

اچھی خوراک کا معجزہ
عمر کا تیسرا دور
اپنی گوناگوں دلچسپیوں کے علاوہ
خاصی مشکلات بھی لاتا ہے:
سٹار بناسپتی
صاف ستھری. زود ہضم اور خالص غذا آپ کے پژمردہ دل و دماغ کو روح پرور تقویت پہنچاتی ہے۔
سٹار بناسپتی
حیاتین اے اور ڈی ملا ہوا آپ کے کھانے کو نہ صرف لذیذ بناتا ہے۔ بلکہ صحت بخش اور زود ہضم بھی
دی پنجاب ویجی ٹیبل گھی اینڈ جنرل ملز لمیٹڈ،
۲۳ - دی مال - لاہور

۳۶۸۴۷



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہفت روزہ نصرت لاہور

۲۸ - فروری ۱۹۶۰ء — دوسرا سال — شمارہ : ۱۲، ۱۳، ۱۴ — ۶ - فتح محمد روڈ

کشمیر نمبر — ترتیب : حنیف رامے

تیسرا حصہ: کشمیر اور ادب

اداریہ

کشمیر کے مسئلے میں ہم کہاں کھڑے ہیں

پاکستان کے سر کا تاج پاکستان کا ہمسایہ بھارت چھین کر لے گیا ہے۔ اہلِ پاکستان کا شاید یہ خیال ہے کہ یہ محض دوستانہ مذاق ہے۔ اُسی قسم کا مذاق جس میں بعض اوقات ایک دوسرے کو دھول دھپا بھی رسید کر دیا جاتا ہے۔ اہلِ پاکستان شاید یہ سوچتے ہیں کہ جس طرح اُن کے سر سے یہ تاج اتارا گیا ہے اسی طرح ایک دن وہ جائیں گے تو اُن کا سر ڈھکا ہوگا —— کشمیر انھیں مل چکا ہوگا۔ اُن کا خیال ہے کہ زور دستیاں بھارت کو یہ احساس کبھی نہ کبھی ضرور ہو جائے گا کہ بیچارے پاکستان کا سر ننگا ہے، کہیں اسے کچھ ہو ہوا نہ جائے۔

اگر انھیں یہ خیال نہ ہو تو سمجھ میں ذرا کم ہی آتا ہے کہ انھیں آخر اور کس خیال نے یوں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر امید کی ترنگ میں ڈوبے رہنے کی بے کنار مہلت عطا کر رکھی ہے۔

"یوں آخر ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔ دنیا کے اتنے بڑے بڑے ملک کشمیر کی بدقسمتی پر آنسو بہانے، پنڈت نہرو کی اخلاقی حمیت کا نوحہ پڑھنے کے سوا کیا کر سکے ہیں —— اور تو اور اقوامِ متحدہ کیا کر سکی ہے۔ اہلِ کشمیر خود ہی کچھ کریں تو کریں۔"

اگر یہی بات ہے تو جب وہ کچھ کرنے نکلتے ہیں تو آپ گویا ان پر سایہ کر انھیں واپس کیوں لے آتے ہیں۔ یا پھر جب وہ پاکستان کا نام دلوں کے بجائے زبانوں پر نہیں لاتے اور صرف آزادی کا دم بھرتے ہیں تو ان کے سینے دھرے پر غداری کا پھارا کیوں پھیر دیا جاتا ہے؟

"جی، دراصل قصہ یہ ہے کہ ہم نے موقع کھو دیا۔ ہمیں چاہیے تھا کہ مہاراجا ہری سنگھ کی بیعت ہوتے ہی کشمیر پر فوج کشی کر دیتے۔ بعد میں بے شک رائے شماری وغیرہ ہوتی رہتی۔ اوّل تو اہلِ کشمیر پاکستان ہی کے حق میں فیصلہ کرتے۔ دوسرے بھارت کے پاس کسی شدید احتجاج کا جواز نہ تھا کیونکہ کشمیر کی تحریکِ آزادی ایک طرح سے مطالبۂ پاکستان ہی کی ایک شاخ تھی اور معاہدۂ الحاق کے تحت آبادی، محل وقوع اور معاشی اعتبار سے اس کا رشتہ پاکستان سے روزِ روشن کی طرح عیاں تھا۔"

بالکل بجا ہے —— وہ محمد علی جناح جن کی ساری زندگی اس موقف کا نشان تھی کہ ہتھیاروں کے بجائے انسانیت کے لیے قانونی جنگ کا راستہ ہی نجات کا راستہ ہے، اُسے پاکستان کے قیام کے ساتھ ہی یہ چاہیے تھا کہ ہر قدر اور اصول کو پس پشت ڈالتے ہوئے اپنی آئین پسندی پر لات مار کر کشمیر پر چڑھائی کر دیتا۔

"کہنے کو کیا نہیں کہا جاتا۔ جب کشمیر کی پاکستانی فوجوں کو [illegible] لگ گیا تو پھر کشمیر پر قبضے میں آخر کیا امر مانع تھا —— سیز فائر کا طوق گلے میں ڈالنے کی کیا تک تھی۔ وہ ہزاروں میل لمبی میدانی سرحدیں جو بھارت کو ہر لحظہ دعوتِ شوق دیتی تھیں اُن پر آپ کی نظر کیوں نہیں جاتی۔ حیدر آباد پر یلغار کرنے والے بھارت کو پاکستان پر یلغار سے کون باز رکھ سکتا تھا —— اور آپ شاید یہ تو جانتے ہیں کہ آپ کے تمام فوجی معاہدے بعد کی پیداوار ہیں اور شاید اسی خطرے کا ردِعمل ہیں۔"

"نہیں جی نہیں، یہ تو اقوامِ متحدہ کا فرض تھا کہ وہ بھارت کو مجبور کرتی کہ وہ اپنے اقراروں اور معاہدوں کی پابندی کرے۔ پہلے دن سے بھارت یہ وعدہ کرتا چلا آیا ہے کہ کشمیر کا فیصلہ وہاں کے عوام کی مرضی سے ہوگا۔ اسی وعدے کی

جاپڑتا ہے یہ سوال کہ رہ جاتا ہے کہ بخشی حکومت نے کشمیر اسمبلی قائم کر کے اس سے بھارت کے حق میں فیصلہ کرا لیا ہے۔ اگر اقوام متحدہ میں استصواب کا قرار دیا ہوتا تو بھارت کو اس کا منہ بند کرنے کے لیے یہ سب کچھ نہ کرنا پڑتا۔ اب اقوام متحدہ اگر کشمیر اسمبلی کے "فیصلے" کو تسلیم نہیں کرتی تو اس پر لازم آتا ہے کہ وہ صحیح فضا میں استصواب رائے کا اہتمام کرے۔ خواہ اس کے لیے اسے اپنی فوجیں کشمیر میں لانی پڑیں۔ آخر سویز اور کوریا کے معاملات میں بھی تو اس نے فوجیں بھجوائی تھیں، کشمیر کوئی در خور اعتنا مسئلہ تو نہیں۔

شاید آپ کو اس ضمن میں ایک خاصا بڑا سا ملک نظر نہیں آیا — سوویٹ روس۔ جس کے حواری سرخ چین کو، جو دنیا کی ایک چوتھائی آبادی کا حامل ہے، مغربی طاقتوں نے ابھی تک اقوام متحدہ کا رکن بھی نہیں بننے دیا۔ مجھے یا آپ کو روسی انداز نظر سے لاکھ اختلافات ہوں لیکن اسے بھی تو اپنے وجود کی بقا کے لیے سیاسی گٹھ جوڑ کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی مغربی طاقتوں کو۔ اگر نیٹو اور سیٹو ضروری ہیں تو روس کو بھی ان معاہدوں کے توڑ کے لیے حواریوں کی ضرورت ہے۔ بھارت کی غیر جانب داری کو روس آخر کیوں ہوا نہ دے۔ مغربی طاقتیں سرخ خطرے کے پیش نظر جو ایشیا گیر دفاعی پہاڑ کھڑا کرنے میں کوشاں ہیں آخر روس اس پہاڑ میں کسی شگاف کسی درے کی تلاش کیوں نہ کرے — اور کشمیر اس نقطۂ نگاہ سے کتنا اعلیٰ درہ ہے۔ ادھر بھارت کو ایشیا میں جو حیثیت اپنے رقبے، آبادی اور امکانات کے اعتبار سے حاصل ہے اور چین کی موجودگی میں طاقت کے ترازو کا پلڑا دوسری جانب جھکانے میں جو کردار وہ انجام دے سکتا ہے اس کے پیش نظر مغربی طاقتوں کو بھی اس کی ناراضی مول لینا گوارا نہیں۔ اب آپ ہی سوچیے کہ اقوام متحدہ جو روس اور مغربی طاقتوں کی زور آزمائی کا مہتم بالشان اکھاڑہ ہے وہ آخر کیا کر سکتی ہے۔

یہ تسلیم کہ وہ اتنا تو ضرور کر سکتی ہے کہ خود اس نے جو قرار دادیں منظور کی ہیں انھیں لباس عمل پہنانے کا اہتمام کرے اور اگر اس سلسلے میں پاکستان یا بھارت رکاوٹ ثابت ہوں تو ان کی بھی پروا نہ کرے۔ سوچنے والی بات یہ ہے کہ کیا ہمیں یہ صورت منظور ہو گی؟

اس موقع پر ہمیں اپنے دل سے یہ فیصلہ کرنا ہے کہ کیا ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ اہل کشمیر کو حق خود ارادیت مل جائے، خواہ وہ ہم سے ملیں یا نہ ملیں۔ یا ہم کشمیر کو اپنے لیے لازم سمجھتے ہیں اور اسے پانی یا دفاع کی بنا پر محض اپنی خاطر چاہتے ہیں۔ اس ایک فیصلے سے ہمارا موقف متعین ہو جانا چاہیے۔ اگر ہم اہل کشمیر کے لیے حق رائے دہندگی ہی کے طالب ہیں تو ہمیں اس کے لیے سازگار فضا بنانے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے اور فوجی انخلا وغیرہ کی باتوں میں الجھنے اور الجھانے کے بجائے، اور اس مسئلے کے مسلسل التوا کو توڑنے کی خاطر اقوام متحدہ کو پیشکش کرنی چاہیے کہ وہ اپنی ذمہ داری پر کشمیر میں استصواب رائے منعقد کرا دے، خواہ فیصلہ کچھ ہی ہو۔

اس سلسلے میں ہمیں اپنا یہ دعویٰ تو یاد ہی ہو گا کہ اہل کشمیر پاکستان کے ہمنوا ہیں۔ اگر ہمیں اس حقیقت پر ایمان ہے تو پھر بیکار کی بہت سی احتیاطیں بالائے طاق رکھ دینی چاہئیں اور جلد از جلد استصواب رائے کا انعقاد ممکن بنانا چاہیے — جلد از جلد اس لیے کہ حالات بدلے بھی جا سکتے ہیں۔ جموں اور کشمیر کے جن مسلمانوں نے پاکستان کی جانب ہجرت کی ہے ان کی جگہ ہندوؤں اور سکھوں کو آباد کیا جا رہا ہے کیونکہ اب کشمیر بھارت کے کہنے کے مطابق بھارت کا باقاعدہ حصہ ہے۔ اس طرح آبادی کا تناسب تہ و بالا ہو جائے گا اور اعداد و شمار کے الجھیڑے درپیش ہوں گے۔

دوسرا موقف، کہ کشمیر ہمیں پاکستان کی ضروریات کی بنا پر ملنا چاہیے، اس بات کا متقاضی ہے کہ ہم صبر کریں

(باقی ہے ←)

میاں بشیر احمد

کشمیر — ایک تعارف

کون ہے جو کشمیر کا نام سنتے ہی کشمیر جنت نظیر نہ کہہ دے؟ عرفی کا شعر "ہر سوختہ جانے"... کس نے نہیں سنا؟ فارسی نہ سمجھنے والے بھی سمجھتے ہیں کہ —

اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

یورپ والے بھی کشمیر کو کشمیر کی حسین وادی یا مسرور وادی کہہ کر یاد کرتے ہیں۔ کشمیر کا نام سن کر دل اس طرح خوش ہو جاتا ہے جیسے اس نے حسن بلکہ خوشی کا منہ دیکھ لیا۔۔

کیا کشمیر واقعی ایسی بے نظیر جگہ ہے؟ اس کا جواب ہاں بھی ہے اور نہیں بھی۔ ہاں اس لیے کہ قدرتی مناظر کے لحاظ سے دنیا کا کوئی ملک کشمیر سے زیادہ خوبصورت نہیں اور نہیں اس لیے کہ یہاں کے باشندوں سے زیادہ خستہ حال لوگ شاید ہی دنیا کے کسی اور ملک میں موجود ہوں گے۔

کشمیر کا عموماً سوئٹزرلینڈ سے مقابلہ کیا جاتا ہے۔ دونوں ملک قدرتی مناظر کے لحاظ سے نہایت خوبصورت ہیں۔ دونوں سمندر سے خاصے فاصلے پر ہیں اور دونوں کوہستانی علاقے ہیں لیکن اس مشابہت کے ساتھ ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ ایسا فرق جیسا کہ یورپ اور ایشیا میں ہے۔ کشمیر سوئٹزرلینڈ سے بہت بڑا ہے، یہاں کے پہاڑ زیادہ اونچے اور وادیاں زیادہ وسیع ہیں، لیکن ساتھ ہی باشندے زیادہ غریب اور زیادہ خستہ حال ہیں یعنی سوئٹزرلینڈ کی نسبت کشمیر میں قدرت زیادہ خوش نما ہے۔ لیکن انسان کم خوش حال!

کشمیر ہندوستان کے شمال مغرب میں واقع ہے۔ کشمیر کی سرحد کے قریب تین بڑی سلطنتوں روس، چین اور ہندوستان کی سرحدیں ملتی ہیں۔ کشمیر کا رقبہ ۸۴۴۷۱ مربع میل ہے۔ اس کی لمبائی ۴۰۰ اور چوڑائی ۳۰۰ میل ہے۔ یہاں کی آبادی تقریباً چالیس لاکھ ہے (۱۹۴۱ء کی مردم شماری میں آبادی ۴،۰۲۱،۶۱۶ تھی) قدرتی طور پر کشمیر کے تین حصے ہیں۔ بیچ میں کشمیر کی وادی ہے جس کا طول ۸۴ میل اور عرض ۲۴ میل ہے اور بلندی ۵۲۰۰ فٹ ہے۔ اتنی بلندی پر ایسی بڑی زرخیز اور خوبصورت وادی دنیا میں اور کہیں نہیں۔ اس وادی کی آبادی ۱۵،۹۰،۲۱۸ ہے اس کے

(بقیہ اداریہ)

صبر کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ ہم پچھلے بارہ سال کی طرح ہاتھ پاؤں توڑ کر پڑے رہیں۔ صبر کا مطلب تو یہ ہے کہ ہم اپنی طاقت کا شیرازہ سمیٹیں اور مزید آگے بڑھنے کا چارہ کریں۔ طاقت کے لفظ سے محض فوجی طاقت مراد نہیں۔ مراد یہ ہے کہ عالمی سیاست میں جب تک ہماری حیثیت اتنی وقیع نہیں ہوتی کہ بھارت کو ہماری دوستی کی پوری پوری ضرورت محسوس ہو تب تک یہ توقع فضول ہے کہ بھارت کسی دن چپ چاپ کشمیر ہمارے ہاتھ میں تھما دے گا۔

ہماری طاقتوں کی شیرازہ بندی اور ان کی نشوونما محض اسی لیے لازم نہیں کہ بھارت کو معاشی، دفاعی اور اخلاقی اعتبار سے پاکستان کی برادرانہ ہمسائگی قیمتی محسوس ہو بلکہ اس لیے بھی لازم ہے کہ اگر استصواب رائے میں حسب سابق دیر ہو تو جب بھی یہ مرحلہ آئے اہلِ کشمیر میں اہلِ پاکستان سے ملنے کی آرزو موجزن ملے — پاکستان سے الحاق انھیں اپنے مستقبل کے لیے اہم بلکہ لازم محسوس ہو — اپنی ذہنی، روحانی، معاشرتی، اقتصادی اور ملی ترقی کی ضمانت نظر آئے۔

یہی وہ مقام ہے جہاں ہمیں اپنی حالت بدلنے کے پیغام کا رُخ اہلِ کشمیر کے بجائے خود اپنے دلوں کی جانب موڑ دینا چاہیے — صداقت کے ساتھ — عزم کے ساتھ۔

شمال میں جو پہاڑوں کا سلسلہ ہے اُس کے پرے مشرق میں لداخ اور مغرب میں گلگت کا علاقہ ہے۔ کشمیر کا تیسرا حصہ وہ ہے جو وادیٔ کشمیر کے جنوب کی طرف یعنی پیر پنجال کے کوہستانی سلسلے کے جنوب میں واقع ہے یعنی جموں کا صوبہ۔

کشمیر آنے جانے کے تین بڑے راستے ہیں۔ ایک راولپنڈی سے ۱۹۶ میل دوسرا جموں سے ۲۰۶ میل اور تیسرا حویلیاں (ایبٹ آباد) سے ۱۶۹ میل۔ تقریباً ستر سال پہلے جب یہ سڑکیں مکمل نہ ہوئی تھیں تو عام طور پر پیر پنجال والا یعنی بھمبر اور شوپیاں کا راستہ استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ مغل بادشاہوں کا بنایا ہوا راستہ تھا۔ چنانچہ آج تک ان مغل سراؤں کے کھنڈر وہاں موجود ہیں جو علی مردان خاں نے شاہجہان کے حکم سے ۱۶۵۱ء تا ۱۶۵۸ء میں یہاں تعمیر کیں۔ یہ رستہ بھمبر سے جو گجرات سے تیس میل پر واقع ہے ہوتا ہوا سری نگر پہنچتا تھا۔ بھمبر سے سری نگر تک بارہ پڑاؤ تھے اور ہر پڑاؤ دس یا پندرہ میل کا تھا۔

کشمیر میں قسم قسم کے قدرتی مناظر ہیں۔ یہاں اونچے سے اونچے پہاڑ ہیں، بڑے بڑے دریا اور خوبصورت سے خوبصورت وادیاں اور جھیلیں۔ شمالی سرحد پر کے ٹو یعنی گوڈون آسٹن پہاڑ جو ایورسٹ کے بعد دنیا کا سب سے اونچا پہاڑ ہے واقع ہے۔ اس کی بلندی ۲۸،۲۷۸ فٹ ہے۔ یہاں دنیا کے سب سے اونچے کاروانی رستے اٹھارہ سے بیس ہزار فٹ کی بلندی پر ہیں۔ کشمیر میں نو دس، چودہ پندرہ، اٹھارہ بیس ہزار فٹ تک بلند چوٹیاں عام ہیں۔ ننگا پربت جو وادیٔ کشمیر میں اکثر جگہ سے نظر آتی ہے ۲۶،۶۲۹ فٹ بلند ہے۔ دریائے جہلم وادیٔ کشمیر میں بل کھاتا ہوا بہتا ہے۔ کشمیری کشیدہ کاری کے پیچ و خم اسی سے لیے گئے ہیں۔ دریائے سندھ لداخ اور گلگت میں سے ہوتا ہوا بہتا ہے جہاں اس کے بڑے بڑے برفانی میدان ہیں۔ کشمیر کی جھیلوں میں ولر برصغیر کی سب سے بڑی میٹھے پانی کی جھیل ہے۔ یہ گرمیوں میں ۱۳ میل لمبی اور ۱۰ میل چوڑی ہوتی ہے اور سردیوں میں اس سے آدھی رہ جاتی ہے۔ دریائے جہلم اس میں ایک طرف سے داخل ہو کر تقریباً دوسری طرف بہہ نکلتا ہے۔ سب سے زیادہ خوبصورت اور سب سے زیادہ مشہور جھیل ڈل ہے جو سری نگر کے قریب پہاڑوں کے دامن میں واقع ہے۔ یہ ۵ میل لمبی اور ۲ میل چوڑی ہے۔ مغل اسے "دامن پاک" کہتے تھے۔ اس میں دو ننھے ننھے مصنوعی جزیرے روپ لنکا اور سونا لنکا ہیں اور اس کے کنارے تختِ سلیمان یعنی شنکر اچاریہ کی پہاڑی، شاہجہان کا شاہی چشمہ، آصف جاہ کا نشاط باغ، جہانگیر کا شالامار، اکبر کا نسیم باغ اور قلعہ اور پھر سری نگر کی آبادی ہے۔ ڈل ایک مسلسل قطعہ آب نہیں۔ اس کے بیچ بیچ میں زمین کے ٹکڑے اور باغات بھی ہیں۔ بید مجنوں کے درختوں کے جھنڈ اور کنول کے پھول اس کی رونق کو دوبالا کرتے ہیں اور یہاں وہ تیرتی کھیتیاں بھی ہیں جن کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا اور اس لئے چرایا بھی جا سکتا ہے۔ "ڈل" کے علاوہ کئی جھیلیں مثلاً کوثر ناگ، شیش ناگ بڑی بلندی پر واقع ہیں۔ ان میں بعض چودہ پندرہ ہزار فٹ کی بلندی پر ہیں۔ کشمیر کی مرکزی وادی کے اطراف میں بہت سی چھوٹی بڑی وادیاں ہیں جن میں لدر، سندھ اور لولاب کی وادیاں زیادہ مشہور ہیں۔ سندھ کی وادی میں سونمرگ کے قریب بہترین کوہستانی نظارے ہیں اور ادھر لدر کی وادی میں پہلگام، کولاہی کا برفانی میدان اور امرناتھ کے متبرک غار دنیا بھر میں مشہور ہیں۔

کشمیر کی آب و ہوا صحت بخش ہے۔ یہاں قسم قسم کے موسم ہیں۔ گرمی سردی بہار جس طرح کا موسم چاہو مختلف جگہوں پر بیک وقت میسر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کشمیر میں چھ قسم کے موسم بہار ہوتے ہیں۔ موسم کی تبدیلیاں بھی مشہور ہیں۔ چنانچہ ضرب المثل ہے "کشمیر نکھا نیوشتن"

قدرتی پیداوار کی بہتات ہے۔ چاول کثرت سے ہوتے ہیں۔ سوپر کشمیر کے مزروعہ رقبے میں سے ایک تہائی رقبے میں شالی یعنی چاول کی کاشت ہوتی ہے۔ کشمیر کے پھل مشہور ہیں جن میں سے ناشپاتی، سیب، اخروٹ کی کافی برآمد ہے۔ گوجروں کی قوم جو پہاڑوں میں بستی ہے اپنے گایوں، بھینسوں، بکریوں اور بھیڑوں کے بڑے بڑے ریوڑ رکھتی ہے جن سے مکھن، اون، گھی تیار ہو کر باہر بھیجا جاتا ہے۔ جنگلوں میں ہر قسم کی لکڑی دستیاب ہوتی ہے کئی درخت کئی کئی سو سال پرانے ہیں۔ سنہ ۲۳ء کی نمائش میں ایک دیودار کے درخت کے تنے کا کچھ حصہ کاٹ کر دکھایا گیا تھا، اس کا گھیر ۱۹½ فٹ تھا اور اس کی تاریخ پیدائش ۱۲۱۵ء لکھی تھی یعنی یہ اس وقت پیدا ہوا جب مسلمان فاتح اس ملک میں آئے اور آج یہ درخت بزبانِ حال گزشتہ چھ سو سال کی تاریخ دہرا رہا ہے۔ اون، ریشم اور زعفران کی کثرت سے برآمد ہے۔ جڑی بوٹیوں سے یہاں کے پہاڑ بھرے پڑے ہیں۔ اندازہ ہے کہ کشمیر کے پہاڑوں میں دھاتیں کثرت سے موجود ہیں لیکن ان کے استخراج کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی گئی۔

سری نگر دارالسلطنت ہے۔ اس کی آبادی تقریباً دو لاکھ ہے یہ جہلم

کے دونوں کناروں پر آباد ہے۔ اسے سات پلوں کا شہر کہتے ہیں اور مشرق کا وینس، غیظ وینس کہنا زیادہ درست ہوگا، جیسا کہ بیان ہو چکا ہے اس کے قریب ہی ڈل جھیل ہے اور ہری پربت پر اکبر کا قلعہ اور شنکر اچاریہ پہاڑی پر ایک پرانا مشہور مندر۔ جامع مسجد اور شاہ ہمدان کی مسجد دو تاریخی عمارتیں ہیں۔ عجائب گھر میں آثار قدیمہ کے بعض اچھے نمونے ہیں مغلیہ باغات اور ان کے پرے ہاروان کی جھیل جہاں سے سری نگر کا پانی آتا ہے سیر کی خاص جگہیں ہیں۔ اتوار کے دن ان باغات میں نہر کا پانی آتا ہے اور سب فوارے چلتے ہیں اور خوب رونق ہوتی ہے۔

جموں، پونچھ، بارہ مولا، اسلام آباد، جسے ہندو اننت ناگ کہتے ہیں، بام پور، جو اپنے زعفران کے لئے مشہور ہے، اونتی پور جہاں ایک مشہور پرانا مندر ہے، یہ یہاں کے بعض بڑے شہر ہیں۔ امرناتھ ہندوؤں کا مشہور مقدس مقام ہے۔ اس کی بلندی ۱۲،۷۹۲ فٹ ہے۔ ہندوستان کے کونے کونے سے جاتری یہاں اگست کے مہینے میں آتے ہیں۔ یہاں کے غار کا دہانہ ۵۰ فٹ ہے جس کے اندر برف میں دیوتاؤں کی مورتیاں بنی ہوئی ہیں۔ مٹن اور کھیر بھوانی بھی ہندوؤں کے متبرک مقام ہیں۔ ویری ناگ دریائے جہلم کا سرچشمہ ہے۔ ککڑ ناگ کا چشمہ اپنے ہاضم اور صحت بخش پانی کی وجہ سے مشہور ہے۔ پہلگام اور گلمرگ سرد مقامات ہیں۔ جہاں ملکی لوگ اور انگریز گرمیوں کا موسم گزارنے آتے ہیں پہل گام میں زیادہ تر ملکی لوگ اور گلمرگ میں انگریز ٹھہرتے ہیں مگر اب گلمرگ میں بھی ملکی لوگوں کا دور دورہ ہو رہا ہے ۱۹۳۹ء میں ۲۷،۴۹۷ سیاح کشمیر میں آئے۔

سیاح جو کشمیر میں آتے ہیں علاوہ مکانات کے عموماً ہوٹس بوٹوں یعنی کشتیوں اور خیموں میں رہتے ہیں۔ یہاں کی شکارا کشتیوں کی سیر کا کون دلدادہ نہیں؟ اجنبی لوگوں کا جن کشمیریوں سے واسطہ پڑتا ہے وہ عام طور پر کشتی کھینے والے مانجھی ہی ہوتے ہیں کشمیر میں سیاحوں کی دلچسپی کے بہت سامان ہیں۔ علاوہ سیر و تفریح کے ریچھ اور دوسرے جانوروں کا شکار اور خاص طور پر مچھلیوں کا شکار ہوتا ہے۔ گلمرگ کے میدان گالف کے لئے مشہور ہیں۔ ان کے علاوہ نباتات، لسانیات، حجریات اور آثار قدیمہ کے ماہرین اور دوسرے محققین کے لئے کشمیر ایک نہایت دلچسپ خطہ ہے ——— دنیا سے دور اور الگ، سیر و دریافت کی ایک دلکش سرزمین۔

کشمیر کے باشندے کشمیری، ڈوگرے، لداخی، گوجر وغیرہ قوموں سے ہیں۔ کشمیری لوگ بلند قامت حسین ہیں۔ وہ ذہین اور محنتی اور خوش مزاج اور سعیدا ہیں۔ ہندوستان میں ہندو مسلمانوں کے بعض مشہور خاندان اور افراد کشمیری نسل کے ہیں۔ کشمیری پنڈت اپنی ذہانت کے لئے مشہور ہیں۔ ہندوؤں میں موتی لال اور جواہر لال نہرو اور مسلمانوں میں ڈاکٹر اقبال اور کئی اشخاص کشمیری نسل سے ہیں۔ مشہور پہلوان غلام، کلو، امام بخش وغیرہ بھی کشمیری ہیں۔ ہماری کئی بستیوں اور انجمنوں میں خاصا کشمیری عنصر موجود ہے اور کئی محلے اور کوچے کشمیریوں سے منسوب ہیں۔ کچھ کشمیر ہی سے پنجاب میں آیا۔ کشمیر کا ہتو، مزدور سارے شمالی ہندوستان میں محنت مزدوری کرتا پایا جاتا ہے۔ کشمیر کے کشمیریوں کے خلاف جو یہ کہا جاتا ہے کہ وہ عموماً فریب اور جھوٹ سے کام لیتے ہیں اور لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں تو یقیناً یہ ان کی انتہائی غریبی کا نتیجہ ہے اور کچھ نہیں۔

باوجود اس غریبی کے پرانے زمانے سے کشمیر صنعت و حرفت کا مرکز رہا ہے۔ شال، ریشم سازی، گلکاری، پیپر ماشی، قالین بافی، گبہ سازی، پتھر اور لکڑی اور چاندی کا کام یہاں کی قدیم صنعتیں ہیں جن میں سے بعض کے لئے کشمیر دنیا بھر میں مشہور ہے۔ اپنی شال کے لئے کشمیر مہابھارت کے زمانے سے مشہور تھا۔ مغلیہ زمانے میں جب اس صنعت کو فروغ ہوا تو ایسی نفیس قسم کی شال بنتی تھی کہ ½ گز کا ٹکڑا لپیٹ کر ایک انگوٹھی میں سے نکل سکتا تھا کشمیر مدتوں سے "شالی شال اور پشم" کا ملک پکارا جاتا ہے۔

ریشم بنانے کے لئے کشمیر کی آب و ہوا سازگار ہے کشمیر کی وادی میں میلوں تک بستیوں میں توت کے درخت لگے ہوئے ہیں۔ توت پر کسان ریشم کے کیڑے پالتے اور اس طرح ریشم تیار کرتے ہیں۔ یہ ایک پرانی صنعت ہے مسلمانوں کے وقت میں بھی یہاں کا ریشم دمشق اور بخارا کو بھیجا جاتا تھا۔ ریشم سازی کے لئے ریاست کا اپنا کارخانہ ہے جہاں ۵۰۰ مزدور روزانہ کام کرتے ہیں۔ پیپر ماشی کشمیر کی مخصوص صنعت ہے اور اس کام کی نزاکت میں کشمیری اپنی کاریگری کے بہترین نمونے دکھاتے ہیں۔ پتھر کے کام کے نمونے قدیم ہندو مندروں میں اور لکڑی کے کام کے نمونے مسلمان بادشاہوں کی مسجدوں میں نظر آتے ہیں۔ پتھر کے لئے مارتنڈ کے ستون دیکھیں اور لکڑی کے لئے جامع مسجد کے ۳۲۲ ستون جن میں اکثر چالیس چالیس فٹ اونچے ہیں

کشمیر کے لوگ ۸۰ فیصد مسلمان ہیں۔ کشمیری عموماً توہم پرست واقع ہوئے ہیں، ہندوؤں کے توہمات عموماً چشموں سے وابستہ ہوتے ہیں اور مسلمانوں کے ان کے پیروں کے مقبروں سے۔ خاص کشمیر کی وادی کے تقریباً ۹۵ فیصدی رہنے والے مسلمان ہیں۔ یہ عادی اکثر مانجھیوں کی "یا پیر دستگیر"

سے گونجتی ہے۔

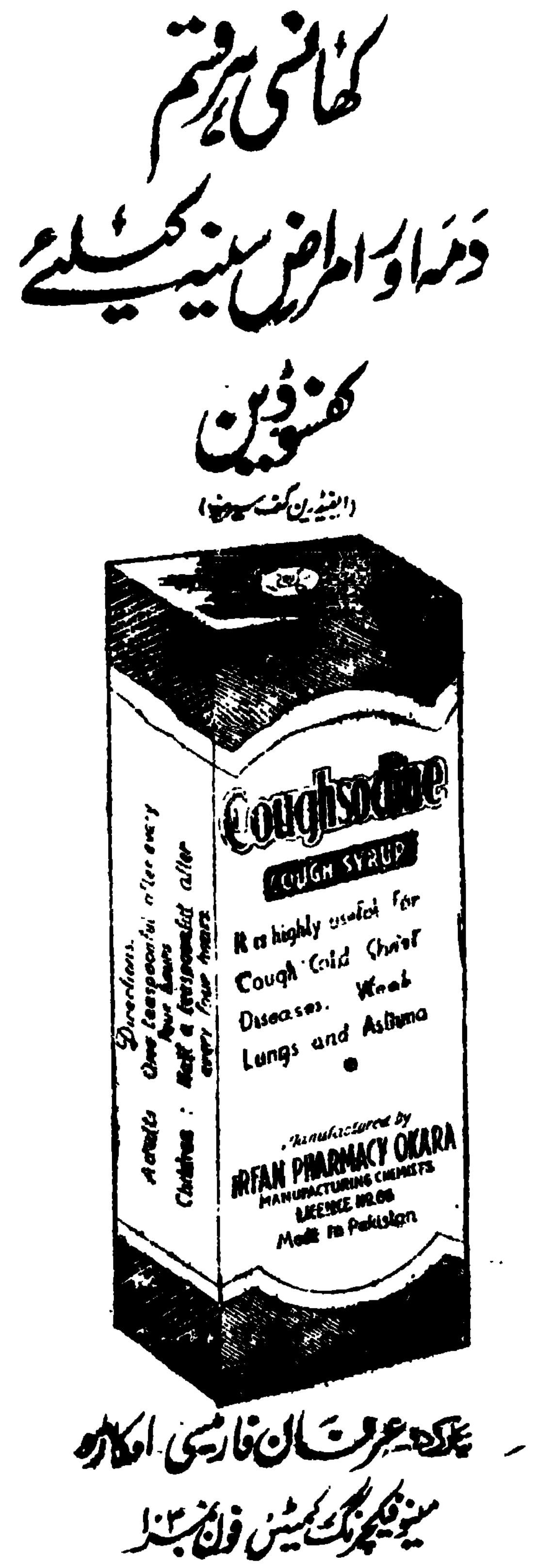
کشمیر میں بہت سی زبانیں ہیں۔ تقریباً ۳۰ لاکھ لوگ کشمیری بولتے ہیں۔ چھ لاکھ پہاڑی، ڈھائی لاکھ ڈوگری، ۳ لاکھ پنجابی، ۲ لاکھ گوجری، سوا لاکھ بلتی وغیرہ وغیرہ۔ ان سب کے لئے مشترک ملکی زبان اُردو ہے۔

کشمیری زبان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ چھ سو سال ہوئے یہ ایک مکمل تحریری زبان تھی۔ کشمیر کا سب سے بڑا بادشاہ بڈشاہ یعنی زین العابدین خود کشمیری میں شعر لکھتا تھا۔ ہندی کی طرح کشمیری شاعری میں بھی عشقیہ اشعار میں عورت سے مرد کی طرف خطاب ہوتا تھا۔ کشمیری شاعری پر بعد میں فارسی شاعری کا اور تصوف کا بہت اثر پڑا۔ یاس و حسرت کا عنصر اس میں بہت ہے اور نظم میں قافیوں کی کثرت ہوتی ہے۔ بڈشاہ کے بعد فارسی کا رواج بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ بعض کشمیری فارسی شعرا، مثلاً غنی کشمیری نے اہل ایران کو اپنا قائل کر لیا۔ کشمیری زبان کے اس وقت کوئی اپنے حروف تہجی نہیں، لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ہاں حروف دوسری کئی زبانوں سے تعداد میں زیادہ ہیں۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اس میں ۲۷ حروف علت ہیں۔ کسی کشمیری کو بولتے دیکھیں، آ ا اُ کہنے میں کئی قسم کی شکلیں بناتا معلوم ہوتا ہے۔ کشمیری شیریں زبان ہے۔ کشمیری میں ضرب الامثال اور محاورات بہت ہیں۔ کشمیری زبان کے متعلق بہت سے نظریے ہیں۔ ایک یہ ہے کہ سنسکرت سے نکلی ہے۔ فارسی کے الفاظ بھی اس میں بہتات سے۔ سنسکرت اور فارسی سے جو کشمیری زبان کا تعلق ہے۔ مندرجہ ذیل الفاظ کی مثالوں سے صاف ظاہر ہوگا۔

سنسکرت	فارسی	کشمیری	اُردو
سپت	ہفت	ست	سات
سوپن	خفتن	سپُن	سُپنا
وایو	ہوا	واوُ	ہوا
پرشٹ	پشت	پت	پیٹھ۔

دوسرا نظریہ یہ ہے کہ کشمیری رشتانہ زبان کی ایک شاخ ہے اور بعض کہتے ہیں کہ سرحد کی داوری زبان اس کا ماخذ ہے۔ ایک اور نظریہ یہ ہے کہ کشمیری سُریانی اور عبرانی سے تیار ہوئی ہے۔ ایک یہودی قوم ترکستان سے یہاں آکر بسی، ان کی زبان عبرانی تھی جو بگڑ کر کشمیری ہو گئی۔

(یہ مضمون جنوری ۱۹۴۸ء کے ماہ نو میں شائع ہوا تھا۔ یہ اس مضمون کا ابتدائی حصہ ہے)



وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا
جس کو حکمت ملی اُسے بڑی عظیم نعمت ملی (قرآن حکیم)





ہم پر الزام ہے کہ ہم اہلِ تحقیق نہیں

آیئے اسے باطل کر دکھائیں

ہمارے پاس علم و حکمت کے ایسے بیش بہا خزینے موجود ہیں جن کی تحقیق و تلاش میں ہمارے اسلاف نے اپنی زندگیاں صرف کر دیں۔ لیکن پوشیدہ ہونے کی وجہ سے وہ انسانیت کے کسی کام نہیں آ رہے۔ ان کا چھپائے رکھنا انسان دشمنی کے برابر ہے۔ آیئے انہیں ظاہر کر کے ثابت کر دیں کہ ہم اب بھی دنیا کو بہت کچھ دے سکتے ہیں۔

آپ یا آپ کے جاننے والوں میں سے کسی کے پاس کوئی مجرب نسخہ یا جڑی بوٹیوں کے متعلق کسی قسم کی معلومات محفوظ ہوں تو انہیں تفصیلاً لکھ کر ہمیں بھیجیے۔ ہم اُن پر خود بھی تحقیق و تجربات کریں گے اور دوسروں کو بھی انہیں پرکھنے کی دعوت دیں گے۔

بھیجنے والوں کے نام سے سب نسخوں کی بجنسہٖ اشاعت کا زیادہ سے زیادہ انتظام کیا جائے گا۔ تاکہ طبی ادارے اور عوامی صحت سے دلچسپی رکھنے والے اہلِ تحقیق ان پر مزید کام کر سکیں۔

یہ پوشیدہ وطبی نوادر قوم کی امانت ہیں آیئے انہیں جمع کر کے انسانیت کے نام پر عام کریں

وقت کا تقاضا ہے کہ قومی صحت کی حفاظت کے لیے ایک جامع کوشش کی جائے۔ اس تقاضے کو پورا کیجیے۔







انسٹی ٹیوٹ آف ایسٹرن میڈیسن

ہمدرد منزل نیو ٹاؤن کراچی۔۵

سر فرانسس ینگ ھسبنڈ

کشمیر کے مناظر اور موسم

برنیئر پہلا یورپی تھا جو کشمیر میں داخل ہوا۔ ۱۶۶۵ء میں وہ لکھتا ہے۔ "سچ تو یہ ہے کہ میں تخیل کی انتہائی جولانی میں بھی یہ تصور نہ کر سکتا تھا کہ یہ اقلیم اتنی حسین ہوگی" یہ تاثر ہمہ گیر نہیں ہے۔ کیونکہ کشمیر پر تازہ ترین کتاب کے مصنف لکھتے ہیں کہ کشمیر کی ضرورت سے زیادہ قدر کی گئی ہے اور یہ کہ اس کے پہاڑوں کے خط و خال معمولی ہیں اور دوسرے درجہ کی ترولی، دالمٹیا، وادیوں سے مشابہ ہیں۔ تسلیم ہے کہ اس محدود دنیا میں ہم سب ایک طرح نہیں سوچتے لیکن میں بہت سے کشمیر آنے والوں سے ملا ہوں اور میرا تجربہ ہے کہ ان میں سے بیشتر مذکورہ بالا فرانسیسی سے اتفاق رکھتے ہیں انہوں نے اس علاقے کے ولولہ انگیز تذکرے کتابوں میں پڑھے یا دوستوں سے سنے تھے۔ لیکن ان میں سے اکثر نے حقیقت کو اپنی توقعات سے بڑھا پایا۔ مجھ کو یہ توقع نہ تھی کہ رہائش کے اخراجات اور سفر کی دشواریاں اتنی زیادہ ہوں گی۔ بعض لوگوں کی آمد کے وقت بارش ہو رہی تھی یا مطلع ابر آلود تھا اور برف نظر نہ آ رہی تھی۔ یا ان کا وسط گرما میں آنا ہوا جب وادی معتدل، بخار آلودہ اور مچھروں سے بھری ہوتی ہے۔ لیکن جب بادل پھٹ گئے ہوں اور دھند چھٹ گئی ہو اور صحیح معنوں میں کشمیر کا بہاری اور خزانی دن رونما ہو تو بے رحم سے بے رحم سیاح کا دل بھی گداز ہو جاتا ہے اور وہ برنیئر کی طرح محسوس کرتا ہے۔

میں اس مضمون میں صرف کشمیر کی مشہور و معروف طشتری نما وادی کا ذکر کروں گا جو ہمالیہ کے عین قلب میں واقع ہے۔ اس کا طول چوراسی میل، عرض بیس سے پچیس میل، سطح سمندر سے اوسط بلندی پانچ ہزار چھ سو فٹ ہے اور عرض البلد وہی ہے جو دمشق اور فیض (مراکش) کا ہے۔

فطری طور پر سوئٹزرلینڈ ہی وہ ملک ہے جس سے کشمیر کا مقابلہ کرنے کو طبیعت سب سے زیادہ مائل ہوتی ہے۔ سوئٹزرلینڈ فی الواقع بہت سی دلفریبیوں کا حامل ہے اور پہاڑ اور جھیل کے ملاپ میں کشمیر سے بڑھ گیا ہے لیکن وہ چھوٹے پیمانے پر بنا ہوا ہے۔ وہاں برف پوش پہاڑ کشمیر کی طرح دور دور تک پھیلے ہوئے نہیں۔ جیسے برفانی پہاڑوں کا مکمل دائرہ جو وادی کشمیر جتنے لمبے اور چوڑے میدان کو گھیرے ہو سوئٹزرلینڈ میں کہیں نظر نہیں آتا کیونکہ وہاں کی بڑی بڑی وادیاں کشمیر کی جانبی وادیوں کے مانند ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جنوبی طرف سے کہیں کہیں کشمیر کے پیچھے جو ہوشربا کوہساروں کا غلغلہ جن کا دنیا بھر میں جواب نہیں نظر آتا ہے وہ بھی سوئٹزرلینڈ کے پیچھے نہیں۔

ہمالیہ کے صرف انہی خطوں، بالتستان اور ہنزہ کے پہاڑوں اور دارجیلنگ سے نظر آنے والے بے نظیر کوہساروں کو کشمیر پر فوقیت حاصل ہے۔ ان علاقوں میں کوہستانی شوکت اور رفعت واقعی اوج پر پہنچی ہوئی ہے اور کشمیر ان سے مقابلہ نہیں کر سکتا لیکن کشمیر میں کوہی شان و شوکت اور خاموش حسن کا جو ملاپ ہے اس کی دلکشی بالکل ذاتی ہے دریائے جہلم کی پرامن اور شاداب وادی کو برف پوش کوہساروں میں گھرا تصور کیجئے اور آپ کشمیر کی حقیقی تصویر کے اتنے قریب پہنچ جائیں گے جتنا کہ ممکن ہے آپ کو کشمیر سے پرے کے زبردست پہاڑوں کی سخت ناہمواری اور تقریباً بے پناہ دبدبے کی توقع تو نہ ہوگی لیکن وہ پرسکون حسن اور فرحناک خوبصورتی حاصل ہو جائے گی جو بعضوں کی نظر میں قابل ترجیح بھی ہے

یہ فیصلہ تو ہر شخص کو خود ہی کرنا پڑے گا کہ کشمیر کا حسین ترین موسم کون سا ہے۔ بہار کے دنوں میں ہم بہار کو انتہائی نفیس طور پر حسین سمجھتے ہیں۔ خزاں آتی ہے تو ہم کہتے ہیں کہ چمکیلے خزانی رنگوں کی دلربائی کا کوئی چیز مقابلہ نہیں کر سکتی۔ لیکن بیشتر لوگ موسم بہار میں کشمیر آتے ہیں اور وہ سال کا اصلی آغاز بھی ہے اس لئے کشمیر کو بیان کرنے کے وقت طلب کام کی ابتدا موسم بہار سے کرنا کچھ مفید رہے گا۔

میں پچھلے سال مارچ کے پہلے ہفتے میں کشمیر پہنچا تمام خوش قسمتی سے عمدہ تھا۔ اس موسم میں کسی اور سال میں شاید میں اتنا خوش نصیب نہ رہتا اور قارئین کو شرابور کرنے والی بارش، کیچڑ بھری سڑکوں اور چٹانوں کے خطرناک طرح گرنے کے امکان کو ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ اور اس مقصد کے لئے اس کے تخیل کی معاونت ضروری نہیں کیونکہ بارانی دن دنیا

تر میں ایک سے ہوتے ہیں۔

راولپنڈی کے اسٹیشن سے جو سری نگر سے ۱۹۶ میل دور ہے، کاروں کا لمبا سفر تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ ہم وادیٔ جہلم میں روانہ روی سے چڑھتے جا رہے تھے اور ہماری بائیں طرف دریا مسلسل جھپٹتا ہوا بہہ رہا تھا اس زور آور اور تند و تیز دریا کو اب کار آمد مقاصد کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس سے رامپور کے قریب برقی طاقت پیدا کی جاتی ہے اور نیچے پنجاب کے میدانوں میں لاکھوں ایکڑ سیراب ہوتے ہیں۔ ہم دیودار کے اس دامن جنگل سے، جو رامپور کے دونوں جانب کھڑا ہے، اور چونا پتھر کی ان شاندار چٹانوں کے پاس سے گزرے جو دائیں بائیں سیدھی اونچی ہوتی گئی ہیں۔ ذرا آگے ہمیں تقریباً ست... کے مندر کے عظیم کھنڈر ملے۔ اسے بدھ مندر بتایا جاتا ہے اور ہے اصل میں ہندوؤں کا۔ تمام علاقہ برف سے ڈھکا تھا۔ چٹانوں کے پہلوؤں پر ہزاروں شمشاد کھڑے روشن دھوپ میں چمک رہے تھے اور سنجیدہ سڑک ٹٹوؤں کی ٹاپوں سے کھڑکھڑا رہی تھی۔ پھر وہ تنگ وادی بتدریج کھلنے لگی۔ اسے احاطے میں لینے والی پہاڑیوں نے جگہ چھوڑ دی۔ دریا کے دھارے کی تندی سست روی میں تبدیل ہو گئی۔ بہت سی لمبے ماتھوں والی کشتیاں مزے مزے سے بہاؤ کے ساتھ تیرتی نظر آئیں۔ پھر بارہ مولا کا چھوٹا شہر اور کشمیر کے پہلے میز شیلے (CHALET) نما لیکن گندے اور بودے مکان، ایک خوش وضع ہندو مندر، ایک مخصوص ستونوں کا پل اور مشہور چناروں کے عمدہ نمونے نمودار ہوئے۔ اور اس کے بعد جب چٹانوں کے پہلو دور دور کو ہٹ گئے تو شاندار وادی نظر آنے لگی۔ اس کے بسیط پیمانے کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے درحقیقت پہاڑوں کے درمیان میدان سمجھنا چاہیئے۔ اور وادی کی پرلی طرف برف پوش پہاڑوں کا وہ عظیم سلسلہ، آسمان کی صاف نیلاہٹ میں دھبے پن سے گھلتا ملتا ہوا پھیلا تھا جو کشمیر کے شمال میں واقع ہے۔ ہارمکھ کی چوٹی بالکل آگے واضح نظر آ رہی تھی۔ وہ سولہ ہزار نو سو فٹ اونچی ہے اور پینتیس میل دور تھی۔ اور بارہ مولا سے ذرا آگے ننگا پربت — (چھبیس ہزار چھ سو فٹ) کو بھی دیکھا جا سکتا تھا جو وہاں سے ستر میل دور تھا۔ ان متعدد کوہی دیوؤں کا، جو پیچھے واقع ہیں، یہ تنہا نمائندہ ان نیچے پہاڑی سلسلوں سے شاہانہ انداز میں سربلند ہے۔

جب ہم کشادہ وادی میں داخل ہوئے تو برف غائب ہو گئی اور بہار کے اولیں مدھم آثار نمایاں تھے۔ درخت تو سچ مچ ابھی ننگے کھڑے تھے۔ بارہ مولا سے سری نگر تک سڑک کے کنارے کنارے سربسر کھڑے ہوئے تناور چناروں اور سفیدوں کی طویل قطاروں پر پتوں کا نام نشان نہ تھا اور گھاس کا رنگ کجلا چکا تھا۔ لیکن بید کے درختوں پر زردی مائل سبز رنگ کا ذرا سا شائبہ تھا۔ ننھی کونپلیں پھوٹنے کے لئے بس تیار ہی تھیں۔ زمین پر جا بجا زرد کروکس اور جانے پہچانے بلیو بیل کے ڈھیر تھے۔ کہیں کہیں بنفشہ کے گچھے بھی تھے۔ کبھی کبھار کوئی تتلی یا سبزی مائل سفید تتلی پاس سے گزر جاتی۔ سب سے زیادہ یہ کہ شاندار چمکیلی دھوپ کھلا صاف نیلا آسمان اور صبح کی ہوا کی کٹیلی خنک پن کے بعد دوپہر کا نرم لمس اور سبک احساس، سب بہار کی آمد کی یقینی امید دلاتے تھے۔

پھر جب آخر کار کشمیر کا صدر مقام سری نگر آ گیا اور میں اپنے محبوب باغ میں واپس پہنچا تو بہار کی آمد کی اور علامتیں بھی ظاہر تھیں۔ بنفشہ، نرگس، اکرکم، اکرن پھول، پینزی اور ڈیزی کھلے ہوئے تھے۔ کیلائی گھاس میں چند ایک ہری پتیاں بھی نمودار تھیں۔ گلاب کی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ پاس کے باغ میں خوبانی پر سچ مچ چند پھول آ گئے تھے اور سارا باغ چڑیوں کے بہاریں ترانوں سے، جو سبک سری سے محبت کے نغموں پر مائل ہو رہے تھے، گونج اٹھا تھا۔ مینا، ابابیل، ہدہد، تھرش اور سارلنگ، بے باک اور عام کوے، اور ان میں سب سے زیادہ پرلطف یعنی چھوٹی سی دلکش بلبلیں اور ان کی نخریلی کلغی۔ یہ ننھی ننھی دوستانہ چڑیاں رازدارانہ انداز میں کھڑکیوں میں آتی ہیں اور پردوں کے چھلے یا کرسیوں پر بیٹھ جاتی ہیں اور پیالی میں سے شکر کھانے سے بھی نہیں ڈرتیں۔

چنانچہ بہت دن موسم ایسا ہی رہا۔ درجہ حرارت رات کو نقطہ انجماد سے ایک یا دو ڈگری نیچے ہوتا اور دن کے وقت سائے اور دھوپ میں بیش از بیش پچپن اور ایک سو چھ ڈگری تک پہنچ جاتا۔ مطلع ہر روز بالکل صاف رہتا۔ قریب کے پہاڑ وادی کی سطح سے ایک یا دو ہزار فٹ کی بلندی تک برف سے ڈھکے ہوئے تھے۔ معدوم وادی کی ساری بلندی پائے سے پہاڑ سفید چمکتی نظر آتی۔ پھر دوپہر ہونے تک سردی اور گرمی کے درمیان عجیب کشمکش ہوتی۔ بیرون باغ ملک کا منظر تمام تر زمستانی تھا — بے برگ و بار درخت اور پامال گھاس مگر ساکن فضا میں سورج کی کرنیں جن کی حدت روز بروز بڑھتی ہی تھی، انگلستانی موسم

گرما کے ابتدائی دنوں جیسی حرارت تھیں اور دوپہر کی دھوپ میں پہاڑ ایک خواب آلود دھند میں لپٹے نظر آ رہے تھے

پھر اچانک ایک تبدیلی ظہور میں آئی یہی پھر پورا منظر یکسر تبدیل ہو گیا۔ کشمیر کی دلفریبی میں چار چاند لگاتی ہیں۔ کالے کالے منحوس بادلوں نے قریب کی چوٹیوں پر ڈیرہ ڈال دیا کہیں کہیں چنگھاڑتے ہوئے برفانی طوفان ان چوٹیوں کے پاس سے ہو کر گزرنے لگے۔ دور کی برف میں وہ خوابناکی اور ملاحت پیدا ہو گئی جو ان طوفان زدہ ایام میں زیادہ دھوپ والے دنوں کی خوابناک دھندلاہٹ کی جگہ لے لیتی ہے۔ کبھی کبھار سورج کی کوئی گمشدہ شعاع گزرتے بادلوں کو چیر کر کسی تنہا چوٹی کو منور کر دیتی اور وادی کی تلہٹی میں باری باری سے کبھی خوف آمیز خاموشی چھا جاتی، کبھی ہوا کے جھکڑ چلنے۔

یہ علامتیں عموماً ناگوار موسم کا پیش خیمہ ہوتی ہیں لیکن اس مرتبہ بارش نہیں برسی اور اسے خوش قسمتی تصور کرنا چاہیئے کیونکہ میں بارہ سنگھے کا شکار کھیلنے کیمپ چلا آیا تھا۔ اگلی صبح چار بجے اٹھ کر میں جلدی جلدی ناشتہ کر کے فوراً ایک جھبرے اور خود سر چھوٹے ٹٹو پر، جو تبت کی لڑائی میں ہاتھ آیا تھا، چڑھ کر ایک شکاری کی سایہ آسا شکل کے پیچھے چل پڑا جو اسی چھوٹے ٹٹو پر سوار تھا بکل کے۔ بادل زیادہ تر غائب ہو چکے تھے ہوا تھم گئی تھی اور تارے اور واضح تابناکی سے چمک رہے تھے۔ جیسے صرف کوہساروں اور صحراؤں میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے ہوا میں ایک طرح کی چستی اور ترو تازگی کا احساس تھا۔ اس میں وہ چبھتی ہوئی سردی نہ تھی جو ہمیں نے اس سے پہلے جنوری کی رات کو گزرتے ہوئے محسوس کی تھی بلکہ وہ تیز اور جانفزا تھی ٹٹوؤں پر سوار ہم کھیتوں میں ایسی پگڈنڈیوں پر جنہیں صرف ایک مقامی باشندہ ہی پہچان سکتا تھا، ٹھوکریں کھاتے ہوئے بڑھتے گئے ہر گاؤں میں کتے ہم پر افسردگی سے بھونکتے تھے مگر کوئی آدمی جاگتا ہوا نہ ملا ہم بتدریج پہاڑوں کے سیاہ خاکوں کے قریب جا پہنچے اور ان کی تلہٹی میں جہاں ابھی تک گھپ اندھیرا تھا، دوسرے شکاری ہم سے آ ملے۔ انہوں نے اسٹیج کے سازشیوں کی طرح اور سانس روک کر یہ بتایا کہ ایک بارہ سنگھا کل کہاں نظر آیا تھا۔ پھر مجھے اتر کر پیدل چلنا پڑا۔ ہم میانہ روی اور خاموشی سے پہاڑ کے پہلو پر چڑھتے گئے اور طلوع آفتاب نے ہمیں وادی سے تین ہزار فٹ بلند پایا۔ شکاری اب نظر آنے لگے تھے اور اپنے طبقے کے افراد کی طرح سخت جان اور چاق چوبند معلوم ہوتے تھے صاف ظاہر تھا کہ وہ گرمی سردی پہاڑوں کے پہلوؤں میں رہنے اور ہمیشہ ناصحوں کو تکنے کے عادی ہیں۔ میر شکاری ایک معمر صورت اکثر بڑھے بالوں والا آدمی تھا۔ میرا خیال ہے اس کی عمر پچاس برس سے زیادہ نہ ہو گی؟ سخت جان اور گٹھیلا سنجیدہ اور مستعد۔ اس کی نظر میں دنیا کے باقی امور لہو و لعب تھے اور شکار ہی انسان کی زندگی کا اصل کام تھا۔ ہاں، رزیڈنٹوں کو عام اوقات میں اپنا دل بہلانے کو دوسری مصروفیتیں بھی نکالنی پڑتی ہیں لیکن جب زندگی کا اصل کام انجام دینے کا وقت آتا ہے تو وہ اس کے پاس آتے ہیں اور وہ ان کا چھوٹے بچوں کی طرح ملائمت سے ہاتھ تھام کر کشمیری بارہ سنگھے کے ٹھکانے دکھاتا ہے اور بتاتا ہے کہ وہ کہاں پھرتا ہے، اس کا پیچھا کس طرح کرنا چاہیئے اور اس کی عادتیں کیا ہیں۔

چنانچہ اب میں خود کو انکساری کے ساتھ شکاریوں کے حوالے کر دیتا ہوں کیونکہ مجھے کوئی دعویٰ شکاری ہونے کا نہیں اس پر وہ گمبھیر سنجیدگی اور ڈرامائی حرکات کے ساتھ آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں۔ ٹھیک وہ جگہ دکھاتے ہیں جہاں کل سہ پہر ایک بارہ سنگھا نظر آیا تھا۔ وہ اس کے بالوں کے چھوٹے چھوٹے گچھے زمین سے چنتے ہیں۔ جو بقول ان کے لڑائی میں جھڑے تھے۔ وہ نرم مٹی اور برف کے ٹکڑوں پر اس کے قدموں کے نشان دکھاتے ہیں اور اس پر بات کرتے ہیں کہ وہ کہاں جا سکتا ہے۔ ان کے پاس حیرت خیز فراست کی کوئی کمی نہیں۔ لیکن جا دہ جا چکا تھا۔ اور یہی وہ امر تھا جسے لاکھ سرگوشی بھی جھٹلا نہ سکتی تھی۔

چنانچہ ہم پہاڑ کے پہلو کے ساتھ ساتھ چلتے گئے۔ اب ہم گہری برف پر چل رہے تھے کیونکہ ہم پہاڑ کی ایک نواحی شاخ پر تھے اور شمالی رخ کے سب ڈھلان جنگلوں سے پٹے ہوتے ہیں اور جنوبی رخ کے سب ڈھلان درختوں سے خالی۔ اس کی وجہ صاف ہے جنوبی ڈھلانوں پر سورج کی کرنیں تقریباً زاویہ مستقیم بنا کر سیدھی پڑتی ہیں اور لہٰذا جمی ہوئی برف جلد غائب ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس شمالی ڈھلانوں پر شعاعیں ترچھی پڑتی ہیں۔ برف دیر تک جمی رہتی ہے؟ جو

نمی کو ضائع نہیں ہونے دیتی، ہریالی خوب پھلتی پھولتی ہے، درخت موٹے ہو جاتے ہیں اور موقع آنے پر برف پر اور زیادہ سایہ رکھتے ہیں اور اپنی جڑوں سے نمی کو روک لیتے ہیں۔ اسی لئے کشمیر کے جنوب یعنی سلسلہ پیر پنچال کے شمال رخی ڈھلانوں پر، جیسے گلمرگ میں، گھنے درخت مسلسل ہیں اور وادی کی شمالی طرف جنوب رخی ڈھلانوں پر کوئی جنگل نہیں۔ بس ان معاون تناخوں پر۔ جو شمال کے رخ پر ہیں جنگل ہیں۔

ہم جنگل کے اس ٹکڑے میں، جو زیادہ تر فندق کے درختوں پر مشتمل تھا۔ بارہ سنگھے کا کھوج لگاتے پھرے۔ شکاری بتاتے گئے کہ بارہ سنگھے نے کہاں کہاں نئی کونپلوں اور چھال پر منہ مارا تھا۔ سال کے اس زمانے میں یہ دو چیزیں اس کی خوراک کا خاص جزو معلوم ہوتی تھیں تو نہیں ایک اور شکاری ملا اور کہنے لگا کہ اس نے بارہ سنگھے کو ابھی صبح دیکھا تھا لیکن میرا گمان ہے کہ یہ محض ایک نوع کی شائستگی تھی جس سے میری لپیٹ ہوئی امیدوں میں دوبارہ جان ڈالنا مقصود تھا۔ چونکہ پہاڑ کے پہلو پر اوپر نیچے اور دائیں بائیں پھرنے اور تمام دن وہیں گزارنے کے باوجود مجھے کوئی بارہ سنگھا نظر نہ آیا۔ ایک دفعہ پتوں میں سرسراہٹ سن کر ہماری امید بندھی لیکن وہاں سے نکل فقط بندروں کی فوج۔ کچھ دیر بعد ایک جنگلی سور پاؤں گھسیٹتا ہوا برآمد ہوا اور پھر ہم نے ایک دور افتادہ چٹان پر ایک ریچھ کو دھوپ میں کھیلتے دیکھا۔ لیکن بارہ سنگھا کہیں نہ تھا۔

لیکن ماندگی اور ناامیدی کے باوجود پہاڑ کے ڈھلانوں پر گزرا ہوا دن یوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے ان دنوں کا حصہ ہو جن میں آدمی نے واقعی زندگی کا لطف اٹھایا ہو۔ ہوا تازہ اور جان بخش تھی۔ پہاڑوں کے سکوت اور سامنے کے عظیم فاصلوں میں کوئی ایسی بات تھی جو تسکین دہ بھی تھی اور روح کو بلند بھی کرتی تھی۔ دور جنوب میں پیر پنچال کے برفانی سلسلے کے پاس سے شاہانہ گھٹائیں اور برفانی طوفان گزر رہے تھے۔ نیچے پُرامن وادی میں نرم رو دریا بل کھاتا چلا جا رہا تھا۔ ایک طرف غضب ناک طوفانی بادلوں کو دیکھا جا سکتا تھا جن کے تیور دھمکی بھرے تھے۔ سورج کی بہت سی شعاعیں انہیں چیر کر دریا کی مارپیچاں گزرگاہ کو اجال رہی تھیں، دوسری طرف ان سیاہ انباروں سے جو دھوپ بھرا برفانی سلسلہ کوہ بلند تھا وہ زمین پر قائم اور سخت۔ واضح اور صاف تھیں گویا کسی ایتھری منور تصویر کے مانند آسمان میں آویزاں معلوم ہوتا تھا۔

میں گھنٹوں وادی کے اس پار نظارہ نے بدلتے بدلتے مناظر کا مزہ لوٹتا رہا اور دوربین سے پہاڑ کے پہلو پر بارہ سنگھے کی تلاش میں تکتا رہا۔ جب شام ہوئی تو میں کیمپ لوٹا۔ اگلے دن مصروفیت کی وجہ سے کہیں نکلنا نہ ہوا لیکن تیسرے دن میں پھر منہ اندھیرے سوار ہو کر چلا۔ جونہی صبح کے اولیں مبہم آثار نمایاں ہوئے میں نے شکاریوں کی معیت میں پہاڑ پر چڑھنا شروع کیا۔ آسمان صاف اور بے ابر تھا۔ اس کی نیلگوں سیاہی جب چاندنی کے ساتھ گھل کر بھوری ہو گئی۔ جوں جوں ہم ثابت قدمی سے اوپر چڑھتے گئے پہاڑ کا رنگ بھورے سے گہرا ہوتا گیا۔ ان آرام دہ سکوت میں۔ جو پہاڑوں کی مخصوص دلکشی ہے، چکور کی سرسراہٹ یا اپنے جوڑے کو بلانے کی غرض سے کسی چڑیا کے اتفاقی چہچہوں کے سوا کوئی شور مخل نہ تھا۔ اور پھر جب ہم کمر کوہ کی چوٹی پر پہنچے تو میں نے بھورے ورنگی رنگیلی میں سے باہر جھانکا تو بالکل غیر متوقع طور پر اس لمبی گلابی پیاز کی نمنماہٹ پر نظر پڑتے ہی جسے ابھی طلوع ناشدہ سورج نے دور افتادہ پہاڑوں پر بکھیر دیا تھا اور اپنے آسمانی پس منظر اور تلیٹی کے ہنوز شبینہ خاکستری ہونے کی وجہ سے وہ اور بھی نمایاں اور جاذب نظر تھی، میرے بدن میں اچانک اہتزاز کی لہر دوڑ گئی۔ گلابی پہاڑوں کا سلسلہ روز روز دکھائی نہیں دیتا اور اس وقت بھی یہ تاثر صرف تھوڑی دیر باقی رہا۔ جلد ہی ایک مدھم نیلاہٹ بھورے رنگ پر غالب آگئی۔ آسمان نیلا اور زیادہ نیلا ہو چلا وادی روشنی سے معمور ہو گئی۔ لیکن افسوس! برفانی چوٹیوں کو تھمانے والا گلابی پیازی رنگ غیر محسوس طور پر مٹ کر اپنی جگہ بے لطف سفیدی چھوڑ گیا۔ پہاڑوں کا وہ تمام طویل سلسلہ اب قابل داد وضاحت کے ساتھ نمایاں تو تھا۔ مگر مسیر طے پر وادی کے غیر روحانی کتھئی رنگ میں واقع نظر آتا تھا۔

ساڑھے نو بجے ہم پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے تھے، سورج پوری طرح ہمارے اوپر چمک رہا تھا۔ ہوا فرحت افزا اور خنک تھی ——— عین بعین ایک مثالی تو تیز اور جان دار دن۔ ہم کمر کوہ کے ساتھ ساتھ، دونوں جانب کے نشیبوں میں بارہ سنگھے کو ڈھونڈتے ہوئے، چلتے رہے لیکن ہمیں صرف ایک جنگلی سور نظر آیا۔ وہ صبح صبح پانی پینے کے لئے چٹان کے ایک چشمے

پر بھی برف توڑ رہا تھا۔ آخر ہم سستانے اور کھانے پینے کے لئے رُکے اب بھی ہم کمرکوہ کے اوپر تھے اور دنیا کی حسین ترین وادی تین ہزار فٹ نیچے، اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ پھیلی تھی اور افق کو سرلبسر محاط کرنے والا آسمانی برفانی سلسلہ ہمارے روبرو تھا۔ اس صاف اور ساکن فضا میں نیچے کے کسی گاؤں کی آوازیں بلند ہوکر دھیمی دھیمی ہم تک آ رہی تھیں۔ وگرنہ ہم ایسے پرسکون انداز میں، انسانیت کے پرشور ہنگامے سے علیحدہ معلوم ہوتے تھے، اور گرم دوپہر کی دھوپ میں بیٹھ کر میں حسن کی اس تمام روح سے لطف اُٹھا سکا۔

اور وہاں مجھے یہ خیال آیا، اور یقیناً میرے علاوہ بھی بہت سوں کو آیا ہوگا؟ کیا وجہ ہے کہ یہ منظر مجھے تو اتنا متاثر کر رہا ہے اور میرے ساتھ والوں پر اس کا ذرا اثر نہیں۔ یہ وہ لوگ تھے جن کی بینائی مجھ سے کہیں تیز تھی۔ اور میرے اردگرد جو جانور تھے ان کی بینائی تو اور بھی تیز تھی۔ جو منظر میرے پیش نظر تھا ان کی آنکھیں اسی کو دیکھ رہی تھیں اور ہر تفصیل کو کہیں زیادہ صحت کے ساتھ پہچان سکتی تھیں۔ لیکن جب میں منظر کی نفیس خوبصورتی سے مخود ہوا پڑا تھا تو وہ تیز بین شکاری، جانور اور اوپر اڑنے والا عقاب جتنے متاثر تھے اس سے تو ان پر اندھے ہونے کا گمان ہوتا تھا۔ صاف ظاہر ہے کہ آنکھیں نہیں دیکھتیں، روح دیکھتی ہے لیکن اس کے بعد ایک اور خیال آتا ہے۔ پتہ نہیں کتنی چیزیں میرے بالکل سامنے ہوں گی جو مجھے سوجھتی ہی نہیں؟ جیسے کشمیری بارہ سنگھوں کو وہ حسین چیزیں نہیں سوجھتیں جن کے درمیان ان کی پوری زندگی کٹتی ہے۔ شاید یہ تمام مسلسل منظر ایسے جمالات سے مرتعش ہو جنہیں دیکھنے کے لئے انسان کے پاس ابھی روح ہی نہیں۔ اس میں کلام نہیں کہ آج کل بھی کچھ لوگ ایسے جمالات دیکھ لیتے ہیں جن کی ہم معمولی آدمی سوجھ بوجھ نہیں رکھتے۔ آج سے فقط سو برس قبل کوہساروں کو کریہہ منظر سمجھا جاتا تھا۔ اور کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ آنے والی صدیوں میں ہماری روح ان جمالات کو دیکھنے کے قابل ہو جائے جن کا آج کسی کو نشان تک نہیں یقیناً وہ اس قابل ہو جائے گی اور پہاڑوں پر غرق محویت ہوکر اکثر میں نے یہ تصور کرنے کی کوشش کی ہے کہ انسانوں کو ان میں ابھی اور کیا کیا [illegible] نظر آ سکتی ہے۔

ایک تنہا بارہ سنگھے کی تلاش میں اونچے اونچے پہاڑ پر چڑھتے پھرنے کے بعد جھیل بیچ کشتی میں بیٹھے نظر آنا، جبکہ ہزاروں مرغابیاں رکے بغیر تیزی سے چاروں طرف اڑ رہی ہوں، منظر اور دلچسپی کے اس تنوع کی محض ایک اور مثال ہے جو کشمیر بہم پہنچا سکتا ہے اس سے پہلے کہ موسم ختم ہو مرغابی کے ایک آخری شکار کے لئے بس ذرا سا وقت تھا اور ہم آٹھ آدمی مشہور ہوکر ہرگھاٹ روانہ ہوئے جو سری نگر سے چھ میل ہے

جھیل کے کنارے مل کر ہم نے نمبر ڈلی کمین گاہوں کے لئے قرعہ اندازی کی۔ شکاری، کشتی بان اور کشتیاں ہماری منتظر تھیں جب ہم نے یہ فیصلہ کر لیا کہ کون کہاں جائے گا اور لنچ کے وقفے کے لئے شکار بند کرنے کا وقت کیا ہوگا تاکہ سہ پہر کو مزید شکار کھیلنے کے لئے مرغابیوں کو دوبارہ بیٹھنے کا موقع مل جائے، تو بندوقیں، کارتوس اور ٹفن لے کر اپنی اپنی ہلکی پھلکی کشتی میں بیٹھ گئے اور نرسلوں میں سے ایک تنگ راستے سے گزر کر پرے کے کھلے پانی میں جا پہنچے۔ ہوکرزر وادی کے بالکل بیچ میں واقع ہے اور جھیل سے برفانی پہاڑوں کا ایک مکمل بیضوی حلقہ دیکھا جا سکتا ہے۔

اس روز بھی بہت عمدہ دھوپ نکلی ہوئی تھی اور دوپہر کے سورج تلے جنوبی سلسلہ خیرہ کن روشنی میں دمک رہا تھا اور شمالی سلسلہ جس پر سورج کی کرنیں سیدھی پڑ رہی تھیں، صاف اور نمایاں تھا۔ دائیں بائیں دور افتادہ سلسلے دھند اور خواب کی دنیا میں کھوئے ہوئے تھے۔ پہاڑوں کے پہلوؤں کے پاس سے نرم گالے سے بادل اڑ رہے تھے۔ ایک تیز جان بخش ہوا جی کو تازہ کرتی ہوئی پانی میں چمکیلی رقصاں لہریں اٹھا رہی تھی جن پہ ان گنت مرغابیاں ابدُب کر رہی تھیں۔

وہاں ہم نے لنچ کھانے سے پہلے دو گھنٹے شکار کھیلا اور بعد ازاں شام تک کھیلتے رہے۔ یہ شکار اتنے زور کا تو نہ تھا جتنا کہ ہم خزاں میں کھیلتے تھے جس کا میں آگے ذکر کروں گا، تاہم یہ لطف تھا اور چونکہ موسم کا آخری تھا سب لوگوں نے جی بھر کر کسر نکالی۔

مارچ کے آخر میں میرا ہرواں جانا ہوا، جو ایک مقبول مقام ہے وہ بھی بدھ مت کے ایک مشہور تیرتھ کا ٹھکانا تھا اور اب نیا؟ سری نگر کو پانی بہم پہنچانے والے ذخیرے کی جائے وقوع اور ٹراؤٹ پالنے کے تالابوں کے لئے مشہور ہے۔ رات مینہ برسا تھا۔ اور ہر طرف گہری گھٹا چھائی تھی۔ بس کہیں کہیں بے حد صاف نیلے آسمان کی جھلک آ رہی تھی۔ مگر موسم بہار اب واضح طور پر نزدیک آ گیا تھا۔ دو تین صدیوں پرانے چناروں پر تو ابھی پتے نہ آئے تھے۔ لیکن بید کے پیڑوں پر تازہ کونپلیں تھیں خوبانی کے پیڑوں پر گلابی اور سفید شگوفوں کا غبار سا چھایا تھا۔ پہاڑوں کے ڈھلانوں پر سفید جنگلی شاہ بلوط، ناشپاتی اور ... کے پیڑ، پورے جوبن پر نقطوں کی طرح بکھرے تھے زمین پر اکثر جگہ پنکھڑیوں کے گرنے سے برف کی طرح سفید تھی۔ فندق کی نوخیز پتیوں نے پہاڑی پہلو کو تازگی بخشی تھی۔ اور پاس ہی بنفشہ، انومیا اور گلوقاہ کھلے ہوئے تھے۔ فضا ثمردار درختوں کی خوشبو سے مالا مال تھی۔ ان درختوں کے گرد شہد کی مکھیوں کے جھنڈ بھنبھنا رہے تھے۔ رنگ برنگی، ملگجی زرد اور سبزی مائل سفید تتلیاں دھوپ میں پھڑپھڑا رہی تھیں۔ اور بلبلوں، دھوبن چڑیا، گولڈ فنچوں اور پودنوں کے جاندار چہچہے بہار کی بیداری کا ایک اور ثبوت فراہم کر رہے تھے

خود ہرواں کئی ذاتی دلفریبیوں کا حامل ہے اس کے پس پشت ایک قطعاً سیدھا، سیاہ کھڑے ڈھلانوں سے مزین، پہاڑ استادہ تھا جس کی برفانی پھننگ اوپر طاری ابر گندہ کو چیر کر بلند تھی وادی میں صاف شفاف چشمے مسرت بھری سرسراہٹ کے ساتھ رواں تھے درمیانی فاصلے پر سرکن جھیل ڈل واقع تھی جس کی پرلی طرف ہری پربت قلعہ سایہ افگن تھا۔ اصل وادی کے بیچ میں تازہ بیدوں کے دیہاتی جھنڈ، ثمری شگوفوں کے بادل اور شاہانہ چنار بکھرے ہوئے تھے۔ بہت دور پیر پنجال، کچھ ناگ اور کاغان کے برفانی سلسلے تھے اور شمال کی طرف منہ کرنے سے مہادیو کی جاذب نظر چوٹی، سنگلاخ اور واضح عمودی اور پھننگ کے قریب تک صنوبروں سے پٹی ہوئی نظر آتی تھی۔

کشمیر کی ایک مزید دلکشی یہ ہے کہ ہر جگہ دوسری جگہوں سے صرف مختلف ہی نہیں ہوتی بلکہ ہر جگہ کا حلیہ ہر روز بدلا ہوا نظر

آتا ہے۔ اکثر دن روشن ہوتے ہیں لیکن دھندلے دن بھی کم جاذب نظر دلفریبیوں سے خالی نہیں ہوتے۔ ہمارے ہر دان آنے کے بعد تلا دن ساکت اور مکدر تھا۔ تمام آسمان پہ بادل چھائے ہوئے تھے گو وہ پہاڑوں سے اونچے تھے۔ اور بعید ترین سلسلے بھی غیر معمولی صفائی سے صبور رہے یک رنگ آسمان کے آگے سفید اور واضح نظر آ رہے تھے۔ سکوت اور بادلوں کا گھر تا ہیں طور پہ طوفان کا شگون تھا اور سہ پہر کو بعید افق کی سیاہی گہری سے گہری ہوتی گئی۔ برفانی پہاڑ دھیرے دھیرے نظروں سے اوجھل ہو گئے پھر درمیانی فاصلہ تاریک اور خوفناک آمیز ہوا۔ بس تھوڑی ہی پیچھے کی اوگھٹ پہاڑی چڑھائیوں پر گہرے بادل غیر محسوس طور پہ چھا گئے اور وہ بڑا پہاڑ تاریک سے تاریک تر ہوتا گیا۔ ہر طرف اندھیرا بڑھتا معلوم ہوتا تھا شگمین بادلوں میں لپٹی کوہستانی چوٹیوں کی تیرگی اور ڈراؤنا پن بڑھتا گیا۔ اتنی دیر مکمل سکوت اور روشنی پہ الٰہی رہی تھی لیکن یکایک اس سکوت میں ہوا کا ایک جھکڑ در آیا۔ سفیدے کے درخت تازیانوں کی طرح جھک گئے۔ بیدوں کی لمبی ٹہنیاں کوڑوں کی طرح آگے پیچھے مڑنے بھرنے لگیں۔ بڑی بڑی بوندیں پٹ پٹ برسیں۔ پہاڑوں سے ایک روشن اور تیز کوندا لپکا۔ پھر بادل زور سے گرجا۔ بجلی کڑک کڑک کر گری اور موسلا دھار مینہ برسنے لگا۔ پہاڑوں میں طوفان برق و باراں جتنے مرعوب کن مظہر فطرت میں کم ہیں۔

جب اگلی مرتبہ میں مئی کے وسط میں ہر بان پہنچا تو ابتدائی گرما بہار کی جگہ لے چکی تھی۔ پہاڑ کے پہلو پر زرد بربری اور جنگلی پیازی گلابوں کے جھنڈ چھینٹوں کی طرح بکھرے تھے۔ کلیماٹس پہ پھول آ گئے تھے اور ہنی سکل درختوں سے لٹک رہی تھی۔ زمین پہ بڑے بڑے جنگلی جرینیم، بڑے اودی آئرس، سفید بیجان، پھیوا، زرد پوٹن ٹلیا، اسٹابری کے پھول، ٹوم تھمب، تپتیا گھاس، فرن، پیلے وائلٹ اور ریڈ پولا تھے۔ سب جو اکثر جنگلی عشق پیچاں سے ڈھکی ہوئی تھیں اور چٹانوں پہ پیازی گلابوں کی ٹہنیاں جھک رہی تھیں۔ پہاڑ کے پہلوؤں پر۔ شمالی رخ ڈھلانوں پہ جنگلی خوبانیوں اور شاہدانے کے درخت اور جنگلی فندق اور وادی کی تلہٹی میں بید، شہتوت اور اخروٹ کے پیڑ ہرے بھرے استادہ تھے۔ اور چراگاہوں میں اب

سنہری اندرل۔ دھنویں پڑیاں، سفید اور نیلی، رام پتیاں، بگلے کبوتر، بلبلیں اور فاختائیں، شفرقتیں، والڈ ردبن، بٹنگ۔ سرسبز پودے گویا دیپ، پیرا فلائی کیچر، ریڈ سٹارٹ اور شرائک موجود تھیں

صبح ابر آلود اور کہریلی تھی مگر مخصوص خوشنمائیوں سے خالی نہ تھی۔ پہاڑ کے پہلوؤں کے برابر برابر دھند کی لمبی لمبی لکیریں تیر رہی تھیں لیکن اب سب کی سطح بالکل یکساں تھی۔ ہماڈیو پہاڑ جو بیس ہزار فٹ۔ شروع میں بہت صاف تھا اور دھوپ میں چمک رہا تھا۔ پھر دھند اس کی طرف بڑھی، گو اس کا بڑھنا محسوس نہ ہوتا تھا۔ اور جلد ہی اس پہ چھا گئی۔ ہوا کے دھاروں کے بیچ میں پھنس کر ہلکے پھلکے دھندلے بادل پہاڑوں کے گرد پھیلا رہے تھے۔ پھر دھند چھٹ گئی اور ہماڈیو، واضح اور نمایاں طور پر بلند، بادلوں سے جھانکتا نظر آیا۔ پھر چوٹی اور پہاڑ کے تمام پہلوؤں کو گھنگھور گھٹا نے ڈھک لیا، بارش برسنے لگی اور ہر طرح سے یہ آثار نظر آئے کہ دن بارانی اور اندھیرا ہوگا۔ مگر بالکل غیر متوقع طور پر بادلوں میں پھر رخنے پڑے اور ہماڈیو پھر بادلوں سے بلند نظر آیا۔ اس کی نوکیلی برفانی واضح اور چمکیلی چوٹی اور ہر چٹان صاف صاف دکھائی دے رہی تھی اور اسی طرح گھنٹوں سورج اور بادلوں میں آخر وقت تک کشمکش جاری رہی اور یہ بتانا کسی وقت ممکن نہ ہوا کہ کس کے غلبہ پانے کا امکان تھا۔ بادل چھائے معلوم ہوتے، پھر دھوپ کی ایک چمک پہاڑ پر کہیں تازہ ہری گھاس اور کبھی چمکتا ہے کی ایک اکیلی کٹیا کو اجالتی نظر آتی۔ آخر بارش نے فتح پائی۔ دھند وادی میں نیچے اور نیچے اترتی گئی۔ بارش برسنے لگی۔ بظاہر ایک سچ مچ کا بارانی دن شروع ہوگیا۔ لیکن اب بھی دھند کو پہاڑوں پر تیرتے، اٹھتے، بکھرتے اور چوٹیوں کو چھپاتے اور ظاہر کرتے دیکھنا دلکشی سے خالی نہ تھا۔ اور چھوٹی وادی کی ہر سبزی اور بھی سبز نظر آ رہی تھی۔ پہاڑ کے پہلوؤں پر، جو عموماً اس قدر کھٹی ہوتے تھے، بہت لطیف سبز رنگ کی جھلک تھی۔ وادی کے دہانے پر جو سفیدے، شہتوت اور چنار کھڑے تھے ان کا اپنا اپنا رنگ تھا اور دھان کے کھیت بے حد تیز زمردیں رنگ کے نظر آتے تھے۔

لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ بس اب دن بھر بارش برسے گی تو دھند یک بیک پہاڑوں سے ہٹ گئی۔ سورج بادلوں سے برآمد ہوا۔ اس کی روشنی میں بلند تر چوٹیاں واضح اور صاف اور زیادہ اونچی گول چٹانیں ایسی نظر آتی ہیں جیسے نرم، روئیں دار کتھئی رنگ کا مشرقی قالین بچھا ہو۔ ایک گھنٹے بعد دھند کی طویل ہموار لکیریں نمودار ہوئیں اور سب تیزی سے بسیرا ہوگئیں۔ ہر ایک پہاڑ ایک خاص سطح سے ذرا دوبارہ بادل میں چھپ گیا۔ جیسے اس طرح فیصلہ کن فتح حاصل ہوگئی۔

ہروان کا گاؤں خود اس وقت بے حد خوبصورت تھا۔ اس پر عظیم چناروں کے جھنڈ چھائے ہوئے تھے جن کے نیچے ہلکے ہلکے رنگ کے بید، شہتوت اور اخروٹ اور چناروں کا چھتر چھڑکنے والے راست قامت حسین سفید تنوں والے سفیدے تھے کہیں کہیں کسی گلپوش موتیے نے سرسبزی کو روشن کیا تھا ....

....

.... گاؤں کی زمین سے گزرنے والے متعدد نالے چمک دمک، فرحناکی اور ٹھنڈک کا باعث تھے۔ اور مرغوں کے اذان دینے، چڑیوں کے چہچہانے، مویشیوں کے ڈکرانے، وادی کی مٹی میں ہری ہری گھاس چرنے والے ٹٹوؤں کے ہنہنانے اور پہاڑوں پر گوالے کے دور سے بھیڑ بکری کے ریوڑوں کو بلانے سے منظر کی چہل پہل میں اضافہ ہو رہا تھا۔ کہنا یہ مشکل ہوگا کہ گاؤں اس وقت زیادہ دلفریب تھا یا چند ہفتے بعد، جب آئرس ختم ہو چکے تھے اور ان کی جگہ سفید گلاب کھلے ہوئے تھے۔ گلاب اور آئرس کشمیری دیہاتوں اور گلیوں اور باڑوں کے دو خاص حسن تھے اور قطعی طور پر یہ بتانا میں پسند نہ کروں گا کہ ان میں زیادہ خوشنما کون تھا۔ ارغوانی اور اودے آئرس کے خوشنما جھنڈ جو موسم بہار میں دیہاتوں کو رنگ اور تابش سے گھیر لیتے ہیں یا سفید اور پیازی گلابوں کے خوشہ بستہ ہار جو گرما میں باڑوں اور دیہی اراضی کو چمکا دیتے ہیں۔

بس ایک خواہش ان دیہاتوں کے بارے میں ہمیں ضرور محسوس کرنی چاہیئے۔ وہ یہ کہ اس فطرتی حسن میں دیہی انگلستان کی صاف ستھری چھوٹی کاٹیجوں یا سوئزرلینڈ کے خوشنما شیلوں سے اضافہ نہیں ہو سکتا۔ کوئی جب بھی کشمیری گاؤں دیکھتا ہے اور اس پر فطرت کی بچھاور

کی قطار کے دونوں جانب جسیم چناروں سے گھری ایک لمبی سڑک پہاڑ کے پہلو تک چلی گئی تھی۔ چناروں پر نئی کونپلوں کا تازہ تازہ رنگ تھا۔ اطراف میں اور بھاگ پر آڑو، ناشپاتی اور شاہ بلوط کے پیڑ تھے جن پر شوخ رنگ کے پھول کھلے تھے۔ ہم آہستہ آہستہ چنار گھری سڑک سے اوپر گئے اور چوٹی پر پہنچ کر ہم نے عظیم چناروں کے درمیان، جھیل کی طرف گرتے ہوئے چبوتروں، ہموار روشوں اور سبزہ زاروں کو دیکھا۔ شاہ بلوط کے سفید پھولوں اور ارغوانی لیلا کے اوپر سے پہلے جھیل کے ساکت پانی، کنارے پر کھڑے بید اور سفیدوں، ہری پربت کے قلعے اور پھر تا حد نگاہ پھیلے جواب اور بھی تیزی سے چمک رہی تھی اور پہلے سے کہیں زیادہ اثیری اور حسین معلوم ہوتی تھی۔ کسی جگہ کی بہار کشمیر کی بہار کی خوبصورتی کا مقابلہ نہیں کر سکتی اور وہ دن کشمیری بہار کا سب سے حسین دن تھا۔

سری نگر سے تین میل دور ایک اور دلکش مقام اس اصل شہر کی جائے وقوع ہے جسے اشوک نے پندرتھن میں بسایا تھا۔ یہ اسلام آباد جانے والی سڑک پر واقع ہے۔ وہاں پہاڑ کی ایک جانبی شاخ نیچے اترتی ہوئی آگے نکل کر دریا کے موڑ سے جا ملی ہے۔ اس کی سطح سر سے پیر، جو دریا سے کوئی اسی فٹ اونچا ہے، ایک عظیم ایک سنگی تنگم کے آثار ہیں۔ بالکل نیچے دریا کا ایک با تمکین موڑ ہے۔ اپریل کی ایک شام کو جب میں وہاں گیا تو میں نے اس بلند سطح مرتفع سے دریا کے دو چمکیلے ٹکڑوں کی طرف دیکھا۔ ان کے کناروں پر شاداب ہری گھاس تھی اور نئے پتوں والے حسین بید اور سفیدے اوپر جھکے ہوئے تھے۔ مخالف کنارے پر گیہوں کے کھیتوں کا رنگ شوخ زمردیں تھا اور رائی کے چمکیلے زرد اور السی کے نوخیز کھیتوں سے، جن کے درمیان قرمزی کو کنار بکھرے ہوئے تھے، رنگی تضاد کا اثر پیدا ہو رہا تھا۔ تمام وادی میں جا بجا بید اور اونچے چناروں کے جھنڈوں میں نیم پوشیدہ، خوشنما بستیاں تھیں۔ حالیہ سیلابوں سے درمیانی فاصلے میں جھیل سماں کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ دائیں طرف تخت سلیمان پر بنا ہوا مندر منظر کی ایک حسین خصوصیت تھا، اور وہاں سے بائیں طرف دور تک خوابناک برفانی پہاڑ ایک مکمل نیم دائرہ بنائے کھڑے تھے۔ سورج سر پر تھا تو وہ دھندلے نظر آ رہے تھے مگر جب شام کے سورج کی پوری روشنی ان پر پڑی تو وہ سفید اور واضح ہو گئے۔ عبادت کے لئے اس سے موزوں جگہ ملنا مشکل ہے۔

وسط گرما میں وادی کشمیر غالباً اپنی سب سے کم دلچسپ حالت میں ہوتی ہے۔ برف پہاڑوں سے تقریباً پگھل چکی ہوتی، پہاڑ خود اکثر گرمی کی دھند یا دھول میں اوجھل، ثمر دار درخت پھولوں سے خالی، زرد رائی اور نیلی السی کے کھیتوں میں نام کو پھول نہیں اور دھان کی سبزی میں وہ تازگی نہیں۔ گہرے سبز اور پھیکے رنگوں کی بھرمار، موسم حبس آلود رہتا ہے۔ درجۂ حرارت سائے میں نوے یا ننانوے ڈگری تک، طبیعت میں بھاری پن اور الکساہٹ سی، مچھروں کے غول کے غول۔ جو لوگ جا سکتے ہیں وہ جون کے آخر تک گلمرگ، لدر وادی میں پہلگام، سندھ میں سونامرگ، گورائس اور متعدد دیگر خنک کوہستانی تفریح گاہوں کو چلے جاتے

لیکن ستمبر کے آغاز میں وادی کی دلکشی بھی لوٹ آتی ہے اور سیاح بھی۔ بارشوں سے فضا تازہ اور خنک ہو جاتی ہے۔ یہ بارشیں وادی میں کم مگر اردگرد کے پہاڑوں پر اکثر زور سے برستی ہیں۔ اکثر دو تین میل تک پھیلے ہوئے دھان کے پکے کھیت سبز اور زرد رنگ کی وسعت دکھاتے ہیں۔ گاؤں، جو سچ تو یہ ہے قریب سے گندے اور بھونڈے نظر آتے ہیں، اپنے چناروں، بیدوں، سفیدوں، اخروٹ اور شہتوت کے درختوں کی آغوش میں معلوم ہوتا تھا کہ دھان کے سمندر میں دلفریب جزیرے ہیں۔ مویشیوں کے گلے چشموں کے سرسبز کناروں پر اور تالابوں کے پاس اور تر دلدلوں میں گھٹنوں گھٹنوں پانی میں گھاس چرتے پھرتے ہیں۔

دن کے وقت دھوپ اب بھی بہت گرم تھی اور آسمان بالعموم روشن اور صاف رہتا تھا لیکن مون سون اکثر ایک دو آخری کاشوں سے باز نہیں آتی۔ ایک ایسے ہی دن میں نے ننگا پربت کو پیر پنجال کے پیچھے سے پچیس یا تیس ہزار فٹ بلند ہوتے دیکھا۔ ہلکے نیلے آسمان کے پس منظر کے آگے اس کے ڈوبتے سورج

سے ڈھلے ہوئے مغربی کنارے صاف اور واضح نمایاں تھے لیکن اس کا مرکزی دل تاریک، مبہم اور معدوم رہا۔ کبھی کبھی گھٹا میں سے بجلی کا کوندا لپکتا اور ڈوبتے سورج سے دور شمالی جانب کے بعید پہاڑوں تک پہنچنے کی بے فائدہ کوشش میں وادی کے اوپر لمبی لمبی ڈراؤنی بانہیں پھیلا رہی تھی۔ ان زبردست طوفانی میناروں کے سامنے بڑے بڑے پہاڑ بھی پست قد اور ننھے معلوم ہوتے تھے۔ یہ گویا اس عظیم الشان فطری نظام کا جو بحر ... سے پانیوں کو ہمالہ پر لاکر برساتا ہے، مظاہرہ اور آخری کوشش تھی۔ طوفانی گھٹا کے پیچھے آسمان، گویا موسم ... ختم ہونے کے تشکر میں، بے حد صاف اور پرسکون تھا اور چاند کسی خلل کے بغیر دھیرے دھیرے اطمینان سے آسمان میں بلند ہوا۔

اور اب برسات کے ختم ہوتے ہی تقریباً سبھی ... رُت کا آغاز ہوا۔ جس میں موسم بہار کی ترو تازگی تو واقعی نہ تھی لیکن مسلسل چمک دمک اور روشنی رہنے کا زیادہ یقین تھا۔ ہوا میں زیادہ زور اور دم خم تھا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ برگ و بار کے رنگ میں وہ تابش اور شدت تھی جو کشمیر کی خزاں کو بے نظیر بنا دیتی ہے۔ اکتوبر کا آخر ہوتے ہوتے چناروں کے عظیم منبروں کا ہر رنگ آہستہ آہستہ مرجھاتا ہوا لال، زرد اور ارغوانی رنگ اور ان رنگوں کے ہر درمیانی روپ میں تبدیل ہو گیا۔ سفیدوں، شہتوتوں اور اخروٹوں میں سے ہر ایک نے خزانی حسن میں اپنی اپنی طرف سے اضافہ کیا۔ وادی اور دریا کے کنارے اس فاخرہ رنگ آرائی سے جگمگا اٹھے اور بہار کے خوبصورت ہوتے ہوئے بھی میرا یہ دل چاہا کہ اس روشن خزانی دن کو کہیں زیادہ نفیس طور پر حسین سمجھوں جب ہم اپنے ہاؤس بوٹ میں بیٹھ کر دریا کے بہاؤ کے ساتھ بہہ چلے تھے جب دریا کے کنارے تمام چنار انتہائی شوخ اور بے حد متنوع رنگ آرائی سے سجے کھڑے تھے، جب پہاڑوں پر گری ہوئی اولیں تازہ برف چمکیلی دھوپ میں جگمگا رہی تھی، اور فضا پر ... کا آسودہ احساس طاری و ساری تھا کہ یہ کسی طوفانی موسم سے گھڑی دو گھڑی کے چھٹکارے کا سرسری وقفہ نہیں بلکہ دنوں اور ہفتوں تک ایسی جگمگاتی دھوپ، ایسے صاف نیلے آسمان اور ہوا میں روز بروز بڑھتی ہوئی خنکی، تازگی اور تیزی کی امید کی جا سکتی ہے۔

دریا کے دھوپ میں چمکتے ہوئے بڑے بڑے موڑ ... نظر آ رہے تھے جیسے ... خزانی ... کا ... حسین تھے۔ سندھ دریا کے سنگم پر واقع شادی پور، جہاں ایک جزیرے پر چھوٹا سا مندر ہے اور ... بید ... اس کنارے ... آب ... ہوئے ہیں۔ ایسا خواب معلوم ہوتا تھا جو تمام حسین ترین چیزوں کے ملاپ سے بنا ہوا ہو۔ پہاڑوں میں نگینے کی مانند جڑی مانس بل جھیل بہت تازہ اور گہری اور صاف جس کے کناروں پر ابھی لال اور ارغوانی پتیوں والے چناروں کی روشیں اور جھنڈ ہیں جن کی سطح پر ... پیر پنجال کے سفید برفانی سلسلے کا عکس پڑتا ہے، کشمیر کا سب سے کامل گوہر تھی۔ یہ سب ایسے خوب صورت مناظر ہیں جو بیان نہیں ہو سکتے۔ خواہ کوئی کچھ ہی کہے اور حقیقت ہمیشہ تصور سے زیادہ حسین رہے گی۔

یہ موسم شکاریوں کے لئے بھی سب سے زیادہ پرلطف ہوتا ہے کیونکہ اب دور افتادہ سائبیریا سے آنے والی مرغابیاں اور ... ہندوستان جاتے ہوئے کچھ دیر کے لئے یہاں کی جھیلوں اور دلدلوں میں اتر پڑتی ہیں۔ موسم بہار میں مرغابی کے شکار کا میں پہلے ذکر کر چکا۔ خزاں میں شکار اور بھی عمدہ ہوتا ہے کیونکہ مرغابیاں تازہ دم اور ... واپسی کی اڑانوں کی نسبت تعداد میں زیادہ ہوتی ہیں۔ مرغابی کے شکار کے لئے ہوکرسر جھیل اور دلدل سے بہتر جگہ دنیا میں نہیں۔ ۱۹۰۸ء میں یہیں لارڈ منٹو اور ان کی پارٹی نے ایک دن میں ڈیڑھ ہزار مرغابیاں ماری تھیں۔

پچھلے سال ہم نے چار اکتوبر کو پہلا شکار کیا۔ ہم گاڑی میں بیٹھ کر صبح کی تازہ ہوا اور چمکیلی دھوپ میں روانہ ہوئے۔ چھ میل کا فاصلہ طے کر کے جھیل کے کنارے پہنچے جہاں شکاری اور کشتی بان ہمارے منتظر تھے۔ نرسلوں اور پانی کی کھلی وسعت کے پرے احاطہ کرنے والے دور افتادہ پہاڑوں کا وہ سلسلہ کا نظارہ تھا جسے میں بیان کر چکا ہوں۔ اس وقت نچلے ڈھلان سرخی مائل گلابی رنگ کے تھے جو پہاڑی سلسلے کے زیادہ بعید اور بلند حصے کے شوخ اور گہرے نیلگوں رنگ میں جذب ہو گیا تھا۔ آسمان کی دھندلی نیلاہٹ

اور روشنی کے گدلا سے بادلوں کی وجہ سے منظر میں خوابناک انداز پیدا ہو گیا تھا۔ پانی پر اور نرسلوں میں کئی قسم کی آبی پرندے کلیلیں کر رہے تھے۔ سطح آب پر جگہ جگہ متعدد گول چپٹی پتیوں اور شوخ زرد مرکزوں والے بالکل سفید مومی کنولوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔

ان سب میں سے بڑی تیزی سے کشتیاں کھیتے ہوئے ہم شکارگاہوں کی طرف گئے جو بڑی احتیاط سے نرسلوں میں چھپی ہوئی تھیں اور وہاں جھاڑیوں، ٹنڈوں اور جھنگوں کے جھنڈوں میں سے بنے کمین گاہ کے شکاری کے پیچھے فجر کا انتظار کرنے لگے۔ دھوپ نام کو نہ تھی، سرد، بے القطل، خوابناک اور خاموش سی رات تھی، بس مچھلیوں کی پھڑپھڑاہٹ تھی یا کبھی کبھار مرغابیاں، جو بغیر کسی شبہ کے جھیل پر تیر رہی تھیں، آوازیں کر اٹھتی تھیں۔

آخر دور سے فیر کی آواز آئی، اور پھر ایک دبی دبی گرج جیسے کہیں دور فاصلہ پر موجیں ٹکرا رہی ہوں۔ پھر چند منٹ ہی گزرے تھے ادھر سے ایک سیاہ بادل اٹھا اور تیزی سے ہماری طرف بڑھنے لگا۔ شور بڑھتا گیا اور چند لمحوں میں تمام آسمان چکر کھاتی، سائیں سائیں کرتی، ارتاٹے بھرتی مرغابیوں سے بھر گیا۔ تعداد میں ہزاروں ہی ہوں گی۔ نہ جانے ان کن جھنڈوں میں نہایت تیزی سے کبھی دائیں سے بائیں .... کبھی بائیں سے دائیں کبھی آگے اور پیچھے، کبھی پیچھے اور آگے اڑ رہی تھیں۔ ایک لمحے ..... کے لئے تو ہم بالکل ششدر رہ گئے۔ ایسی سائیں سائیں اور پھڑپھڑاہٹ تھی کہ نشانہ باندھنا ناممکن تھا۔ پھر جب پہلی دیوانہ وار اڑان ختم ہوئی تو اطمینان سے نشست باندھنا آسان ہو گیا اور میرے ساتھیوں کی بندوقیں یکے بعد دیگرے مرغابیاں گرانے لگیں۔

کوئی بیس منٹ بعد ہنگامہ فرو ہوا۔ دور مرغابیوں کے جھنڈ بلندی پر اڑتے نظر آ رہے تھے لیکن کوئی قریب نہ آیا۔ ایک کاہلانہ وقفہ شروع ہوا۔ سورج غیر متوقع طور پر آگ برسانے لگا۔ پسینہ سر اور گردن سے نیچے بہنے لگا۔ لال اور نیلے، چھوٹے اور بڑے ٹڈے، جن کے پر باریک اور شفاف تھے

جھپٹے تھے، خاموشی سے مگر تیزی سے نرسلوں میں اڑتے پھر رہے تھے۔ وقتاً فوقتاً جھینگروں کی سیٹیاں، چڑیوں کی چہچہاہٹ، ہماری پہنچ سے دور بلندی پر اڑتے ہوئے وحشی مرغابیوں کی سائیں سائیں، آغاز کی پکار اور دور کہیں بندوق کی ٹھائیں اس سکوت کو توڑ دیتی۔ ورنہ ہر چیز پر خوابناک دوپہر کا سکوت مسلط تھا۔ پھر یکایک مرغابیوں کے جھرمٹوں کا ایک اور سلسلہ شائیں شائیں کرتا پاس آیا اور ہم بھی بندوقیں لئے جتنی تیزی سے ممکن ہوا داغنے لگے۔ پھر ایک وقفہ آیا۔ اس کے بعد اور جھنڈ اڑتے آئے اور تمام دن یہی ہوتا رہا۔ جیسا کہ پہلے طے ہو چکا تھا ڈیڑھ بجے ہم کھانا کھانے اور مرغابیوں کو اترنے کا موقع دینے کے لئے رک گئے اور پھر رات ہونے تک شکار کھیلتے رہے۔ جب دن ڈھلا تو دیکھا ریذیڈنسی سرجن کرنل ہڈورڈز دو سو، اور دوسرے لوگ بھی سو سو مرغابیوں سے کافی زیادہ مار چکے تھے۔

اس وقت سے لے کر ہر مہینے تین چار دن اس مشہور جھیل پر مرغابی کا شکار جاری رہتا ہے۔ موسم اب بتدریج ٹھنڈا ہوتا گیا حتیٰ کہ دسمبر میں سوکھا سی پالا پڑنے لگا۔ درختوں سے اب سارے پتے جھڑ گئے، گھاس مرجھا کر بھوری ہو گئی لیکن دن تقریباً ہمیشہ صاف اور غیر مکدر ہوتے اور گو صبح دم دبیز برف اور برف کی ہی پتلی قلمیں موجود ہوتیں دس گیارہ بجے تک سائے کے باہر کہیں برف کا نشان تک نہ رہتا۔ فضا خوشگوار طور پر گرم رہنے لگی اور ہوا شاذ و نادر ہی چلتی۔

کرسمس کے بعد موسم میں تبدیلی واقع ہوئی۔ بدلیاں گھمنڈنے لگیں اور بارش یا برفباری ہونے لگی۔ جنوری اور فروری سال کے بدترین مہینے ہیں۔

گزشتہ سال وادی سے رخصت ہونے سے ذرا پہلے میں نے کشمیری بارہ سنگھا مارنے کی ایک دفعہ اور کوشش کی۔ سری نگر سے ... میل دور وادی کے شمال میں، دریا کے کنارے ہمارا چھوٹا سا پڑاؤ تھا۔ گرمیوں میں وہ بڑا حسین مقام تھا جب پانی پر گھنی چھاؤں تھی، ہر پائے کنارے سرسبز اور شاداب تھے اور دریا لبالب تھا؛ مگر اب درخت ننگے کھڑے تھے، کنارے کچھ اجاڑ

تھے اور پانی تہائی پایاب تھا اور وہ عجیب دلچسپ نظام معلوم ہو رہا تھا۔ یہ بھی کہ مطلع ابر آلود تھا اور بارش کے آثار تھے۔ جو عورتیں دریا پر پانی بھرنے آئی تھیں، ان کی رنگت زرد تھی اور وہ کانپ رہی تھیں۔ ہمارے نوکر سردی کے مارے سکڑے بیٹھے تھے۔ وادی میں شمال سے چلنے والی سرد ہوا سیٹیاں بجا رہی تھی اور بلند تر کوہساروں پر برف گرنے کی دھمکیاں دے رہی تھی۔

بالکل اسی چیز کی مجھے ضرورت تھی۔ تاکہ اگلے دن جب میں شکار کو نکلوں تو برفباری کی وجہ سے بارہ سنگھے ذرا نیچے کی چوٹیوں پر اتر چکے ہوں۔ لہٰذا میں صبح چار بجے اٹھا اور ڈٹ کر ناشتہ کرنے کے بعد اپنے وفادار سکین سر بہ فلک ٹٹو پر سوار ہو۔ ایک رہنما کو ساتھ لیے برفانی نگر جان بخش ہوا اور تاریکی میں سات میل طے کر کے پہاڑیوں کے دامن میں جا پہنچا جہاں دو شکاری میرے منتظر تھے۔

اپنے طبقے کے افراد کی طرح وہ سخت جان، مستعد پہاڑ کے پہلوؤں پر فطرت اور جنگلی جانوروں کے ساتھ رہنے اور جو کھم اور گرمی سردی جھیلنے کے عادی تھے۔ وہ عیار شہریوں اور بستیوں میں رہنے والے کابلوں سے بالکل مختلف تھے۔ رحیم شیخ، میر شکاری، بوڑھا کر بڑے بالوں والا آدمی تھا جس کی آنکھیں تیز اور دوربین کا طرح مضبوط اور وضع گھمبیر و متین تھی جیسے کہ اس کی زندگی کا پیشہ بہت سنجیدہ درجہ رکھتا ہو۔ یہ درحقیقت، جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے۔ ہندوستان بھر کے میر شکاریوں کی خاص صفت ہے۔ والئ ریاست کے ذہنی ریاستوں کے دوروں پر میں کبھی یہ فیصلہ نہ کر سکا۔ کہ میر شکاری اور یورپی باورچی میں سے کون خود کو زیادہ اہم سمجھتا ہے۔ والئ ریاست اور ریذیڈنٹ ان دونوں کی نظر میں نیچے ہوتے ہیں جن کے ناز اٹھانے پڑتے ہیں جن کا دل بہلانا اور خاطر تواضع کرنی پڑتی ہے۔

چونکہ میں میر شکاریوں کے نقطہ نظر سے آگاہ تھا اس لئے میں نے خود کو طفلانہ مگر بے محل اعتماد کے ساتھ اس کے حوالے کر دیا لیکن افسوس! بلند تر پہاڑوں پر برفباری نہیں ہوئی تھی۔ بادل چھٹ گئے تھے اور بارہ سنگھے ضرور ابھی دور دراز چوٹیوں پر رہ گئے ہوں گے جو کئی میل دور اور ہزاروں فٹ بلند تھیں۔ دو دن کی سخت چڑھائی اور نہایت احتیاط جستجو کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

نومبر ۱۹۶۰ء

تیسرے دن صبح سویرے اُٹھ کر خیمے سے باہر جھانکا تو آسمان بالکل صاف نظر آیا۔ اور زمین پر پالے کی موٹی تہہ جمی ہوئی تھی۔ ہوا میں کیسی خنکی تھی۔ حرارت پیما سولہ فارن ہائیٹ پر تھا اور دریا کے چمکیلے ٹکڑے کے اُس پار صاف نیلے آسمان تک آگئے۔ پہاڑوں کا ایک گلابی پہاڑی سلسلہ بہت واضح نظر آرہا تھا ٹٹو پر سوار ہوکر میں اس جگمگاتی دھوپ میں ایک اور پہاڑی کے پہلو کی طرف روانہ ہوا جو نو میل دور تھی۔ صبح کی برف سماں ٹھنڈی ہوا نے پہلے تو میرے کانوں اور انگلیوں کو شل کر دیا لیکن ٹٹو کو سرپٹ دوڑانے سے خون جلد ہی میری رگوں میں جھنجھنا کر گردش کرنے لگا ایک گھنٹے سے کچھ ہی زیادہ وقت میں میں دو ماہر شکاریوں سے جا ملا۔ رُک کر پہاڑ کے پہلو پر تیز نظریں ڈالتے ہوئے انہوں نے مجھے بتایا کہ دو بارہ سنگھے اور سات ہرنیاں انہوں نے دیکھے ہیں، گو بارہ سنگھے دونوں چھوٹے چھوٹے تھے۔

میں نے اتر کر جب اس شریر چھوٹے تبتی ٹٹو کو چھوڑا تو اس کا سر گھاس کے ایک گچھے میں خوب گھسا ہوا تھا۔ پھر میں نے ایک قلی ساتھ لے کر جس نے میری دوربین، اوور کوٹ اور رائفل اٹھا رکھی تھی، پہاڑی پر چڑھنا شروع کیا۔ ایسی آب و ہوا میں آدمی جلد ہی چاق چوبند ہو جاتا ہے۔ مجھے نکلے ہوئے یہ تیسرا دن تھا اور اب میں پہاڑوں پر تقریباً اتنی ہی آسانی سے چڑھ رہا تھا جتنی آسانی سے خود شکاری چڑھا کرتا ہے۔ پہلے دن جو کام قطعاً جانفشانی کے برابر تھا وہ اب مشکل محسوس ہونے والی زحمت تھا جس بڑھتی ہوئی پھرتی سے میں پہاڑ پر چڑھ رہا تھا اس میں غالباً بارہ سنگھا سے کی توقع کا ہاتھ بھی تھا۔ بہرحال، اپنا کوٹ اتار کر، کیونکہ چڑھائی کی مشقت اور تیز دھوپ کی وجہ سے اب واقعی گرمی لگ رہی تھی۔ میں چڑھائی کو محسوس کئے بغیر ہی کوہ کی چوٹی پر پہنچ گیا جو وادی سے تین ہزار فٹ اونچی تھی۔

مخالف سمت میں ہمارے قدموں تلے، ایک چھوٹی آرام دہ جانی وادی تھی جہاں چناروں اور شہتوتوں کی چھاؤں میں قریے آباد تھے۔ ہمارے پیچھے اصل عریض وادی تھی جس میں بڑا دریا بہتا جا رہا تھا اور دور فاصلے پر پیر پنجال کے سنگلاخ پہاڑ دوپہر ..... کی دھوپ میں چمک رہے تھے

منظر کمال کا تھا۔ لیکن بارہ سنگھے اب بھی نظر نہ آئے۔ اندھیرا چھانے تک ہم پہاڑ کے پہلو پر دوڑتے دھوپتے رہے لیکن بارہ سنگھوں کے قدموں کے نشانوں کے سوا، یا شاید وہ ہرنیوں کے ہوں، کچھ دکھائی نہ دیا۔ جو بلند تر پہاڑوں کی طرف جا رہے تھے۔ پھر مجھے گلگت کے طویل سفر کی تیاری کرنے کے لئے جلدی جلدی پڑاؤ اور اگلے دن سری نگر کو لوٹنا پڑا۔

موسموں کا دور تمام ہوا، اور بہار، گرما، خزاں اور سردی کے بدلتے ہوئے حالات میں وادی کی کیفیت کا بیان ہو چکا۔

ترجمہ محمد سلیم الرحمٰن

کشمیر نمبر کے بعد

۶ مارچ ۱۹۶۰ء

کا "نصرت" شائع نہیں ہوگا

تاکہ آپ کو کشمیر نمبر کے مطالعے کی مہلت مل جائے

شہنشاہ جہانگیر

کشمیر کے واقعات

کشمیر کے حالات

کشمیر چوتھی اقلیم میں واقع ہے۔ اس کا عرض خط استوا سے پینتیس درجے ہے اور طول جزائر سفید سے ایک سو پانچ درجے۔ زمانہ قدیم میں یہ ملک راجوں کے زیر حکومت رہا ہے جن کی مجموعی مدت حکومت چار ہزار سال بنتی ہے۔ ان راجوں کے نام اور حالات زندگی تاریخ راجہ ترنگ (راج ترنگنی) میں جو حضرت عرش آشیانی (شہنشاہ اکبر) کے حکم سے ہندی سے فارسی میں ترجمہ کی گئی تھی، تفصیل کے ساتھ موجود ہیں۔ سن سات سو بارہ ہجری میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہونے پر یہ خطہ اسلامی برکات سے فیض یاب ہونا شروع ہوا جس کے بعد دو سو بیاسی سال تک بتیس مسلمان حکمرانوں نے حکومت کی۔ یہاں تک کہ نو سو چورانوے ۹۹۴ ہجری میں حضرت عرش آشیانی نے اسے فتح کیا۔ جب سے لے کر اب تک جب کہ تینتیس سال کا عرصہ ہوتا ہے، یہ ہماری سلطنت کے امراء کے زیر انتظام رہا ہے۔ اس کا طول بھولباس گھاٹی سے نیچے تک چھپن کوس جہانگیری ہے۔ عرض ستائیس کوس سے زیادہ اور دس کوس سے کم نہیں ہے۔ شیخ ابوالفضل نے اکبر نامہ میں محض قیاس سے لکھا ہے کہ کشمیر کا طول دریائے کشن گنگا سے لے کر اجبا تک ایک سو بیس کوس ہے اور عرض دس سے کم اور پچیس کوس سے زیادہ نہیں ہے۔ میں نے اپنے اطمینان و یقین کے لیے تجربہ کار لوگوں کے ایک گروہ کو پیمائش کرنے کے لیے حکم دیا تاکہ حقیقت حال پوری طرح سے معلوم ہو کر تحریر کر دی جائے۔ چنانچہ معلوم ہوا کہ طول، جس کو شیخ نے ایک سو بیس کوس لکھا ہے، سڑسٹھ کوس ہے۔ لیکن چونکہ یہ امر مسلمہ ہے کہ ملک کی حد وہاں تک ہوتی ہے جہاں تک کہ لوگ اس ملک کی زبان میں گفتگو کرتے ہوں۔ اس لیے بھولباس سے جو دریائے کشن گنگا سے گیارہ کوس اس طرف ہے، کشمیر کی سرحد مقرر ہوئی اور اس لحاظ سے چھپن کوس ہی بنتا ہے۔ عرض کے سلسلے میں شیخ کے بیان میں دو کوس سے زیادہ کا فرق نہیں نکلا۔ میرے عہد حکومت میں کوس کی جو پیمائش ہے جو حضرت عرش آشیانی نے مقرر کی تھی یعنی ہر کوس پانچ ہزار گز، ہر گز دو گز شرعی کے مطابق ہے جو چوبیس انگلیوں کے برابر ہوتا ہے۔ میں جہاں بھی کوس یا گز کا ذکر کرتا ہوں میری مراد اسی کوس اور گز سے ہوتی ہے جو رائج ہے۔

شہر کا نام سری نگر ہے۔ دریائے بہٹ (جہلم) اس کے وسط میں سے گزرتا ہے۔ اس دریا کا سرچشمہ جسے ویرناگ کہتے ہیں، شہر کے جنوب میں چودہ کوس (اب یہ فاصلہ اسلام آباد اور ڈورو کے راستے سے چوالیس میل ہے) کے فاصلے پر ہے۔ وہاں میرے حکم سے ایک عمارت اور باغ بنایا گیا ہے۔ اس دریا پر شہر میں لکڑی اور پتھر سے چار نہایت مضبوط پل بنائے گئے ہیں، جن پر سے لوگ آسانی کے ساتھ گزرتے ہیں۔ پل کو کشمیری زبان میں کدل کہتے ہیں۔ شہر میں ایک نہایت عالی شان مسجد ہے، جسے ۷۹۵ ہجری میں سلطان سکندر نے تعمیر کروایا تھا۔ یہ ایک عرصے کے بعد جل گئی تھی تو سلطان حسین نے اسے تعمیر کروانا شروع کیا تھا لیکن اس کی حیات نے وفا نہ کی جس کی وجہ سے اس کی تکمیل اس کے وزیر ابراہیم باکری نے ۹۰۹ ہجری میں کی۔ جب سے لے کر اب تک ایک سو بیس سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اس کا طول محراب سے لے کر اس کی مشرقی دیوار تک ایک سو پینتالیس گز اور عرض ایک سو چوالیس گز ہے، جس میں چار طاق بنائے گئے ہیں اور اطراف کے ایوانوں اور ستونوں پر اعلیٰ درجے کے نقش و نگار بنائے گئے ہیں۔ سچ بات تو یہ ہے کہ کشمیر کے سابقہ حکمرانوں کی اس سے بہتر اور کوئی یادگار باقی نہیں رہی ہے۔

میر سید علی ہمدانی قدس سرہ کچھ عرصہ اس شہر میں رہے تھے۔ ان کی یادگار کے طور پر ایک خانقاہ شہر میں موجود ہے۔ شہر سے متصل دو بڑے بڑے تالاب ہیں جو تمام سال پانی سے بھرے رہتے ہیں اور پانی کا ذائقہ قطعاً نہیں بدلتا۔ لوگوں کی آمد و رفت

اور غلہ، بندھن وغیرہ کے لانے اور لے جانے کا دارومدار کشتیوں پر ہے۔ شہر درپرگنات میں پانچ ہزار سات سو کشتیاں ہیں اور سات ہزار چار سو ملاح۔ اس ولایت کے اڑتیس پرگنے ہیں جن کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ بالائی حصہ آمراج اور نشیبی ادھر کا حصہ کامراج کہلاتا ہے۔ یہاں زمین کی ضابطہ بندی اور لین دین میں روپیہ دام اشرفی کو کام میں لانے کا رواج عام نہیں ہے۔ تمام اشیاء اجناس کی قیمت کا تعین دھان کے ڈھیروں سے کرتے ہیں اور ہر ڈھیر (خروار) تین من آٹھ سیر کا ہوتا ہے۔ کشمیریوں کا ایک من دو سیر کا ہوتا ہے اور اپنے چار من کو ہم آٹھ سیر کے برابر ہوتا ہے۔ ایک ترک کہتے ہیں اس کے محصولات کی کل آمدنی تیس لاکھ تریسٹھ ہزار پچاس خروار (ڈھیر) ہے جو نقد کے لحاظ سے سات کروڑ چھیالیس لاکھ ستر ہزار دام بنتی ہے؟ اس لیے یہ ولایت موجودہ ضابطے کے مطابق آٹھ ہزار پانچ سو سواروں کے منصب کی جاگیر ہے۔ کشمیر کا راستہ دشوار گذار ہے۔ نسبتاً سب سے سہل رستہ بھمبر اور پکھلی کا ہے۔ بھمبر کا راستہ اگرچہ زیادہ نزدیک ہے لیکن اگر کوئی شخص کشمیر کے موسم بہار سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہو تو اس کے لیے پکھلی کا راستہ بہتر ہے کیونکہ دوسرے راستے موسم بہار میں برف سے اٹے ہوئے ہوتے ہیں۔

اگر کشمیر کی تعریف و توصیف کما حقہٗ کی جائے تو کئی کتابوں میں پوری ہو۔ مجبوراً اس کی خصوصیات مختصراً تحریر کرتا ہوں۔

کشمیر ایک سدا بہار باغ ہے یا یوں کہیے کہ ایک فولادی قلعہ ہے جس کو کوئی زوال نہیں۔ بادشاہوں کے لیے ایک عشرت فزا گلشن اور درویشوں کے لیے دلکشا خلوت۔ ایسے ہے جہاں خوشنما چمن و دلکش آبشار بے شمار اور دریا و چشمہ حد حساب سے باہر ہیں۔ جہاں تک نگاہ کام کرتی ہے سبزہ اور آب رواں ہی دکھائی دیتا ہے۔ گلاب، بنفشہ اور خودرو نرگس صحرا صحرا کھلتے ہیں۔ پھولوں کی اقسام لاتعداد ہیں۔ کوہ و دشت شگوفوں سے مالا مال ہیں۔ گھروں میں در و دیوار و بام پر کھلے ہوئے گل لالہ بہار کا منظر پیش کرتے ہیں تو ہموار مرغزاروں اور سرسبز لہلہاتے پھولوں کی لطافت الفاظ میں سما نہیں سکتی۔

شدہ جلوہ گر نازنینان باغ
رخ آراستہ ہر یکی چوں چراغ

(باغ کے نازک اندام خوب رو (پھول) جلوہ افروز ہو گئے ہیں)

غزل خوانی بلبل صبح خیز
تماشائے نظارگان کردہ تیز

(نغمہ سحر گاہی چھیڑتے ہوئے بلبل کی دلکش صدا نے مےکشوں کی خواہش مے کشی کو بھڑکا دیا ہے)

بہ چشمہ منقار بط آب گیر
چوں مقراض زریں بقطع حریر

(بطخ چشمے کے صاف و شفاف پانی میں اپنی منقار یوں ڈبو رہی ہے جیسے حریری پارچہ پر سنہری قینچی چل رہی ہو)

بساط گل و سبزہ گلشن شدہ
چراغ گل از باد روشن شدہ

(گلشن نے سبزہ و گل کا فرش بچھایا ہوا ہے اور پھولوں کے چراغ ہوا نے روشن کیے ہیں)

بنفشہ سر زلف را خم زدہ
گرہ در دل غنچہ محکم زدہ

(بنفشہ نے اپنی زلفوں کو خم دے کر غنچوں کے دلوں پر اپنی کشش کی بندھن مضبوط کر دی ہے)

بادام اور آڑو کے شگوفے یہاں کے بہترین شگوفوں میں سے ہیں۔ دوسرے علاقوں میں یہ شگوفے ماہ اسفندارمذ کی پہلی تاریخ سے پھوٹنا شروع ہوتے ہیں لیکن کشمیر میں ماہ فروری کے آغاز اور سری نگر میں فروری کی نویں دسویں تاریخ سے یہ شگوفے چنبیلی کھلنے کا موسم شروع ہونے تک درختوں پر دکھائی دیتے ہیں۔ میں نے والد بزرگوار کی معیت میں کشمیر کے زعفران زاروں کی سیر موسم خزاں میں متعدد مرتبہ کی ہے۔ بحمد اللہ کہ اس مرتبہ اس خطہ کو بھری بہار میں دیکھنے کا موقع ملا۔ اس کے موسم خزاں کی خوبیاں خزاں آنے پر بیان کروں گا۔ کشمیر کی عمارتیں لکڑی سے تعمیر کی جاتی ہیں اور دو دو، تین تین، چار چار منزلہ ہوتی ہیں، جن کی چھتوں پر لپائی کر کے لالہ چوغاشی

والے بیام کے پھول اگائے جاتے ہیں، جو سال کے سال موسم بہار میں کھل کر نہایت خوشنما معلوم ہوتے ہیں۔ چھتوں پر پھول اگانے کا یہ طریقہ صرف اہل کشمیر ہی کا ہے۔ اس سال دولت خانے کے باغیچہ اور جامع مسجد کی چھت پر گل لالہ بکثرت کھلے ہوئے تھے۔ یاسمن کبود باغات میں کثرت سے ہوتا ہے۔ سفید یاسمن جسے اہل ہند چنبیلی کہتے ہیں، خوشبودار ہوتا ہے۔ ایک اور قسم کا چنبیلی کا پھول صندل کے رنگ کا ہوتا ہے جس کی خوشبو نہایت تیز ہوتی ہے۔ یہ پھول صرف کشمیر میں پایا جاتا ہے۔ گلاب کے چار پانچ قسم کے دیکھنے میں آئے۔ لیکن ان میں سے صرف ایک قسم کا پھول خوشبودار ہوتا ہے۔ گلاب کی طرح کا ایک اور قسم کا پھول ہوتا ہے جس کا رنگ صندل کی طرح اور خوشبو نہایت نفیس و لطیف ہوتی ہے۔ اس کا تنہ بھی گلاب کے تنے کی طرح ہوتا ہے۔ سوسن کے پھول دو طرح کے ملتے ہیں۔ ایک تو وہ جو باغات میں ہیں۔ یہ نہایت شاداب ہیں اور ان کا رنگ سبز ہے۔ دوسرے وہ جو صحرائی ہیں ان کا رنگ پھیکا ہے لیکن یہ نہایت درجے کے خوشبودار ہیں۔ گل جعفری بڑا اور خوشبودار ہوتا ہے۔ اس کا پودا قد آدم سے بھی اونچا ہو جاتا ہے لیکن بعض سالوں میں جب گل جعفری کا پودا پوری طرح سے پرورش پا کر پھول دیتا ہے، تو اس میں ایک قسم کا کیڑا پیدا ہو جاتا ہے۔ جو اس کے پودوں کو مکڑی کی طرح جالا بن کر ضائع کر دیتا ہے اور اس کے تنے کو خشک کر دیتا ہے اس سال بھی ایسا ہی ہوا۔ کشمیر کے ییلاقات (گرمی گزارنے کے محلات) میں جو جو پھول میری نظر سے گزرے ہیں ان کی قسمیں گنتی سے باہر ہیں۔ ان میں سے جن پھولوں کی نادر العصر استاد منصور نقاش نے تصویریں بنائی ہیں سو سے زائد اقسام کے ہیں۔ یہاں عرش آشیانی کے عہد حکومت سے قبل شاہ آلو قطعاً نہیں ہوتا تھا۔ محمد قلی افشار نے کابل سے لا کر پیوند لگا دیے۔ اب تک ان میں سے دس پندرہ کے قریب بار ور ہو چکے ہیں۔ خوبانیوں کے پیوند لگے ہوئے درخت بھی معدودے چند تھے۔ موصوف نے ہی پیوند لگانے کا طریقہ یہاں عام کیا۔ اب یہاں خوبانی کثرت سے اور فی الواقع بہت خوب ہوتی ہے۔ کابل کے باغ شہر آرا میں میرزائی نام کا خوبانی کا ایک بہت عمدہ درخت تھا۔ جب میں نے اس درخت کی خوبانی کھائی تھی تو مجھے محسوس ہوا تھا کہ میں نے اس سے قبل اتنی اچھی خوبانی نہیں کھائی تھی۔ کشمیر میں اس جیسے کئی درخت ہیں۔ یہاں کی ناشپاتی نہایت اعلیٰ قسم کی ہوتی ہے۔ یہ کابل و بدخشاں کی ناشپاتی سے بہتر اور تقریباً سمرقند کی ناشپاتی کی طرح ہے۔ یہاں کا سیب اپنی عمدگی کے لیے مشہور ہے۔ امرود درمیانے درجے کا ہوتا ہے۔ انگور کثرت سے ہوتا ہے لیکن اس کی بیشتر قسمیں کھٹی اور ادنیٰ ہوتی ہیں۔ انار بھی ہوتا ہے لیکن کم مقدار میں۔ تربوز اعلیٰ قسم کا ہوتا ہے۔ خربوزے نہایت میٹھے ہوتے ہیں لیکن پختگی کو پہنچ کر ان میں سے اکثر کیڑے پڑ جانے کی وجہ سے خراب ہو جاتے ہیں، جو خراب ہونے سے بچ جاتے ہیں وہ نہایت عمدہ ہوتے ہیں۔ شاہتوت نہیں ہوتا۔ البتہ توت کی کئی تمام اقسام صحن کے تنوں کا سہارا لے کر انگور کی بیلیں اوپر چڑھی ہوئی ہوتی ہیں۔ توت فراواں ہیں۔ لیکن یہ توت چند توتوں کو چھوڑ کر کھانے کے قابل نہیں ہوتے اور یہ چند قسمیں بھی وہ ہیں جو قلمی ہیں۔ توت کے پتوں کو ریشم کے کیڑوں کو پالنے کے کام میں لایا جاتا ہے اور ریشم کے کیڑوں کے انڈے تبت و گلگت سے لائے جاتے ہیں۔ شراب اور سرکہ یہاں بہت بنتا ہے۔ لیکن یہ شراب ذائقہ میں ترش اور ادنیٰ درجے کی ہوتی ہے کشمیری زبان میں مس کہلاتی ہے۔ کئی پیالے پینے کے بعد سرور پیدا کرتی ہے۔ سرکہ سے کئی اقسام کے اچار بنائے ہیں۔ چونکہ یہاں اچھی قسم کا لہسن پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے اچاروں میں بہترین اچار لہسن کا بنتا ہے۔ یہاں چنے کو چھوڑ کر تمام اقسام کے غلہ جات کی فصل ہوتی ہے جب چنے کی کاشت کرتے ہیں تو پہلے سال اچھی فصل ہوتی ہے، دوسرے سال ادنیٰ درجے کے چنے پیدا ہوتے اور تیسرے سال تو اس قدر خراب ہوتے ہیں کہ کلاؤ (مونگ) کی طرح سے دکھائی دیتے ہیں۔ چاول کی پیداوار تمام دیگر غلہ جات سے زیادہ ہے۔ اغلباً تمام غلہ جات کو ملا کر مجموعی پیداوار تین حصے چاول اور ایک حصہ دیگر غلہ جات پر مشتمل ہے۔ کشمیریوں کی بنیادی غذا چاول ہے، لیکن یہاں چاول ادنیٰ درجے کا ہوتا ہے۔ اس کا خشکہ بنا کر سرد کر کے کھاتے ہیں اور اسے بھتہ کہتے ہیں۔ کھانا گرم گرم کھانے کا رواج نہیں ہے، بلکہ غریب لوگ تو اس کا ایک حصہ رات کے وقت کھا کر دوسرا حصہ دوسرے دن کھانے کے لیے رکھ چھوڑتے ہیں۔ نمک ہندوستان سے آتا ہے بھتہ میں نمک نہیں ڈالتے البتہ سبزی کو پانی میں ابال کر خوش ذائقہ بنانے کے

اس میں تھوڑا سا نمک ڈال دیتے ہیں۔ اور بتھ کے ساتھ کھاتے ہیں جو لوگ خوش حال ہوتے ہیں اور اس کا اظہار کرنا چاہتے ہیں وہ سبزی میں تھوڑا سا روغن یا روغن ڈال دیتے ہیں۔ لیکن چار مغز کے اس تیل سے کھانا جلد ہی کڑوا اور بدمزہ ہو جاتا ہے۔ گھی بھی بتھ میں ڈال دیتے ہیں، لیکن وہ بھی کھانے کو بدمزہ کر دیتا ہے لیکن اگر مکھن سے تازہ تازہ گھی بنا کر استعمال کریں تو ایسا نہیں ہوتا۔ تازہ بنے ہوئے گھی کو کشمیری میں سداپک کہتے ہیں۔ یہ گھی ہوائے سخت سرد و مرطوب ہونے کی وجہ سے تین چار روز کے بعد خراب ہو جاتا ہے۔ بھینس اس علاقے میں نہیں ہوتی۔ گائے بھی چھوٹی اور ادنیٰ قسم کی ہوتی ہے گیہوں کے دانے پتلے ہوتے ہیں۔ نان کھانے کا یہاں رواج نہیں ہے۔ دنبوں کی چکی نہیں ہوتی اور یہ پہاڑی دنبوں کی طرح سے ہوتے ہیں جسے ہندوستانی ہندو کہتے ہیں۔ اس کا گوشت لطیف و خوش ذائقہ ہوتا ہے۔ مرغ، قاز، مرغابی اور سویہ کثرت سے ہوتا ہے۔ مچھلیاں چھلکے دار اور بغیر چھلکے دار دونوں قسم کی ملتی ہیں۔ لوگ ادنیٰ درجے کے پشمینے سے جسے پٹو کہتے ہیں، کرتہ بنوا کر پہنتے ہیں پٹو کے سلسلے میں ان کا نظریہ یہ ہے کہ اس کے بغیر ہوا سے بچنا محال اور ہاضمہ کا صحیح رکھنا ناممکن ہے۔ یہاں کی بنی ہوئی پشمینہ کی شال، جس کا نام حضرت عرش آشیانی (شہنشاہ اکبر) نے پرم نرم رکھا ہے، انتہائی مشہور ہونے کی وجہ سے محتاج تعریف نہیں ہے۔ ایک اور قسم کا پشمینہ بنایا جاتا ہے، جسے ترمہ کہتے ہیں۔ یہ شال زیادہ موٹا اور ملائم تر ہوتا ہے درمہ نام کا پشمینہ بھی بنتا ہے۔ جو گدھوں اور کتوں کا جھول بنانے اور فرش پر ڈالنے کے مصرف میں آتا ہے۔ شال کو چھوڑ کر باقی جتنے پشمینے ہیں تبت کے پشمینوں سے بہتر نہیں ہیں شال تبت کی شال سے بہتر ہے۔ حالانکہ اس کے لیے اون تبت سے منگوائی جاتی ہے۔ کیونکہ تبتی اس اون سے شال نہیں بنا سکتے۔ اس شال کی اون ایک ایسی بکری سے حاصل ہوتی ہے جو فقط تبت ہی میں پائی جاتی ہے۔ کشمیر میں شال کی اون سے اعلیٰ درجے کے پٹو بھی بنتے ہیں اور دو شالوں کو ایک دوسرے کے ساتھ رفو کر کے بانات کی طرح ملتے ہیں، جس کے بعد بارش کے لیے بھی کارآمد ہو جاتا ہے کشمیر کے لوگ داڑھی منڈواتے ہیں اور گول دستار پہنتے ہیں۔ عوام الناس عورتوں میں صاف اور دھلا ہوا کپڑا پہننے کا رواج نہیں ہے۔ وہ پٹو کا ایک ہی کرتا بنوا کر تین چار سال تک مسلسل پہنتی ہیں پٹو کو بغیر دھوئے ہوئے جلاہے کے ہاں سے لے آتی ہیں اور کرتہ سی کر پہن لیتی ہیں جب تک یہ کرتہ پھٹ نہیں جاتا پانی کا منہ نہیں دیکھتا۔ پاجامہ پہننا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ کرتا کھلا اور سر سے پاؤں تک لمبا ہوتا ہے، جسے کمر کے مقام پر کمر بند سے باندھ لیتی ہیں۔ اگرچہ اکثر لوگوں کے گھر دریا کے کنارے واقع ہوئے ہیں۔ مگر پانی کا ایک قطرہ بھی نہانے کے مصرف میں نہیں لاتے۔ جیسے ظاہر میں غلیظ ہیں ویسا ہی ان کا باطن بھی غلیظ و گندہ ہے۔ اہل حرفت و صنعت میرزا حیدر کے زمانے میں بہت زیادہ تعداد میں یہاں آکر آباد ہوئے اور فن موسیقی میں ترقی ہو کر کمانچہ، جنتر، قانون، چنگ، دف اور بانسری (سازوں) کا رواج ہوا۔ اس سے قبل فقط کمانچہ کی طرح کا ایک ساز یہاں رائج تھا۔ کشمیری زبان کے نغمے ہندی راگوں کے سروں میں گائے جاتے تھے۔ وہ بھی دو تین سروں میں بلکہ اور اکثر ایک ہی لے میں۔ سچ بات تو یہ ہے کہ کشمیر کی رونق بڑھانے میں میرزا حیدر نے جو خدمات سرانجام دی ہیں اس کی وجہ سے اس کے بہت سے حقوق ہیں۔ حضرت عرش آشیانی کے عہد سلطنت سے پہلے یہاں کے لوگوں کی سواری کا انحصار گونٹ پر تھا۔ یہاں کے گھوڑے بڑے قد و جثہ کے نہیں ہوتے تھے البتہ باہر کے ملکوں سے یہاں کے حکام کے لیے بطور تحفہ عراقی اور ترکی گھوڑے لائے جاتے تھے۔ گونٹ پستہ قد گھوڑے کو کہتے ہیں جو ہندوستان کے دیگر پہاڑی علاقوں میں بھی پایا جاتا ہے خصوصاً اس کی وہ قسمیں جن کو تنگرہ اور شخ جلو کہتے ہیں جب یہ خداداد سرزمین گلشن آئین شہنشاہ اکبر کے زیر نگیں آئی تو انہوں نے بہت سے قبائلی امراء کو یہاں جاگیریں عنایت کر کے عراقی اور ترکی گھوڑوں کے گلے نسل بڑھانے کے لیے عنایت کیے۔ ان کے سپاہیوں نے بھی اپنی طرف سے اپنے لیے ایسے انتظامات کیے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی عرصے میں کشمیر میں اعلیٰ قسم کے گھوڑے ملنے لگے جیسا کہ اب گھوڑے کی قیمت دو تین سو روپے تو عام ہے اور ہزار روپے کی قیمت کا گھوڑا بھی ملتا ہے۔ لوگ سوداگر اور زراعت پیشہ ہیں۔ اکثریت کا مذہب سنت والجماعت ہے۔ سپاہی پیشہ لوگ امامیہ شیعہ ہیں۔ ایک گروہ نوربخشی فرقہ سے تعلق رکھتا ہے

فقراء کا طبقہ بھی پایا جاتا ہے جنہیں ریشی کہتے ہیں، یہ اہل علم و معرفت ہوتے ہیں لیکن سادگی و بے ریائی کی زندگی بسر کرنے میں کسی کی برابری نہیں کرتے، طلب دنیا سے کنارہ کش رہتے ہیں، گوشت نہیں کھاتے شادی نہیں کرتے اور صحراؤں میں پھل دینے والے درختوں کے نہال لگاتے رہتے ہیں اور محض اس خیال سے کہ لوگ ان درختوں کے پھلوں سے بہرہ ور ہوں خود ان کے پھلوں سے حظ اندوز نہیں ہوتے اس طبقے کے افراد کی تعداد دو ہزار ہوگی۔ برہمن لوگ بھی جو اس ملک کے قدیمی باشندے ہیں، یہاں موجود ہیں۔ یہ عام کشمیری زبان میں گفتگو کرتے ہیں اور ظاہری وضع و اطوار میں مسلمانوں سے مختلف نہیں معلوم ہوتے لیکن ان کی کتابیں سنسکرت میں ہیں۔ سنسکرت پڑھتے ہیں اور بت پرستی کی تمام رسوم بجا لاتے ہیں۔

جیسا کہ ہند کے دانشور سنسکرت زبان میں اپنی تصانیف لکھتے ہیں اور اس زبان کو مقدس سمجھتے ہیں۔ یہاں ظہور اسلام سے قبل کے تعمیر کیے ہوئے عالی شان بتکدے ابھی تک اپنی جگہ پر قائم ہیں جن کی تشکیل میں فرش سے لے کر چھت تک تیس تیس چالیس چالیس گز کے پتھر کام میں لائے گئے ہیں۔ شہر سے متصل ایک پہاڑی ہے، جسے کوہ ماران کہا جاتا ہے۔ اسے ہری پربت بھی کہتے ہیں مشرقی سمت میں کوہ ڈل واقع ہے، جس کا گھیر ساڑھے چھ کوس سے کچھ زیادہ ہے۔ حضرت عرش آشیانی (شہنشاہ اکبر) کے عہد میں ان کے حکم سے یہاں پتھر اور چونے سے ایک نہایت مضبوط محکم قلعے کی تعمیر شروع کی گئی تھی۔ جو مجھ نیازمند کے عہد حکومت میں قریب الاختتام ہے۔ یہ قلعہ اتنا بڑا ہے کہ پہاڑی اس کے اندر آگئی ہے اور قلعے کی دیوار اس کے گردا گرد تعمیر ہوئی ہے۔ اس پہاڑی کے ساتھ جو ڈل تھا وہ اب قلعے سے متصل ہے جس کے رخ پر دولت خانہ بنایا گیا ہے اس دولت خانے کے اندر باغیچہ لگایا گیا ہے، جس کے درمیان ایک چھوٹی سی عمارت بنائی گئی ہے، جہاں میرے والد بزرگوار اپنے قیام کشمیر کے زمانے میں اکثر و بیشتر بیٹھا کرتے تھے۔ یہ عمارت میری اس مرتبہ کی سیر کشمیر میں سخت بے رونق نظر آئی چونکہ ان کی نشیمن گاہ مجھ نیازمند کے لیے سجدہ گاہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لیے یہ بے رونقی پسند نہیں آئی اور میں نے معتمد خان کو جو میرے مزاج دان ملازموں

یہ بہت ہے، انتہائی توجہ کے ساتھ باغیچہ کو نئے سرے سے ترتیب دینے اور ان عمارتوں کی انتہائی موزوں مرمت کرانے کا حکم دیا۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ میں اس کے حسن اہتمام سے باغیچہ و عمارت میں نئی آب و تاب پیدا کی گئی۔ تین قطعات پر مشتمل تین گز اونچا چبوترہ تعمیر کر کے باغیچہ کی آرائش میں اضافہ کیا گیا اور عمارت کو نئے سرے سے تعمیر کر کے نادرہ روزگار مصوروں کی نقاشی سے نگارخانۂ چین بنا دیا گیا ہے۔ اب میں نے اس باغیچہ کا نام نور افزا رکھ دیا ہے۔

جمعہ ۵ ماہ فروردین کو تبت کے راجہ کی طرف سے پیش کش کے طور پر بھیجی ہوئی زد قطاس گائیں میری نظر سے گزاری گئیں۔ یہ شباہت اور جثے میں بھینس سے ملتی ہیں۔ جسم بالوں سے بھرے ہوئے ہیں جو سرد مقامات کے حیوانات کا خاصہ ہے، اس کے برعکس ان بکرے جو گرم پہاڑی علاقہ ہے، ایک پہاڑی بکرا لایا گیا تھا جو نہایت خوبصورت تھا۔ لیکن اس کے جسم پر بال کم تھے۔ اس کو ہندوستان کشمیر میں سرد اور برفانی علاقہ ہونے کی وجہ سے جتنے بھی حیوانات پائے جاتے ہیں بالوں سے ڈھکے ہوئے اور بدوضع ہوتے ہیں۔ کشمیری پہاڑی بکرے کو کیپل کہتے ہیں۔

انہیں دنوں ایک آہوئے ختن بھی بطور پیش کش لایا گیا۔ چونکہ میں نے اس قسم کے ہرن کا گوشت اس سے قبل نہیں کھایا تھا اس لئے حکم دے کر اس کا گوشت پکوایا۔ سخت بدمزہ نکلا کسی بھی جنگلی حیوانات کا گوشت اس قدر بدذائقہ نہیں ہوتا۔ اس ہرن کے نافے میں تازہ حالت میں خوشبو نہیں ہوتی جب یہ کچھ دن کے بعد خشک ہو جاتا ہے تو مہکنے لگتا ہے۔ ہرنی میں نافہ نہیں ہوتا۔

میں پچھلے دو تین دنوں میں اکثر و بیشتر کشتی کی سواری کر کے بہاک اور شالامار کے شگوفہ زاروں کے نظارے سے محظوظ ہوتا رہا۔ بہاک کا پرگنہ کوہ ڈل کے اطراف میں واقع ہے۔ اس طرح سے شالامار کا پرگنہ بھی کوہ ڈل سے متصل ہے، جہاں ایک عمدہ ندی ہے جس کا پانی ڈل سے متصل پہاڑ سے نکل کر ڈل میں مل جاتا ہے۔ میں نے خرم بیٹے کو ہدایت کر کے اس ندی کے راستے میں ایک بند بندھوایا، جس کی وجہ سے یہ ندی ایک ایسے آبشار کی صورت اختیار کر گئی۔ جس کے نظارے سے لطف اٹھایا جا سکتا ہے یہ مقام کشمیر کی عمدہ سیرگاہوں

ہی نشو و نما ہوتا ہے۔

بل تھل درخت اور ایک بہت بڑا چنار

۲۷ ماہ اردی بہشت کو میں شکار کھیلنے کے لیے موضع پانپور گیا جو جیہ لنکا کا آبائی وطن ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ ایک عمدہ مقام اور دلکش سیرگاہ ہے جہاں رواں دواں نہریں اور اعلیٰ درجہ کے چنار کے درخت ہیں۔ میں نے حیدر ملک کی درخواست پر اس موضع کا معائنہ کیا۔ یہاں اس موضع کے راستے میں بل تھل نام کا ایک درخت دکھایا جس کی ایک شاخ کو پکڑ کر جو ہلایا جائے تو پورا درخت ہلنے لگتا ہے۔ عوام کا نظریہ یہ ہے کہ یہ بات صرف اسی درخت کے ساتھ مخصوص ہے۔ لیکن اس گاؤں میں بھی اسی طرح کا ایک درخت نظر آیا جس کی شاخ کو پکڑ کر ہلایا جاتا تھا تو سارا درخت ہلتا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس قسم کی حرکت کسی ایک درخت کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ تمام درختوں کا خاصہ ہے۔

ہندوستان کے رُخ پر سری نگر سے ڈھائی کوس کے فاصلے پر ایک چنار کا درخت ہے جس کا پتہ اندر سے جلا ہوا ہے۔ بیس سال پہلے گھوڑے پر سوار، پانچ دوسرے سواروں جن کے گھوڑوں پر کاٹھیاں کسی ہوئی تھیں اور دو خواجہ سراؤں کے ساتھ اس کے اندر داخل ہو گیا تھا۔ جب سے اس مرتبہ کی سیر کشمیر میں، میں نے جس تقریب میں اس واقعہ کا ذکر کیا تھا لوگوں نے اسے بعید از فہم سمجھا تھا چنانچہ اس دفعہ میں نے ایک بار پھر چند لوگوں کو اس کے اندر مذکورہ طریق سے داخل ہونے کا حکم دیا اور مذکورہ واقعہ بالکل صحیح ثابت ہوا۔ اکبر نامہ میں لکھا ہے کہ حضرت عرش آشیانی نے چونتیس آدمیوں کو اس کے اندر بٹھا کر دیکھا تھا۔

سکہ ناک آبشار

۳ ماہ اردی بہشت کو سکہ ناک آبشار کا نظارہ کرنے گیا۔ یہ ایک نہایت عمدہ ایلاق ہے اور آبشار درے کے وسطی حصے میں اچھی خاصی بلندی سے نیچے گرتا ہے۔ ابھی تک اس کے اطراف میں برف موجود ہے۔ چونکہ یہ جمعرات کا مبارک دن تھا اس لیے روزانہ کی شراب اس

پھولوں سے بھرے ہوئے مقام میں ندی کے کنارے بیٹھ کر پی اور حظ اٹھا کر محظوظ ہوا۔ اس پانی میں ساری کی قسم کا ایک پرندہ نظر آیا۔ ساری تو سیاہ رنگ اور سفید چتیوں والا ہوتا ہے لیکن یہ بلبل کا رنگ اور سفید چتیاں رکھتا ہے۔ پانی میں غوطہ لگاتا ہے اور دیر کے بعد دوسرے مقام پر نمودار ہوتا ہے۔ میں نے اس قسم کے دو تین پرندے پکڑنے کا حکم دیا تاکہ معلوم کر سکوں کہ اس کے پاؤں کی انگلیوں کے درمیان مرغابی کی طرح جھلی موجود ہے اور ایک دوسرے سے متصل ہے یا نہیں اور بصورت دیگر خشکی کے پرندوں کی طرح اس کے پاؤں کی انگلیاں ایک دوسری سے جدا جدا ہیں یا نہیں۔ ان میں سے دو پکڑے گئے۔ ایک اسی وقت مر گیا اور دوسرا ایک دن زندہ رہا۔ پاؤں کی انگلیاں جھلی دار اور دوسرے سے ملی ہوئی نہیں تھیں جیسا کہ مرغابی میں ہوتی ہیں۔ ان دونوں کے یکتا ہونے کی وجہ سے استاد منصور کو اس کی تصویر بنانے کا حکم دیا۔ کشمیری اسے گلکار کہتے ہیں یعنی پانی کا سانپ۔

انشکن اور گلاس

کشمیر میں سب سے پہلے پکنے والا پھل انشکن ہوتا ہے جو ذائقے میں کھٹ میٹھا ہوتا ہے۔ اور حجم میں گلاس سے چھوٹا لیکن گلاس سے زیادہ مزے دار اور لطیف ہوتا ہے۔ شراب کے ساتھ بطور نقل گلاس کو تین چار دانوں سے زیادہ نہیں کھا سکتے جبکہ انشکن کے سو دانے بطور گزک ایک دن رات میں شوق سے کھائے جا سکتے ہیں۔ خاص طور پر قیمتی انشکن۔ میں نے حکم دیا کہ آئندہ اسے خوش رنگ کہا جائے۔ یہ پھل عام طور پر کوہستان بدخشاں اور خراساں میں ہوتا ہے۔ وہاں کے لوگ اسے بجمد کہتے ہیں۔ اس کا جو سب سے بڑا دانہ تھا میں نے تلوایا تو آدھے مثقال (سوا دو ماشے) کا نکلا۔

۶ ماہ اردی بہشت کو گلاس کے دانے درختوں پر چنے کے دانوں کے برابر ہو گئے۔ ستائیس اردی بہشت کو ان میں رنگ آنا شروع ہو گیا اور ۱۵ ماہ خرداد کو پکنے پر اتروا کر کھائے گئے۔ مجھے گلاس بہت سے پھلوں کے مقابلے میں زیادہ پسند ہے۔ اس کے چار درخت باغ نورافزا میں بارآور ہوئے ہیں۔ میں نے ان میں سے ایک کا نام شیریں بار، دوسرے کا خوشگوار، تیسرے کا جس پر سب سے زیادہ پھل لگے ہوئے تھے،

پر بار اور چھوٹے تھے کہ جس پر سبب سے کہ گلاس تھے، کم بانام رکھا بزم (شاہجہانی)، کیمگھر کے باغیچہ میں بن گلاس کے ایک درخت پر پھل پک گئے تھے۔ میں نے اس کا نام شاہوار رکھا۔ اس باغیچہ میں گلاس کا ایک بوٹا بھی لگا ہوا تھا۔ اسے میں نے نوربار کا نام دیا۔ میں روزانہ گلاس کی اتنی مقدار جو شراب کے ساتھ بطور نقل کھائی جا سکے اپنے ہاتھ سے چنتا ہوں۔ اگرچہ کابل کا گلاس بھی ڈاک چوکی کے ذریعے پہنچ رہا ہے لیکن گھر کے باغیچہ میں اپنے ہاتھ سے تازہ تازہ چننے کا لطف ہی کچھ اور ہے۔ کشمیر کے گلاس کابل کے گلاس سے کم تر درجے کے نہیں ہوتے بلکہ ان سے کچھ بڑے ہی ہوتے ہیں۔ میں نے ان میں سے سب سے بڑے دانے کو تلوایا تو ایک ٹانک اور پانچ سرخ کا نکلا۔

ایلاق (گرمی گزارنے کا شاہی محل)، توسی مرگ

پیر شانزدہ تیر ماہ الٰہی کو ایلاق توسی مرگ کی سیر کرنے کے لیے روانہ ہوا۔ راستے میں دو مرتبہ قیام اور کوچ کرنے گھاٹی کی چڑھائی کے مقام تک پہنچا۔ ۱۸ کو گھاٹی کی دو کوس کی سخت چڑھائی طے کر کے اوپر پہنچا اور وہاں سے مزید ایک کوس کا نشیبی راستہ طے کر کے مذکورہ ایلاق تک پہنچ گیا۔ راستے میں اگرچہ جگہ جگہ رنگارنگ پھولوں سے بھرے ہوئے قطعات نظر آئے لیکن جس طرح ان کی تعریف سنی تھی اور ذہن میں ان کے متعلق جس قسم کا تصور بندھا تھا اس کے مطابق انہیں نہیں پایا۔

جمعرات ۱۸ تیر ماہ الٰہی کو ایلاق کے نزدیک ایک نہایت خوش منظر درے کا نظارہ کرنے گیا جس کے شگفتہ پھولوں کی نہایت تعریف سنی تھی۔ یہ گلپوش درہ بلا شبہ اس قابل ہے کہ اس کی بڑھ چڑھ کر تعریف کی جائے۔ جہاں تک نظر کام کرتی تھی رنگارنگ پھول دکھائی دیتے تھے۔ اپنے حضور میں پچاس قسموں کے پھول چنوائے، ممکن ہے کہ اور اقسام کے پھول بھی ہوں، جو نظر سے اوجھل رہ گئے ہوں۔ دن ڈھلے ایلاق کی طرف لوٹ آیا۔

منگل ۸ ماہ امرداد کو ایلاق کوری مرگ کو دیکھنے گیا، کیونکہ متعدد مرتبہ اس کی تعریف سننے کی وجہ سے ان دنوں اسے دیکھنے کی خواہش بڑھ گئی تھی۔ اس کی خوبی حد تعریف سے باہر ہے۔ جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی رنگ رنگ اور قسم قسم کے پھول ہی پھول دکھائی دیتے تھے اور سبزہ و گل کے درمیان ندیوں میں صاف و شفاف پانی رواں دواں تھا۔ گویا یہ نقاش فطرت کے سحر نگار موقلم سے بنا ہوا ایک ایسا مرقع تصویر تھا جس کے دیکھنے سے دلوں کی کلیاں کھل جائیں۔ بلا شبہ اس ایلاق سے دوسرے ایلاقات کو کوئی نسبت نہیں ہے اسے کشمیر کی بہترین تفریح گاہ کہا جا سکتا ہے۔

ہندوستان میں پپیہا نام کا ایک خوش الحان پرندہ ہوتا ہے جو برسات کے موسم میں دلگداز لے میں گاتا ہے اور کوئل کی طرح سے اپنے انڈے کوے کے گھونسلے میں رکھ دیتا ہے جنہیں کوا اپنے انڈے سمجھ کر سیتا اور بچے نکالتا ہے۔ میں نے کشمیر میں دیکھا کہ پپیہے نے اپنے انڈے ڈومنی کے گھونسلے میں رکھے، جن سے ڈومنی نے بچے نکال کر ان کی پرورش کی

کشمیر کے صوبیدار دلاور خاں کی وفات

بدھ ۱۸ ماہ شہریور کو دلاور خاں کاکڑ وفات پا گیا۔ وہ قبیلہ اور برادری رکھنے والے امرا میں سے تھا۔ اس کی ذات میں شجاعت کے ساتھ ساتھ امارت اور فوجی مہارت کی صفات بھی مجتمع ہو گئی تھیں۔ اس نے میری شاہزادگی کے زمانے میں میری ملازمت اختیار کی تھی اور اپنے حسن خلوص و جوہر قابلیت کی بدولت اپنے تمام ساتھیوں سے آگے بڑھ کر امارت کے درجے تک پہنچ گیا تھا۔ اس کی عمر کے آخری حصے میں اللہ تعالیٰ نے اسے حق نمک ادا کرنے کی توفیق بخشی یعنی اس نے اپنی ہمت کے بل بوتے پر کشتواڑ کو فتح کرنے کی نمایاں خدمت سرانجام دی۔ اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت کرے۔ میں نے اس کے بیٹوں اور گھرانے کے دوسرے لوگوں کو طرح طرح کے الطاف و اکرام سے نوازتے ہوئے ان میں سے جو جو منصب پانے کے قابل تھے انہیں مناصب دے کر امرائے دربار کی صف میں شامل کیا اور باقی ماندوں کو حکم دیا کہ جس طرح سے وہ مرحوم کے ساتھ وابستہ تھے اسی طرح اس کے بیٹوں کے ساتھ وابستہ رہیں تاکہ اس کے متوسلین بکھر نہ جائیں۔

جمعرات ۱۹ ماہ شہریور کو کشمیریوں نے دریائے جہلم کے دونوں کناروں پر چراغاں کیا۔ یہ رسم یہاں بہت پرانی ہے۔ ہر سال اسی دن ہر وہ شخص جس کا گھر اس دریا کے کنارے ہے، امیر ہو یا غریب،

شب برات کی طرح سے چراغاں کرتا ہے۔ میں نے برہمنوں سے اس رسم کا سبب دریافت کیا تو انھوں نے بتایا کہ زمانہ قدیم میں اسی تاریخ کو دریا کا سرچشمہ دریافت ہوا تھا، اس لیے جب سے لے کر آج تک ہر سال اسی دن یہ جشن منایا جاتا ہے اور اسے "وتھ ترواہ" کہا جاتا ہے۔ یہ جشن منانے کی تاریخ تیرہ شوال ہے۔ وتھ کے معنی جہلم کے ہیں اور ترواہ تیرہ کو کہتے ہیں۔ یہ چراغاں بلاشبہ بہت عمدہ تھا۔ میں کشتی کی سواری کر کے سیر و نظارہ سے خوش ہوا۔

کشمیر کے چند پرندے

۱۰ ماہ شہریور کو [illegible] تالاب میں مرغابیاں نمودار ہوئیں اور [illegible] شہریور کو [illegible] نظر آنے لگیں لیکن کشمیر میں جو پرندے ملتے ہیں وہ یہ ہیں کلنگ، سارس، طاؤس، چرز، لگلگ، قمری، فاختہ، [illegible] تلیر، نقرہ، بلچام، لیلورہ، حواصل، مکش، [illegible]، دراج، شارک، [illegible]، بوبل، [illegible]، کوئل، شارق، [illegible] بیدانہ نام رکھا ہے۔ مجھے مذکورہ بالا پرندوں میں سے بعض کے نام فارسی میں معلوم نہیں تھے کیونکہ ولایت (ماوراء النہر) میں نہیں ہوتے۔ اسی لیے میں نے ان کے ہندی نام لکھے ہیں۔ وہ چرند اور پرندے جو کشمیر میں نہیں پائے جاتے ہیں: زرد رنگ کا شیر، چیتا، [illegible] یا جنگلی بھینس، لال ہرن، [illegible]، بارہ سنگھا، نیل گائے، گورخر، بن بلاؤ، جنگلی بلی، چھچھوندر، گوہ اور جنگلی [illegible]۔

ویرناگ (ویری ناگ)

منگل ۱۳ ماہ شہریور کو ہم نے اچھول (اچھہ بل) کے سرچشمہ پر منزل کی۔ اس چشمہ کا پانی اس (ویرناگ) سے زیادہ ہے۔ یہاں ایک عمدہ آبشار بھی ہے جس کے دونوں طرف چنار اور سفیدار کے عمدہ موزوں درخت کھڑے ہیں، جن کی شاخیں اور پتے ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہیں۔ یہاں موقع و محل کے مطابق دلکش نشیمن ترتیب دیے گئے ہیں، جن کے مقابل میں گل جعفری سے [illegible] پاکیزہ باغیچہ ہے گویا جنت کا ایک ٹکڑا لا کر یہاں رکھ دیا گیا ہے۔

بدھ ۱۰ ماہ کو اچھول سے کوچ کیا اور ویرناگ سرچشمہ کے نزدیک پہنچ کر پڑاؤ ڈالا۔

جمعرات [illegible] ماہ کو ویرناگ سرچشمہ کے کنارے پر خوشی کی محفل قائم کی اور مقربین کو بیٹھنے کا حکم دے کر جام شراب مرحمت کیے جن کے ساتھ کبابوں سے [illegible] ہوئے تھے بطور نقل عنایت کیے۔ شام تک محفل رہی جس کے بعد یہ تمام مست و سرشار اپنی اپنی قیام گاہ کو چلے گئے۔

یہ چشمہ دریائے بہت (جہلم) کا دہانہ ہے اور ایک ایسے پہاڑ کے دامن میں واقع ہے جو لاتعداد گھنے درختوں اور بے اندازہ سبزہ زار سے ڈھکا ہوا ہے۔ میں نے اپنی شاہزادگی کے زمانے میں اس مقام کی نشان کے مطابق ایک عمارت تعمیر کرنے کا حکم دیا تھا جو ان دنوں تکمیل کو پہنچ گئی ہے۔ اس کا حوض ہشت پہلو اور ہر پہلو چالیس چالیس گز کا ہے۔ گہرائی چودہ گز ہے۔ پانی پہاڑ پر اگے ہوئے سبزہ زار کے عکس سے سبز نظر دکھائی دیتا ہے جس میں بے شمار مچھلیاں تیرتی ہیں۔ حوض کے اردگرد گنبد نما ایوان اور عمارت کے سامنے باغ بنایا گیا ہے جس کے دروازے سے لے کر حوض تک ایک آبجو بنائی گئی ہے جو چار گز چوڑی ایک سو اسی گز لمبی اور دو گز گہری ہے۔ اس کے دونوں طرف خیابان ہیں جن کے فرش میں پتھر لگائے گئے ہیں۔ حوض کا پانی اس قدر صاف و شفاف ہے کہ چار گز کی گہرائی کے باوجود اگر تہ میں چنے کا دانہ بھی پڑا ہوا ہو تو دکھائی دیتا ہے۔ آبجو اور چشمہ کے نیچے اگے ہوئے سبزہ و گیاہ کی لطافت کے متعلق کیا لکھوں، یا لکھوں کئی قسم کا سبزہ اور چمیلی ایک دوسرے کے ساتھ اگے ہوئے نظر آتے ہیں، جو طاؤس کی دم کی طرح رنگا رنگ ہیں اور پانی کی موج سے متحرک رہتے ہیں۔ ایسے بے نظیر پھول جو جدا جدا کھلے ہوتے ہیں حقیقت میں تمام کشمیر میں اتنی دلکش و دلفریب سیرگاہ کہیں نہیں ہے۔ یہاں آ کر مجھے معلوم ہوا کہ کشمیر میں دریا کے بالائی اطراف سے خوبصورتی میں دریا کے زیریں اطراف کو کوئی نسبت نہیں ہے اور مجھے کچھ دنوں کے لیے ان حدود میں سیر و تماشا کرنا چاہیے تھا اور خوب داد عیش دی جاتی تھی لیکن روانگی کا وقت نزدیک آ پہنچنے اور گھاٹی کے اوپر برف باری شروع ہو جانے کی وجہ سے ٹھہرنے کی گنجائش نہیں تھی۔ مجبوراً [illegible]

کی طرف واپس ہوا اور حکم صادر کیا کہ مذکورہ راستہ کے دونوں طرف درخت لگائے جائیں۔

بعدہٗ ہم [illegible] ماہ کو لولاب پہنچے [illegible] یہ جگہ بھی عمدہ ہے۔ اگرچہ مذکورہ [illegible] کے [illegible] نہیں ہے لیکن اگر یہاں تعمیر و مرمت کا سامان کیا جائے تو یہ جگہ اچھی ہو جائے گی چنانچہ میں نے اس مقام کی موزونیت کے مطابق عمارت [illegible] شروع میں بنے ہوئے [illegible] کی مرمت کرنے کا حکم دیا۔

واپس آتے ہوئے راستے میں ایک ایسے چشمے پر گزر ہوا جسے [illegible] کہا جاتا ہے [illegible] پائی جانے والی مچھلیاں اندھی ہوتی ہیں [illegible] ڈال کر [illegible] آنکھیں [illegible] بھی محسوس ہوتا تھا [illegible] چشمے کے پانی میں مچھلی کو اندھا کر دینے کی خاصیت ہے۔ بہرحال یہ بات بہت عجیب نظر آئی۔

مچھلی شکار کرنے کا ایک نیا طریقہ

ان دنوں مچھلی کا شکار کرنے کا ایک نیا طریقہ دیکھنے میں آیا ہے وہ یہ کہ دریا میں جہاں جہاں پانی زیادہ سے زیادہ آدمی کی چھاتی تک آتا ہے دو کشتیاں اس طرح سے ایک دوسری کے ساتھ [illegible] چلائی جاتی ہیں کہ ان کا ایک سرا ایک دوسرے سے ملا ہوا اور دوسرا ایک دوسرے سے الگ [illegible] دس پندرہ گز کے فاصلہ پر ہوتا ہے۔ دو ملاح لمبی لکڑیاں ہاتھ میں لیے، اس فاصلے کو برقرار رکھنے کے لیے ان دونوں کشتیوں کے [illegible] کناروں پر بیٹھے ہوتے ہیں۔ [illegible] ہوئے سروں کو دو ملاح پکڑ کر پانی میں چلتے ہیں جب مچھلیاں دونوں کشتیوں کے درمیانی فاصلے میں [illegible] راستہ سے [illegible] نکلنے لگتی ہیں تو جو مچھلی جس ملاح کے پاؤں سے ٹکراتی ہے ملاح اسے پکڑنے کے لیے پانی میں ڈبکی لگاتا ہے۔ دوسرا ملاح اپنے دونوں ہاتھ [illegible] کی پشت پر رکھا [illegible] نیچے دبا [illegible] ہاتھ [illegible] دریا سے مچھلی [illegible] اس طریقے میں بعض ملاح [illegible] ماہر ہیں [illegible] دو دو مچھلیاں [illegible] ایک [illegible] دونوں ہاتھوں میں دو مچھلیاں پکڑے ہوئے برآمد ہوتا تھا۔ مچھلی کے شکار کا یہ طریقہ [illegible] علاقے میں دریا کے [illegible] میں رائج ہے۔ ٹھہرے ہوئے پانی [illegible] اس طریق سے شکار نہیں کیا [illegible] کیا جاتا ہے جبکہ اس [illegible] پانی ٹھنڈا ہونے کی وجہ سے تکلیف [illegible] نہیں ہوتا۔

کشمیر سے ہندوستان کی طرف مراجعت

[illegible] ماہ الٰہی کو ایک پہر اور ساڑھے گھڑی رات گئے [illegible] کشمیر سے ہندوستان کی طرف مراجعت [illegible] کے پھول کھلنے شروع ہو گئے تھے اس لیے [illegible]

[illegible] ٹھہرا دیا۔ کشمیر میں ان کاروں سے سو کہیں [illegible] پیدا نہیں ہوتی۔

[illegible] میں رہ گئے اس کی [illegible] کا علاقہ [illegible] ہوتے [illegible] سے [illegible] اس کا چوالا [illegible] گلمرگ [illegible] پھولوں سے [illegible] بناتے ہیں [illegible] خوبصورت ہے [illegible] پر جاتے ہیں [illegible] ہوتی ہے [illegible] اور لطف [illegible] میرے لحاظ سے [illegible] باتیں بھی ہو جاتی ہیں [illegible] قدرتی ماحول [illegible] جاتے ہیں [illegible] طرح پر تبدیلی [illegible] مطابق حاصل کئے [illegible] کشمیر میں نہیں ملتا [illegible] کشمیر کے تحفوں میں [illegible] لگانے کے [illegible] یہاں ہزار [illegible] کاری حیوانات دستیاب [illegible] رہتے ہیں اور [illegible] جاتے ہیں۔ باز [illegible] بھی ملتے ہیں جو [illegible] ہوتے۔

چونکہ [illegible] میں ایک نہایت عمدہ و نایاب قسم کی آبشار کی موجودگی کے متعلق کچھ متعدد مرتبہ ذکر کیا گیا تھا اس لیے [illegible] جا کر [illegible] دیکھنے کے باوجود میں نے [illegible] سے دیکھا۔ واقعی اس کی تعریف حد بیان سے باہر ہے۔ پانی [illegible] مقامات [illegible] کرتے ہوئے نیچے آتا ہے میں نے اتنا اچھا اور اتنا نفیس آبشار اس سے قبل نہیں دیکھا تھا۔ بلا شبہ نہایت نایاب منظر ہے میں نے [illegible] چونکہ [illegible] وقت گزار کر اس کے نظارہ سے دیدہ و دل کو سیراب کیا۔ بارش کے موقع پر اس کا منظر [illegible] ہو جاتا ہے۔ [illegible] کے بعد وہاں سے واپس ہو کر شام کو [illegible] پہنچ گیا۔ یہاں رات بسر کی۔

[illegible] ماہ [illegible] کی کھائی سے اتر کر [illegible] کی کھائی کے اوپر [illegible] راستے کو عبور کرنا اس [illegible] کہ کوئی [illegible] نہیں آ سکتا۔ یہاں پہنچنے سے قبل [illegible] دنوں سے [illegible] برف باری ہو رہی تھی [illegible] ڈھک کر سفید ہو چکے تھے اور راستے میں کئی مقامات پر برف جم [illegible] کی وجہ سے [illegible] پاؤں بڑی مشکل سے [illegible] تھے [illegible] دقت پیش آتی تھی [illegible] اللہ تعالیٰ [illegible] ہوا کہ اس دن برف باری نہیں ہوئی اور [illegible] اچھا ہوا [illegible] اس سے قبل [illegible] گزر چکے تھے کیونکہ جو لوگ پیچھے [illegible] آئے تھے ان سب کو [illegible] پڑا۔

[illegible] ماہ [illegible] کی کھائی سے اتر کر [illegible] کی وجہ سے [illegible] جاتا [illegible]

[illegible] ماہ [illegible] کو [illegible] نزول جلال کیا [illegible] سے [illegible] ایک [illegible] نہایت عمدہ [illegible] ہے۔ جہاں میرے حکم کے مطابق [illegible] ایک تجویزہ تعمیر کیا گیا تھا۔ [illegible] خوش منظر جگہ ہے [illegible] یہاں آنے کی [illegible] ایک [illegible] ہوٹل [illegible] اس ضمن میں [illegible] سلطنت کی یادگار کے طور پر [illegible] والے اس کتبہ پر [illegible] کے نیچے لکھوا [illegible]۔

جمعرات [illegible] ماہ [illegible] کو [illegible] میں قیام کیا۔ [illegible] بہت سے [illegible] نظر آتے تھے۔ لیکن [illegible] اور حیوانات میں نمایاں فرق معلوم ہوتا۔ اور وہ تمام خصوصیات جو [illegible] علاقوں میں پائی جاتی ہیں واضح طور پر دیکھنے میں آئیں۔ یہاں [illegible] اور ہندی دونوں زبانوں میں گفتگو کرتے ہیں۔ [illegible] ان کی اصلی زبان ہے۔ کشمیر کے نزدیک ہونے کی وجہ سے کشمیری زبان بھی سمجھتے ہیں۔ [illegible] یہ کہ یہاں سے ہندوستان شروع ہوتا ہے۔ [illegible] لباس [illegible] اور ہندوستانی عورتوں کی طرح سے ناک میں نتھ پہنتی ہیں۔ [illegible] سلیم [illegible]

میں شاید نیند وادیوں کی خواہش شامل نہ تھی جسمانی طور پر بڑے تنومند ہونے کے باوجود مجھے وہ نہ اتنا نرم و نازک معلوم ہوئے اور مثلاً ہمسایوں سے مختلف ہوتے ۔ دلکش ہونے کے باوجود صحیح معنی میں غارت گر ہیں ۔ [illegible] ہنزہ میں جرم کی وارداتیں تقریباً نہ ہونے کے برابر ہیں ۔

علی آباد کا نوجوان پوسٹ ماسٹر محبوب جس کی سرخ قمیض پتلون سے باہر لٹکی ہوئی تھی ، بڑی لطف آمیز باتوں سے مجھے بلتت اور کریم آباد تک چھوڑنے آیا ۔ یہ سفر کی آخری مسافت تھی ۔ میں نے پوچھا کہ اس نے اتنی اچھی انگریزی بولنی کہاں سے سیکھی ۔

" یہاں ہنزہ میں جناب ہمارے پاس کتابیں آتی ہیں ۔"

" لیکن یہ تو آسان طریقہ نہیں کہ کوئی دوسرا انگریزی بولنے والا پاس نہ ہو ۔ میں سمجھتا ہوں تم نے اور زبانیں اس طرح نہیں سیکھی ہوں گی ؟"

" بے شک سیکھی ہیں جناب ۔ فارسی اور تھوڑی سی پشتو بھی میرا خیال ہے میں انگریزی سے زیادہ اچھی بول لیتا ہوں ۔ اور ظاہر ہے گلگتی اور اردو بھی مجھے آتی ہے ۔ اور جناب ، یہاں ہنزہ میں بہت سی چھوٹی چھوٹی زبانیں ہیں ۔ ان میں سے ایک زبان سیکھنے ایک انگریز کرنیل صاحب یہاں علی آباد آئے تھے ۔ انہوں نے کتاب لکھی تھی ۔ شاید آپ کو ان زبانوں کے نام پتہ نہیں ، بروشسکی وغیرہ ۔"

" تو ان میں سے تمہیں کتنی زبانیں آتی ہیں ؟"

" تین جناب ۔ ظاہر ہے مجھے وہ بچپن سے آتی ہیں ۔"

بلتت کا پرانا محل ، جو ایک شاندار جگہ پر بنا ہوا تھا ، ہماری بائیں طرف استادہ تھا ۔ یہ دیکھ کر افسوس ہوتا تھا کہ میر نے اس میں رہنا ترک کر دیا تھا ۔

پھر گاڑی احاطے میں داخل ہونے پر ایک چوبی محرابی دروازے پر بڑے بڑے حرفوں میں مہمان نوازانہ طور پر " خوش آمدید " لکھا نظر آیا ۔ ایک صاحب جناح کیپ اور عمدہ قطع کا کوٹ اور ٹخنے تک کی شلوار پہنے مسکراتے ہوئے ہمارا استقبال کرنے کو آگے بڑھے ۔ انہوں نے بتایا کہ وہ میر کے بھائی اور ریاست کے معتمد تھے ۔ ان کے اوپر کے دو درمیانی دانت سونے کے تھے ۔

مجھے ایک بے جنگلے کے بیرونی زینے کے راستے دوسری منزل پر پہنچایا گیا ۔ وہاں غازی ملت کرنل میر محمد جمال خاں ، والی ہنزہ ، اپنے مہمان کے منتظر تھے ۔ ان سے دوبارہ مل کر بڑی خوشی ہوئی ۔ وہ خوبصورت ، قد کے بھاری کاٹھی کے جوان سال مرد تھے ۔ انہوں نے شاندار ہنزہ پٹو کا ، جو دنیا کا غالباً بہترین ٹوئیڈ ہوتا ہے ، سوٹ ، بڑے نقش و نگار والی سیاہ اور سفید چمڑے [illegible] کی واسکٹ ، لال لمبی جرابیں ، قمیص ، ایک بڑی [illegible] کی انگوٹھی اور بھاری سی زنجیر والی سنہری رسٹ واچ پہن رکھی تھی ۔

انہوں نے اور ان کے بھائی نے پریشانی کے ساتھ بتایا ، کیونکہ ایشیا میں مہمان نوازی یورپ سے کہیں زیادہ اہم ہے ، کہ میری آمد کی تاریخ کے متعلق افسوسناک طور پر کچھ غلط فہمی ہو گئی تھی ۔ چنانچہ دوسرے مہمان ، جو مجھ سے پہلے آئے تھے ، خود محل کے خاص مہمان خانے میں ٹھہرے ہوئے تھے ۔ یہ بات بہت افسوسناک تھی : محل زیادہ بڑا نہ تھا ، جیسا کہ میں دیکھ سکتا تھا ، اس لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ مجھے ایک ملحق پرانی عمارت میں ٹھہرایا جائے ۔ بدقسمتی سے اسے ابھی یورپی طرز پر آراستہ نہ کیا گیا تھا ، لیکن امید تھی کہ مجھے کوئی خاص تکلیف نہ ہوگی ۔ اگر ذرا سی دقت بھی پیش آئے تو مجھے چاہیئے کہ ازراہ مہربانی میر صاحب کے بھائی کو مطلع کر دوں اور مغربی مذاق کو پورا کرنے کی حتی الامکان کوشش کی جائے گی ۔

بعض اوقات ایشیا میں مہربان میزبان حیران ہوتے ہیں اگر کوئی یورپی ان کے ملک میں پہنچ کر مشرقی طرز زندگی کو آزمانے کا اشتیاق ظاہر کرتا ہے ۔ انہیں یہ یقین مشکل سے آتا ہے کہ ان کا مہمان اپنی خاطر کھانے پینے اور ساز و سامان میں تبدیلی کا واقعی خواہشمند ہے اور ایسی تبدیلی سے اس کا مزا کرکرا ہو جاتا ہے ۔ وہ سمجھتے ہیں کہ مہمان شاید کسی نرالی شائستگی کے مارے ، انہیں تکلیف نہ دینے کی غرض سے ، یہ بہانہ کر رہا ہے ۔

ہنزہ میں کریم آباد محل کے پچھلے حصے میں جو کمرے میرے لئے مخصوص کئے گئے تھے ان کا ایک اپنا انداز تھا ۔ فرش پر متعدد اوپر تلے بچھے ہوئے پر حرارت رنگوں کے غالیچے تھے ۔ بیٹھک کی دیواروں پر بطور تختہ بندی نفیس قسم کے کاشغری قالینوں کے کوئی چالیس فٹ لمبے اور کمر کمر اونچے ٹکڑے لگے ہوئے تھے ۔ وہ زیادہ تر لال رنگ کے تھے اور ان سے ایک ڈیزائن بن گیا تھا ۔ اصل میں

یہ اس زمانے کی یادگار تھے جب کرسیاں استعمال نہ ہوتی تھیں۔ دریچے کے نیچے بیٹھنے والے دیوان سے ٹیک لگاتے تھے۔ تختہ آتش دان پر گلدان رکھے تھے، جن میں چینی انداز جھلکتا تھا۔ وہ یقیناً سنکیانگ سے لائے گئے تھے۔ ایک لال لاکھی سینی تھی، جس پر سنہرے رنگ سے بنی ہوئی تصویریں زور وشور سے چوگان کھیل رہی تھیں۔ قیمتی قالینی حاشیوں کے اوپر دیوار پر گزشتہ میروں اور ان کے اقرباء کے فوٹو ٹنگے ہوئے تھے جو استاد زمانہ سے دھندلا گئے تھے۔ شاہ جارج ششم اور ملکہ الزبتھ کی ایک روغنی تصویر بھی تھی۔ کھلے کمرے میں ایک بڑی بھاری چارپائی پر بستر بچھا ہوا تھا اور ایک پرانے سنہرے اور لال کپڑے کی لاٹونی گڑی ہوئی تھی۔ یہ کاف صفائی میری منتظر تھی۔

رات کے کھانے کے بعد، محل کے بالائی کمرے میں، میر نے ماضی اور حال کے وسط ایشیائی امور پر دلچسپ باتیں کیں۔ میری نگاہ اور کشمیر سے قطع تعلق ہو جانے کے بعد ہنزہ فی الواقع محصور ہو کر رہ گیا تھا۔ تاہم یہ کہ وہ دنیا سے بالکل بے تعلق نہ ہوئے تھے اور انہیں ایک اسلامی ملک یعنی پاکستان کا حصہ ہونے پر مسرت تھی۔ انہیں نیچے کی سے گلگت ہوائی آمد و رفت اور نئی، موجود یا بننے والی، خوب موسمی جیپ سڑکوں کا سہارا تھا۔ لیکن اس سے انکار ممکن نہ تھا کہ حالات تھے عجیب ۱۹۵۰-۵۱ء کے جاڑوں سے وہ کچھ ایسا محسوس کر رہے تھے جیسے کسی جزیرے پر آباد ہوں اور سنکیانگ، جس پر اشتراکیوں کا قبضہ تھا بہت قریب تھا۔

مجھے شاید پتہ نہ تھا کہ ہنزہ کے کشمیر سے اتنے قریبی تعلقات نہ تھے جتنے کہ سنکیانگ سے تھے۔ تجارت کے اہم راستے اسی طرف جاتے تھے۔ دو سال پہلے تک ہنزہ میں تقریباً تمام چاول کاشغر سے آیا کرتا تھا۔ ۱۹۳۵ء تک یا اس کے لگ بھگ چینی سپاہی ہر سال سنکیانگ کے حکام کی طرف سے رسمی تحائف لے کر ہنزہ آیا کرتے تھے۔ اشتراکیوں کی آمد کے بعد سے جو تھوڑی سی اطلاعات انہیں شمالی دروں کے اس طرف سے موصول ہوئی تھیں وہ ناگوار تھیں۔ سنا گیا تھا کہ سر جمہوریت کو سوسو کے گروہوں کو سیاسی بنا پر گولی ماری جاتی ہے۔ پختہ سال نسل اور بہتر خاندانوں کو بظاہر ٹھکانے لگایا جا رہا تھا۔ جلد ہی شاید وہاں نوعمر لوگ رہ جائیں گے جو اسلام سے بے خبر رہ کر اور

اشتراکی عقیدوں پر پروان چڑھیں گے۔

یہ پتہ چلانا مشکل تھا کہ اشتراکی واقعی کتنے طاقتور تھے۔ ہنزہ والے تو بہرصورت چینیوں سے کبھی نہ ڈریں گے۔ لیکن خود وادیٔ کشمیر اتنا سنگین خطرہ اچھی نہ تھا جتنا کہ لداخ کو تھا۔ وہاں کے باشندے، تبتیوں کی طرح، بدھ مت کے پیرو تھے، اور تبت پر اشتراکی قبضہ تھا، اور لداخی بظاہر ابھی سے سری نگر کی شیخ عبداللہ کی حکومت کے خلاف جھنجھلا رہے تھے۔

ہنزہ اور سنکیانگ کے مابین ثقافتی مماثلت دستکاری جیسی چیزوں سے ظاہر ہوتی تھی۔ میر نے ایسا ظاہر کیا کہ میں نے ان کے قالین اور نمدے دیکھ لئے ہوں گے؟ ہنزہ والے کاشغر کی چیزوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ سرینگر کا اثر کم رہا تھا۔ یہی بات کھانوں پر بھی صادق آتی تھی۔ ہنزہ کے معمول خاندان جو کھانے کھاتے تھے وہ کشمیری سے زیادہ کاشغری ہوتے تھے۔ بہت سے چینی کھانے بھی مقبول تھے۔ کیا مجھے کسی طرح مشرقی طباخی سے دلچسپی تھی؟ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ اس پر میر نے کہا کہ وہ میرے جانے سے پہلے اصلی کاشغری کھانا تیار کروائیں گے۔

ایسا ہی ہوا اور کھانا بہت لذیذ تھا ———

اپریل کی دس تاریخ، ایک اور دھندلا دن، ہوا تقریباً بند۔ میں کریم آباد میں اپنے قالینوں سے اٹے کمرے میں بیٹھا لکھ رہا تھا کہ یکایک باہر ہلچل مچی۔ ایک شخص گرجتے شور سے پراگندہ آوازیں بلند تھیں۔ باہر دیکھا تو ایسا معلوم ہوا کہ بلتت محل کے پچھواڑے عظیم ابرپوش سے ایک چھوٹا سا تند طوفان گرد چرخ زن آ رہا ہے۔ فضا چمکاتے ہوئے ذرات سے معمور ہو گئی۔

جلد ہی میرے کمرے کے باہر ٹہنیاں ٹکراتی اور جھکتی ہوئی زمین کو قریب قریب کھرچنے لگیں۔ بلتت وقتی طور پر اندھیرے میں گم ہو گیا۔ چھوٹے چھوٹے سفید گالوں کو اڑتے دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ ساتھ ہی مرے سے گزرنے والی تیز ہوا ایک دم سرد ہو گئی۔

پھر مجھے یاد آیا۔ کچھ دیر پہلے مجھے دور کہیں دھڑاکا ہونے کا ادھورا احساس ہوا تھا۔ اس عظیم گھاٹی کے اوپر بادلوں میں پیشی چوٹیوں پہ اوالانش آیا تھا اور میں اب جو کچھ دیکھ رہا تھا وہ طوفان گرد نہ تھا بلکہ اوالانش کی تباہی ہوئی ہوا تھی جیسے بڑی درشتی سے نیچے

اور لکھنؤ میں منگایا گیا تھا۔ وہی اپنے ساتھ برف کی سلائیں سائیں ریتلی ٹیلیاں بکھرا لائی تھی۔

ہنزہ میں ہر جگہ ہمارا دوستانہ خیر مقدم ہوا۔ دیہاتوں میں چہل قدمی سے نرم دل اور ہنسی اور سچی مسرت کا تماشہ دیکھ کر لوٹتا۔ اس کے علاوہ لوگ ایک اجنبی کے ساتھ بھی فطرتاً اور شگفتہ دلچسپی لیتے۔ بچے خاص طور پر دلپذیر تھے، سلیقہ مند، شوقین، خوبصورت اور ہنس مکھ۔

حسنِ اتفاق جگہ پر بلتت کا چھوٹا سفیدی نما محل واقع تھا اس سے زیادہ پر تجمل نہیں خیال کیا جاتا ہوں گا، مگر وہ تعمیری نقطۂ نظر سے بھی موثر تھا۔ چاہئے اس اثر کا ہی واحد سبب بالائی منزل کے وہ بڑے چوبی باہر کو نکلے ہوئے چھجے ہوں جن پر کندہ کئے ہوئے بڑے بڑے نقشوں کی اڑانیں پڑی ہوئی تھیں۔

اندر ایک تاریک زینہ چھوٹے چھوٹے کمروں کے ایک سلسلے کی طرف جاتا تھا۔ ان کی دیواروں پر تلواریں اور ڈھالیں آویزاں تھیں۔ ان کے بعد خاص کمرے آتے تھے۔ ایک اندرونی کمرے میں چھت میں بنے ہوئے سوراخ سے چوکور روشندان سے دھندلی روشنی آتی رہتی تھی۔ دو چوکیں سے بیٹھے۔ فرش کے وسط میں ایک کھلا آتشدان تھا جس کے گرد آرائشی چوبی کام کی کندہ کاری تھی۔

دوسرے کمرے میں جہاں ایک بڑے باہر کو نکلے دریچے سے روشنی آتی تھی مختلف طرز کی دیواری آرائش تھی۔ کچھ تصویریں تھیں۔ مذہبی ماحول میں آغاخاں، اسماعیلی فرقے کے پیشوا کو، اپنے کنبے کے افراد کے ساتھ دکھایا گیا تھا۔ پھر غیر متوقع طور پر ملکہ وکٹوریہ کی ایک بڑی سی رنگین تصویر نظر آئی۔ قریب سے دیکھنے پر پتہ چلا کہ وہ ۱۸۹۹ء کا کیلنڈر تھا۔

دریچے سے ہم جس وسیع منظر کا نظارہ کر رہے تھے وہ جنوب میں راکاپوشی کے بلند و بالا، برفانی پچیس ہزار پانچ سو فٹ اونچے پہاڑ سے محدود تھا۔ بخطِ مستقیم راکاپوشی ہم سے کوئی بیس میل دور ہوگا۔ اس کی چوٹی بادلوں میں پنہاں تھی لیکن اس کے بیشتر مہیب گلیشیئر اور چٹانیں اب آشکارا تھیں۔ دائیں بائیں دوسری عظیم، بے نام، نیم پنہاں چوٹیاں معلق تھیں اور نیچے دریا تک ڈھلوان ہوتے ہوئے تختہ بہ تختہ گیہوں کے ہرے کھیت کھڑے تھے۔ اور خوبانی کے شگوفے، حیرت انگیز موسمی فراوانی میں، تمام زرخیز علاقے پر ہلکی ارغوانی شکر کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔

یہاں پہنچ کر مجھے ذرا پتہ چلا کہ دیہات کی معیشت میں خوبانی کا کیا حصہ ہے جو علاقہ سات ہزار سے نو ہزار فٹ کی درمیانی بلندی پر ہو اور دریائے سندھ کے معاونوں گلگت، شیوک اور ہنزہ سے سیراب ہوتا ہے۔ اس میں ہر جگہ خوبانی کو قابل ذکر اہمیت حاصل ہے وہاں دوسرے پھل بھی ہوتے ہیں مثلاً سیب، ناشپاتی، آڑو، انار، انگور اور شہتوت مگر خوبانی ہی وہاں کی خاص فصل ہے۔ آب و ہوا اور مٹی کی وجہ سے خوبانی کا پیڑ خوب بڑھتا ہے اور کثرت سے پھل آتا ہے۔

خوبانیوں کو کئی طرح استعمال کرتے ہیں۔ گرمیوں میں تو صرف پکی خوبانیاں کھائی جاتی ہیں۔ دوسرے موسموں میں انہیں سکھا کر کھاتے ہیں اور وہ بہت مزیدار رہتی ہیں۔ لیکن ان کا مغز سب سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔ اسے سخت بادام کی طرح دانتوں سے توڑ کر یا آٹے کی طرح پیس کر موٹی موٹی روٹیاں یا ٹکیاں بنا کر کھاتے ہیں۔ یہ ٹکیاں بھی خوش ذائقہ ہوتی ہیں۔ میرے یہاں ہم انہیں روز کھاتے تھے۔ مغز سے ایک کارآمد تیل بھی نکلتا ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ مغز غیر معمولی طور پر مقوی ہوتا ہے۔ مغز سفر پر لے جانے کے لئے بہت موزوں رہتے ہیں، جس کی میں تصدیق کر سکتا ہوں کیونکہ وہ چکنے اور سخت ہوتے ہیں اس لئے آسانی سے ٹوٹتے یا پسیلے نہیں ہوتے۔

مقامی غذا میں کسی خصوصی عنصر کی موجودگی سے، اور شاید پانی کی کسی خوبی کی وجہ سے، لوگوں کی صحت اچھی اور عمریں طویل ہوتی ہیں۔ اس شام کو بلتت محل سے اترتے ہوئے مجھے ایک چاق و چوبند بوڑھے سے ملایا گیا جس کی چال تیز اور ہاتھ کی گرفت مضبوط تھی۔ میں نے کشمیر کے تاریخی واقعات پر اس سے سوال کئے اور جوابوں سے اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ، جیسا کہ دعویٰ کیا گیا تھا ضرور سو سال کا ہو گا۔ وہ پینسٹھ سال سے زیادہ کا معلوم نہ ہوتا تھا۔ کوہستانی مہمات پر جوان ہنزہ اور نگر والوں کی قوت برداشت کو حیرت انگیز بتایا جاتا ہے۔ شپٹن نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ وہ نیپالی شیرپاؤں سے، جو زیادہ مشہور ہیں، کہیں زیادہ برتر کوہ پیما ہیں۔"

میر پریشان تھے۔

میرے جانے سے دو دن پہلے انہوں نے بادلوں سے ڈھکی

ہوئیوں کو تیوری چڑھا کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں وثوق سے جانتا ہوں کہ یہ بادل ہٹ جائیں گے"

ہم کریم آباد محل کے پاس کھڑے یہ باتیں کر رہے تھے۔ اب کہنے لگے میں تو نہیں سمجھتا۔ میرا مقصد ہے کھیتوں کو سیراب کرنے کے لئے پانی کچھ دھوپ سے ہونا چاہیئے۔"

کیا مطلب؟ میں نے پوچھا۔ میں حیران رہ گیا۔ کھیتوں میں پانی دینے کے لئے دھوپ چاہیئے؟ مجھے معلوم تھا کہ ہنزہ والوں کی زبان تو ہم پہلے سے سمجھتے تھے کہ یہاں موسم سے کوئی پراسرار رشتہ ہے۔ دراصل گرمیوں میں ایک زمین ہماری تخم ریزی ہوا کرتی ہے جس میں ہم ایک خاص لیٹ ڈالتے ہوئے کھیتوں میں سونے کے ذرے ملا دیتے ہیں۔ یہ بات میری سمجھ میں آ گئی۔

"آپ کا مطلب ہے کہ پچھلی سہ پہر سے پنڈت نہرو نے جو بار جہاز نہیں بھیجے؟"

وہ مسکرا دئے۔ یہ ہمارا آپس کا ایک چھوٹا سا لطیفہ تھا۔ میرے یہاں آنے کے تھوڑے عرصے بعد میں نے، ادا کاروں کے دھماکے سے چونک کر، انہیں ہنسایا۔ میں نے کہا معلوم ہوتا ہے کشمیر کی لڑائی دوبارہ شروع ہو گئی ہے اور پوچھا کہ ان کی ہوائی حملے کی پناہ گاہ کہاں تھی۔

انہوں نے سر ہلایا اور مسکرائے "ہاں ہمیں امید رکھنی چاہیئے کہ کل وہ بہت سارے ہوائی جہاز بھیجے گا۔۔۔"

اور ایسا ہی ہوا۔ میرے نگر جانے سے ایک دن پہلے سہ پہر کو، حیرت انگیز طور پر نیلے اور بادلوں سے پاک آسمان تلے، برفانی چوٹیوں سے غیر معمولی طور پر بھاری اور دھیمے دھماکوں کی آوازیں آئیں۔

دھندلے دنوں کا پریشان کن تسلسل آخر ٹوٹ گیا۔ ہنزہ میں موسم بہار میں مطلع کا ابر آلود رہنا خطرناک خشک سالی کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ اس کے برعکس دھوپ نکلتی ہے تو برف پگھلتی ہے اور زبردست ادا کاروں آتے ہیں، اور پھر ظاہر ہے پہاڑی ندی نالے چڑھ جاتے ہیں اور نیچے وادی میں گلیشیروں، بانیوں اور کھیتوں کے کھیتوں کے درمیان سے بہتی ہوئی آب پاشی کی لبالب نہریں [illegible] دکھائی دیتی ہے۔

ہنزہ سے نگر جاتے ہوئے دو تہائی راستے پر ٹٹو نہیں کام آ سکتے۔ ڈھلان بہت سیدھے تھے اور پل بہت بودے۔ اس لئے سارا سامان قلیوں نے اپنی کمر پر کس لیا۔ کریم آباد سے سطح زمین اچانک نظر آنے والی گندمی پہاڑیوں اور نرم سبز ڈھلانوں کے ایک سلسلے میں، جو دریائے ہنزہ کی طرف اترتی جاتی ہے۔ ہنزہ کوئی دو ہزار فٹ نیچے اپنی تنگ گھاٹی میں بل کھاتا جاتا ہے۔ راکاپوشی کا دیو ہیکل سفید اور نیلا، دن تھا۔ بادل دور ہو جانے کی وجہ سے اب بلندیاں بالکل صاف نظر آ رہا تھا۔ چھبیس ہزار فٹ زیادہ فٹ بلند ہیبت ناک کھڑی چٹانوں اور گلیشیروں کا ایک عظیم الشان اور واقعی خوفناک سلسلہ مشرق کی طرف ہے۔ جو ہماری نظر کا مرکز تھا۔ دوپہر اس پر کی تیز دھوپ پڑ رہی تھی۔ اتنے دیو آسا پیمانے پر عیاں منظر کو دیکھ کر ہوش اڑے جاتے تھے۔

اتنی اونچائی پر بھی دریائے ہنزہ تیز رفتار گدلے پانی کا مہیب سیلاب تھا، جو پگھلتے گلیشیروں کی وجہ سے چڑھ گیا تھا۔ ہم اس کے نزدیک پہنچے، اس کے اوپر کی تند ہوا، تیز دھوپ میں تپی ہوئی اور معطر، ہمارے چہروں سے دستانے کی طرح، اچانک گرم گرم ٹکرائی۔ اور دریا کی عجیب پہنائی پر جو ہوا کے جھکڑوں یا دریا کے تھپیڑوں مارنے سے لرزتا ہوا جھولا پل پڑا تھا وہ پل سے زیادہ پل کا بوسیدہ ڈھانچہ معلوم ہو رہا تھا۔ اس کو معلق رکھنے والے موٹے تار گھس گئے تھے، کٹہرا کسی طرح ٹوٹ چکا تھا اور بہت سے چوبی تختے ندارد تھے۔

جب میں پل کی ان خالی جگہوں کو الانگ رہا تھا ۔۔۔ اور میری نظر مسحور ہو کر لمحہ بھر کو نیچے تیز کف آلودہ گرد آلود لہروں پر پڑ گئی تھی ۔۔۔ تو میرے پیچھے رحیم (اردلی) یا بار بردار قلیوں کی بھاری بھرکم حرکت سے جن کے قدم غلط ہو گئے تھے، وہ سارا چرچراتا ہوا نرالا پل جھولنے لگا۔ دھک دھک کرتے دل سے میں دوسرے کنارے پر نگر کے علاقے میں پہنچا۔ وہاں ہنزہ قلیوں نے سامان اتار دیا اور اس کے بعد ہماری نگرانی غلام رسول نے سنبھال لی۔ وہ بہت خوب صورت نوجوان تھا۔ اس نے میرا تیس سیر کا سوٹ کیس یوں اٹھا لیا جیسے کوئی خالی ہو اور اپنا تعارف کرانے کے بعد ۔۔۔ اور یہ جتا کر

کہ وہ صرف قلی ہی نہیں تھا، رہنما اور حافظ بھی تھا —— اس تیزی سے ایک ڈھلوان پر ہمارے آگے آگے چڑھا گیا کہ اچھا بھلا ہونے کے باوجود میری ذرا سی دیر میں سانس پھول گئی۔

غلام رسول کی پر زور شخصیت اور زبردست جسمانی طاقت ویکھے چند لفظوں تک محدود ہے، رحیم اور باقی دونوں قلیوں پر، جو زیادہ عمر کے آدمی تھے، غالب رہی اور کچھ دیر بعد نگر کے میر کے جمعدار بھی اس کے اثر سے نہ بچ سکا۔ جمعدار ایک اہم مقامی منصب تھا اور ہدایات کے مطابق، ایک شہر ستانے کے لئے اگلی گھاٹی میں ہمارا منتظر تھا۔ خبر یہ تھی کہ میر بدقسمتی سے نگر سے کچھ عرصے کے لئے باہر گئے تھے اور میری آمد کے موقع پر موجود نہ ہو پائے گے

ہم نے اس مقام پہ ہمیں ہسپر گلیشیرز سے اترنے والی ایک چھوٹی سی جھاگ بھری معاون ندی پار کرنی تھی۔ پل لمبا تھا بس دو دو چپٹے ہوئے گول لٹھوں کو طولاً رسی میں جکڑ کر درمیانی ہولڈروں پر لٹکا دیا تھا۔ ہاتھ کا سہارا بھی کوئی نہ تھا۔ چڑھتے ہوئے دھارے کے زور سے چھوٹی چھوٹی موجیں کبھی کبھی پل پر تھپیڑے مارتی تھیں۔ اس میں گرنا اگرچہ ناگوار ثابت ہوتا لیکن یہ حقیقت تھی کہ اسے پار کرنا دریائے ہنزہ کو عبور کرنے کے مقابلے میں کہیں کم سنگین تھا۔ مگر جب ہم جب اس پر سے گذر رہے تھے تو جمعدار نے، جو میر کے انگریز ملاقاتی کے لئے متردد تھا کہ نگر میں برسوں سے کوئی ایسا ملاقاتی وارد نہ ہوا تھا، میری حرکات کو غلط معنی پہنا اور یک بیک ضرورت سے زیادہ جوش میں آ، مجھے سہارا دینے کو پیچھے سے تھام لیا —— اور ہم دونوں دریا میں گرنے سے بال بال بچے۔

غلام رسول نے، جو پیچھے دیکھ رہا تھا، بجلی کی طرح لپک کر ہمارے ڈگمگاتے اور الجھے ہوئے جسموں کو پکڑ لیا۔ حالانکہ اس نے سوٹ کیس اٹھا رکھا تھا، وہ ہمیں دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑا کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ جمعدار کو، جو عمر اور حیثیت میں اس سے بڑا تھا، اس نے خوب ہی سخت سست کہا۔ خجل ہو کر وہ بد نصیب آدمی، مسکین خاموشی اختیار کئے، اگلے ڈھلوان پر بھاری بھاری قدم اٹھا کر چڑھتا رہا۔

ہمیں پوری طرح اپنے بس میں کر لینے کے بعد اب غلام فراغت سے بات کر سکتا تھا۔ اس نے اپنا حاکمانہ انداز ترک کر دیا اور ہمیں ایک لمبے اور کٹھن مڑتے تڑتے راستے سے نگر کے پہلے بڑے گاؤں کی طرف لے جاتے ہوئے وہ خوش طبع ساتھی ثابت ہوا۔ پیچھے سے وہ بڑا عجیب نظر آ رہا تھا۔ سیب کے پھولوں کی ایک تازہ توڑی ہوئی ٹہنی اس کی سفید گلگتی ٹوپی کی زینت تھی —— ایک نوجوان کی طرف سے بہار کو سلام —— وہ اس کے چلنے سے ہل جل رہی تھی۔

اپنی ثانوی، ضمنی حیثیت کے عین مطابق نگر منظری لحاظ سے ہنزہ جتنا شاندار نہیں۔ بڑی بڑی چوٹیاں اتنی خوبی سے مرتب نہیں ہوتیں۔ ان میں سے اکثر اس گنجان تر اور تنگ تر منظر میں زیادہ نزدیک کی ادنیٰ چوٹیوں کے پیچھے کلی یا جزوی طور پر چھپ گئی ہیں۔ صرف دا(کا) حصہ دونوں سروں پر، مغرب میں ہمارے پیچھے ہنزہ کی طرف اور مشرق میں ہسپر گلیشیر کے قریب گنجوت کے گٹھیلے سلسلے کی طرف وہ پوری طرح نمایاں، مگر فاصلے کی وجہ سے چھوٹی چھوٹی، نظر آتی ہیں۔

اب ہم ایک بنجر خطے میں پہنچے۔ ننگی چٹانوں سے تپش اور سورج کا چہرہ وحشیانہ طور پر منعکس ہو رہی تھی۔ مجھے جلد ہی پیاس لگنے لگی۔ بدن پر، جہاں جہاں پسینہ سوکھ گیا تھا، نمک کے ننھے ننھے ذرے محسوس کئے جا سکتے تھے۔ نگر کے سفر کی آخری مسافت ایک ہموار قطعے پر مشتمل ہوتی ہے جس کے نیچے خوبانی کے پیلے پھولوں کے جھاگ سے ڈھکے گیہوں کے کھیت، تختہ بتختہ، جو نیچے ڈھلان میں ہسپر کے معاون تک اترتے چلے گئے تھے۔ وہاں ٹٹوؤں پہ سفر کرنا پھر ممکن ہو گیا اور میر کی مہمان نوازانہ ہدایات کے بموجب خدمت گار دو لدے ٹٹو، اور میر کی اپنی سواری کا ایک یابو لئے ایک پیڑ کے نیچے ہماری راہ دیکھ رہے تھے۔

نگر محل ایک ذرا سی اونچی زمین پر واقع ہے۔ جب ہم پولو کے میدان کے موڑ سے چڑھتے ہوئے نزدیک پہنچے تو اپریل کی شام کی تیز ترچھی روشنی میں وہ بھلا معلوم ہوا۔ بہت سے گرد کھڑے ابھی تک بے برگ و بار سفیدوں کے پیلے کھودی تنے اس کے وقار میں اضافہ کر رہے تھے اور اس کے چاروں طرف ہرے ڈھلانوں پر خوبانی کے پھولوں کا ایک دلفریب آبشار سا چھٹکا ہوا تھا۔

اس میں بلتت کا سا جلال نہ تھا، لیکن میرے خیال میں وہ

تھا یہ کریم آباد محل سے بھی زیادہ موزوں مقام پہ واقع تھا۔ ان محلوں کی طرح یہ بھی چھوٹا سا تھا۔ ہنزہ اور نگر کے یہ گویا سیاسی مرکز اہم ہیں لیکن کوئی خاص قلعہ بند نہیں۔

میر چونکہ گئے ہوئے تھے، میزبانی کے فرائض ان کے جانشین ولی عہد نے انجام دیئے جسمانی طور پر تو شاید وہ اتنا دلکش نہیں تھا۔ نوجوان ہونے کی وجہ سے خوبرو آدمی بن جائے ——— مگر اس کے نہایت عمدہ آداب مجلس سے میں مسرور اور متاثر ہوا۔ ایک محافظ خاص کا ہاتھ تھامے محل کے زینے کی اونچی بے ڈھنگی سیڑھیاں ایک ایک کر کے چڑھتے ہوئے وہ اس شام کو منو اور شفیق کے ساتھ مجھے رات کا کھانا کھانے لے گیا پھر اس نے خود لوہی میز کے صدر مقام پر ایک ایسی کرسی پہ بٹھایا اور دوران طعام ایسی میرے ساتھ یوں شائستہ سوالات اور تسلیمات کا تبادلہ کیا جیسے مہمان نوازی کی طویل تربیت پا چکا ہو۔ دنیا کے اتنے بعید علاقے میں جہاں کوئی آتا جاتا نہ ہو اتنے اچھے آداب کا ہونا یقیناً ایک قابل ذکر کارنامہ تھا۔

اس کے دو خاص محافظ تھے۔ ایک کے بال سرخی مائل تھے اور بڑے ناز سے پلی ہوئی بہت موٹی مونچھیں نیز دونوں کی رنگت پیلی۔ تقریباً زرد سیاہی تھی۔

اپریل کی ایک اور خنک صبح کو ہم نے اور رحیم ادا نے ٹٹوؤں اور تین سامان سے لدے ٹٹوؤں سمیت بادل ناخواستہ نگر محل سے واپسی کے سفر پر روانہ ہوئے۔ ہم بیرونی دیوان عام کے آگے سے گزرے، جو مغل طرز کا ایک مختصر اور خوشگوار نمونہ تھا، پہلے تنوں والے سفیدوں اور خوبانی کے پھولوں کی فراوانی کے آگے سے گزرے جو آبشار کی طرح ڈھلان پر پھیلے ہوئے تھے۔

چھوٹے سے ولی عہد نے اندرونی احاطے میں اپنے تنومند خاص محافظوں کے درمیان کھڑے ہو کر بڑی خوش خلقی سے ہاتھ ملا کر مجھے خدا حافظ کہا۔

میں نے ہنزہ اور نگر میں متعدد مسلم امام باڑے اور مسجدیں دیکھیں، بہرحال اس علاقے میں جو پہلے کشمیر ریاست کے نام سے موسوم تھا، مسلم مذہبی عمارتوں میں گنبد اور مینار جیسے ممیز امتیازات عموماً نہیں ہوتے اور غیر تربیت یافتہ نظر تو انہیں مشکل ہی سے شناخت

کر سکتی ہے۔ میدانوں کی طرف واپس آتے ہوئے راستے میں جو دوسرا گاؤں پڑا اس میں ایسی ہی عمارت تھی وہ چھوٹی، چوکور، پتھروں کی بنی ہوئی تھی، چھت ہموار تھی اور اوپر ایک چوبی لالٹین لگی ہوئی تھی۔

قبریں بھی عجیب مانوس شکل کی ہوتی ہیں۔ پٹھانوں کے علاقے میں تو وہ گول پتھروں کے مستطیل ڈھیر ہوتی ہیں اور اتنے بیٹھے ہوئے دکھائی دیتی ہیں جیسے کسی دیو کا مدفن ہوں۔ کبھی کبھی ان کو سہ پہلو دریائی پتھروں کی الواح سے پر وقار بنا دیا جاتا ہے۔ نگر اور ہنزہ میں وہ مختلف تھیں۔ ایوانیاں بنی ہوئی ہیں جن کے ہر کونے پر چار سبز جھنڈیاں ہوتی ہیں اور انہیں باقی حصے سے اونچا رکھا جاتا ہے۔

جاتے ہی خشک نالے سے نکل کر ہم ہنزہ دریا کے مشرقی کنارے پر چلتے گئے۔ یہ وہی علاقہ تھا جہاں میں نے ہنزہ کے علاقے میں اپنی پہلی رات کو علی آباد کے مقام سے نگر والوں کی حیثیت کو، جن کی بابت مجھے کسی نے نہ بتائی تھی، اتنی دلآویزی سے دیکھتے دیکھا تھا۔ یہ ایک خاصا سیدھا تنگ تھا اور بہت زرخیز تھا۔ گاؤں بھی بہت سے تھے۔ اور ہمارے دائیں بائیں جو بیس ہزار فٹ سے کہیں بلند تھیں عظیم چوٹیاں کھڑی تھیں اور جنوب میں راکاپوشی کی دیو پیکر دلکش برفانی استادگی، جو ہمارے آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ اور دوپہر کو آسمان کے زیادہ نیلا ہونے پر زیادہ عظیم اور خوبصورت ہوتی جا رہی تھی۔ دریائے ہنزہ کے اس کنارے پر سفر کرتے ہوئے ہم اس کے بہت قریب سے گزرنے والے تھے۔ آتے ہوئے وہ اتنا پاس نہ تھا۔ مرے کی طرف سے دیکھنے پر اس پہاڑ کی حسین چوٹی تقریباً چاقو کی دھار کی طرح پتلی نظر آ رہی تھی۔ جب میں نے مایون کے ڈاک بنگلے سے سیب کے پیڑوں کے پاس کھڑے ہو کر چاندنی میں اسے دیکھا تھا تو وہ کچھ فنا اور دیوی سے مشابہ معلوم ہوا تھا، لیکن اب پتہ چلا کہ وہ ویسا تیمم قبہ نما پہاڑ نہ تھا۔

اگلی صبح میں مرے سے لوٹتا ہوا چلا تو میری آنکھیں شاذ ہی راستے پر تھیں اور میرا سر مستقل طور پر راکاپوشی کی برفانی جسامتوں کے نمایاں ہونے والے تنے اور شاندار مناظر کی طرف مڑا ہوا تھا اور اس دن میں نے سفر کی سب سے طویل مسافت طے کی اور ایک بار پھر مجھے زیادہ تر دوبانی کے سفر کا سہارا تھا۔

ہمیں بنیادی سے چلے تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ ایک ڈزرپ پچھر کی

[illegible] سے اس پر ایک اور چھوٹا سا پیالہ ہماری طرف آگے بڑھا دیا۔ [illegible] کا [illegible] حصہ [illegible] نظر آ رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا [illegible] میرے گھر کی طرف [illegible] ہوں گے۔ میرا قیاس درست نکلا [illegible] خوش ذائقہ [illegible] ہم صرف اٹھا کیں [illegible] تھی۔ وہ دوپہر [illegible] آ رہے تھے اور [illegible] ہوتے تھے۔ انہوں نے [illegible] سادہ [illegible] بڑا اچھا ہوا تھا اور چراغ [illegible] رکھی گئی۔

[illegible] کے لئے ہم نے [illegible] دستہ [illegible] مکمل [illegible] میرے ساتھ [illegible] مہمان [illegible] کی گئی تھی [illegible] ہوئے ہیں [illegible] چھوٹے بڑے [illegible] ایسا [illegible] کی [illegible] باتوں کے دوران میں یہ حیران کن انکشاف ہوا کہ [illegible] مجھے [illegible] کیا تھا۔ [illegible] اعتراض کی [illegible] دیر کی اور پوچھا کہ انہوں نے ایسا کیوں سمجھا جبکہ میں عام انگریزی لہجہ میں بات کر رہا تھا۔

"لیکن مجھے تو خیال بھی نہ ہو سکا تھا کہ مجھ سے کوئی انگریز ملے [illegible] یہاں سے ہمارے [illegible] ہوئے" [illegible] اچھے [illegible] پرانے وقتوں کی [illegible] ہمارے پاس کئی امریکی آ چکے ہیں [illegible] سفر کرتے [illegible] پاکستان بننے کے بعد انگریز کوئی نظر نہیں آیا۔ مجھے تو یہ ڈر لگ رہا تھا کہ ہماری [illegible] انگریز سے ملاقات نہ ہو گی۔"

ان دونوں ریاستوں میں پردے [illegible] سے پابندی نہیں کی جاتی۔ جن دیہاتوں سے ہم آج گزر رہے تھے وہاں کی عورتیں آتے جاتے اجنبیوں کی [illegible] سے منہ پھیر لیتی ہیں لیکن وہ نقاب ڈال [illegible] نہیں رکھتی ہیں۔ وہ چھوٹی چھوٹی ٹوپیاں پہنتی ہیں، جن پر کئی رنگوں کا بھڑکیلا کام ہوتا ہے۔ ان کے بال [illegible] لٹوں میں [illegible] ہوتے ہیں۔ [illegible] اور [illegible] میں نے چھوٹی لڑکیوں کے فوٹو لئے [illegible] احتجاج نہ ہوا۔ بہرحال میں نے غالباً عقلمندی کی جوان عورتوں کی تصویریں لینے کی کوشش نہ کی۔

[illegible] پاک کے لحاظ سے معیار زندگی [illegible] وہاں فقر عام [illegible] مجھے تو کوئی نظر میں آیا اور سادہ [illegible] کسی کو [illegible] نہیں ہوتی۔

جب آپ گاؤں میں داخل ہوں تو وہ "السلام علیکم" کہتے ہیں [illegible] ہوتے ہیں اور [illegible] ہیں [illegible] سے مصافحہ [illegible] دوستانہ [illegible] عام ہے، وہ جو شلوار [illegible] پرانے طرز کی [illegible] اظہار کیا جاتا ہے۔

اگرچہ [illegible] یہاں موجود ہیں لیکن [illegible] جلد کی طرح [illegible] عام ہے کہ [illegible] علاج معالجے میں [illegible] رکھتا ہے۔ [illegible] جاتے ہوئے [illegible] کے مقام پر ایک [illegible] بوڑھا [illegible] آنکھیں [illegible] [illegible] ان میں ایک بیمار [illegible] آدمی نے [illegible] مجھ سے درخواست کی کہ [illegible] پیٹ کی تکلیف کو دور کر دوں۔

[illegible] گلگت کو واپسی کے آخری مرحلے پر [illegible] پر چلے ہوئے۔ دریائے [illegible] کے [illegible] اس راستے سے جو زیادہ [illegible] آتے تھے۔ اوپر [illegible] دھوپ میں [illegible] آتے۔ [illegible] جو کبھی کبھی [illegible] ایک [illegible] سے اوپر نظر آتا تھا، شاہانہ طور پر [illegible] اور بے حد بلند تھا۔ اس کے [illegible] آبشار اور آویزاں [illegible] معلوم ہوتا تھا کہ سے اوپر [illegible] کو ہیں۔

(ترجمہ :- محمد سلیم الرحمٰن)

خان محمد فضل الرحمٰن

کشمیر کا پیدل سفر

میں ان دنوں اقبال کا وہ کلام پڑھ رہا تھا جس پر رنگِ تغزل غالب ہے۔ پیامِ مشرق کی دو نظمیں متعلقہ کشمیر زیادہ تر میرے زیرِ مطالعہ تھیں اور ان کے چند بیت اکثر پڑھتا رہتا مثلاً ؎

بگوئی کہ بہر ماں بہشت بریں را
نہادشت در دامن کوہسارے
رخت بکاشمر کشا کوہ و تل و دمن نگر
سبزہ جہاں جہاں ببیں لالہ چمن چمن نگر
دخترکے برہمنے عشوہ گرے تبسم گرے
دیدہ بروئے او کشا باز بخویشتن نگر

ہوسٹل کے جس کمرے میں میں رہتا تھا اس سے بالکل متصل کشمیری پنڈت ملکھی رام چک کی کوٹھڑی تھی۔ کمرے اور کوٹھڑی کے درمیان جانب غرب دروازہ تھا جو ہمیشہ بند رہتا۔ اس دروازے کے کواڑوں میں دو نامعلوم سے سوراخ تھے جن سے آر پار دیکھا جا سکتا تھا۔ ملکھی رام چک کی دوکان بھی رہائشی کوٹھڑی کے برابر تھی جس میں وہ مٹھائیاں اور سوڈا واٹر فروخت کرتا تھا۔ کوٹھڑی کی صحنچی جنوب میں تھی۔

جب جیٹھ چڑھا اور گرمی پورے جوبن پر آئی تو ملکھی رام جب دوکان سے نئی بہو لایا۔ اب وہ دکان پر بجائے دو کنی دھوتی کے تین دھاری دھوتی پہن کر بیٹھتا تھا۔ تیسری دھاری بیچ میں زرد ہوتی تھی وہ ململ کے قمیض تلے سرخ بنیان پہنتا تھا۔ نئی دلہن کے آنے کی خبر سب سے زیادہ مجھے ہوئی کیونکہ میرے پڑوس کا حصہ اب آباد ہو گیا تھا۔ میرے کانوں میں جب اُن کے نئے نئے پیار کے الفاظ پڑے تو تعجب اور معصومیت نے کان کھڑے کر لئے اور میری طبیعت پھڑک پھڑک کر رہ گئی۔ تعطیل کے دن آئے تو ملکھی رام جب تو لاہور سے اپنی دلہن لے کر آبائی قصبہ چلا گیا اور مجھ پر اداسی چھا گئی۔

میں نے سوچا کہ پنڈت چک تو اپنے قصبے کو چلا گیا ہے میں لاہور چھوڑ کر کہاں جاؤں۔ در و دیوار اور ماحول سے تب کشمیر کی صدائیں سننے لگا جو ملکھی رام چک کی دلہن ایسی ہزار ہا عشوہ گر ملک اور تبسم گروں کا وطن ہے اور اگلے ہی روز میں جموں میں تھا اور شام کے وقت پہاڑوں میں سیر کرتے ہوئے توی ندی کے پیر میرے سامنے تھے۔ دوسری صبح کو بس مجھے مری لئے جا رہی تھی۔ جب میں ٹوٹ کے سانپ دار پہاڑوں میں پہنچا تو موٹر کو ٹٹ پہنچنے پڑے۔ بس یہاں سر شام پہنچی تھی۔ رات کو سفر نہ تھا۔ اس لئے مسافر ہوٹلوں میں ٹھہرے۔ جب میں بس سے اتر کر ہوٹل کو جا رہا تھا تو ایسی باس آ رہی تھی کہ جیسے میں خوشبوئی کے پہاڑوں میں پھر رہا ہوں اور ہوا ایسی ستانی تھی کہ میں کھائی پر جنگلی بھیڑیے کی طرح دوڑ کر چڑھنے لگا۔

صبح کو جب میں نے کمرے کی کھڑکیاں کھولیں تو دیکھا کہ اکثر پہاڑ دیوداروں سے ڈھکے پڑے ہیں اور جانب شمال ایک سفید سا تنبو پہاڑوں پر بیٹھا ہوا ہے۔ یہ کشتواڑ کو جانے والی بڑی پگڈنڈی تھی میں اس سحر کن خوش منظر میں ایسا محو ہوا کہ بس نکل گئی۔ ناشتے کے بعد جب میں باہر نکلا تو جھاڑیوں سے خوشبو آ رہی تھی۔ شمال مغرب میں پیر پنجال کا برف دھوپ میں ایسا چمک رہا تھا جیسے نیلے نیلے ابر آسمان میں چاند میری نگر جانے والی سڑک اسی پہاڑ کی سرنگ میں سے گزرتی تھی۔ میرا ارادہ یہ تھا کہ میں سرنگ کے راستے نہیں بلکہ اس پہاڑ کے اوپر سے گزر کر وادیٔ کشمیر میں اتر جاؤں گا۔

ہوٹل کے نزدیک ہی کاشتکاروں کے گھر تھے۔ جب میں ادھر سے گزرا تو دیکھا کہ ان میں سے ایک کاشتکار کی لڑکی لود اروں میں کھڑی ہوئی ایسی لگ رہی تھی جیسے اندھیرے میں مشعل۔ اس نے اپنے لال کرتے پر سیاہ جیکٹ پہنی ہوئی تھی۔ جس کے بٹن چھوٹے نرد رنگ کے

چہار اینٹیں ایسے معلوم ہو رہے تھے جیسے اپسوال کے کارتوس بنے ہیں۔ وہ اور اس کا چھوٹا بھائی کچھ بکریوں کو لئے چوکی سنگلات کی طرف جا رہے تھے جہاں سے وہ آ گئے اس لڑکی نے مجھ سے سگرٹ مانگا میں نے اسے کہہ دیا کہ میں تو تمباکو نہیں پیتا لیکن میں اس کے لئے سگرٹ کے پانچ پیکیٹ معہ ماچس کے جا کر دکان سے خرید لایا جب اس نے پیکیٹ دیئے تو وہ بہت متعجب ہوئی کہ جب میں خود نہیں پیتا تو اس کے لئے کیوں لایا ہوں دراصل میں چاہتا تھا کہ اس کے ساتھ دلچسپ باتیں کروں۔ ٹھنڈے سائے تلے کچھ دیر بیٹھوں بہار ہو اور ایسے پتوں نے جگہ ایسی نرم ہموار کی تھی جیسے کوئی پروں کی توشک پر لیٹا ہو۔

رات کے وقت جب میں خیمہ میں بستر پر لیٹا تو مجھے مرغ چیخ والی کے خیالات آ رہے تھے اور میں گویا مجنوں ہوں۔ تو ہوائی چیخ بہ چیخ تھنٹ کی جھیل ماند ہو رہی تھی گمی تھی۔ پھر میں باہر برآمدے میں آ گیا۔ بارش کی گھڑیوں کے اندر نیچے چراغ ٹمٹماتے ہوئے تاروں میں اس طرح گھل مل رہے تھے جیسے گرمیوں اور تلیر کھیت میں مل کر چمک رہے ہوں یعنی ان میں کچھ فرق تو ضرور ہے لیکن وہ ہوں ایک ہی زمرے سے۔ ہوا ٹھنڈی تھی لیکن ایسی صحت و فرحت بخش کہ سینہ کھول کر خوب اچھی طرح سے سانس لیں۔

اگلے دن جو بس سری نگر سے آئی تھی اس میں مسافر کچھ قدرتی طرف بھی ساتھ لئے تھے جو بھر بھری بھر بھری سی تھی۔

بجوت بھون اور درہ بانہال تک پانی کی سیر گاہ تھی اور اس کا منظر خوب دلفریب تھا لیکن یہاں کے باشندوں میں جو زیادہ تر مسلمان تھے غریبی بہت ہوئی تھی۔

بجوت سے میں کشتوار بھی دیکھنے گیا۔ یہاں کی خاص چیز چوگان کا میدان تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ اس سے بڑا چوگان تمام ہمالہ میں نہیں جیسے مشہور چوگان جو دریائے راوی کے غربی کنارے پر تھا۔ وہ واقعی اس سے چھوٹا تھا۔ اس چوگان کے پاس کشمیری سیبوں کے باغ تھے۔ آبادی کشتواڑ کی بھی مسلمان تھی۔ یہ خطہ جہانگیر نے فتح کر کے قلمرو ئے مغلیہ میں شامل کیا تھا۔

بجوت واپس آ کر میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ یہاں سے وادی کشمیر تک پیدل سفر کروں گا۔ کچھ روز بعد میں صبح صبح چل پڑا اور تمام رستے رام بن کے پڑاؤ پر پہنچ کر دریائے چناب پر مہاراجہ کشمیر کا بنا ہوا پل تھا۔ اس پل میں مجھے کوئی خاص اہمیت نظر نہ آئی لیکن یہ

پہلا کیا ... بار کہ بنا ہوا تھا جس میں مہاراجہ کے اس کارنامے کی تعریف کی گئی تھی۔ رات کے وقت میں دریا کے کنارے پاس ہی ایک اُبھار کو منتخب کر کے ٹھہرا رات گہری تھی۔ اس لئے میں باہر بیٹھ رہا ہم میں آ گیا نیچے سے دریا کا شور سنائی دے رہا تھا۔ اونچے اونچے پہاڑوں سے گھرا ہوا دریائے چناب اندھیری رات میں کالے ناگ کی طرح ایسا ڈراؤنا نظر آ رہا تھا کہ جب میں سویا تو کئی بار ... بلکہ پڑا کہ کہیں چناب ابھار لیتا ہوا میری طرف نہ آ گیا ہو۔

رام بن سے اگلا مقام رام سو رہا تھا اور پھر ایک اور پڑاؤ آیا۔ جب میں وہاں پہنچا تو سورج پہاڑوں کے پیچھے ڈوب چکا تھا اور میری ٹانگیں بقیہ جسم کا بوجھ برداشت کرنے سے عاری نظر آ رہی تھیں کیونکہ میں نے آج تقریباً چونتیس پینتیس میل کا سفر کیا تھا۔ میرے سامنے دکانیں اور آدمی آ جا رہے تھے جن میں ایک کھیت کی منڈیر پر لیٹ گیا۔ میرے پاس سے مویشی گزر رہے تھے جن کے گھنگروں کی آوازیں میں سن رہا تھا لیکن مجھ میں اتنی سکت نہ تھی کہ اٹھ کر بیٹھ سکوں یا آنکھیں بھی کھول سکوں۔ چھوٹے چھوٹے نالوں نے پہاڑ جیسی ... ورنہ ایک ایک گھنٹہ بعد جب میں اٹھا تو چاندنی کھیت لئے ہوئے تھی اور پہاڑ سے جو بڑے منہ والا چاند ایک چھوٹی سی پہاڑی سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

اس کے بعد میں پیر پنجال کی تلہٹی میں پہنچا۔ یہاں پہنچنے کی مجھے اتنی عجلت ہو رہی تھی جیسے ولیم شکسپیر کو AS YOU LIKE IT کے صحرا آرڈن میں پہنچنے کی تاکہ وہاں کے ابلتے چشمے کلیلیں کرتے ہوئے بڑے گھنیر درخت اور ٹھنڈے ٹھنڈے چکنے چکنے اور کھردرے پتے دیکھ سکتا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور درہ پیر پنجال پر جس کو درہ بانہال بھی کہتے ہیں۔ پھوار پڑنے لگی تھی لیکن کچھ دیر بعد ہوا چلی اور بادل اس طرح سے پھٹ گئے جیسے کہ کسی تالاب سے کائی صاف کر دی گئی ہو۔ سورج نکل آیا۔ جب ہوا چل رہی تھی اور پھوار پڑ رہی تھی تو میں کھوہ میں بیٹھ گیا جہاں ایک گڈریے کا لڑکا آیا۔ وہ سچ مچ میں ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے نئے عہد نامہ کے دور کا کوئی انسان تھا جو ٹیلی گیلی پر اپنے گلے کی ... رہا تھا اور جس نے مسیح کے وعظ اپنے کانوں سے سنے تھے۔

جس وقت میں پیر پنجال کی چوٹی پر پہنچا تو سورج کچھ ڈھل چکا

پھیکا تھا۔ ہوا معتدل ہو چکی تھی اور دن میں صرف اتنی خنکی تھی کہ کپڑے اتار دیں تو سردی لگے اور قمیص پہنے رہیں اور سویٹر پہنیں تو خوشگوار معلوم ہو۔ میرے آس پاس برف کی بڑی بڑی سلیں پڑی ہوئی تھیں لیکن اس وقت وہ ویسی نہیں چمک رہی تھیں جیسی میں انہیں جنوب سے دیکھا کرتا تھا۔ قدرتی برف میں نے یہاں پہلی بار دیکھی تھی۔ میں نے اسے چھتری سے کھود مار کر توڑا اور پھر اس بھربھری بھربھری چیز کو کھانڈ میں ملایا اور کوٹ کی ڈبیا میں رکھ کر کھایا۔

اس وقت میری پشت مشرق کی جانب تھی جہاں پہاڑ پیچھے پہاڑ تھے لیکن ان پر برف کی نمود نہ تھی۔ مگر مغرب کی طرف ایک بہت وسیع میدان تھا۔ وادی کے چاروں طرف جو اونچے اونچے پہاڑ سنتریوں کی طرح کھڑے تھے ان پر برف نے دستار بندی کی ہوئی تھی۔ قسمت سے مطلع صاف تھا ورنہ بادل کی دھواں دھار میں نگاہ کام نہ کر سکتی۔ وادی کشمیر میں دریائے جہلم مروڑیاں کھاتا ہوا بہہ رہا تھا اور کہیں کہیں ایک ایک، دو دو چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں۔ ان پہاڑیوں کا کوئی باقاعدہ سلسلہ نہ تھا بلکہ وہ بادلوں کی طرح قدرتی طور پر بکھری ہوئی تھیں جن کا رنگ مجھے اودا اودا دکھائی دے رہا تھا۔ اگر اس وادی میں یہ پہاڑیاں اور دریائے جہلم نہ ہوتا تو اس کے حسن میں چار چاند نہ لگتے اور مشاطہ قدرت پر حرف آ جاتا۔ یہاں سے دیہات اور قصبے ایسے نظر آ رہے تھے جیسے بونوں کی بستیاں ہوں اور کہیں کہیں مسجدوں کے گرجا نما مخروطی گنبد ابھرے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔

جب ذرا دن اور ڈھل گیا تو ہوا سرد سرد چلنے لگی اور سبزہ زار میں اُگے ہوئے چھوٹے چھوٹے زرد پھول ایسے کھلے ہوئے تھے۔ میں یہاں اس لئے بہت دیر تک ٹھہرا رہا تھا کہ ایسے موقعے آسانی سے ہاتھ نہیں آتے۔

میں نے پھر نکال رات دیر ہوئے وادی کشمیر میں اترنا شروع کیا۔ ویری ناگ ابھی دور تھا کہ رات ہو گئی۔ دھند محسوس ہوا۔ پہاڑ کی اترائی، ڈھلوانی، قدرتی برف کا استعمال اور خوشی کے سبب مجھے بہت بھوک لگ آئی تھی۔ ایک جگہ میں نے کاشتکاروں کے ایسے چھپنے پر جیسے وہ صرف فصل کے موقع پر استعمال کرتے ہوں گے، نارنگی جتنا کدو لگا دیکھا اور بھوک کے سبب اس کو توڑ کر کھا لیا۔ رات میں نے ایک چکی میں بسر کی جس میں مکئی پیسی جا رہی تھی اور وہیں گھاس تا سبزی کے ساتھ مکئی کی روٹی کھائی۔ تمام رات گھراٹ چلتا رہا تھا اور اس کی گونج میرے کانوں میں اگلے دن بھی کئی گھنٹے تک

آ رہی تھی۔ صبح کو جب میں کچھ باہر نکلا تو نقشہ بدلا ہوا تھا۔ یہاں مجھے ہر شخص مسلمان، فلاکت زدہ اور افلاس زدہ نظر آتا تھا۔ کشمیری لمبے لمبے کرتے پہنے ہوئے پھر رہے تھے اور ان کے سروں پر بالا گیری کی چوبچی دار کلاہ تھی۔ ان کے چہرے سفید ضرور تھے لیکن سرخی تو گویا بالکل ہی ناپید تھی۔ مجھے زیادہ تر مردنی چھائی دکھائی دیئے۔ بالمقابل ان کے میں نے برہمنوں کو دیکھا جن کے بشروں پر بشاشت اور قدرے تمکنت ہویدا تھی۔ اگر کسی گاؤں میں کوئی سر برآوردہ سا گھر دکھائی دیتا تو اس کے معنے یہی تھے کہ وہ برہمن کا ہوگا۔

میں نے ویری ناگ کے متعلق تزک جہانگیری میں پڑھا ہوا تھا کہ یہاں دریائے جہلم کا منبع ہے اور اس کی کائی مور کے پروں جیسی ہے۔ میں نے جہلم کا منبع بھی دیکھا اور مور کے پر ایسی کائی بھی دیکھی۔ جہلم اپنے منبع سے نکل کر ایک بڑی گیند کی طرح بہہ رہا تھا۔ ویری ناگ میں ہندوؤں کے ٹھہرنے کے لئے دھرم سالہ موجود تھی لیکن مسلمانوں کے لئے کوئی انتظام نہ تھا۔ میں نے مجبوراً ایک مسجد کا رخ کیا۔ مجھے مسجد میں بیٹھے ہوئے ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ بچے جمع ہو گئے اور تھوڑی دیر میں امام مسجد کو بھی بلا لیا گیا۔ یہ تمام بچے نہایت غلیظ تھے اور ان کے چہروں سے مردنی ٹپکتی تھی۔ کئی بچے اس طرح ہچکیاں لے رہے تھے جیسے انہیں ہچکی کی بیماری ہو۔ ویری ناگ ہی میں میں نے پہلی دفعہ کشمیر کے لمبے لمبے اور سیدھے سفیدے دیکھے۔ جن کے پس منظر میں پہاڑ بہت ہی خوبصورت معلوم ہوتے تھے۔

وادی کشمیر کا پہلا مغل باغ میں نے اچھبل میں دیکھا۔ یہ بیگم جہانگیر کی یادگار تھی اور دوسرے مغل باغوں کی طرح ترتیب وار تختوں میں منقسم تھا اور تختے زینہ دار تھے۔ یہ باغ بھی اشرفیوں کے شوق آب کی زندہ مثال تھی۔ باغ کے طبقوں کی مختلف بلندیوں پر سے گرتے ہوئے پانی کے خوبصورت مصنوعی جھرنوں کا سماں پیدا کر رہے تھے۔ ہری بھری شرقی پہاڑی پر برف کے ٹکڑے دھوپ میں چمک رہے تھے اور اس باغ میں گرنے والا پانی ان چشموں سے آتا تھا جو اس پہاڑی پر پھوٹ رہے تھے۔ میں نے اس پہاڑی پر چڑھ کر ان چشموں کی تلاش کی لیکن نہ پا سکا۔ باغ میں زرد پھولوں کی بڑی ہی فراوانی تھی اور سبزہ دھانی تھا جو

وادیٔ کشمیر کے سبزے کی خاص خصوصیت ہے میدانوں کا سبزہ تیلیا سبز ہوتا ہے اور یہ نظر کے لئے اتنا تسکین بخش نہیں ہوتا۔ اس باغ کے سبزے پر چھوٹے چھوٹے سفید سفید پھول بھی کھلے ہوئے ہوتے تھے اور ہوا نرم نرم تھی۔ جتنا عرصہ میں کشمیر میں رہا میں نے ہوا تیز چلتی ہوئی نہیں دیکھی۔

ایسے ہی ایک باغ میں اور اس سے باہر چنارے اور گھنیر چھاؤں میں پڑے ہوئے تھے۔ ان کے بیٹے دیہاتی تھے اور خوب تیز تیز بولتے۔ ان سے کچھ خرید... وہاں پہنچا... دکھائی دیتے ہیں۔ باغ سے نکل کر چند روز کے دور تک رنگا رنگ کپڑے ہوئے بیٹھے تھے۔ ان جسموں کی شوخی تازگی ، زندہ سا کھلا پن کشمیریوں کے مقابل ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی دریں بیٹ کر آیا ہو۔ الموڑا انگلستان کا ساحل ... بیٹھے ہوئے اونٹوں کے پاس سے گزر رہا ہو۔

باغ سے باہر چناروں تک تفریح کرنے والے سیاحوں نے سفید سفید خیمے لگائے ہوئے تھے۔ جو ہریالی میں ایک عجیب ہی پُربہار منظر تھا۔ ہندوؤں کے لئے یہاں بھی دھرم شالہ تھی۔

کشمیر میں داخل ہوتے ہی میں کسی محبوب عشوہ گر سنے اور ستم گر کی تلاش تھا لیکن اس کا تو یہاں بالکل ہی نام و نشان نہ تھا۔ مکھی رام چک کی بھی ایسا چہرہ میں نے یہاں کوئی نہ دیکھا۔ بھلا پچکے ہوئے گالوں اور زردی زردی سفیدی میں بھی کہیں حسن ہوتا ہے۔ جو لوگ اونچی کرسی اور مکانوں میں گھات لگا کر رہتے ہیں ان کے یہاں میں جنت ملی ہے ہر جگہ دیکھنے میں ... ان سے تلاش کرنا فضول ہے۔ رفتار رفتہ ناطہ اور حسن مزدوری باہم مترادف ہیں کشمیریوں کا تھا۔ ... سراسر

ایسے ہی سے چند میل کے فاصلے پر اسلام آباد ہے جس کی اہمیت سری نگر کے بعد دوسری ہے۔ اس شہر کو عوام تو اسلام آباد ہی کہتے ہیں لیکن ہندو مہاراجہ گلاب سنگھ نے اس کا نام اننت ناگ رکھا تھا اور سرکاری دفاتر میں بھی اسلام آباد کو اسی نام سے پکارتے تھے۔ یہاں بھی مسلمانوں کی غالب اکثریت تھی۔ اورنگ زیب کی بنائی ہوئی عظیم الشان مسجد کے ستون لکڑی کے تھے اور اس مسجد کا گنبد بھی گر جا نما مخروطی تھا کشمیر میں یہی طرزِ تعمیر عام تھی۔ مجھے اس مسجد میں اس فنِ تعمیر کی جھلک نظر آتی تھی۔ جو مغلوں کا خاصہ تھا۔

جب سے میں کشمیر میں داخل ہوا تھا میرے کانوں میں چلتے چلے جانے کے غلغلے تھے۔ اسلام آباد سے سری نگر جاتے ہوئے بھی یہی حالت تھی تانگوں کی سڑک کے دونوں جانب توت کھڑے تھے۔ جن کے انگلی کے پور جتنے سفید سفید اور زنبیری پھل میں ملتا تھا جا رہا تھا۔ لانبے لانبے چھریرے سفید کیے داروں درختوں کے تنے دھوپ میں سفید کاغذ کی طرح چمک رہے تھے پھر یہ چنار بھی تو جگہ جگہ تھے ہی لیکن سب سے زیادہ گلِ لالہ بہار دے رہا تھا اور بہت اچھا لگتا تھا۔ کھیتوں میں تا حدِ نگاہ یہی لالہ زاری پھول کھلے ہوئے تھے کھیتوں میں اور کھیتوں کی منڈیروں پر، کچے مکانوں کی چھتوں پر اور دیواروں پر، نالوں کے پاس بائیں کنارے پر اور دائیں کنارے پر پہاڑیوں کے اوپر اور پہاڑیوں کی چوٹی پر یعنی ہر جگہ لالہ ہی لالہ تھا پھولوں کی اتنی فراوانی میں نے بسنت رُت تک بھی کبھی نہ دیکھی تھی۔ ان پھولوں نے تمام وادی میں گویا آگ سی لگا رکھی تھی۔ اور اقبال کا یہ مصرعہ عجب مزا دے رہا تھا۔

پھر چراغِ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن

جس طرح میدانی علاقوں کے کاشتکار جھاڑ جھنکار سے تنگ آ کر اس کی صفائی کیا کرتے ہیں اسی طرح کشمیری کاشتکار گلِ لالہ سے پناہ مانگتے تھے۔

صد حیف کہ میں نے گل ہائے لالہ تو اتنا ہم غفیر تو دیکھا لیکن مجھے یہاں کوئی بھی لالہ رُخ نظر نہ آیا۔ یہاں کے باشندے غلیظ تھے۔ چیکٹ میلے کپڑوں کے سبب ان کے پاس کوئی کھڑا ہونا بھی پسند نہ کرتا۔ ان کے پاؤں میں گھاس کے جوتے تھے اور سر پر بلا صفائی کی کلاہ جس پر نیچے سے اس طرح میل چڑھا ہوا تھا جس طرح کہ اتری ہوئی برساتی ندی کے کناروں پر گدلا پانی گھاس پھوس چھوڑ گیا ہو۔ اس حلیے میں کون اچھا لگتا ہے۔ یہاں کی عورتیں بھی ہیئت کذائی میں ہندوستان کی نیچ قوموں ایسی تھیں اور ان کے چہروں پر بیچارگی کے آثار تھے۔ وہاں کی پود لگاتے ہوئے میں نے ان کے گیت سنے تو ان میں بجائے جوشِ انبساط کے کچھ نوحہ ہی کا پہلو تھا۔

اس خطے میں درختوں کی افراط تھی۔ کھیتوں میں جو درخت دیکھے گئے وہ قد میں زیادہ بڑے نہیں تھے اور ان کی ٹہنیاں بید کی قلمیں جیسی تھیں ان درختوں کی شاخوں سے ٹوکریاں اور ٹوکرے بنتے تھے صبح صبح کشمیر کا منظر زیادہ ہی دلفریب ہوتا تھا کشمیری لمبے لمبے چوغے نما قمیص پہنے ہوئے

سر پہ کلاہیں مڑھے، پاؤں میں بھی کے ہوتے پہنے اور گرم چادروں میں بھی دہقت کی دبی ہوئی کانگڑیاں چھپائے چھپتے ہوئے نظر آتے تھے۔

سری نگر دریائے جہلم پر آباد شہر تھا اور ہری سنگھ ہائی روڈ یہاں کی گویا ٹھنڈی سڑک تھی۔ جہلم کے شاخ در شاخ پانیوں میں جو دریائے جہلم کے معاونوں کی طرح پھیلے ہوئے تھے ان کناروں پر جھومتا ہوا ہاؤس بوٹ دیکھتا رہتا تھا ان پر لوگ مکانوں کی طرح رہتے بستے تھے۔ ان پر دیدہ زیب رنگ روغن کیا ہوا ہوتا تھا۔ کھڑکیوں میں گملے رکھے ہوئے ہوتے تھے قالینوں اور فرنیچر سے مزین کمرے بجلی کی روشنی سے منور ہوتے تھے۔ سب سے بڑی ہاؤس بوٹ میں نے ہر اگدل سے امیرا کدل کی طرف لائبریری کو جاتے ہوئے دیکھی تھی۔ یہ ہاؤس بوٹ دو منزلہ تھی اور میں نے سنا تھا کہ یہ لارڈ کچنر سپہ سالار اعلیٰ افواج ہند کے لئے بنوائی گئی تھی۔

میں نے یہاں کا عجائب گھر اور لائبریری بھی دیکھی۔ لائبریری میں زیادہ جایا کرتا تھا۔ وہاں مستقل طور پہ میں نے پولیس کے سپاہی ڈیوٹی پہ دیکھے۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ لائبریری کی کھڑکیوں میں سے جب میں باہر دیکھتا تو ایسا معلوم ہوتا جیسے کوئی بہت ہی اعلےٰ قسم کی تصویر دیکھ رہا ہوں۔ سامنے ایک نگاہ میں بیک وقت پھول، پہاڑ، برف، چنار اور رنگین ہاؤس بوٹ نظر آیا کرتے تھے۔

سرینگر میں سب سے اونچی جگہ تخت سلیمان تھی جس کا نام سرکاری طور پر شنکر اچاریہ تھا۔ یہ خشک پہاڑی تھی جس کے پتھر چمک رہے تھے اس کی چڑھائی اتنی آسان تھی کہ کوئی چاہتا تو ناک کی سیدھ میں اوپر جا سکتا تھا چنانچہ میں بھی اس پر اسی طرح سیدھا چڑھتا تھا۔ اوپر جا کر میں نے ایک کھنڈر سا مندر دیکھا۔ اس مندر کے کلس پر رات کے وقت بجلی کا بہت بڑا بلب روشن ہوتا تھا۔

تخت سلیمان کے جانب شمال دنیا کی خوبصورت ترین جھیل، ڈل، میلوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے آس پاس مغل باغات تھے۔ چھوٹی چھوٹی سرسبز پہاڑیاں تھیں اور خاص جھیل کے ساتھ ہی دھان کے کھیت تھے تین مشہور مغل باغات اس جھیل کے شرقی کنارے پر تھے۔ میں ایک دن تخت سلیمان سے اتر کر ڈل کے شرقی کنارے کنارے پیدل ان باغات کی سیر کو گیا۔ چشمہ شاہی سب سے چھوٹا باغ تھا جس میں ایک گنگناتا ہوا چشمہ کانوں اور آنکھوں دونوں کے لئے دعوت تھا اس چشمے کا پانی جون جولائی میں بھی اتنا ٹھنڈا تھا کہ اس میں ہاتھ زیادہ دیر تک نہیں رکھ سکتے تھے۔ شالامار باغ میں سنگ سیاہ کی بارہ دریاں سی تھیں جن کی طرز تعمیر مغلوں کا بھی حصہ ہے اور فوارے بھی اسی قسم کے تھے جیسے لاہور کے شالامار باغ کے۔ وہ نشاط باغ جس میں بیٹھ کر علامہ اقبال نے اپنا ساقی نامہ لکھا تھا مجھے سب سے ہی زیادہ پسند آیا۔ کشمیر کے دوسرے مغل باغوں کی طرح یہاں بھی اس کے پہلو میں ایک پہاڑی تھی جس سے ابھر کر چشمے آ رہے اور باغ کئی سطحوں میں بنا ہوا تھا جن سے آبشار پیدا کئے گئے تھے یہیں میں نے پہلی بار بادام کے درخت دیکھے اور کئی کچے بادام کھائے۔

مجھے باغات کی سیر کرتے ہوئے کافی دیر ہو گئی تھی۔ نشاط باغ کی پہاڑی پہ چاند نکلا ہوا تھا۔ میں نے ایک شکارا کرایہ پر لیا جس میں قالین بچھا ہوا تھا اور گاؤ تکیہ لگا ہوا تھا۔ نزدیک ہی ایک دوسرے شکارے میں جے پور کے بانکے بیٹھے ہوئے تھے جنہوں نے جے پور کی کسی مغنیہ کو ساتھ بٹھایا ہوا تھا۔ مغنیہ خود ہی ستار بجا کر راجپوتانے کا کوئی مقامی گیت گا رہی تھی جس میں ریگستانوں، ان کی خاموش فضا، عشاق کی بے صبری اور محبوبہ کی ستم ظریفانہ بے نیازی کا ذکر تھا۔ چاندنی رات میں پہاڑیاں بے حد سیاہ نظر آ رہی تھیں اور ڈل کا پانی چاندی کی طرح چمک رہا تھا اور چناروں کے سائے طوبیٰ صفت نظر آ رہے تھے۔

جب میں کشمیر سے لوٹا تو بید کے کشادہ بکس میں میرے ساتھ بڑے بڑے سیب تھے۔ ان میں سے میں نے پانچ سیب پنڈت منگھی رام چک کے گھر بھیجے جنہیں دیکھ کر ان کی دلھن بڑی خوش ہوئی لیکن اسے یہ پتا نہ تھا کہ میرے سفر کشمیر کی بانی کافی حد تک وہ بھی تھی۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کسی مقام پر آ کر کوئی انسان ایسا بھی مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ "نوہلین" کی ضرب کاری برداشت کر جائے اور اف نہ کرے۔ اشک نہ بہائے۔ جل کر خاک ہو جائے لیکن دھواں نہ اٹھے ہاں ایسا مقام آتا ہے اور وہ ہے محبت کے ٹیڑھے سیدھے موڑ۔ "**عارف بٹالوی**" نے نفسیات کا مطالعہ کرنے کے بعد اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔

بشیر جیبروس

تاریخ کشمیر

کشمیر کی تاریخ مسلم عہد تک

اس بات نے دوسرے مطالعہ کرنے والوں کی طرح مجھے بھی متعجب کیا ہے کہ کشمیر کے ماضی کے متعلق اتنی معلومات موجود ہیں۔ ریاست کے جس میں جموں اور کشمیر دونوں شامل ہیں، تاریخ گزشتہ کی تحریری دستاویزوں کا تقریباً ایک مکمل مربوط سلسلہ موجود ہے۔ برصغیر ہند و پاک کا کوئی اور حصہ اس کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

کشمیری اپنی تاریخ کو عموماً چار ادوار میں تقسیم کرتے ہیں۔ ہندو راجہ، کشمیری مسلم، مغل اور پٹھان۔ دوسرے زیادہ جدید مورخین نے سکھ ڈوگرا اور قبل ہندو ادوار کا اضافہ کر کے اسے چھ یا سات ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ ہندو راجاؤں سے پہلے کی تاریخ کے سنگی آثار موجود ہیں اور ایسے حقائق بھی ہیں جن کی صداقت اہل وادی کو تسلیم ہے۔

ابتدا میں بہت سے بادشاہ کشمیر کے چھوٹے چھوٹے حصوں پر حکمراں تھے، ان کے جواڑے کو راج کہلاتے تھے۔ وہ آپس میں لڑتے رہتے اور جو ہار جاتے وہ ساتھ مل کر جیتنے والے راجپوت راجاؤں میں کسی سے مدد مانگ لیتے۔ ان اولین راجاؤں میں سے ایک کا نام گونندا اول بتایا جاتا ہے جو ۱۲۶۰ء ق م کے قریب حکومت کرتا تھا۔ امرناتھ کے شہرہ آفاق غاروں میں ان راجاؤں کے نام محفوظ ہیں ان میں ایک راجہ نارا کا ذکر بھی ہے جس نے ۱۰۴۸ء ق م سے ۱۰۰۸ء تک حکومت کی تھی لیکن کشمیر کے عالم بتاتے ہیں کہ ان دونوں راجاؤں کے زمانے سے پہلے ایک بے حد خوفناک زلزلے نے سندمت نگر کے بدکار شہر کو — سارے مشرق کو — پیوند خاک کر دیا تھا۔ اس کے بعد سیلاب آنے سے وولر جھیل کا پانی تمام علاقے پر چڑھ گیا تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ واقعات سندرسین کے دور حکومت میں (۲۰۸۲ء اور ۲۰۰۲ء ق م کے درمیان) پیش آئے تھے۔ اس زمانے سے بھی پیچھے جائیں تو کچھ مورخین نے تخت سلیمان یا شنکر اچاریہ سے متعلق دستاویزات

میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ اصل عمارت سندیمان نے تعمیر کی تھی جو کشمیر پر ۲۶۲۲ء سے ۲۵۶۴ء ق م تک حکمران رہا تھا۔ بہر حال دوسرا دعویٰ ہے کہ عمارت ۲۰۰ء ق م سے پہلے کی بنی ہوئی نہیں اور جب اسے جلوک نے بنوایا تھا اور چھٹی صدی عیسوی میں راجہ گوپادت نے نئے سرے سے تعمیر کرایا تھا۔

۳۲۷ء ق م میں سکندر اعظم نے شمالی ہندوستان پر حملہ کیا۔ وہاں اس وقت بدھ مذہب کا غلبہ تھا۔ عظیم بدھ راجہ اشوک نے جس کی سلطنت بنگال سے دکن، افغانستان اور پنجاب تک پھیلی ہوئی تھی کشمیر کو تقریباً ۲۵۰ء ق م میں فتح کیا۔ وہ خود بدھ مت کا پیرو تھا اور اسی کو اس نے ریاستی مذہب قرار دیا۔ اس کے بیٹے جلوک نے جو ۲۰۰ء ق م کے قریب اس کی جگہ تخت نشین ہوا دوبارہ شیوا کی پرستش شروع کی اور وہ ناگا دوشیزاؤں کا بڑا شیدا تھا۔ اسی نے اصل تخت سلیمان کی جگہ پر پہلا ہندو مندر بھی تعمیر کیا۔

اشوک ہی نے سری نگر کے اصل شہر پندرا تھن کی بنا ڈالی۔ یہ اب موجودہ شہر سے دریا کے بہاؤ کے خلاف جاتے ہوئے، تین میل پر ایک گاؤں ہے۔ اشوک نے مصر اور یونان سے دوستانہ تعلقات قائم کئے۔ چنانچہ اس زمانے میں کشمیر میں جس فن تعمیر اور مجسمہ سازی نے رواج پایا اس میں ان دونوں ممالک کا اثر نمایاں ہے۔ اس گاؤں میں، پہنچ کر جہاں پرانا شہر آباد تھا، یہ ماننا پڑتا ہو گا کہ انتخاب اچھا تھا۔ لہذا مقام ہے اور دریائے جہلم کے بڑے خم سے کھیتوں کے اس پار شاندار منظر دکھائی دیتا ہے اور عقبی پہاڑ سردیوں کے مہینے میں اس کے لئے ایک بیش قیمت آڑ بن جاتے ہیں۔

دوسری قبل مسیح صدی میں بدھ مت ترشک راجاؤں ہشک

کنشک اور ہشک کی حکومت رہی۔ ان کے زمانے میں کہا جاتا ہے کہ ناگا مشتعل ہو گئے اور انہوں نے پہاڑ کے ڈھلان پر برف کی سلوں کو لڑھکا کر بہت سے بدھیوں کو مار ڈالا۔" اس کے بعد ... وادی پر حملہ آور ہوئے ظلم و تشدد کے بعد ... رومی افواج ہندوستان کو فتح کر رہی تھیں ایک مشہور سیاح چینی، بادشاہ ہشک کی یادداشتیں زندہ ہیں۔ اسی نے کشمیر کے بدھ مذہب کی تاریخ میں مجلس منعقد کی تھی۔ اسی مجلس نے "قانون کا عظیم" نیا ذریعہ اظہار مرتب کیا تھا۔ لیکن چھٹی صدی عیسوی میں سفید ہن بادشاہ کے آنے کے بعد بدھ مذہب کشمیر میں بتدریج ناپید ہو گیا۔ اس بادشاہ کی آمد کے ساتھ وسط ایشیا سے سیاسی نقل مکانی کے ایک سلسلے کا آغاز ہوا جو تقریباً تین سو سال تک جاری رہا۔

وادی کی ہری نگر کی چھوٹی چھوٹی وادیوں میں سے ایک کے دہانے کے پاس، جہاں سے ڈل جھیل کا آئینہ صفت پانی نیچے نظر آتا ہے، بمقام ہردان ایک جگہ اب بھی دکھائی جاتی ہے جو اس زمانے میں مشہور بدھ عارف ناگارجن کی، جسے تمام ملک پر بے چون و چرا مذہبی اختیار حاصل تھا، جائے رہائش تھی۔ وہ بڑے پائے کا کیمیا گر تھا۔ اس کی کہانی اس لحاظ سے دلچسپ ہے کہ وہ ایک مدت سے محروم اولاد متمول برہمن گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ اس کے پیدا ہونے پر نجومیوں نے پیشین گوئی کی کہ وہ سات سال سے زیادہ نہ جیئے گا۔ والدین اپنے چہیتے بچے کو حسب پیشین گوئی مرتے دیکھنا نہ چاہتے تھے اور انہوں نے اسے متعدد مقامات کے سفر پر بھیج دیا۔ وہ نالندہ پہنچا، راہب بن گیا۔ اس نے برہمنوں کی تعلیمات کی تردید کرنا سیکھا اور وقت آنے پر تمام بدھ مذہب کا پیشوا بنا۔

روایتوں میں اس زمانے کے جس بادشاہ کا ذکر سب سے زیادہ ہے وہ سفید ہن بادشاہ مہرہ کل ہے۔ اس کا قابل اعتبار ثبوت موجود ہے کہ وہ ۵۲۸ء کے قریب حکمران تھا۔ اس کے ظلم و ستم کی بہت سی کہانیاں بیان کی جاتی ہیں۔ وادی کے جنوب مغرب میں واقع درہ پیر پنجال سے متعلق ایک کہانی لوگوں میں سینہ بسینہ منتقل ہوتی آئی ہے۔ وہاں ایک چٹان ہے جس پر اس نے فوج کے ہمراہ پہاڑ پار کیا تھا۔ ان دنوں افواج ہاتھیوں کا کثرت سے استعمال کرتی تھیں۔ ان میں سے ایک ہاتھی نیچے گھاٹی میں گر پڑا اور اس کی درد بھری چیخوں سے بادشاہ کو اتنا مزا آیا کہ اس نے سو اور ہاتھی زبردستی نیچے گرانے کا حکم دے دیا۔ ایک اور کہانی مائیں ابھی ان لڑکیوں کو سناتی ہیں جن کے شادی سے پہلے ہی خراب ہو جانے کا اندیشہ ہو۔ وہ یہ ہے کہ چندر کُلیا دریا سے ایک بڑا بھاری پتھر ہٹانے کی ضرورت پیش آئی۔ بادشاہ کو خواب میں کسی نے بتایا "صرف پاک دامن عورت ہی اسے وہاں سے ہٹا سکتی تھی۔" بہت سے شہروں کی بیویوں نے پتھر ہٹانے کی کوشش کی مگر ناکام رہیں۔ آخر چندراوتی نامی کمہارن نے یہ کام سرانجام دیا۔ اتنی عورتوں کو بدچلن پا کر بادشاہ بڑا برہم ہوا اور اس نے حکم دیا کہ انہیں ان کے شوہروں اور بچوں سمیت تہ تیغ کر دیا جائے۔ سب ملا کر تعداد تین لاکھ تک پہنچتی تھی۔"

کہا جاتا ہے کہ اس کی آمد کی خبر لوگوں کو ان گدھوں سے ہو جاتی تھی جو اس کے ہاتھوں قتل ہونے والوں کو کھانے کے لالچ میں ہمیشہ آگے آگے اڑتے رہتے تھے۔" اس شخص کی حرکات تشدد آمیز تھیں اور وہ موت سے مشابہ تھا۔" اس کی اپنی موت بھی ڈرامائی تھی کیونکہ اس نے خودکشی کی

۶۳۰ء کے قریب کا چینی بدھی سیاح ہیون سانگ اپنے وقائع میں اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ اس مشہور جابر نے چند ہی بدھی خانقاہوں کو صحیح سلامت رہنے دیا۔ ان میں سے ایک کے ... آثار، جو اس کی خوبصورتی پر دال ہیں، آج کل ہردوان کے مقام پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ ہیون سانگ نے "بدھیوں کے منادر" کا ذکر بھی کیا ہے اور یہ کہ اس دہشت انگیز تعداد سے نپٹنے کے لئے راہب ... سے دوسرے لوگ پناہ ڈھونڈنے کشمیر سے تبت کو فرار ہو گئے تھے۔ اس بادشاہ سے دور جس کی وسط ایشیا میں وسیع اقالیم تھیں، جو برہمنوں کا اصل سرپرست تھا۔

ایک اور بادشاہ جو اس زمانے میں حکومت کرتا تھا اپنی دلی صداقت ... کی یادداشت کے لئے کشمیریوں کے دلوں میں چھوڑ گیا ہے اور لوگ آج بھی جب کوئی غیر معمولی طور پر مبارک بات پیش آئے یہ کہتے ہیں کہ راجہ ونیادت کا زمانہ لوٹ آیا ہے۔ اس نے اوائل عمر ایک پجاری کی نگرانی میں گزارے تھے اور جب لوگ اس سے اپنے باپ کی گدی پر بیٹھنے کی درخواست کرنے آئے تو اس نے کہا کہ اگر وہ اس کی کچھ شرائط قبول کرنے کو تیار ہوں تو وہ ان کی بات مان لے گا۔ خاص خاص شرائط یہ تھیں ——— اس کی رعایا میں سے کوئی کبھی جھوٹ نہ بولے گا، ...

خود ہو گا نہ دے گا، اور کسی ذی حیات کی جان نہیں لیگا۔ اپنے لئے اس نے شنکراچاریہ پہاڑی کے دامن میں ایک چھوٹی سی کٹیا بنائی اور قریب ہی دو بیگھے ٹکڑے گرد تعمیر کروائے اور کشمیر کے زمینداروں سے درخواست کی کہ جو کچھ ان کی زمین پر پیدا ہو اس کا دسواں حصہ جو اپنی خوشی سے ہے ان کو داموں میں جمع کرا دیں۔ یا گے دام کی نگرانی پر اس نے بھائی کو مامور کیا اور دوسرے میں کہ ہر صبح خود صرف ضرورت مندوں کو بخش دیا کرتا۔ اس نے صرف اتنی فوج باقی رکھی جو اسکے علاقے کی حفاظت کرنے کیلئے کافی تھی اور تمام فوجی عہدوں کو ختم کر دیا۔ کہتے ہیں کہ وہ سادہ زندگی بسر کرتا تھا۔ اپنی زمین کے ایک حصے کو خود کاشت کرکے اپنی کفالت آپ کرتا اور اپنی پیداوار کا دسواں حصہ گودام میں جمع کرا دیتا۔ اگرچہ راجہ جو کسی اہمیت کا حامل تھا، نیک اور پارسا تھا۔ وہ برہمن تھا۔ اس نے کشمیر میں برہمن فرقے کی برائیاں دور کرنے اور اسے ترقی دینے کے لئے بہت کام کیا اور تخت سنبھالنے اور گوکلیہ پر مندر بنوائے۔

راجہ تونجین کے دور میں کشمیر میں بڑا سخت قحط پڑا۔ روایت ہے کہ ہزاروں لوگوں کی کرامات آمد سے دور ہوا۔ اس کے بعد راجہ ماترگپت کا زمانہ آیا جو مالوہ کا ہوتا ہے۔ راجہ [illegible] اجین کا باج گزار تھا۔ وہ فیاض طبع اور نرم دل آدمی تھا جس کی "شجاعانہ خوش خلقی اور رعایا کی تربیت اس زمانے کے اخلاق و آداب کے لئے اچھا خیال پیدا کرتی ہے۔" اس نے راجہ پرورسین کی اطاعت قبول کی۔ پرورسین دوم وہ راجہ تھا جس نے سری نگر نامی نئے دارالسلطنت کی بنیاد ڈالی۔

اب راجہ للتادت کا [illegible] جسے مکتا پیڑ بھی لکھتے ہیں اہم زمانہ ہے جو سب سے زیادہ یادگار ہے۔ اس نے تقریباً ۷۲۵ء سے ۷۶۱ء تک حکومت کی۔ اس کے زمانے میں کشمیر نے جو اب تک غلامی کی صعوبتیں سہتا رہا تھا، خوش حالی دیکھی اور اپنی حفاظت کرنے کا اہتمام [illegible] کے باشندوں نے جارحانہ اقدام کئے۔ اس کی فوج ساٹھ ہزار سے زیادہ سواروں اور پچاس ہزار پیدلوں پر مشتمل تھی۔ "وہ دنیا کو فتح کرنے کے لئے ملک سے نکلے" اور کشمیری مورخوں کا دعویٰ ہے کہ اس میں للتادت کامیاب رہا۔ اس میں شک نہیں کہ اس نے قنوج کے راجہ اور پنجاب کی پہاڑیوں کے تمام [illegible] سرداروں کو اپنے سامنے سر جھکانے پر مجبور کر دیا۔ تبتیوں اور وسط ایشیا کی اقوام کو شکست دی اور بارہ سال کے بعد لوٹ کر تبتیوں کو بلتستان میں مار بھگایا۔

یہ نامور سورما کشمیر کے راجہ پرتاپ دت کا بیٹا تھا" اور ایک حیرت انگیز طور پر امیر اور پر تجمل سوداگر کی داشتہ کے بطن سے تھا جس کے حسن نے بادشاہ کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔" بہت سوں کا دعویٰ ہے کہ وہ خالص کشمیری تھا مگر اس بارے میں کافی شبہات پائے جاتے ہیں کیونکہ اس کا دادا جو اس کے شاہی خاندان کا بانی بھی تھا، کہا جاتا ہے معمولی خاندان کا آدمی تھا گو اپنے عہد سے پہلے کے حکمران خاندان کے رشتہ داروں میں تھا، تاہم یقینی ہے کہ یہ خاندان بیرونی نسل کا تھا۔ ممکن ہے کہ وہ کشمیر میں دو یا شاید تین پشتوں سے آباد ہو۔

وہ اپنی فتوحات سے "بہت سے فنون اور پیشوں میں ماہر عالم اور کاریگر" اپنے ساتھ لایا اور اس نے خود کو ملک اور قوم کی بھلائی کے لئے وقف کرنا شروع کر دیا۔ اس کا زیادہ وقت عوامی کاموں میں گزرتا۔ اس نے بڑے بڑے مندر بنوائے اور [illegible] کے اندرونی حصوں اور بیرونی قلعوں کو سونے سے آراستہ کیا جو [illegible] میں اس سے پہلے آیا تھا۔ یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ مارتنڈ کا زبردست مندر اسی کی تعمیر ہے گو کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس میں [illegible] ایک راجہ [illegible] ۲۹۳۶ [illegible] نے بنوایا تھا اور راجہ للتادت نے اس کے قریب [illegible] تعمیر کروا کے ستون [illegible] آمدے کا اضافہ کر دیا۔ اغلب یہ ہے کہ اسے ان پتھروں کا خیال آیا ہوگا جو اصل مندر میں لگے ہوئے تھے اور اس نے اپنے معماروں کے نمونے پر مندر کو بالکل نئے سرے سے بنوا دیا اور اس مقصد کے لئے صرف پتھروں کو کام میں لایا۔ پرہاسپور میں اس نے ایک [illegible] اور مندر بنوایا اور ایک بڑا زبردست ستون کھڑا کروایا۔ اب بڑے بڑے پتھروں کے سوا وہاں کم ہی باقی ہے اور کہا جاتا ہے کہ جن پتھروں کو لے جانا سہل تھا انہیں بارہ مولا کی سڑک بنانے کے کام میں لایا گیا۔ اس نے نہریں کھدوائیں، پانی کی نکاسی کو منظم کیا اور اس طرح اس زمین کو قابل کاشت بنا دیا جو پہلے بیکار پڑی تھی۔ اس کی رعایا خوشحال تھی، مگر اس میں کلام نہیں کہ اس کی بہت سی عظمت خیالی ہے اور ہم تک پہنچتے پہنچتے حقیقت کا درجہ حاصل کر چکی ہے۔ مثال کے طور پر یہ کہانی کہ اس نے اتنی عظیم الشان دیگ بنوائی تھی جس میں ہر روز ایک لاکھ آدمیوں کے واسطے کھانا پک سکتا تھا۔ وہ "انصاف پسند" زبردست اور حلیم تھا لیکن اس کی فطرت کا ایک اور پہلو بھی تھا؛ شراب

کے نشے میں وہ انتہائی ظالمانہ احکامات صادر کرتا اور اپنے الفاظ یا ایمان پر ہمیشہ قائم نہ رہتا۔ بدمست دیوانگی کے ایک دورے میں اس نے حکم دیا کہ پرورسین کا بنایا ہوا خوبصورت شہر نذرِ آتش کر دیا جائے۔ اور جیسا تاریخ میں مذکور ہے کہ روم جل رہا تھا اور نیرو سارنگی بجا رہا تھا۔ اسی طرح سری نگر کے شہر کو جلتا دیکھ کر للتادت خوشی سے دیوانہ وار رقص کر رہا تھا۔ تاہم اس کی سپاہ بے چین تھی۔ وہ طویل عرصے تک فتح اور لوٹ کی عادی رہی تھی اور اس سے محروم ہو کر اس نے آپس میں لڑنا شروع کر دیا۔ ملک میں اضطراب تھا اور چھوٹی موٹی خانہ جنگیاں چھڑ گئیں۔ بادشاہ بھی مزید فتوحات کا خواہشمند تھا اور وہ وسطِ ایشیا روانہ ہو گیا۔ اس کی رعایا نے اسے واپس بلانے کی کوشش کی، لیکن وہ چالیس سال حکومت کرنے کے بعد ترکستان میں مر گیا۔

کشمیر سے روانہ ہونے سے پیشتر، گویا یہ جانتے ہوئے کہ وہ کبھی لوٹ کر نہ آئے گا، اس نے اپنی رعایا کو بہت سی عاقلانہ نصیحتیں کیں جو "راج ترنگنی" میں محفوظ ہیں۔ اس نے انہیں بیرونی خانہ جنگی کے خطروں سے خبردار کیا۔ چونکہ انہی کی وجہ سے اس نے اپنی فوج کو ملک سے باہر لے جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس لئے یقیناً اسے ان کا خیال ہوگا۔ اس نے انہیں اپنے اپنے قلعوں میں سامان رسد اور مرمت کی بابت تاکید کی۔ اس نے اپنی پہاڑوں میں رہنے والی رعایا کے لئے قانون بنائے کہ نظم و ضبط پر سختی سے پابندی ہو، کاشتکاروں کے پاس ہمیشہ صرف اتنا غلہ چھوڑا جائے جو ان کو بس سال بھر کے لئے کافی ہو، ان کو صرف اتنے مویشی اور بیل رکھنے کی اجازت ہو جو بالکل ضروری ہوں، ورنہ وہ طمع کا شکار ہو کر اپنے ہمسایوں کی زمین پر قبضہ کر لیں گے۔ اس نے ایک اور آئین بھی بنایا جس پر صدیوں تک عمل ہوتا رہا وہ یہ کہ "کاشتکاروں پر جبر کرنا ضروری ہے۔ ان کا طرزِ زندگی شہر کے لوگوں کے معیار سے پست رہنا چاہیئے ورنہ شہر والے نقصان اٹھائیں گے۔" اس کا سب سے دانشمندانہ حکم آخر میں آیا۔ گو اس پر بدقسمتی سے اس کے بعد سے آج تک عمل نہیں ہوا وہ یہ کہ اپنے افسروں میں اقربا پروری کو وہ برداشت نہیں کرے گا۔

اس کے دورِ حکومت میں کشمیر نے جن بلندیوں کو چھوا ان تک کشمیر نہ پہلے پہنچا تھا اور نہ بعد میں پہنچا۔ جب وہ تخت نشین ہوا تو اس کے بھائی کی بدعملی کی وجہ سے ملک کی حالت ناگفتہ بہ تھی لیکن اس کے ماتحت کشمیری حملوں کا شکار ہونے کی بجائے خود حملہ آور اور لٹنے کی بجائے خود لوٹنے والے بن گئے اور جب وہ اپنے وطن لوٹے اور اس کی حالت کا دوسرے ملکوں سے مقابلہ کیا جو انہوں نے دیکھے تھے تو شرمندہ ہو گئے اور اپنے روشن خیال بادشاہ کی عاقلانہ فرمانروائی میں انہوں نے بہت سی خرابیاں دور کر دیں تاکہ اپنے ملک پر فخر کر سکیں۔

اس کے بعد جو کئی راجہ ہوئے ان کی حکومت کا زمانہ یا عرصۂ حکمرانی مختصر تھا۔ للتادت کا پوتا بھی ملک کی روایات میں تقریباً اتنا ہی مشہور ہے، کیونکہ وہ بھی دنیا فتح کرنے کے لئے روانہ ہوا تھا۔ گنگا پہنچ کر اس نے قنوج کے راجہ کو شکست دی لیکن پھر اسے خبر ملی کہ خود اس کا تخت و تاج خطرے میں تھا اور غاصب کو بے دخل کرنے کے لئے اسے کشمیر لوٹنا پڑا لکھا ہے کہ وہ "شاعروں کی جماعتوں کی حوصلہ افزائی اور نئے شہر آباد کرتا تھا"۔ اس کے بعد" ایک آرام طلب اور عیاش شہزادہ تخت پر بیٹھا۔ اس کی جگہ پھر ایک بچے نے لی جس کے سرپرست چچا تھے۔ جونہی وہ حکومت کا کام سنبھالنے کے لائق ہوا چچاؤں نے اسے مار ڈالا اور اس کی جگہ ایک اور بچے کو تخت پر بٹھا دیا۔ یہ بچہ جوان ہو کر اپنے چچاؤں کے جھگڑوں کی بدولت، تقریباً چالیس برس تک حکومت کرتا رہا۔ لیکن آخر میں اسکا بھی وہی حشر ہوا اور اس کی جگہ پھر ایک بچے کو بٹھایا گیا اور جونہی اس بچے نے اپنا حق جتانا شروع کیا اسے بھی دوسروں کی طرح ٹھکانے لگا دیا گیا۔

راجہ اونتی ورما کی حکومت کا آغاز ۸۵۵ء میں ہوا۔ للتادت کے عہد کے بعد ہی ایک سو بیس سال تک ملک کو بدعملی کی وجہ سے معاشی طور پر نقصان پہنچا تھا۔ وادی میں جو پانی زمینوں کو غرقاب کرتا تھا اس کا بیشتر حصہ اونتی ورما کے عہد میں نکالا گیا۔ عالم انجینئر سویہ نے دریائے جہلم کی تہ گہری کروا کر سویہ پور کے مقام پر پانی کے نکلنے کے لئے راستہ صاف کر دیا۔ سویہ پور شہر کا نام اسی کے نام پر رکھا گیا تھا لیکن اب وہ سوپور کے نام سے مشہور ہے۔ اونتی ورما نے اونتی پورہ نامی شہر بھی بسایا تھا جو اب سری نگر اور اسلام آباد کے درمیان جہلم کے کنارے پر ایک خستہ حال گاؤں ہے۔ یہ گاؤں دو عمارتوں کے عظیم کھنڈروں کے درمیان آباد ہے۔ عمارتیں قدیم کشمیری معماری کی غالباً سب سے پر رعب مثال ہیں اور مارتنڈ کی معماری سے مختلف نہیں، لیکن زیادہ مفصل بت کاری سے مزین ہیں۔ اونتی ورما

ہی نام توجہ اپنے ملک کی تحصیل پر رہی ۔ کسی تحریر سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ اس نے دوسروں کو فتح کرنے کے لیے ملک سے باہر قدم نکالا۔

اس کے بعد ۸۸۳ء میں اس کا بیٹا شنکر ورما تخت نشین ہوا۔ یہ بڑا زبردست فاتح تھا اور اپنے ہمسائے کے بھائی سے تخت و تاج جیت کر " نو لاکھ پیادے ، تین سو ہاتھی اور ایک لاکھ سوار " لے کر روانہ ہوا ۔ اگر یہ تعداد درست ہے تو اس کے حیرت انگیز ہونے میں شبہ نہیں ۔ لیکن اتنے آدمی آئے کہاں سے ؟ کیا انہیں اس پاس کے علاقوں سے بھرتی کیا گیا تھا ؟ اس میں بہت کم شک ہے کہ وہ ذات سے بہت سے پوچھو اور پہاڑیوں کے ہو گئے ۔ اس کی یادگار صرف پٹن کا مندر ہے جسے اس زمانے میں شنکر پورہ کہا جاتا تھا ۔ اس کے کردار کے بارے میں لکھا ہے کہ " وہ حریص جابر ، خمار باز اور عیاش تھا " اس کے باوجود اس نے اپنی ملکہ سوگندا کے ساتھ مل کر مہادیو کے نام پر دو مندر بنوائے تھے ۔

بعد ازاں طویل مدت تک راجا ، ان کے بھائی بھتیجے ، رشتے کے بھائی اور دوسرے لوگ اقتدار حاصل کرنے کے لئے آپس میں لڑتے جھگڑتے رہے ۔ چھوٹی چھوٹی سلطنتیں قائم ہوئیں ۔ بچہ راجاؤں نے حکومت کی ۔ شنکر ورما کے فوراً بعد جسے تخت ملا وہ ایک بچہ تھا ۔ اس کی ماں کو نیابت کے فرائض انجام دیتی تھی وزیر کے ، جو اس کا محبوب تھا ، زیر اثر تھی ۔ تخت نشینی کے دو سال بعد بچے کو وزیر نے قتل کر دیا ۔ اس کے بعد جو بچہ گدی پر بیٹھا وہ بھی بس چند دن زندہ رہا ۔ پھر قائم مقام ماں نے وزیر کو برطرف کر دیا اور خود دو تین سال تک ملک پر حکومت کی ۔ ویسے فوجی سردار اس کی باتیں نہ مانتے تھے ۔ وہ اپنی بات پر قائم رہی تو انہوں نے بغاوت کر دی اور ملکہ کو پکڑ کر تہ تیغ کر دیا ۔ اس کے بعد فوج نے اپنی مرضی سے ایک راجہ کو تخت پر بٹھایا اور وزیر ایسے چنے جو بے ایمان تھے ۔ یہ سلسلہ زیادہ عرصے تک جاری نہ رہ سکا اور دو سال کے بعد راجہ کو اپنی جگہ ایک بھتیجے کو دینی پڑی ۔ ایک اور بغاوت ہوئی اور پھر ایک اور راجہ تخت پر بیٹھا جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے سپاہیوں کو کافی رشوت نہ دے سکا اور اس لئے وہ بھی معزول ہوا ۔

یہاں سے کشمیر کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا ۔

جاگیر داروں نے جن میں اکثر چھوٹے موٹے راجاؤں سے کچھ ہی کم تھے ــــــ جو بری نگر میں فوجی گروہ کے اقتدار کی بیجا کی ہوئی چپقلش سے بہت تکلیف اٹھا چکے تھے ، اپنی مختصر فوجوں سمیت سری نگر پر دھاوا بول دیا ۔ انہوں نے فوجی امرا کو شکست دی ، وزیر کو نکال باہر کیا اور تخت پر ایک ایسے آدمی کو بٹھا کر ، جو جائز طور پر راجہ بننے کا مستحق تھا ، قدیم شاہی نسل کو بحال کر دیا ۔ بہر حال اس آدمی نے " ان لوگوں کا جنہوں نے اسے تخت پر بٹھایا تھا ، اس کے منہ آتنا کچھ کیا تھا احسان بھلا دیا اور ذلیل مظالم اور بے اعتدالیوں کو اپنا شعار بنا لیا حتیٰ کہ جاگیردار اسے برداشت نہ کر سکے اور ایک رات انہوں نے اسے ، جب وہ اپنی نیچ ذات رانیوں میں سے ایک کے پاس لیٹا تھا ، قتل کر ڈالا "

جاگیرداروں کی بدنصیبی اب بھی ختم نہ ہوئی کیونکہ اس کا جانشین اور بھی گیا گزرا ثابت ہوا ۔ اس کے مظالم اور نفسانی بے اعتدالیاں پاگلوں جیسی تھیں اور ایک وزیر ، جو تمام وقت تخت پر قابض ہونے کی تدبیر کر رہا تھا ، اس کی حوصلہ افزائی کرتا رہتا تھا ۔ وزیر نے اس کے دل میں یہ بات بٹھا دی کہ اس کے اقربا اس سے تخت چھیننے کا ارادہ رکھتے ہیں ۔ اس پر وہ انہیں غارت کرنے پر تل گیا ، کچھ کو قتل کیا ، کچھ کو گڑھوں میں پھنکوا کر بھوکا مارا ۔ مارنے کا یہ طریقہ اس زمانے میں مقبول تھا ۔ وہ صرف دو برس زندہ رہا اور اس کا جانشین چند دن کے بعد تخت چھوڑ کر بھاگ گیا ۔

سپہ سالار یعنی وزیر تخت پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا ۔ اسے احساس تھا کہ برہمنوں کو ملک میں بڑی طاقت حاصل ہے اور ان کا اعتماد اور حمایت حاصل کرنے کی غرض سے اپنا انتخاب ان کی ایک انجمن پر چھوڑ دیا ۔ وہ حیران رہ گیا جب انہوں نے اپنے میں سے ایک کو راجہ چن لیا ۔ اس راجہ نے نو سال تک بڑی دانشمندی سے حکومت کی اور اس عرصے میں ملک میں پھر امن چین لوٹنے لگا ۔ لیکن یہ امن پائیدار ثابت نہ ہوا کیونکہ راجہ کی موت پر وزیر نے ، جس کا خیال تھا کہ نو سال پہلے اس کی حق تلفی ہوئی تھی ، شاہی محل میں زبردستی گھس کر راجہ کو قتل کر دیا اور لاش دریائے جہلم میں پھینک دی ۔ اس نے ایک سال سے کچھ ہی زیادہ حکومت کی تھی کہ " اس کا بدن پھول کر اس کے سر جتنا بڑا ہو گیا " اور وہ مر گیا ــــــ یقیناً اسے استسقا کا مرض ہوا ہو گا ۔

اب ایک دلچسپ دور آتا ہے کیونکہ اس کی جگہ "کیمہ گپت" نامی شخص گدی پر بیٹھتا ہے "جو بے حد شہوت پرست تھا اور اس زمانے میں جتنی مکاریاں معلوم اور رائج تھیں سب کی سب اسے معلوم تھیں" اس نے پونچھ خاندان کی شہزادی "دیدا" سے شادی کی جو کابل شاہی خاندان کے مشہور راجہ بھیم کی پوتی تھی۔ وہ بڑے مضبوط کردار کی مالک تھی، چنانچہ اس کے عیش پرست شوہر کے عہد تک میں امور سلطنت پر اس کا کچھ اثر محسوس کیا جا سکتا تھا۔

۹۵۸ء میں کیمہ گپت کے مرنے پر اس کا نابالغ بیٹا تخت نشین ہوا۔ ظاہر ہے کہ رانی دیدا پورے شاہی اختیارات کے ساتھ اس کی سرپرست مقرر ہوئی۔ ان اختیارات میں سے بیشتر کو تو وہ اپنے عیاش شوہر کے سامنے ہی اپنے ہاتھ میں لے چکی تھی۔ سنگدلی میں وہ کشمیر کے کسی ظالم ترین راجہ سے کم نہ تھی۔ کچھ مورخ یہ قیاس ظاہر کرتے ہیں کہ "اپنے بیٹے کی جوان موت میں اس کا ہاتھ تھا" اس نے تمام حریفوں کو کچل دیا، تمام گرفتار ہونے والے باغیوں کو قتل اور ان کے خاندان کے بچے بچے کو مروا ڈالا۔ اس نے اپنے تین بے سہی تو وہ پوتوں کو بھی یا تو اعلانیہ قتل کروایا یا مشتبہ طریق سے ٹھکانے لگا دیا۔ اس کے بعد "وہ ایک قاصد پر عاشق ہو گئی، جو اصل میں لوہارا کا دیہقان چرواہا تھا۔ زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ اس زمانے میں وہ درباری پنجابیہ سمجھا جائے گا۔۔۔۔۔ اور اسے اپنا وزیر مقرر کر دیا۔ وہ اس کے تمام عرصۂ فرمانروائی میں اس پر چھایا رہا۔ وہ جوانمرد تھا اور اس نے ایسی اعلیٰ درجے کی فوج تیار کی کہ عظیم فاتح محمود غزنوی نے، جو ہندوستان میں اسلام پھیلا رہا تھا، جب کشمیر پر حملہ کیا تو اسے ناکام لوٹنا پڑا۔ رانی دیدا خود بھی زیرک اور دور بین موقع شناس تھی اور معلوم ہوتا ہے کہ جب تک وہ حکمران رہی ملک کی حالت ابتر نہ ہونے پائی۔

اپنے بیٹوں اور جانشینوں کا خاتمہ کرنے کے بعد اس نے اپنا ایک جانشین منتخب کر لیا۔ وہ اس کا بھتیجا سنگرام راجہ تھا جس نے اس کی تقلید میں فاصد وزیر کو مع فرزند قتل کر دیا۔ اس کے بعد معلوم ہوتا ہے متعدد لوگوں نے ذرا ذرا سی دیر کو راج کیا، ماؤں نے بیٹوں کو ٹھکانے لگایا، قتل اور خودکشی کا بازار گرم رہا حتیٰ کہ ۱۰۸۹ء میں راجہ ہرش دیو تخت نشین ہوا اور بارہ برس تک حکومت کرتا رہا۔ کشمیر کے آخری دور کے ہندو راجاؤں میں وہ ممتاز تھا: بہادر، لائق اور ہمہ گیر، فنون اور موسیقی کا دلدادہ، لیکن ظلم اور بے رحمی" چالاکی اور بے پرواہی نوبت بہ نوبت اس کی بوقلموں زندگی میں ظاہر ہوتی رہی" اس کا دربار بہت پرشوکت تھا وہ دانشوروں، موسیقاروں اور شاعروں کی حوصلہ افزائی کرتا تھا۔ اپنے پیشروؤں کی طرح، خاندان کے لوگوں میں مار کاٹ کے ڈر سے، اس نے خاندان کے ہر فرد کو مع اپنے سوتیلے بھائی اور اس کے بھتیجے بھانجوں کے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنی فوج اور تن پروری پر اتنی بے پرواہی سے روپیہ خرچ کیا کہ خزانہ خالی ہو گیا اور وہ مندروں کو بڑی بے رحمی سے لوٹنے پر اتر آیا۔ اس نے سونے کے بتوں اور مورتیوں کو بھی نہ چھوڑا۔ مزید یہ کہ اس نے لوگوں پر اور زیادہ محصول لگا دیئے۔ ملک میں ایک وبا پھیل گئی۔ لوگوں اور سپاہیوں کی بیماری سے فاقہ اٹھا کہ ہر جگہ چور چکاروں کا زور ہوا۔ اس کے بعد ایک خوفناک سیلاب آیا۔ جس کی وجہ سے قحط پڑ گیا نتیجہ یہ ہوا کہ فاقہ زدہ اور بیزار لوگوں نے بادشاہ کے خلاف بغاوت کر کے اسے ہلاک کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا سر قلم کر دیا گیا اور جب لوگ اسے دیکھ چکے تو جلا دیا گیا۔ اس کے دھڑ کو ایک خداترس ہیزم فروش نے اسی برہنگی کے عالم میں، جیسے کسی فقیر کو، نذر آتش کیا"

اس کے جانشین راجہ اوچل نے ورثے میں ایک خالی خزانہ اور "ایسے وزیر اور چھوٹے موٹے سردار پائے جنہیں بس لوٹ مار سے کام تھا" اور جب وہ ثانی الذکر کی مدد سے اقتدار پر فائز ہوا تو درحقیقت ملک پر انہی کی حکومت تھی اور اس کا اپنا چھوٹا بھائی "سلطنت میں خانہ جنگی شروع کرنے کا خواہاں تھا" یہ دیکھ کر کہ وہ بالکل تنہا تھا اور کسی پر بھروسہ نہ کر سکتا تھا راجہ نے ان کے درمیان حسد اور رشک کو ہوا دے کر انہیں آپس میں لڑا دیا۔ اس نے سرداروں کا خاتمہ یوں کیا کہ کچھ کو ملک سے نکال دیا، کچھ کو قتل کر ڈالا اور جو ملک میں چھوٹی چھوٹی جگہوں پر قابض رہ گئے تھے ان سے بزور ہتھیار رکھوا لئے اور اپنی ماتحتی پر مجبور کیا۔ وہ اس فیصلے پر پہنچا کہ اس کی رعیت میں اکثر کی موت کے ذمہ دار کایستھ افسر تھے اور وہ "تشنجی ہیضہ، پیچش اور اس بیماری سے جس میں اچانک موت واقع ہو جاتی ہے" سے کم تباہ کن نہ تھے۔ چنانچہ وہ ان پر باقاعدہ ظلم ڈھانے لگا لیکن ان کی جگہ جو ناقص نظم و نسق رائج کیا اس سے اس کے اقتدار میں کمی آ گئی۔ جہاں تک اس کی رعایا کا تعلق تھا وہ قابل اور فیاض لیکن کڑا آدمی تھا، دس سال کی حکومت کے بعد اپنے پیشروؤں کی طرح، وہ بھی تشدد کی موت مرا۔ حاکم شہر اس کے

بھائیوں کے ہمراہ رات کو محل میں داخل ہوا جبکہ رفقا کے ساتھ حرم سرا میں داخل ہو کر وہ اس سے دو چار ہوتے ہی اس پر ٹوٹ پڑے ہیں۔ گو وہ بے جگری سے لڑا لیکن ان نئے حملہ آوروں نے جلد ہی اس پر قابو پا کر اسے پانچ بار زخمی کر کے مار ڈالا۔"

اس کے جانشین نے بمشکل ایک دن راج کیا اور اس کا سوتیلا بیٹا [illegible] کے لئے حکمران رہا اسے اس کے بھائی نے قید کر دیا اور اس کی جگہ آٹھ سال تک حکومت کرتا رہا [illegible] یہ دو سال تھے جب [illegible] کے [illegible] بگڑے ہوئے جھگڑوں اور بغاوتوں کا دور تھا۔ اس [illegible] بار بار اپنے مخالفین کی خوشحالی کرنے کی مقدور بھر کوشش کی۔" [illegible] چند وزیر کو اس کے تین بیٹوں سمیت قید کر دیا اور آخر ان کا گلا گھونٹنے کا حکم دیا۔"

تواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خبیث ذہنیت کا مالک تھا۔ [illegible] اس کے پاس بطور [illegible] ہوتے ان کو انتہائی [illegible] پہنچاتا تھا۔ آخر انہوں نے اس قدر بھاری تعداد میں اس کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا کہ وہ پونچھ سے فرار ہونے پر مجبور ہو گیا۔ کوئی ایک سال تک ایک جھوٹا دعویدار تخت پر قابض رہا۔ اس دوران میں ملک کے غریب فلاکت زدہ لوگ ان لوگوں کے جتھوں کے جو تخت پر قبضہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے، رحم و کرم پر زندگی بسر کرتے رہے۔ اس کے بعد راجہ لوٹ آیا اور اپنے پیش روؤں کی مثال پر عمل کرتے ہوئے اس نے جاگیرداروں کو آپس میں لڑوا دیا اور مزید پانچ برس تک حکمران رہا۔ ہمیں پانچ برسوں کے بعد اس کا بھی وہی انجام ہوا۔ اسے مار ڈالا گیا۔"

اگلی دو صدیوں تک یہی حالت رہی۔ زمینداروں کا جو اپنی جگہ خود چھوٹے موٹے راجہ تھے، غلبہ تھا اور وہ سری نگر کے راجہ کی مطلق نہیں سنتے تھے۔ ان میں سے کچھ راجاؤں نے کئی سال تک حکومت کی، کچھ نے چند سال تک اور بالآخر ہندو سلطنت پارہ پارہ ہو گئی۔

سر فرانسس ینگ ہزبینڈ، جو اس صدی کے آغاز میں سری نگر میں برطانوی ریذیڈنٹ تھے۔ ان ادوار میں راجاؤں کی خونریزی اور قتل کے واقعات پر جن کا ذکر ان صفحات میں ہوا اور جو پنڈت کلہن سے ماخوذ ہیں، کہتے ہیں: "ان کی ہو بہو نقل میں نے اسی سرحد کی آزاد ریاستوں میں اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔ جب میں ۱۸۸۶ء میں ہنزہ گیا تو وہاں کے والی نے، جسے اب جلاوطن کر دیا گیا ہے، اپنے باپ کو قتل اور دو بھائیوں کو زہر دے دیا تھا اور دو بھائیوں کو پہاڑ سے نیچے پھنکوا دیا تھا۔ میں ۱۸۹۳ء میں چترال گیا۔ جب مہتر چترال کا باپ مرا تھا تو وہ کل سترہ بھائی تھے۔ جب میں وہاں پہنچا تو کل چار زندہ تھے اور بعد میں خود مہتر چترال کو اس کے تین بھائیوں میں سے ایک نے مار ڈالا۔ اس بھائی کو قتل کرنے کی اجازت متوفی مہتر چترال نے اکثر مجھ سے لینی چاہی تھی کہ اگر اس نے بھائی کو نہ مارا تو بھائی اسے مار ڈالے گا۔ چترال میں بھی [illegible] کی [illegible] کشمیر کی تاریخ جو [illegible] ہے [illegible] کے قتل خوفناک طور پر عام تھے۔"

تاریخ میں لکھا ہے کہ جب ۱۳۰۱ء میں راجہ سہدیو تخت نشین ہوا تو کشمیر [illegible] کا ملک تھا۔ اس راجہ کے عہد میں کشمیر پر ذوالقدر خان تاتار نے حملہ کیا اور راجہ کشتواڑ فرار ہو گیا حملہ آوروں نے سری نگر کو آگ لگا دی، جن لوگوں کو چاہا غلام بنا لیا اور جتنے باقی ماندہ لوگ ہاتھ آئے انہیں تہ تیغ کر دیا۔ ذوالقدر خان آٹھ مہینے ملک پر قابض رہا۔ چونکہ کاشتکار موجود نہ تھے اس لئے اشیائے خورد و نوش کی کمی آ گئی اور اس نے جنوب میں اس درے کے راستے سے جو وادی [illegible] سے گزرتا ہے، وادی سے رخصت ہونا چاہا لیکن جاڑوں کے دن تھے اور انہیں برف نے آ لیا۔ وہ [illegible] سے پسپا ہوتے ہوئے [illegible] میں سے بھی بدقسمت نکلے اور سب کے سب فنا ہو گئے۔

راجہ سہدیو کے [illegible] رام چند نے بہر حال کشمیر کو خیرباد نہ کہا تھا اور اب اس نے سری نگر کی طرف بڑھ کر کشتواڑ سے، جہاں راجہ نے بھاگ کر پناہ لی تھی، آنے والے گدیوں کو مار بھگایا۔ رام چند کے ساتھیوں میں دو آدمی تھے، ایک تو سوات کا شاہ میر اور دوسرا رینچن شاہ، جو تبت کے راجہ کا لڑکا تھا۔ رینچن شاہ اپنے باپ سے لڑ کر تو آیا ہی تھا یہاں رام چند سے بھی جھگڑ پڑا اور اسے اپنے ان ساتھیوں کی مدد سے جنہیں وہ تبت سے لایا تھا، قتل کر دیا۔ اس کے بعد اس نے مقتول کی لڑکی سے شادی کر لی اور ۱۳۲۰ء میں اپنے راجہ ہونے کا اعلان کیا۔ وہ ہندو مذہب اختیار کرنا چاہتا تھا مگر برہمنوں نے اسے اپنے دین میں شامل کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر کشمیر میں عرب سے کوئی بلبل شاہ آئے اور انہیں نماز پڑھتا دیکھ اور ان کے وعظ سن کر راجہ نے اسلام قبول کرنے کا فیصلہ کیا اور مسلمان ہو کر اپنا نام صدرالدین رکھا اور مندر توڑنے، مورتیاں تباہ کرنے اور ہندو مارنے شروع کر دیئے

ایک بے حد شاندار محل تعمیر کروایا جس میں دریائے سندھ کا ٹھنڈا تازہ پانی آتا تھا۔ اس محل کی بارہ منزلیں تھیں، ہر منزل میں پچاس کمرے اور ہر کمرے میں پانچ سو آدمیوں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ لیکن مسلمانوں کے بنائے ہوئے دوسرے محلوں اور مکانوں کی طرح اس کی تعمیر بھی لکڑی سے ہوئی تھی اور اب اس کا کوئی نشان باقی نہیں۔ کشمیر میں جن جن عالم ملاؤں سے میری ملاقات ہوئی ان میں سے ایک معمر بزرگ نے بتایا کہ "مسلمان وادی میں لکڑی کی مساجد بناتے تھے تاکہ وہ دورانِ عبادت میں مسلمانوں کو گرم رکھیں۔ مسلمانوں کو دن میں پانچ مرتبہ عبادت کرنی پڑتی ہے۔ ہندو پتھروں کے ٹھنڈے مندروں میں گزارا کر سکتے ہیں کیونکہ وہ دن میں صرف ایک دفعہ پوجا کرتے ہیں اور وہ بھی چند منٹ کے لئے۔"

زین العابدین نے ہندو علوم کی تجدید کے لئے ہر ممکن کوشش کی، مندروں کی مرمت کروائی۔ تخت سلیمان کا مندر بھی اسی کا مرمت شدہ ہے۔ اس کے پیشرو نے ان ہندوؤں پر، جنہوں نے وادی میں ٹھہرنے کی جرأت کی تھی، جو بھاری جزیہ عائد کیا تھا وہ زین العابدین نے نہ صرف ختم کر دیا بلکہ بھاگ جانے والوں کو واپس بلانے کے لئے انہیں جاگیروں کی پیشکش کی۔ مسلمان کا ہندوؤں سے ایسا رواداری برتاؤ کرنا حیرت انگیز تھا۔ آج تک بہت سے برہمن اس بات کی تشریح ایک صدیوں پرانی کہانی سے کرتے ہیں جس پر انہیں کامل یقین ہے۔ کہانی یہ ہے کہ تخت نشین ہونے کے فوراً بعد زین العابدین بیمار ہوا اور مرنے ہی والا تھا تو ایک ہندو یوگی، جو اس کا احسان مند تھا، آگے بڑھا اور کہنے لگا کہ وہ مرتے ہوئے جوان بادشاہ کی روح سے اپنی روح بدلنے کو تیار ہے؛ شرط یہ ہے کہ اس کی لاش کو کسی امن کی جگہ پر محفوظ رکھا جائے۔ بادشاہ نے یوگی کی روح کو قبول کر لیا لیکن اس کے بھائی یعنی وزیراعظم نے یوگی کی لاش جلوا دی۔ اور اس دن سے اصلی بادشاہ وہی ہندو تپشی تھا، زین العابدین نہیں تھا۔

ایک اور کہانی، جو غالباً درست بھی ہے، یہ ہے کہ بادشاہ کو کئی ماہ سے ایک بہت تکلیف دہ پھوڑے نے تنگ کر رکھا تھا اور شاہی حکیم اس کا علاج کرنے سے قاصر تھے۔ اتنے میں شری بھٹا نامی ایک شخص آیا اور اس نے کہا کہ وہ پھوڑے کو بغیر کسی تکلیف کے ایک سنہرے مرہم سے دور کر دے گا۔ اس کا علاج کامیاب رہا اور بادشاہ نے خوش ہو کر بھٹا کو حضور میں لانے کا حکم دیا اور کہا کہ جو مرضی چاہے مانگ لے۔ اپنے لئے کچھ مانگنے کی بجائے اس نے یہ استدعا کی کہ ظلم رسیدہ برہمنوں کو وادی میں امن و چین سے رہنے کی اجازت دے دی جائے۔ اس کے بعد سے بادشاہ نے اکثر موقعوں پر ان لوگوں کا اپنی مسلم رعایا سے زیادہ لحاظ رکھا۔ لہٰذا ہندوؤں میں وہ "بادشاہ" کے نام سے مشہور تھا۔

اس وقت تک، ہندو راجاؤں کے ماتحت، ملک کی سرکاری زبان سنسکرت رہی تھی۔ زین العابدین نے کشمیر میں فارسی رسم الخط کو رواج دیا۔ وہ خود بھی فنونِ لطیفہ اور ادب کا مربی تھا اور اس کے دربار میں ادیب، شاعر، موسیقار اور گویے ہر وقت موجود رہتے تھے اور ان میں سے اکثر دور دراز سے اس کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ کشمیر میں اس نے کاغذ سازی، ابریشم سازی اور بافندگی اور لداخ سے درآمد ہونے والی نرم اون سے شال بافی، جس کے لئے کشمیر مشہور ہوا، اور کاغذی مصنوعات کا آغاز کیا۔ وہ میدانی کھیل کود کا بھی بڑا شائق تھا۔

اس کے باوجود اس کے خون میں ملک فتح کرنے کی لگن تھی۔ وہ لڑنے نکلا اور تبت اور پنجاب کے کچھ حصے اپنی سلطنت میں شامل کر لئے۔ کشمیر میں چاک قبیلے سے اس کی ان بن ہو گئی جب اس نے سردار پانڈو چاک کو گرفتار کرنے کے بعد دردو کے علاقے میں دھکیل دیا؛ پانڈو چاک کے اتنے کوڑے لگوائے کہ وہ مر گیا اور پھر پشیمان ہو کر متوفی کے بیٹے حسین چاک کو اپنے مقربوں میں جگہ دی۔

زین العابدین نے انہتر سال کی عمر میں انتقال کیا۔ اس کے نام کی آج بھی کشمیری، خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، عزت کرتے ہیں۔ انہیں یاد ہے کہ وہ انصاف پسند، فیاض اور روشن خیال شہزادہ تھا جس نے پچاس سال کے عرصے میں ان لوگوں کی پیدا کی ہوئی خرابیوں کو جو اس سے پہلے صدیوں تک فرمانروائی کر چکے تھے، دور کرنے کی پوری کوشش کی۔ اس کے دورِ حکومت میں وادیٔ کشمیر واقعی "وادیٔ مسرور" تھی۔

جیسا کہ اکثر ہوتا ہے اس عظیم بادشاہ کا بیٹا شرابی اور کمزور ارادے کا مالک تھا۔ ۱۵۳۲ء میں مرزا حیدر نے شمال کی طرف سے

ترکوں یا مغلوں کی فوج نے ساتھ کشمیر پر حملہ کیا اور کچھ سال اس پر قابض رہا۔ اس کے بعد چاکوں کا ذکر آتا ہے جنہوں نے شمال کی طرف سے کشمیر پر دھاوا بولا۔ ان لوگوں کے متعلق ہمیں اس کے سوا بہت کم معلومات حاصل ہیں کہ وہ کشمیری نسل کے نہیں تھے اور ریاست کے سرحدی شمالی حصوں میں ان کا اب کچھ سراغ ملتا ہے۔ ۱۵۵۵ء کے بعد پینتیس سال کے عرصے میں ان میں سے آٹھ نے کشمیر پر راج کیا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ دلیر، تنومند، بے باک اور بیباک، حملہ در پہ ظالم لوگ تھے۔ تاہم انہوں نے ملک کو دنیا کی جنت سمال بنا دیا جیسا وہ سو سال سے کچھ کم چلے تھا۔

یوسف خاں نے، جو ۱۵۸۰ء میں تخت پر بیٹھا: "ایک کسان عورت سے شادی رچائی اور سب کچھ بھول کر عیش و عشرت میں مشغول ہو گیا:" گلمرگ کی دلکشی دریافت کرنے کا سہرا اس کے سر ہے۔ اس کی وزیر سے چپقلش ہو گئی۔ چونکہ تمام اختیارات وزیر کے ہاتھ میں تھے۔ اس نے بادشاہ کو ملک سے نکال دیا۔ یوسف خاں کے بیٹے یعقوب خاں کی طبیعت اور طرح کی تھی اور ۱۵۸۲ء میں جب اکبر اعظم نے کشمیر پر پہلا حملہ کیا تو یعقوب خاں نے وادی جہلم میں رہنے والے بمبا اور ککا لوگوں کی فوج جمع کر کے، زوروں کی بارشوں اور حملہ آوروں کے پاس سامان خورد و نوش کی کمی سے فائدہ اٹھا کر، مغلوں کو سخت جانی نقصان پہنچایا۔ یہاں سے کہانی پلٹا کھاتی ہے کیونکہ نازاں اور فتح مند سپہ سالار نے وادی واپس پہنچ کر نہ صرف ہندوؤں پر ظلم ڈھائے بلکہ سنیوں کے ساتھ بھی برا برتاؤ کیا۔ سنیوں نے اکبر سے درخواست کی کہ وہ ان کو نجات دلائے۔ اکبر نے ان کی التجا سنی اور وعدہ کیا کہ مذہبی رواداری کشمیر میں لوٹ آئے گی اور وہ غلاموں کی تجارت کو بالکل بند کرا دے گا۔ ۱۵۸۵ء میں اس نے مرزا قاسم کے ماتحت فوج روانہ کی۔ یعقوب خاں پھر اس سے ٹکر لینے کے لئے آگے بڑھا لیکن اب کی سپاہ اس سے ناخوش تھی اور اکثر سپاہی اس کا ساتھ چھوڑ کر مغلوں سے مل گئے۔ یعقوب خاں کو مجبوراً پسپا ہونا پڑا۔ حملہ آور اگلے سال سری نگر پہنچ گئے لیکن وہاں یعقوب خاں نے، جو تخت سلیمان پر مورچہ ڈالے ہوئے تھا، دوبارہ ان پر حملہ کیا اور جنوب کی طرف سے شمسی چاک کی فوجیں بھی ان پر ٹوٹ پڑیں۔ بعض مرتبہ تو حملہ آوروں کو شکست ہوتے ہوتے بچی لیکن وقت پر کمک پہنچ گئی اور ایک سال بعد کشمیری سلاطین کا دور ختم اور مغل شہنشاہوں کا عہد اکبر سے شروع ہوا۔ اس نے کشمیر کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا اور ساتھ ہی وادی میں امن و امان قائم کر دیا۔ تقریباً دو سو سال تک کشمیر سلطنت مغلیہ کا صوبہ رہا۔

اکبر تین دفعہ کشمیر آیا۔ پہلی مرتبہ تو وہ کشمیر کے تخت پر بیٹھنے کے لئے وارد ہوا۔ اس وقت دربار میں اس کا وزیر مالیات ٹوڈرمل بھی تھا، جس نے بمقام پٹن اپنے پڑاؤ سے یہ فیصلہ کیا کہ کشمیر کے لوگ کتنا محصول دیں گے۔ قصہ مشہور ہے کہ جب وہ خود پٹن کے باشندوں پر لگنے والے محصول کے بارے میں فیصلہ کرنے ہی والا تھا تو اس ضلع کے ایک بڑے زمیندار کی حسین لڑکی اس کے خیمے میں داخل ہوئی اور انجام کار عشق کی گرما گرمی میں وہ دستاویز مکمل کرنا بھول گیا۔ اس لئے ملک کے اس حصے کو اندراج اور متعلق محصول سے بچ جانے کے لئے اس لڑکی کا شکر گزار ہونا چاہیے۔

اکبر نے تیسری دفعہ آکر ہری پربت کی پہاڑی پر قلعے کو از سر نو بنوایا، اس کے گرد دیوار کا اضافہ کیا اور اس امید پر مزدوروں کو فیاضی سے تنخواہیں دیں کہ ملک سے بھاگے ہوئے لوگ لالچ میں آکر لوٹ آئیں گے۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے تیس ہزار باربرداروں اور قلیوں کو اس کام کے لئے نوکر رکھا تھا۔ لیکن اسے اپنی سلطنت پر دہلی سے حکومت کرنی پڑتی تھی اور وہ کشمیر میں تھوڑی ہی دیر رک سکتا تھا۔ اس کے باوجود وہ اس پائے کا حکمران تھا کہ اس نے اس بات کا خیال رکھا کہ جنہیں اس نے حاکم مقرر کیا تھا وہ وفاداری سے اس کے احکام پر عمل کرتے رہیں اور رعایا ان کے ماتحت خوش رہے۔

اکبر کا جانشین جہانگیر تھا جسے اپنی سلطنت میں سب سے زیادہ کشمیر عزیز تھا۔ وہ تاریخ میں باغ لگانے والے کے نام سے مشہور ہے۔ کشمیر میں اس کے لگائے ہوئے جو باغ ابھی تک مشہور ہیں وہ شالیمار باغ، نسیم باغ اور نشاط باغ ہیں۔ ہر ایک میں حیرت انگیز شہ نشین اور چبوترے بنے ہوئے جہاں فواروں سے ٹھنڈا پانی دھار باندھ کر نکلتا ہوا جھرنوں سے گرتا اور مرمریں ڈھلانوں پر پھیلتا جاتا ہے۔ وادی کے طول و عرض میں جو دیو زاد اور پرشوکت چنار نظر آتے ہیں وہ بھی جہانگیر نے لگوائے تھے۔ تزکِ جہانگیری میں یہ تحریر دلچسپی سے خالی نہیں کہ اس نے ایک کشمیری عورت سے، جو کسی کشمیری شہزادے کی لڑکی

تھی۔ شادی بیاہی تھی۔ اس سے ایک لڑکی پیدا ہوئی تھی جو ایک سال زندہ رہ کر مر گئی تھی ۱۶۲۷ء میں جب وہ بستر مرگ پر تھا اور کشمیر سے دہلی لے جایا جا رہا تھا تو اس سے پوچھا گیا کہ اسے کسی چیز کی خواہش تھی۔ اس کے جواب کو کشمیر کے لوگوں نے ہمیشہ عزیز رکھا ہے "صرف کشمیر"!

اس کے بیٹے شاہجہان نے نہ صرف باغ بنانے کا کام جاری رکھا بلکہ اس رواداری پالیسی میں بھی کوئی فرق نہ آنے دیا جو اس کے باپ نے اپنی رعیت کے ساتھ اختیار کی تھی۔ اس مغل عہد کے دوران میں کہا جاتا ہے کہ جھیل ڈل کے قریب وجوار میں سات سو ستر باغ لگائے گئے تھے۔ گلابوں اور بید مشک سے حکومت کو ہر سال ایک لاکھ روپے کی آمدنی ہوتی تھی۔ کن کن چیزوں پر محصول لگتا تھا، اس کا اندازہ اس تحریر سے ہو سکتا ہے کہ شہنشاہ کے ایک صوبہ دار نے جس کا نام ظفر خاں تھا، "ملاحوں اور بھیڑوں پر ٹیکس لگا دیا! سرکاری عہدہ دار ملک کے بہترین پھلوں اور لکڑی کو ضبط کر لیتے تھے، اس وجہ سے لوگ پھل دار درختوں کو کاٹنے لگے تھے۔ اس نے عہدہ داروں کو ایسی حرکات کرنے سے منع کر دیا۔ اعتقاد خاں کا، جو ایک صوبہ دار تھا، گو وہ ظالم تھا، کار نمایاں یہ ہے کہ اس نے چالاک لوگوں کے فتنے کو ختم کر دیا۔

شاہجہان کا بیٹا اورنگ زیب برہمنوں پر سخت ستم ڈھانے کے لئے مشہور ہے گو وہ تخت نشین ہونے کے بعد صرف ایک مرتبہ کشمیر آیا اور "کشمیر کے برہمن اس کے نام کو نفرت کی نظر سے دیکھتے ہیں"۔ "کفار کے خلاف اس کی شدید سرگرمی کا اثر کشمیر تک پہنچا"۔ اس کے باوجود برنیئر، جس کی تحریروں کا حوالہ اکثر دیا جاتا ہے اور جو اورنگ زیب کے عہد میں کشمیر گھوما پھرا تھا، کشمیریوں کی حاضر جوابی، ذہانت اور خوش تدبیری کا ذکر کرتا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ "شاعری اور علوم میں ایرانیوں سے کم نہیں"۔ وہ کشمیر کو "ہندوستان کی جنت ارضی" کہتا ہے اور پھولوں، پھلوں اور اناج کی کثرت کا ذکر کرتا ہے۔

۱۶۶۴ء میں اورنگ زیب سخت بیمار پڑا۔ اسی کے بعد اس نے کشمیر کا پہلی اور آخری مرتبہ سفر کیا۔ اس سفر کا مقصد صحت کی بحالی تھی۔ ڈاکٹر برنیئر ۱۶۶۵ء میں وہاں پہنچا اور اپنی کتاب میں شاہی آمد کو بیان کیا ہے۔ بعد میں بطور معالج اورنگ زیب کی خدمت میں حاضر رہا۔ شہنشاہ کا سفر کوئی خاص راحت بخش ثابت نہ ہوا کیونکہ دریائے چناب تک راستہ مکمل افراتفری اور انتشار کی حالت میں طے ہوا۔ پھر درۂ پیر پنجال پار کرتے ہوئے ایک حادثہ پیش آیا۔ بہت سے ہاتھی جن پر شاہی خواتین سوار تھیں، آگے پیچھے چل رہے تھے۔ ان میں سے ایک کا پاؤں پھسل گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پیچھے آنے والے ہاتھیوں میں سے کوئی درجن بھر یا اس سے زیادہ نیچے کھائی میں جا گرے۔ کچھ عورتیں ہلاک ہو گئیں اور بہت سے آدمی زخمی ہوئے اور چند ہاتھی کھائی کی تہ تک لڑھکتے چلے گئے۔" یہاں وادی میں اورنگ زیب نے میدانی علاقوں میں موسم گرما ختم ہونے تک قیام کیا۔ پھر وہ دہلی واپس گیا۔

مغل سلطنت کی حالت روز بروز ابتر ہوتی گئی اور اس کے انتشار کے ساتھ ساتھ صوبے دار بادشاہ بن بیٹھے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۷۴۵ء میں "کشمیر کے صوبے کی حکومت موروثی اور دہلی سے تقریباً آزاد معلوم ہوتی تھی"۔

۱۷۵۲ء میں کشمیر پٹھانوں کے تسلط میں آ گیا اور اس کے بعد ۱۸۱۹ء تک پورے اٹھائیس شاہان درانی نے ملک پر حکومت کی۔ ہندوؤں کو جتنا اس زمانے میں ستایا گیا اس کی نظیر کشمیر کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ لارنس نے کہا ہے کہ یہ عہد بہیمانہ استبداد کا تھا جس میں کوئی اچھا کام نہیں ہوا، شجاعت یا حمیت کا نام نہیں"۔ اور ینگ ہزبینڈ گورنروں کے متعلق لکھتے ہیں کہ "ان کے لئے سر قلم کروانا پھول توڑنے سے زیادہ اہمیت نہ رکھتا تھا"۔ دہلی کے بجائے اب کابل سے کشمیر پر حکومت ہونے لگی لیکن گورنروں کو چونکہ کچھ پتہ نہ ہوتا تھا کہ وہ قابل رشک عہدے پر کب تک فائز رہیں گے وہ واپس جانے سے پہلے ملک کو جتنا ممکن ہوتا لوٹ کھسوٹ لیتے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک "عظیم خاں" نامی گورنر چھ سال میں دو کروڑ روپے کا مالک بن گیا"۔

مغل دور میں ہندوؤں کے سامنے تین راہیں تھیں، تبدیلی مذہب، موت یا کشمیر سے فرار، لیکن اسد خاں کے زمانے میں دو ہی صورتیں تھیں، تبدیلی مذہب یا موت۔ جو بیچارے شامت زدہ پنڈت مسلمان ہونے سے انکار کرتے ان کے سر پر گوبر سے بھرے ہوئے مٹکے رکھ دیئے جاتے اور مسلمان ان پر پتھر مار مار کر دل بہلاتے جب

شنا چیرٹ جاتا تو بتا ہوا گوبر ہندوؤں کی آنکھوں میں بھر جاتا۔ جیسا کہ آج کل ہم سنتے ہیں کہ لوگوں کو خود اپنی قبر کھودنے پر مجبور کیا گیا اسی طرح ان ہندوؤں سے بعد میں زبردستی گھاس کے بڑے بڑے بورے بنوائے جاتے۔ پھر دو دو کو رسی سے باندھ کر تھیلوں میں بھر دیتے اور کشتی میں رکھ کر ——— ڈل جھیل میں لے جاکر زندہ ہی پانی میں پھینک آتے۔ جھیل کا وہ حصہ اب "بٹ مزار" کے نام سے مشہور ہے۔

ان حاکموں میں سے صرف ایک کو دوسروں سے بہتر سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کا نام امیر خان جوان شیر تھا اس نے امیرا کدل پل بنوایا، جو اب سانتواں پل کہلاتا ہے، اور اصل شیر گڑھی محل بھی تعمیر کیا جو (آخری مہاراجہ کے سوا) اس کے بعد کے حکمرانوں کی جائے رہائش بنا رہا۔ اس کے باوجود جب اس نے سنا کہ ڈل جھیل پر مغلوں کے لگائے ہوئے باغوں کو کشمیری پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں تو چھ باغوں پر بس چلا انہیں تباہ کروا دیا۔

تین پنڈتوں کو کشمیر میں رہنے کی اجازت ملی ——— اور کچھ کو مثلاً پنڈت نند رام ٹکو اور پنڈت زیرم کاک ان کو ان کے علم و فضل کی وجہ سے افغان دربار میں جگہ مل گئی۔ ان کو مجبور کیا گیا کہ داڑھی رکھیں، جوتے یا چوڑی نہ پہنیں اور ماتھے پر تلک لگانے کی تو سخت ممانعت تھی۔ آج کل کشمیری پنڈت ایک دلیر زاویہ پگڑی باندھتے ہیں اور تلک لگانے میں مبالغے سے کام لیتے ہیں: کہا جاتا ہے کہ وہ ایسا اس لئے کرتے ہیں کہ انہیں پٹھان حکمرانوں کا ہولناک استبداد کبھی فراموش نہ ہو۔

ایک حکمران میر تھا جس نے برہمنوں اور شیعوں دونوں کو جھیل میں ڈبو دیا اس مقصد کے لئے وہ چمڑے کے تھیلے استعمال کرتا تھا۔ اس طرح وہ ہندوؤں کو، جن کی نظر میں گائے مقدس ہے اور مذہب میں چمڑے کو چھونا یا پہننا جائز نہیں، چمڑے کے تھیلوں میں بند کروا کے مارتا تھا۔ عطا محمد خان نے ایک بڑھئی کریہہ صورت عورت کو اپنا گماشتہ مقرر کیا تھا جس نے یہ تہیہ کر رکھا تھا کہ کسی ہندو لڑکی کو شادی کے لئے کنواری نہ چھوڑے گی۔ اپنی لڑکیوں کو مسلمانوں کے ہاتھوں عصمت دری سے بچانے کے لئے مائیں نہ صرف ان کے بال ——— جو کشمیری عورتوں کے لئے مایۂ فخر ہوتے ہیں۔ بلکہ ناک تک کاٹ ڈالتی تھیں۔ اس وقت جس مسلمان کو رستے میں کوئی پنڈت یا ہندو لڑکا ملتا وہ اس پر سوار ہو جاتا اور دیا تو اس پر سواری کھاتا یا اسے زمین پر گرا دیتا اور چیخ کر کہتا "تو برہمن ہے اور میں تجھ پر سواری کروں گا۔"

پھر فتح خاں نے رنجیت سنگھ کو کشمیر پر حملہ کرنے کے لئے سالانہ آٹھ لاکھ روپیہ خراج دینے کی پیشکش کی۔ سکھ فوج نے پہلے پہل ۱۸۱۴ء میں پیر پنجال کے راستے سے پیش قدمی کی۔ رنجیت سنگھ پونچھ سے فوجی نقل و حرکت کا نگران تھا۔ راجوری کے راجہ نے یہ افواہ پھیلائی کہ حملہ آور کی فوج کے ہراول کو محمد عظیم نے سپیور کے مقام پر گھیرے میں لے کر شکست دے دی ہے: اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام سکھ فوج کو واپس بلا لیا گیا۔ "فاتح" جرنل ہری سنگھ لوٹ گیا جہاں اس نے برہمنوں کو مزید ناقابل برداشت اذیتیں پہنچا کر اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ اسے اپنے جاسوسوں کے ذریعے یہ پتہ چل گیا تھا کہ حملہ کروانے میں برہمنوں کا ہاتھ تھا۔ پھر پنڈت بیربل دھر نامی ایک سنار تی ہرکارہ اپنے بیٹے راجکاک سمیت لاہور پہنچنے میں کامیاب ہو گیا جہاں اس نے رنجیت سنگھ سے دوبارہ کشمیر پر حملہ کرنے کی التجا کی اور یہ وعدہ کیا کہ اندرون کشمیر سے اس کی ہر ممکن مدد کی جائے گی۔ محمد عظیم کے جاسوس اچھے تھے اور جب اس نے ان کی زبانی اس سفر کا احوال سنا تو بیربل اور راجکاک کی بیویوں کو طلب کیا۔ بیربل کی بیوی نے خودکشی کر لی لیکن راجکاک کی نوجوان بیوی کو مسلمان بنا کر کابل بھیج دیا گیا۔ ۱۸۹۵ء میں لارنس نے اس کے متعلق لکھا کہ "وہ وہاں اب سے ذرا ہی پہلے تک مقیم تھی۔"

محمد اعظم حملہ آور فوج کی طاقت اور قوت کا حال سن کر اپنے بھائی جبار خاں کو گورنر بنا کر کابل بھاگ گیا۔ ۱۸۱۹ء میں رنجیت سنگھ کے مشہور جرنیل مصر دیوان چند نے جموں کے راجہ گلاب سنگھ کی معیت میں نئے گورنر کو، جس نے یونہی سا مقابلہ کیا، شکست دی اور بعد میں سری نگر میں اکبر کے بنوائے ہوئے قلعے ہری پربت کے سب سے اونچے مقام پر سکھ پرچم لہرا دیا۔

سکھ حکومت بھی ویسی ہی تھی جیسی پچھلی حکومتیں تھیں۔ انہوں نے لاہور سے ایک گورنر بھیج دیا اور ۲۷ سالہ سکھ عہد میں دس گورنر اس اہم عہدے پر فائز ہوئے۔ بیچارے شامت زدہ لوگوں پر اور بھی زیادہ ٹیکس لگائے گئے اور ہندوؤں سے مسلمان ہونے کے بعد اب ان پر بحیثیت مسلمان ستم ڈھائے گئے کیونکہ سکھ ہندوؤں ہی کی ایک شاخ

تھے۔ محصول بہت بھاری تھا۔ جو لوگ پہلے حکومت کو اپنی پیداوار کا نصف حصہ دیتے تھے اب انہیں تین چوتھائی حصہ ادا کرنا پڑتا۔ شالوں کی تخمینی قیمت پر چھبیس فیصدی ٹیکس لگتا۔ اس کے علاوہ جس اون سے وہ تیار ہوتی تھیں اس پر ایک درآمدی محصول وصول کیا جاتا۔ قصابوں سے مستریوں اور عوامی ناظروں تک رنڈیوں تک ہر پیشے اور ہر تجارت پر ٹیکس تھا۔ گورنر کو، جو منصبِ اعلیٰ تھا، ہر سال اپنے عہدے کے لئے تیس ہزار روپے ادا کرنے پڑتے اور اس کی کوئی پوچھ گچھ نہ تھی کہ وہ اپنا نقصان کس طرح پورا کرتا تھا۔ ہم تصور کر سکتے ہیں کہ وہ کیسے کرتا ہوگا۔

اس کے علاوہ بیگار کے ہولناک طریقے کو ملک میں دوبارہ رائج کیا گیا۔ حکومت کی مسلح فوجیں تمام تندرست مردوں کو پکڑ دھکڑ کر دور دراز علاقوں میں طویل عرصوں تک بطور قلی کام کرنے کے لئے بھیج دیتیں۔ اکثر وہ کبھی واپس نہ آتے۔ کھیتی باڑی کا کام بوڑھے مرد اور عورتیں، جیسے بن پڑتا، کرتیں۔ نوجوان عورتوں نے خود کو برقعوں میں چھپا لیا اور لڑکوں کا وہی حشر ہوا جو صدہا سال پہلے کو زتھ میں ان کے بھائیوں کا ہوا تھا۔ پھر سے ہزاروں لوگ کشمیر سے بھاگ گئے۔ اب کی دفعہ بھاگنے والے مسلمان تھے۔

اس زمانے میں موور کرافٹ نے کشمیر کا سفر کیا تھا اور بعد میں اس کے متعلق کتاب لکھی تھی۔ اس میں مذکور ہے کہ گاؤں نیم ویران ہیں، لوگ تقریباً ننگے ہیں۔ ان کی ہڈیاں نکل آئی ہیں اور وہ غربت اور فاقہ کشی کی ایک بھیانک تصویر پیش کرتے ہیں۔ "سکھ کشمیریوں کو مویشیوں سے کچھ ہی بہتر سمجھتے ہیں" اس نے لکھا۔ اگر سکھ کسی کشمیری کو مار ڈالتا تو اس پر صرف سولہ یا بیس روپے جرمانہ ہوتا۔ اگر مرنے والا ہندو ہوتا تو جرمانے میں سے صرف چار روپے اور مسلمان ہوتا تو دو روپے اس کے گھر والوں کو دیئے جاتے۔

۱۸۲۸ء میں وادی میں ایک شدید زلزلہ آیا۔ سری نگر کا شہر تقریباً تباہ ہو گیا۔ اس کے فوراً بعد ہیضہ پھیل گیا۔

جس دن کھڑک سنگھ نامی حکمران فوت ہوا اسی دن اس کا بیٹا "دیوار کے ایک حصے کے گرنے سے" دب کر مر گیا۔ لڑکے کی ماں رانی چند کور کو اس سلسلے میں شیر سنگھ پر شک ہوا اور اس کے خلاف سازش کرنے لگی لیکن رانی ہی کی ایک باندی نے جو شیر سنگھ کی خیر خواہ تھی، اپنی مالکہ کا، جب وہ قیلولہ کر رہی تھی، سر پھاڑ دیا۔

شیر سنگھ کے عہد میں، جسے رنجیت سنگھ کا بیٹا کہا جاتا تھا، کشمیر کے دیہات میں اتنا سخت قحط پڑا کہ اس کے اثر سے سری نگر کا شہر تک محفوظ نہ رہ سکا۔ ہزاروں لوگ کشمیر چھوڑ کر پنجاب چلے گئے۔ یہ قحط اتنا شدید تھا اور اس نے اتنا طول کھینچا کہ عام بازاری لوگوں کے لئے وہ آج تک کشمیر کی تاریخ میں سنگ میل کا درجہ رکھتا ہے۔

۱۸۳۴ء میں کرنل میہاں سنگھ آیا جو ایک روشن خیال حاکم تھا۔ وہ واحد سکھ گورنر ہے جو وادی کی بحالی کا کام کرنے کی وجہ سے لوگوں کو یاد ہے۔ اس نے دیہات کی بحالی کی خاطر باہر سے غلے کے بیج اور مرغے مرغیاں منگوائیں، شادی پر سے بھاری ٹیکس ہٹا دیا، پیداوار کے ٹیکس کو گھٹا کر پچاس فی صدی کر دیا۔ سکھوں سے پہلے ٹیکس کی یہی شرح تھی۔ اور ان لوگوں کے لئے، جو ضرورت سے زیادہ نفع لیتے تھے یا ناپ تول میں بے ایمانی کرتے تھے، سخت سزائیں اور جرمانے مقرر کئے۔ لیکن رنجیت سنگھ کے مرتے ہی کشمیر میں مقیم فوج نے گورنر میہاں سنگھ کے خلاف بغاوت کر دی اور اسے مار ڈالا۔

پنجاب میں طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ کمزور، عیش پسند اور غیر متوازن جانشینوں نے اس ابتری میں حکومت چلانے کی کوشش کی مگر چند روزہ سکھ حکومت پر زوال آ چکا تھا۔

نومبر ۱۸۴۵ء میں ساٹھ ہزار سکھوں نے ایک سو پچاس توپیں لے کر برطانوی علاقے پر حملہ کیا، جہاں انہیں انجام کار شکست فاش ہوئی۔ انگریزی فوج لاہور تک بڑھ آئی۔ سکھ حکومت کو ہتھیار ڈالنے پڑے اور نو مارچ ۱۸۴۶ء کو عہد نامہ لاہور طے پایا۔ اور سولہ مارچ کو معاہدہ امرتسر ہوا جس کی رو سے گلاب سنگھ جموں اور کشمیر کا مہاراجہ بنا۔

جموں کے راجہ گلاب سنگھ کی حیثیت سے وہ ان دو جرنیلوں میں سے ایک تھا جنہوں نے ۱۸۱۹ء میں کشمیر کو سکھ سلطنت میں شامل کرنے میں ہاتھ بٹایا تھا۔ اب وہ صرف پانچ ہزار سپاہیوں کو لے کر سری نگر کی طرف بڑھا اور وہاں کے باغیوں کو کچل دیا۔ اس کے بعد شیخ غلام محی الدین کو وہاں کا گورنر تعینات کر کے وہ پنجاب

ہو گیا۔ لیکن ایک سال بعد پھر وادیٔ جہلم میں فتنہ و فساد کا آغاز ہوا۔ اس دفعہ اس کا بانی بمبا قبیلہ تھا۔ یہ لوگ بہادر مگر فتنہ پرداز تھے اور انہیں ترکوں کی نسل سے ہونے کا دعویٰ تھا۔ ان کے سردار سلطان زبردست خان کو گرفتار کر کے سری نگر میں قید کر دیا گیا تھا۔ بمبا لوگوں نے شیر احمد کے ماتحت اتفاقاً کامبوری کے مقام پر سکھ فوج کے سات ہزار آدمیوں کو تہ تیغ کر دیا۔ کشمیر پر دھاوا بولا اور شیلاہم پر گورنر کے بیٹے امام الدین کی بارہ ہزار فوج کو شکست دی۔ برف باری شروع ہو گئی اور باقی ماندہ سکھوں کو پسپا ہونا پڑا۔ زبردست خان کو رہا کر دیا گیا لیکن گورنر اپنے عہدے پر قائم رہا اور اس نے اگلے سال جامع مسجد کھلوا دی جو سکھوں کے برسر اقتدار آنے کے بعد پچھلے چوبیس سال سے بند پڑی تھی۔ گو وادیٔ کشمیر لاہور کے سکھ حکمرانوں کی ملکیت تھی اس پر فی الواقع گلاب سنگھ کی حکومت تھی اور چنانچہ سولہ مارچ ۱۸۴۶ء کو یہ واقعہ پیش آیا کہ پچھتر لاکھ زر نقد اور ایک گھوڑے، بارہ بکریوں اور شالوں کے چھ جوڑوں کے سالانہ خراج کے بدلے کشمیر اور دریائے سندھ کے مشرق اور دریائے راوی کے مغرب کا تمام پہاڑی علاقہ، جو سکھوں نے بطور تاوان جنگ انگریزی حکومت کے حوالے کر دیا تھا، "مہاراجہ گلاب سنگھ اور اس کے جانشین ہائے نرینہ" کو مل گیا۔

اگرچہ امام الدین کو، جو اپنے باپ کی جگہ گورنری پر فائز ہوا تھا، گلاب سنگھ نے مامور کیا تھا اس نے اب حکومت سے دست بردار ہونے سے انکار کر دیا۔ شیر احمد اور اس کے بمبا قبیلے سے مل کر اس نے ان فوجوں سے مقابلہ کیا، جو سری نگر پر قبضہ کرنے آئی تھیں، اور چالیس دن تک ہری پربت قلعے کو محاصرے میں لئے رکھا۔ مہاراجہ گلاب سنگھ کی فوج کو شکست ہوئی۔ اس کا نمائندہ لکھپت رائے، جسے اس نے نیا گورنر بنا کر بھیجا تھا، مارا گیا اور فتح سے سرشار بمبا اور ککا لوگوں کی توجہ عوام پر ہوئی۔ انہوں نے وادی میں دھاوے بولے اور شہر کو لوٹنے لگے۔ آخرکار برطانوی افواج جموں کے علاقے میں داخل ہوئیں اور مدافعت کرنے والوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔

مہاراجہ گلاب سنگھ ڈوگرا راجپوت تھا یا بالالفاظ دیگر ڈوگرا علاقے میں رہنے والا راجپوت تھا۔ کشمیر اور پنجاب کے میدان کے درمیان پہاڑی سلسلے کے جنوب کا کوہستانی حصہ ڈوگرا علاقہ کہلاتا ہے۔

وہ ۱۷۹۲ء میں پیدا ہوا تھا۔ اس کی کئی پشتوں کا شجرہ موجود تھا۔ اس کے آباؤ اجداد کا پیشہ ہمیشہ سے سپاہ گری تھا۔ اس کا پردادا سروپ سنگھ رنجیت دیو کا بھائی تھا جس نے انتشار اور ابتری کے برسوں میں جموں میں ایک خاصی مستحکم حکومت قائم کی تھی اور اس کے جانشین سنہ ۱۸۰۹ء تک اس پر قابض رہے تھے۔ سن مذکور میں انہیں معزول کر دیا گیا۔ بیس برس کی عمر میں، جب اس کے خاندان پر برا وقت آ گیا تھا، گلاب سنگھ جہلم کے مغرب میں منگلا نامی قلعے کے قلعے دار کی فوج میں نوکری کر کے کھانا اور تین روپیہ مہینہ کا معقول مشاہرہ پا رہا تھا۔ اس سے وہ بہر حال مطمئن نہ ہو سکا اور جموں کو لوٹ آیا۔ جہاں ۱۸۰۸ء میں سکھوں کے حملے کے دوران میں اس سے کارہائے نمایاں سرزد ہوئے اور "مہاراجہ رنجیت سنگھ کے سامنے اس کا اچھے الفاظ میں ذکر کیا گیا۔"

اس کے بعد ۱۸۱۱ء میں وہ اپنے بھائی دھیان سنگھ کے ساتھ، جو تقریباً پندرہ سال کا تھا، گھوڑے خریدنے کے لئے قرض لے کر، لاہور پہنچا اور رنجیت سنگھ کے سامنے پیش ہوا۔" ان کے شائستہ انداز اور خوبصورت ناک نقشے سے بہت متاثر ہو کر مہاراجہ نے انہیں نوے روپیہ مہینہ پر اپنا مصاحب مقرر کیا۔" اپنے والد کے انتقال کے بعد وہ خاندانی سپاہ اور متعلقین کو بھی لے آیا، اور ان کا بارہ سال کا بھائی سچیت سنگھ بھی ان سے آ ملا۔ وہ "خوش ادا اور خوبصورت تھا اور اس نے فوراً مہاراجہ کی توجہ اور اعتماد حاصل کر لیا۔ اس کی دل آویز صفات کو مہاراجہ نے خاص قدر کی نگاہ سے دیکھا اور اسے اتنا عزیز رکھنے لگا کہ اس کی لمحہ بھر کی جدائی بھی منظور نہ تھی۔" ڈاکٹر صوفی اپنی کتاب "کاشیر" میں رقم طراز ہیں: "درحقیقت یہ تینوں ڈوگرا بھائیوں کی خوب صورتی تھی جس نے فی الفور رنجیت سنگھ کو جو ذاتی حسن کی خاص طور پر قدر دانی کرتا تھا، ان کی طرف متوجہ کر دیا۔

گلاب سنگھ کی کہانی حقیقی معنوں میں ایک ایسے قسمت آزما سپاہی کی کہانی ہے جس نے اپنے گوہر مراد یعنی جموں اور کشمیر کے تخت کو حاصل کرنے کے لئے بالکل کسی چیز سے احتراز نہ کیا۔



ترقی اور خوشحالی کی شاہ راہ
منصوبے کی تکمیل کیلئے پوری قوم کا تعاون ضروری ہے۔
سادگی ہمارا قومی شعار ہے
مستقبل کیلئے روپیہ بچایئے
قومی ترقی کیلئے روپیہ بچانے کے چار طریقے

جب رنجیت سنگھ جموں پر حملہ آور ہوا تو گلاب سنگھ اور اسکے بھائی اسکی خدمت میں تھے جب جموں سکھ سلطنت میں شامل کر لیا گیا تو گلاب سنگھ کو کارگزاری کے صلہ میں جموں کا، دھیان سنگھ کو پونچھ کا اور سب سے چھوٹے بھائی کو رام نگر کا راجہ بنا دیا گیا۔ آنے والے برسوں میں گلاب سنگھ نے لداخ اور بلتستان کو فتح کر لیا اور تبت پر حملہ کیا اور جب رنجیت سنگھ فوت ہوا تو جموں، لداخ اور بلتستان پر گلاب سنگھ کا اقتدار مستحکم تھا اسکے علاوہ وہ کشمیر میں بھی "حاکمانہ اثر رکھتا تھا"

چنانچہ یہی وہ شخص تھا جو تاریخ میں اپنی ستم شعاری اور حریصانہ کارناموں کے سبب مشہور ہے۔ جس نے ایک نئے حکمران خاندان کی بنیاد ڈالی۔ اس خاندان کا دور حکومت ڈوگرا راج کے نام سے موسوم ہے۔

اس کے برسر اقتدار آنے پر کشمیر کی جو حالت تھی اسے "افسوسناک کہا جاتا ہے۔ کیونکہ … پیداوار کے صرف نصف حصے کا دعویٰ تھا بلکہ … ہر ممکن طریقہ سے فائدہ پہنچانے کے لئے جھوٹے وعدے کرکے اس کے علاوہ اپنا حصہ بھی لے لیا کرتے تھے۔ مہاراجہ … فرماں روا نہ تھا۔ اس نے چیزوں کو اپنی حالت پر چھوڑ دیا تھا ۔۔۔ اپنی عمر کے آخری برسوں میں تو وہ چلنے پھرنے سے بالکل معذور ہو گیا تھا جس چیز کی کبھی وہ امید کر سکتا تھا وہ اسے مل چکی تھی اور بحیثیت حکمران اس کے مرتبے کو انگریزوں نے جو فتنہ و فساد کی حالت میں اس کی مدد کرنے کے لئے قریب ہی موجود تھے مستحکم اور مضبوط بنا دیا تھا۔ معاہدہ امرتسر میں اس نے وعدہ کیا تھا کہ جب برطانوی سپاہ پہاڑی خطوں میں یا اس کے مقبوضات سے ملحق علاقوں میں سرگرم پیکار ہو گی تو وہ اپنی تمام فوجی قوت سمیت اس کی مدد کرے گا" اور برطانوی حکومت کا یہ وعدہ تھا کہ "اگر مہاراجہ گلاب سنگھ کو اپنے علاقوں کو بیرونی دشمنوں سے بچانے کی ضرورت پیش آئی تو وہ مدد دے گی" چنانچہ مہاراجہ کو یہ پتہ تھا کہ اسے صرف اندرونی بدنظمیوں سے نبٹنا پڑے گا اور وہ آرام سے بیٹھ سکتا تھا۔

تاریخ میں لکھا ہے کہ ۱۸۵۷ء میں جس دن استسقا کے مرض میں فوت ہوا اس دن وادی میں زلزلہ آیا۔ بستر مرگ سے اس نے ایک لاکھ روپیہ غریبوں میں تقسیم کروایا۔ یہ واقعی اس نے بڑے ایثار سے کام لیا تھا کیونکہ تمام عمر تو وہ روپیہ سمیٹتا رہا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ رعایا میں سے کوئی اگر عرضی پیش کرنا چاہتا تو جہاں سے مہاراجہ گزر رہا ہو وہاں کھڑے ہو کر روپیہ دکھانا کافی تھا۔ راجہ فوراً اسے دیکھ لیتا۔

یہ بھی مذکور ہے کہ ایک انگریز عورت مسز الیشبی گیرس ولسن نے اس کی پانچ بیویوں کو اس کی چتا پر ستی ہونے سے بچایا۔ سلطان سکندر نے، جو ۱۴۱۳ء میں فوت ہوا، اس رسم کو منسوخ قرار دے دیا تھا۔ لیکن جب مسلمانوں کے ہاتھ سے طاقت چھن گئی تو عورتیں پھر ستی ہونے لگیں، یا شاید اس سے بھی قبل زیادہ روادار مسلمان بادشاہوں کے زمانے میں ستی کی رسم پھر رائج ہو گئی ہو۔

گلاب سنگھ کے بعد اس کا تیسرا بیٹا رنبیر سنگھ تخت پر بیٹھا۔ ان دونوں مہاراجوں نے غدر کے دوران میں انگریزوں کو اپنی جو خدمات پیش کی تھیں اس کے بدلے میں یہ صلہ پایا کہ اصل معاہدے میں ترمیم کر دی جائے تاکہ اگر مہاراجہ کے اپنی اولاد نرینہ نہ ہو تو وہ خاندان کی ملحق شاخوں میں سے جانشین چن لے۔ رنبیر سنگھ کے متعلق لارنس نے لکھا ہے کہ "وہ شاہی شہزادہ تھا۔ وہ اپنے مذہب اور سنسکرت علم و فضل کا شیدائی تھا لیکن مسلمانوں کے ساتھ اس کا سلوک اچھا اور روادارانہ تھا۔ نہیں اس نے اپنے مذہب پر آزادی سے عمل پیرا ہونے کی اجازت دے رکھی تھی۔" اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اس کی تمام رعایا اسے چاہتی تھی اور یورپی لوگوں میں بھی جن کے ساتھ وہ بڑی مہمان نوازی سے پیش آتا تھا، مقبول تھا۔ انہیں سکول کھولنے اور ڈسپنسریاں کھولنے کی اجازت دے دی تھی۔ اس معاملے میں وہ اپنے باپ سے بہت مختلف تھا جس نے اقتدار پر فائز ہوتے ہی رویہ بدل لیا تھا۔ سابقہ حکمرانوں کے برخلاف وہ اہل وعیال والا آدمی تھا۔ اس کی طبیعت نرم اور زندگی سادہ اور اخلاقی تھی۔ وہ لوگوں کی عرضیاں سننے اور ان کا جواب دینے کی غرض سے روز دربار عام کرتا تھا۔ اس زمانے میں کشمیر کی آبادی اس کے عشر عشیر بھی نہ رہی تھی جتنی کہ پہلے تھی یا اب ہے۔ اس روشن خیال فرماں روا نے ریاست میں نئے اجناس کو رائج کرنے کی حتی الامکان کوشش کی اور کھلے دل سے پہلے پہل ریشم، چائے، انگور کی بیلوں اور افشرگروں پر خرچ کیا۔ اگر اس میں کوئی کمزوری تھی تو بس یہی کہ وہ بہت زیادہ نرم اور رحمدل تھا۔ اگر اس میں اپنے باپ کی سی قوت ارادی ہوتی تو وہ وادی کی ترقی کے لئے بہت کچھ کر سکتا۔ بدقسمتی سے اس کے عہد میں بے وقت کی شدید بارشوں کی وجہ سے دو سال تک بھیانک قحط پڑا۔ اس عرصے میں دو تہائی

آبادی مرگئی اور دیہات اور شہر دونوں پر قحط کا اثر پڑا، چنانچہ تجارت بھی بند ہوگئی۔ مہاراجہ کی عمر کے باقی پانچ سال مشکلات دور کرنے اور ریاست کا نظم ونسق درست کرنے میں صرف ہوئے۔ ایک سب سے اہم کام یہ ہوا کہ وادی تک گاڑیوں کے آنے کی سڑک بنائی گئی تاکہ دوبارہ قحط پڑنے کی صورت میں غلہ درآمد کیا جاسکے۔

۱۸۸۵ء میں رنبیر سنگھ نے انتقال کیا اور اس کا سب سے بڑا لڑکا پرتاب سنگھ تخت نشین ہوا۔ اس کے عہد میں ایک ریاستی کونسل اور متعدد انگریز افسروں کی قابلانہ مدد سے کشمیر کو بالآخر امن نصیب ہوا اور اس نے میانہ روی سے ترقی کا آغاز کیا۔

ایک تو پرتاپ سنگھ زندگی کے بیشتر حصے میں بیمار رہا دوسرے تمام بیانات اس بات پر متفق ہیں کہ بطور حکمران وہ بھی کمزور طبیعت کا تھا۔ اس کے علاوہ ابتدا میں خاندانی سازشیں بھی اس کے حق میں مضر ثابت ہوئیں اور ملک کی حالت بہت خراب ہوگئی۔ وائسرائے نے اسے لکھا کہ "آپ کی ریاست کے فراواں وسائل کے باوجود آپ کا خزانہ خالی تھا اور ہر محکمے اور ہر دفتر میں رشوت اور بدنظمی کا دور تھا، جناب عالی اب تک ادنی اور نالائق مصاحبین میں گھرے ہوئے تھے" یہ مہاراجہ نے ایک نیابتی کونسل کی تشکیل کی منظوری دے دی۔ ایک سال تک اس کی صدارت دیوان لچھمن داس نے کی۔ اس کے بعد مہاراجہ کا بھائی راجہ امر سنگھ، جو اس کے ولی عہد کا باپ بھی تھا، صدر منتخب ہوا۔ ۱۸۹۱ء میں خود مہاراجہ کونسل کا صدر مقرر ہوا اور نائب صدر کا عہدہ امر سنگھ کو دے دیا گیا۔

غالباً اس زمانے کا سب سے مشہور انگریز افسر جس نے لوگوں کی بھلائی کے لئے سب سے زیادہ کام بھی کیا، سر والٹر لارنس تھا۔ اس کے تجویز کردہ تصفیۂ اراضی سے کشمیر میں مال گزاری کے صحیح تعین کا آغاز ہوا۔ دہقانوں کے خواب وخیال میں بھی یہ بات نہ آسکتی تھی کہ حکومت اتنا کم حصہ مانگے گی۔ تجارت پر جو بھاری محصول تھے وہ گھٹا دیئے گئے۔ مستقبل کے لیے جو منصوبہ تیار ہوا اس میں سیلاب بندی، زمین کی بازیابی اور سڑک بنانے کو نمایاں اہمیت حاصل تھی۔ ان تمام باتوں سے کشمیر میں زیادہ پھل ہونے لگا، کسانوں کو زیادہ نفع ہوا جس کا لازمی نتیجہ ریاست کی آمدنی میں دوگنا اضافہ تھا۔ آبادی تیزی سے بڑھنے لگی۔

پرتاب سنگھ کی جانشینی کے وقت وائسرائے ہند نے یہ فیصلہ کیا اب سے کشمیر اور جموں کے صدر مقام میں برطانوی ریذیڈنٹ رہا کرے گا کیونکہ دوسری ہندوستانی ریاستوں کی طرح وہ بھی حکومت برطانیہ کی جاگیر تھی۔ البتہ عنانِ حکومت بدستور مہاراجہ کے ہاتھ میں رہے گی۔ سر اولیور سینٹ جون کو پہلا ریذیڈنٹ مقرر کیا گیا۔ اس سے قبل ۱۸۵۲ء سے لے کر مہاراجہ نے صرف اس بات کی منظوری دی تھی کہ صرف چند ماہ کے لئے ایک برطانوی افسر خصوصی ڈیوٹی پر کشمیر میں رہا کرے گا۔

مہاراجہ پرتاب بڑا کٹر ہندو تھا۔ کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ پروہت زدہ تھا اور پنڈتوں سے مشورہ کئے بغیر کوئی فیصلہ نہ کرتا تھا۔ چالیس سال حکومت کرنے کے بعد اس کا ۱۹۲۵ء میں انتقال ہوا۔ جب وہ دم توڑنے ہی والا تھا تو ہندو رسم کے مطابق، اسے محل کے بالائی کمرے سے جلدی جلدی نیچے لے گئے تاکہ وہ دھرتی ماتا پر جان دے۔ وہاں ایک گائے اس کی منتظر تھی۔ مرتے ہوئے مہاراجہ اور گائے کے درمیان دھاگا باندھا گیا کیونکہ مہاراجہ کو اس وقت اتنا ہوش ہی نہ رہا تھا کہ وہ گائے کی دم پکڑ سکے۔ دھاگا باندھنے سے یہ امر یقینی ہوگیا کہ اس کی روح ذرا دیر سستانے کے لئے صحیح سلامت پہنچ جائے گی۔ ریاست کشمیر کے باہر سے ایک برہمن بھی لایا گیا۔ اس کے سر سے پیر تک بال مونڈ دیئے گئے اور ان تمام چیزوں کی علامتیں جو مہاراجہ کے استعمال میں رہتی تھیں اسے پیش کی گئیں مثلاً بستر کی چادریں، کھانے کے برتن، ایک موٹر، گھوڑا، سونا، چاندی، روپیہ وغیرہ۔ جب مہاراجہ کا انتقال ہوگیا تو اس برہمن کو پولیس نے ریاست سے نکال دیا اور واپس آنے کی بالکل ممانعت کر دی۔ کیونکہ وہ اپنے ساتھ گزرے ہوئے مہاراجہ کے تمام گناہ لے گیا تھا۔

جن لوگوں کو اس عہد میں کشمیر جانے کا اتفاق ہوا انہیں ہمیشہ یاد رہے گا کہ مہاراجہ پرتاب سنگھ ایک پست قد انسان تھا جو ایک بہت بڑی پگڑی باندھتا تھا، انتہائی فیاض میزبان تھا اور ایسی

پیچ ہائیں۔ سرکاری دعوتیں دیتا تھا جو پہلے محض قابلِ عمل کہانیاں معلوم ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ اس کی یہ دلچسپی بڑے غضب کی تھی اور مذاہب تحقیق پسند تھا۔

چونکہ پرتاپ سنگھ کی کوئی اولادِ نرینہ نہ تھی اس لئے اس کا بھتیجا ہری سنگھ، خوبصورت راجہ امر سنگھ کا جو ۱۹۰۹ء میں فوت ہوا تھا، بیٹا کشمیر اور جموں کے تخت پر بیٹھا۔ اور حدود کے اندر امن و امان کے ساتھ ریاست کی میانہ رو ترقی جاری رہی "حتیٰ کہ ۱۹۴۷ء کے ہنگامی حالات پیش آئے۔

محمد اسد اللہ قریشی

کشمیر میں اسلام کیسے پھیلا؟

بعض غیر مسلم لوگوں کا کہنا ہے کہ کشمیر میں مسلمانوں خصوصاً سلطان سکندر والی کشمیر کے عہد میں ہندوؤں کو جبراً مسلمان بنایا گیا ہندوؤں کے مندر گرا دیئے گئے اور انہیں تکلیفیں دی گئیں اور اس سلسلے میں پٹھانوں کے عہد کا بھی خاص طور پر ذکر کیا جاتا ہے کہ انہوں نے ہندوؤں کے ساتھ نار وا سلوک کیا اور انہیں طرح طرح کی تکلیفیں دیں۔ سو ہم مختصراً گزارش کریں گے کہ ان اعتراضات کی اصلیت کیا ہے اور کیا یہ صحیح ہیں یا غلط؟ اور اگر غلط ہیں تو کیوں؟

جن لوگوں نے یہ اعتراضات کئے ہیں اول تو انہوں نے اس بات کی نشاندہی نہیں کی ہے کہ کن کن آدمیوں پر جبر کیا گیا اور کن کن آدمیوں کو تکلیف دی گئی بس ایک مبہم بات لکھ دی ہے کہ فلاں کے عہد میں جبر ہوا انہیں چاہیئے تھا کہ جبر و ایذا دہی کی کوئی مثال پیش کرتے دوم یہ کہ ان اعتراضات کی تردید نہ صرف بعض حقیقت پسند مغربی مورخوں نے کی ہے بلکہ خود ہندو مورخین نے بھی کی ہے یورپی اور ہندوستانی مورخوں نے لکھا ہے کہ اس قسم کے الزامات تعصب یا بعض دوسری سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر گھڑ لئے گئے ہیں ان کا کوئی تاریخی یا واقعاتی ماخذ نہیں نہ وہ کوئی واضح دلیل یا مثال پیش کرتے ہیں جس سے ان کے دعوے کی تصدیق ہو سکے ان تصانیف اور تاریخوں کے بارے میں ہی جن میں یہ الزامات مذکور ہیں" کے متعلق مشہور یورپی مورخ ڈاکٹر آرنلڈ صاحب نے "پریچنگ آف اسلام" نامی کتاب میں لکھا ہے کہ یہ ناقابل اعتبار تصانیف ہیں اسی طرح پنڈت پریم ناتھ بزاز نے اپنی تصانیف میں وضاحت سے لکھا ہے کہ کشمیر میں اسلام علماء صوفیاء اور خاموش مبلغوں کے ذریعے پھیلا ہے اس میں کسی قسم کے جبر کو قطعاً کوئی دخل نہیں اس خیال کو پنڈت پریم ناتھ بزاز نے بڑے بڑے زور دار دلائل کے ساتھ گذشتہ دنوں اپنے ایک مضمون میں "کشمیر میں اسلام کا فروغ" کے عنوان سے بھی شائع کیا تھا جو ہندوستان کے علاوہ بعض پاکستانی جرائد میں بھی شائع ہوا تھا کشمیر میں اسلام پہلی صدی ہجری کے آواخر میں جہیم بن سامہ اور سلیط بن عبداللہ الحنفی دو خاموش مبلغوں کے ذریعے داخل ہوا اور رفتہ رفتہ لوگوں میں پھیلتا گیا کوئی مسلم سپہ سالار یہاں نہیں آیا جس نے جنگ کی ہو اور اس کے رعب، دبدبہ یا جبر سے کوئی مسلمان ہوا ہو اس قسم کی کوئی ایک مثال بھی پیش نہیں کی جا سکتی۔

آٹھویں صدی ہجری یا تیرھویں صدی عیسوی میں سب سے پہلے کشمیر کا راجہ رینچن اس وقت مسلمان ہونے کا شرف حاصل کرتا ہے جب وہ تخت کشمیر پر متمکن ہو چکا ہوتا ہے آخر اس پر کس نے جبر کیا اس نے تخت پر بیٹھتے ہی کشمیر کے تمام موجودہ مذاہب کا جائزہ لیا! ویدمت ہندو مت اور مسلمان علماء کا ایک مباحثہ بھی کرایا تا کہ اسے معلوم ہو جائے کہ کونسا مذہب دلائل کے لحاظ سے مضبوط ہے وہ خود اگرچہ بدھ مت کا پیرو تھا مگر اس نے کافی غور و خوض کے بعد آخر ایک مسلمان مبلغ سید شرف الدین بلبل شاہ کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا کیونکہ اسے یہی مذہب دلائل و براہین کے لحاظ سے سب سے زیادہ سچا معلوم ہوا صاحب گلدستہ کشمیر پنڈت ہرگوپال کول جس نے مسلمانوں پر جبری اشاعت کا یہ الزام لگایا ہے لکھتا ہے کہ راجہ رینچن نے برہمنوں سے ہندو مت میں داخل کرنے کی درخواست کی تھی مگر برہمنوں نے اس کی درخواست مسترد کر دی" سوال یہ ہے کہ اس میں قصور کس کا ہے؟ اسلام کا یا برہمنوں کا ظاہر ہے کہ اس میں قصور برہمنوں کا تھا جنہوں نے اس کی درخواست کے باوجود اسے اپنے مذہب میں داخل نہ کیا جب راجہ مسلمان ہوا تو اس کے ساتھ اور بھی بہت سے لوگ مسلمان ہو گئے کیونکہ بادشاہ کے مسلمان ہو جانے کے بعد دوسرے لوگوں نے بھی اسلام کا گہری نظر سے مطالعہ کیا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کے سادہ اصول ان کو اپیل کر گئے اور وہ مسلمان ہو گئے اس کے بعد کشمیر میں ایران سے سید علی ہمدانی بہت سے مبلغان اسلام کے کشمیر میں آئے جن کی وجہ سے اسلام کی اشاعت کو اور بھی ترقی ہوئی اور یہ واقعہ ہے کہ بعض ہندوؤں کو اسلام کی روز افزوں ترقی سخت ناگوار گزری اور انہوں نے یہ سمجھ کر کہ کشمیر سے ہندو مت اور برہمنیت ختم ہوتی جا رہی ہے اسلام کے خلاف مندروں میں سازشیں کرنی شروع کر دیں اور خفیہ طور اس بات کی کوشش میں رہے کہ مسلم حکومت کا تختہ الٹ کر پھر رام راج اور برہمن راج قائم کر دیا جائے اور انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ مجلسی بائیکاٹ کیا اور مسلمانوں کا نام

یعنی بابا رشی خبیث رکھا اور جہاں جہاں مسلمان رہتے تھے ان مقامات کا نام پھلمر یعنی خبیث لوگوں کی جگہ رکھ دیا۔ سلیمان نامی ایک شخص مسلمان ہو گیا تو ہندوؤں نے تکلیف اور ایذا دہی کی وجہ سے کشمیر سے ایران چلا گیا۔ دوبارہ کے بعد پھر کشمیر آیا اگر مسلمان رہا ہوں کا کام جبریہ مذہب ہوتا تو سلیمان نامی یہ نو مسلم ہندوؤں کی ایذا دہی کے خوف سے کشمیر سے ایران نہ بھاگتا بلکہ بادشاہ سے مدد لے کر ایذا دینے والے ہندوؤں کا قلع قمع کرتا

سلطان سکندر کے زمانے میں میر محمد ہمدانی کشمیر میں تشریف لائے اور ایک روایت کے مطابق بارہ سال اور دوسری روایت کے مطابق بائیس سال کشمیر میں تبلیغ کرتے رہے ان کے علاوہ دیگر سینکڑوں علما اور مبلغ اپنے عمل تقویٰ اور تبلیغ کے ذریعے لوگوں کو اسلام کی طرف کثرت سے کھینچ رہے تھے یہاں تک بہت سے برہمن اور ہندوؤں کے امرا اور درویانتی بھی مسلمان ہو گئے جب وہ مسلمان ہو گئے تو خود انہوں نے اپنے زنار اتار دیئے جلا دیئے اور بہت سوں نے اپنے مندروں کو مسلمان ہونے کے بعد مسجدوں میں تبدیل کر دیا مغربی مورخ مسٹر آئرلینڈ نے لکھا ہے کہ کشمیر میں میر محمد ہمدانی کے آنے کے بعد کس سرعت اور وسعت سے اسلام پھیل گیا کہ کل چند گھر مسلمان ہونے سے رہ گئے اور جوں جوں لوگ مسلمان ہوتے گئے اپنے مندروں کو توڑ کر مسجدیں بنانے لگے سلطان سکندر نے ہندو برہمن سہہ بٹ کو اپنا وزیر اعظم مقرر کر رکھا تھا وہ بھی مسلمان ہو گیا ہندوؤں نے اس کے خلاف سخت مذموم پروپیگنڈا کیا اور اسے برے برے ناموں سے موسوم کیا گیا یہ خبریں سہہ بٹ تک پہنچتی تھیں اس حد تک بھی اس نے سختی نہ کی لیکن اسلام کی اس قدر بے حد ترقی دیکھ کر ہندوؤں نے اپنے ان معبدوں اور مندروں کو سازشوں اور بغاوت کا مرکز بنا لیا ان مندروں میں سے مشہور مندر وزیر ایشری نام کا تھا جو مرکز فساد بن گیا تھا سہہ بٹ نے ان کو بار بار تنبیہہ کی کہ فساد سے باز رہو مگر وہ باز نہ رہے چنانچہ اس مندر کو جو بجائے معبد کے فساد و بغاوت کا مرکز بن گیا تھا مسمار کرنا پڑا اس کی بنیاد میں ایک پتھر برآمد ہوا جس پر لکھا تھا :

"بسم اللہ منتر ہیز ششنت وزیر ایشری" یعنی بسم اللہ ایک منتر ہے جس سے مندر وزیر ایشری ویران ہو گا اس مندر کی تعمیر کے وقت نجومیوں اور مہنتوں نے کشمیر میں اسلام آنے کی خبر دی تھی یہ خبر پتھر پر کندہ کرا کر بادشاہ کے حکم سے اس مندر کی بنیاد میں رکھوایا گیا تھا جو مندر خالص معبد تھے ان کے ساتھ کسی نے قطعاً کوئی تعرض نہ کیا اس کے باوجود میر محمد ہمدانی نے وزیر اعظم سہہ بٹ کو یہ ہدایت بھیجی کہ اسلام کو پھیلانے میں کسی قسم کے رعب اور دبدبہ یا جبر کو دخل نہ ہو کیونکہ اسلام میں اس کی ممانعت ہے قرآن میں فرمایا ہے کہ دین کے معاملہ میں کسی قسم کا جبر جائز نہیں سلطان سکندر کا نام خواہ مخواہ بت شکن رکھ دیا گیا اور بعض مسلم مورخین نے اسے بت شکن لکھا ہے انہوں نے ہندو مورخین کی کتابوں سے یہ نقل کیا ہے ورنہ تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جو شخص اسلام اور قرآن پر ایمان لاتا ہے جس کا حکم ہے کہ دین کے معاملہ میں جبر جائز نہیں وہ پھر جبر کو روا رکھے

سلطان سکندر کے اوپر مزید تارا نگی ہندوؤں میں اس طرح بھی پیدا ہوئی کہ اس نے شراب خوری قمار بازی زنا کاری چوری سانڈ مرغو اور پتنگ و ر بار کو جن کے ہندو لوگ عرصہ سے دلدادہ چلے آ رہے تھے ممنوع قرار دے دیا تھا ہندوؤں نے اپنے مذہب میں مداخلت سمجھا اور یہ ہندو شراب کا کاروبار قمار بازی اور اس طرح کے ان مخرب اخلاق کاموں میں زندگی بسر کرتے تھے وہ بیکار ہو گئے اور بعض کشمیر چھوڑ کر ہندوستان کی طرف کاروبار کی تلاش میں نکلے جن سے یہ مشہور کر دیا گیا کہ سلطان نے ہندوؤں کو جلا وطن کر دیا حالانکہ اگر مسلمانوں کے سوا کوئی اور بادشاہ بھی ہوتا تو ملک کی ایسی حالت میں وہ بھی ایسا ہی کرتا جیسا سلطان سکندر نے کیا یہ ملکی اصلاحات مذہب اسلام سے قطع نظر حالات کے تقاضاؤں کے مطابق کی گئیں بڈشاہ (زین العابدین) کے زمانے میں چونکہ حالات سدھر گئے تھے اس لئے اسے زیادتی سے کام لینے کی ضرورت پیش نہیں آئی بڑا سی کے عہد میں مخالفوں کو یہ یقین ہو گیا کہ اب مسلمان حکومت کو ختم نہیں کیا جا سکتا لہذا انہوں نے اب مسلمانوں کے ساتھ صلح و آشتی کیا تھ رہنا بہتر سمجھا اسپر زین العابدین بڈشاہ نے ان کا خیر مقدم کیا اور نہایت فیاضی سے ان سے پیش آیا اور انہیں بہت سی مراعات دے دیں ابتدائی عہد مسلم سلاطین کے وقت بھی اگر ہندو صلح و آشتی سے رہتے تو انہیں کبھی سختی سے کام لینے کی ضرورت پیش نہ آتی رہی پٹھانوں کے مظالم تو اس کے شکار جیسے ہندو تھے ویسے ہی خود مسلمان بھی اس کے شکار تھے بلکہ مسلمانوں کی کثرت کی وجہ سے ان پر کثرت سے مظالم بھی ہوئے انہیں زراندوزی مقصود تھی خواہ وہ ہندوؤں سے حاصل ہوتی یا مسلمانوں سے انہوں نے ہندو مسلم دونوں کو اپنی زراندوزی کی ہوس کا نشانہ بنایا وہ ایسے ہی حکمران تھے جیسے کشمیر کے سکھ حکمران تھے یا جیسے کسی ملک کے لئے کوئی بیرونی حکمران یا فاتح ہوا کرتا ہے ۔

دراصل حقیقت یہ ہے کہ کشمیر میں مسلمانوں کی حکومت کوئی اسلامی حکومت نہ تھی مغل پٹھان، سکھ، یا ڈوگرے جو بھی کشمیر کے حکمران رہے وہ ایسے ہی تھے جیسے کوئی غیر ملکی حکمران یا فاتح ہوا کرتے ہیں بہ حیثیت کشمیری قوم کے ان کے لئے جیسے مغل تھے ویسے ہی پٹھان تھے اور جیسے پٹھان تھے ویسے ہی سکھ تاریخ کا گہرا مطالعہ کرنے سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ان سب حکمرانوں نے کشمیر کو ایک مفتوح ملک سمجھا اور ہندو و مسلمانوں سب کے ساتھ وہی سلوک کیا جو فاتح طاقتیں مفتوح قوموں کے ساتھ کیا کرتی ہیں —— یہ کتنا بیجا ظلم ہوگا کہ انہوں نے کشمیر کو جذباتی تسکین کا ذریعہ سمجھ رکھا تھا جہاں کی آب و ہوا، قدرتی نیرنگیاں اور خوب صورتی ہے اگر وہ دل بہلایا کرتے تھے ان کے کرتوتوں کو اسلام کے سر تھوپنا سراسر زیادتی ہے بعض مسلم مورخین کو بھی اس سلسلے میں غلط فہمی ہوئی ہے انہوں نے مسلم سلاطین کی حکومتوں کو اسلامی حکومتیں سمجھ لیا جیسے کہ ہندوؤں نے انہیں اسلامی حکمران سمجھ لیا تھا اور ان کے جائز و ناجائز کاموں کو خواہ مخواہ اسلام کے سر تھوپ دیا حالانکہ ان میں سے کوئی حکومت بھی سرے سے اسلامی حکومت نہ تھی اور نہ ہی ان کے کاموں کو اسلامی فعل سمجھ کر بطور دلیل پیش کیا جا سکتا ہے۔ خلافت راشدہ کے بعد اسلامی حکومت خالصتہً دنیا کے کسی خطے میں قائم نہ ہو سکی لہٰذا ہندوؤں نے سلاطین کشمیر پر یہ سب اعتراضات اگر صحیح بھی مان لئے جائیں تو وہ ان سلاطین سے متعلق ہیں اسلام پر ایسے اعتراضات وارد ہی نہیں ہو سکتے کیونکہ اسلام ایک دین ہے جس میں کسی قسم کا دینی جبر جائز نہیں رکھا گیا ہے۔

ہفت روزہ نصرت لاہور

ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی

اہلِ کشمیر

اب تک یہ خیال کیا جاتا تھا کہ کشمیر میں پتھر کا زمانہ آیا ہی نہیں۔ بہرحال پانا رہتھن، تخت سلیمان، ارہوم، وند اہوم، ڈنگل، ناران ناگ کے مقامات پر کھدائی و تحقیق کے بعد دستکاری اور شکار کے اوزاروں، قدیم وضع کی قبروں، مختلف شکلوں کے کھدے پتھروں کی حالیہ دریافت نے بظاہر یہ ثابت کر دیا ہے کہ ایسا عہد کشمیر میں گزرا ہے۔ یعنی اس قدیم قبل از تاریخ دور میں بھی یہ سرزمین انسانوں سے آباد رہ چکی ہے۔

بدھ زمانے سے پہلے اور بعد میں ناگ پوجا کا وسیع رواج اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ وادیٔ کشمیر کے اولین آباد کار غالباً وہ لوگ ہوں گے جو "باشندگان قدیم" کے نام سے مشہور ہیں اور آریاؤں کی آمد سے پہلے ہندوستان میں آباد تھے۔ اسی بارے میں کچھ پتا نہیں کہ کشمیر میں قدم رکھتے وقت ان ابتدائی باشندوں کی تہذیب کس مقام تک پہنچ چکی تھی۔

اس کے بعد ہندوستان کے شمال مغرب سے آریائی یورش کی طرح آئی گو اس بات کو کیتھ جیسے محققین تسلیم نہیں کرتے۔ جیسا کہ پنجاب اور شمالی ہندوستان میں ہوا تھا۔ اسی طرح کشمیر میں بھی آریہ "قدیم باشندوں" سے گھل مل کر ایک قوم بن گئے۔ بہرحال وہ یہاں کے لوگوں پر آریائی نسل کا ٹھپا لگانے کیلئے ضرور کافی بڑی تعداد میں آئے ہوں گے۔

یہودی:۔ کشمیریوں کی جسمانی اور نسلی خصوصیات گردوپیش کی نسلوں سے بہت جدا ہیں۔ وادی میں آنے والے باریک بین سیاحوں نے ہمیشہ اس فرق کو محسوس کیا ہے۔ اس لئے ان کے نسلی ماخذ کے بارے میں بہت سی قیاس آرائیاں کی گئی ہیں۔ ایک ایسی ہی مضبوط شواہد پر مبنی قیاس آرائی کشمیریوں کا سلسلہ یہودی بلکہ عبرانیوں سے ملاتی ہے۔

کشمیریوں میں سے بہتوں کے خدوخال کی "یہودی" وضع کا متعدد جدید سیاحوں نے مشاہدہ کیا ہے۔ حالیہ زمانے میں کشمیر پر دو بلند پایہ محققین یعنی سر والٹر لارنس اور سر فرانسس ینگ ہزبینڈ نے، جن کی کشمیر اور کشمیریوں سے گہری واقفیت میں کوئی کلام نہیں۔ عورتوں، بچوں اور مردوں کے چہروں کی اسرائیلی "یہودی" وضع کو تسلیم کیا ہے۔ سر والٹر لارنس کہتے ہیں کہ مڑی ہوئی ناک کشمیریوں کی امتیازی خصوصیت ہے اور عبرانی ناک نقشہ عام ہے۔

سر فرانسس کا کہنا ہے کہ "ہم نے اپنے ذہن میں قدیم اسرائیلی ہیروؤں کی جو تصویر بنائی ہے اسے کشمیر میں سچ مچ دیکھنا ممکن ہے۔ کچھ لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں، گو مجھے یہ کہنا ہی پڑے گا کہ ان کے پاس کوئی خاص ثبوت نہیں کہ کشمیری اسرائیل کے گمگشتہ قبائل ہیں .... اور واقعہ یہ ہے کہ اصلی انجیلی چہروں کو کشمیر میں ہر جگہ دیکھا جا سکتا ہے۔ خاص طور پر کوہستانی دیہات میں یہاں آپ جب بھی چاہیں اسرائیلی چرواہوں کو گلے چراتے دیکھ سکتے ہیں۔" برنیئر نے بھی اسی فیصلہ کن انداز میں بات کی ہے۔ "پیر پنجال کے پہاڑ پار کر کے کشمیر میں داخل ہونے پر مجھے سرحدی دیہات کے باشندے یہودیوں سے بہت مشابہ معلوم ہوئے۔ ان کے خدوخال اور آداب اسی قدیم قوم کے معلوم ہوتے ہیں۔ میری بات کو محض تخیل آرائی نہ سمجھئے۔ کیونکہ میرے کشمیر آنے سے مدتوں قبل ہمارے جیسوئٹ پادری اور کئی دوسرے یورپی ان کی یہودی شکل وصورت کا ذکر کر چکے ہیں۔"

شاہ ہمدان ولی اللہ چودھویں صدی میں کشمیر تشریف لائے تھے۔ انہوں نے بھی وادی کو گویا کشمیر میں اسرائیلیوں کی آبادکاری کی تائید میں، "باغ سلیمان" کا نام دیا تھا۔

البیرونی سلطان محمود غزنوی کی کشمیر کے خلاف مہم کے ہمراہ آیا تھا۔ یہ مہم کشمیریوں کی شجاعت اور سخت برفباری

کی وجہ سے ناکام رہی۔ البیرونی نے بہرحال پنجاب اور غزنی میں اپنے طویل قیام کے دوران میں کشمیر پر معلومات جمع کرنے کے ہر موقع سے فائدہ اٹھایا۔ کشمیریوں کے متعلق، پنڈت کلہن سے ایک صدی سے بھی پہلے، البیرونی لکھتا ہے "کشمیری ملک کے فطری دفاع کے بارے میں خاص طور پر فکرمند رہتے ہیں۔ اور اسی لئے ملک میں آنے والی تمام سڑکوں اور دروں پر اپنی قوی گرفت رکھنے کا ہمیشہ اہتمام کرتے ہیں۔ اس وجہ سے ان سے تجارت کرنا بہت مشکل ہے۔ گذشتہ زمانے میں وہ ایک یا دو بدیسیوں کو، یا بالخصوص یہودیوں کو، ملک میں آنے کی اجازت دے دیتے تھے۔ مگر اب کسی ہندو تک کو، جب تک ذاتی طور پر اس سے واقف نہ ہوں انہیں آنے دیتے، دوسرے لوگوں کا تو ذکر ہی کیا"۔

افغان خون میں "یہودی" کی آمیزش کے امکان کا شبہ بھی کیا گیا ہے۔ سر جارج گریرسن کی تحقیقات سے یہ ثابت ہو گیا کہ کشمیری زبان کا تعلق سنسکرت گروپ سے نہیں۔ داردی گروپ سے ہے۔ گو یہ قبول کر لینا چاہئے کہ موجودہ کشمیری پر سنسکرت نے کافی اثر ڈالا ہے۔ اب یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ پشتو ایرانی خاندان کی مشرقی شاخ کا حصہ ہے، اور کشمیری بھی ایرانی گروپ ہے یا زیادہ صحیح یہ ہوگا کہ ہند ایرانی گروپ سے متعلق ہے۔ اس لئے، پشتو اور کشمیری میں کچھ نہ کچھ رشتہ ضرور ہوگا۔

عرب :۔ آٹھویں صدی میں وادی سندھ میں عرب یورش کا پہلا زور مسلمانوں کو بعض مرتبہ کشمیر کے گرد و نواح تک لے گیا۔ لیکن خود پنجاب تک کو مسلمانوں نے مستقل طور پر فتح نہ کیا۔ کشمیر پر المسعودی۔ القزوینی اور ادریسی جیسے مسلمان جغرافیہ دانوں کی تحریریں بہت مختصر ہیں۔

بہرحال بمبا قبیلے کو جو کشمیر میں جہلم کے دائیں کنارے پر آباد ہے، بنو امیہ کی نسل سے ہونے کا دعویٰ ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ بنو امیہ کے کچھ لوگ بدخشاں کو ہجرت کر گئے تھے۔ اور کچھ پشتوں تک وہاں رہنے کے بعد سنہ ۱۳۴۲ء میں بچہ کے ہمراہ کشمیر چلے آئے تھے۔

بہر کیف کشمیر میں ہند آریائی نسل کی آمیزش بہت پائی جاتی ہے کشمیری زبان کو سنسکرت نے جس طرح تبدیل کیا ہے۔ اس سے آریائی اثر کے پھیلاؤ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے پاس یہ فرض کرنے کیلئے معقول وجہ ہے کہ قدیم زمانے میں بھی کشمیر پر بیرونی حکومت تھی اور جس قوم کی حکومت ہوتی اسی قوم کے لوگ یہاں آکر بستے رہے۔ گو یہ امکان نہیں کہ یہ آباد کاری بڑے پیمانہ پر ہوئی ہوگی۔

لہذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ کشمیر کی موجودہ آبادی ایک ایسا مجموعہ ہے جس میں قدیم باشندوں کے ساتھ تھوڑی سی "یہودی" اور بہت سی آریائی اور دیگر بیرونی نسلیں گھل مل گئی ہیں۔

کشمیری :۔ جو لوگ کشمیریوں سے بخوبی واقف ہیں اور انہیں بہت قریب سے دیکھ چکے ہیں۔ وہ فوراً یہ تسلیم کر لیں گے کہ کشمیری بنیادی طور پر تخیل پسند اور صوفی طبع ہوتا ہے۔ اس کے ماحول نے اسے ایسا بنا دیا ہے۔ عظیم برفانی چوٹیوں، رواں سیمیں چشموں، اور ارفع تنہائیوں نے اس کے ذہن کو اس راستے پر لگا دیا ہے۔ سات سو سال تک بدھ مذہب کو، ویدانت کی تعلیم اور ایرانی ماخذ سے سرایت کرنے والے اسلامی تصوف کو کشمیر نے سر آنکھوں پر بٹھایا ہے۔ پیروں اور پنڈتوں نے اسے توہم پرست بنانے کی کوشش بھی بڑے زور شور سے کی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ تصوف اور وہم اب کشمیری فطرت میں رچ گئے ہیں۔ درحقیقت وہ وہم اور تصوف کی فضا میں سانس لیتا ہے۔ سنہ ۱۵۵۰ء میں مرزا حیدر دغلات نے جو خیال ظاہر کیا تھا۔ وہ آج تک کشمیریوں پر تقریباً پورا اترتا ہے۔ مرزا نے کہا تھا کہ کشمیر میں اتنی بدعتیں جائز قرار پا گئی ہیں کہ لوگ حرام و حلال میں فرق نہیں کر پاتے۔ "پیر و صوفی" ہمیشہ خوابوں کی تعبیر کرتے رہتے ہیں۔ معجزے دکھاتے ہیں، اور مستقبل یا ماضی کے بارے میں غیب سے اطلاعات حاصل کرتے ہیں..... ان کے خیال میں طریقت کو شریعت پر ترجیح حاصل ہے۔ لہذا اہل طریقت شریعت سے کوئی سروکار نہیں رکھتے" یہ مشاہدہ آج بھی بڑی حد تک درست ہے۔ اور اگر کشمیری مسلمانوں کو دنیا میں ترقی کرنی ہے تو انہیں پوری توہمات اور پیروں سے

عادت پائی ہوگی۔

کشمیری تخیل نے کچھ نہایت عمدہ شاعری بھی دنیا کے سامنے پیش کی ہے۔ لیکن موزوں صورت میں پیش نہ ہو سکنے کی وجہ سے اس شاعری کے ساتھ پوری طرح انصاف کبھی نہیں ہوا۔ ذہنی طور پر وہ غالباً دوسرے ہندوستانیوں سے فائق ہے اور بحث کرنے میں بڑا تیز ہے۔ معمولی سے معمولی کشمیری بھی بیشتر موضوعات پر ذہانت سے بات کر سکتا ہے۔ طنز کرنے کی بڑی استعداد رکھتا ہے۔ تمام نازک خیال لوگوں کی طرح جذباتی اور مبالغے کا شائق ہوتا ہے۔ وہ گانے اور گانے والی چڑیوں کا بھی دلدادہ ہے۔ دھان کے کھیتوں میں گائے جانے والے گیت بہت شاعرانہ خیالات سے معمور ہیں. ان کی دھنیں [illegible] ہیں۔ اگرچہ کشمیری بہت شور مچانے والا، باتونی اور ضدی ہوتا ہے۔ لیکن زلزلے اور ہیضے جیسی آفتوں کے دوران میں بے حد خاموش رہتا ہے۔

کوئی کام دنیا میں نہیں جو کشمیری نہ کر سکتا ہو۔ وہ بہت عمدہ کاشتکار، چھاپالی ہوتا ہے۔ اور نقل بندی کے متعلق کافی معلومات رکھتا ہے۔ نفیس اونی کپڑا بننا، عمدہ ٹوکریاں بنانا، لکڑی کا کام، سونے چاندی کا کام سب ہی اسے آتا ہے۔ جہاں تک اس کی عمدہ کاریگری کا تعلق ہے۔ دنیا میں شاید چند لوگ اس کی ٹکر کے ہوں لیکن شاید اس سے فائق کوئی نہیں۔ پیرپیٹے کہتا ہے کہ کشمیر کے مانجھی وینس کے گونڈولا بانوں سے کم چالاک نہیں ہوتے، "خطرناک سے خطرناک صورت حال سے بھی صحیح سالم نکل آتے ہیں۔" وزا "بہت عمدہ باورچی ہوتا ہے اور شاید دنیا بھر میں [illegible] کیلئے گوشت کے پچاس [illegible] سالن تیار کر سکتا ہے۔ اس کے کھانا کھلانے کے طریقے میں بہرحال ابھی اصلاح کی کافی گنجائش ہے۔ کشمیری اپنے کاروبار کو سمجھتا ہے اور سودا کرنے میں نقصان کبھی کبھار ہی اٹھاتا ہے۔

عام طور پر سرینگر میں اور اس کے آس پاس دوکانداروں کے ہاں نرخ مقرر ہوتے ہیں۔ سب سے سستا اشیا پنڈتوں کے لئے، ان سے مہنگا برصغیر سے آنے والوں کیلئے، اور سب سے مہنگا یورپی یا امریکی سیاح کیلئے۔ شاید جہاں تک کشمیری دوکاندار کا تعلق ہے۔ ان نرخوں میں کچھ منافات نہ ہو لیکن ان سے خریدنے والے کے ساتھ ناانصافی ہوتی ہے۔

کشمیری راسخ العقیدہ ضرور ہے لیکن نئے تصورات کی طرف سے قطعاً بے حس ہرگز نہیں ہے۔ وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ نرمی سے پیش آتا ہے۔ اور ینگ ہزبینڈ کا کہنا ہے کہ دیہاتوں میں بداخلاقی یا طلاق کی وارداتیں شاذ و نادر ہی سننے میں آتی ہیں وہ مہمان نواز بھی ہوتا ہے اور اپنے مہمانوں کی خندہ پیشانی سے تواضع کرتا ہے۔ کشمیری قتل و غارت کا بالکل عادی نہیں اور جان و مال کو نقصان پہنچنے کے حادثات بہت کم پیش آتے ہیں۔ کشمیری شرابی یا افیمچی نہیں ہوتا۔ اگر اس کی نسوار پینے کی عادت شمار نہ کی جائے تو یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ وہ قابل ذکر طور پر پرہیزگار ہوتا ہے۔

سر والٹر لارنس کہتا ہے کہ کشمیری کاشتکار کئی لحاظ سے آئرش لوگوں سے مشابہت رکھتا ہے۔ وہی حاضر جوابی جو آئرشوں کا خاصہ ہے کشمیری میں بھی پائی جاتی ہے اور لگان ادا کرنے سے دونوں کی جان جاتی ہے۔ کشمیری اور آئرش دونوں ہنسی مذاق کو بہت پسند کرتے ہیں۔ بے ضرر فریب کاری کے شوقین ہوتے ہیں۔ بچوں اور بزرگوں سے نرمی سے پیش آتے ہیں اور صفائی اور حفظان صحت کے بنیادی اصولوں کی بھی پروا نہیں کرتے۔

کشمیری عورتیں: بہت سے بیرونی سیاحوں نے کشمیری عورتوں کے بارے میں اپنے تاثرات ظاہر کئے ہیں دو بے حد متضاد رائیں، ایک انگریز کی اور دوسری فرانسیسی کی، بہت تعجب میں ڈالنے والی ہیں۔

کرنل الیگزینڈر ڈو اپنی تاریخ ہندوستان میں جو ۱۷۶۷ء میں چھپی تھی، رقم طراز ہے "کشمیر کے باشندے حیرت انگیز حد تک حسین ہوتے ہیں اور عورتوں کا حسن تو خاص پر کشش ہے" اور ہڈیلو ولسن نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ ہاروت اور ماروت نامی فرشتوں کو دام حسن میں گرفتار کرنے والی عورتیں کشمیری تھیں۔ اس کے برعکس وکٹر ژاک مون، ایک فرانسیسی عالم طبیعات اپنی کتاب "خطوط از ہند" میں لکھتا ہے "جیسی کریہہ صورت چڑیلیں میں نے کشمیر میں دیکھیں دنیا میں کہیں نہیں دیکھیں۔ یہاں کی عورتیں تو بہت ہی بدصورت ہیں" ادھر مشرقی شاعر

کشمیری عورتوں کے حسن کے بارے میں متفق ہیں اور مثال کے طور پر ظہوری کا یہ شعر پیش کیا جا سکتا ہے۔

بہ ترکان غارت گر صبر و ہوش
بہ کشمیریان ملاحت فروش

جس فرانسیسی مصنف کا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے اس کی طبیعت شاید اس غلاظت کی وجہ سے متنفر ہو گئی ہو جو بعض طبقوں کی کشمیرنوں کے مقدر میں لکھی ہے۔ ایک دفعہ ایک رنا مشنری یہ کہنے پر مجبور ہو گئی تھی کہ "پیاری کشمیرنو تم نہاتی دھوتی کیوں نہیں؟ انہوں نے حیران ہو کر اسے دیکھا اور جواب دیا "ہم پر اتنے ظلم و ستم ڈھائے گئے ہیں کہ ہمیں صاف رہنے کی پرواہ نہیں رہی" یہ جواب شاید اس امر کی وضاحت کرتا ہے کہ افغان اور سکھ ادوار میں ظالمانہ حکومت کے ماتحت صاف رہنے کا مطلب بد نظری اور اغوا کو دعوت دینا تھا اور اس طرح عورتوں کو مجبوراً گندا رہنے کی عادت پڑ گئی۔

جارج فورسٹر نے، جو ۱۷۸۳ء میں کشمیر آیا تھا کشمیرنوں کو جنوبی فرانس کی عورتوں سے مشابہت دی ہے جو اپنے حسن کے لئے مشہور ہیں اور یہ بھی کہا ہے کہ کشمیرنوں کو "جنوبی فرانس یا اسپین میں بہ دنیٹ کالے بالوں والی گوری حسینہ تصور کیا جائے گا" ہندوستانی نظروں کو کشمیرن عام ہندوستانی عورت سے مختلف معلوم ہوتی ہے۔

پنجاب کی چوڑی ہڈی اور گندمی رنگ کی کسان عورت اور ہندوستان کے دوسرے حصوں کی سانولی عورتوں کے مقابلہ میں کشمیرنوں کا رنگ زیادہ گورا، آنکھیں اکثر نیلی اور ظاہری وضع زیادہ لوچ دار اور دلکش ہوتی ہے۔ ہندو کشمیرن اکثر زیادہ نازک اندام ہوتی ہے۔ البتہ مسلمان عورت میں زیادہ دم اور زور پایا جاتا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ہندوؤں میں ذات پات کی پابندیاں ہیں، اور مسلمانوں میں اس قسم کی پابندی نہیں۔ کشمیرن کی بڑی بڑی چمکیلی کالی آنکھیں ترکی، ایرانی یا افغانی حسیناؤں سے کم نہیں۔ اگرچہ خواجہ حافظ نے اپنے دیوان میں صرف کشمیریوں اور ایرانیوں کی تعریف کی ہے

بشعر حافظ شیرازی گویند و می رقصند
سیہ چشمانِ کشمیری و ترکان سمرقندی

حافظ اور ظہوری کی طرف سے اسے واقعی بڑی داد سمجھنا چاہئے کہ حسن کے سلسلے میں انہوں نے ترکوں اور کشمیریوں کا ایک ساتھ ذکر کیا ہے کیونکہ ترک یقیناً مشرقی اقوام میں سب سے زیادہ حسین ہیں۔ سعدی نے اسی امر کی تائید میں کہا ہے۔

سعدیا روزِ ازل حسن بہ ترکاں دادند

بہر کیف اس میں کلام نہیں کہ غریبی اور جہالت اور اس بد نصیب وادی کی سیاسی گر، شوں نے کشمیرنوں کی نسوانی دلکشی کو بڑی حد تک بگاڑ دیا ہے۔ اسی لئے وادی میں گئے والے ایک صاحب کو یہ کہنا پڑا۔

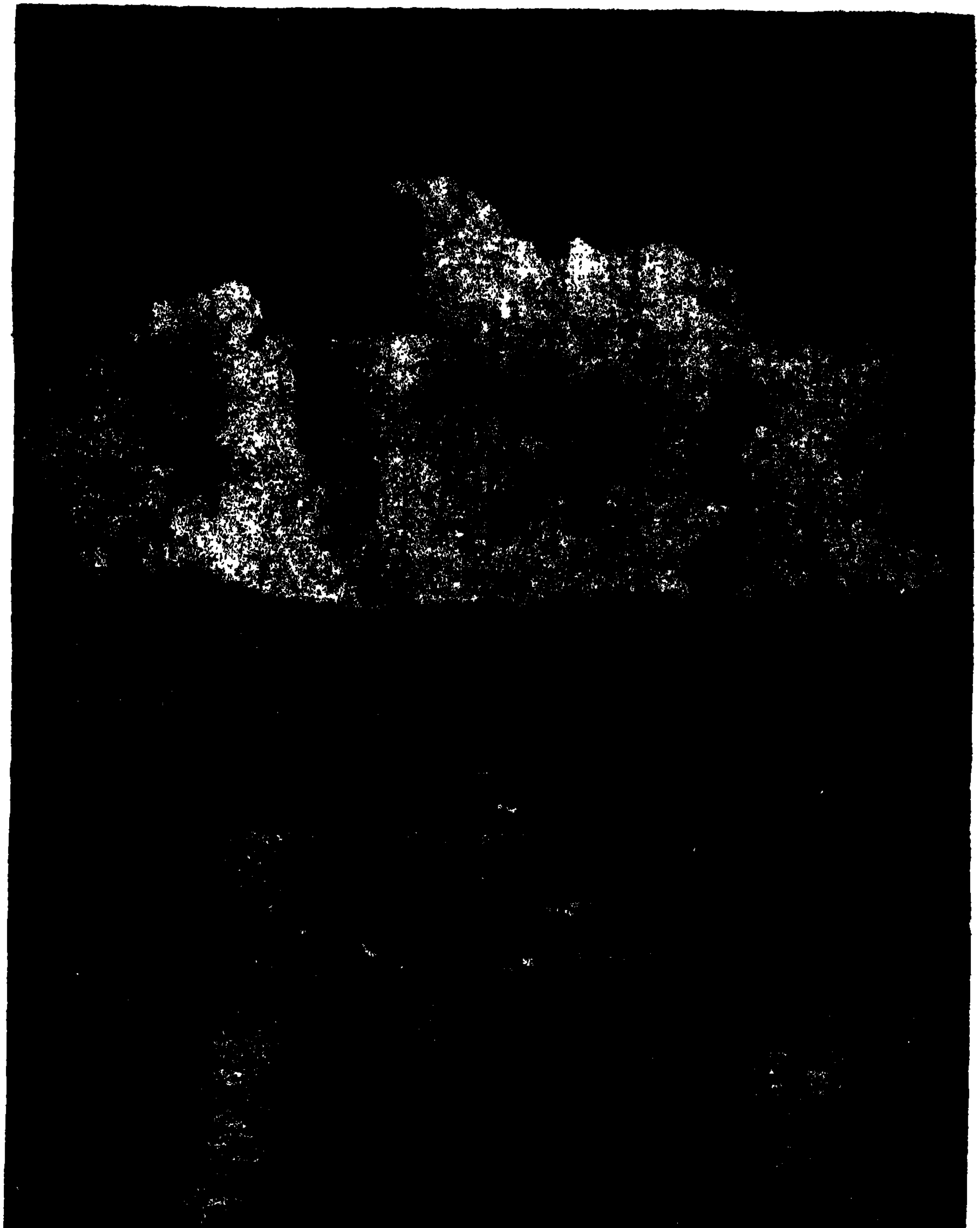
حسن کو چاہیے انداز و ادا، ناز و نمک
کیا ہوا گر ہوئے گوروں کی طرح گال سفید

لیکن آزادی اور شائستہ بود و باش کے مواقع ملتے ہی صورت حال بالکل بدل جاتی ہے جیسا کہ وہ کشمیری عورتیں ثابت کر چکی ہیں جو پنجاب اور یوپی میں جا کر آباد ہوئی ہیں۔ بقول مسز ایشلے کیرس ولسن کشمیری بچے بھی بڑے دلربا ہوتے ہیں لیکن ماؤں کی بے توجہی اور گرد و پیش کی غریبی اور گندگی انہیں اسی دلربائی سے پروان نہیں چڑھنے دیتی۔

کشمیر نمبر کی تصویروں کیلئے

ہم ــــــ جیلانی اور خورشید

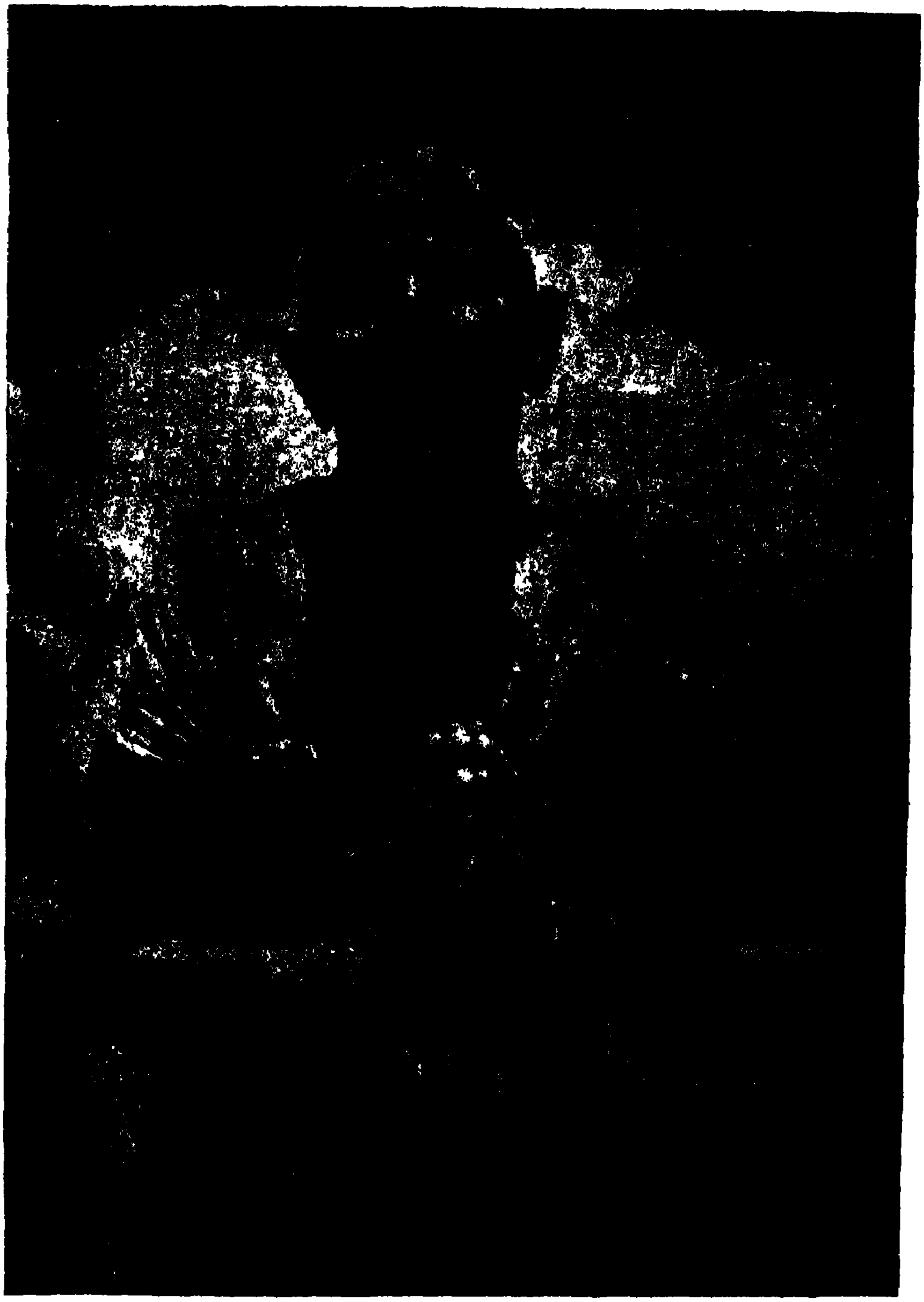
کے خاص طور سے شکر گذار ہیں۔ "شیخ عبد اللہ کی تقریر" "سرفروشان کشمیر" اور "ہنستا ہوا کشمیری" کو چھوڑ کر باقی سب تصویریں انہی کی کاوش ہیں۔ "ہنستا ہوا کشمیری" ــ پروفیسر عزیز کی تخلیق ہے۔



سری نگر نشاط باغ سے جھیل ڈل کا منظر



ہنستا ہُوا کشمیری



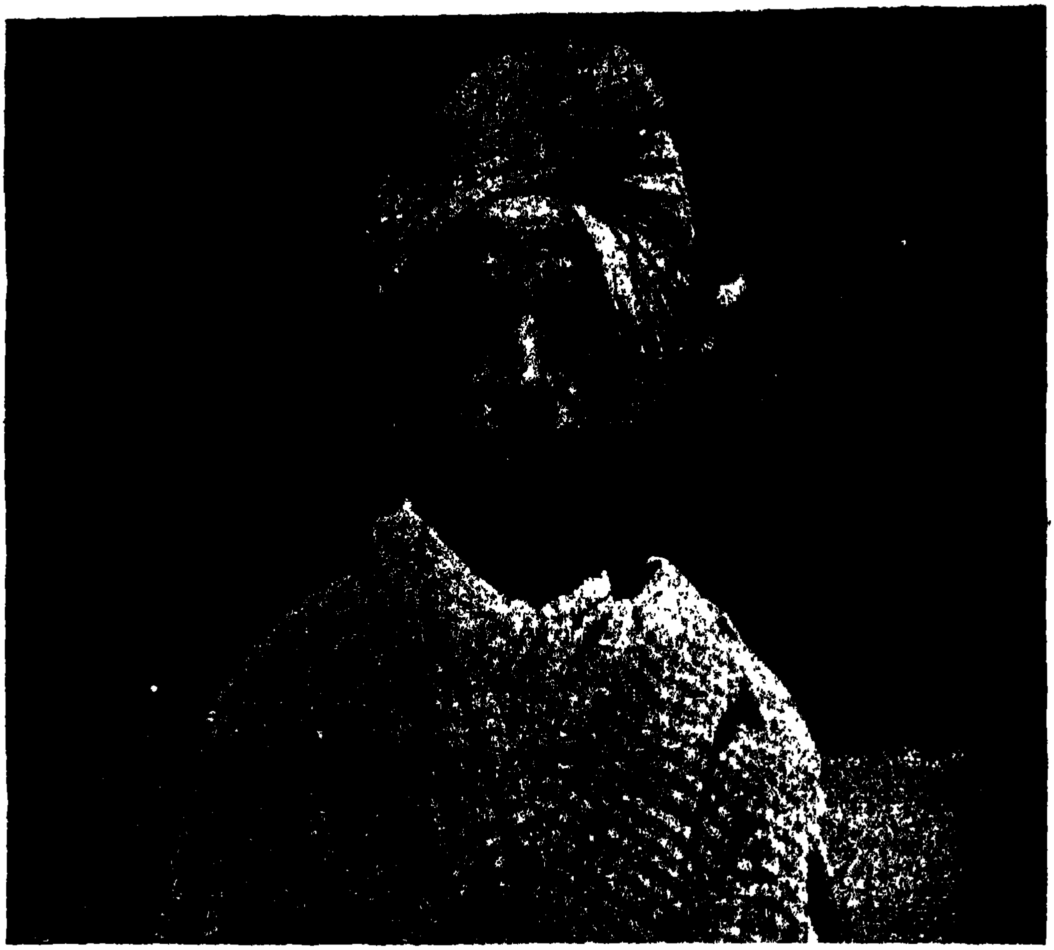
روتا ہوا کشمیری



خوش بچے →

اداس بچے ←

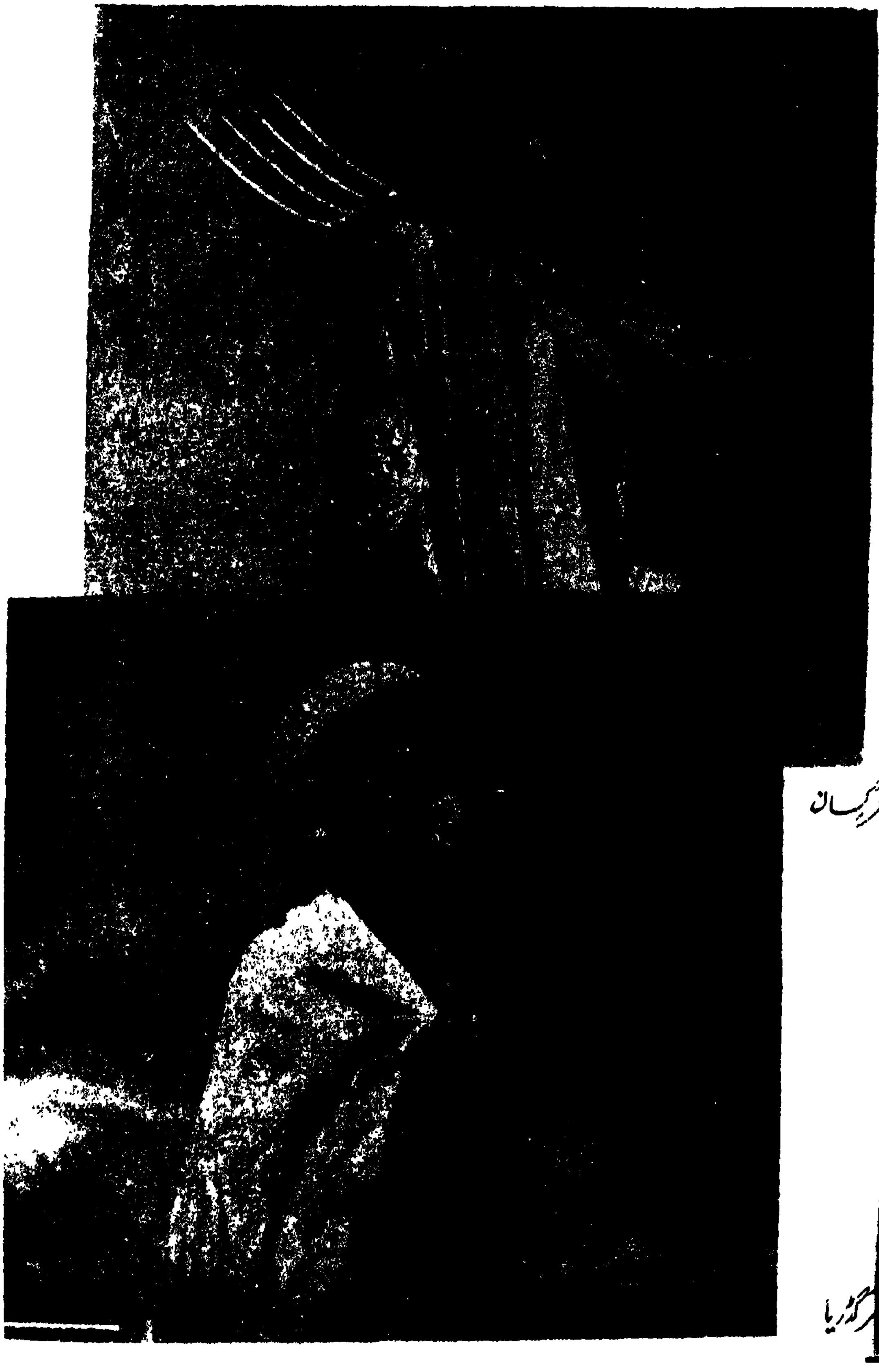




کشمیری پنڈت



کشمیری مزدور



عمرکیسان

رگذریا



کشمیری کمہارن

ہفت روزہ "نصرت" لاہور

بشیر جیروی

اہلِ کشمیر کا کردار

اب عوام کا ذکر ہو جائے۔ وہ اصل میں کس طرح کے ہیں؟ ان کا حقیقی کردار کیا ہے؟

یہاں ہم انہیں پھر تقسیم کر رہے ہیں لیکن ریاستوں اور صوبوں میں اتنا نہیں جتنا کہ ہر طرح جیسے کہ پہاڑوں نے انہیں تقسیم کیا ہے۔

جو لوگ وادیٔ کشمیر کو گھیرنے والے پہاڑوں سے پرے آباد ہیں وہ ہیں، پونچھ اور گلگت کے لوگ ہیں۔ یہ جنگجو ہیں۔ ماضی میں بعض اوقات یا تو انہوں نے خود وادی پر دھاوا بولا تھا یا دوسرے حملہ آوروں کا ساتھ دیا تھا۔ پرانی ہندوستانی فوج کے بہترین دستوں میں سے کچھ انہی لوگوں سے بھرتی کئے گئے تھے۔ انہوں نے جس کی اطاعت قبول کی اس پر ثابت کر دیا کہ وہ نڈر اور قابل اعتماد ہیں۔ انہی خدا داد اوصاف اور مناسب تربیت سے ان کی اپنی کا رکردگی نکل آتی ہے۔ ویسے ان تینوں مقامات کے لوگوں کے مزاج جدا ہوتے ہیں۔ پونچھ کے لوگ تو کبھی کبھی ہنس بھی دیتے ہیں، گلگت کے لوگ شاذ و نادر ہی مسکراتے ہیں کیونکہ ان کی زندگی پر صعوبت ہوتی ہے۔ ان کے ریس کی مٹی فصل اگانے میں بہت بخل سے کام لیتی ہے۔ اس کے برعکس پونچھ سے آنے والے آدمی اپنے جائے وقوع کے لحاظ سے بھی اور زمین کی پیداوار کے لحاظ سے بھی دونوں کے درمیان کا علاقہ ہے۔ جوانی کے دنوں میں نظامِ کھیتی باڑی کرنے پر سپاہ گری کو ترجیح دیتے ہیں اور چھوٹی موٹی پنشن لینے کے بعد اپنی اراضی کا رخ کرتے ہیں۔ مختصر یہ کہ عموماً ان لوگوں پر ہمیشہ بھروسہ کیا جا سکتا ہے اگر آپ ان کے دوست ہیں تو وہ آپ کا ساتھ دیں گے اور چاہے کچھ ہو جائے مشکل وقت میں بھی ساتھ نہ چھوڑیں گے۔ یہ بات دونوں شمالی ریاستوں پر اسی طور پر صحیح اترتی ہے لیکن یہ لوگ معاملات عشق میں بہت متشددانہ بھی ثابت ہو سکتے ہیں اور جس پر ان کا دل آ جائے اسے حاصل کرنے کے لئے کسی چیز کا ساتھ چھوڑنے سے، کوئی دکھ اٹھانے سے دریغ نہ کریں گے پھر ذات پات، مذہب اور نسل کو وہ خاطر میں نہیں لاتے۔ اور اگر ان کا محبوب جوان اور نظر نواز ہو تو اسے حاصل کرنے کے بعد وہ بڑے حاسدانہ طور پر اس کی نگرانی کرتے ہیں۔ ورنہ چند برسوں بعد یہ معمولی کمیں بعد ہی حیرت انگیز طور پر اسے نظر انداز کر دیں یا نکال دیں گے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی غرض کا مقصد صرف یہ ہے کہ حاصل کرنے اور بڑے عرصے تک رکھنے کی اپنی صلاحیت کا ثبوت دیا جائے۔ اس کے بعد ان کی دلچسپی ختم ہو جاتی ہے۔ یہ حال، لوگ ایسے ہیں کہ جان و مال کے بارے میں ان پر اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ یہ بھی دوست یا مالک کی خاطر جان پر کھیلتے جب انہیں یقین ہو جائے یا پتہ چلے کہ انہوں نے غلط آدمی کو اعتماد کے لئے چنا ہے تو یہ نفرت اتنی بڑھ جاتی ہے کہ وہ مار بھی ڈالتے ہیں۔ جوں جوں زمین کا بنجر پن بڑھتا جاتا ہے اور ان لوگوں کو دوست بنا کر اپنے ساتھ رکھنا دشوار ہو جاتا ہے۔ دونوں بظاہر ٹھنڈی جگہ ہے اور گو گذشتہ زمانے میں حملہ آوروں نے انہیں زیر کیا، کسی نے اس کام کو آسان نہیں پایا۔ کیونکہ زیر ہونے والوں نے ہار ماننے کے بعد جو ذرا سی زندگی کو ہاتھ سے نہ جانے دیا تھا اور پر غرور انداز میں اپنا سر اونچا رکھا تھا۔ وہ نہ تو دھتکارے جاتے اور نہ ہی خوشامد کرتے ہیں وہ ضرورت سے زیادہ بے قرار نہیں ہوتے۔

شمال اور شمال مشرق میں لداخی آباد ہیں۔ یہ جنگجو نہیں ہیں جو قدم کے پیچھے آدمی ہے۔ اس ایک دن کی زندگی کو مذہب کے لئے وقف کر دیا ہو ان سے اور کس طرح کی زندگی کی توقع کی جا سکتی ہے لیکن وہ ایماندار ہوتے ہیں۔ ان کی بات پر اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ جن لوگوں کو وہ اپنا دوست بناتے ہیں ان کو دھوکا نہیں دیتے اور ان سے وفا کرتے ہیں۔ وہ کبھی مہمانوں کی چیز نہیں چراتے۔ وہ سادہ لوگ ہیں جو زندگی مسکرا کر گزار دیتے ہیں اور کسی چیز کا انہیں ڈر نہیں ہوتا۔ وقتاً فوقتاً انہیں استبداد کے سامنے سر جھکانا پڑا لیکن ایسے دور کشمیر کے دوسرے علاقوں کے ادوار جتنے طویل یا بھیانک نہیں تھے۔

اس کے بعد ہم وادی کے عوام کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جنہیں عموماً کشمیری کہا جاتا ہے۔ ان کا کیا کردار ہے؟

اس کا مطالعہ کرنے سے پیشتر ایک لمحے کے لئے ان عوامل پر توجہ

دینی چاہیئے جنہوں نے ان لوگوں کے کردار کی تشکیل میں حصہ لیا ہے؟ یہ مخصوص عوامل فطری حادثات عظیم تھے۔ اب بھی کبھی کبھی ہمالیہ میں کہیں خفیف سے زلزلے کی خبر ہم تک پہنچتی ہے۔ یہ عمل ہزاروں لاکھوں سال سے جاری ہے۔ اس بات کا کافی ثبوت موجود ہے کہ ماضی میں کشمیر میں خوفناک زلزلے آئے تھے اور ان میں سب سے تباہ کن زلزلے خود وادی میں آئے تھے۔ پہلا زلزلہ جس کا تاریخ میں ذکر ہے راجہ مدسین کے زمانے میں (۲۹۲ء تا ۲۲۷ء ق م) آیا تھا۔ شہر کا وسطی حصہ شق ہو گیا اور دریا، پہاڑیوں اور پہاڑوں سے پھوٹنے والے پانی نے تمام شہر کو غرق کر دیا۔ ۱۵۰۱ء میں ایک اور زلزلہ تین مہینے تک جاری رہا۔ ۱۵۵۲ء میں ایک اور زلزلہ آیا جس کی مدت دو مہینہ تھی اور تقریباً اتنا ہی طویل زلزلہ ۱۶۶۲ء میں آیا۔ ۱۷۳۵ء میں ایک اور زلزلہ تین مہینے تک آتا رہا اور ایک ہزار مکان برباد ہو گئے۔ لیکن ان سب سے تقریباً پچاس سال بعد ۱۷۸۴ء میں آنے والا زلزلہ بازی لے گیا جو ایک سال تک جاری رہا۔ سب سے خوفناک زلزلہ ۳۰ مئی ۱۸۸۵ء کو رات کے تین بجے آیا۔ اسی کے دوران میں بمقام لاری ایک سات سو فٹ لمبا، تین سو فٹ چوڑا اور ستر فٹ گہرا انشقاق پڑ گیا جس میں چھ مکان مع مکینوں کے غائب ہو گئے۔ دس ہزار مکان تباہ، تین ہزار تین سو نوے آدمی اور چالیس ہزار مویشی ہلاک ہوئے اور زلزلے کے جھٹکے ڈھائی مہینے تک محسوس ہوتے رہے۔ اس کے نتائج نہایت خوفناک اور لوگوں کی حالت قابل رحم تھی۔ چنانچہ مہاراجہ نے انہیں نئے مکان بنانے کے لئے تیس ہزار روپیہ دیا اور دو لاکھ روپیہ کا لگان معاف کر دیا۔ نیو نے اپنی کتاب "پیر پنجال سے پرے" میں اس دہشت ناک دنوں کا ذکر کیا ہے۔ جب اسے اور اس کے کارکنوں کو لوگوں کے بچانے کے کام سے گھڑی بھر کے لئے سونا بھی بمشکل نصیب ہوتا تھا۔ اور بڑی زبردست آگیں لگ گئی تھیں۔ کیونکہ لوگ اپنی جلتی ہوئی کانگڑیاں چھوڑ کر بھاگ گئے تھے اور ان کے الٹے ہی گرے ہوئے مکان دھڑ دھڑ جلنے لگے تھے۔

اس کے بعد سیلاب جیسی خوفناک آفت ارضی کا نمبر آتا ہے۔ پہلے مرقوم زلزلے کے ساتھ زبردست سیلاب بھی آیا تھا۔ اکثر زلزلوں کے ساتھ خصوصاً جب وہ موسم بہار میں آئیں، یہ مزید ہولناکی بھی بپا ہوتی ہے ویسے سیلاب زلزلوں سے زیادہ آتے ہیں۔ ۱۳۰۹ء میں ایک سیلاب دس ہزار مکان بہا کر لے گیا اور ۱۷۴۶ء میں ایک اور سیلاب میں اتنے ہی مکان اور دریائے جہلم کے تمام پل بہہ گئے۔ ایک اور خوفناک سیلاب ۱۸۴۱ء میں آیا اور ٹل گیٹ کے ٹوٹ جانے سے سری نگر شہر کا تمام مشرقی حصہ ڈوب گیا۔ غرضیکہ یونہی سیلابوں کا تانتا بندھا رہا۔ فی زمانہ دریا کے کناروں پر پانی کا دباؤ کم کرنے کے لئے کافی کام ہوا ہے اور سیلاب ہولا ہو۔ دریا کی تہ بھی گہری کی گئی ہے۔ لیکن اب بھی کبھی کبھی، موسم بہار میں پہاڑوں کی برف پگھلنے کے وقت، کنارے جواب دے جاتے ہیں، اور یہی وہ وقت ہوتا ہے جب کھیتیوں کے پکنے کے آثار نمایاں ہوتے ہیں۔

افراط کے اس دیس میں قحط بھی اتنے پڑے ہیں کہ ان کے ذکر سے صفحے کے صفحے سیاہ ہیں۔ تونجین اول کے عہد میں (۲۰۵ء تا ۱۱۴ ق م) اگست میں برفباری ہونے سے چاول کی فصل بالکل تباہ ہو گئی تھی اور قحط پڑ گیا تھا۔ ان میں اکثر قحطوں کا باعث بے موسم کی بارشیں ہوتی تھیں چونکہ کسان اتنا بہت سا غلہ شہر بھیجنے پر مجبور تھے جو ان کے پاس کھانے پینے کو کچھ نہ بچتا تھا اور سب سے زیادہ تکلیف انہیں ہی اٹھانی پڑتی تھی۔ ۱۸۳۲ء کا قحط اس طرح پڑا تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ لاہور سے کشمیر روانہ ہوا اور اس نے گورنر کو اپنے کیمپ کے لئے کافی سامان رسد جمع کر لینے کا حکم دیا۔ حکم کی تعمیل ہوئی اور کسانوں کے پاس برائے نام غلہ رہ گیا۔ پھر اکتوبر میں، جو فصل کٹنے کا مہینہ ہوتا ہے، شدید برفباری نے فصلوں کو تباہ کر دیا۔ اگلے سال کشمیر کے نئے گورنر کرنل میہن سنگھ نے محل کی شہ نشین پر کھڑے ہو کر دیکھا تو شہر میں ایک بھی چراغ جلتا نظر نہ آیا اور صبح کے وقت مرغوں کو اذان دیتے ہوئے سنا۔ کیونکہ انہیں تو قحط کے مارے ہوئے لوگ کھا گئے تھے۔ اس نے پنجاب سے کافی غلہ اور مرغیاں منگوائیں اور اگلے برس حالت سدھر گئی۔ ۱۸۶۴ء میں بھی ایک سخت قحط پڑا لیکن ۱۸۷۷ء کا قحط تو ہولناک تھا۔ کہا جاتا ہے کہ دو تہائی آبادی بھوک کی مر گئی تھی۔ اگرچہ مہاراجہ نے پنجاب سے ہزاروں من غلہ منگوایا تھا قحط میں ڈھائی سال تک کمی نہ ہوئی۔ ان مصائب کا سبب خشک سالی نہیں بلکہ گرمائی طغیانی اور کبھی کبھار قبل از وقت برفباریاں ہوتی تھیں، اور ملک کی الگ تھلگ جائے وقوع کی وجہ سے قحط کے ایام میں باہر سے سامان رسد لانا مشکل ہو جاتا ہے اور اکثر حملہ آور فوجوں کی تاخت و تاراج بھی قحط کا سبب بن جاتی تھی۔

آخری فطری آفت ہیضے کی خوفناک وبا ہے۔ اس کا ۱۹۰۲ء

...ستہ زور رہے او۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حملہ آور پنجاب سے اپنے ساتھ لائے تھے۔ دیکھئے ۱۸۳۰ء میں طاعون کی وبا پھیلی تھی۔ جس کے متعلق وقائع نگاروں نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ چالیس دن تک اس کا دور رہا کہ انسانوں کے حواس باختہ ہوگئے۔ مرنے والوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ انہیں دفنانا یا جلانا نہ جا سکتا اور لاشوں کو دریا میں پھینکنا پڑا۔ ہر مرتبہ ہزاروں آدمی مرتے تھے اور اس کا ثبوت موجود ہے کہ ۱۸۹۲ء اور ۱۹۱۰ء کے درمیان پندرہ دفعہ ہیضے کی وبا پھیلی تھی ۱۹۰۲ء میں گیارہ ہزار سات سو اور ۱۹۱۰ء میں نو ہزار دو سو آدمی مرے تھے۔ آج کل ہیضے کی وبا شاذ و نادر ہی پھیلتی ہے کیونکہ طبی سائنس بہت ترقی کر چکی ہے اور کشمیر میں صفائی اور حفظان صحت کی عادات پیدا کرنے کی بڑی کوشش کی گئی ہے گو ترقی کی اب بھی بہت گنجائش ہے۔

یہ تمام وبائیں اور آفات فطری تو لوگوں پر نازل ہوتی رہی ہیں۔ اس کے علاوہ صدیوں سے ہمیشہ موجود رہنے والے فاتحوں، ظالم لوگوں اور حاکموں نے ان کے ملک پر قبضہ رکھا ہے۔ ہر حاکم کا قانون جدا تھا، مزاج جدا تھا، ان میں سے کچھ مہربان تھے، دوسرے بے رحم تھے۔ صدیوں سے لوگوں کے کسی ذہنی فرشتے نے اس خوف کے سائے میں زندگی بسر کی ہے کہ اگر انہوں نے آقاؤں کے جابرانہ حکم کی جسمانی طور پر تعمیل نہ کی یا اسے ذہنی طور پر قبول نہ کیا تو اس کی سزا موت ملے گی۔

انہی حاکموں نے انہیں زندگی کی ان ضروریات کو ترسایا جو انہوں نے اتنی وافر مقدار میں خود بنائی یا اگائی تھیں کہ ان کے گھر بار کو پوری ہو کر بچ رہتیں۔ چنانچہ کشمیریوں نے خود کو اور اپنے جھتیوں کو بربادی سے بچانے کے لئے جھوٹ بولنا سیکھا۔ انہوں نے یہ سیکھا کہ کسی اجنبی پر بھروسہ نہ کرو، کبھی وہ لوٹنے کی غرض سے آیا ہو۔ اور انہوں نے آفات فطری یا حملہ آوروں کے برپا کئے ہوئے قحط سے بچنے کے لئے غلہ جمع کرنا اور چھپانا سیکھا۔ اور اسی وجہ سے اور اپنی فرومایگی کی بنا پر موقع ملنے پر چرانا سیکھا۔ انہوں نے تلوار اور بندوق سے ڈرنا سیکھا کیونکہ ان دونوں سے انہیں جانی و مالی نقصان اٹھانے پڑے تھے۔ انہوں نے ظاہر میں غریب بننا اور اس طرح میلا کچیلا رہنا سیکھا تاکہ ان پر ٹیکس لگانے والے مغالطے میں آ کر ان سے کم روپیہ پیسہ وصول کریں۔

چنانچہ ان مسلسل مظالم کی وجہ سے وادی کے عوام انتہائی نفرت انگیز تنزل کی حالت تک پہنچ گئے ہیں، اور ان کا خوف بزدلی سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ اسی لئے ان کے علاقے کے شمال مغرب اور جنوب کے کوہستانوں میں آباد لوگوں کو اگر آپ کشمیری کہہ دیں تو وہ فوراً آپ کی غلطی کی تصحیح کر دیں گے۔ کسی قوم کے لوگوں کا اس حالت میں مبتلا ہونا ہولناک بات ہے لیکن اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ پشتہا پشت سے انہیں اس پر مجبور کیا گیا ہے یہاں تک کہ اب ان کا اخلاقی حوصلہ بالکل تو نہیں لیکن بہت حد تک مفقود ہو چکا ہے کیونکہ انہیں یہ بھی نہیں سکھایا گیا کہ اپنا بچاؤ کس طرح کرنا چاہئے۔ انہیں یہ پتہ ہی نہ تھا کہ کس طرح لڑنا اور اپنے جگر گوشوں کو بچانا چاہئے۔ انہوں نے یہ سیکھا ہی نہیں کہ جب مارنے مٹنے کا خون سر پر چڑھ جائے تو قتل کس طرح کرنا چاہئے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ وادی میں قتل کی وارداتیں بہت کم ہوتی ہیں۔

مورکروفٹ جس نے ۱۸۱۹ء اور ۱۸۲۵ء کے درمیان کشمیر کی سیاحت کی تھی لکھتا ہے کہ عوام کاہل اور خراب غذا، اندھیرے، نم اور گھٹے ہوئے مکانوں، غیر معمولی غلاظت اور حد درجہ بدفعلی کی وجہ سے انتہائی گھناؤنی بیماریوں میں مبتلا ہیں۔ اس کا دعویٰ ہے کہ اس وقت اس سے زیادہ ذلیل قوم کہیں موجود نہیں؟ اور یہ کہ جہاں تک کردار کا تعلق ہے کشمیری خود غرض وہم پرست اور کاذب ہے لیکن دین کے معاملے میں ہمیشہ فریب کاری سے کام لیتا ہے اور مکاری سے باز نہیں رہتا اور ذرا شرمندہ نہیں ہوتا بلکہ مورکروفٹ نے یہ بھی کہا ہے کہ میں یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ کشمیری کے عیوب میں ان کی فطرت کا نہیں سیاسی حالات کا ہاتھ ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اسے بہتر انسان میں بدل دینے کا کام مشکل ثابت نہ ہوگا۔" ان کی اپج کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ ایک دانشمند حکومت کے ماتحت وہ شاید اخلاقی اور ذہنی طور پر اپنی اچھی صلاحیتوں کے برابر بلند ہو جائیں۔

اس کے بعد ہم جی۔ ٹی۔ وِن کی آراء پیش کرتے ہیں جس کا سفرنامہ ۱۸۴۲ء میں چھپا تھا "کشمیری کسان کی چوڑی چکلی ہرقلیسی کاٹھی اور مردانہ ناک نقشے اور اس کی سہمی ہوئی شکایتوں اور بودی طبیعت کا تضاد عجیب ہے۔ لیکن اس امر کو ملحوظ رکھنا چاہئے کہ یہ کمزوریاں عین ممکن ہے عرصہ دراز تک استبداد اور مطلق العنانی کے پنجے میں گرفتار رہنے سے پیدا ہوئی ہوں۔ حوصلہ کی اسی کمی نے انہیں چالبازی اور بے ایمانی کا سہارا لینے پر مجبور کر دیا ہے۔ اسی وجہ سے ان کے دوسرے عیوب کو اور بھی بری نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ کیونکہ جہاں تک چال چلن کا تعلق

ہے کشمیری سکھوں اور پٹھانوں دونوں سے مختلف ہیں کشمیریوں کے جھوٹے اور مکار ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔"

فریڈرک ڈریو نے ۱۸۷۵ء میں اپنی کتاب "علاقہ جات جموں و کشمیر" میں لکھتا ہے کشمیری دروغ گو ہیں۔ جھوٹ بولنے کو تیار رہتے ہیں اور طرح طرح کی دھوکے بازی کے عادی ہیں۔ جھگڑالو ہیں، شور بہت مچاتے ہیں۔ تو تو میں میں کرنے کو تیار لیکن ہاتھا پائی سے بچتے ہیں۔ طاقت کے ذرا سے استعمال یا دھمکی پر بچوں کی طرح رونے لگتے ہیں۔ درحقیقت اپنی بزدلی اور کم ہمتی کے لئے وہ کافی مشہور ہیں۔ خیال ہے کہ کسی ایک فرقے کا نہیں پوری وادی کے لوگوں کا ذکر ہے۔ پانچ لوگوں کے متعلق جن سے مغربیوں کا سب سے زیادہ واسطہ پڑتا تھا، ڈریو لکھتا ہے: "ان کا تخیل بڑا کام کرتا ہے۔ ہر وقت جھوٹے قصے کہانی سنانے کو تیار رہتے ہیں۔ بے حد حریص ہیں اور جب تک انہیں تھوڑا سا اور مل جانے کی امید ہے کبھی مطمئن نہیں ہوتے۔"

لیکن بقول ڈریو ان میں اچھی باتیں بھی تھیں۔ اسے تسلیم ہے کہ ایسے کشمیری بھی اسے ملے تھے جنہوں نے جسمانی خطرات کا بخوبی مقابلہ کیا تھا۔ اور یہ کہ "ذہنی طور پر وہ اپنے ہمسایوں سے برتر ہیں۔ وہ پنجابیوں سے تو یقیناً زیادہ ذہین ہیں اور ذہن اور اختراع کے اور ادراک اور روشن خیالی کے اعتبار سے اپنے آقا ڈوگروں سے بہت آگے ہیں۔"

اسی زمانے میں ولسن نے اپنی مشہور کتاب "دسکن برف" تحریر کی تھی۔ اس میں اس نے لکھا ہے کہ چینی سیاح فاہیان نے بھی، جو کوئی سو برس پہلے کشمیر آیا تھا، کشمیریوں کے کردار کو خاص طور پر برا بتایا تھا۔ خود ولسن کی رائے یہ ہے کہ "پرفریب قومیں تو اور بھی ہیں لیکن کشمیریوں کا جواب نہیں ملتا۔ ان پر جو الزام لگائے جاتے ہیں میں ان سے انکار نہیں کر سکتا۔ اس کے باوجود میں ان پر ترس کھانے اور ان سے ہمدردی رکھنے پر مجبور ہوں۔ وہ غیر دلچسپ لوگ نہیں بلکہ ذہین پسند لوگ ہیں اور اختراع کا بڑا مادہ اور خوش طبعی ان کا خاصہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ ان میں اس چیز کے عناصر موجود ہیں جو زیادہ خوش نصیب حالات میں ایک عمدہ کردار کو جنم دے سکتی لیکن وہ ایک ایسی زرخیز اور حسین وادی میں آباد ہیں جس کے چاروں طرف جفاکش اور جنگجو قبائل بستے ہیں اور ایک عرصہ دراز سے اس استبداد کے شکار ہیں جو قومی امید اور خوبی کو تباہ کر دیتا ہے۔"

اب اگلی نسل کے متعلق لارنس کی کتاب "وادی کشمیر" (۱۸۹۵ء) سے اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔ لارنس کشمیریوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ کشمیر میں زرعی اصلاحات کا آغاز اسی نے کیا تھا۔ "کشمیری پنجاب ہی میں نہیں بلکہ تمام ایشیا میں بہت بدنام ہیں۔ کہاوتوں میں اس کے اخلاق کو سانپ سے بدتر اور آدمی مجلس اور غیبوں سے تشبیہ دی ہے اور لوگوں کو متنبہ کیا گیا ہے کہ کشمیریوں کو اپنا دوست نہ بنائیں۔ میں نے ایک بوڑھے کشمیری سے کشمیریوں کی موجودہ بدحالی کی وجہ پوچھی تھی۔ اس نے قومی کردار کی دو امتیازی خصوصیتوں کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ دروغ گوئی اور حسد۔ کسی کو پھلتے پھولتے دیکھنا کشمیری کی برداشت سے باہر ہے۔ وہ بہت بودی طبیعت کا مالک ہے اور افسروں کے سامنے بے حد ناکسی کا اظہار کرتا ہے۔ جب وہ دیہاتی حکام کے سامنے ہو یا شہر میں کوئی عرضی پیش کر رہا ہو تو اس پر یقین کرنا ناممکن ہے۔ البتہ اس کے اپنے گاؤں میں ساتھی گاؤں والوں کے سامنے میں نے اس سے سچی بات کہلوانا خاصا آسان پایا ہے۔" آگے چل کر وہ لکھتا ہے "کشمیری ڈرپوک اور رقیق القلب ہوتا ہے۔ اس کی عادتیں بھی گندی ہیں اور تن بدن بھی۔ بات بات پہ رو دیتا ہے۔ ایک صفت ان میں اتنے مظالم سہنے کے باوجود باقی ہے یعنی خود رائی۔ لیکن وہ ہندوستان کے باقی لوگوں سے زیادہ ذہین ہیں۔ بحث کرنے میں بہت تیز اور حاضر جواب ہیں۔ دیہات میں طلاق دینے یا بدکاری کی وارداتوں کا ذکر شاذ ہی سننے میں آتا ہے۔ اگرچہ کشمیریوں کے کردار میں ابھی ترقی کی بہت گنجائش ہے، میں سمجھتا ہوں کہ ان کی حالت اور بدتر نہ ہونے کی بات ان کے حق میں ضرور جانی چاہیئے۔ کیونکہ انہیں خود دار، مرد آدمی اور راست گو بننے کے مواقع بہت کم ملے ہیں۔ وہ آدمی جسے ہر چھوٹے سے چھوٹا عہدہ دار پیٹ اور لوٹ سکتا ہو جلد ہی اپنی خود داری سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ کشمیری کو ایسا اس کے حکام نے بنایا ہے۔ لیکن مجھے یقین اور امید ہے کہ اگر دو پشت تک مستحکم اور منصفانہ حکومت رہی تو وہ بدل کر مفید، ذہین اور کافی ایماندار آدمی بن جائے گا۔"

۱۹۱۲ء میں ڈاکٹر ارنسٹ نیو نے، جو ایک عرصے تک کشمیر میں مشن ہسپتال میں سرجن تھا، لکھا "کشمیری فطرتاً مکار اور عادی اچکے ہیں۔ قلی طبیعت کے بودے اور جھوٹ اور دھوکے بازی کی طرف مائل ہوتے ہیں اور اندھیرے میں تنہا رہ جانے سے ڈرتے ہیں۔ لیکن میں نے ایسے لوگ

بھی دیکھے ہیں جنہوں نے دوسروں کی خاطر اپنی جان خطرے میں ڈال دی اور انہیں [illegible] ذاتی فائدہ پیش نظر نہ تھا۔ تاہم جسمانی طاقت اور برداشت کی صلاحیت کے باوجود کشمیری بے حد حساس اور جذباتی ہوتا ہے اور بات بات پر رنجیدہ ہو جاتا ہے۔ یہ لوگ جسمانی تکلیف کو یورپ کے لوگوں سے زیادہ آسانی سے برداشت کر سکتے ہیں مگر ضبطِ نفس کی کمی کی وجہ سے زیادہ شور مچاتے ہیں۔ یہ ایک ڈاکٹر کی رائے ہے جس کی کتابوں سے صاف ظاہر ہے کہ وہ [illegible] وان بھی تھا۔ چنانچہ اس کے نزدیک کشمیریوں کی بزدلی کی وجہ یہ تھی کہ صدیوں کے استبداد سے دبا کر وہ ایسی حالت میں مبتلا ہو گئے ہیں۔

ریورنڈ ٹنڈیل بسکو نے جو کئی سال تک مشن اسکول کا ہیڈ ماسٹر رہا تھا کئی کتابیں لکھی ہیں اور ان میں بتایا ہے کہ اس نے کس طرح "کشمیریوں کی قوم کو مرد بنانے میں" اپنا وقت گزارا تھا۔ اس نے اپنی "حیات خود نوشت" میں لکھا ہے: "میرے زمانے کے آدمیوں کی اخلاقی حالت کو اگر نظر رکھا جائے تو یہ ظاہر ہوگا کہ ایسی شہوت رانیاں اور بدفعلیاں شاید ہی بچی ہوں جو وادی میں نہ کی جاتی یا کی جا سکتی ہوں۔ ان کے مرتکب نہ صرف حملہ آور بلکہ خود وادی کے لوگ ہوتے تھے۔ ہندوستان سے اس مذاق کے جو لوگ آتے تھے کشمیری خود ان کے ذوق کا سامان بہم پہنچایا کرتے تھے۔"

اپنی ایک اور کتاب "کشمیر دھوپ چھاؤں میں" پادری صاحب نے لکھا ہے: "پچھلے تیس سال سے میں عام کشمیریوں سے واقف ہوں۔ وہ بزدل اور خودداری سے ناآشنا اور حد درجہ مکار رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کشمیری حسن اتفاق سے دنیا کے حسین ترین ملکوں میں سے ایک میں آباد ہیں اور دوسرے لوگوں کی اس ملک پر دانت رہے ہیں۔ کشمیر کو قتل و غارت کرنے، جور و ستم ڈھانے اور غلام بنانے والے حملہ آوروں نے بار بار فتح کیا ہے اور کشمیریوں کے حوصلے اور زندگی کو اس طرح کچل دیا ہے کہ ان کی اچھائیاں مفقود ہو گئی ہیں۔ بہر حال کشمیری بتدریج غلامی سے مردانگی کی طرف ترقی کر رہے ہیں۔ فطری طور پر ترقی کی رفتار ابھی بہت سست ہے لیکن وہ بلندی کی طرف جانے والی راہ پر گامزن ہیں۔"

تو یہ تھا کشمیری کردار جیسا کہ اسے پچھلے ڈیڑھ سو سال میں باہر سے آنے والوں نے پایا۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو محض سیر و سیاحت کی غرض سے آئے اور وہ لوگ بھی جنہوں نے ایک مدت کشمیریوں کے ساتھ بسر کی اور انہیں عزیز رکھا۔ کشمیریوں کے تنزل کے بارے میں ہر ایک نے اپنی اپنی رائے پیش کی ہے جس پر کم و بیش [illegible] ٹنڈیل بسکو نے جس ترقی کا ذکر کیا تھا اب اس میں کچھ اور اضافہ ہو گیا ہے لیکن کشمیر سے باہر رہنے والے لوگ اب بھی کشمیر والوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کشمیری اب بھی [illegible] رہتا ہے۔ اس نے ابھی تک یہ نہیں سیکھا کہ کاروبار دیانتداری پر قائم رہنا چاہیے۔ جیسا نمونہ بھیجا جائے ویسا ہی سامان بھی بھیجا جانا چاہیے۔ یہ نہ ہو کہ [illegible] کوئی چیز پسند کرا کے قیمت ادا کر کے چلا جائے اور اس کے لئے اسے کوئی دوسری چیز بھیج دی جائے۔ ابھی اسے یہ جاننا ہے کہ اس کی برف پوش پہاڑوں سے گھری وادی میں ایسے لوگ موجود ہیں جن میں اتنی جسمانی طاقت ہے کہ اپنے حسین دیس کو حملہ آوروں سے بچا سکیں۔ ابھی اسے اور بہت سی باتیں بھی سیکھنی ہیں مثلاً: رشک کے مادے کو دل سے نکالنا۔ یہ تسلیم کرنا کہ اس کے ایسے ہم وطن بھی ہیں جو سیاسی اور انتظامی قابلیت رکھتے ہیں اور سچے دل سے اور بے تعصبی سے اپنے لوگوں کی قیادت کرنے کے خواہاں ہیں۔ اس تصوف اور وہم پرستی کو ہنس کر ٹھکرانا جو کئی سو برس سے اس کی روح میں رچی ہوئی ہے جس کا ڈھنڈورا جاہل پیر، صوفی، سادھو، پجاری اور ملا پیٹتے چلے آئے ہیں۔ بزرگان دین کو چاہئے تھا مسجدوں، مندروں اور زیارت گاہوں سے ایسے ملاؤں اور پجاریوں کو آج سے بہت پہلے نکال دیتے۔ اسے یہ بھی سیکھنا ہے کہ وہ سچ بول سکتا ہے اور اس خوف کے بغیر کہ ماضی کہیں پیچھے سے آکر اس کا گلا نہ گھونٹ ڈالے۔ از سر نو جینے کا آغاز کر سکتا ہے اور آخر میں اسے ان تمام اندھیرے اور دہشت ناک برسوں کو بھلانا سیکھنا ہے جن میں اس نے بغیر کسی قصور کے، شرمساری، ذلت اور خوف کے سوا کچھ نہ پایا اور اپنی خودداری کو دوبارہ حاصل کر کے مستقبل کی طرف نظر اٹھانی ہے جس میں اس کے لئے بہت کچھ ہے بشرطیکہ وہ ایڑی چوٹی کا زور لگا دے کیونکہ کشمیر کی حسین سرزمین ان تمام واقعات کے باوجود جوں کی توں موجود ہے۔ اب یہ کام کشمیریوں کے ذمے ہے کہ وہ اسے کوئی نفیس اور شاندار شکل دیں تاکہ ان کی آئندہ نسلوں کو کشمیری کہلائے جانے پر فخر ہو اور اس کی وجہ صرف یہی نہ ہو کہ ملک میں حسین جھیلیں، وادیاں اور پہاڑ ہیں بلکہ وہاں رہنے والوں کی مردانگی اور سالمیت بھی ہو۔

ترجمہ: محمد سلیم الرحمٰن


آدم جی کی نئی پیشکش
ریشم کی مانند ملائم اور نفیس لِنن
سِلکولِن
نفیس
خوش نما
جامہ زیب
آدم جی پارچہ جات کے
ہر ایک گز پر
"Adamjee Fabrics" کی
مہر ہوتی ہے۔
ملبوسات کیلئے آدم جی کا تیار کردہ سوتی کپڑا
"سِلکولِن" ایک انوکھی دریافت ہے۔
ملائمت اور نفاست کے اعتبار سے سِلکولِن
ریشمی کپڑوں کی طرح سوتی کپڑوں میں اپنی مثال آپ ہیں۔
سلکولن میں سادگی، خوشنمائی اور جامہ زیبی
کی اعلیٰ خوبیاں موجود ہیں۔
آدم جی
A.D. 87/238

سراج احمد سراج

کشمیر کی بُود و باش

ریاست جموں و کشمیر میں بسنے والے عوام کی بود و باش کا جائزہ لیتے وقت ہمیں اس حقیقت کو ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ ہندوکش اور قراقرم کے برفستانی سلسلے کر پنجاب کے تپتے ہوئے میدانوں تک پھیلے ہوئے اس خطۂ حسین و جمیل کی قدرتی تقسیم، آب و ہوا کی نیرنگی، ماحول کے اثرات اور دوسرے عوامل کے تحت اس ملک میں بسنے والے لوگوں کے رہن سہن میں نمایاں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایک انگریز اہل قلم نے کشمیر کو ایک وسیع عمارت سے تشبیہ دی ہے، جس کی کئی منزلیں ہیں، اور ہر منزل میں رہنے والوں کا لباس الگ، بولی علیحدہ، رہن سہن اور رسم و رواج جدا ہے، اور یہ بات ہے بھی درست۔ جموں کو اس عمارت کا ایک دروازہ سمجھ لیجئے، جس میں داخل ہوتے ہی اونچے نیچے ٹیلوں اور پہاڑیوں کا ایک سلسلہ دکھائی دے گا، جس میں کہیں کہیں میدان بھی ہیں۔ یہ کاہنڈی یا ڈگر کا علاقہ ہے، جس میں ڈوگرا راجپوت، کھتری برہمن، ٹھکر، جاٹ وغیرہ ذاتوں اور گوتوں کے لوگ آباد ہیں۔ ہندو تھوڑے اور مسلمان زیادہ۔ لباس، زبان، رہن سہن اور رسم و رواج میں گہری یکسانیت پائی جاتی ہے ـــــ معمولی فرق مراتب لئے ہوئے ڈوگرے راجپوت جنہیں میاں کہا جاتا ہے، عام طور پر سپاہی پیشہ ہیں۔ کھتری تجارت کرتے ہیں اور ٹھکر جاٹ وغیرہ کھیتی باڑی۔ ڈوگری، گوجری، اور پہاڑی بولیاں جو پنجابی سے ملتی جلتی ہیں بولی جاتی ہیں۔ اس علاقے میں بلا کی گرمی پڑتی ہے لیکن یوں ہی آگے بڑھو تو نقشہ بدل جاتا ہے۔ گھنے جنگلات، سرسبز و شاداب پہاڑیاں، اُبلتے ہوئے میٹھے پانی کے چشمے، اور زرخیز پہاڑی ڈھلوانوں پر جفاکش اور محنتی کسانوں کی بستیاں مختلف نظارہ پیش کرتی ہیں۔ اس علاقے کی آب و ہوا بے حد خوشگوار ہے۔

اس سے آگے پیر پنجال کی بلند دیوار کے اُس طرف وہ خطۂ مینو سواد ہے جسے وادیٔ کشمیر کہتے ہیں، اور جسے اس رفیع الشان عمارت کی دوسری منزل کہا گیا ہے۔ اونچے سر بفلک اور برف پوش پہاڑوں سے گھری ہوئی چوراسی میل لمبی اور کوئی بیس سے پچیس میل چوڑی اس وادی پر بہار کو قدرت نے نہایت فیاضی سے سنوارا ہے۔ سرسبز و شاداب دھان کے ہموار کھیتوں، دلفریب مرغزاروں اور گلپوش میدانوں میں ادھر اُدھر چنار کے پُرعظمت اور بلند و بالا درخت، بوڑھے فلسفیوں کی طرح سر نہوڑائے فطرت کی کسی عظیم راز کی گتھی سلجھاتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ جگہ جگہ سفیدے کے اونچے سیدھے اور سبک درختوں کی قطاریں، اور ان کی اوٹ میں پھلدار درختوں کے باغات، سُرخ اور سفید گلاب، چنبیلی اور دوسرے عطرفشاں پھولوں کے جھنڈوں میں لکڑی، مٹی یا کچی پکی اینٹوں کے دو منزلہ رہائشی مکانوں پر مشتمل بستیاں اور پھر شمال مشرقی پہاڑیوں پر واقع جھیلوں، چشموں کے بہتے ہوئے پانی کی نقرئی اور سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی لکیریں جو نیچے جا کر آپس میں مربوط ہو جاتی ہیں، نظارے کو اور بھی دلکش بناتی ہیں۔ یوں سمجھ لیجئے کہ کشمیر کی عظیم الشان عمارت کی اس دوسری منزل پر سبز رنگ کے ایک قالین کا گمان ہوتا ہے، جس پر ماہر فن کاریگر نے نہایت چابکدستی سے مختلف اور موزوں رنگوں کا گلزار کھلایا ہو۔

وادیٔ کشمیر کی مجموعی آبادی کوئی سولہ سترہ لاکھ ہوگی، پوری وادی میں ایک ہی زبان بولی جاتی ہے ایک ہی قسم کا ڈھیلا ڈھالا لباس، اور تقریباً ایک ہی طرح کا نظامِ بود و باش ہے وہی شہری اور دیہاتی، یا خواجہ اور دہقان کا فرق لئے ہوئے۔ شہری آبادی جو عام طور پر تاجروں، صنعت کاروں اور مختلف قسم کے پیشہ وروں پر مشتمل ہے۔ نسبتاً زیادہ خوش پوش، مہذب اور تعلیم یافتہ ہے، لیکن وادی کی عظیم اکثریت زراعت کار ہے۔ لمبا اور کھلی آستینوں والا کرتا جسے پیرہن کہا جاتا ہے، عورتوں اور مردوں کا مشترکہ لباس ہے۔ البتہ مرد جہاں ٹوپی پہنتے ہیں، عورتیں بالوں کے سر کی پوشش سے مشابہ قصابہ اوڑھتی ہیں، جس کی اونچائی طبقاتی درجوں کے مطابق گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ کانگڑی کشمیریوں کے جاڑے کی رفیق ہے، جو شہر و دیہات میں استعمال ہوتی ہے۔ شہروں میں پڑھے لکھے لوگ اب تیزی سے بدل رہے ہیں۔ ڈھیلے ڈھالے پیرہن کی جگہ کوٹ پتلون اور پگڑی کی جگہ ہیٹ اور قراقلی کا رواج ہوتا جا رہا ہے۔ شہری اپنی عورتوں کو پردہ کراتے ہیں، لیکن دیہاتی عوام کی علیحدہ بات ہے، محنت کش کشمیریوں کی عورتیں، جہد حیات کی کشمکش میں اپنے مردوں کا ہاتھ بٹاتی ہیں۔

اس منزل میں بسنے والوں میں ہندوؤں کی تعداد دو ڈھائی فیصد سے زیادہ نہیں انہیں کشمیری پنڈت کہا جاتا ہے حالانکہ یہ سب کے سب برہمن نہیں، بلکہ ان میں کھشتری برہمن درویش بھی شامل ہیں آخرالذکر لوہر کہلاتے ہیں، اور عام طور پر تجارت پیشہ ہیں۔ لیکن جہاں تک بود و باش کا تعلق ہے، وادی کشمیر میں بسنے والوں کے رہن سہن میں یکسانیت ہے۔ شادی بیاہ کی رسموں میں صرف حیثیت یا مرتبے کے لحاظ سے فرق ضرور ہوتا ہے، شہروں میں برات کا جلوس رات کو شمعوں کی روشنی میں اور کاغذوں کے مصنوعی چھتوں کی چھاؤں میں مغلوں اور ایرانیوں کے تقریباتی تکلفات کا مظہر ہے۔ دعوتوں میں بھی وہی شاہانہ تکلف برتا جاتا ہے۔ کشمیری باورچی جنہیں وازہ کہا جاتا ہے طرح طرح کے لذیذ و مزیدار کھانے پکانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ ایسے مواقع پر حیثیت سے بڑھ کر فضول خرچی کی حد تک بھی چلا جاتا ہے جس سے کشمیریوں کی معیشت پر گہرا اثر پڑتا ہے لیکن رسم و رواج کے بندھنوں میں جکڑے کشمیری ان تکلفات میں کمی لانا ممکن نہیں۔ ہے اس تعلق میں اصلاح مراسم کی وقتاً فوقتاً کوششیں ہوئیں اور اسراف سے پیدا ہونے والے نتائج کا احساس دلا کر لوگوں کو فضول خرچی سے اجتناب کرنے پر زور دیا گیا لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ شادی بیاہ کے موقع اور دوسری مذہبی اور موسمی تقریبات پر عمدہ کھانے پکانے اور تہذیب و آداب کو ملحوظ رکھنے کے معاملے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا ایک ہی سا انداز ہے۔ وادی کشمیر کے لوگ عام طور پر چاول کھاتے ہیں، گیہوں وادی میں بہت ہی کم ہوتا ہے، اور صرف نلچہ باقرخانی اور شیرمال کی صورت میں استعمال ہوتا ہے۔ چپاتی یا روٹی کا رواج نہیں، چاولوں کے ساتھ بکرے یا بھیڑ کا گوشت، مچھلی اور کرم کا ساگ کشمیریوں کا من بھاتا کھاجا ہے۔ کشمیریوں کو مناظر قدرت سے دلی لگاؤ ہے، چوڑے چکلے ہاڑ اور گورے چٹے بدن کے خوش رو کشمیری فطرت کے عطیات سے حسب مراتب استفادہ کرنے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ کڑکڑاتے جاڑوں کے بعد جب موسم بہار کی آمد آمد ہوتی ہے تو کشمیریوں کے جذبات میں ایک طوفان سا برپا ہو جاتا ہے، جس کے اظہار کے لئے شگوفہ بادام پھوٹنے کی تقریب ہفتوں منائی جاتی ہے ہندو اور مسلمان، شہری اور دیہاتی سبھی فصل گل کی آمد پر خوشیاں مناتے ہیں یوں بھی یعنی موسم گل کا یہ میلہ کشمیری معاشرت کا ایک خاص جزو ہے۔ آئیے اب کشمیر کی عظیم الشان عمارت کی تیسری اور آخری منزل میں رہنے والے لوگوں کے رہن سہن پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالیں، اونچے پہاڑوں کے دشوار گزار دروں، تنگ گھاٹیوں اور تیزی سے بہنے والے ندی نالوں کا سلسلہ طے کرکے جب آپ بلندی پر پہنچتے ہیں، تو ایک پُرہیبت و جلال نظارہ دیکھنے میں آتا ہے عظیم برفستان اور پُرہول ویرانوں سے گذر کر وہ سامنے بلتستان ہے۔ دائیں جانب گلگت کا علاقہ اور بائیں لداخ، اس خطہ زمین پر بسنے والے لوگ کئی قبائل سے تعلق رکھتے ہیں، گلگتی ہمارے پٹھان بھائیوں کی طرح قدآور جسیم اور وجیہہ ہیں، بلتستانی اور لداخیوں کی شکل و شباہت چینیوں اور تبتیوں سے ملتی جلتی ہے۔ لداخ میں بدھوں کی آبادی تمامی ہے۔ باقی سب مسلمان ہیں۔ خوش حالی اور مفلسی پہلو بہ پہلو رہن سہن کے طور طریق پر اثر انداز ہے۔ کشمیر کی عمارت کا یہ آخری حصہ یعنی تیسری منزل پچھلی دونوں منزلوں سے مختلف ہے اس منزل کے تینوں حصوں یعنی گلگت، بلتستان اور لداخ میں زبانیں تو علیحدہ ہیں، لیکن لباس اور رہن سہن کے انداز میں کسی قدر یکسانیت پائی جاتی ہے۔ لوگ بھیڑیں پالتے ہیں اور اونی لباس پہنتے ہیں، پیداوار بہت کم ہے، البتہ قدرت نے اس علاقے کو پھلدار درختوں سے نوازا ہے، جن میں خوبانی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ جسے سکھا کر اس علاقے کے باشندے خود استعمال کرتے ہیں، اور تجارتی جنس کے طور پر اس کے بدلے میں کپڑا، نمک، تیل، اور اناج وغیرہ حاصل کرتے ہیں۔ یہ بڑے سخت جان اور جفاکش لوگ ہیں، جو فطرت کی مہیب قوتوں سے بارہ مہینے برسرپیکار رہتے ہیں اس علاقے میں میلوں تک روئیدگی کا نام نشان دکھائی نہیں دیتا۔ البتہ ندی نالوں کے کنارے گھاٹیوں میں، جو تھوڑی بہت کھیتی ہوتی ہے اسی پر لوگوں کی گذران ہے۔

ریاست جموں و کشمیر کی عظیم الشان عمارت میں بسنے والے لوگوں کی بود و باش کا خاکہ نامکمل رہیگا اگر یہ نہ بتایا جائے کہ پہلی منزل میں لوگ گائے بھینسیں اور بھیڑ بکریاں پالتے ہیں، دوسری منزل یعنی وادی کشمیر میں گائے بھیڑیں اور گھوڑے پالے جاتے ہیں، اور تیسری منزل میں بھیڑوں کے علاوہ یاک نام کا ایک جانور بھی پالا جاتا ہے جو اونٹ سے مشابہ ہوتا ہے لیکن جسامت میں اونٹ سے چھوٹا۔ ٹٹوؤں کی طرح اس سے رسل و رسائل کا کام لیا جاتا ہے۔

اے۔ اے سلہریا

کشمیر کا فنِ تعمیر

جن فنون کو ہمارے اسلاف نے ترقی دے کر بام عروج پر پہنچایا ان ہی میں سے ایک فن تعمیر ہے۔ زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح اس شعبے میں بھی مسلمانوں نے اپنی تحقیقی اور ذوق جمالیات کو بروئے کار لا کر لافانی نقوش چھوڑے ہیں۔ جغرافیائی موثرات کے پیش نظر اس سلسلے میں وادیٔ کشمیر میں جو کچھ ہوا اس کا مختصر سا خاکہ یہ ہے:

کشمیر میں فن تعمیر کے تین دور ہیں:۔

(۱) مغلوں سے قبل کا دور (۲) لکڑی کے طرز تعمیر کا دور اور (۳) خالص مغل دور۔

اس فن کے دور اول میں قوم بدھ مت کے پیروؤں اور ہندوؤں کے مندر اور پانڈوؤں سے منسوب پتھر کے محلات کے کھنڈر ہیں۔ ان عمارتوں میں استعمال شدہ پتھروں کا حجم اور فن سنگتراشی کی ابتدائی ترقی قابل دید ہے۔ وادی کے انتہائی شمال مغرب میں ایسے کھنڈر بکثرت ملتے ہیں۔ ان کھنڈروں کو محکمہ آثار قدیمہ کی غفلت اور بے پناہ استداد زمانہ نہ مٹا سکا۔ اس دور میں صرف عام فہم کا پتھر استعمال ہوا ہے۔ جغرافیائی محل وقوع اور نقل و حمل کی مشکلات کے باعث دوسرے مقامات سے قیمتی اور عمدہ قسم کے پتھر کی درآمد خارج از بحث ہے۔

دوسرے دور میں فن تعمیر کی تاریخ کا وہ دور آتا ہے جس نے کشمیر کو جنت نظیر بنانے میں خاطر خواہ حصہ لیا۔ اس کے بعد مسلمان حکمرانوں کا دور شروع ہوتا ہے۔ اس دور کی خصوصیت لکڑی کا کام ہے۔ لیکن ہندوستانی فن تعمیر کے مورخوں کننگھم اور کول نے اپنی اپنی تفصیلات میں اس لکڑی کے عروج کو نظرانداز کر دیا ہے۔ فرگوسن نے البتہ اس دور کی مکمل تحقیق کی ضرورت محسوس کی ہے اور اس نے لکڑی کے کام کو مسلمان حکمرانوں کے دور کا مخصوص فن قرار دیا ہے اور اس نے قابل دید لکڑی کی تعمیرات کا تذکرہ کیا ہے۔

اس فن کی ترقی کا ایک یقینی سبب یہاں کے جنگلات کی کثرت ہے۔ اشاعت اسلام کے بعد مساجد کی ضرورت نے بھی اس فن کو اور زیادہ اہم بنا دیا۔ بعد میں مسلمان اولیاء کے مزارات کی تعمیر نے بھی اس میں اضافہ کر دیا۔ ان عمارات سے اس فن کی تاریخی خصوصیت اور اہمیت واضح ہوتی ہے۔

مسجد شاہ ہمدان

یہ مسجد سری نگر میں واقع ہے۔ دریائے جہلم کے کنارے پر مضبوط بنیادوں پر کھڑی ہے۔ اس کا پرفضا ماحول اور عقب میں برف پوش پہاڑوں کا منظر اس کے حسن میں اضافہ کرتا ہے۔

زین العابدین کے محلات

یہ محلات "زینہ ڈل محل" اور "زینہ لانک یا زینہ لنک" کے مقامی ناموں سے مشہور ہیں۔ تاریخ رشیدی کے مصنف مرزا حیدر نے تفصیل ورنہ بتاتے ہوئے محل کی تعمیر کی مکمل تفصیل دی ہے۔ یہاں مختلف قسم اور رنگ کے پھولدار پودے لگائے گئے تھے جو اپنے حسن اور کمال جاذبیت میں نظیر نہیں رکھتے تھے۔ ان محلات کے آثار کا ڈوگروں کے ہاتھوں تباہی کا شکوہ بے جا ہوگا۔

بڈشاہ کا راجدان

مرزا حیدر ہی بڈشاہ کے اس راجدان یعنی SECRETARIAT کی تفصیل بتاتے ہوئے لکھتا ہے کہ اس کی بارہ منزلیں تھیں جن میں سے بعض کے پچاس پچاس کمرے، برآمدے اور ہال تھے۔ یہ عمارت کلی طور پر لکڑی کی بنی ہوئی تھی "تاریخ شاہان کشمیر" میں اس محل کی مدت تعمیر ۱۵ سال بتائی گئی ہے۔ یہاں شاہی دربارداری کے تمام مراسم ادا ہوتے تھے۔

سنہ لنک اور روچہ لانک

یعنی سنہری اور روپہلی ٹاپو۔ سلطان زین العابدین نے ایک سہ منزلہ عمارت سنہ لانک یا سنہ لنک کے نام سے ۱۴۲۱ء میں جھیل ڈل میں تعمیر کروایا تھا۔ لیکن شومی قسمت سے یہ عمارت ایک زلزلہ کی نذر ہو گئی۔ جہانگیر نے اس کے بعد یہاں ایک سرائے سی بنوائی لیکن وہ بھی باقی نہ رہی۔ روپہ لانک کی عمارت کو سلطان حسن شاہ نے نسیم باغ کے مقابل چناروں کے درمیان تعمیر کروایا تھا۔ نورجہاں نے اس عمارت کو بہت پسند کیا۔ جیمز [illegible] سیاحوں نے ۱۶۶۳،۱۶۲۰-۱۰: ۱۸۲۳،۱۰۲۲،۱۸۲۵ میں اسے بچشم خود دیکھا اور اس امر کی شہادت کے طور پر اپنے نام یہاں کندہ کر گئے۔

مدنی مسجد

لکڑی کے کام کا ایک اور اعلیٰ نمونہ یہ مسجد ہے۔ یہ مسجد ۱۴۴۴ء میں قائم ہوئی۔ سید محمد مدنیؒ سکندر کے وقت میں یہاں بطور مبلغ تشریف لائے تھے اور پھر یہیں فوت بھی ہو گئے۔ ان کا مزار نوہٹہ میں تعمیر کیا گیا ہے۔

جامع مسجد سری نگر

اس فن کا ایک نادر نمونہ سری نگر کی جامع مسجد ہے۔ لارنس نے اس مسجد کے بارے میں نہایت ہی عجیب اور گمراہ کن معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ اس کے بیان کے مطابق موجودہ مسجد کا احاطہ بدھ مت کے پیروؤں اور بعد میں ہندوؤں کی ایک متبرک جگہ تھی۔ لیکن فرینک (FRANAK) نے اس بیان کی تردید کرتے ہوئے مذکورہ کہانی بدھ مسجد جسے کشمیری زبان میں بودھ مسجد کہا جاتا ہے سے منسوب کی ہے۔ مسجد کے موجودہ نام سے اس کہانی میں کچھ صداقت معلوم ہوتی ہے۔ سلطان سکندر نے سب سے پہلے اس جامع مسجد کو ۱۳۹۸ء تا ۱۴۰۱ء میں تعمیر کروایا اور اس کے بعد سلطان حسن نے اس کی تعمیر کروائی۔ ابراہیم اور احمد ماگرے نے اس کی تکمیل کی۔ ڈوگرہ حکومت کے دوران میں مسلمان اجتماعی طور پر اس کی مرمت کرتے اور اس کی تعمیر میں اضافہ کرتے تھے

مسجد شاہ ہمدان

اس مسجد کا طرز تعمیر کسی حد تک مدنی مسجد کے مشابہ ہے۔ لیکن لکڑی کا کام چینی طرز کا ہے۔ مسٹر نکوس اسے غزنی طرز تعمیر سے متاثر قرار دیتا ہے۔

شیخ نورالدین ولی کا مزار

یہ مزار سری نگر سے ۲۰ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اس کا وضع و انداز نہایت بارعب اور خوش کن ہے۔ مزار کی موجودہ شکل و صورت کو مغل شہنشاہ اکبر سے منسوب کیا جاتا ہے۔ مزار سے متصل ایک مسجد ہے جسے ایک افغان حاکم عطا محمد خاں نے تعمیر کروایا تھا۔

جامع مسجد شوپیاں

سری نگر سے ۲۹ میل جنوب میں شوپیاں کے علاقہ میں یہ مسجد واقع ہے۔ اس مسجد کی ظاہری وضع و ساخت چینی طرز تعمیر سے مشابہ ہے لیکن محرابوں، دیواروں، دریچوں اور پنجروں سے عرب طرز تعمیر کے اثرات نمایاں ہیں۔ یہ مسجد جامع مسجد سری نگر کی طرز پر ۲۲۹۱ء میں تعمیر ہوئی۔

تیسرا دور مغل حکومت کا ہے:

یہ دور مغلوں کا مشہور و معروف اور اپنی طرز کے خاص فن کا زمانہ ہے۔ گو یہاں سنگ مرمر اور دوسرے قیمتی پتھر کو جغرافیائی حالات کے باعث استعمال نہ کیا جا سکا لیکن بعد کے مسلمانوں نے اس کمی کو کسی حد تک پورا کر دیا۔

مغل حکومت کی تعمیرات میں سے قلعہ ہری پربت کے گرد کی فصیل ہے جس کے اب صرف نشانات ہی باقی ہیں۔ مسٹر نکوس کے بیان کے مطابق شالامار باغ میں بارہ دری، مسجد اخوند ملا شاہ عمدگی اور نفاست میں دہلی اور آگرہ کی مغل عمارات کا مقابلہ کر سکتی ہیں۔

پتھر مسجد

یہ ۱۶۲۳ء میں نورجہاں نے تعمیر کرایا تھا۔ یہ آج کل شاہی مسجد کے نام سے مشہور ہے۔ اس مسجد کی تعمیر کے متعلق نورجہاں کا روایتی جملہ مشہور ہے۔ اس واقعہ نے مسجد کی شہرت اور بھی بڑھا دی۔ مسجد کے بالمقابل مجاہد منزل قابل دید عمارت ہے۔

پری محل

شہزادہ دارا شکوہ نے اپنے اتالیق ملا شاہ کے لیے اور صوفیائے کرام اور علماء کی خاطر سے تعمیر کرایا تھا۔ گو عمارت بتدریج تباہ ہو گئی ہے تاہم کھنڈر بتاتے ہیں کہ عمارت عجیب تھی۔

قلعہ ہری پربت

یہ قلعہ افغان حاکم سردار عطا محمد خان نے تعمیر کرایا تھا۔ کاٹھی دروازہ اور سنگین دروازہ اس کے مشہور راستے ہیں۔

اخوند ملا کی مسجد

یہ مسجد اور اس کے ساتھ والا حمام دارا شکوہ نے ۱۶۴۹ء میں تعمیر کروایا تھا۔

دارا محل

اسے دارا شکوہ نے قلعہ ہری پربت پر تعمیر کروایا تھا۔ اپنے زمانے میں اس کی چمک دمک قابل دید تھی۔

درگاہ شریف

حضرت بل کے مقام پر شہر سے ۵ میل دور ڈل کے کنارے واقع ہے۔ مزار کی تقدیس کا سبب نبی اکرمؐ کا موئے شریف ہے۔ ڈوگرہ عہد میں اسے نیشنل کانفرنس کے پلیٹ فارم کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا۔ مسلمانوں نے اجتماعی طور پر اس کی تعمیر اور ترسیل میں بہت اضافہ کیا ہے۔

ہمارے اسلاف کی اس پُرعظمت اور لازوال وراثت کو بعد کے دشمن حکمرانوں نے حتی الامکان برباد کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ مسلمانوں کے سیاسی عروج کے زوال کے بعد عنان اقتدار سکھوں کے ہاتھ میں آیا۔ اس قوم نے اپنے اقتدار کا جو مظاہرہ پنجاب میں کیا تھا اس سے کچھ زیادہ ہی کشمیر میں کیا۔ اس قوم نے مسلمانوں کی عمارات، مساجد اور خانقاہوں کو مسمار کر کے بدترین جہالت کا ثبوت دیا۔ جن مساجد کی تعمیر عظمت اسلاف کے شکوہ کا پتہ دیتی تھیں اور جن عمارات کو دیکھ کر انسانی عقل حیرت میں پڑ جاتی تھی۔ انہیں اصطبلوں میں بدلا گیا۔ سکھوں کے دور حکومت میں اس کم نصیب سرزمین میں اذان دینے کی سزا زبان کاٹنا قرار دی گئی تھی۔ اس شرمناک کارکردگی سے اس قوم کی دوسری حرکات کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس وحشی قوم کے بعد ہند میں سفید فام انگریزوں کا دور اقتدار آیا۔ یہ قوم گو اسلام دشمنی میں سکھوں سے کچھ کم نہ تھی لیکن تاریخی آثار کے تحفظ کا احساس اس میں بہرحال موجود ہے۔ مگر وادی کشمیر براہ راست ان کے زیر نگیں نہیں رہی بلکہ ان کی قسمت میں اس ڈوگرا حکومت کی غلامی تھی جو اپنی پیشرو سکھ قوم سے مختلف نہ تھی۔ اس دور کے ظلم و استبداد کی کہانی وادی کے عوام کے علاوہ وہاں کی قدیم تاریخی عمارتیں بھی بتاتی ہیں۔

ملکوں کا استحکام باصول اور دیانت دار اداروں کے ہاتھ میں ہوتا ہے

قومی اور ملکی ترقی اور استحکام کے لیے

ایشین میوچل انشورنس کمپنی لمیٹڈ

اپنی پوری قوت سے سرگرم عمل ہے

(۱) موٹر انشورنس (ہر قسم) (۲) فائڈلٹی گارنٹی

(۳) حادثہ انشورنس ٹکٹ (صرف چار روپیہ سالانہ ادا کر کے سفری حادثے کی صورت میں ایک معقول رقم)

(۴) سپورٹنگ گن انشورنس (۵) ورک کمپنسیشن

سال	کاروبار (روپے)	دعوے (روپے)
۱۹۵۶ء	۴،۲۴،۶۳۴	۸۶،۵۵۵
۱۹۵۷ء	۴،۷۶،۵۷۳	۹۵،۳۳۱
۱۹۵۸ء	۵،۲۱،۹۴۸	۱،۵۴،۳۷۱

شاخیں

(۱) صدر بازار، پشاور (۲) بانده ہاؤس، ایبٹ آباد (۳) ڈلہوزی روڈ، راولپنڈی

(۴) جنرل سٹینڈ، سرگودھا (۵) ریلوے بازار، جہلم (۶) محمد شاہ آباد، سیالکوٹ

(۷) کچہری روڈ، لائل پور (۸) حرم گیٹ، ملتان (۹) شکارپوری گیٹ بہاولپور

(۱۰) کچہری روڈ، حیدرآباد سندھ (۱۱) جناح روڈ، کوئٹہ (۱۲) کراچی کمپنی بلڈنگ میکلوڈ روڈ کراچی۔

(۱۳) ۱۱ ۲ جانسن روڈ۔ ڈھاکہ (۱۴) لاما بازار سلہٹ

(۱۵) بس اسٹینڈ، اوکاڑہ (۱۶) کے سی روڈ، چٹاگانگ

ایشین میوچل انشورنس کمپنی کو خدمت کا موقع دیجیے

ہیڈ آفس: ۴۲ / 42 مال روڈ - لاہور فون: ۳۹۶۳ / 3963

دوسرا حصّہ

مسئلہ کشمیر

(ا) پس منظر

(ب) کشمیر اور پاکستان کا تعلق

(ج) مسئلہ کشمیر ___ اقوام عالم اور بھارت کی نظر میں

(د) مسئلہ کشمیر کے گونا گوں پہلو ___ ایک دائرۂ معارف

(س) مسئلہ کشمیر ___ کشمیری قائدین کی نظر میں

(س) مسئلہ کشمیر ___ پاکستانی اہلِ فکر کی نظر میں

(ص) انٹرویوز

(ع) شخصیات کشمیر

(ف) آزاد کشمیر

(ق) چند دستاویزیں

ہفت روزہ نصرت لاہور

خواجہ غلام دین وانی

مسئلہ کشمیر کا پس منظر

۱۶ مارچ ۱۸۴۶ء کشمیر کی تاریخ کا منحوس سال تھا۔ اسی سال کشمیری عوام سے دھوکہ اور فریب کھیلا گیا۔ کشمیری عوام سے بالا بالا ان کی مرضی اور منشا کے خلاف رات کی تاریکی میں کشمیر اور کشمیری عوام کو فروخت کیا گیا۔ جس میں ایک طرف انگریز سودا باز تھا اور دوسری طرف ڈوگرہ خریدار۔ اسی سال کشمیر کی تاریخ کا وہ سیاہ باب شروع ہوا جس کا خمیازہ آج بھی کشمیری عوام بھارتی سامراج کی شکل میں بھگت رہے ہیں۔ اسی سال ریاست جموں و کشمیر کی موجودہ تشکیل کی ابتدا ہوئی اور کشمیری مسلمان ڈوگرہ سامراج کی غلامی کی زنجیروں سے جکڑا گیا۔ اس سے قبل اگرچہ تمام ہندو راجاؤں اور مسلمانوں کی حکومتیں یکے بعد دیگرے بدلتی رہیں۔ مغلوں اور افغانوں اور سکھوں کے بعد ڈوگرہ سامراج نے جنم لیا اور اس موخر الذکر بدترین دور کی ابتدا سے ہی کشمیری عوام کی جدوجہد آزادی کی ابتدا ہوئی۔ اس لحاظ سے کشمیری عوام کی سیاسی جدوجہد نہ صرف عبرت آموز اور سبق آموز رہی بلکہ امتداد زمانہ کے ساتھ کشمیری عوام کی مظلومیت اور ڈوگرہ سامراج کی درندگی اور بربریت کی جگر سوز داستان بھی ہے۔ یوں تو کشمیری عوام کی زبوں حالی کا دور سکھوں کے دور حکومت میں ہی شروع ہوا تھا۔ جب سکھوں کی حکومت کے عام دستور کے مطابق کشمیر صوبیداروں کو اجارہ پر دیا جاتا تھا۔ سکھ حکمرانوں نے کشمیری عوام پر ایسے ظلم کئے۔ جنہیں کشمیری عوام کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ غرضیکہ ان مظالم کی یاد سے روح آدم کانپ اٹھتی ہے۔ نتیجہ کار یہ مسلمانوں کے خاندان کو گوبر کے اوپلوں میں ڈال کر زندہ جلا دیا جاتا تھا۔ مسلمانوں کی عزت و ناموس سکھا شاہی سے محفوظ نہ تھی۔ یہاں تک نوبت پہنچ چکی تھی کہ کوئی سکھ اگر کسی مظلوم مسلمان کو قتل کر دیتا تو سرکار کے اور پر اس سے ۱۶ روپے (سولہ روپے) ادا کرنے کی سزا ملتی جس میں سے ۴ روپے مقتول کے ورثاء کو ملتے اور باقی سرکاری خزانہ میں جمع ہوتے تھے۔ مشہور سکھ حکمران رنجیت سنگھ کی فوج میں بہت سے ڈوگرے بھی تھے۔ اور ان میں سے گلاب سنگھ اور دھیان سنگھ ... تھا۔ اپنی عیاری کی وجہ سے جلد رنجیت سنگھ کا منظور نظر ہو کر ... سکھوں اور انگریزوں کی جنگ میں اس نے زمانہ

سازی کا ثبوت دیا۔ اور حالات کا رخ اس طرح بدلا کہ اس نے انگریزوں سے صلح کی ڈول ڈالی۔ سکھ حکومت دیوالیہ ہو چکی تھی۔ انگریز سکھوں سے ایک خطیر رقم کا مطالبہ بطور تاوان جنگ کر رہے تھے۔ گلاب سنگھ اور رنجیت سنگھ اور اس کے خاندان سے لوٹا ہوا روپیہ اس وقت کام میں لایا۔ چنانچہ ۱۶ مارچ ۱۸۴۶ء میں انگریزوں نے بعوض ۷۵ لاکھ نانک شاہی روپیہ وادی کشمیر کو گلاب سنگھ کے فروخت کر دیا اور اس شرط کو گلاب سنگھ ڈوگرے سے تسلیم کروا دیا تھا کہ وہ انگریزوں کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرے گا۔ یہی وہ رسوائے عالم معاہدہ امرتسر تھا۔ جو عرف عام میں بیعنامہ امرتسر سے موسوم ہوا۔ اور اسی طرح قوم سے فروختند و چہ ارزاں فروختند کا سودا پورا ہوا۔ فرنگی سامراجیت کے اہل کاروں نے نہ صرف اس سرزمین کو ڈوگرہ سامراجیت کی تحویل میں دیکر ڈوگروں کو اس جنت نشان وادی کا حکمران بنایا۔ بلکہ یہاں کے عوام کا سودا بھی بھیڑ بکریوں کی طرح طے پایا۔ اس وقت کی آبادی کے لحاظ سے ایک کشمیری کو چند روپے میں فروخت کر دیا گیا۔ اس منحوس دن سے ان جابر حکمرانوں نے کشمیری عوام کو کچلنا اور پائمال کرنا شروع کر دیا۔ حضرت حفیظ جالندھری نے بیعنامہ امرتسر کے الفاظ سے متاثر ہو کر خوب کہا ہے ؎

وادیاں، کہسار، جنگل، پھل سا پھول اناج!
ڈھور ڈنگر، آدمی، ان سب کی محنت کام کاج!
یہ مویشی ہوں کہ آدم زاد سب ہیں زر خرید
ان کے بچے بچیاں اولاد سب ہیں زر خرید

غرض اس طرح کشمیر کا جنت نظیر وادی ۷۵ لاکھ نانک شاہی میں بک گئی۔ اور لاکھوں کشمیری عوام کی قسمت کو انگریزوں اور ڈوگروں نے اپنی ذاتی ملکیت بنا لیا۔ اس بیعنامہ کی رو سے یہ بھی طے پایا تھا کہ گلاب سنگھ ہر سال انگریزوں کو ایک گھوڑا، چھ بکرے، چھ بکریاں اور تین کشمیری شالیں بطور نذرانہ پیش کرے گا۔ انگریزوں نے اس طرح کشمیر اور کشمیری عوام کو ڈوگروں کے ہاتھ سو سالہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیا۔ ... نظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ تو یہ ...

جاتے رہے نہ جانے کتنے افسوس ملتے رہے۔ ڈوگرا راج کے صد سالہ دور غلامی میں کشمیری مسلمانوں نے سکھ شاہی کے بعد ڈوگرا شاہی کے مظالم برداشت کئے ظلم و تشدد کے لحاظ سے یہ دور انتہائی استبدادی اور ستم کشی کا دور رہا ہے۔ یہ صد سالہ دور کشمیری مسلمانوں کی زندگی کا ظلم و ستم کی ایک لمبی کہانی ہے جس کو کشمیری مسلمان کبھی نہ بھول سکیں گے۔ اس دور میں مسلمانوں پر بیگار اور زمینداری کا دور دورہ رہا کہ جو ہندو ہوتا خود ایک مسلمان ہونے کے مترادف تھا۔ ہندو اسلام قبول کرتا تو وراثت سے محروم کر دیا جاتا۔ مقدس مقامات ڈوگرہ حکمرانوں نے چھین لئے جنہیں معبدوں میں منتقل کر دیا گیا۔ بیگار کا زور تھا جسے ایک انگریز اس طرح بیان کرتا ہے۔ کشمیر میں ایک گاڑی کہیں لے جانا چاہیں۔ تو آپ کو درجن مزدور بلوا لیں سے زیادہ سے زیادہ پڑ رہے گے کشمیر میں رہنے والوں کی خستہ حالت دیکھ کر میری گردن شرم سے جھک گئی۔ انسانیت کی اس تذلیل میں نے روئے زمین پر کہیں نہیں دیکھی۔ ان روح فرسا حالات میں اس جنت نظیر وادی کا رہنے والا مسلمان رہا ہیں خوف، تکلیف اور رنج کے سوا کسی راحت کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ڈوگرا حکمرانوں نے یہاں کے مسلمانوں پر وہ ظلم توڑے کہ چنگیز کی روح بھی لرز اٹھی۔ پنڈت پریم ناتھ بزاز نے اپنی کتاب "ان سائڈ کشمیر" میں لکھا ہے: "ڈوگرا راج ہندو راج کی عملی صورت ہے مسلمانوں کے ساتھ نہایت ناروا سلوک کیا جاتا ہے ہندوؤں کے مقابلہ میں انہیں حقیر اور ذلیل سمجھا جاتا ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ مسلمان ہونا ریاستی قانون میں جرم ہے۔ یہ وہ ظلم ہے جس کا انسانی ذہن تصور نہیں کر سکتا ہے اس کا بین ثبوت یہ ہے کہ گائے کی قربانی کی سخت ممانعت ہے اس جرم کی پاداش میں دس سال کی قید سخت ملتی ہے۔ صد سالہ ڈوگرا راج میں ۲۸ وزرائے اعظم مقرر کئے گئے جن میں ایک بھی مسلمان نہیں تھا۔ ریاستی فوج کی تیرہ پلٹنوں میں مسلمان مشکل سے ۱/۲ ۱ پلٹن ہونگے، انہیں اسلحہ رکھنے کی اجازت نہیں، تعلیم ان میں بہت ہی کم ہے۔ آپ سو گاؤں گھوم جائیں۔ تو آپ کو ایک بھی مسلمان ایسا نہیں ملے گا۔ جو اپنا نام لکھ سکتا ہو۔ اس کی تمام تر ذمہ داری ڈوگرا راج پر ہے۔ ڈوگروں نے اس سرسبز شاداب خطہ پر ۱۰۰ سال حکومت کی ہے۔ انہیں کبھی بیرونی حملے کا ڈر نہیں رہا۔ اس امن و عافیت کے باوجود ریاست کا جو حال ہے وہ ایک ذمہ دار حکمران کے لئے انتہائی باعث شرم ہے۔ غرض کشمیر کے عوام جن میں بہت بڑی اکثریت مسلمانوں کی ہے گذشتہ سو سال سے انتہائی افلاس خوف اور ناداری کی زندگی بسر کرتے رہے۔ الخ"

حالات میں یہاں بھی عوام کی طرف سے ایسا ہی رد عمل ہوا جیسا کہ انہی حالات میں یا اس کے قریب قریب حالات میں دوسرے ملکوں میں ہوا تھا۔ جابر حکمران اور مظلوم رعایا کے درمیان تصادم روز بروز وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ شدت اختیار کرتا گیا۔ ریاست کشمیر میں سیاسی بیداری نے عوام کے اس جذبے کو اور بھی ہوا دی۔ مسلمان مظلوم تھے۔ انہوں نے اس ظلم سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے سیاسی تحریک شروع کر دی۔ جب ۱۹۲۱ء میں کشمیر میں لارڈ ریڈنگ (ہندوستان) کے وائسرائے کی آمد پر مسلمانوں نے اپنی تکالیف اور ڈوگرہ استبدادیت کے خلاف جو واویلا کیا تھا۔ وہ اگرچہ وقتی طور پر ناکام ہوا تھا۔ اور مسلمانوں پر سخت ظلم توڑے گئے تھے۔ مگر اب اس آواز میں کافی زور پیدا ہو گیا تھا اور یہ تحریک بڑھتی، پھیلتی اور مخصوص سمت اختیار کر رہی تھی۔ جلسے جلوس اور احتجاج کی پکار ریاست کے گوشہ گوشہ سے سنائی دینے لگی۔ جموں میں ینگ مینز ایسوسی ایشن کی تحریک میں چوہدری غلام عباس نے ممتاز مقام حاصل کیا اور فتح کدل ریڈنگ روم نے شیخ محمد عبداللہ کو جنم دیا مسلمانوں نے اس طرح اپنے مقاصد کے حصول کے لئے اپنی نمائندہ جماعت مسلم کانفرنس کا قیام عمل میں لایا۔ چوہدری غلام عباس۔ شیخ محمد عبداللہ۔ میر واعظ مولوی محمد یوسف شاہ نے متحد ہو کر اس جماعت کی داغ بیل ڈالی۔ ۳۲-۱۹۳۱ء میں یہ تحریک عوامی شکل اختیار کر گئی۔ گو ذمہ دار نظام حکومت کا قیام۔ زمینداروں کو حقوق ملکیت کا تحفظ، پریس اور پلیٹ فارم کی آزادی کے علاوہ اور بہت سارے مطالبات صرف مسلمانوں کے فائدے کے لئے نہ تھے بلکہ ایسے مقاصد کی آزادی سے بلاشبہ چالیس لاکھ کشمیری عوام کی بھلائی مطلوب تھی لیکن یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے۔ کہ اس تحریک کی ابتداء صرف مسلمانوں کے ہاتھوں ہوئی جنہوں نے بلا شرکت غیرے ریاست میں ایک جمہوری نظام قائم کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ چنانچہ جس تنظیم کے زیر اہتمام اس تحریک نے نشو و نما پائی خالصتاً مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ جیسے کہ خود جس کا نام موجودہ کشمیر مسلم کانفرنس، نفس منتہائے تحریک پر گواہی دے رہا ہے۔ قائدین تحریک کی تقریریں، گلینسی کمیشن جس کا قیام مسلمانوں کی شکایات اور مطالبات کی تحقیقات کے لئے عمل میں لایا گیا تھا۔ کی رپورٹ۔ وہ مساجد اور خانقاہیں، جن کے سایہ میں ہمیشہ عوامی مظاہرے اسٹیج ہوتے رہے، مسلم اسیران ڈوگرا کے ریکارڈ، توہین قرآن، خطبہ عید پر بندش کے سانحات، جو راجہ اور رعایا کے درمیان چپقلش کے فوری اسباب بن گئے یہ سب واقعات دلالت کرتے ہیں اس حقیقت پر کہ آزادی کشمیر کی

جدوجہد اسمی طور پر خالص اسلامی نوعیت کی حامل تھی۔ یہ کوئی تعجب خیز بات نہ تھی۔ کیونکہ ریاستی جمہور اس صورت حال کو ختم کرنے پر کمربستہ ہو چکا تھا۔ جس کے زیر اثر ریاستی ہندوؤں کو خصوصی مراعات حاصل تھیں۔ ہندو اقلیت میں تھے اور مسلمان ریاست کی کل آبادی کا ۸۳% تھے لیکن ملازمتوں اور فوج میں ان کی اجارہ داری تھی۔ انہیں تجارت میں اضافی فوائد حاصل تھے۔ ریاست میں مسلمانوں اور ہندو آبادی کے مفاد میں ایک خلیج پیدا ہو گئی تھی۔ ایک تضاد تھا۔ جو ان کی مجلسی اور اقتصادی زندگی میں موجود تھا۔ اور ان کے نظریوں میں ایسا ٹکراؤ تھا۔ جو متحدہ ہندوستان کے مسلمانوں اور ہندوؤں کی باہمی آویزش سے بھی شدید تر تھا۔ ایسی منزل پر کشمیری مسلمانوں کا یقین روز بروز مستحکم ہوتا چلا جا رہا تھا۔ دو قومی نظریہ کے علاوہ ہندوؤں کے اس سلوک نے کشمیری مسلمانوں پر ہندوستانی مسلمانوں سے بھی زیادہ گہرے نقوش چھوڑے۔ ادھر ریاستی ہندو اس فرسودہ خاندانی اقتدار اور اس کی بداعتدالیوں کے معاون ہی نہیں تھے۔ بلکہ وہ ہر قیمت پر اس کی حفاظت کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ اور مسلمان اس کو ختم کرنے پر کمربستہ تھے۔ چنانچہ آج بھی مسلم کانفرنس کے زعما اور کارکن تحریک آزادی کشمیر کے ذریعے رواں ہیں اور اپنے ملک کو ڈوگرہ بھارتی راج سے چھٹکارا دلانے کے لئے مصروف جدوجہد ہیں مسلمان اپنے لئے تمام انسانی حقوق کا مطالبہ کر رہے تھے۔ اس کے جواب میں ان پر گولیاں برسائی گئیں۔ چنانچہ ۱۳ جولائی ۱۹۳۱ء کو پہلی بار سری نگر سنٹرل جیل میں مسلمانوں کے سینے ڈوگرہ فوجیوں کی گولیوں سے چھلنی ہوئے گولیوں کی یہ بارش مجاہد عبدالقدیر کی گرفتاری اور اس کے مقدمہ کی پیروی کی سبب ہوئی۔ عبدالقدیر جو کشمیر میں بغرض سیاحت تشریف لائے تھے۔ انہوں نے مسلمانوں پر مظالم دیکھ کر ان کو منظم ہونے کی اپیل کی اور زندان مسلم ارزاں کر دیا گیا۔ جیل کی کال کوٹھڑیاں آباد کی گئیں۔ ایذائیں دی گئیں۔ ۱۹ اپیل کا ذلیل قانون جاری ہوا۔ ڈوگرہ سامراج نے اس تحریک کو ختم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ مگر ان کو کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ یہ تحریک ۱۹۳۱ء میں عوامی شکل میں دنیا کے سامنے آئی اور ۱۹۳۱ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک مختلف صورتوں اور مختلف مانگوں کو لے کر اٹھی۔ مسجدوں کی واگزاری، تبدیلی مذہب پر ضبط جائیداد کی منسوخی۔ پریس اور پلیٹ فارم کی آزادی نمائندہ اسمبلی کے قیام، ذمہ دار نظام حکومت کا مطالبہ اور آزادی کے متعلق جدوجہد کی گئی۔ اس دور میں نام نہاد کانگرسی نیشنلسٹ ہندوؤں نے مسلمانانِ کشمیر کے ملی شیرازہ کو برباد کر دیا۔ ان کی سازش سے مسلم کانفرنس اور نیشنل کانفرنس مسلمانوں کی دو جماعتیں بن گئیں۔ ۱۹۳۱ء-۳۸ء تک مسلمانوں میں مکمل اتحاد و اتفاق رہا۔ اس اتحاد سے نہ صرف ڈوگرہ سامراج گھبرا گیا بلکہ کانگرسی بھی خوفزدہ ہو گئے۔ گوپالا سوامی آئینگر آنجہانی اور پنڈت پریم ناتھ بزاز نے کشمیری مسلمانوں کے اس طرح ملی شیرازہ توڑنے میں کانگرس کا خوب کام کیا۔ ۱۰ جون ۱۹۳۸ء کا وہ منحوس دن تھا جب کشمیری مسلمانوں کا ملی شیرازہ بکھرا اور شیخ محمد عبداللہ نام نہاد نیشنلزم کا شکار ہو گئے۔ چوہدری غلام عباس خاں نے جلد ہی کانگرسی ہندوؤں کے عزائم کو بھانپ لیا، اور انہوں نے کشمیری مسلمانوں کے ملی شیرازہ کو پھر سے منظم کرنے کے لئے جدوجہد شروع کر دی۔ کشمیر چھوڑ دو۔ اور آزاد کشمیر کی تحریکوں نے جنم لیا، ڈوگرہ راج مردہ باد اور بیعنامہ امرتسر توڑ دو کے نعرے سننے میں آئے۔ تحریک کے پندرہ سال کے عرصے نے کشمیری عوام میں کافی بیداری پیدا کی تھی۔ اور کشمیری عوام اس بات کو اچھی طرح جانتے تھے۔ کہ شخصی حکمرانی اور مطلق العنانی کا دور اب گذر چکا ہے۔ اب کسی فرسودہ نظام کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ کشمیری مسلمان اچھی طرح اس بات کو جانتا تھا کہ جب تک ان کے سروں پر ڈوگرہ شاہی کی نحوست سوار ہے ظلم و تشدد اور ناانصافی سے نجات ناممکن ہے۔ ادھر متحدہ ہندوستان میں قائداعظم محمد علی جناح کی قیادت میں مسلمانانِ ہندوستان نے جو سیاسی حیثیت حاصل کر لی تھی، اور مطالبہ قیام پاکستان کے اثرات سے کشمیری مسلمان غافل نہ تھے۔ قائداعظمؒ دو بار کشمیر تشریف لائے نیشنل کانفرنس اور مسلم کانفرنس کے زعماء سے ان کی کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ کشمیر سے رخصت ہونے پر انہوں نے کشمیری مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم - اور ایک تنظیم کے مضبوط اور مربوط کرنے کا پیغام دیا۔ بدقسمتی سے شیخ صاحب اس وقت باوجود قائداعظمؒ کی مدبرانہ فراست کے کانگرسیوں کے چنگل سے نہ نکل سکے۔

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان اور پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔ جولائی ۱۹۴۷ء میں کشمیر کے مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت مسلم کانفرنس نے پاکستان سے الحاق کرنے کی تاریخی قرارداد منظور کی۔ برصغیر ہند میں انگریزوں کے چلے جانے کے بعد ریاستی عوام کے لئے بھی پاکستان یا بھارت سے الحاق کا مسئلہ پیش آیا۔ ڈوگروں نے اپنے طے شدہ منصوبہ کے تحت بھارتی سامراج سے سازباز شروع کر دی تھیں۔ ریڈکلف، لیارڈ اور لارڈ

[illegible] ان مسلمانوں کی نسل کشی کی وجہ سے جن کی ووٹ کا راستہ [illegible] ریاست کو ملانے کے لئے جو دروازہ کھل گیا تھا۔ پٹیالہ، نابھہ، کپورتھلہ کی ریاستوں میں جو ہاہاکار مچی، جس میں سکھوں، لیڈروں نے کانگریسیوں کے ہاتھ مل کر [illegible] مسلمانوں کو ختم کرایا گیا تھا۔ اسی طرح بھارتی [illegible] ڈوگرا حکمران نے بھی کشمیری مسلمان کو ختم کر کے کشمیر کو ہمیشہ کے لئے بھارتی مقبوضہ بنانے کے لئے سازش مکمل کر لی تھی۔ جو مجاہدین کشمیر اور ان کے پاکستانی بھائیوں کی بروقت مداخلت اور کشمیری [illegible] کی بغاوت سے ناکام بنا دی گئی۔ پھر بھی جموں میں لاکھوں مسلمانوں کو قتل کیا گیا اور لاکھوں پاکستان کی طرف دھکیل دیئے گئے۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء میں [illegible] کشمیری مسلمانوں نے مسلح بغاوت کر دی اور اسی [illegible] ڈوگرا راج [illegible] بھارتی غاصبانہ حملہ ناکام بنا دیا گیا۔

۲۴ اکتوبر آزاد کشمیر حکومت کا قیام عمل میں آیا۔ اپنی شکست اور ناکامی کو چھپانے کے لئے بھارت نے کشمیر کو سلامتی کونسل کے سامنے پیش کر دیا۔ [illegible] آج بھی سلامتی کونسل کے پیش ہے۔ اور کشمیر کے [illegible] انصاف اور داد خواہی کے طالب ہیں۔ ۱۹۴۷ء اور ۱۹۵۳ء میں حالات نے ایک اور پلٹا کھایا۔ شیخ محمد عبداللہ پر بھارتی نام نہاد [illegible] کشمیری عوام کو بھارت کے غلام بنانے اور اس طرح پاکستان سے قیام پاکستان کا انتقام لینے کے منصوبوں کی قلعی کھل گئی۔ انہوں نے علی الاعلان بھارت کے اس ہوس ملک گیری کے پروگرام کا پردہ چاک کر دیا۔ اور واضح الفاظ میں اعلان کیا کہ کشمیری عوام سب کچھ چاہتے ہیں۔ مگر بھارت سے الحاق نہیں چاہتے۔ ان کو معزول کر دیا گیا۔ اور آج عرصہ چھ سات سال سے جیل میں پنڈت نہرو کے حکم سے بند ہیں۔ مقبوضہ کشمیر میں بھارت کے غاصبانہ قبضہ کے بعد خود کشمیری مسلمان اپنے وطن میں اجنبی محسوس کر رہا ہے۔ بھارت نے کوئی امتیاز نہیں چھوڑا ہے۔ جیسے وہ اپنا لوہا منوا سکیں۔ نماز، خطبہ [illegible] بھارت سے درآمد شدہ [illegible] سمجھا جاتا [illegible] زبان سنسکرت [illegible] گزشتہ سو سالوں سے بھارت نے کشمیر کو [illegible] رکھا ہے۔ اس غاصبانہ [illegible] دشمن، دھونس اور [illegible] کے باوجود کشمیری مسلمانوں کو بھارت اپنا ہم خیال نہیں بنا سکا۔ بھارت کشمیر پر خوف اور طاقت کے ذریعے [illegible] اپنا قبضہ جاری نہیں رکھ سکتا۔

آج کشمیر [illegible] کشمیری عوام پر ظلم و ستم کی داستان [illegible] آخری منزل میں داخل ہو گئی ہے۔ [illegible] پاکستان میں فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کی قیادت میں ایک باعمل حکومت قائم [illegible] پاکستان کی تعمیر و ترقی میں مصروف ہے۔ اور انہوں نے کشمیر کے متعلق اپنی پالیسی کا واضح طور اعلان کرتے ہوئے کہا ہے۔ کہ کشمیریوں سے جا کر پوچھ لیں [illegible] اور دوسرے پاکستانی کشمیر کے بارے میں اسی طرح سوچتے ہیں جس طرح کشمیری کشمیر کے لئے [illegible] ہم۔ انشاء اللہ کشمیریوں کو حق خود ارادیت دلا کے رہیں گے اور وہ اپنی مرضی سے الحاق کا مسئلہ طے کریں گے۔ بھارتی ظلم و تشدد کے [illegible] افق [illegible] امید کی کرن [illegible] صبح آزادی [illegible] ہے۔ انشاء اللہ وہ سحر دور نہیں جب کشمیری عوام آزاد ہو کر پاکستان کی تعمیر میں اپنے پاکستانی بھائیوں کے شانہ بشانہ سرگرم عمل ہوں گے (آمین)

عبدالقدیر رشک

جنگ سے متارکہ جنگ تک

سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی پگڈنڈی وادی سے پرے پہاڑ کی ترائیوں میں گم ہو رہی تھی۔ شیش ناگ اور ششتی ناگ میں پاؤں لٹکائے سوچ میں ڈوبا ہوا ایک انسان جو کشمیر کی پہاڑیوں میں چل چل کر تھک چکا تھا۔ جن کے کان اچھلتی، بل کھاتی لہروں اور ہنستی چڑیوں کے مدھر گیت ——— سننے میں گم تھے۔ ترائیوں پر چھائی ہوئی دھند کو گھورتے ہوئے اسے اچانک خیال آیا کہ امسال کشمیر کے ہاؤس بوٹوں اور ڈاک بنگلوں میں پہلی سی چہل پہل نہیں۔ نہ سعودی عقلمندوں اور کیمروں سے لدے پھندے یورپی سیاح، نہ ٹٹوؤں کی پیٹھ پر پہاڑی راستوں پر سفر کرنے والی ہنس مکھ میمیں۔ البتہ جونک قسم کے خانہ بدوش موجود ہیں جو ڈل کے کناروں پر جوتے سرہانے رکھ مزے سے سو رہتے ہیں۔

کشمیر کی نکھری فضا پر عجیب بے کسی اور سراسیمگی کا عالم طاری تھا۔ فضاؤں اور ہواؤں پر افسردگی تھی ——— اگرچہ جولائی کا مہینہ بھرپور شباب پر تھا لیکن جانے کشمیر کو کس کی نظر لگ گئی تھی ——— کشمیر آزادی کے موڑ پر کھڑا تھا ——— اس موڑ پر جہاں قومیں خاک و خون کا غسل لیتی ہیں لیکن کشمیر چپ چاپ اور اداس تھا۔ مجبور اور مظلوم کشمیر۔ مسلم کانفرنس کے کارکن جس کی اشک شوئی کے لئے قریہ قریہ گھوم رہے تھے لیکن اس خاکستر میں بظاہر کوئی چنگاری نظر نہ آتی تھی۔ علامہ اقبال کا ارشاد درست تھا۔

از غلامی بے بہائے او مرد
آتشے اندر رگ تاکش فسرد

میں کہر آلود فضا میں ششتی ناگ میں پاؤں لٹکائے سوچ رہا تھا کہ وہ قوم ایک روشن مستقبل کے خواب کیا دیکھے گی جس کے ہر فرد کی قیمت ساڑھے سات روپے مقرر ہے۔ حافظ کو اگر کشمیریوں کی قدر و قیمت معلوم ہوتی تو وہ کبھی نہ کہتا ؎

زشعر حافظ شیراز می گویند و می رقصند
سیہ چشمان کشمیری و ترکان سمرقندی

کشمیر کی دور افتادہ بستیوں میں گھوم پھر کر ۱۸ جولائی کو سری نگر میں وارد ہوا تو دیکھا کہ یہ خوبصورت ترین شہر بدستور سرد تھا۔ البتہ دھسوں میں لپٹے ہوئے مسلم کانفرنس کے بعض کارکن ضرور نظر آتے جو گلی کوچوں میں آزادی کی افواہیں پھیلا رہے تھے۔ اسی دوران مسلم کانفرنس کے قائم مقام صدر چوہدری حمید اللہ تشریف لائے اور بعض نجی مکانوں پر سیاسی بحث کا سلسلہ جاری رہا۔ البتہ نیشنل کانفرنس کے صدر دفتر "مجاہد منزل" میں خاصی چہل پہل نظر آتی تھی۔ سری نگر میں ایک تبدیلی اور بھی نظر آئی۔ ۱۸ جولائی تک سیوک سنگھ اور مہا سبھا کے نئے دفتر کھل چکے تھے اور کشمیری پنڈتوں اور ڈوگروں کے نوجوان لڑکے کھلے سبزہ زاروں میں نیکر پہنے اور مشق کے طور پر لٹھ چلاتے نظر آتے تھے۔ قرائن بتا رہے تھے کہ کبھی ان چپ چاپ سبزہ زاروں میں انسانی خون سے لالہ زار کھلیں گے۔ سوکھی گھاس کی بجائے انسان کے خون ارزاں کی فراوانی ہو گی۔

یکم اگست ۱۹۴۷ء کا سورج سری نگر پر طلوع ہوا تو آنجہانی مہاتما گاندھی بنفس نفیس تشریف لے آئے۔ مجاہد منزل میں نیشنل کانفرنس کے کارکنوں سے خطاب کیا۔ لیکن ان کی آمد کا سیاسی مقصد کچھ اور تھا۔ وہ سری نگر کے سیاسی عفریت اور کانگرس کے ازلی اور ابدی دشمن وزیراعظم رام چندر کاک سے آخری فیصلہ کرنے آئے تھے۔ یہی وزیراعظم تھے جنہوں نے پنڈت جواہر لعل نہرو کو دریائے جہلم پر روکا تھا اور ان کے چہرے پر خفیف سا زخم بھی آ گیا تھا۔

اصل بات یہ تھی کہ کانگرس کشمیر کو بھارت میں شامل کرنے کا منصوبہ بنا چکی تھی۔ لیکن مسٹر کاک راستے کا روڑا بن رہے تھے۔ مہاتما گاندھی وزیراعظم کاک کے سیاسی عزائم کا جائزہ لینے سری نگر آئے تھے۔ ان کی آمد سے پہلے دربار کشمیر پر ڈورے ڈالنے کا کام شری آچاریہ کرپلانی کو سونپا گیا تھا لیکن ان کا مشن ناکام رہا۔ اب سری نگر کو مہاتما گاندھی کی ضرورت تھی۔ گفتگو نے طول کھینچا تو وزیراعظم کاک نے صاف الفاظ میں کہا۔

"ہم ہر ایک سے دوستانہ تعلقات قائم رکھنا چاہتے ہیں" یہ جواب خلاف توقع نہ تھا۔ کانگرس کو کاک سے یہی امید تھی۔ لیکن مہاتما گاندھی اپنے کانوں سے یہ جواب سننا چاہتے تھے۔ اب اس کے علاوہ چارۂ کار نہ تھا

شیخ عبداللہ کو جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں سے نکالنے کا حق کیا جائے اُن کے سر پر وزارت عظمیٰ کی دستار رکھی جائے اور وہ دربار کشمیر میں کانگریس کی وکالت کریں۔ چنانچہ انہوں نے کاک کی کوٹھی کی بجائے شیخ عبداللہ کے مکان کا رخ کیا۔ بیگم عبداللہ نے باپوجی کا پر جوش استقبال کیا اور بوڑھے باپو نے میلی سی جھولی میں لپٹا لپٹایا کوئی تحفہ بیگم کی نذر کیا۔

مہاتما گاندھی کے اس دورے کو مسلسل غیر سیاسی اور نجی ثابت کیا جا رہا تھا لیکن مسلم کانفرنس کے لیڈر ان کی آمد کا مطلب سمجھ چکے تھے۔ ایک مسلمان سیاسی لیڈر نے بھرے مجمع میں اعلان کیا کہ مہاتما گاندھی کشمیر کو بھارت میں شامل کرنے کے لئے بات چیت کرنے آئے ہیں۔

ادھر مسلمانان ہند کی واحد نمائندہ سیاسی جماعت مسلم لیگ نئے اختیارات سنبھالنے کی تیاریوں میں مشغول تھی ادھر سری نگر میں ہندوستان اور کشمیر میں خفیہ معاہدے کی شرائط طے ہو رہی تھیں لیکن اس کے باوجود سری نگر کے مسلمانوں کو غلط فہمی میں مبتلا رکھا جا رہا تھا۔ شیخ عبداللہ کی رہائی اور وزیراعظم کاک کی تباہی کے سامان مکمل ہو چکے تھے۔ کشمیر کے بھولے بھالے عوام بے خبر تھے۔ جیسے ناڈل، چیرہ دستیاں لاعلم تھیں اور شیش ناگ کے اندھیرے تاریکی میں تھے۔ ان کو خاموشی سے ایک دوسرے مالک کے پاس فروخت کیا جا رہا تھا۔ جو گلاب سنگھ سے زیادہ با اثر اور سرمایہ دار تھا۔

اس وقت کا کشمیر خوش ہوتا تو جگہ جگہ تفریح گاہیں کھل جاتیں مغموم ہوتا تو زلزلے آتے تھے۔ کشمیر میں ۶ اگست کی صبح کو پہلا زلزلہ آیا راقم الحروف گھبرا اور ہڑبڑا کر قہوہ خانے سے نکلا تو مہاتما گاندھی جا رہے تھے۔ دہلی کی طرف ـــ اور اس منزل کی طرف جہاں سے لوٹ کر کوئی نہیں آتا۔ کشمیر میں یہ ان کا آخری سفر تھا۔

کشمیر اور حیدر آباد کے سوا متحدہ ہندوستان کی تمام ریاستیں اپنی قسمت کا فیصلہ کر چکی تھیں۔ کشمیر سے مہاتما گاندھی کے رخصت ہوتے ہی ریاستی سیاست اپنے رنگ بدلنے لگی۔ نیشنل کانفرنس کو برسر اقتدار لانے کے لئے کاک کا زوال ضروری تھا۔ دربار کشمیر سیاسی ریشہ دوانیوں کی آماجگاہ بن چکا تھا۔ سری نگر میں طرح طرح کی افواہیں پھیلنے لگیں۔ نیشنل کانفرنس کو برسر اقتدار لانے کے لئے ضروری تھا کہ مسلم کانفرنس اور کسان مزدور کانفرنس کو ختم کیا جائے۔ نیشنل اور مسلم کانفرنس دو تلواریں تھیں جن کا ایک سیاسی نیام میں سما سکنا محال تھا۔

۱۱ اگست کی صبح کو وزیراعظم رام چند کاک معطل کئے گئے اور اسی روز نئے وزیراعظم میجر جنک سنگھ نے ریاست کی وزارت کا حلف اٹھایا لیکن سیاسی مصلحت یہی تھی کہ کانگریسی اقدامات کئے گئے۔ ما بدولت کو صیغۂ راز میں رکھا جاتا۔ چنانچہ میجر جنک سنگھ نے برسر اقتدار آتے ہی مرکزی حکومت کو تار دیا کہ ریاست کشمیر خود مختاری کا اعلان کرتی ہے۔ اسی روز بخشی غلام محمد اور غلام محمد صادق کی جو روپوش تھے۔ گرفتاری کے وارنٹ منسوخ ہوئے اور زنانہ مسلم لیگ کی سیکرٹری مس ناصرہ صدیقی کو ریاست بدر کر دیا گیا۔ شیخ عبداللہ کی رہائی کے احکام جاری ہوئے۔ میجر جنک سنگھ نے مسلم کانفرنس کے جلسے جلوسوں پر پابندی عائد کر دی۔ سری نگر کے مسلم عوام کو مجبور کر دیا کہ وہ گھروں میں بیٹھ کر حکومت کے فیصلے کا انتظار کریں۔ جب حکومت نے لوگوں سے شہری آزادی کا حق بھی چھین لیا۔ تو انہوں نے ۱۱ اگست کی رات کو چھتوں پر پاکستان زندہ باد کے نعرے لگائے اور ۱۴ اگست کو مسلمانوں کے جھونپڑوں اور مکانوں پر پہلی دفعہ پاکستان کے سبز جھنڈے لہراتے نظر آئے ـــ عوام اور حکومت میں تصادم ناگزیر تھا۔ سری نگر کی فضا کسی تند اور تیز طوفان کی آمد کا پتہ دے رہی تھی۔

۱۴ اگست کی صبح کو شیخ عبداللہ مجاہد منزل میں تقریر کرنے آئے تو میں سری نگر سے چل دیا۔ یہ فضا اور یہ ہوا خانہ بدوشوں کے مزاج کے منافی تھی۔ اسے ڈل اور شیش ناگ پر نصب کئے پہرے تھے جن پر ناچتے اور شکاروں پر بیٹھے دھوبیوں کے لوک گیت سننے والے خانہ بدوش ایک ایک کر کے چل دئے۔ ان میں میں بھی شامل تھا۔ سری نگر سے کوسوں دور ضلع گورداسپور کا ایک گاؤں میرا منتظر تھا۔

آزادی کی رات ان گنت مصیبتوں کو ساتھ لے کر آئی۔ مشرقی اور مغربی پنجاب میں قتل و غارت کا بازار گرم تھا۔ آزادی کے ٹھیک سات یا دس دن ایک فوجی ٹرین ریلوے سٹیشن پر رکی۔ حفاظتی فوج کے کچھ دستے مہاجرین کو نکالنے آئے تھے۔ ان مسلمان دستوں کا کمانڈر نہایت نیک دل، بہادر اور جواں مرد تھا۔ وہ مہاجرین کو نکالتا بستی بستی لئے ریلیف فوجی سپاہیوں کو ساتھ لئے آگے بڑھتا چلا گیا۔ وہ کشمیر کی سڑک کٹھوعہ روڈ پر پہنچا تو اس کی معیت میں باقاعدہ اور بے قاعدہ سپاہیوں کی خاصی بڑی جمعیت تھی۔ بہادر جرنیل شوق روڈ پر پہنچ کر رک گیا اور نگاہیں کشمیر پر گاڑ دیں۔ اس موقع پر بآسانی اس انتہائی اہم سڑک کی ناکہ بندی کی جا سکتی

[illegible] کی ملٹری [illegible] توقف مزید ہوا [illegible] اہل کشمیر [illegible] داخل کر لیا ہے اور [illegible] اس فیصلے پر [illegible] دیا۔

ظلم کشمیر [illegible] کوہ، دریا اور غروب آفتاب [illegible] خانہ بدوشی [illegible] مجبور ہو سکتے اور [illegible] انسان کبھی [illegible] قدم اٹھتے ہیں [illegible] آج [illegible] کر دیا کہ [illegible] بہتی ہے۔

۱۸ اکتوبر ۱۹۴۷ء [illegible] سورج [illegible] پہاڑوں کی اوٹ سے طلوع ہوا تو [illegible] مسلمانوں [illegible] تھا۔ یہ [illegible] محمد یوسف [illegible] آزادی کی خوشیاں منا رہے اور کشمیر کی پاکستان [illegible] کا مطالبہ کرنے کے لیے اکٹھے ہوئے تھے لیکن [illegible] جانتا تھا کہ ہری سنگھ [illegible] کشمیر کی قسمت کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ مہاراجہ ہری سنگھ [illegible] عوام کے جذبات سے بے خبر تھے [illegible] بڑھتے ہوئے خطرے [illegible] پونچھ، باغ، راولاکوٹ، تھوراڑ، منگ اور [illegible] کی جا چکی تھی۔

لیکن باغ کے [illegible] نے مسلمانوں کے دل میں [illegible] ڈال دئے۔ باغ میں اجتماع ہو رہا تھا کہ اچانک ڈوگرا سپاہیوں سے بھری ہوئی لاریاں نمودار ہوئیں۔ لوگ ابھی پوری طرح صورت حال کو سمجھ بھی نہ پائے تھے کہ ہر طرف سے گولیاں برسنے لگیں۔ حریت پسند گولیوں سے خاک و خون میں تڑپنے لگے۔ ایک گھنٹے کے بعد گرد اور دھوئیں کے بادل ہٹے تو پانچ سو سے زائد کشمیریوں کی لاشیں باغ میں پڑی نظر آئیں۔ زخمی لوگوں اور شہیدوں کے [illegible] سے پورے کشمیر میں ایک قیامت برپا ہو گئی۔

اہل کشمیر کے لئے اب دو ہی رستے تھے سسک سسک اور [illegible] یا باعزت طور پر اپنے وطن کے لئے صف آرا ہو جائیں۔ اہل کشمیر نے دوسرا راستہ پسند کیا۔ اہل کشمیر کی خوش قسمتی تھی کہ پونچھ کے اکثر نوجوان اور بڈھے [illegible] جنگ میں تجربہ رکھتے تھے۔ جنگی آداب جانتے تھے اور ان کے پاس اسلحہ بھی موجود تھا [illegible] مسلمانوں کے قتل عام [illegible] چنانچہ پونچھ میں [illegible] شروع ہوئی اور یہی وقت ایک کشمیری نوجوان سردار ابراہیم [illegible] سامنے آیا۔ راولاکوٹ اور باغ کے دیہاتی [illegible] بیٹھے تھے۔ رفتہ رفتہ [illegible] پھیلتی چلی گئی۔

آخر پونچھ کے مجاہد سر پر کفن باندھ گولیوں کا مینہ برسانے [illegible] اٹھے [illegible] کی موت کی خبر [illegible] آگ [illegible] چلی گئیں [illegible] ڈھول بجے اور قبائلی لشکر راتوں رات کشمیر کی طرف کوچ کر گئے۔

۲۴ اکتوبر کا دن غروب ہوا تو محسودی قبائل کا جوان ہمت جرنیل شاہ پسند منزلوں پہ منزلیں طے کرتا لشکر سمیت مظفرآباد کی ترائیوں میں آ اترا ہوا۔ رات کی تاریکی مظفرآباد پر تسلط جما چکی تھی۔ قبائلی آداب جنگ کے مطابق چاند طلوع ہونے سے پہلے مظفرآباد کی قسمت کا فیصلہ ہونا ضروری تھا۔ آخر رات کی تاریکی میں پچاس محسودی نوجوان شاہ پسند کی ذاتی نگرانی میں مظفرآباد پر حملہ آور ہوئے۔ مظفرآباد کے گلی کوچوں میں ڈوگرہ اور بھارتی فوج کا پہرہ تھا۔ قبائلی حملہ بجلی اور طوفان سے کم نہیں تھا۔

مظفرآباد پہنچ کر قبائلی نوجوانوں نے پہلی باڑ ماری اور دشمن کی افراتفری سے فائدہ اٹھا کر لمبے لمبے خنجر نکال کر شہر کے گلی کوچوں میں جا گھسے۔ دشمن نے قبائلیوں کو سنگینوں پر سنبھالنے کی کوشش کی لیکن دست بدست لڑائی میں قبائلیوں کا مقابلہ آسان نہ تھا۔ دشمن کو زیر ہوتے دیکھ کر شاہ پسند نے مظفرآباد کی ترائیوں میں رکے ہوئے لشکر کو حکم دیا کہ وہ آگے بڑھ کر کوہالہ پر جا پڑے۔ آخر کوہالہ میں بھی دو گھنٹے کی خونریز لڑائی کے بعد ریاستی فوج تتر بتر ہو گئی۔ کوہالہ اور مظفرآباد فتح ہوتے ہی قبائلی لشکر اوڑی کی طرف چل پڑا۔ تھکا ہارا قبائلی لشکر اوڑی پہنچا تو

[illegible] رات کا ایک پہر باقی تھا لیکن پوری رات [illegible] کے باوجود قبائلی لشکر سری نگر پہنچنے کے لئے بے تاب تھا۔ جنگی مصلحت یہی تھی کہ سرینگر ہوائی اڈہ [illegible] سے پہلے اس پر بھی قبضہ کر لیا جائے۔ اوڑی [illegible] [illegible] ایک گھنٹہ مقابلہ کیا۔ جب قبائلی لشکر کو بڑھتے دیکھا تو پیچھے ہٹ گئے۔ ۲۵ اکتوبر کی صبح [illegible] تو مظفر آباد کو [illegible] راولا کوٹ [illegible] پر مجاہدین کے جھنڈے لہرا رہے تھے۔

[illegible] کا [illegible] کشمیر کے میدان جنگ کے تصور سے [illegible] [illegible] قبائلی حملے کو بہانہ بنا کر بھارت سے ریاست کے الحاق کا اعلان کر دیا۔ ریاست کا اقتدار شیخ عبداللہ کو سونپا گیا۔ بھارت سے کشمیر کے الحاق کا اعلان ہوتے ہی بھارتی چھاؤنیوں میں ایک زلزلہ سا آ گیا۔ [illegible] دہلی کی وزارت حربیہ نے لیفٹیننٹ کرنل ڈی۔ آر۔ رائے کی کمان میں بھارتی فوج کشمیر میں اتار دی۔ ہندوستان کی تقریباً ہر چھاؤنی سے بھارتی فوج کشمیر کی طرف روانہ کر دی گئی [illegible] فوج [illegible] [illegible] [illegible] شیر [illegible] [illegible] تھی۔ ملکی فوج کو فتح یاب بنانے کے لئے بھارتی طیارے قبائلی لشکر پر بمباری کرنے لگے۔ دور مار توپیں پہاڑیوں پر چڑھائی گئیں اور بھارتی [illegible] نے اعلان کیا کہ ہم ایک ہفتے کے اندر اندر مجاہدین سے کشمیر خالی کرا لیں گے۔

جس روز بھارت کی ٹڈی دل فوج کشمیر میں داخل ہوئی پاکستان کے ایک سابق فوجی افسر کسی نجی کام کے سلسلے میں یہاں موجود تھے۔ فوج کے دو مسلح سنتری بھی اتفاق سے اُن کے ہمراہ تھے۔ یہ تینوں اوجی رات کی تاریکی میں ایک پہاڑی پر چپ چاپ کھڑے تھے۔ دور سے بڑھتی ہوئی بھارتی جیپ کاروں کی بتیاں نظر آ رہی تھیں۔ جیپوں کی میلوں لمبی لکیر تھی کہ کشمیر کی طرف بڑھتی چلی آتی تھی۔

بہادر افسر سنتریوں کے ساتھ ایک گھاٹی میں آ گیا۔ ایک سنتری نے دیا سلائی جلائی اور افسر نے جیب سے چڑ مڑ کاغذ نکال کر پنسل سے جنگی نقشہ بنایا اور مسکرا کر کہا۔

"اب تم نقشے کے مطابق پوزیشن سنبھال کر بیٹھ جاؤ اور فائر کھولو" دونوں سنتری حیرت سے افسر کا منہ تکنے لگے اُن کے مقابلے پر پوری منظم فوج تھی۔ دور مار توپیں تھیں اور جنگی طیارے تھے۔

آخر مسلمان افسر دو سنتریوں کے ساتھ خود بھی مورچہ سنبھال کر بیٹھ گیا۔ جنگی نقشے کے مطابق مختلف زاویوں سے فائر کھلا۔ بھارتی فوج کی بڑھتی ہوئی جیپ کاروں کی بتیاں گل ہو گئیں۔ بھارتی کمانڈر اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا کہ پاکستان کی باقاعدہ فوج نے مقابلے پر پہنچ کر ہے مناسب زاویے بنا رکھے تھے کہ کوئی [illegible] [illegible] کار [illegible] [illegible] [illegible] فوج کے ساتھ آن پہنچا ہے۔ قارئین کو تعجب ہوگا کہ بھارتی فوج ۳۶ گھنٹے تک ایک انچ بھی آگے نہ بڑھ سکی۔ یہ کارنامہ فردِ واحد کے مجاہدین کے کارناموں سے کیا کم ہے۔

[illegible] قبائلی جو اوڑی اور بارہ مولا سے فتح کے شادیانے [illegible] بجاتے ہوئے بڑھے تھے تلواروں اور خنجروں کی بجلیاں گراتے آخر سری نگر سے قریب پہنچ گئے [illegible] [illegible] [illegible] بھارتی توپیں استعمال کیں مری [illegible] ہوائی اڈے پر [illegible] [illegible] [illegible] ڈوگرے میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے اور مجاہدین نے سری نگر [illegible] [illegible] حکومت کے جھنڈے لہرا دیئے۔ عین بہانی کے وقت [illegible] [illegible] بدقسمتی سے مفقود الخبر ہو گئے۔

۱۴ اکتوبر [illegible] بھارتی طیاروں نے بارہ مولا کے نہتے اور [illegible] شہریوں پر اندھا دھند بمباری کی مجاہدین کی پوزیشن کچھ کمزور ہو چلی تھی کہ پیر صاحب پونچھ نواب سید محمد ابراہیم [illegible] مجاہدین کے ہمراہ آ پہنچے۔ لیفٹیننٹ کرنل [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] نے فوج کو بارہ مولا میں [illegible] دیا لیکن اس کا انجام نہ صرف بھارتی فوج کے حق میں برا ہوا بلکہ لیفٹیننٹ کرنل [illegible] بھی بارہ مولا میں مارے گئے اور بھارتی فوج پہاڑوں میں گھس گئی۔

۵ نومبر کو سید محمد [illegible] [illegible] [illegible] پہنچ گئے۔ ادھر بھگو [illegible] اور [illegible] جہلم پر قبضہ جمانے کے بعد مجاہدین نے ڈوگرا فوج کو میرپور میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔ [illegible] [illegible] میں گڑبڑ جاری تھی کہ گلگت میں بھی جنگ کے شعلے بھڑک اٹھے اور گلگت کے مجاہدین نے ڈوگرا فوج کے افسر کو گرفتار کر لیا۔

کشمیر تقریباً فتح ہو چکا تھا۔ دشمن کے جنگی ہوائی جہازوں کی ٹکڑیاں کبھی کبھی آتیں اور مجاہدین پر بم گرا کر روپوش ہو جاتیں۔ اسی دوران مجاہدین نے اپنی معمولی رائفلوں اور [illegible] گنوں سے بھارت کے سات جنگی طیارے مار گرائے۔ نومبر کے وسط میں ایک آفریدی سردار چھ پانچ سو جوانوں کے ساتھ کشمیر میں داخل ہوا اور کشمیر میں جگہ جگہ اپنی شجاعت کے ڈنکے بجا دیئے۔ [illegible] [illegible] اور [illegible] کی فتح کا سہرا اسی آفریدی سردار کے سر ہے۔

[illegible] فتح و نصرت کی خبریں سننے کا منتظر تھا۔ لیکن فتح کی بجائے شکست کی تشویش ناک خبریں مسلسل آتی چلی گئیں۔ بھارتی کمانڈر جو کبھی

جو ابھی خوش فہمی میں مبتلا تھے مایوس ہوتے چلے گئے۔ اب عافیت اسی میں تھی کہ بھارت جنگ بند کرنے کی کوشش کرے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور بھارت کے دوسرے یورپی دوستوں نے اقوام متحدہ میں سیاسی فضا سازگار بنانے میں خاص محنت اور کاوش سے کام لیا جب یہ معاملہ سلامتی کونسل میں پیش ہوا تو مسٹر آئنگر نے پورے زور سے کشمیر پر اپنے حق کا اعلان کیا۔ حالانکہ کشمیر کے ہر محاذ پر بھارتی فوجوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ مجاہدین دو دو میل لمبے محاذ پر ہندوستانی فوج کے کئی کئی دستے پڑے رہتے تھے مسٹر آئنگر کے الفاظ کی نوعیت یہی تھی تو پانی تھی کہ مجاہدین نے ایک ہی رات میں پونچھ کے اردگرد حملہ کر کے پانچ سو ہندوستانی سپاہی موت کے گھاٹ اتار دیئے۔ دشمن نے اکھنور کے محاذ پر پیش قدمی کی کوشش کی لیکن سخت جانی نقصان اٹھا کر بھاگنا پڑا۔ جب راجوری کے محاذ پر بھی دشمن کو شکست ہوئی تو بھارتی لیڈر کشمیر میں جنگ بند کرانے کے لئے کوشاں ہوئے اور آخر غیر جانبدارانہ استصواب اور دیگر شرائط کے ساتھ اقوام متحدہ نے کشمیر میں جنگ بند کرا دی اور مجاہدین کو متارکۂ جنگ کی شرائط کے مطابق پیچھے ہٹنا پڑا لیکن مجاہدین کے لئے یہ خوشی کا مقام نہ تھا۔ بعض تو ایسے تھے جنہوں نے جنگ بند ہونے کی خبر سنتے ہی اپنی بندوقیں توڑ ڈالیں۔ مگر آخر کار قوم کے فیصلے کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ اور یہ سر آج تک خم ہے لیکن دوبارہ اٹھنے کے لئے ہر لحظہ تیار۔

مشتاق احمد قریشی

جموں کی تباہی

پنڈت نہرو نے ہندوستان کی اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔

"ماہ نومبر (۱۹۴۷ء) کے اوائل میں جموں کے قریب بعض ایسے حوادث پیش آئے جن پر مجھے دلی افسوس ہے۔ مسلم پناہ گیروں کا قافلہ جموں سے جا رہا تھا اس پر غیر مسلم پناہ گیروں اور دوسروں نے حملہ کیا اور بہت سے لوگ مقتول و مجروح ہوئے محافظ فوج نے اپنا فرض باعزت طریق پر ادا نہ کیا لیکن یہ کہ دینا چاہتا ہوں کہ ہماری فوجوں کا کوئی دستہ موقع پر موجود نہ تھا اور انھیں اس حادثہ سے کوئی تعلق نہیں۔"

لیکن مسلم پناہ گیروں کے قافلے ایک سے زیادہ مرتبہ بھیجے گئے۔ اکثر پر حملے ہوئے۔ تین ہزار کا ایک قافلہ کاملاً ختم کر دیا گیا۔ ایک قافلہ میں سے صرف تھوڑے سے لوگ چھپ چھپا کر بچے اور کئی روز پیدل چل کر پاکستان پہنچے۔ انھیں جموں سے سیالکوٹ آنے والے راستے کے بجائے گورداسپور جانے والے راستے پر چلایا گیا۔ گویا مقصد یہ تھا کہ اگر بعض لوگ جموں کے غیر مسلموں کی دستبرد سے بچ ہوں تو گورداسپور میں مارے جائیں۔

پنڈت جی نے کہا کہ ہندوستان کی فوج ان کی حفاظت پر مامور نہ تھی لیکن سوال یہ ہے کہ حفاظت کس فوج کے ذمہ لگائی گئی تھی؟ کیا وہ کشمیر کی ڈوگرا فوج تھی یا والی پٹیالہ کے وہ سکھ اس کام پر لگائے گئے تھے، جن کو قتل و غارت کے سوا کوئی تعلیم نہیں دی گئی۔ اس انتظام کا ذمہ دار کون تھا؟

جموں کی تباہی ایک مکمل سازش کا نتیجہ تھی۔ چنانچہ ڈوگرا فوج نے مسلمانوں کا مکمل صفایا کرنا شروع کر دیا۔ ۲۲ اکتوبر کو جموں کے تمام مسلمان پولیس والوں سے ہتھیار لے لیے گئے۔ ۲۸ اکتوبر کو ان پر حملہ کیا گیا۔ ۲۰ اکتوبر کو اکھنور کے آس پاس کے پندرہ ہزار مسلمانوں کو اکھنور کے پل کی طرف لایا گیا اور کہا گیا کہ پیدل پاکستان چلے جائیں۔ انھوں نے نالہ پیدل چلنے سے انکار کیا تو راجپوت اور ڈوگرا سپاہیوں نے ان پر حملہ کیا۔ پندرہ ہزار میں سے تقریباً ایک سو آدمی کھیتوں میں چھپ کر بچے اور پاکستان پہنچے۔

۲۳ اکتوبر کو میران صاحب کے حلقے سے ۲۵ ہزار مسلمانوں کو ماؤ گاؤں میں جمع کیا گیا اور حکم دیا گیا کہ پیدل پاکستان چلے جاؤ۔ وہ جا رہے تھے تو ڈوگرا فوجیوں نے حملے کر کے مستورات چھین لیں۔ آدمیوں کو قطار میں کھڑا کر کے مارنا شروع کیا۔ ۲۵ ہزار میں سے صرف دو سو بچے۔ ۲۰ اکتوبر کو کٹھوعہ کے پاس آٹھ ہزار مسلمان جمع ہوئے۔ سب ڈویژنل مجسٹریٹ کٹھوعہ سے امداد کی درخواست کی جس پر کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ وہ لوگ تین میل کا فاصلہ طے کر چکے تو ڈوگرا فوجیوں اور مسلح سکھوں نے ان پر حملہ کیا۔ چالیس آدمیوں کے سوا سب مارے گئے۔

اوائل اکتوبر میں سمبا کے چودہ ہزار مسلمانوں کو ہندوؤں اور سکھوں نے محاصرہ میں لے لیا ۲۲ اکتوبر کو مہاراجہ صاحب وہاں پہنچے۔ اس کے بعد مسلمان عورتیں چھین لی گئیں۔ باقی لوگوں کا قتل شروع ہو گیا اور چودہ ہزار میں سے صرف پندرہ بچے۔

۵ نومبر کو جموں شہر میں مہاراجا کے نام پر منادی کرائی گئی کہ مسلمانوں کو فوراً جموں سے نکل جانا چاہیے۔ اور پاکستان کی طرف سے بھی یہی ہدایت پہنچی ہے۔ مسلمان پریڈ کے میدان میں جمع ہوئے موٹر لاریوں میں سوار کرا کے انھیں سوچیت گڑھ کے بجائے کٹھوعہ کے راستے پر لے جایا گیا۔ ماوا کے مقام پر انھیں حملے کا ہدف بنایا گیا۔ چار ہزار میں سے صرف نو سو بچ کر انتہائی مصیبتوں سے سیالکوٹ پہنچے۔ ان میں مسٹر غلام مصطفیٰ ایم۔ ایل۔ اے بھی تھے، جن کی اہلیہ، ہمشیرہ اور بچے مارے گئے۔ اسی حملہ میں چودھری غلام عباس صاحب

کئی بلبے اور صاحبزادی نا پتا ہو گئیں۔ جموں سے عزیز مسلم گھرانوں کا
ایک قافلہ ۶ نومبر کو سفر کر رہا تھا جس پر حملہ ہوا۔ اگر فی
گھر پچاس آدمی بھی فرض کیے جائیں تو ۱۱ ساڑھے تین ہزار بنتی
ہے۔ تیسوں کی مارک گئے ... سے دو ہزار ہے ... بڑی لگتی ہے۔
راستے میں ان پر مسلح سفید پوشوں نے حملہ کیا جن سے صرف سب جان
بچا کر گئے۔ اسی طرح ۶ نومبر کو ایک اور قافلہ جس کے ساتھ ... سوچیت
گڑھ پہنچا۔ اس قافلے کی ساری مستورات اور بیشتر سامان فوجیوں نے
راستے میں چھین لیا۔

کشمیر یہ بڑی ... دہلی کے انکار ات پر ... کیا کیا تھا۔ دشمن
کو یہ امید ہو گئی کہ یہ زمین کشمیر سے مسلمان کا نام مٹا دیا جائے گا ---
مسلمان کا خون کتنا ارزاں ہو چکا تھا --- آزادی کے لیے اس نے کتنی
بڑی قربانی دی --- ؟

۲ نومبر ۱۹۴۷ء کو ہندوستان کے نمائندے کنور دلیپ سنگھ
کی دعوت پر جموں کے مسلمانوں کے ایک وفد نے ان سے ملاقات کی۔
دوران گفتگو انھوں نے وفد سے صاف الفاظ میں کہا کہ مسلمان
جموں کے لیے یہ بہتر ہے کہ وہ یہاں سے فوراً چلے جائیں کیونکہ حالات
خراب ہو چکے ہیں۔ وفد نے بہتیرا ان کو یقین دلایا کہ وہ وفادار ہیں اور
یہاں رہنا ہی بہتر سمجھتے ہیں۔ لیکن انھوں نے اصرار جاری رکھا کہ موجودہ
صورت میں ان کے لیے فوراً یہاں سے چلا جانا بہتر ہو گا۔ اس کے
جواب میں وفد کے ایک ممبر نے عرض کیا کہ آپ یہاں کانگرس کے
نمائندے کی حیثیت سے آئے ہیں اور یہ ہندوستان میں کانگرس
کی واضح پالیسی ہے کہ وہاں مسلمانوں کو ... دیا جا رہا ہے تو یہ
آپ کی پالیسی اس سے مختلف ہو سکتی ہے؟ اس کے جواب میں
انھوں نے پھر بھی یہی کہا کہ اس وقت حکومت کی یہی پالیسی ہے۔
دوسرے ممبر نے کنور صاحب سے کہا کہ اس وقت حکومت کشمیر کے
وزیر اعظم شیخ عبداللہ ہیں۔ لہٰذا ہم چاہتے ہیں کہ ہم اس سلسلہ میں
ان کا نظریہ بھی معلوم کر لیں۔ کنور صاحب نے اس کے جواب میں کہا
کہ وہ آج کل بہت مصروف ہیں۔ ملاقات خواہ ٹیلیفون پر کیوں نہ ہو
بہت مشکل ہے اور جس کی موجودہ حالات کے تحت شاید اجازت
بھی نہ مل سکے۔ ہاں اتنا کیا جا سکتا ہے کہ میں ان سے مل کر آپ کا
پیغام پہنچا دوں۔ چنانچہ دوسرے روز جب وفد کے ممبران کی
خدمت میں گئے تو انھوں نے کہا کہ میں نے شیخ عبداللہ صاحب سے
ٹیلیفون پر گفتگو کی تھی اور وہ سو فی صدی میرے خیال سے متفق ہیں۔
ابھی گفتگو سے سے ماحت جاری تھی کہ اگلے ہی دن ساڑھے آٹھ
بجے حکومت کی طرف سے لاؤڈ سپیکر کے ذریعے اعلان کر دیا گیا کہ
آج مورخہ ۵ نومبر کو ۳ بجے تک تمام مسلمان پولیس لائن میں پہنچ
جائیں جو وہاں وقت مقررہ پر نہ پہنچے گا اس کی سلامتی کی ذمہ داری
حکومت پر نہ ہو گی مختصر نوٹس کا واضح مطلب یہ تھا کہ مسلمانوں کو
پریشان کیا جائے تاکہ بھاگ دوڑ میں وہ اپنے گھروں سے کم سامان
نکال سکیں۔ چنانچہ اس اعلان کا نتیجہ یہی ہوا کہ بمشکل لوگ اپنے بچوں
کو لے کر بمشکل دور پولیس لائن پر وقت مقررہ پہنچ سکے۔

... مہاجرین کا پہلا قافلہ ۵ نومبر ۱۹۴۷ء ۲ بجے دوپہر
پولیس لائن سے روانہ ہوا۔ لاریوں کی کل تعداد چالیس کے قریب
تھی اور اس قافلہ کے کل افراد ۳ ہزار تھے۔ حکومت کا اعلان تھا کہ
یہ قافلہ براستہ سوچیت گڑھ پاکستان پہنچا دیا جائے گا۔ لیکن اس
کے عین برعکس یہ قافلہ سانبہ کی طرف پہنچا دیا گیا۔ جہاں ایک حصہ
روک لیا گیا اور دوسرا ماداں کی طرف پہنچا دیا گیا۔ پھر سانبہ میں اس
قافلہ کو دو حصوں میں بانٹ کر ڈوگرا انڈین فوج مسلح ہندوؤں اور
سکھوں نے ان پر چھاپے شروع کر دیے اور بمشکل چار سو
کے قریب جان بچا کر پاکستان پہنچ سکے۔ ظالم ہندوؤں نے اور
وحشی ڈوگروں نے کئی نوجوان باعصمت عورتوں کو اغوا کر لیا اور
تمام سامان لوٹ لیا۔

دوسرے قافلے کو روانگی کا وقت ۶ نومبر جمعرات کو ملا۔
اس قافلہ کو بھی راستہ میں بھٹکا کر ستواری اور بشناہ کے درمیان
ٹھکانے لگا دیا گیا اور ڈوگرہ فوج اور سنگھ پارٹی اور سکھوں اور
دوسرے اچھوتوں نے وہ مظالم ڈھائے کہ الامان۔ اس قافلہ میں
دو ہزار کے قریب مرد، عورتیں اور بچے تھے۔ جن میں بمشکل ایک
سو کے قریب موت کے چنگل سے نجات پا سکے۔ اس جگہ تین
سو کے قریب لڑکیاں ڈوگروں اور دوسرے ہندوؤں نے
اغوا کر لیں۔

"کشمیر ٹائمز" کے ایڈیٹر مسٹر جی۔ کے ریڈی نے کشمیر سے پاکستان کی شمولیت کا مطالبہ کیا تو انھیں زیرِ حراست کر لیا گیا۔ انھوں نے اپنی آنکھوں سے جموں میں مسلمانوں کی تباہی کا المناک مشاہدہ کیا، ان کی زبانی سنیے۔

گزشتہ دس دنوں میں ریاست کشمیر کے صوبہ جموں میں تین ہزار بے گناہ مسلمان موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ جموں کے تمام دیہات سے مسلمانوں کو بے دخل اور فنا کرنے کے لیے ایک باقاعدہ منظم پروگرام پر عمل کیا گیا۔ ہزاروں کی تعداد میں مسلمان عورت، مرد اور بچے جبراً اپنے گھروں سے نکال لے جا کر چھوٹے چھوٹے گروہوں میں توڑے اور پھر جا کر چپ چاپ انتہائی بربریت کے ساتھ قتل کیے گئے۔ ان کے دیہات جلا کر خاک کیے گئے۔ ان کی جائدادیں لوٹی جا رہی ہیں اور ان کی فصلیں یا تو تلف کر دی گئیں یا وحشی ڈوگروں کے ہتھے چڑھ گئیں۔ ظلم و تشدد کا یہ بحران اور جنون بے رحمیت اور وسعت میں اپنی مثال نہیں رکھتا۔ اور مشرقی پنجاب کا قتل عام بھی اس کے سامنے ماند پڑ گیا۔

مسلمانوں کے اس قتل عظیم کے پس پشت ڈوگرا فوج، راشٹریہ سیوا سنگھ، راجپوتوں کے ہجوم اور ہندو سکھ سرکاری افسران تھے۔ راشٹریہ سیوا سنگھ کے خفیہ ایجنٹوں کی مدد سے، جو امرتسر اور دہلی سے بھیجے گئے تھے۔ ڈوگرا فوج اور با اثر راجپوتوں نے مفصل خاکے تیار کیے ہوئے تھے کہ جموں سے مسلمانوں کو پاک کر کے اس صوبہ کو ہندوؤں کے لیے دار الامان بنا دیا جائے۔ ابتدائی پروگرام یہ تھا کہ چند مسلمانوں کو قتل کر کے باقی مسلمانوں میں خوف و ہراس پیدا کر دیا جائے تاکہ وہ اپنے آپ پاکستان کا رُخ کر لیں۔ لیکن ڈوگرا جاگیرداروں نے جو ریاست کے شہری اور فوجی نظم و نسق پر قابض ہیں۔ غالباً یہ محسوس کیا کہ مسلمانوں کی عام ہجرت سے پاکستان کے تمام مسلمانوں کے قلوب میں نفرت کی لہر دوڑ جائے گی اور حکومت پاکستان بھی مشتعل ہو جائے گی جس سے بہت ناخوشگوار نتائج پیدا ہونے کا اندیشہ ہوگا۔ اس لیے یہ فیصلہ کیا گیا کہ جہاں تک ممکن ہو سکے بے گناہ اور نہتے مسلمانوں کو ان کے گھروں میں ہی تہ تیغ کر دیا جائے۔

فتنہ انگیز پروپیگنڈا کی ایک ہذیانی مہم کے ذریعے راجپوت ہجوموں کو اشتعال دلا کر مسلمانوں پر لوٹ پڑنے کے لیے تیار کیا گیا۔ تمام تر دیہات میں راشٹریہ سیوک سنگھ کے کارکنوں اور ڈوگرا فوجیوں نے یہ افواہیں پھیلانی شروع کیں کہ پاکستانی حکومت عنقریب جموں و کشمیر ریاست پر حملہ کرنے والی ہے۔ کہ پٹھانوں اور بلوچوں کے خون آشام گروہ ریاست کی بالخصوص جموں کی سرحدوں پر جمع کر دیے گئے ہیں اور اشارہ پاتے ہی وہ ریاستی سرحدوں میں داخل ہو کر ڈوگروں کے وطن کو تاخت و تاراج کرنا شروع کر دیں گے۔ ان کے دیہات اور مکانات کو جلا کر لوٹنا شروع کر دیں گے اور ان کے عزیز و اقارب کو تہ تیغ کر کے ان کی عورتوں کو بھگا لے جائیں گے۔ سیدھے سادے جاہل ڈوگروں کو للکارا گیا کہ وہ کاہلی اور لاپروائی کا چولا اتار کر اپنی جان و مال اور آبرو کو بچانے کے لیے تیار ہو جائیں۔ اسی طرح پاکستان اور مسلمانوں کے خلاف نفرت اور حقارت کے جذبہ کو عروج پر پہنچا کر ڈوگروں کو انگیخت کیا گیا کہ وہ مسلمان پانچویں کالم کو جو جموں میں آباد ہیں ختم کر دیں۔ قبل اس کے کہ انھیں دو محاذوں پر لڑنے کے لیے مجبور کیا جائے۔ چنانچہ اس طریقہ سے ڈوگرا راجپوتوں کے فرقہ وارانہ جنون کو ہوا دے کر انھیں مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے کی مہم کے لیے تیار کر دیا گیا۔

لیکن بریگیڈیئر خدا بخش کی موجودگی جو جموں ایریا کی تمام فوجوں کے کمانڈر تھے، ان شیطانی عزائم کو عملی جامہ پہنانے کی راہ میں مزاحم تھی۔ چنانچہ ڈوگرا جماعت کے اونچے حلقوں میں سازش کا جال بچھایا گیا اور اُن کے خلاف ایک جھوٹا الزام تراشا گیا کہ وہ پاکستان سے خفیہ ساز باز کر رہے ہیں۔ اور پاکستان کو فوجی معلومات بہم پہنچا کر پاکستانی فوج کے حملہ کے لیے راستہ صاف کر رہے ہیں۔ چنانچہ انھیں فوراً برخاست کیا گیا۔ اور کٹر منہ زور ڈوگرے جو مسلمان دشمنی میں رسوائے زمانہ ہیں کھلے چھوڑ دیے گئے تاکہ مسلمانوں کے خون کو ارزاں کر دیں اور تمام مسلم آبادی کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کر دیں۔ بعض ہندو اخبار بھی اس سازش میں شریک کر لیے گئے اور انھوں نے ہر طریقہ سے ڈوگرہ تعصب اور جنون کو مشتعل کرنے کے لیے شب و روز پروپیگنڈا کرنا شروع کیا۔ جموں کے ایک اخبار نے لکھا کہ ہر ایک ڈوگرہ کم از کم دو سو مسلمانوں

کو مار دیا جاتا ہے۔

ماہ اکتوبر کے وسط میں پلہ پلٹ دیا گیا۔ امن و ضبط کے قیام کی آڑ میں تمام علاقوں میں ڈوگرہ فوج پھیلا دی گئی۔ ڈوگرہ سپاہیوں نے راشٹریہ سیوک سنگھ کے آدمیوں کے ساتھ مل کر دیہاتیوں کو اکٹھا کیا اور مفصل ہدایات دیں کہ کب کس جگہ اور کس طریقہ پر مسلمانوں پر حملہ کر کے انھیں ختم کرنا ہوگا۔ جموں کی پولیس میں بیشتر مسلمان تھے ایک ہی رات میں بے دردی سے نہتا کر دی گئی اور جن سپاہیوں نے ہتھیار رکھنے سے انکار کیا انھیں گولی کا نشانہ بنا دیا گیا۔ اس طریقہ سے صوبہ جموں میں تمام ان ناخواستہ عناصر کو راستے سے ہٹا دیا گیا جن سے ڈوگروں اور سیوا سنگھیوں کے بہیمانہ عزائم میں مزاحمت کا اندیشہ ہو سکتا تھا۔

اچانک ایک دن جموں کے شہریوں نے صبح اٹھ کر دیکھا کہ جموں کے اطراف میں کئی دیہات سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے ہیں۔ تھوڑی دیر میں مسلمان پناہ گزینوں کے قافلے پیادہ وہاں سے شہر جموں میں داخل ہونے لگے۔ اور قتل عام، آتشزدگی، لوٹ مار اور ظلم و تشدد کی داستانیں سنانے لگے۔ فوج نے انھیں شہر میں داخل ہونے سے روک دیا۔ اور توی پل کو جو جموں کو دیہات سے ملاتا تھا بند کر دیا گیا۔ مسلم پناہ گزین، جو اس رات ڈوگرہ غنڈوں کے ہاتھوں قتل سے بچے تھے۔ پاکستان پہنچنا چاہتے تھے لیکن فوج نے انھیں سرحد پار کرنے سے روک دیا۔ ہر جگہ پناہ گزینوں کو منتشر کر کے چھوٹے چھوٹے گروہوں میں سمیٹ دیا گیا اور دور افتادہ مقامات پر پہنچا دیا گیا۔ جہاں انھیں یا تو گولیوں کا نشانہ بنا دیا گیا یا فوج اور ڈوگرا جتھوں نے کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ ۱۹/۱۸، اور ۲۰/۱۹ کی شب کو بہت سے مسلم دیہات نذر آتش کر دیے گئے۔ جموں سے آئی ہوئی اطلاعات سے پتا چلا کہ مقتولین کی لاشوں کو غیر آباد مکانوں میں ڈھیر کر کے جلا دیا گیا۔ تاکہ ان کا کوئی نشان نہ مل جائے۔

۱۸ اکتوبر کو جموں سے باہر بارہ ہزار پناہ گزین پریڈ گراؤنڈ میں جمع ہو گئے تھے۔ انھوں نے حکام سے گڑگڑا کر کہا کہ یا تو انھیں جموں پناہ لینے کی اجازت دی جائے یا سیالکوٹ کی سڑک پر سے ریاست سے باہر نکلنے دیا جائے۔ حکام نے انھیں اسی جگہ چار دن تک آب و دانہ سے محروم روکے رکھا ان میں سے کئی زخمی بھی تھے۔ اسی حالت میں وہاں کئی بچے بھی پیدا ہوئے۔ جموں کے کئی مسلمانوں نے اس حالت زار کا پتا پاکر حکام سے درخواست کی کہ پناہ گزینوں کو خوراک اور طبی امداد پہنچانے کی اجازت دی جائے لیکن ڈوگرا فوجی حکام نے اجازت نہیں دی۔ ان چار راتوں میں اس طرف سے متواتر گولیوں کی آوازیں آتی رہیں اور ہر گولی کے ساتھ ترساں و ہراساں لوگوں کی چیخیں آدھی رات کے سناٹے کو چیرتی ہوئی شہر تک پہنچتی تھیں۔ کسی کو علم نہیں کہ اس بدقسمت جم غفیر کا کیا حشر ہوا۔ ان میں سے کتنے گولی کا نشانہ بنے، کتنوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر پھینک دیا گیا اور عورتوں کا کیا انجام ہوا۔ لیکن اس المناک حادثہ کا اندازہ جموں کے شہریوں نے گدھوں کی تعداد سے لگایا جو بڑے بڑے جھنڈوں میں اس علاقے پر اڑتے رہے۔

ڈوگرا شیطنت متواتر ایک ہفتہ تک اس وحشیانہ طریقہ سے بے روک ٹوک جاری رہی۔ ہر طرف جدال و قتال کا بازار گرم تھا۔ اور یکے بعد دیگرے تمام دیہات نذر آتش کیے جاتے رہے۔ جموں کے لوگ اس خونریزی اور بربادی کی وسعت کا صحیح اندازہ لگانے کے قابل نہیں تھے۔ تاہم خفیہ طریقوں سے بعض لوگ اپنی جانوں پر کھیل کر رات کے وقت توی کے پل کو عبور کر کے شہر میں داخل ہوئے اور حالات کی خبر دیتے رہے۔ جموں شہر کی مسلم آبادی خوف کے مارے سمٹ کر ایک ہی محلہ میں آ گئی اور ایک ایک گھڑی گن گن کر گزارنے لگی۔ کیونکہ ہر دم انھیں یہی ڈر تھا کہ ڈوگرا فوج اور مسلح غنڈے ٹوٹ پڑیں گے اور انھیں ختم کر دیں گے۔ خوش قسمتی سے ۱۹ اکتوبر کو ان پر کوئی مصیبت نازل نہیں ہوئی۔ اسی دن مہاراجہ اپنے وزیراعظم کے ہمراہ جموں پہنچ گئے۔ مسلمانوں کے ایک وفد نے مہاراجہ سے ملنا چاہا۔ تاکہ یا تو ان کی حفاظت کی ضمانت دی جائے یا انھیں ریاست سے باہر نکل جانے کا موقع دیا جائے۔ وزیراعظم نے دو دن تک ان کی درخواست کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اور اس کے بعد ایک مبہم سا اور خشک سا جواب کہلا بھیجا کہ حکومت اپنی ذمہ داریوں سے باخبر ہے۔

اس ہفتہ میں کم از کم بیس ہزار مسلمان موت کے گھاٹ اتارے

گئے۔ دیہاتی علاقہ میں ایک بھی مسلمان گھر ایسا نہیں تھا جو لوٹ یا آتشزدگی سے محفوظ رہا ہو۔ مویشی تیرا چھین لیے گئے۔ اور زمینیں غصب کر لی گئیں۔ زنا اور اغوا کی بے شمار خبریں موصول ہوئی ہیں۔ جہانگیر دان کے وزیراعظم نے یا اعتماد ڈوگرا فوجی افسروں کی معیت میں فساد زدہ علاقہ کا دورہ کیا۔ مگر قاتلوں کو کیفر کردار پر پہنچانے کی بجائے ان کی پیٹھ ٹھونکی گئی۔ راکفل گولہ بارود اور دوسرے مہلک اسلحہ سے لدی ہوئی لاریاں علاقوں کا گشت لگاتی رہیں اور مہاراجہ نے رواجیہ ہاتھوں سے دیہاتی رضاکاروں میں اسلحہ تقسیم کیے اور ان کی بہادری اور دلیش بھگتی پر انھیں شاباش دی مہاراجہ نے کئی بڑے بڑے مسلح ہجوموں میں تقریریں کیں اور انھیں یقین دلایا کہ ہندو سٹیٹ ریاست پر ظلم ڈھانے والے بہت جلد ختم ہونے والے ہیں۔ جموں میں ۵ نومبر کو اسٹیٹ کے ۔۔۔ کا ایک گروہ مہاراجہ کے وزیراعظم کا استقبال کرنے کے لیے جمع ہوا تھا۔ تمام مقامی افسران وہاں موجود تھے اور لوگ اپنے تمام اسلحہ سے لیس ہو کر نمائش کے لیے اکٹھے ہوئے تھے۔ اس جلسے سے پاکستان کی سرحد صرف تین چار میل ہے۔ اس ہجوم کو تین قطاروں میں صف آرا ہونے کا حکم دیا گیا۔ پہلی قطار میں وہ لوگ تھے جن کے پاس رائفلیں تھیں۔ دوسری قطار میں مہلک ہتھیاروں والے اور تیسری قطار میں لاٹھی بردار بیت بستہ کھڑے تھے۔ اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس، وزیر زراعت، اسسٹنٹ انجینئر شیخ، سیدین امر داس اور کئی دیگر فوجی اور شہری افسران ڈیوٹی پر موجود مہاراجہ کی آمد کے منتظر تھے۔ بدقسمتی سے عین اسی وقت مسلم پناہ گزینوں کا ایک قافلہ دیہاتی علاقہ میں سے نکل کر پاکستان کی طرف جاتا ہوا نظر آیا۔ فوج نے ان کو ایک لمبی قطار بنانے کا حکم دیا۔ دس ہزار مسلمانوں پر مشتمل اس قافلہ کو اس مسلح ہجوم کے سامنے سے گزرنے پر مجبور کیا گیا۔ جب یہ طویل قافلہ مسلح ہجوم، فوج اور شہری حکام کے سامنے پہنچا تو افسران نے چلا کر کہا انھیں پاکستان بھیج دو۔ ڈوگرا سپاہی اور مسلح غنڈے جنگی نعرے لگاتے اور مہاراجہ بہادر کی جے کے نعرے لگاتے ہوئے ان پر ٹوٹ پڑے اور انتہائی بے دردی سے ان بے گناہ انسانوں کو ذبح کر کے رکھ دیا۔ سیکڑوں آدمی گولی کا نشانہ بن گئے۔ اور سیکڑوں جو کلہاڑیوں، نیزوں اور دوسرے مہلک ہتھیاروں سے نشانہ ستم بنائے گئے۔ اس افراتفری میں سیکڑوں آدمی خوف و ہراس سے بے تحاشا ادھر ادھر بھاگنے لگے مارے ڈر کے۔ ان کا تعاقب کر کے اپنی رائفلوں اور بندوقوں سے ان کا شکار کھیلتے رہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے تمام زمین بے گناہوں کے خون سے لالہ زار ہو گئی اور چاروں طرف لاشوں اور اعضائے انسانی کے ڈھیر نظر آنے لگے۔ یہ نظارہ انتہائی دہشت انگیز تھا۔ اس واقعہ کے ایک دن بعد مہاراجہ اور وزیراعظم موقع پر پہنچ گئے۔ اور حسب دستور سابق استقبال کی رسومات ادا کی گئیں اور قاتلوں کی پیٹھ ٹھونکی گئی۔ وہاں بھی مہاراجہ نے بہت سے آدمیوں کو اسلحہ اور گولہ بارود تقسیم کیا اور ان سے عہد لیا کہ مزید کہ اس حصہ کی حفاظت کی ذمہ داری ان کے کندھوں پر ہوگی۔

اس طریقہ سے جموں کی مسلم آبادی کا باقاعدہ استیصال کیا گیا مہاراجہ کے دورہ کے بعد ہر مکانات نذر آتش کیے گئے کہ مکانات اور زمینیں آبادی کی باقی نہ رہیں اور کوئی واپس آ کر دعویٰ دار نہ بن جائے۔ ڈوگروں نے اس دن کے ساتھ مسلمانوں کے خلاف جنگ لڑی ہے۔ ڈوگرہ سپاہیوں اور سید راشٹریہ سیوک سنگھ کے رضاکاروں نے جتھے منظم کیے افسران کے ساتھ قریہ بہ قریہ دورے کر کے ڈوگرہ راجپوت غنڈوں کو مدد دیتے رہے تھے اور انھیں مشورے دیتے رہے تھے کہ مسلمانوں کو ختم کر کے ان کی لاشیں اس طرح غائب کی جائیں کہ ان کا نام و نشان باقی نہ رہے۔

جو لوگ اکھنور اور جموں سے پاکستان ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے وہ اپنے اہل و عیال سمیت ایک جگہ جمع ہوئے۔ مقابلہ کی ٹھانی لیکن زبانہ سے مسلمان آئے اور انھوں نے لنڈی کے لوگوں کو بتایا کہ زبانہ میں خود مہاراجہ نمائندہ ہے۔ اب ہم نہتے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ چنانچہ انھوں نے ہجرت کا ارادہ کیا۔ دیکھتے دیکھتے مسلمانوں کے سامنے ان کے بھرے ہوئے گھروں کو جلا دیا گیا، ان سے مستورات چھین لی گئیں اور عورتوں، بچوں، نوجوانوں، بوڑھوں کی لاشوں سے دریائے چناب کا پانی سرخ ہو گیا۔ راجہ نے یہ اعلان کیا تھا کہ جو مسلمان پاکستان جانا چاہتے ہیں وہ تیار رہیں۔ انھیں صرف ایک صندوق اور ایک بستر ہمراہ لینے کی اجازت ہوگی۔ انھیں ہدایت کی گئی کہ

جب لاریاں انھیں لینے کے لیے آئیں تو وہ اس میں بیٹھ کر پاکستان چلے جائیں۔ چنانچہ اس حکم کے مطابق سب ان لاریوں پر سوار ہو گئے جب لاریاں ستوار سے سانبہ کی طرف مڑیں تو چوہدری غلام مصطفیٰ نے ڈرائیور سے کہا کہ تم تو سانبہ کی طرف جا رہے ہو۔ ڈرائیور نے مونچھوں پر تاؤ دیا اور کہا کہ چوہدری صاحب آپ خاموشی سے بیٹھے رہو [illegible] ہم تجھے [illegible] گے جہاں آپ کو جانا ہوگا۔ جب یہ لاریاں [illegible] پہنچیں تو دشمنوں نے [illegible] سپاہیوں کو حکم ہوا کہ تمام لوگ لاریوں سے نیچے اتر آئیں۔ چنانچہ تمام مسلمان نیچے اتر کر زمین پر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد جموں کی طرف سے ایک جیپ کار آئی۔ ہندوستانی فوج کا ایک افسر جیپ سے نیچے اتر کر کہنے لگا کہ اس قافلہ میں جو نوجوان مستورات ہیں ان کو [illegible] سپاہیوں کے لیے چھانٹ [illegible] لو۔ اللہ اکبر [illegible] ہماری بہو بیٹیاں [illegible] جا رہی تھیں۔ ایک لڑکی کی چھاتی سے تین ماہ کا معصوم بچہ چمٹا ہوا تھا۔ ایک سکھ [illegible] سپاہی اس کی طرف بڑھا۔ ماں نے بچے کی [illegible] پر رحم مانگا [illegible] کی مدد کو پکارا۔ وحشیوں نے بچے کو [illegible] سے کھینچا اور اوپر سے گھما کر زمین پر دے مارا۔ اس کے بعد اس عورت کی طرف [illegible] اور [illegible] سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ اس کے بعد [illegible] ہو کر گر پڑی اور سکھ نے [illegible] کر دیا۔ [illegible] دیا اور [illegible] کہا کہ [illegible] زندہ ہیں۔

[illegible]

میں [illegible] شہر کا باشندہ ہوں۔ [illegible] راجپوتوں کا ایک بڑا مرکز ہے۔ [illegible] سے چند روز پیشتر قصبہ کے مسلمانوں میں بڑی بے چینی پھیل گئی اور [illegible] سخت ہراساں نظر آتا تھا کیونکہ ان پر سر بازار آوازے کسے جاتے تھے۔ اور اکا دکا قتل بھی عام ہو چکے تھے۔ سب سے بڑی اور فوری توجہ جو گھبراہٹ کا باعث ہوئی [illegible] مہر چند مہاجن کا وزارت عظمیٰ کا سنبھالنا تھا۔ [illegible] دونوں کا اندازہ تھا کہ یہ تقرر کشمیر کے انڈین یونین [illegible] کا پیش خیمہ ہے۔ اسی دن سے سیوا سنگھ پارٹی نے اس قصبہ میں اعلانیہ طور پر [illegible] نمائش شروع کر دی۔ اور قصبہ کے کو چہ [illegible] مسلح ہو کر مارچ شروع کر دی۔ مسلمان بالکل سہم گئے [illegible]

[illegible] کے پاس اس بلا وجہ نمائش کی شکایت کی گئی تو انھوں نے تسلی آمیز الفاظ میں کہا کہ یہ سب محض پاکستانی حملوں کا تدارک کرنے کے لیے تیاریاں ہو رہی ہیں تم یہاں کے باشندے ہو تمہیں تو فکر نہیں کرنا چاہیے۔ جاؤ اطمینان سے اپنا کاروبار کرو۔

ایک دن جب میں نے حالات [illegible] دیکھے تو میں [illegible] اور میرے ہمسفر [illegible] پھر اور ایک [illegible] راستہ میں [illegible] پارٹی کا جال بچھا ہوا تھا۔ ہم نے رات کے وقت ایک گاؤں میں ایک مدرس کے ہاں ٹھہرنے کا ارادہ کیا۔ اس گاؤں کا نام [illegible] ہے اور جموں روڈ سانبہ سے دس میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔

جوں ہی ہم نماز مغرب سے فارغ ہوئے [illegible] روشنی دکھائی دی۔ معلوم ہوا کہ کسی گاؤں کو آگ لگائی گئی ہے [illegible] ہی نعروں کی آوازیں آنے لگیں [illegible] گاؤں کے [illegible] معلوم ہو [illegible] راجپوت [illegible] کے لیے [illegible] اور ان سے [illegible] کا خوف زدہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں لیکن جونہی [illegible] نزدیک پہنچے مسلمانوں [illegible] چنانچہ ہم بھی ان کے ساتھ [illegible] کھیتوں میں جا کر [illegible] گئے۔ ابھی ہم بیٹھے ہی تھے کہ [illegible] گاؤں [illegible] شروع [illegible] میرے ہمسفر [illegible] وہاں سے [illegible] اور ایک [illegible] کے [illegible] ہم اس [illegible] کی جانب [illegible] تھے اور [illegible] بند ہو [illegible] وقت [illegible] اور ہم [illegible] دوسرے روز [illegible] ہم جموں [illegible] پہنچ گئے۔ وہاں پر بظاہر [illegible] تھا جو اکثر ایک بڑے طوفان کے آنے سے پہلے ہوا کرتا ہے۔ [illegible] تھا کہ بچوں اور والدین کو ہمراہ لے کر سیالکوٹ چلا جاؤں لیکن پتہ چلا کہ سرحد بالکل بند ہو چکی ہے۔ لہذا پاسپورٹ نہیں مل سکتا۔ [illegible] نتیجہ [illegible] جانے کی جسارت کی راستے میں قتل ہو گئے

[illegible] سانبہ [illegible] کہ تمام [illegible] سانبہ [illegible] کے مسلمانوں کا صفایا کر دیا گیا۔

دیہات جلا کر خاکستر بنا دیے گئے۔ ان گاؤں سے جو دیہاتی اور [illegible] بھاگ کر آنے میں کامیاب ہوئے، وہ ستواری چھاؤنی میں جمع ہو گئے۔ ان کی تعداد چالیس پچاس ہزار کے قریب تھی۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ یہ تمام کارروائی غنڈوں اور سیوا سنگھ پارٹی کی ہے۔ لہٰذا انھوں نے ملٹری چھاؤنی میں جمع ہونا محفوظ خیال کیا۔ ان غریبوں کو کیا معلوم تھا کہ یہ سب تباہی مہاراجہ کے اپنے پروگرام اور اشارے سے انجام پا رہی ہے۔ چنانچہ ان کی خوش فہمی جلد ہی رفع ہو گئی جب [illegible] نے ان کے چاروں طرف ملٹری پھیلا دی۔ ان کا مال و [illegible] اور [illegible] چھین لی گئیں اور دوسرے ہی دن انھیں ٹولیوں [illegible] پاکستان کی حدود [illegible] ہو سکے۔

جموں شہر کی ناکہ بندی [illegible] کوئی خبر لوگوں [illegible] نوجوان مسلمان [illegible] شہر کے [illegible] اپنے دفاع کو [illegible] بنانے کی غرض سے ایک دو محلوں میں جمع ہو گئے تھے۔ سنگھ پارٹی کے [illegible] زور شور سے شروع ہو گئے۔ ان کے حملے ملٹری کی گولیوں کی [illegible] میں [illegible] چنانچہ [illegible] گھروں پر اچانک حملہ ہوتا ان [illegible] کو [illegible] وہ بھاگ جاتے۔ ایک دن [illegible] شہید کر دیے گئے [illegible] اس حقیقت کی [illegible] ملٹری کی بدولت ظالموں کی شرارت [illegible] ہو گئے [illegible] بہت سے ہندو اور سکھ اس ترکیب [illegible] تھے اور [illegible] صاف [illegible] تھے۔

[illegible] مسلمان اپنے نیزوں بھالوں [illegible] نعرہ تکبیر بلند کرتے۔ اللہ اکبر کی باطل شکن صدا [illegible] آتے ہی [illegible] سے کفار بھاگ گئے۔ گویا ایٹم بم کا دھماکا ہوا چاہتے ہیں۔ مسلمانوں کے پاس یہی سب سے بڑا ہتھیار تھا۔

ان ایام میں آزاد کشمیر کے مجاہدین کی خبریں ریڈیو پر نشر ہوتی تھیں۔ چنانچہ جموں میں [illegible] مجاہدین [illegible] علاقوں [illegible] بارہ [illegible] جاتا اور وہ اپنی مسلمان رعایا ہی کو [illegible] سے [illegible] کرنے کی [illegible] اور [illegible] ہندوؤں اور

سکھوں میں ہتھیار تقسیم کرتا۔ کوئی مسلمان شہر سے باہر نہیں جا سکتا تھا اور نہ کوئی باہر سے شہر میں داخل ہو سکتا تھا جس کسی نے ایسی جسارت کی گولی کا نشانہ بنا دیا گیا۔ اکثر مسلمان اس کوشش میں ڈوگرا فوج کی گولیوں کا شکار ہو گئے۔ حالانکہ وہ رات کے اندھیرے میں پیٹ کے بل رینگ رینگ کر چلے۔ اس پر طرہ یہ کہ مسلمانوں پر راشن پانی اور بجلی بھی بند کر دی گئی۔ یہاں تک کہ خاکروبوں کو بھی مسلمان محلوں میں صفائی کرنے سے روک دیا گیا۔ غلاظت کے ڈھیر لگ گئے اور مسلمان خود اپنی نالیاں صاف کرنے پر مجبور ہو گئے۔ میں نے بچشم خود گزیٹڈ افسروں کو ایسا کرتے دیکھا۔

۲۸ اکتوبر کو مسلمان ملٹری اور پولیس سے ہتھیار لے لیے گئے اور راجہ صاحب کا ایک اعلان پڑھ کر سنایا گیا جو یہ تھا کہ مسلمان اجتماعی طور پر سب سے [illegible] ہیں۔ انھوں نے حکومت کا [illegible] کیا۔ اگر وہ وفاداری کا ثبوت دینا چاہتے ہیں تو تمام ہتھیار خواہ وہ لائسنس والے ہی کیوں نہ ہوں، جمع کروا دیے جائیں [illegible] قائم کر دے گی۔ نیز اگر کسی کے پاس سے ہتھیار برآمد ہوا تو وہ موت کی سزا کا مستوجب ہوگا۔ مسلمانوں نے دوسرے ہی دن ایک عام اجلاس بلایا [illegible] میں مہاراجہ کو وفاداری کا پورا پورا یقین دلایا گیا اور تمام جائز چیزیں [illegible] حکومت [illegible] ملٹری اور [illegible] پارٹی کی طرف [illegible] بند رہی۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ دراصل اس وقت حکومت کے پاس گولہ بارود ختم ہو گیا تھا۔ اور کسی نہ کسی حیلہ بہانہ سے چند دنوں کے لیے [illegible] کرنا چاہتے تھے کیونکہ جب تک ان کا سامان نہ آ جاتا کوئی کارروائی نہ کر سکتے تھے۔

۴ نومبر ۱۹۴۷ء کو پٹیالہ اور [illegible] رجمنٹ معہ اسلحہ اور فوج وارد ہوئے۔ مہاراجہ کے ساتھ بات چیت ہوئی اور مسلمانان جموں کے متعلق بھی فیصلہ طے پا گیا۔ وہ کیا تھا؟ اسی شام کیپٹن نصیر الدین کو، جو ایک نہایت مخلص [illegible] میں بلا کر کہا کہ مسلمانان جموں یہاں کسی صورت نہیں رہ سکتے۔ انھیں پاکستان جانے کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔

۵ نومبر ۱۹۴۷ء کو تمام مسلمان پولیس لائن کے میدان میں جمع کیے گئے۔ داخل ہوتے وقت ان کی جامہ تلاشی بھی لی گئی۔ بارہ

نکلتے ہی سکھوں نے حملہ کر دیا جوان لڑکیوں کو اٹھا کر لے گئے اور باقی تمام افراد کو قتل کر دیا گیا۔ راستے میں کوئی نہ بچ سکا۔ بدھی اور تاونی مولا سے تقریباً تین ہزار مسلمانوں کا قافلہ روانہ ہوا۔ ماہی چک پہنچنے پر ان پر حملہ کر دیا گیا اور ان میں سے صرف سات آدمی بچ کر پاکستان میں داخل ہو سکے۔ حملہ آوروں نے نمبل اور برین گنوں سے حملہ کیا جوان عورتوں کو اٹھا کر لے گئے۔

نگرتی، ڈینگا، رتب اور چھنہ وغیرہ دیہات کے تقریباً ۶ ہزار مسلمانوں کا قافلہ پاکستان کی طرف روانہ ہوا اور جب دیگھکیاں کے مقام پر پہنچا تو ملٹری نے ان سے نقدی اور زیور وغیرہ تمام چھین کر بگل بجا دیا جس پر حملہ آوروں نے حملہ شروع کر دیا۔ ملٹری نے بھی فائرنگ کی۔ اس قافلہ سے تیس مسلمان بچ کر پاکستان پہنچ سکے۔

موضع سلنتی، میرانگر، چانڈی وغیرہ دیہات کے مسلمان میرا نگر میں جمع ہو کر قافلہ کی صورت میں پاکستان روانہ ہوئے۔ یہ قافلہ آٹھ ہزار افراد پر مشتمل تھا۔ میرا نگر سے نکلتے ہی ان کو ملٹری نے روک لیا اور کہا کہ ان کو بحفاظت پاکستان میں پہنچا دیا جائے گا۔ بشرطیکہ زیورات اور نقدی انھیں دے دی جائے۔ مسلمانوں نے یہ شرط مان لی اور نقدی اور زیورات وغیرہ سب دے دیا۔ جب قافلہ یہاں سے روانہ ہو کر چھٹی گھوئی پہنچا تو ملٹری والوں نے ایک فائر کیا اس کے ساتھ ہی سنگ والوں نے حملہ کر دیا جو پہلے ہی سے چھپے بیٹھے تھے۔ حملہ آوروں کے پاس رائفلیں، ایک برین گن، لاتعداد تلواریں اور برچھے اور بم تھے حملہ صبح سے شام کے پانچ بجے تک جاری رہا۔ اس قافلہ میں سے صرف دو ہزار مسلمان بچ کر پاکستان پہنچ سکے جن میں زیادہ تعداد زخمیوں کی تھی۔

راجپورہ اور گگوال سے تقریباً دو ہزار مسلمانوں کا قافلہ روانہ ہوا۔ جن میں سے صرف ایک سو بچ کر پاکستان میں داخل ہوئے۔ سانبہ میں گرد و نواح کے تمام مسلمان جمع ہو گئے جن کی تعداد دس ہزار کے قریب تھی۔ اس طرح تو خونخوار درندوں نے مسلمانوں کی حفاظت کے بجائے ان کے گاؤں کا محاصرہ کر لیا۔ اس کے بعد مردوں کو شہر کے تالاب پر جمع کیا تاکہ امن کمیٹی بنائی جائے۔ مسلمان مردوں کو نکالنے کے بعد جوان لڑکیوں کو اغوا کیا گیا۔ اور ضعیف العمر عورتوں کو قتل کیا گیا۔ دوسری طرف مسلمان مردوں کو تالاب پر جمع کر کے ملٹری اور سنگ والوں نے حملہ کر دیا۔ اس حملہ میں سے صرف ۴۰ مسلمان بچ کر پاکستان میں داخل ہو سکے۔ دنیا کا کتنا ہولناک قتل عام تھا۔

شیخ عبداللہ نے ۱۲ نومبر کو ایک بیان میں یہ تسلیم کیا کہ صوبہ جموں کے حالات خوشگوار نہیں لیکن انھوں نے پاکستان پر یہ الزام عاید کیا کہ چونکہ ریاست کی حدود مغربی پنجاب سے ملتی ہیں اس لیے جو کچھ وہاں ہوا یہ اس کا ردِ عمل تھا۔

تحصیل کوٹلی ضلع میرپور ریاست جموں و کشمیر راولپنڈی سے بجانب مشرق ۴۰ میل کے فاصلہ پر ہے۔ اس تحصیل کی مجموعی آبادی ۱۱۳۰۰۰ ہے۔ ایک لاکھ زراعت پیشہ مسلمان اور تیرہ ہزار ہندو سکھ وغیرہ آباد تھے۔ تقریباً دو سال سے ڈوگرہ حکومت نے ان مسلمانوں کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے لیے ایک طرف اہل ہنود کو راشٹریہ سنگھ پارٹی کے نام پر مسلح کرنے میں ہر ممکن امداد کی۔ دوسری طرف تحصیل بھر میں ہندو ظالم اور راشی افسران تعینات مقرر کیے۔ مسلمانوں کا عرصہ حیات تنگ کرنے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی۔ تحصیل بھر میں نام کا بھی ایک مسلمان افسر یا ملازم نہ رہنے دیا۔ کھلے بندوں رشوت اور مقدمہ بازی کرا کر تباہ کرنے کے دن رات منصوبے جاری کرائے گئے۔ تحصیل کے ملحقہ دریائے جہلم کی ہر گزرگاہ پر بالخصوص کوٹلی کے علاوہ دوسرے تین مقامات پر بالخصوص ڈوگرا و گورکھا ملٹری کے مستقل کیمپ لگا کر مسلمانوں کو گولیوں سے ڈرانے کے سامان شروع کر دیے۔ پہلے ضلع راولپنڈی کے فسادات میں علاقہ راولپنڈی کے ملحقہ مسلمانانِ ریاست کو اعانت کا مجرم گردان کر ملٹری اور پولیس کے ذریعے سیکڑوں مسلمان کو ماخوذ کر کے ان کے گھر لوٹے عورتوں کی بے حرمتی کرائی تین ماہ مسلسل فوج کی لام بندی جاری رکھی۔ اور پولیس و مجسٹریٹوں کے ہاتھوں مسلمانوں کو طرح طرح کی اذیتیں دیں مگر عناد بھر سے لوٹ کھسوٹ کا ایک کوڑی کا مال برآمد ہوا اور نہ کوئی مغویہ ہندو عورت ملی۔ چہ جائیکہ ڈوگرا درندہ حکومت اس واقعہ کو مسلمانوں کی بے گناہی کا کافی ثبوت خیال کرتے شرمسار ہوتی مگر بجائے شرمسار ہونے کے حکومت نے مسلمانوں سے جبراً اپنے خرچ پر تاریں دلوانی شروع کر دیں کہ وہ حکومتِ پاکستان کی بجائے

انڈیا سے شامل ہونے کی مہاراجہ کو اپیل کرتے ہیں چنانچہ عام مسلمانوں نے دیگر تمام مظالم تو نہایت صبر و استقلال سے برداشت کیے مگر یہ چیز نہ حکومت پاکستان سے ریاستی مسلمانوں کا عدم تعاون ہے قطعی برداشت نہ کیا اور کھلے بندوں مہاراجہ سے احتجاج کرنا شروع کر دیا کہ پاکستان سے شامل ہونے کا غیر مشروط طور پر اعلان کریں یا مسلمانوں کو جن کی آبادی ۔۴ لاکھ ہے [illegible] کو پاکستان میں نقل وطن کرنے کی اجازت دی جائے [illegible] حکومت نے یہ دیا کہ اپنی ڈوگرہ [illegible] لاتعداد فوج [illegible] کو مسلمانوں کی آواز دبانے کے لیے مینڈھر کا بازار میں کھڑا کر دیا۔ تقریباً ۲۵ دن کوٹلی کے ملحق مسلمانوں پر گولیاں چلائی جاتی رہیں۔ برین گنوں سے اندھا دھند فائر کر کے ہزارہا بے گناہ مسلمانوں کو ہلاک کیا گیا۔

اس کے بعد مسلمانوں کے مکانات اور کاٹی ہوئی فصل لوٹی اور جلائی گئی۔ قصبہ بھر کے مسلمان لاکھوں روپیہ کا مال و سامان گھروں میں چھوڑ کر بھاگ گئے تھے وہ لوٹ لیا گیا۔ تو ہوائی جہازوں کے ذریعے دن میں تین بار مسلمانوں کے آباد دیہاتوں پر بمباری ہوتی رہی، راستہ چلتے مسافروں اور بھاگتے ہوئے لوگوں پر ہوائی جہاز بم برساتے رہے۔ ۲۳ نومبر کو انڈین فوج اور ٹینک اور سات سات میل تک مار کرنے والی توپوں کا خونخوار حملہ ہوا جس سے لاتعداد زن و مرد اور بچے مارے گئے، فوج کے ہمراہی ہندو اور سکھوں نے مسلمان زن و مرد اور بچوں کو مکانوں میں بند کر کے جلانا شروع کر دیا، نوجوان معصوم دوشیزاؤں کو سکھوں کے حوالے کر کے اغوا کرا لیا گیا۔ انڈین فوج اور لاتعداد ہوائی جہازوں کی بمباری سے جو کوئی بے چارہ جنگلات اور پہاڑوں میں جا چھپا اور ہزارہا مسلمان بھاگ کر ضلع جہلم اور راولپنڈی میں چلے گئے۔

لیاقت علی خاں

مسئلہ کشمیر — اور پاکستان کی کوششیں

دنیا جانتی ہے کہ ہم نے حکومت کشمیر سے بہتر مفاہمت کرنے کے لئے کس قدر مسلسل و متواتر کوشش کی ہے۔ لیکن حکومت کشمیر نے ہماری ان تمام مساعی کو نازیبا تغافل یا متردد کر دیا۔ ۲۔ اکتوبر کو میں نے وزیر اعظم کشمیر کو تجویز لکھ بھیجی کہ دونوں حکومتوں کے درمیان متنازعہ مسائل پر جن میں سامان معاہدے کے بابت سپلائی کا مسئلہ اور سرحدی حملوں کے باہمی الزامات کا سوال بھی شامل ہے۔ دونوں حکومتوں کے نمائندوں کی گفتگو ہونی چاہیئے۔ وزیر اعظم کشمیر نے جواب دیا کہ میں اس وقت بے حد مصروف ہوں اور ان معاملات پر گفتگو نہیں کر سکتا۔ تاہم میں نے اپنی حکومت کے ایک نمائندے کو کشمیر بھیجا تاکہ ریاست کے ارباب اختیار سے بات چیت کرے۔ لیکن وزیر اعظم نے اس سے بات چیت کرنے سے انکار کر دیا اور اسے واپس آنا پڑا۔ ۱۵ اکتوبر کو وزیر اعظم کشمیر کا ایک تار میرے نام آیا جس میں یہ دھمکی دی گئی تھی کہ اگر پاکستان نے غیر جانبدارانہ تحقیقات کی تجویز سے اتفاق نہ کیا تو ہم سرحد کشمیر پر پاکستانیوں کے غیر دوستانہ افعال کا مقابلہ کرنے کے لئے بیرونی امداد طلب کرنے پر مجبور ہوں گے۔ ۲۰ اکتوبر کو قائد اعظم نے حکومت کشمیر کے ایک تار کے جواب میں وزیر اعظم کشمیر کو توجہ دلائی کہ پاکستان کشمیر کے ساتھ اپنے تعلقات کو خوشگوار بنانے کی بار بار کوشش کر چکا ہے اور لکھا کہ وزیر اعظم کشمیر کراچی آ کر معاملات پر گفت و شنید کریں۔ اس استدعا کا کوئی جواب نہ دیا گیا۔ قائد اعظم نے واضح کیا کہ بیرونی امداد طلب کرنے کی دھمکی قریب قریب الٹی میٹم کا حکم رکھتی ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت کشمیر کی پالیسی کا اصل مقصد ایسا موقع تلاش کرنا ہے کہ کشمیر دفعتہً انڈین یونین میں شامل ہو سکے۔

حکومت کشمیر نے مسائل پر گفتگو کرنے کے لئے نمائندہ بھیجنے سے انکار کیا۔ غیر جانب دار تحقیقات کے لئے نمائندہ نامزد نہ کیا۔ قائد اعظم نے وزیر اعظم کشمیر کو کراچی میں آنے کی جو دعوت دی۔ اس کا جواب نہ دیا۔ اپنی فوج کو مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لئے استعمال کر کے ریاست میں دانستہ فسادات پیدا کئے اور جس دن ہندوستان کے ساتھ کشمیر کا الحاق منظور ہوا اسی دن نو بجے صبح انڈین یونین کی فوج ہوائی جہازوں میں سری نگر پہنچ گئی۔ ان تمام واقعات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جمہور کشمیر کی مرضی کے خلاف الحاق کرنے کا منصوبہ موجود تھا جو صرف اسی طریق سے پورا ہو سکتا تھا۔ کہ ہندوستانی فوجیں ملک پر قابض ہو جائیں۔

اگرچہ حکومت کشمیر نے پاکستان کے خلاف ہر قسم کے الزامات عائد کئے (اور انہی نام نہاد بدسلوکیوں کے تدارک کی غرض سے حکومت ہند نے حکومت کشمیر کو فوجی امداد بھیجی تھی) لیکن انڈین ڈومینین نے کسی مرحلے پر بھی نہ ان بیانات و الزامات کے متعلق حکومت پاکستان سے جواب طلب کیا اور نہ باہم گفت و شنید سے اس مسئلے کے حل کی کوئی کوشش کی۔ حکومت پاکستان کو صرف اس وقت اطلاع دی گئی جب ہندوستان نے کشمیر کا الحاق تسلیم کر لیا اور اپنی فوجیں کشمیر میں اتار دیں۔

کشمیر پر حکومت ہند کے اس ناواجب قبضے کے بعد قائد اعظم نے تجویز کی کہ لاہور میں فوراً ایک کانفرنس منعقد کی جائے جس میں دونوں ملکوں کے گورنر جنرل، دونوں حکومتوں کے وزیر اعظم اور مہاراجا اور ان کے وزیر اعظم شامل ہوں۔ یہ دعوت قبول کر لی گئی اور ۲۹ اکتوبر کو یہ کانفرنس منعقد ہونے ہی والی تھی کہ آخری لمحہ پر پنڈت نہرو کے بیمار ہو جانے کی وجہ سے ملتوی کرنی پڑی۔ پھر یہ فیصلہ کیا گیا کہ کانفرنس یکم نومبر کو منعقد ہو اور اس میں دونوں گورنر جنرل اور دونوں وزیر اعظم شریک ہوں۔ یہ کانفرنس بھی نہ ہو سکی۔ کیونکہ پھر آخری لمحہ پر یعنی یکم نومبر کی صبح کو ہمیں اطلاع دی گئی کہ پنڈت نہرو علالت کی وجہ سے لاہور پہنچ کر اس میں شریک نہ ہو سکیں گے۔ اس طرح جہاں تک انڈین ڈومینین کا تعلق ہے کانفرنس کے انعقاد کا خیال غت ربود ہو گیا۔ اگر حکومت ہند حقیقت میں اس اہم اور ضروری مسئلے پر گفت و شنید کرنے

ہفت روزہ "نصرت" لاہور

کی خواہش رکھتی تو پنڈت نہرو کی جگہ ان کے نائب وزیر اعظم کانفرنس میں شریک ہو سکتے تھے۔ یکم نومبر کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن جائنٹ ڈیفینس کونسل کے اجلاس میں شامل ہونے کے لیے لاہور آئے اور انہوں نے قائد اعظم سے ملاقات کی۔ اس ملاقات میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی خدمت میں چند تجویزیں پیش کی گئیں۔ لیکن اس کے بعد حکومت ہند کی طرف سے قائد اعظم کو یا مجھے کوئی پیغام یا مراسلہ موصول نہ ہوا۔ بلکہ اس کے بجائے پنڈت نہرو نے حقائق کے قطعاً خلاف حکومت پاکستان کے خلاف بے سروپا الزامات دنیا بھر میں نشر کیے۔ ان کی تقریر اس وقت ہوئی جب لارڈ ماؤنٹ بیٹن واپس دہلی پہنچے۔ ان کے الزامات کی حقیقت جو کچھ ہے وہ میں پہلے ہی واضح کر چکا ہوں۔ اب اصل امور کا فیصلہ آپ لوگ اور اہل عالم خود ہی کریں۔

(۴ نومبر ۱۹۴۷ کی نشری تقریر کا اقتباس)



چوہدری سر محمد ظفر اللہ خاں

مسئلۂ کشمیر اور پاکستان

قیام پاکستان پر یعنی پندرہ اگست ۱۹۴۷ء کو تقسیم ہند عمل میں آنے پر تمام ریاست کشمیر میں اور خصوصاً مسلمانوں میں بڑی خوشی منائی گئی کہ ڈوگرا راج کے ناقابل بیان استبداد سے ، جس کے خلاف وہ پچھلے سو سال سے جدوجہد کر رہے تھے ، نجات پانے کا وقت آگیا ہے ۔ مسلمانوں نے تمام ریاست میں اور خود جموں اور سری نگر کے شہروں میں بڑے جوش و خروش سے یوم پاکستان منایا ۔ ریاست کی اہم ترین سیاسی جماعت یعنی مسلم کانفرنس نے اتفاق رائے سے یہ اعلان کیا کہ وہ پاکستان میں شامل ہونے کی حامی تھی ، ہمیں یقین ہے کہ خود نیشنل کانفرنس (جس کے شیخ عبداللہ صدر ہیں) کے اراکین کو اپنی مرضی سے انتخاب کا موقع دیا جاتا تو ان میں سے کافی پاکستان میں شمولیت کو ترجیح دیتے ۔ مہاراجہ کی حکومت نے پندرہ اگست ۱۹۴۷ء کو حکومت پاکستان سے ایک سٹینڈ اسٹل معاہدہ کیا جس کی رو سے حکومت جموں و کشمیر کی رہائشیوں کا اور ریاستی ڈاک اور تار کے محکمے اور محصول کا انتظام حکومت پاکستان کے ہاتھ میں آگیا ۔ میرا خیال ہے کہ یہ معاہدہ آبادی کے مسلم حصے میں یہ تاثر پیدا کرنے کے لئے کیا گیا تھا کہ مہاراجہ پاکستان میں شریک ہونے کا ارادہ رکھتا ہے ، مگر اب معلوم ہوتا ہے کہ مہاراجہ کا ہرگز یہ قصد نہ تھا اور یہ محض مسلم رعایا کو احساس تحفظ دلا کر ٹھنڈا کرنے اور یہ یقین دلانے کی ترکیب تھی کہ معاہدہ بتدریج پاکستان میں شمولیت کی صورت اختیار کر لے گا ۔

اس کے فوراً بعد ہی مہاراجہ نے مشرقی پنجاب سے ہندوؤں اور سکھوں کو ریاست میں لانے کے ایک باقاعدہ منصوبے پر عمل شروع کیا تاکہ مسلم رعایا کو مرعوب کر کے ہندوستان میں شامل ہونے پر رضامند کر لے ۔ اس نے اپنی فوجوں سے کام لینا بھی شروع کر دیا ۔ اب اصل سوال یہ ہے کہ عوام کی طرف سے اس تحریک کا اور مہاراجہ کی طرف سے اس جبر و تشدد کا آغاز کب ہوا ؟ بھارت کے نمائندے کا کہنا ہے کہ بائیس اکتوبر ۱۹۴۷ء تک کوئی بات نہیں ہوئی تھی اور اس کے بعد جو واقعہ پیش آیا وہ قبائلیوں کا ایک پُرامن ریاست پر اچانک حملہ تھا ۔ اور اسی حملے سے تمام جھگڑا شروع ہوا ۔

اس کے برعکس پاکستان کا کہنا یہ ہے کہ ایک پُرزور تحریک آزادی پہلے ہی سے ریاست میں شروع ہو چکی تھی اور قبائلی حملہ ہونے سے پیشتر اس نے کافی زور پکڑ لیا تھا ۔ حقیقت یہ ہے کہ قبائلیوں کا حملہ حالات کا براہ راست نتیجہ تھا کہ مہاراجہ کی فوجوں نے ، کبھی کبھی خود مہاراجہ کی قیادت میں ، ہر قسم کی انسانیت سوز حرکتوں اور جفاکاریوں سے تحریک آزادی کو کچلنا شروع کر دیا تھا ۔ پھر پاکستان اور قبائلی علاقوں کے لوگ ریاست میں اپنے ہم مذہبوں کی مزید تکلیف کو ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر دیکھنے کی تاب نہ لا سکے اور ان کی مدد کو جا پہنچے ۔

اب دیکھنا چاہیئے کہ میرے پاس اس دعویٰ کے لئے شواہد کیا ہیں ۔ میں سب سے پہلے سیکورٹی کونسل کی توجہ ایک پریس نوٹ کی طرف منعطف کراؤں گا جو مہاراجہ کی حکومت نے بارہ ستمبر ۱۹۴۷ء کو جاری کیا تھا ۔ اس کا اقتباس ملاحظہ ہو :-

> "چوبیس اگست ۱۹۴۷ء کو بڑے بڑے اور بہت جوش میں بھرے ہوئے جتھے ویسٹ باغ تحصیل میں جمع ہو گئے اور پچیس تاریخ کو منتشر ہو جانے پر آمادہ کرنے کی تمام کوششوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے قریب کے شہر باغ کی طرف روانہ ہوئے جہاں ان کی تعداد پانچ ہزار تک پہنچ گئی اور اس میں اگلے دو دن میں کافی اضافہ ہو گیا ۔ یہ جتھے مختلف قسم کی بندوقوں ، کلہاڑوں اور برچھیوں سے مسلح تھے "

اس تحریک کو دبانے کی غرض سے جو تدابیر اختیار کی گئی تھیں وہی بعد میں قبائلی حملے کا سبب بنیں ۔ اب میں ایک مضمون سے اقتباس پیش کرتا ہوں ۔ جو ایک نامہ نگار خصوصی نے لکھا تھا اور دس اکتوبر ۱۹۴۷ء کو لندن کے "ٹائمز" میں چھپا تھا :

"باقی ماندہ ڈوگرا علاقے میں دو لاکھ سینتیس ہزار مسلمانوں کو ڈوگرا حکومت کی فوجوں نے خود مہاراجہ کی قیادت میں اور ہندوؤں اور سکھوں کی مدد سے منظم طور پر موت کے گھاٹ اتار دیا۔ صوبہ جموں کی دو تہائی مسلم آبادی کے اس خاتمے نے مشرقی جموں صوبے کی آبادی کے موجودہ تناسب کو بالکل بدل دیا ہے۔ ریاست کے آمد و رفت کے راستے اور معاشیاتی معاملات تمام تر مغربی پنجاب سے وابستہ تھے اور ان کا رخ پٹھان کوٹ کی طرف نہ موڑا گیا ہے اور نہ آسانی سے موڑا جا سکتا ہے۔"

ظاہر ہے پاکستان کے عوام ان تمام واقعات سے گہری طرح متاثر ہوئے جب ان کے بھائیوں کو قتل اور اپنا گھر بار چھوڑ پاکستان میں پناہ لینے پر مجبور کیا جا رہا تھا تو وہ بے اعتنائی کیوں کر برت سکتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ قبائلی اور کچھ پاکستانی رضاکار کشمیر میں داخل ہوئے لیکن تنازع کے آغاز کو لازماً مہاراجہ کی اپنی مسلم رعیت پر ظلم ڈھانے کی پالیسی میں تلاش کرنا پڑے گا۔

اب میں سیکورٹی کونسل کو بتاؤں گا کہ خود شیخ عبداللہ نے اس بارے میں کیا کہا ہے۔ شیخ عبداللہ نے اکیس اکتوبر ۱۹۴۷ء کو دہلی میں پریس کو ایک بیان دیا تھا۔ یہ تاریخ معنی خیز ہے کہ ریاست کشمیر پر قبائلی حملے سے پیشتر کی ہے۔ پہلے، حربی پوزیشن کی طرف اشارہ ملاحظہ ہو:

"ریاست کو جو حربی پوزیشن حاصل ہے اس کی وجہ سے عبداللہ کا خیال تھا کہ اگر ریاست بھارت میں شامل ہو گئی تو پاکستان پوری طرح گھر جائے گا۔"

حربی پوزیشن کا یہ اندازہ خود شیخ عبداللہ کا ہے۔ ان مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے جو کشمیر کے لوگوں کو شمولیت کے مسئلے پر کوئی فیصلہ کرنے میں پیش آ رہی تھیں شیخ عبداللہ نے کہا:

"چند ریاستوں مثلاً پٹیالہ، بھرتپور وغیرہ میں جو واقعات پیش آئے ہیں ان سے فطری طور پر کشمیر کے مسلمانوں کے، جو ریاست میں اکثریت میں ہیں، ذہن میں خدشات پیدا ہو گئے۔ انہیں یہ ڈر تھا کہ ریاست کا ہندوستان میں شامل ہونا ان کے لئے خطرے کا پیش خیمہ تھا۔"

بقول شیخ عبداللہ کشمیر کے مسلمان یہ محسوس کر رہے تھے۔ اسی بیان میں آگے چل کر انہوں نے کہا:

"پونچھ میں موجودہ گڑبڑ کی وجہ وہ غیر ہوشمند پالیسی تھی جو ریاست نے اختیار کی تھی۔ پونچھ کے عوام اپنے مقامی حکمران کے اور پھر کشمیر دربار کے ماتحت مصائب سہتے آئے تھے۔ انہوں نے اپنی شکایات کی تلافی کے لئے ایک عوامی تحریک شروع کی تھی۔ یہ تحریک فرقہ وارانہ نہیں تھی۔"

اور اسی بات سے بھارت کے نمائندے کو انکار ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ریاست میں کوئی عوامی تحریک نہیں تھی، کوئی واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ مجھے پتہ نہیں کہ وہ شیخ عبداللہ کو مذکورہ بالا بیان دینے پر کس نام سے یاد کرے گا۔ شیخ عبداللہ نے مزید کہا۔

"جب وہ تحریک شروع ہو گئی تو ریاست کشمیر نے اپنی فوج بھیج دی اور پونچھ میں دہشت پھیل گئی۔"

اس بارے میں بھی بھارت کے نمائندے کا کہنا یہ ہے کہ فوج صرف قانون اور نظم و ضبط قائم رکھنے کے لئے بھیجی گئی تھی تاکہ کوئی تکلیف دہ واقعہ پیش نہ آئے۔ تو پھر لوگوں میں دہشت کیوں پھیلی تھی؟ یہ فوج بھارت کے نمائندے کے کہنے کے مطابق آخر کس کی مدد کے لئے، کسے بچانے اور پناہ دینے کے لئے آئی تھی؟ لیکن شیخ عبداللہ کہتے ہیں:

"ریاست کشمیر نے اپنی فوج بھیج دی اور پونچھ میں دہشت پھیل گئی۔ لیکن پونچھ کی بالغ آبادی کا بیشتر حصہ ہندوستانی فوج کے سابق فوجیوں پر مشتمل تھا جن کے جہلم اور راولپنڈی کے لوگوں سے قریبی تعلقات تھے۔ انہوں نے اپنی عورتوں اور بچوں کو وہاں بھیج دیا، سرحد بند کر دی اور فساد پر آمادہ لوگوں کے مہیا کئے ہوئے اسلحہ لے کر لوٹ آئے۔ موجودہ صورت حال یہ تھی کہ بعض علاقوں سے

ریاستی فوج پسپا ہونے پر مجبور ہو گئی تھی"

اکیس اکتوبر کو یہ صورت حال تھی۔ اور یہ شیخ عبداللہ کے الفاظ میں، جو وزیر اعظم نہرو کے دوست اور حواری ہیں، مسئلہ کشمیر کی بنا تھی۔

بھارت کے نمایندے نے جو فرد جرم عائد کی ہے کہ پاکستان نے ان حالات کو ختم کرنے کے لئے ویسی کارروائی نہیں کی جیسی کہ اسے کرنی چاہئیے تھی میں حکومت پاکستان کی طرف سے اس جرم کا اقبال کرتا ہوں۔ پاکستان کو چاہئیے تھا کہ مہاراجہ کی ریاستی فوج کے ہاتھوں مسلمانوں کے قتل عام کو روکنے اور ان علاقوں میں جہاں قبائلیوں کی وجہ سے خلل پڑا تھا نظم و ضبط بحال کرنے کے لئے اپنی فوج کشمیر بھیج دیتا۔

پاکستان نے ایسا نہیں کیا کیونکہ ایک تو وہ فساد زدہ علاقے میں اضافہ نہیں کرنا چاہتا تھا، دوسرے میں یہ دکھاؤں گا اس مسئلے کو دوستانہ، پُرامن اور منصفانہ اور بجا طور پر حل کرنے کی پاکستان نے فوراً بعد ہی کیا کچھ کوشش کی تھی۔

اس وقت تک واقعہ یہ پیش آیا تھا کہ "آزاد کشمیر" تحریک شروع ہو چکی تھی۔ بعض علاقوں میں اس تحریک نے مہاراجہ کی فوج کو شکست دے کر تتر بتر کر دیا تھا۔ چھبیس اکتوبر کو حالت یہ تھی کہ مہاراجہ اپنے صدر مقام سری نگر سے بھاگ کر جموں میں پناہ گزیر ہو چکا تھا۔ جموں سے اس نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو خط لکھا۔ اس خط میں اس نے درخواست کی کہ ہندوستانی فوج بھیج دی جائے اور چونکہ وہ ہندوستان میں شامل ہوئے بغیر ایسی درخواست نہیں کر سکتا تھا، وہ شمولیت کے لئے تیار تھا۔ اس خط کے جواب میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے کہا کہ ریاست کے الحاق کے مسئلے کو عوام کی رائے سے طے کرنا چاہیے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ مہاراجہ کا خط جموں میں چھبیس اکتوبر کو لکھا گیا تھا اور ستائیس کی صبح کو ہندوستانی فوج بذریعہ ہوائی جہاز سری نگر پہنچ گئی۔ اس سے اچھی طرح اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس اثنا میں پس پردہ کیا کچھ ہوتا رہا۔ ظاہر ہے کہ پاکستان مہاراجہ کے خط اور ماؤنٹ بیٹن کے جواب کو کسی طرح شمولیت کا اقرار سمجھنے کے لئے تیار نہ تھا۔

جوناگڑھ کے بارے میں بھارت نے جو رویہ اختیار کیا ہے اگر اسے مدنظر رکھا جائے تو کشمیر کے بارے میں بھارتی رویے کا کھوکھلا پن بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ بھارت کو حسب دلخواہ اصول چن کر ان دونوں ریاستوں پر لاگو کرنے اور پھر ان دونوں کے بارے میں اپنے رویے کو حق بجانب ثابت کر کے دکھانے دو۔ پھر یہ فیصلہ کرنا ممکن ہوگا کہ ہر دو ریاستوں کے بارے میں بھارت کی تدابیر، معیار اور آدرش ایک جیسے ہیں یا بھارت ہر حالت میں اپنے فائدے کے لئے اپنے معیار، آدرش اور اعلانات میں رد و بدل کرتا رہتا ہے۔

پرامن تصفیے کے لئے گفت و شنید

پاکستان نے بارہا کوشش کی کہ بھارت سے براہ راست گفت و شنید کر کے مسئلہ کشمیر کو طے کر لے۔ اٹھائیس یا انتیس اکتوبر کو پاکستان کے گورنر جنرل نے ہندوستان کے گورنر جنرل سے کہا کہ صورت حال پر قابو پانے اور پرامن طرح طے کرنے کا بہترین طریقہ یہ تھا: دونوں حکومتیں اپنے اپنے گورنر جنرل کو مسئلے سے نمٹنے کے اختیارات دے دیں۔ پھر وہ لڑائی روکنے اور نظم و ضبط بحال کرنے کے لئے قدم اٹھائیں خواہ اس سلسلے میں حملہ آور قبائلیوں کے خلاف فوجی کارروائی ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔ جب یہ کام ہو چکے تو وہ سب لوگ جو باہر سے آئے ہوں ریاست سے چلے جائیں یعنی بھارتی فوج، قبائلی، پاکستانی رضاکار اور دیگر لوگ۔ اس کے بعد دونوں گورنر جنرل ریاست کا نظم و نسق سنبھال لیں اور ایک آزاد اور غیر جانب دار استصواب رائے کا سامان کریں تاکہ جموں اور کشمیر کے عوام پاکستان یا ہندوستان میں شامل ہونے کا فیصلہ کر سکیں۔

میں یہ معلوم کرنا پسند کروں گا کہ اس پیشکش میں کون سی بات قابل اعتراض تھی اور کیا یہ مسئلے کو پُرامن، بجا، منصفانہ اور جائز طور پر حل کرنے کے لئے مدبرانہ پیشکش نہ تھی۔

مسئلے کو حل کرنے اور ریاست میں ہونے والی جنگ کو روکنے کے لئے پاکستان نے یہ کوشش کی تھی۔ اس پیشکش کو قبول نہیں کیا گیا۔ اسے رد کر دیا گیا۔

اعتراض یہ تھا کہ آئینی طور پر اپنے گورنر جنرل کو ایسا اختیار دینا بھارتی حکومت کے لئے پریشان کن تھا۔ میں اس بارے میں

تو کچھ نہیں کہوں گا، لیکن ہم نے یہ پیشکش کی تھی اور میں دوبارہ کہتا ہوں کہ ان حالات میں یہ سب سے منصفانہ پیشکش تھی۔ اس سے کسی فریق کو فوقیت نہ حاصل ہوتی تھی اور شمولیت کا فیصلہ ریاست کی عوام کے ہاتھ میں رہ جاتا تھا۔ بعد میں اس پیشکش کا جو واقعی تحریری جواب علاوہ اس تار میں شامل ہے جو بھارت کے وزیراعظم نے آٹھ نومبر ۱۹۴۷ء کو پاکستان کے وزیر اعظم کو بھیجا تھا۔ میں دسواں اور گیارہواں پیرا پڑھ کر سناؤں گا جس میں کہا گیا تھا:

"اس طرح یہ ظاہر ہو جائے گا کہ ہماری تجاویز جنھیں ہم کئی بار بیان کر چکے ہیں، یہ ہیں: ایک، حکومت پاکستان علانیہ وعدہ کرے کہ وہ حملہ آوروں کو کشمیر سے نکالنے کی حتی الامکان کوشش کرے گی۔ (۲) بھارت کی حکومت اپنے اس اعلان کو دہرائے گی کہ جونہی حملہ آور کشمیر سے نکل جائیں گے اور نظم و نسق بحال ہو جائے گا وہ اپنی فوج کشمیر سے ہٹا لے گی، اور یہ کہ بھارت اور پاکستان کی حکومتوں کو مل کر اقوام متحدہ سے کشمیر میں جلد از جلد استصواب رائے کا انتظام کرنے کی درخواست کرنی چاہیئے۔"

انہی باتوں پر تو ہم پچھلے دو سال سے زور دے رہے ہیں لیکن سیکورٹی کونسل، بھارت اور پاکستان کے لئے اقوام متحدہ کے کمیشن کی کوششیں، اور خود ہماری بھارت کی حکومت کو اس پر رضامند کرنے کی مساعی، بدقسمتی سے اب تک ناکام رہی ہیں۔ اب میں اس تار سے اقتباس کو جاری رکھتا ہوں:

"مذکورہ بالا فیصلے صرف کشمیر سے متعلق ہیں لیکن دونوں حکومتوں کے مابین اچھے تعلقات بحال کرنے کے لئے اشد ضروری ہے کہ اس اصول کو قبول کر لیا جائے کہ جس ریاست کا حکمران اس فرقے سے تعلق نہ رکھتا ہو جس کی ریاست میں اکثریت ہو اور جو اس ملک میں شامل نہ ہوئی ہو جہاں اسی فرقے کی اکثریت ہو جس کی ریاست میں ہے، تو اس سوال کا جواب کہ وہ ریاست آخری طور پر کس ملک میں شامل ہوئی ہے لوگوں کی رائے لیکر معلوم کرنا چاہیئے۔"

یہ تجاویز بجنسہٖ وہ تو نہیں تھیں جو ہم نے پیش کی تھیں تاہم ہم نے انہیں مزید گفت و شنید کی اساس قرار دینا قبول کر لیا۔ ہم نے یہ بھی تجویز کیا کہ دونوں حکومتوں کے ان امور پر تمام تنازع کو اقوام متحدہ کے سامنے پیش کیا جائے۔ چودہ نومبر ۱۹۴۷ء کو وزیر اعظم پاکستان نے پریس کو ایک بیان دیا۔ اس سے اقتباس پیش ہے:

"اقوام متحدہ کے چارٹر کا بنیادی اصول یہ ہے کہ طاقت کو حق پر غالب آنے سے روکا جائے۔ لہٰذا اس تمام جھگڑے کو بین الاقوامی رائے کی BAR کے سامنے پیش کرنا چاہیئے۔ ہم اقوام متحدہ سے یہ درخواست کرنے کو تیار ہیں کہ وہ ریاست میں لڑائی اور مسلمانوں کے قتل عام کو روکنے کے لئے فی الفور اپنے نمایندے جموں اور کشمیر میں مامور کر دے، بیرونی افواج کے ہٹائے جانے کا پروگرام مرتب کرے، استصواب رائے ہونے تک ریاست میں ایک غیر جانبدار انتظامیہ قائم کرے، اور ریاست کے عوام کی آزاد اور بے قید منشا معلوم کرنے کی غرض سے اپنی رہنمائی اور اختیار میں الیکشن کرانے کا کام سنبھالے۔"

اس کے علاوہ وزیراعظم پاکستان نے بائیس نومبر ۱۹۴۷ء کو وزیراعظم برطانیہ کو ایک تار بھیجا جس میں کہا گیا:

"مذکورہ بالا تجزیے سے ظاہر ہوتا ہے کہ پہلے جنگ بند ہونا اور بیرونی افواج کا ہٹایا جانا ضروری ہے، دوسرے، اور یہ بات بھی کم اہم نہیں کہ کشمیر کے نظم و نسق کو فی الفور کسی غیر جانبدار اور آزاد آمر کو اپنے اختیار میں لے لینا چاہیئے۔ جب تک یہ شرائط پوری نہ ہوں گی آزاد استصواب رائے کی بجھے ہمارے خیال میں موسم بہار تک ملتوی

رکھنا ضروری نہیں، کوئی امید نظر نہیں آتی۔"

" مجھے اُمید ہے کہ آپ اصل صورت حال کو سمجھ لیں گے۔ اگر آپ نے ان بنیادی حقائق پر غور کیا تو مجھے امید ہے کہ آپ ہماری اس تجویز کی حمایت کریں گے کہ مذکورہ بالا کام انجام دینے کے لئے اقوام متحدہ کو فوراً ایک کمیشن بھیج دینا چاہیئے۔"

اگرچہ دونوں حکومتوں کو اس پر اتفاق ہے کہ اس مسئلے کا فیصلہ عوام کی آزاد اور بے قید منشا سے ہونا چاہیئے مگر اس بارے میں ان کے درمیان شروع ہی سے اختلاف چلا آرہا ہے کہ وہ حالتیں کیا ہوں گی جو لوگوں کے آزادانہ اظہار رائے کی ضامن بن سکیں۔ اس سلسلے میں ایک امر ہے جس کا مجھے امید ہے سیکورٹی کونسل خیال رکھے گی اور وہ یہ ہے:

جوناگڑھ کے معاملہ میں بھارت نے اصرار کیا تھا کہ استصواب رائے کا کام بھارتی حکومت اور ریاست جوناگڑھ کو انجام دینا چاہیئے۔ ہم نے کشمیر کے معاملے میں اصرار تو کجا کبھی یہ تجویز بھی نہیں کیا کہ استصواب رائے کا کام ریاست جموں وکشمیر کی حکومت اور حکومت پاکستان کو انجام دینا چاہیئے، اور اس میں بھارتی حکومت کا کوئی دخل نہ ہو۔ جوناگڑھ کے بارے میں بھارت کی تجویز کے پس پشت جو منطق ہوگی وہ یقیناً کشمیر کے مسئلے پر بھی صادق آتی ہے۔ لیکن ہم نے اسے منصفانہ نہیں سمجھا۔ ہم نہ تو خود سے نہ دوسروں سے یہ بہانہ کہہ سکے کہ ایسے حالات میں استصواب رائے منصفانہ ہو سکتا ہے۔ اسی لئے ہم پوری طرح رضامند تھے اور پورے وقت رضامند رہے ہیں ——— سچ تو یہ ہے کہ ہم نے اصرار کیا ہے ——— کہ استصواب رائے ایسے حالات میں جو اسے واقعی آزاد اور غیر جانبدار بنا سکیں کسی غیر جانب دار مختار کی نگرانی میں ہو۔ اور یہی بھارتی حکومت اور ہمارے مابین تمام اختلاف ہے اور مسئلے کا پُر پیچ پہلو ہے۔ آزاد اور غیر جانبدار استصواب رائے کے لئے کم سے کم شرائط جن پر ہم زور دیتے ہیں وہ یہ ہیں کہ تمام بیرونی افواج اور باہر سے آنے والے جنگجو عناصر کو ریاست سے ہٹا لیا جائے! جموں اور کشمیر کی ریاست میں ایک لافریقی انتظامیہ قائم کی جائے، استصواب رائے کا انتظام اور انجام دہی اقوام متحدہ کے اختیار کے ذریعے اور ماتحت ہو۔ لیکن اگر کوئی یہ کہے کہ "اوہ، لیکن آپ جو تجویز کر رہے ہیں اس سے تو جو شخص کشمیر کی ہندوستان میں شمولیت کے لئے ووٹ دینا چاہتا ہوگا وہ نہیں دے سکے گا" تو اس شرط میں ترمیم کر دی جائے۔ ان شرائط میں ایسی کون سی بات ہے جو کسی شخص کو اپنی مرضی کے خلاف ووٹ دینے پر مجبور کر دے یا جس پر کسی کو کوئی معقول اعتراض ہو سکے؟

پھر اس معاملے کو ہماری تجویز کے مطابق اقوام متحدہ کے سامنے پیش نہیں کیا گیا۔ ہم نے یہ تجویز کی تھی کہ ہم دونوں مل کر اس معاملے کو اقوام متحدہ کے سامنے رکھیں اور وہ آزاد اور غیر جانبدار استصواب رائے کے جو انتظامات کرے ان پر پابند رہیں۔ بھارت نے سیکورٹی کونسل کے روبرو پاکستان کے خلاف شکایت لے کر آنا پسند کیا۔ اس کے باوجود پاکستان نے اقوام متحدہ سے اس رائے طلبی کو سراہا۔

بھارت کی کشمیر پر قابض ہونے کی کوشش اور پاکستانی فوج کا داخلہ

جس دوران میں سیکورٹی کونسل کشمیر کے مسئلے پر بحث کر رہی تھی، بھارت، کونسل کی دونوں فریقین سے اس درخواست کے باوجود کہ وہ کوئی ایسی حرکت نہ کریں جس سے حالت اور خراب ہو جائے، کشمیر میں بڑے پیمانے پر جارحانہ فوج کشی شروع کرنے کے لئے اپنی افواج کی طاقت بڑھا رہا تھا۔ یہ حملہ شروع اپریل ۱۹۴۸ء میں ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کشمیری مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد پاکستان کو ہجرت کر گئی اور خود پاکستان کی بقا کو خطرہ لاحق ہوگیا۔ بھارتی افواج خطرناک انداز میں پاکستان کی سرحدوں کی طرف بڑھنے لگیں اور جہلم کی نہروں کا ہیڈ ورکس جو ریاست کشمیر میں منگلا کے مقام پر واقع تھا خطرے میں پڑ گیا۔

بھارت نے اپنے اصلی ارادوں پر پردہ ڈالنے کی کوئی کوشش نہ کی ———،

پندرہ مارچ ۱۹۴۸ء کو بھارت کے وزیر دفاع نے بھارتی آئین ساز اسمبلی میں اعلان کیا کہ بھارتی فوج دو یا تین مہینے کے اندر اندر کشمیر میں تمام مدافعت پر قابو پالے گی۔ بھارتی فوجی تیاریاں اس کے واشگاف ارادوں کے عین مطابق تھیں۔

لندن کے ٹائمز نے تیرہ اپریل ۱۹۴۸ء کو اپنے خصوصی نامہ نگار مقیم سری نگر کا ایک مراسلہ چھاپا۔ اس میں کہا گیا تھا:

"بھارتی فوج نے سردیوں کے مہینوں میں بے حد جانفشانی سے کام کیا ہے اور اب اس کی حالت بہتر ہو گئی ہے۔ برفانی طوفانوں اور بارش اور ان کی وجہ برپا ہونے والی طغیانی، کیچڑ اور گرتی چٹانوں کے باوجود وہ مستقل مزاجی سے رسد اور کمک پہنچاتی رہی۔ اس نے سڑکوں اور ہوائی اڈوں کو بہتر بنایا اور اپنے سپاہیوں کی تربیت اور سخت کر دی۔ کمک اور رسد کے اعتبار سے اس نے ایک قابل ذکر فتح حاصل کی ہے لیکن اب بھی اپریل میں، جو روایتی طور پر موسم بہار کی پیش قدمی کا مہینہ ہے، یہ ضروری مرحلہ مکمل نہیں ہوا ہے۔ سری نگر اور جموں کے درمیان کی سڑک، جو بانیہال درے سے بل کھاتی گزرتی ہے، ابھی تک برف سے ڈھکی ہوئی ہے اور فوجی قافلے اکثر برف میں پھنس جاتے ہیں۔ نقل و حرکت کو بہتر بنانے کے لئے روزانہ ہوائی سروس کا انتظام کیا گیا ہے اگرچہ موسم کے حالات کی وجہ سے ہوائی اڑان کم از کم دو تین ہفتے تک غیر محفوظ ثابت ہو گی۔ لیکن فوج کو کافی کمک پہنچ چکی ہے، اور اسے جلد ہی ایک معینہ جارحانہ کارروائی کے لئے تیار ہو جانا چاہیئے۔ ابھی سے کچھ یونٹیں جموں میں راجوری سے اور اڑی سے پیشقدمی کر چکی ہیں اور کچھ چھوٹی موٹی کامیابیوں کی اطلاع موصول ہوئی ہے۔ لڑائی خونریز ہوتی ہے، قیدی کم ہی بنائے جاتے ہیں اور دونوں فریقوں سے بربریت سرزد ہوئی ہے۔ سکھ فوجوں نے متعدد پٹھانوں کو قتل کر دیا ہے۔"

یہ بات، پاکستان کے اپنی کچھ فوج کشمیر بھیجنے سے چند ہفتے پہلے کی ہے لیکن اس میں بالکل کوئی شبہ نہیں کہ بھارت ریاست کشمیر کو فوجی مدافعت سے پاک کرنے کے لئے جارحانہ کارروائی کی تیاری کر رہا تھا۔ اس وقت پاکستان کو کیا خطرہ درپیش تھا؟ جہاں تک اس کی اپنی سلامتی کا تعلق ہے، اسے ایک شدید خطرے کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ ریاست پر قبضہ ہوتے ہی پاکستان کے فوجی پہلو کا ناکارہ ہو جانا ناگزیر تھا۔ اسے یہ خدشہ بھی درپیش تھا کہ دریائے جہلم پر بھی آبپاشی کا نظام شاید تباہ و برباد ہو جائے۔

اس موقع پر حکومت پاکستان کو اپنے کمانڈر انچیف کی طرف سے جنگی صورت حال کی ایک رپورٹ بیس اپریل ۱۹۴۸ء کو موصول ہوئی اس کا اقتباس ملاحظہ ہو:

عام جنگی حالات (الف)

بھارتی فوج نے کشمیر میں وسیع پیمانے پر جارحانہ حملہ کرنے کی تیاری ۱۹۴۸ء کے آغاز میں بڑی برق رفتاری سے شروع کی۔ آٹھ بریگیڈ گروپ جو معاون اسلحہ، توپ خانے، بکتر بند فوج، انجنیئروں وغیرہ سے لیس ہیں اور جنہیں کافی لڑاکا فوج کی حمایت حاصل ہے اس وقت جموں اور کشمیر میں صف بستہ ہیں اور فوجی طاقت بڑھانے کا کام جاری ہے لیکن اب تقریباً تکمیل تک پہنچا معلوم ہوتا ہے۔ پندرہ مارچ ۱۹۴۸ء کو بھارتی وزیر دفاع نے بھارتی دستور ساز اسمبلی میں اعلان کیا کہ "بھارتی فوج دو تین مہینے کے اندر اندر نام نہاد حملہ آوروں کو کشمیر سے باہر دھکیل دے گی"۔ اس وقت بھارتی فوج کے خاص اجتماع جنوب میں ہیں یعنی جموں نوشہرہ علاقے میں، کم از کم ایک مزید بریگیڈ کے وادی میں بھیجے جانے کی ابھی سے اطلاع آ گئی ہے۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ دو جداگانہ کمان منظم کی جا رہی ہیں، ایک وادی کے لئے، دوسری جموں کے لئے۔ محدود پیمانے پر جارحانہ حملہ بظاہر ابھی سے شروع ہو گیا ہے۔ بھارتی فوج نے بارہ اپریل کو راجوری

پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد دہشت انگیزی کا دور آیا جس میں گاؤں جلائے گئے، شہری آبادی کو قتل کیا گیا اور دوسرے انسانیت سوز ظلم توڑے گئے۔ اطلاع ہے کہ چار ہزار آدمی اس فتنہ کے شکار ہوئے ہیں اور علاقے میں سخت ہراس اور افراتفری پھیلی ہوئی ہے۔

(ب) استخراج

"یہ واضح ہے کہ عام جارحانہ حملہ جب جاری شروع ہونے والا ہے فوج کی موجودہ ترتیب سے گمان ہے کہ حملہ پہلے جنوب میں شروع ہوگا اور اس کا رُخ بھمبر اور میرپور کی طرف ہوگا تاکہ پاکستان کی بین سرحد تک پہنچ جا سکے"۔

یہ ایک طویل رپورٹ ہے اور میں اصل مضمون کو بطور اقتباس پیش نہیں کروں گا۔ میں اب استخراجات کا خلاصہ پیش کرتا ہوں جو تقریظ کے آخر میں ہے۔

خلاصہ

(ا) "یہ بات یقینی ہے کہ بھارتی فوج شمال اور جنوب میں عام جارحانہ حملے کا منصوبہ بنا رہی ہے۔ اس سے ان مقامات پر قبضہ کرنا مقصود ہے: جنوب میں بھمبر، میرپور اور پونچھ شمال میں مظفر آباد، کوہالہ۔

(ب) راجوری میں پیش آنے والے واقعات سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ مذکورہ بالا علاقوں میں بھارتی فوج کی پیش قدمی پاکستان کے لئے مہاجرین کا شدید مسئلہ پیدا کر دے گی۔ پاکستان پہلے ہی مہاجرین سے اٹا ہوا ہے۔ یہ مہاجر سول انتظامیہ پر انتہائی بوجھ ڈالیں گے اور ملک کے معاشی اور مالی وسائل پر بار بن جائیں گے۔ صرف اسی نقطۂ نظر سے بھی یہ لازم ہے کہ بھارتی فوجوں کو مذکورہ بالا مقامات پر قابض ہونے سے روکا جائے۔

(ت) بھمبر اور میرپور پر قبضہ کرنے سے بھارت کو دو بڑی رکاوٹوں یعنی چناب اور راوی کو پار کر لینے کی جغرافیائی فوقیت حاصل ہو جائے گی۔ وہ بالکل پاکستان کی سرحد پر پہنچ جائیں گے، جہلم کے پل کو جو ہمارے لئے اس قدر اہم ہے خطرے میں ڈال دیں گے اور انہیں سازش وغیرہ کرنے کے زیادہ مواقع ملیں گے اس سے انہیں منگلا ہیڈ ورکس پر اختیار بھی حاصل ہو جائے گا اور جہلم اور دیگر اضلاع کی آب پاشی کا انحصار ان کے رحم و کرم پر ہوگا۔

(ٹ) پونچھ پر بھارتی فوج کے قبضے سے پاکستانی فوج میں پونچھ کے آدمیوں کے اخلاقی حوصلے پر سنگین اثر ہوگا اور بعد ازاں اس سے دوسرے علاقوں کے سپاہیوں کے حوصلے پر بھی برا اثر پڑے گا۔ فوج سے مفروریوں کی تعداد بڑھ جائے گی اور ڈسپلن کو سخت صدمہ پہنچے گا۔

(ث) مظفر آباد یا کوہالہ کے ہاتھ سے نکل جانے سے پاکستان کی سلامتی پر بہت دور رس اثر پڑے گا۔ اس سے بھارتی فوج پاکستان کے عقبی دروازے پر قابض ہو جائے گی۔ جس سے وہ جب چاہے دریائے جہلم وغیرہ جیسی کسی بڑی رکاوٹ کا سامنا کئے بغیر پاکستان میں داخل ہو سکتی ہے۔ اس سے خان عبدالغفار خاں اور اس کی جماعت فقیر اپی اور افغانستان جیسی تخریب پسند عناصر کی حوصلہ افزائی ہوگی: اور اس سے یقیناً صوبہ سرحد اور پنجاب کے کچھ ملحق اضلاع میں شدید دہشت اور کھلبلی پھیل جائے گی اور لوگ بڑے پیمانے پر ہجرت کریں گے اور اس طرح خود پاکستان کے اندر مہاجروں کا ایک لاینحل مسئلہ پیدا ہو جائے گا۔

(ج) مذکورہ بالا علاقوں اور بالخصوص مظفر آباد کے علاقے میں بھارتی فوج کو آسانی سے فتح حاصل ہو جانے سے یقیناً قبائلی پاکستان سے زیادہ برا

راست امداد نہ ملنے کی وجہ سے برگشتہ ہو جائیں گے اور شاید پھر وہ خود پاکستان کی مخالفت پر اتر آئیں

سفارشات

اگر پاکستان مہاجرین کے ایک اور سنگین مسئلے کا سامنا نہیں کرنا چاہتا جس میں تقریباً ستائیس لاکھ لوگ بے گھر ہو کر پاکستان آئیں گے، اگر بھارتی فوج کو پاکستان کے عقبی اور جانبی دروازے پر سے کھٹکے ٹوٹ جانے سے روکنا ہے جہاں سے وہ جب بھی چاہے پاکستان میں داخل ہو سکتی ہے، اگر شہری اور فوجی حوصلے کو خطرناک حد تک متاثر ہونے سے بچانا مقصود ہے، اور تخریب پسند سیاسی طاقتوں کے پاکستان میں بے لگام چھوڑ دینا اور ان کی حوصلہ افزائی کرنا مقصود نہیں تو یہ انتہائی ضروری ہے کہ بھارتی فوج کو اوڑی۔ پونچھ۔ نوشہرہ جنرل لائن سے آگے نہ بڑھنے دیا جائے۔

میں سیکورٹی کونسل کے نمائندوں سے سوال کرتا ہوں کہ اگر آپ اپنے انفرادی علاقہ اختیار میں اپنے ملکوں کی سلامتی اور دفاع ان کے ذمے ہوتا اور انہیں اپنے کمانڈر انچیف سے اس قسم کی رپورٹ ملتی — اور اس معاملے میں یہ رپورٹ کسی پاکستانی نے پیش نہیں کی تھی بلکہ ممتاز برطانوی افسر جنرل سر ڈگلس ای گریسی کی پیش کردہ تھی جو کمانڈر انچیف تھے اور ہیں — اور انہیں یقین آ جاتا کہ صورت حال ایسی تھی تو ان حالات میں وہ کم سے کم کیا قدم اٹھاتے؟ پاکستان نے بھی وہی کم سے کم قدم اٹھایا اور کچھ نہیں کیا۔ اس نے مذکورہ بالا لائن کی حفاظت کے لئے اپنی فوج متعین کی۔ اس نے یہ ۱۹۴۸ء میں مئی کے پہلے ہفتے میں کیا۔

ہم سے جو سوال پوچھا گیا وہ یہ تھا کہ تم نے سیکورٹی کونسل کو مطلع کیوں نہیں کیا؟ کیا بھارتی حکومت نے جارحانہ حملہ شروع کرتے وقت سیکورٹی کونسل کو مطلع کیا تھا؟

ہم نے بہرحال اقوام متحدہ کے کمیشن کو سات جولائی ۱۹۴۸ء کو پاکستان آنے کے ایک دن کے ...

... اندر اندر اس سے مطلع کر دیا تھا۔ آٹھ جولائی کی صبح کو میں نے کمیشن کو اس وقت کی جنگی حالت پر انتہائی تفصیلی اور مکمل اطلاعات بہم پہنچا دی تھیں اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ جموں اور کشمیر میں پاکستانی افواج کہاں کہاں اور کس تعداد میں تھیں —

سیکورٹی کونسل میں تقریر کا ایک حصہ

فروری ۱۹۵۰ء

پاکستان کے لیے کشمیر کا پانی

ڈاکٹر خلیل اللہ قریشی
شعبہ جغرافیہ۔ پنجاب یونیورسٹی

ٹی۔ وی۔ اے کے سابق چیئرمین ڈیوڈ للینتھل کے نزدیک سندھ کے میدان کو ملنے والے پانی کی دو تہائی مقدار کشمیر سے آتی ہے۔

مغربی پاکستان کے تین اہم دریاؤں سندھ جہلم اور چناب کے بالائی راستے کشمیر میں ہیں۔ اس پہاڑی رقبے کی وسعت کے لحاظ سے جس میں سے ہوتے ہوئے برصغیر کے دریا میدانوں تک پہنچتے ہیں، سندھ سب پر نمایاں فوقیت کا حامل ہے۔ دریائے سندھ کے طاس کا ہمالیائی رقبہ ۱۰۳٫۸۰۰ مربع میل ہے جس کے بعد صرف برہم پتر کا نمبر آتا ہے جس کے طاس کا ہمالیائی رقبہ ۹۹٫۲۰۰ مربع میل ہے۔ سندھ پورے ہمالیہ کو عبور کرتا ہے اور اس کے اس پہاڑی رقبے کے ۶۲٫۷۲۰ مربع میل کشمیر میں ہیں۔ اس کے طاس کا راستہ بہت بلند ہے۔ چونکہ سندھ کا اصل منبع جنوبی تبت میں ہے (۳۱° - ۵۰ شمال اور ۸۱° - ۴۰ مشرق تقریباً) اس لئے یہ تقریباً ۱۸۰۰ میل تک لداخ کے اندر مشرقی پہاڑی سلسلے کے ساتھ ساتھ بہتا ہے۔ تھنگرا کے قریب یہ پہاڑی سلسلے میں داخل ہو کر لداخ کے شمال میں ۳۰۰ میل تک آب ریز میں بہتا ہے یہاں تک کہ سکردو کے نزدیک دوبارہ سلسلۂ کوہ عبور کر کے اندرونی جانب بہنے لگتا ہے۔ ہمالیہ کے ساتھ ساتھ اس کا رخ بالعموم جنوب مشرق سے شمال مغرب رہتا ہے۔ لیکن ننگا پربت کی چوٹیوں کے گرد گھومنے کے بعد سلسلۂ کوہ کی طرح اس کے رخ کی اچانک تبدیلی قابلِ توجہ ہے۔ یہاں ایک طویل فاصلے تک یہ جنوب مغربی سمت میں بہتا ہے۔

اس قدر پیچیدہ راستہ اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے طاس کی بلندی دریا کو اقتصادی مقاصد کے لئے قابلِ استعمال نہیں رہنے دیتی۔ دوسرے عوامل جو اس کے کشمیر میں بہنے والے حصے کی افادیت کو کم کر دیتے ہیں مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) دریا کے فرش کا سیدھا ڈھلوان۔

(۲) وادی میں گہرے تنگ گھاٹیوں کی موجودگی

(۳) دونوں پنجابوں کے دیگر دریاؤں سے اس کا بعد جو اس کے پانی کو مختلف دھاروں میں موڑنے کا امکان کم کر دیتا ہے — اور

(۴) معاون دریائے کابل جس کے پانی کی عظیم تر مقدار اور طاس (۳۵۰۰۰ مربع میل) دوسرے معاونین، شیوک (۱۳۰۰۰ مربع میل) گلگت (۱۰٫۰۰۰ مربع میل)، زنسکر (۱۰٫۰۰۰ مربع میل)، دراس (۵۰۰۰ مربع میل) اور شنگار (۵۰۰۰ مربع میل) کی نسبت سب سے بڑا ہے دریائے کابل دریائے سندھ سے ریاستی حدود کے باہر ملتا ہے۔

مون سون کے حلقۂ اثر سے دور رہنے کے باعث دریائے سندھ میں زیادہ تر برف کا پانی آتا ہے۔ ہمالیہ کے پہاڑوں اور تبت کے متعلق جغرافیائی اور طبقات الارضی مضمونوں میں سے ایک مصنف برارڈ کے خیال میں وہ گلیشیر جو دریائے سندھ کو پانی دیتے ہیں قطبی علاقوں کے بیرونی جانب کے تمام پہاڑوں سے بڑے ہیں۔ ان گلیشیرز کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قراقرم کے گلیشیرز اور دوسرے ہندوکش کے گلیشیرز۔ ہندوکش کے گلیشیرز کے پانی کی تمام رسد کشمیر کے باہر دریائے سندھ میں جاتی ہے۔ دریا کے پانی کی مقدار کے متعلق، اعداد و شمار کشمیر کے صرف ایک مقام سکردو پر مہیا ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ دریائے سندھ اور کابل کے سنگم اور کالا باغ کے مقامات پر بھی یہ اعداد و شمار مل سکتے ہیں۔ دریا میں پانی کی مقدار کے اتار چڑھاؤ کا پتہ چلانے کے لئے یہ مقامات ایک دوسرے سے بہت فاصلے پر ہیں۔ اس مقام کے اعداد و شمار بھی نہیں ملتے جہاں دریا کشمیری علاقے کو چھوڑ کر خاص پاکستانی علاقے میں داخل ہوتا ہے۔ تاہم یہ چیز تو معلوم ہی ہے کہ دریائے سندھ کے نکاس میں بے شمار تغیرات ہوتے رہتے ہیں۔ موسمی اتار چڑھاؤ کا اثر، بعض اوقات کسی گلیشیر یا پہاڑی چٹان کے راستے میں آ جانے سے پانی کی عارضی بندش اور پھر اس رکاوٹ کے دور ہو جانے پر پانی کا یکایک بہاؤ بھاری سیلابوں کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اور اس قسم کے سیلاب اکثر آتے رہتے ہیں اس کے باوجود دریا کو ریاستی علاقے میں موڑنے کے امکانات بہت کم ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کشمیر میں دریائے سندھ کی پاکستان

کے لئے آب پاشی یا سیلابوں کی روک تھام کے کسی مفید منصوبہ میں استعمال نہیں کیا جا سکتا۔

البتہ دریائے جہلم اور چناب کے معاملے میں پاکستان پر کشمیر کا اقتدار دریائے سندھ کے مقابلے میں کہیں زیادہ واضح اور نمایاں ہے۔ دریائے جہلم تمام تر ایک کشمیری دریا ہے کیونکہ اس کے طاس کا ۱۲۰۰۰ مربع میل کا پہاڑی علاقہ سو فیصدی ریاستی حدود میں ہے کشمیر کی ۹۰ میل لمبی اور ۲۵ میل چوڑی وادی ایک بیضوی شکل کی ناند سی ہے جو ہمالیہ اور پیر پنجال کے پہاڑوں سے گھری ہوئی ہے جن کی چوٹیوں کا درمیانی فاصلہ عرض میں ۷۵ میل ہے۔ دریائے جہلم کے طول کے رخ کے متعلق ایک اہم بات یہ ہے کہ ولر جھیل تک پہنچنے سے پہلے اس کا ڈھال بہت زیادہ عمودی ہے لیکن اس کے بعد اس کے ڈھال میں نمایاں کمی آ جاتی ہے۔ بارامولا اور مظفر آباد کے درمیان اس کا ڈھال ۳۳ فٹ فی میل ہے جبکہ مظفر آباد سے لے کر منگلا کے قریب تک اس کا ڈھال مزید گھٹ کر ۱۲ فٹ فی میل رہ جاتا ہے۔ بارامولا سے نیچے جہلم پیر پنجال کے آر پار ایک تنگ اور گہری گھاٹی میں پڑ جاتا ہے اور پھر اوڑی تک تقریباً ۲۰ میل سیدھا بہتا ہے۔ گھاٹی (بسما گلی) کی گہرائی ۷۰۰۰ فٹ ہے اور تنگ نالے کی دیواریں (جن کی چوڑائی ۷۰ فٹ تک ہے) کم و بیش عمودی ہیں۔ مظفر آباد پر اور مظفر آباد کے نیچے دریائے جہلم علی الترتیب دریائے کشن گنگا اور کنہار سے مل جاتا ہے اور اپنی مغربی سمت چھوڑ کر اپنے معاونین کی جنوبی سمت اختیار کر لیتا ہے۔ منگلا تک پہنچتے پہنچتے دریا بہت پیچ و خم کھا جاتا ہے۔

منگلا پر دریا کے ماہانہ اور روزانہ نکاس کے اعداد و شمار ملتے ہیں جو ریاست کے اندر دامنی پہاڑوں کے دامن میں واقع ہے۔ (ریاستی علاقہ کا وہ حصہ جس میں نہر اپر جہلم کے ہیڈ ورکس واقع ہیں برطانوی ہند کو متذکرہ نہر کی کھدائی کے زمانے میں پٹے پر دے دیا گیا تھا) یہاں دریا کے نکاس کی ماہانہ اوسط ۹ لاکھ کیوسک ہے۔ مختلف مہینوں کے اعداد و شمار بالترتیب ذیل ہیں۔

جنوری	۲،۰۹۰،۷۳۴	فروری	۳،۰۵۱،۰۳۶
مارچ	۸،۲۰،۰۰۵	اپریل	۱۳،۰۴۰،۷۳
مئی	۱۸،۳۴۶،۴۴۴	ستمبر	۸،۰۷،۳۴۴
جون	۱۶،۸۶،۴۶۱	اکتوبر	۳،۹۲،۶۰۲
جولائی	۱۶،۹۰،۰۲۹	نومبر	۲،۲۹،۰۰۵
اگست	۱۴،۷۵،۹۳۷	دسمبر	۲،۰۷۱،۲۲۶

ان اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ نومبر دسمبر اور جنوری کے مہینوں میں دریا کا نکاس سب سے کم ہوتا ہے۔ فروری کے بعد نکاس میں اضافہ شروع ہوتا ہے حتیٰ کہ مئی کے مہینے میں یہ اپنے شباب پر پہنچ جاتا ہے اس مہینے میں اس کی اوسط ۱۸ لاکھ کیوسک ہوتی ہے۔ مئی سے اگست تک نکاس میں معمولی سی کمی ہوتی ہے۔ بعد ازاں نومبر تک نکاس میں بڑی تیزی کے ساتھ کمی ہوتی چلی جاتی ہے۔ بحیثیت مجموعی نکاس میں کمی بیشی موسم سرما و بارشوں کے پانی کی کمی بیشی کے مطابق ہوتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ اور کم سے کم نکاس کی سالانہ اوسط ۱۶،۱۷،۴۲۹ کیوسک ہے۔ دسمبر ۱۹۵۰ پر ختم ہونے والے دس برسوں میں کم از کم اور بیش از بیش نکاس کا مطلق فرق ۲۸،۳۰،۲۸ کیوسک ہے اس عرصے کا زیادہ سے زیادہ نکاس کم سے کم نکاس کا ۱۸۰۰ فی صد سے کچھ زیادہ ہے۔ نکاس کم از کم اور بیش از بیش نکاس کا فرق سال کے مئی سے ستمبر تک کے بارانی حصے میں بڑھتا ہے۔ نکاس کی زیادہ سے زیادہ مقداریں کم سے کم مقداروں کے مقابلے میں ماہ بہ ماہ اتار چڑھاؤ کا زیادہ شکار ہوتی ہیں۔ یہ تمام حقائق دریائے جہلم کے متعلق ایک اہم نتیجے کی طرف ہماری راہ نمائی کرتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ اس خصوص میں سب سے بڑا مسئلہ طغیانی کے دنوں میں ان مہینوں کے لئے پانی کا ذخیرہ کرنا ہے جن میں پانی بہت کم رہ جاتا ہے۔ ٹھیک ٹھیک یہ تشخیص کرنا تو مشکل ہے کہ پانی کی کتنی مقدار ضائع جاتی ہے جسے مناسب وقت پر ذخیرہ کر کے ناکافی پانی کی وجہ سے ہماری جیسی پانی کو ترسی ہوئی زمین کے لئے مفید طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ایک دھندلا سا تصور اس غیر مستند اور پرانے تخمینے کی روشنی میں قائم کیا جا سکتا ہے جس کا عام طور پر حوالہ دیا جاتا ہے کہ بحیثیت مجموعی ان دریاؤں کا صرف ۲۰ فی صد حصہ اس وقت آب پاشی کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے۔

* جہلم اور چناب دونوں دریاؤں میں سال کے سات مہینوں میں پانی کی مقدار اوسط سے کم رہتی ہے۔ دریائے جہلم میں اپریل سے

اگست تک کے پانچ مہینوں میں پانی کی مقدار اوسط سے زیادہ رہتی ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے اور یاد رہے کہ مہینوں میں فاضل پانی مفید مقاصد کے تحت استعمال کیا جا سکتا ہے اور موزوں مقامات پر بند باندھ کر اور تالاب بنا کر ذخیرہ کر کے اس کی زیادہ کارکردگی کا سدباب کیا جا سکتا ہے۔

کشمیر کی پاکستان میں شمولیت کی صورت میں دریائے جہلم ایک محفوظ دریا ہے۔ اولاً اس وجہ سے کہ اس کے بالائی حصے کا کوئی حصہ بھی ریاست سے باہر نہیں ہے۔ ثانیاً اس وجہ سے کہ اگرچہ اس کا طاس چناب کے طاس سے کافی فاصلے تک ملا ہوا ہے تاہم مشترک خط فاصل کے ساتھ کوئی ایسا مقام نہیں ہے جہاں دونوں سلسلوں کی اہم شریانوں میں سے کوئی ایک شریان دوسری شریان کے قریب آتی ہو۔ چنانچہ اس دریا کے پانی کو موڑ کر دوسرے دریا میں ڈال دینے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

کشمیر کا دوسرا دریا یعنی چناب اس سے بھی زیادہ توجہ کا مستحق ہے۔ اس کے دونوں سرچشموں، بھاگا (BHAGA) چندرا جو بارالاچا درے کے قریب ہیں، اکھنور تک، جہاں یہ پہاڑوں کو چھوڑتا ہے، اس کا ڈھلان اوسطاً ۳۹ فٹ فی میل ہے جبکہ یہاں سے کشتواڑ تک جہاں دریا پیر پنجال کے پہاڑوں میں ایک گھاٹی بناتا ہے اس کا ڈھلان ۲۴ فٹ فی میل ہے۔ کشتواڑ سے اکھنور تک اس کا ڈھلان ۲۹ فٹ فی میل ہے۔ یہ دریا کوہ ہمالیہ کے مشرقی سلسلوں سے نکلتا ہے اور کشمیر میں داخل ہونے سے پہلے ایک طویل فاصلے تک انہی سلسلوں میں بہتا رہتا ہے۔ اس کے طاس کا ۳۵۰۰ مربع میل کا حصہ بھارت میں واقع ہے۔

مرالہ کے مقام پر جہاں یہ دریا پہاڑی علاقہ چھوڑ کر میدان میں داخل ہوتا ہے اس کے نکاس کی ماہانہ اوسط ۴۴۲،۲۵،۱۱ کیوسک ہے۔ ماہانہ اعداد و شمار یہ ہیں۔

جنوری	۳،۲۲،۲۸۲	جون	۱۷،۳۱،۰۸۹۳
فروری	۳،۶۵،۵۱۴	جولائی	۳۰،۳۵،۲۹۸
مارچ	۶،۲۲،۹۶۷	اگست	۳۰،۹۲،۰۰۱
اپریل	۷،۰۵،۳۸۲	ستمبر	۱۶،۹۲،۶۲۳
مئی	۱۲،۲۶،۶۷۴	اکتوبر	۱،۹۲،۴۲۸
نومبر	۲،۰۴،۳۲۲	دسمبر	۲،۳۳،۴۸۴

اس دریا میں پانی کی مقدار اکتوبر سے دسمبر تک سب سے کم رہتی ہے۔ جولائی اور اگست تک اس میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اگست کا مہینہ اس کے شباب کا ہے جس میں اس کی اوسط ۳۰ لاکھ کیوسک ہوتی ہے۔ ستمبر سے مقدار گھٹنی شروع ہوتی ہے۔ پانی کی کمی بیشی کا مدار تمام تر موسمی حالات پر ہے۔ بیش از بیش اور کم از کم نکاس کا سالانہ اوسط فرق ۲۹،۹۷،۶۱۳ کیوسک ہے اور اس سال کا مطلق فرق ۴۰ لاکھ کیوسک سے زیادہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس مدت میں زیادہ سے زیادہ مطلق نکاس کم سے کم مطلق نکاس کا ۳۰ گنا ہے۔ یہ فرق مئی سے ستمبر تک کے بارانی نصف حصے میں بڑھ جاتا ہے۔ کم از کم نکاسوں کی نسبت بیش از بیش نکاسوں میں اتار چڑھاؤ زیادہ ہوتے ہیں۔

چناب اور جہلم کے درمیان موازنہ

دونوں دریاؤں کے پانی کی مقدار اور بہاؤ کے طرز میں چند نمایاں فرق ہیں۔ چناب میں پانی کی ماہانہ اوسط مقدار جہلم کی مقدار سے ۴ لاکھ کیوسک زیادہ ہے۔ وہ مہینے جن میں چناب کا پانی اوسط مقدار سے کم آتا ہے جہلم کے ستمبر سے مارچ تک کے مہینوں کے مقابلے میں اکتوبر سے اپریل تک ہیں۔ چناب میں اوسط نکاس سے انحرافات زیادہ نمایاں ہیں۔ مثلاً کے مقام پر جہلم کے نکاس پر پہاڑوں کی گلیشیری برسات کے مقابلے میں موسمی مون زیادہ براہ راست اثر انداز ہوتی ہے۔ اس امر کی تصدیق کسی حد تک دریا کی کوہستانی منزل کے طول کی کمی سے بھی ہوتی ہے۔ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جہلم کے مقابلے میں چناب کے بالائی راستے کے پانی کی مقدار زیادہ ہے۔ دریا کے ابتدائی مراحل میں پانی کا رخ موڑنے کے امکانات کے متعلق یہ چیز ایک نہایت ہی اہم امر بن جاتی ہے۔

چناب کے نکاس کے اتار چڑھاؤ اور اس کے طاس کے علاقہ کا مطالعہ کرنے سے اس دریا کے متعلق دو نہایت اہم مسائل سامنے آتے ہیں۔ ایک پانی کی ذخیرہ اندوزی دوسرے پانی کو بھارت کی جانب موڑنے کے امکانات کا جائزہ۔ جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے کہ چناب کے معاملے میں پانی کی ذخیرہ اندوزی

کی صرورت بہ نسبت جہلم کے زیادہ اہم ہے۔ کیونکہ پانی کی مقدار میں اتار چڑھاؤ اور اس کے باعث پانی کا ضیاع بھی چناب میں زیادہ ہے۔ پانی کی ذخیرہ اندوزی کے لئے مناسب مقامات کی تلاش دریا کے راستے کی مکمل چھان بین کی متقاضی ہے۔ اس قسم کے مقامات کسی صورت میں بھی دریا کے طول کے رخ اس مقام سے زیادہ دور تلاش نہیں کئے جانے چاہئیں جہاں سے دریا کے ہموار راستے کی ابتدا ہوتی ہے۔ یہاں پانی کی بڑی سے بڑی مقدار بھی ذخیرہ کی جا سکتی ہے کیونکہ آگے وادی چوڑی ہو کر ایک وسیع طاس کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ آب و ہوا کے لحاظ سے بھی یہ انتخاب بہتر ہے۔ اگر ایسا مقام کسی ایسی جگہ واقع ہو جہاں پانی کی کافی مقدار زمین میں جذب ہو جائے یا بخارات کی شکل میں ضائع ہو جایا کرے تو پھر فاضل پانی کو محفوظ کرنے کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ پہاڑی علاقے میں ایسے مقامات پر بند باندھنے میں کفایت بھی رہے گی جہاں وادی نے کم و بیش مثلث کی شکل اختیار کر رکھی ہو۔ اس طرح بند کی تعمیر کا خرچ اور چنائی وغیرہ کے کام کا حجم بھی کم سے کم ہوگا۔

اس قسم کے مقامات میں سب سے زیادہ مناسب مقام کشمیر میں ریاسی کے نزدیک دھن گڑھ میں واقع ہے۔ یہ مقام ایک بند اور اس کے اوپر ایک جھیل کی تعمیر کے لئے تمام ضروری شرائط پوری کرتا ہے۔ تقسیم سے قبل اس مقام پر بند کی تعمیر ایک طویل المیعاد منصوبہ بندی کے مرحلے میں تھی۔

پانی کا رخ موڑنے کا سوال ایک شخص کو راوی اور چناب کے باہمی خط فاصل کے ان دو مقامات پر انگلی رکھنے پر مجبور کرتا ہے ان میں سے ایک کشمیر میں ادھم پور کے مقام بھادرواہ کے جنوب میں واقع ہے۔ یہاں راوی اور چناب کے دو معاون "دریائی لوٹ" کے قدرتی عمل میں ایک دوسرے کے انتہائی قریب آ گئے ہیں۔ دونوں کے سرچشموں کے درمیان صرف تین میل کا فاصلہ ہے۔ اصل مشکل چناب، اور راوی کے اس متذکرہ معاون کے منبعوں کی سطحوں کا فرق ہے۔ یہ معاون ندی چناب سے ۷۰۰، ۱ فٹ اونچی ہے۔ سطحوں کے اس فرق پر بند باندھ کر چناب کی سطح اونچی کرنے اور متذکرہ معاونین کے سرچشموں کے باہمی فاصلے سے زیادہ فاصلے تک سرنگ کھودنے ہی سے اس فرق پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ لیکن فنی مشکلات اور مالی دشواریاں جن کا حساب نہیں لگایا گیا، اس راہ کا روڑہ بنی ہوئی ہیں۔ دوسرے مقام پر اس مقام کو صرف اس وجہ ہی سے ترجیح دی جا سکتی ہے کہ یہاں پانی کی وافر مقدار موجود ہے۔

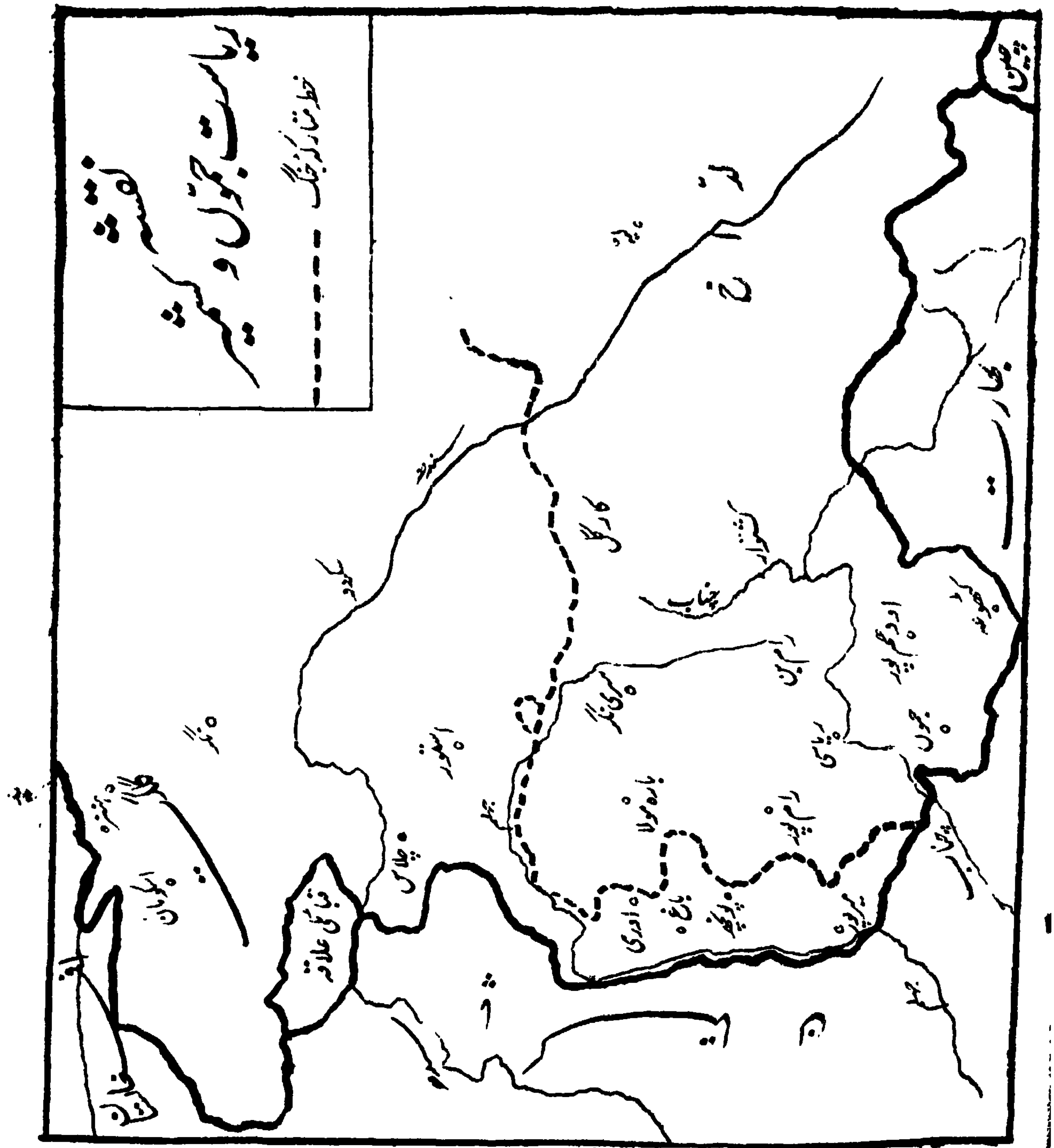
دوسرا منصوبہ ماڑھ ہوسٹل (عرض بلد ۸-۴ – ۳۲° شمال طول بلد ۴۲-۷۵° مشرق) تیسا کے مشرق اور کند ماڑھ کے شمال مغرب میں ایک پرانا اور مالی لحاظ سے قابل عمل منصوبہ ہے۔ مذکورہ بالا صورت کی طرح اس میں ڈھلان مخالف سمت میں نہیں ہے زمین کا ناہموار نشیب چناب سے راوی کے معاون کی جانب مخالف سمت میں نہیں ہے۔ زمین کا ناہموار نشیب چناب سے راوی کے معاون کی جانب ۷۰۰، ۵ فٹ سے ۳۰۰، ۳ فٹ تک ہے۔ درمیان میں پڑنے والے علاقے کے ایک حصہ کے سب سے بلند مقام کی بلندی ۴۰۰، ۸ فٹ ہے۔ یہاں یہ چیز پیش نظر رہے کہ مجوزہ ماڑھ ہوسٹل کا مقام کشمیر سے باہر بھارتی علاقہ میں واقع ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ منصوبہ کشمیر پر بھارتی قبضہ ہونے یا نہ ہونے سے بے نیاز ہو کر بروئے عمل لایا جا سکتا ہے۔ پانی کی وہ مقدار جو اس طرح موڑی جا سکے گی دریافت طلب ہے۔ لیکن مذکورہ بالا پہلی صورت سے یہ بہرحال کم ہی ہوگی۔

چناب کے پانی کو راوی میں ڈالنے کا ایک اور امکان بھی موجود ہے۔ اگرچہ اس میں ایک طویل فاصلے تک پانی لے جانا ہوگا تاہم اپنے علاقے کی ماہیت کے اعتبار سے یہ قابل عمل ہے۔ اور پانی کی اس مقدار کے لحاظ سے جس کا رخ موڑا جا سکے گا نفع بخش بھی ہے۔ چناب کے پانی کا کچھ حصہ اکھنور کے مقام پر نکلنے والی دو نہروں پرتاپ اور رنبیر میں جاتا ہے۔ ان دونوں میں نہر رنبیر جنوب مشرقی سمت میں جموں کو جاتی ہے۔ سطح سمندر سے اکھنور کی بلندی ۱۱۲۸ فٹ ہے جبکہ جموں کی بلندی ۱۰۲۹ فٹ ہے جموں کے قریب یہ نہر جنوب کی طرف جانے والی دو شاخوں میں منقسم ہو جاتی ہے۔ اس نہر کو جنوب مشرقی جانب ہی تھوڑا سا اور بڑھا کر جموں سے کٹھوعہ کے جنوب مشرق میں راوی سے ملایا جا سکتا ہے کٹھوعہ کی بلندی ۱۰۵۱ فٹ ہے جو جموں کی بلندی سے کچھ زیادہ ہے۔ لیکن مذکورہ بالا قصبے کے جنوب میں ۹۸۴ فٹ بلکہ اس سے

بھی کم ہو جائے گی ممکن ہے۔ رنبیر نہر میں اس قسم کا اضافہ اور جموں کٹھوعہ روڈ متوازی چلیں گے۔ اگرچہ نہر کی سطح کو ان کی سطح تک لانے میں کچھ مشکل ضرور پیش آئے گی۔

پاکستان میں سیلابوں اور زمین کے کٹاؤ کی بڑھتی ہوئی مشکلات کبھی چھپائی نہیں اور نہ انسدادی تدبیر جانتی ہیں۔ سیلابوں کی پچھلی تاریخ (جس کا انحراف اوسط سے دوگنا زائد ہے) یہ ظاہر کرتی ہے کہ برصغیر کا سب سے زیادہ سیلاب زدہ علاقہ مغربی پاکستان ہے ۱۸۶۸ء سے ۱۹۴۴ء تک شمال مشرقی سرحدی صوبہ میں ۹ سیلاب آئے، پاک پنجاب میں ۹ اور سندھ میں ۱۱۔ اس کے مقابلے میں بھارتی پنجاب میں اس دوران میں اگرچہ ۱۰ سیلاب آئے جبکہ بھارت کے دوسرے حصوں میں نسبتاً بہت کم سیلاب آئے جن کی کم سے کم تعداد ایک (چھوٹا ناگ پور) اور زیادہ سے زیادہ نو (مشرقی یو۔پی) ہے۔ شمال مشرقی سرحدی صوبہ، پنجاب، اور سندھ کے متعلق مجموعاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہاں اوسطاً ہر نواں سال سیلاب کا سال ہوتا ہے اگرچہ ۱۸۶۸، ۱۸۸۲، ۱۸۹۲، ۱۹۰۸، ۱۹۱۴، ۱۹۱۶، ۱۹۱۷ء، ۱۹۲۹، ۱۹۳۳، اور ۱۹۴۴ء اہم سیلابی سال رہے ہیں اور حسبِ معمول ان کے درمیان کوئی باقاعدہ زمانی فاصلہ نہیں ہے اور قیامِ پاکستان کے بعد سے تو دس بارہ سال میں کتنی ہی مرتبہ سیلاب آئے ہیں۔

متعلق سیلابوں کی وجوہات میں بارش کی زیادتی، برف کا زیادہ پگھلنا اور برف کے تودوں سے دریا کی عارضی بندش شامل ہیں جس کا نتیجہ رکاوٹ دور ہوتے ہی زبردست بہاؤ کی صورت میں نکلتا ہے۔ دریاؤں کی خصوصیات اور طرز اور اس کے ساتھ نہروں کی گنجائش، ان کا کٹاؤ، تہہ میں گارے کا جمنا، طاس کی ارضی ساخت اور سیلاب کے آنے سے قبل طاس کے علاقہ میں جذب کرنے کی گنجائش سیلابوں کے مسئلے کے سائنٹیفک مطالعے کے سلسلے میں اہم امور ہیں۔ یہ امور دریاؤں کے بالائی حصوں میں زیادہ اہم ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ پاکستان میں سیلابوں کے انسداد اور پیش گوئی کشمیر میں ان کوائف کے مسلسل مطالعے کی متقاضی ہے اور بہتر تو یہ ہے کہ انسدادی تدابیر بھی وہیں اختیار کی جائیں اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ کشمیر اور پاکستان ایک ہوں۔ (ترجمہ: عمر فاروق)


ریاست جموں و کشمیر
خط متارکہ جنگ
جموں
چناب

ڈاکٹر خلیل اللہ قریشی
شعبۂ جغرافیہ پنجاب یونیورسٹی

پاکستان کے لیے کشمیر کی فوجی اہمیت

کسی ریاست کی سرحدیں اسکی قوت یا کمزوری کی بہترین مظہر ہوتی ہیں۔ پرانے خیال کے مطابق اگر ہم ریاست کو ایک فرد سمجھیں تو قوت نمو یا اعضاء وجوارح کی کمزوری و انتشار کے آثار اس کی سرحدوں سے بخوبی ظاہر ہونگے۔ اس لئے کوئی ریاست بھی اپنی سرحد سے بے نیاز نہیں رہ سکتی۔ اور یہی معاملہ پاکستان کے ساتھ بھی ہے۔

بذات خود یہ امر بھی بہت اہم ہے کہ کشمیر کا علاقہ ۸۴۴۷۱ مربع میل، پاکستان کے بڑے سے بڑے ضلعے سے بھی بڑا ہے لیکن کشمیر کی فوجی و سیاسی اہمیت اس سے کہیں زیادہ ہے۔ کشمیر کا محل وقوع، مغربی پاکستان کے نہری پانی کا اس پر انحصار، قدرتی اور ناقابل تسخیر دفاعی لائن، ایشیا کی بڑی طاقتوں سے اس کا اتصال اور اس کے باشندے وہ عوامل ہیں جن سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

کشمیر ایک ناقابل عبور اور قدرتی دفاع کا حامل خطہ ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے۔ کہ قدرت نے اس علاقہ کو پانچ عظیم الشان کوہستانی دفاعی لائنوں سے مستحکم کرنے میں غیر معمولی احتیاط برتی ہے جو تین وادیوں پر محیط ہیں اور یہ وادیاں جن میں دریا بہتے ہیں خندق کا کام دیتی ہیں۔ دریائے جہلم، سندھ اور شیوک کی وادیاں پیر پنجال۔ بالا ہمالیہ، زنسکر، لداخ اور قراقرم کے سلسلہ ہائے کوہ سے گھری ہوئی ہیں جو سطح بحر سے ۱۴۰۰۰ فٹ سے ۱۵۰۰۰ فٹ تک بلند ہیں۔ برصغیر کے پورے شمال کو گھیرے ہوئے ہمالیہ کہیں بھی اس طرح واضح سلسلوں میں منقسم نہیں ہے۔ جس طرح کشمیر میں ہے اور نہ ہی ان سلسلوں کا عرض کہیں اتنا زیادہ ہے جتنا یہاں ہے۔ برصغیر کی پوری تاریخ ان رکاوٹوں کے ناقابل تسخیر ہونے پر شاہد ہے۔ وسط ایشیا کی ان بے شمار جنگجو جماعتوں نے جو گنگا کے زرخیز اور خوش حال میدانوں پر حملہ آور ہوئیں افغانستان ہی کا راستہ اختیار کیا خیال کیا جاتا ہے کہ ان میں سے کچھ تو سمرقند کے مشرق میں دوردراز علاقوں سے چلے تھے۔ ازمنۂ وسطیٰ کے اوائل میں ہندوستان آنے والے چینی سیاحوں کو بھی کشمیر کا مختصر راستہ چھوڑ کر افغانستان کا طویل اور پیچیدہ راستہ اختیار کرنا پڑتا۔ تاریخ کے بعد کے ادوار میں ہمالیہ کی مغربی شاخوں کے دروں، خیبر وغیرہ کے استعمال سے بھی کشمیر کے پہاڑوں اور وادیوں کی حصول جنگیاں کے ناقابل گذر ہونے پر روشنی پڑتی ہے۔

جس طرح یہ سلسلہ ہائے کوہ پاکستان پر اس طرف سے ہونے والے ہر حملے کے خلاف، پاکستان کی حفاظت کرنے میں مثبت قدروقیمت کے حامل ہیں، منفی طور پر یہ پہاڑ اگر کسی بیرونی طاقت کے قبضے میں ہوں تو دشمن کی پناہ گاہ بن کر پاکستان کے لئے بالکل اس طرح خطرناک بھی بن سکتے ہیں۔ میدانی حدود کے برعکس کوہستانی سرحدیں آہنی پردے کا کام دیتی ہیں۔ میدانی علاقوں میں ہمارے جاسوس سرحد پار کی ہر فوجی نقل وحرکت کا پتہ بآسانی چلا سکتے ہیں لیکن اس کے برعکس ان پردہ پوش سلسلوں کے اس پار بڑی سے بڑی فوجی نقل وحرکت بغیر کسی رکاوٹ اور اطلاع کے جاری رہ سکتی ہے۔ اس لئے پاکستان کے علاوہ کسی اور طاقت سے کشمیر کا الحاق پاکستان کا گلا گھونٹ دینے کے مترادف ہوگا۔

دیگر ایشیائی طاقتوں سے اتصال

ہوسکتا ہے کہ یہ بات متناقض معلوم ہو لیکن ہے یہ قرین عقل کہ برصغیر کے باہر کے حملوں سے محفوظ ہونے کے باوصف کشمیر کے علاقے کو علیحدگی سے کوئی نقصان نہیں پہنچا حالانکہ یہ ایشیا کی پانچ طاقتوں بھارت پاکستان، افغانستان، چین اور روس کا مقام اتصال ہے۔

بھارت کے ساتھ کشمیر کی سرحد ۲۰۵ میل لمبی ہے۔ یہ عددی اسلوب بیان ذرا غلط تاثر دیتا ہے کیونکہ ۱۵۰۰۰ فٹ بلند پہاڑی سرحد کسی طرح بھی باہمی تعلقات میں ممد ومعاون ثابت نہیں ہوسکتی۔ ۲۰ میل کا صرف ایک ٹکڑا قابل عبور ہے اور وہ بھی بہزار دقت۔ وہ مشکلات جو راوی پر سے گزرنے والی کٹھوعہ روڈ کی تعمیر میں پیش

آتی ہیں اس دعوے کی تصدیق کرتی ہیں اور اس تمام درد سر کے باوجود یہ سڑک محض ایک فوجی سڑک کی حیثیت رکھتی ہے جو جنگ کی صورت میں پاکستان کی طرف سے ایک معمولی سے حملے کی زد میں ہے۔ رسل و رسائل اور رسد کی کوئی دوسری متبادل لائن بھی نہیں ہے۔ اس طرح سے کشمیر اور بھارت کے درمیان یہ اکلوتا رابطہ ایک درخت کے تنے کی مانند ہے اور اگر اسے کاٹ دیجئے تو پورا درخت کشمیر میں پھیلی ہوئی جنگی مہم کی شاخوں سمیت دھڑام سے زمین پر آرہے گا۔ اس شہ رگ کے کٹ جانے کا مطلب یہ ہوگا کہ تمام بھارتی فوج کشمیر میں پھنس جائے گی۔ پھر اس تباہ کن نفسیاتی ردّعمل کا بھی کوئی علاج نہ ہو سکے گا جو محصور ہو جانے کا لازمی نتیجہ ہوگا۔ شاہراہ کی مداخلت کرتے ہوئے بھارتی فوجوں کو آگ یا پانی میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے کیونکہ اس لائن تک پہنچنے کے لئے ایک سے زیادہ راستے موجود ہیں جو سب کے سب بھارتی علاقے سے باہر ہیں۔ وہ راستے یہ ہیں۔ اچھ وادی سے ہوتے ہوئے جمبیر گڑھ تک ڈیگھ نالہ سے ہوتے ہوئے سمبا تک۔ اور سیالکوٹ جموں توی روڈ۔

کٹھوعہ جموں سرینگر روڈ تک پہنچنے کے یہ تمام راستے موجود واقع ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اس سڑک کی حفاظت کرنے والوں کو اپنی پسپائی کے خط کے متوازی لڑنا پڑے گا جو فوجی اعتبار سے ایک ناموافق صورت ہوگی۔ اس سڑک کے غیر محفوظ ہونے میں مزید اضافہ اس امر سے بھی ہوتا ہے کہ جو فوج بھی کشمیر کے باہر دریائے بیاس کے شمال مغرب میں کمین گاہ میں بٹھائی جائے گی وہ فوجی لحاظ سے صحیح پوزیشن میں نہ ہوگی کیونکہ اس فوج کو دفاعی مقاصد کے تحت کمین گاہ سے باہر نقل و حرکت کی بہت کم آزادی حاصل ہوگی۔

یہی وہ خامیاں ہیں جو کشمیر اور بھارت کے اس درمیانی رابطے کو فوجی کارروائیوں کے لئے بھی ناقابل استعمال بنا دیتی ہیں۔ کوئی امکان مستقبل قریب یا بعید میں اس کے تجارتی شاہراہ بن جانے کا بھی نظر نہیں آتا۔

سرزمین کشمیر کی سطح کی عجیب و غریب خصوصیات کی وجہ سے وہ برائے نام اتصال جو بھارت کو کشمیر سے حاصل ہے نہ ہونے کے برابر ہو جاتا ہے۔ کشمیر کی قدرتی ساخت پہ ایک نظر ڈالتے ہی سے یہ بات آشکارا ہو جاتی ہے کہ ریاست کا رُخ بھارت کی جانب نہیں بلکہ بھارت سے ہٹ کر ہے۔ کم سے کم مزاحمت کے خطوط۔ وادیاں وغیرہ ـــــ صرف بیشتر ہی نہیں بلکہ تمام کے تمام ہر جگہ مغرب سے مشرق کے بجائے مشرق سے مغرب کے رُخ واقع ہیں۔ یہ کوہستانی ساخت بھارت کشمیر سرحد کے بیشتر حصّہ کو ناقابل عبور بنا دیتی ہے۔ اس کے باوجود بھارت کشمیر سے بالکل ہی کٹا ہوا نہیں ہے۔ کم سے کم جہاں تک اس علاقے میں زندگی کی نبض محسوس کرنے کا تعلق ہے ـــــ سر سائرل ریڈکلف نے بڑی احتیاط اور نکتہ رسی سے کام لیتے ہوئے گورداسپور کا ضلع بھارت کے حوالے کر کے اسے ایک روزن مہیا کر دیا ہے۔

تبت کشمیر سرحد بھی بھارت کشمیر سرحد کے برابر طویل اور تنی ہی بلکہ بڑے پیمانے پر کسی منظم نقل و حرکت کے لئے زیادہ ہی دشوار گزار ہے۔ تبت کی منتشر اور قلیل آبادی، ناہموار زمین اور سب سے بڑھ کر سخت ناموافق موسم اس سرحد کے آر پار ہر قسم کی فوجی نقل و حرکت میں مانع ہیں۔

سن کیانگ اور روسی ترکستان کے ساتھ بھی اگرچہ پانچ سو میل لمبی سرحد ہے مگر یہ سرحد بھی فوجی سرگرمیوں کے لئے سازگار نہیں ہے۔ بالائی شیوک اور ہنزہ ہی وہ ایسی وادیاں ہیں جو دونوں علاقوں کو ملاتی ہیں اور جن پر علی الترتیب شمالی کشمیر سے چین اور روسی ترکستان کے درمیان آمد و رفت کا انحصار ہے۔ یہ وادیاں نہایت دشوار گذار ہیں کیونکہ یہاں کی آب و ہوا اتنی سخت خشک ہے کہ یہاں برف بھی نہیں پڑتی۔

سرینگر سے زوجیلا اور قراقرم ہو کر چینی ترکستان میں یارقند جانے والا راستہ سات دروں سے گزرتا ہے اور قدرتی رکاوٹوں کے باوجود اوپر کی طرف چڑھتا ہے۔ جگہ جگہ پہاڑوں کے گرے ہوئے ٹکڑوں سے راستہ بند ہو جاتا ہے۔ ایسے دریاؤں کی وجہ سے راستہ لمبے موڑ کاٹتا ہے جن کو پایاب عبور نہیں کیا جا سکتا۔ کہیں کہیں برف کے پھٹنے ہوئے تودوں سے راستہ صاف ہو جاتا ہے، کہیں یہ ایسی گھاٹیوں میں سے گزرتا ہے جہاں تیز دھوپ پڑتی ہے اور کوئی سایہ نہیں ہوتا اور کہیں ایسی سطوح مرتفع پر سے گزرتا ہے جہاں گلا دینے

والے سرد جھکڑ چلتے رہتے ہیں اور کوئی جائے پناہ نہیں ہوتی۔ سرینگر سے مشرقی جانب ۵۱ ۲ میل تک یہ راستہ زوجیلا سے لداخ میں لیہ کو جاتا ہے۔ زوجیلا دریائے سندھ کی وادی کے اوپر واقع ہے جو دریائے جہلم کا ایک معاون ہے۔ چونکہ یہ بلند مقامات جن میں یہ راستہ واقع ہے آب ہوا اور معاشی لحاظ سے موثر سد راہ ہیں اس لئے ایک مسافر درے سے گزرتے ہوئے دوسری طرف ایک دوسرا ہی ماحول اور منظر پاتا ہے۔

زوجیلا سے لیہ کا راستہ سورو وادی کی طرف جاتا ہے جہاں دراس اور کارگل کے قصبات ہیں۔ یہاں دریا پر راستے کے لئے اچھے پل بنے ہوئے ہیں۔ کارگل کے بعد راستہ مشرقی جانب دریائے سندھ پر سے گزرتا ہے یہاں دریا کو کشتیوں کے ذریعے عبور کیا جاتا ہے۔ اس مقام سے آگے راستہ کا رُخ مغرب سے مشرق کو ہے اور لیہ تک جو لداخ کا صدر مقام ہے راستہ زیادہ تر وادیٔ سندھ کے شمالی کنارے کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ ساڑھے گیارہ ہزار فٹ کی بلندی پر لیہ ایک مشہور قصبہ ہے اور شمال میں یارقند، مشرق میں لاسہ، مغرب میں پاکستان (وادی کے راستے) اور جنوب میں بھارت (کلو کے راستے) سے آنے والے قافلوں کا پڑاؤ ہے۔ وسط ایشیا کے قافلے موسم خزاں میں یہاں پہنچتے ہیں اور بازاروں میں رونق بڑھ جاتی ہے۔ "جو مقام مشرق بعید کے راستے میں ہانگ کانگ کو حاصل ہے وہی مقام یارقند کے راستے میں لیہ کو حاصل ہے"۔ یہاں سے راستہ پیچ و خم کھاتا ہوا شمال کی طرف مڑتا ہے۔ اس دشوار گزار مقام سے آگے یہ راستہ پہاڑی مزاحمتوں سے ہوتا ہوا دو قابل ذکر دروں کارڈنگلا اور ساسر پلا سے گزرتا ہے یہاں تک کہ بالائی شیوک کے معاونین سے گزر کر درہ قراقرم تک جا پہنچتا ہے جو ۲۹۰ر۱۸ فٹ بلند ہے۔ قراقرم کے بعد راستہ ڈھلوان ہو جاتا ہے اور مزید شمال میں چینی ترکستان جا پہنچتا ہے۔

تھامس ہالڈیچ نے ان الفاظ میں اس راستے کی منظر کشی کی ہے۔

"پتھریلے میدانوں میں میلوں تک یہ سڑک ایک تنے ہوئے سفید تاگہ کی مانند معلوم ہوتی ہے جس کے دونوں کناروں پر بھوک اور دکھ بھری زندگی کا شکار ہونے والوں کی ہڈیوں نے حاشیہ آرائی کر رکھی ہے پرانے قافلوں کے دہشت ناک آثار ——— شاید دنیا بھر میں سب سے زیادہ کریہہ المنظر تجارتی شاہراہ یہی ہے۔ نہ کوئی درخت، نہ کوئی جھاڑی اور نہ وہ سرد اور بے جان حسن جو برف کی چادر بلند مقامات کو عطا کرتی ہے۔ کیونکہ ہمالیہ اور اس کی شاخوں کی پشت کے بلند علاقوں میں کچھ زیادہ برف باری نہیں ہوتی"۔

بے مہر ماحول، شدید آب و ہوا، نامانوس بلند فضا، دشوار گزار علاقہ، چینی ترکستان اور تبت کے پڑوسی ملکوں کی منتشر اور قلیل آبادی کی بنا پر بڑے بڑے قافلوں کا گذرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کے باوجود یہ راستہ پاکستان کے شمالی درہ ہائے میں سے ایک درہ ہے جسے اب تک کسی نہ کسی طرح جاری رہنے والی تجارت نے کم از کم نیم وا رکھا ہے۔ حال ہی میں اس کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔ کیونکہ تبت میں سرخ چین کے بڑھتے ہوئے اثرات اور ترکستان پر اس کے تسلط نے وینڈل ولکی کے ان الفاظ کی تصدیق کر دی ہے کہ "دنیا میں سن کیانگ ایک ایسا علاقہ ہے جہاں سیاست اور جغرافیہ مل کر دنیا کے مستقبل کے بارے میں دلچسپی رکھنے والوں کے لئے ایک معنی خیز مرکب بن جاتے ہیں"۔

وہ راستہ جو ایبٹ آباد کے شمال میں وادی کنہار اور چیلاس سے ہوتا ہوا گلگت جاتا ہے اس قابل ہے کہ پاکستان چین اور روس کے درمیان کشمیر سے گزرتی ہوئی ایک کڑی کا کام دے سکے۔ درہ بابوسار جو کشمیر اور شمال مغربی سرحدی علاقے کی سرحد پر واقع ہے سطح سمندر سے ۶۹۰ر۱۳ فٹ بلند ہے۔ اور نقل و حمل میں زیادہ دقت پیش نہیں آتی۔ چلاس پر دریائے سندھ پایاب عبور کیا جا سکتا ہے۔ گلگت پر یہ راستہ دو شاخوں میں منقسم ہو جاتا ہے۔ ایک تو وادی گلگت سے ہوتا ہوا گلگت ایجنسی تک جاتا ہے اور ہنزہ سے گذر کر روسی ترکستان تک پہنچتا ہے۔ چند واضح وجوہات کی بنا پر اب تک اس راستہ کی چھان بین کی گئی ہے نہ اسے استعمال کیا گیا ہے ہو سکتا ہے کہ مستقبل میں بھی اس راستے کی فوجی اہمیت زیادہ نہ ہو لیکن اس کے باوجود یہ راستہ دونوں طاقتوں کے درمیان مؤثر علاقائی رابطے کے باعث روس اور پاکستان کے مابین بہتر سیاسی تعلقات استوار کرنے میں اہم کردار ادا کرے گا۔

افغانستان کا وہ علاقہ جسے جزیرہ نمائے وخان کہا جاتا ہے اور جو ایک عرصہ سے عدم توجہی کا شکار ہے کشمیر کے شمال مغرب میں واقع ہے۔ یہ علاقہ ایک مقام پر صرف آٹھ میل چوڑا ہے۔ یہ اتنا تنگ ہے کہ کشمیر اور افغانستان کے درمیان کوئی معقول رابطہ پیدا کرنے میں معاون نہیں ہو سکتا۔ اور پہاڑی ہونے کی وجہ سے افغانستان اس کی پوری طرح حفاظت بھی نہیں کر سکتا۔ دباؤ ڈالنے کے لئے اس علاقے کو آسانی سے کاٹا جا سکتا ہے۔ انیسویں صدی کے استعمار پسند روس اور برطانوی ہند کے درمیان براہ راست تصادم سے بچنے کی خاطر یہ علاقہ برطانوی حکمت عملی کا پیدا کردہ تھا اور آج بھی پاکستان اور روس کے درمیان سرحدی جھگڑوں سے بچنے میں مدد دے رہا ہے۔ لیکن دونوں طاقتوں کے درمیان سیاسی تعلقات بڑھانے میں حائل نہیں ہے کیونکہ یہ تو دونوں طاقتوں کے درمیان صرف براہ راست اتصال کو روکتا ہے۔ حلقہ پامیر تا قدمیاش کا علاقہ جہاں روس چین افغانستان اور کشمیر کے علاقے ایک دوسرے کے قریب جا آتے ہیں خاص توجہ کا مستحق ہے۔ ہوکر یا سار یکول کے پہاڑ طول میں شمال سے جنوب کی طرف جاتے ہیں اور اس طرح سن کیانگ اور روسی ترکستان کے درمیان ایک قدرتی خط فاصل بناتے ہیں۔ اپنے جنوبی سلسلوں میں کشمیر کی سرحد تک پہنچنے سے پہلے یہ مغرب کی طرف ایک کارآمد چکر کاٹتے ہیں۔ مغرب کی طرف یہی چکر وہ حلقہ بناتا ہے جو مذکورہ بالا طاقتوں کو باہمی سیاسی سرگرمیاں جاری رکھنے کے قابل بناتا ہے۔

پاکستان سے رشتے

پاکستان اور کشمیر کی ساڑھے تین سو میل لمبی سرحد کشمیر کی دوسری سرحدوں سے زیادہ لمبی نہیں ہے۔ لیکن یہی وہ سرحد ہے جہاں جغرافیائی معاشی اور نسلی تعلقات قائم ہیں۔ شمال مغربی سرحدی علاقے اور کشمیر کی سرحد پر خصوصاً اور باقی سرحد پر عموماً وہ بے شمار پیچ و خم دونوں خطوں کے جو کہیں پاکستانی علاقہ میں بڑھ آئے ہیں اور کہیں کشمیری علاقہ میں حقیقی میلان کو ظاہر کرتے ہیں۔ یہ سرحدی خم ایک دوسرے سے اس طرح پیوست ہیں کہ دونوں علاقے ایک دوسرے میں ضم ہو کر وجود لاینفک معلوم ہوتے ہیں۔

کشمیر کا رُخ پاکستان کی طرف ہے۔ کشمیر کے دریا۔ سندھ، جہلم اور چناب جن میں ریاست کی زندگی ہے ـــــ سب کے سب پاکستان کی طرف جاتے ہیں۔ دریا عام طور پر تجارت کے لئے اہم شریانوں کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن ان کی یہ حیثیت کشمیر کی ناہموار اور سنگلاخ سطح کی وجہ سے اور بھی زیادہ اہم ہو جاتی ہے کیونکہ یہاں دیگر ذرائع آمد و رفت بہت ہی کم ہیں۔ پاکستان کی طرح کے ایک دریائی ملک کے لئے دریاؤں کے سرچشمے اور بالائی حصے بہت اہم ہوتے ہیں اور اس بنا پر کشمیر ہماری پوری پوری توجہ کا مستحق ہے۔ نہروں کے ہیڈ ورکس بنانے کے لئے موزوں مقامات یہیں واقع ہیں۔ یہیں سیلابوں کی روک تھام کے لئے دریاؤں پر بند باندھ کر ان پر قابو پایا جا سکتا ہے اور ایسے مقامات بھی یہیں ہیں جہاں سستی بجلی پیدا کی جا سکتی ہے۔ اگر یہ مقامات کسی بد اندیش ملک کے قبضہ میں ہوں تو سرے سے دریاؤں کے راستے ہی تبدیل کر دینا جدید فنی کمال کے لئے ناممکن نہیں ہے۔

کشمیر کے ذرائع آمد و رفت بھی پاکستان کے رُخ واقع ہیں۔ سیالکوٹ جموں روڈ جو بانہال روڈ کے نام سے کشمیر کی جانب آگے جاتی ہے، گجرات بھمبر روڈ، جہلم میرپور روڈ، جہلم وادی کا راستہ اور ایبٹ آباد مانسہرہ مظفرآباد روڈ۔ پاکستان اور کشمیر کے درمیان اتنے مشہور راستے ہیں کہ یہاں ان کی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف اتنا کہہ دینا ہی کافی ہو گا کہ وہ دستکاریاں جن کے لئے کشمیر مشہور ہے پاکستان میں ان راستوں بالخصوص وادی جہلم کے راستے سلطان زین العابدین کے عہد میں بھی پہنچتی تھیں۔

پاکستان اور کشمیر کی اقتصادیات ایک دوسرے سے اس طرح مربوط ہیں کہ کوئی مصنوعی اور سیاسی خط کھینچ کر ان کو علیحدہ کر دینا ناقابل تصور ہے۔ کشمیر میں خوراک کی کمی ہے۔ خشک آب و ہوا اور ایک سنگلاخ سطح کی وجہ سے کل زمین کا صرف پانچ فی صد زیر کاشت آتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ قابل کاشت زمین کے ہر مربع انچ سے پورا پورا فائدہ اٹھانا لازم ہے۔ جامع اعداد و شمار کی غیر موجودگی میں قابل کاشت زمین کے رقبہ کو وسیع تر کرنے کی غرض سے دریاؤں

اور جھیلوں پر تیرتے ہوئے کھیتوں کی دانشمندانہ تدبیر کشمیر میں قابل کاشت زمین کی انتہائی کمی کا مکمل ثبوت ہے چنانچہ قدرتی طور پر ۱۰ لاکھ من اناج اور دانوں کی سالانہ درآمد کی بہم رسانی کے لئے کشمیر پاکستان کا محتاج ہے۔ اگر ضرورت کے مطابق خوراک کی مقدار مل جائے تو کشمیر آسانی کے ساتھ پھولوں اور پھلوں کی کاشت پر اپنے تمام وسائل لگا سکتا ہے جو تمام دوسری زرعی پیداوار سے زیادہ منافع بخش ہے

کشمیر کے جنگل ۱۰،۲۷۴ مربع میل کے رقبے میں پھیلے ہوئے ہیں ان پر ریاست کی کل آمدنی کے ایک تہائی سے نصف تک کا انحصار ہے۔ اس ضمن میں کشمیر کے مفاد کے لئے سب سے بہتر صورت یہی ہے کہ لکڑی کے شہتیروں کو ان دریاؤں میں بہایا جائے جو پاکستان میں آتے ہیں۔ جہلم اور وزیر آباد کو کشمیری لکڑی کی منڈیوں کی حیثیت میں باقی رکھنے سے اہل کشمیر کو ایک کروڑ روپیہ سے زیادہ کی سالانہ آمدنی ہوگی۔ اور اس کے ساتھ ہی پاکستان میں عمارتی لکڑی، بانس اور بید کی ضروریات پوری ہوجائیں گی نرم لکڑی اور لکڑی کے گودے کی بہم رسانی سے مغربی پاکستان میں کاغذ سازی کی صنعت قائم کرنے کے امکانات بڑھ جائیں گے

سیر و سیاحت جو کشمیر کی آمدنی کا ایک بڑا ذریعہ ہے اور جس سے ریاستی حکومت کو ۶۰ لاکھ روپے کی سالانہ آمدنی ہوتی ہے کشمیر کا پاکستان سے اتصال کا ثمرہ ہے۔

کشمیر کو معاشی استحکام کی جو ضمانت پاکستان دیتا ہے اس کے صلہ میں کشمیر بھی پاکستان کی ایک سے زیادہ طریقوں سے مدد کرسکتا ہے دریاؤں کی گزرگاہوں پر جو زیادہ تر کشمیر میں ہیں۔ مستقل نوعیت کی شجرکاری سے زمین کے کٹاؤ اور سیلابوں کی روک تھام کے سلسلے میں پاکستان کی بڑی ٹھوس مدد ہوگی۔ مظفر آباد، جموں اور سوہرا کے مقامات پر بجلی کی پیداوار میں اضافہ کرکے مغربی پاکستان میں بجلی کی کمی کو دور کیا جاسکتا ہے منگلا ہیڈ ورکس جو کشمیر پر کسی بیرونی طاقت کے قبضے کی صورت میں خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ ہمارے ہاتھوں میں بالکل محفوظ ہوگا۔ اور رچنا دوآب کے جنوبی علاقوں میں تین لاکھ ایکڑ اراضی کو ملنے والے پانی کی رسد بھی محفوظ ہوجائے گی جہاں گندم اور امریکی کپاس کی بہترین فصلیں تیار ہوتی ہیں۔ پھر جموں میں باکسائٹ کی قسم کی فوجی اہمیت کی ایک معدن کے بے پناہ ذخائر ہمارے جیسے ملک کے لئے بڑے قیمتی ہونگے جس کے پاس کافی معدنیات نہیں ہیں۔

کچھ اور امور

یہ بات خواہ کتنی ہی عجیب کیوں نہ محسوس ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ کشمیر جو آج آویزشوں کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ صدیوں سے لوہ تستور، کا مرکز رہا ہے کشمیریوں نے تاریخ کے ہاتھوں بہت ستم سہے ہیں۔ اب اس بات کی ضرورت ہے کہ اس سرزمین میں امن کا دور دورہ ہو۔ پاکستان سے ہم رشتہ ہونے ہی میں اس امن کی ضمانت ہے کیونکہ اسی صورت میں تعمیراتی منصوبوں پر آسانی سے عمل ہوسکے گا۔ طویل المیعاد ترقیاتی منصوبوں سے ایک حصہ کے طور پر یہاں ایک سلاح خانہ بنانے کا امکان بہت روشن ہوجاتا ہے۔ روس نے یورال کے مشرق میں جو سلاح خانہ بنائے ہیں۔ وہ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ اس قسم کے کارخانے محفوظ علاقوں ہی میں نصب کرنے چاہئیں جو چاروں طرف سے گھوم رہے ہوں اور جہاں مکمل راز داری رہ سکے۔ پھر بحری، بری اور ہوائی فوج کے لئے ایک مشترکہ تربیت گاہ بنانے کی ضرورت بھی ہماری توجہ گل پر مرکوز کردیتی ہے جو تمام جنوب مشرقی ایشیا میں اس مقصد کے لئے بہترین مرکز ہے۔ محض منظر کا حسن اور جانفزا آب و ہوا ہی فوجیوں کو مضبوط اور قوی بنا دیتے ہیں۔

حاشیہ چناب کے پانی کا رخ موڑنا نسبتاً آسان ہے۔ چناب اور راوی کے دو بعد میں شامل ہونے والے معاون زمین کا ٹنے کے قدرتی عمل کے دوران بھادر واہ کے جنوب میں اودھم پور کے قریب ایک دوسرے کے پاس پاس آگئے ہیں۔ ڈوڈا کے قریب چناب پر بند باندھ کر اور مذکورہ بالا معاونوں کے سرچشموں کے درمیان سرنگ کھود کر چناب کے پانی کو راوی میں ڈالنے کے کام کی تکمیل کی جاسکتی ہے جو پاکستان میں داخل ہونے سے پہلے بھارت کے علاقے میں بھی چکر کھاتا ہوا بہتا رہتا ہے۔ حکومت پاکستان کے ایک اعلان میں جو ۱۰ اگست ۵۱ء کو جاری کیا گیا تھا۔ یہ انکشاف ہوا تھا کہ بھارت کے پیش نظر پہلے ہی سے ایک ایسا منصوبہ ہے۔ جس کے ذریعے چناب کے پانی کو بھارتی علاقے کی طرف موڑا جاسکے گا

پختونستان کا نعرہ اگرچہ خیالی اور مضحکہ خیز ہے لیکن اس کی مرتاں کشمیر کی صورت حال کے نشیب و فراز کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ رہی ہے اور یہ حقیقت مسئلے کی نوعیت کو سمجھنے کے لئے ہمیں ایک اشارہ مہیا کرتی ہے۔ کشمیر کا پاکستان سے الحاق کابل ریڈیو پر بیرونی اثرات کا خاتمہ کر دے گا۔ اور وہ از خود سکھائی ہوئی بولی بولنا بند کر دے گا اور یہ بے بنیاد نعرہ اپنی موت آپ مر جائے گا۔

آخری تجزیے میں اس علاقے کی طاقت کے سب سے اہم سرچشمے کا نمبر آتا ہے جسے افرادی قوت کہا جاتا ہے۔ ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے مطابق کشمیر کے باشندوں کی تعداد ۴۰,۲۱,۶۱۶ تھی جس میں ۰۰۰... ۳۲ د بز ۱۱ و ۷۷ مسلمان اور باقی زیادہ تر ہندو تھے (۲۰ بز ۱۲ و ۲۱) دونوں مذہبی جماعتیں ایک عرصے سے ایک دوسرے سے ممتاز چلی آرہی ہیں۔ ان کے فرق کی بنیاد کسی نسلی اختلاف پر نہیں ہے بلکہ یہ دونوں جماعتیں ایک صدی کے غیر مسلم اقلیت کے ظالمانہ راج کی اس طویل تاریخ کی پیداوار ہیں جس کی ابتدا ۱۸۴۶ء میں لاہور کے خزانے سے لوٹے ہوئے ۷۵ لاکھ روپے کی حقیری رقم کے عوض گلاب سنگھ کے کشمیر خریدنے پر ہوتی ہے۔[1]

ظالم اور مطلق العنان ڈوگرا حکومت کا طرہ امتیاز یہ پالیسی تھی کہ مسلمانوں کو اپنی اغراض کے لئے مسلسل استعمال کیا جائے اس کا یہ طویل دور اپنی تمام تر زہرناکی اور تلخی کے باوصف معاشرے کی دو واضح طبقات میں تقسیم پر منتج ہوا — ایک وہ طبقہ جو خون چوس رہا تھا اور دوسرا وہ جس کا خون چوسا جا رہا تھا۔ مسٹر ونگیٹ کشمیر میں بحالیات کے کام کی ابتدائی رپورٹ میں لکھتے ہیں کہ

"مالیہ کا نظام ایسا ہے کہ چاہے کشمیری کاشتکار زیادہ کام کرے یا کم، اس کے پاس فصل سے اتنا ہی چھوڑا جاتا ہے جس کے سہارے وہ اصلی فصل تک زندہ رہ سکے۔ وہ ایک کثیر اور آرام طلب شہری آبادی کے لئے فاضل دھاول پیدا کرنے کی ایک مشین ہے۔ شالی کے اس قدر سستا ہونے کا راز یہ ہے کہ اگر قیمتوں کو ان کے صحیح معیار تک بڑھنے دیا جائے تو پنڈتوں کی پوری جماعت حکومت کو اپنے مطالبات کے سامنے سر تسلیم خم کرنے پر مجبور کر دے گی۔

مسلمان کاشتکار کو شالی پیدا کرنے اور اسے بازار کے صحیح بھاؤ سے کم پر بیچنے پر مجبور کر لیا جاتا ہے تاکہ شہری پوری طرح آسودہ رہیں۔ اگر فصل دونوں (کاشتکار اور شہری آبادی) کے لئے ناکافی ہو جائے تو شہر کو بہر حال رسد پہنچائی جائے گی۔ خواہ اس کے لئے کتنے ہی جبر سے کیوں نہ کام لینا پڑے اور کاشتکار اور اس کے اہل و عیال کو اس کے بغیر ہی گذارا کرنا پڑے۔"

اس سماجی تفریق اور اس کے نتیجہ میں مسلمانوں میں ہندو راج کے خلاف پیدا ہونے والی نفرت سے مجبور ہو کر آبادی کے ایک بہت بڑے حصے کی نظریں پاکستان پر پڑنے لگی ہیں جہاں ان کے ہم مذہب بھائی بند ایک ابھرتی ہوئی نئی جمہوریت کے سایہ تلے اپنی قسمتوں کے آپ مالک ہیں۔

شمال اور شمال مشرق میں وادیٔ کشمیر جو پہاڑوں میں گھستی ہوئی میدانوں کی ایک زبان سی معلوم ہوتی ہے نسلی و قومی لحاظ سے ایک پاکستانی علاقہ ہے جس کے ہر حصہ میں خصوصیت مسلمانوں کی بھاری اکثریت ہے۔

پاک کشمیر سرحد کے دونوں جانب تہذیبی و تمدنی مناظر کی یکسانیت حالیہ جد و جہد آزادی کے دوران میں یہاں کے باشندوں کی شجاعت کا پر شکوہ مظاہرہ اور کشمیریوں کا پاکستان کی طرف میلان سب کے سب فوجی نقطہ نگاہ سے اہم امور ہیں۔

افراد کی تعداد ہی نہیں بلکہ ان کے اوصاف و خصوصیات بھی بہت اہم ہوتے ہیں۔[2] ذہنی اعتبار سے کشمیری ہندوستان کے

---

[1] اس کیلئے گلاب نے چار لاکھ پونڈ ادا کئے جو اس نے برطانوی علاقہ[*] برطانیہ رعایا کو لوٹ کر اور قتل و غارت کر کے پیدا کئے تھے۔ انگریزوں سے اپنی غیر مشروط وفاداری اور پرخلوص دوستی کے اظہار کے طور پر اس نے ۱۸۴۹ء کو چلیانوالہ میں انگریزوں کے خلاف کشمیر سے شیر سنگھ کی مدد کے لئے ایک دیسی املادی فوج بھیجی۔ بعد ازاں گورنر جنرل نے گلاب سنگھ کے متعلق کہا تھا "وہ اول درجے کا بدمعاش ہے جس کا رستی بعید دراز ہے۔ ایسا بدمعاش جو حاکم ہو۔ یا کوڑی کوڑی کا محتاج ہر صورت میں بدمعاش ہے۔" جے۔ الیف۔ ای امپیریل ملٹری جیوگرافی صفحہ ۵

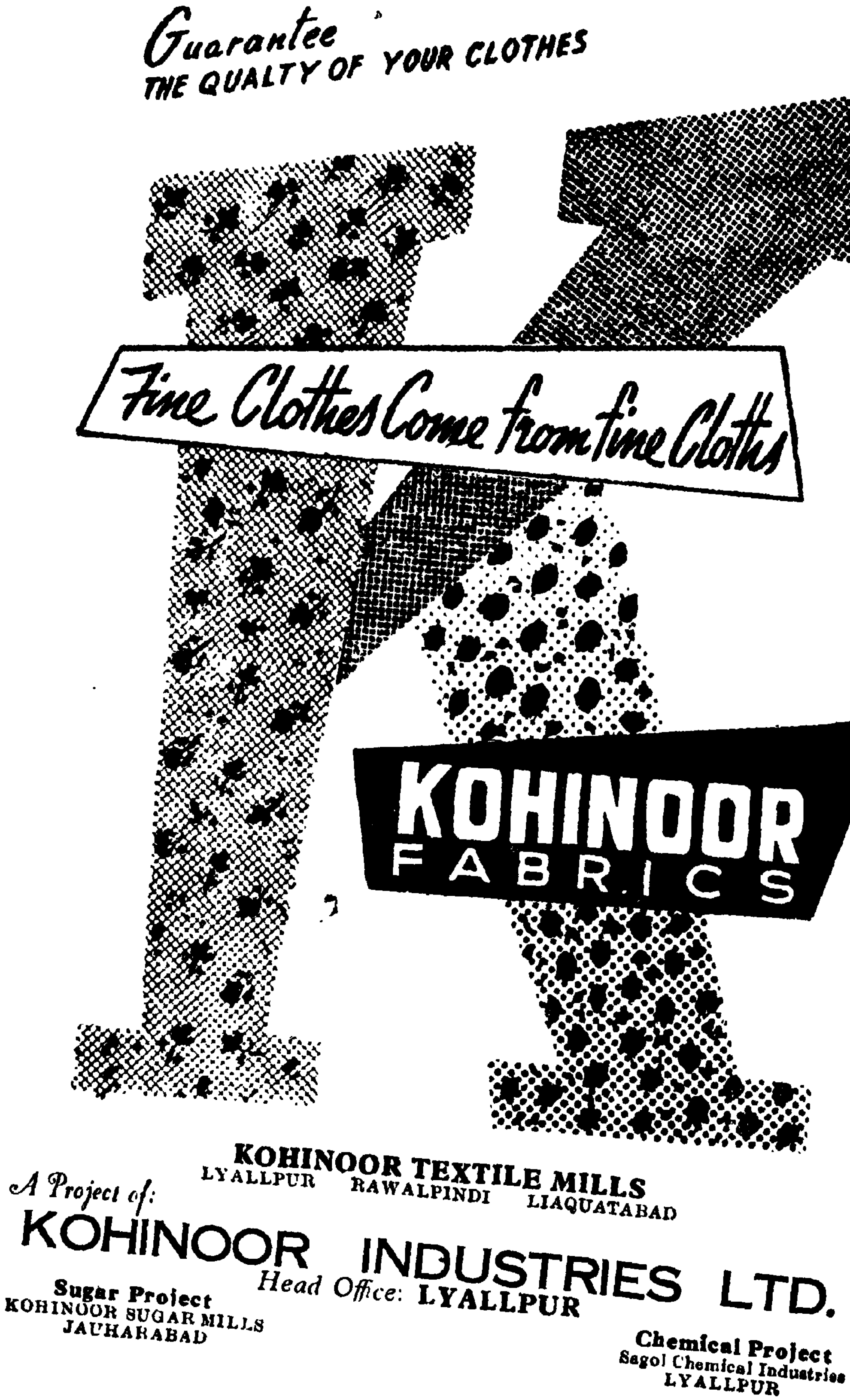
[2] جے الیف ای نے امپیریل ملٹری جیوگرافی میں ۵ پر لکھا تھا کہ جب وسط ایشیا میں طوفان اٹھے گا۔ تو نئی جمہوریتیں جو سب کی سب بلا استثنا مسلمان ہیں

باشندوں میں سب سے زیادہ بلند ہیں۔[1] کشمیریوں کی اعلیٰ درجے کی دستکاری اور فنی مہارت ان کی اختراعی اور تخلیقی صلاحیت کا نتیجہ ہے۔ وہ جسم اور ذہن دونوں کی خصوصیات کے مالک ہیں۔ کشمیر نے اگر ایک طرف گاما پہلوان جیسے جسمانی کمال کے مجسمے پیدا کیے ہیں تو دوسری طرف بین الاقوامی شہرت رکھنے والے فلسفی شاعر علامہ اقبال جیسا ذہین فرد بھی پیدا کیا ہے۔ اقبال کے فلسفہ حیات کا اثر پاکستان کے پڑھے لکھے طبقے پر بہت گہرا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ہم پہلے ہی سے کشمیر کے ممنون احسان ہیں۔ کشمیریوں کے ساتھ یگانگت کا یہ احساس جو تمام تر فوجی حکمت عملی کا اصلی مقصد ہے۔ ہمارے لئے عادی اور ذہنی اعتبار سے مزید تقویت کا باعث ہوگا۔

ترجمہ: عمر فاروق

ص[2] کشمیر میں اپنے بھائیوں کی آزادی کے لئے کوشاں ہوں گی۔ یہ پیشگوئی اکتوبر ۱۹۴۷ء میں تھوڑے سے تغیر کے ساتھ اس وقت پوری ہوئی جب ملحقہ پاکستانی علاقے کے مسلمان اپنے مظلوم و مقہور بھائیوں کو نجات دلانے کے لئے پہنچ گئے

ص[1] لارنس دی ویلی آف کشمیر ص۲۳۶


Guarantee THE QUALTY OF YOUR CLOTHES
Fine Clothes Come from fine Cloths
KOHINOOR
FABRICS
KOHINOOR TEXTILE MILLS
LYALLPUR RAWALPINDI LIAQUATABAD
A Project of:
KOHINOOR INDUSTRIES LTD.
Head Office: LYALLPUR
Sugar Project
KOHINOOR SUGAR MILLS
JAUHARABAD
Chemical Project
Sagol Chemical Industries
LYALLPUR

شعبۂ اطلاعات اقوام متحدہ

مسئلہ کشمیر — اقوام متحدہ سیکورٹی کونسل میں

۱۹۴۷ء سے ریاست جموں و کشمیر کا مسئلہ — سرکاری زبان میں بھارت اور پاکستان کا مسئلہ اور زیادہ مقبولِ عام اصطلاح میں مسئلہ کشمیر اقوام متحدہ کے سامنے پیش ہے۔ اوائل ۱۹۴۸ء میں یہ مسئلہ بھارت کی درخواست پر سیکورٹی کونسل میں لایا گیا تھا۔ ۱۹۵۲ء کے بعد ۱۹۵۷ء میں سیکورٹی کونسل پاکستان کی درخواست پر پھر اس مسئلے کو زیرِ بحث لائی اور کشمیریوں کی قسمت اور کشمیر کے سیاسی مستقبل کا فیصلہ کرنے کی خاطر وہاں ایک دفعہ پھر استصواب رائے کی قرارداد منظور کی۔

لیکن اس کے ایک ماہ بعد سوویٹ روس نے سیکورٹی کونسل کی اس قرارداد کی مخالفت کی جس کے مطابق طے ہوا تھا کہ کونسل کے صدر گونار وی جارنگ کو کشمیر بھیجا جائے تاکہ وہ وہاں جا کر مسئلہ کے تصفیے کے امکانات تلاش کریں اور بھارتی فوج کو وہاں سے ہٹا کر اقوام متحدہ کی فوج کی زیرِ نگرانی آزادانہ استصواب رائے کرانے کی کوشش کریں۔ تب اس مخالفت کے پیشِ نظر کونسل نے ایک قدرے نرم قرارداد منظور کی اور مسٹر جارنگ کی زیرِ قیادت ایک مشن بھارت اور پاکستان میں بھیجا تاکہ ان دونوں ملکوں کے مابین سمجھوتہ کروا سکے۔

۲ جنوری کو پاکستان کے وزیر خارجہ (ملک فیروز خاں نون) نے کونسل سے درخواست کی تھی کہ کشمیر کے موجودہ حالات کے پیشِ نظر کونسل کا اجلاس جلد از جلد بلایا جائے۔ انھوں نے اس خدشے کا اظہار کیا تھا کہ سری نگر میں بیٹھی ہوئی اسمبلی نے ایک نیا دستور منظور کیا ہے جس کی رو سے کشمیر کو بھارت کا باقاعدہ حصہ بنا دیا جائے گا۔ یہ نیا دستور ۲۶ جنوری کو نافذ ہونے والا تھا۔

بھارت اور پاکستان کے نمائندوں کے بیانات سننے اور اس سلسلے میں تائیدی شہادتیں وصول کرنے کے بعد سیکورٹی کونسل نے ۲۴ جنوری کو دس میں سے نو ووٹوں (سوویٹ روس نے ووٹ نہ دیا تھا) سے اپنی پہلی قراردادوں کی تصدیق کر دی کہ جموں اور کشمیر کے باشندوں کو یہ موقع دیا جائے کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق بھارت یا پاکستان جس سے چاہیں الحاق کر لیں۔ اس اجلاس نے دونوں اطراف کو کشمیر میں استصواب رائے کی خاطر اقوام متحدہ کے مقرر کیے ہوئے کمیشن کی کئی ایک پہلی قراردادوں کی یاد دہانی کرائی اور یہ فیصلہ کیا کہ سری نگر میں بیٹھی ہوئی کسی اسمبلی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کوئی قانون منظور کر کے کشمیر کا الحاق بھارت سے کر دے۔

کشمیر کے الحاق کا مسئلہ پہلی مرتبہ جنوری ۱۹۴۸ء میں سیکورٹی کونسل کے سامنے پیش ہوا تھا۔ اس وقت بھارت نے شکایت کی تھی کہ قبائلی کشمیر پر حملہ کر رہے ہیں اور وہاں وہ جنگ جاری ہے۔ ۱۹۴۷ء کے آئینِ آزادی کی رو سے ریاست کشمیر کو یہ حق حاصل تھا کہ بھارت یا پاکستان جس سے چاہے اپنا الحاق کر سکتی ہے۔ جب قبائلی کشمیر میں گھس آئے تو مہاراجہ کشمیر نے بھارت سے الحاق کی درخواست کی اور بھارتی حکومت اس بات کے پیشِ نظر الحاق پر رضامند ہو گئی کہ جب حالات بحال ہو جائیں گے تو اس مسئلے کا فیصلہ عوام کی خواہشات کے مطابق کر دیا جائے گا۔ بھارت نے کشمیر کے دار الحکومت سری نگر اور اس کی ملحقہ زرخیز اور خوبصورت وادی میں اپنی فوجیں اتار دیں۔ پاکستان نے مہاراجہ کے الحاق کا فعل غیر قانونی سمجھ کر اپنی فوجیں بھی کشمیر میں اتار دیں۔ اب دونوں ملکوں کے مابین باقاعدہ فوجی جھڑپیں ہونے لگیں۔

اس جنگ کو بند کرانے کے لیے سیکورٹی کونسل نے فوراً ایک کمیشن مقرر کر دیا۔ بہت سی ناکام کوششوں کے بعد اس کمیشن نے چند تجویزیں پیش کیں جو خاصے غور و خوض کے بعد بھارت اور پاکستان نے منظور کر لیں اور یکم جنوری ۱۹۴۹ء کو کمیشن نے دونوں ملکوں کو جنگ بندی کا حکم دے دیا۔ ان تجویزوں میں یہ باتیں شامل تھیں کہ کشمیر کے الحاق کا فیصلہ آزادانہ اور غیر جانبدارانہ استصواب رائے سے کیا جائے گا اور استصواب رائے کی نگرانی کے لیے اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل ایک ناظم مقرر کریں گے۔ استصواب رائے کا کام کرنے والے تمام افسر

اُس عالم کے ماتحت جنوری ۱۹۴۹ء میں خطِ جنگ بندی کا تعین بھی کر دیا گیا۔

لیکن آزادانہ استصوابِ رائے سے پہلے بھارت اور پاکستان اپنی فوجیں کشمیر سے ہٹانے پر متفق نہ ہو سکے۔ اس پر اقوامِ متحدہ کا ایک نمائندہ اس کام کے لیے مقرر کیا گیا۔ پہلے یہ کام آسٹریلیا کے سر اوون ڈکسن اور بعد میں امریکہ کے ڈاکٹر فرانک پی۔ گراہم کے سپرد کیا گیا۔ اپریل ۱۹۵۲ء میں اقوامِ متحدہ کے نمائندے نے رپورٹ دی کہ بھارت اور پاکستان کے مابین کوئی معاہدہ کرانے میں اب صرف یہ خاص بات باقی رہ گئی ہے کہ خطِ جنگ بندی کے دونوں طرف دونوں ملکوں کی فوجیں کتنی تعداد میں اور کس نوعیت کی ہونی چاہئیں اور اقوامِ متحدہ کے ناظم کو کس تاریخ سے استصوابِ رائے کے کام کا اختیار حاصل ہوگا۔

اجلاس کی درخواست

۱۰ جنوری ۱۹۵۷ء کو پاکستان کے وزیرِ خارجہ نے سیکورٹی کونسل سے مسئلہ کشمیر پر اجلاس بلانے کی درخواست کی اور کہا کہ گزشتہ تین سال میں پاکستان کی مسلسل کوششوں کے باوجود اس تنازع کا کوئی اطمینان بخش حل نہیں نکل سکا۔ انھوں نے کہا کہ ۲۹ مارچ ۱۹۵۶ء کو بھارتی وزیرِ اعظم نے مجلسِ قانون ساز میں جو تقریر کی تھی اور ۱۳ اپریل کو انھوں نے ایک پریس کانفرنس میں جو کچھ کہا تھا، علاوہ بریں وہ تمام باتیں جو وہ وقتاً فوقتاً عوامی تقریروں میں کہتے رہے ہیں اور نام نہاد کشمیری مجلسِ قانون ساز کا بھارتی حکومت سے مل کر کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ...... ان سب باتوں نے ہمیں یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور کر دیا ہے کہ بلاواسطہ گفت و شنید سے تنازعِ کشمیر کا کوئی جائز حل نکلنا مشکل ہے"۔ پاکستانی وزیرِ خارجہ نے الزام لگایا کہ مقبوضہ کشمیر میں بہت سے عوامی راہنماؤں کو اُن پر مقدمہ چلائے بغیر نظر بند کر دیا گیا ہے اور پاکستان میں مقیم تقریباً پانچ لاکھ کشمیری مہاجرین اپنے گھر لوٹنے کے منتظر ہیں۔ انھوں نے کہا کہ "بھارتی وزیرِ اعظم کا یہ اعلان کہ وہ استصوابِ رائے کے خلاف ہیں اور اس کے دوش بدوش کشمیر کو بھارت کا باقاعدہ حصہ بنانے کی کوشش امنِ عالم کے لیے خطرناک صورتِ حال پیدا کر سکتی ہے"۔

سیکورٹی کونسل میں زیادہ تر ان نکتوں پر بحث ہوتی رہی:

کشمیر پر قبائلیوں کا حملہ اور پاکستانی حکومت کی طرف سے اُن کی حوصلہ افزائی، آئینِ آزادی کی رُو سے کشمیر کا بھارت یا پاکستان سے الحاق کرنے کا حق، کشمیری عوام کی مرضی کے خلاف مہاراجہ کشمیر کا بھارت سے الحاق، معاشی اور اقتصادی لحاظ سے کشمیر کی اپنے ہمسایہ ممالک سے مطابقت، کشمیری عوام کی رائے معلوم کرنے کی خاطر بھارت و پاکستان کے مابین کشمیر میں آزادانہ استصوابِ رائے کا جو معاہدہ ہوا تھا اس استصوابِ رائے سے پہلے بھارتی اور پاکستانی فوجوں کا کشمیر سے اخراج۔ کشمیر کی کٹھ پتلی حکومت کا فیصلہ کہ ۲۶ جنوری ۱۹۵۷ء سے کشمیر بھارتی قانون کے تحت آجائے گا۔ بھارت کا اعلان کہ اب کشمیر میں حالات "بدل" چکے ہیں اور اب اقوامِ متحدہ کی پہلی قراردادوں کا اطلاق اس پر نہیں ہوتا اور کشمیر کا بھارت سے الحاق اٹل ہے۔

پاکستان کی حیثیت

اقوامِ متحدہ کے ۱۶ جنوری کے اجلاس میں پاکستان کے وزیرِ خارجہ نے پاکستان کی حیثیت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ بھارتی حکومت نے اپنے پہلے وعدوں کے باوجود کشمیر میں استصوابِ رائے کرانے سے انکار کر دیا ہے۔ انھوں نے الزام لگایا کہ کشمیری عوام کی خواہشات کا احترام نہ کرتے ہوئے بھارت نے کشمیر کا الحاق اپنے ساتھ قبول کر لیا اور اس الحاق کو تقویت پہنچانے کے لیے وہاں اپنی فوجیں بھیج دیں۔

پاکستان کے وزیرِ خارجہ نے کہا کہ ہندوستان تقسیم ہوا تھا تو آئینِ آزادی کی رُو سے یہ بات واضح تھی تمام ہندوستانی ریاستیں جو پہلے برطانیہ کے ماتحت تھیں، اپنی مرضی سے بھارت یا پاکستان سے مل سکتی ہیں۔ اُس وقت ہندوستان کے وائسرائے اور گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے تمام ریاستوں کے فرمانرواؤں کو کہا تھا کہ وہ بھارت یا پاکستان سے اپنا الحاق کرتے وقت "آبادی کی نوعیت عوام کی خواہش اور جغرافیائی عناصر پر خاص توجہ دیں"۔ مسٹر نون نے کہا تقسیم ہند کی بنیاد اس بات پر رکھی گئی تھی کہ ہندوستان کے مسلم اکثریت والے صوبے مثلاً شمال مغربی علاقے پاکستان کی حد میں شامل ہوں گے اور بھارت غیر مسلم اکثریت والے علاقوں پر مشتمل ہوگا۔ اس لحاظ سے حیدرآباد اور کشمیر کے معاملے میں بات بالکل صاف ہے۔ اگرچہ یہاں کا حکمران ہندو تھا

لیکن یہاں کی ۸۵ فی صد آبادی مسلمانوں کی ہے۔ اس کی سرحدیں زیادہ تر پاکستان ہی سے ملتی ہیں۔ اس لیے سیاسی، اقتصادی، فوجی، مذہبی، ثقافتی اور جغرافیائی اعتبار سے کشمیر کا الحاق پاکستان سے ہونا چاہیے۔

پاکستانی نمائندے نے کہا کہ ریاست جوناگڑھ جہاں کا حکمران مسلمان نواب تھا، اپنی ریاست کا الحاق پاکستان سے کر چکا تھا اگرچہ وہاں کی بیشتر آبادی ہندوؤں پر مشتمل تھی۔ اس پر بھارتی حکومت نے شور مچا دیا کہ ایک مسلمان حکمران ہندوؤں کا ترجمان نہیں ہو سکتا اور حکومت پاکستان کو لکھ بھیجا کہ یہ الحاق اُن اصولوں کی خلاف ورزی کرتا ہے جن پر تقسیم ہند کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ پاکستانی نمائندے نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا تب بھارتی فوج نے جوناگڑھ پر حملہ کر کے اس پر زبردستی قبضہ کر لیا۔ یہی حال حیدرآباد دکن کا تھا۔ ریاست میں ہندو اکثریت کے باوجود نظام حیدرآباد نے بھارت سے اپنی ریاست کا الحاق کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر بھارتی فوجوں نے وہاں بھی جبراً قبضہ کر لیا۔ ان دونوں مثالوں میں بھارتی حکومت کا رویہ کشمیر کے بارے میں اُس کے رویے کے بالکل برخلاف ہے۔

"الحاق مشروط تھا"

پاکستانی ترجمان نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا کہ بھارت نے خود سے کشمیر کا الحاق کرتے وقت بڑی نیک نیتی سے کہا تھا کہ "یہ الحاق بالکل مشروط ہے" اور اپنے ایک اعلان کے ذریعے حکومت پاکستان اور مہاراجہ کشمیر کو مطلع کیا تھا کہ کشمیر کا آخری فیصلہ کرتے وقت وہاں کے عوام کی خواہشات کو مدنظر رکھا جائے گا۔" اگرچہ اقوام متحدہ کے کمیشن سے استصواب رائے کے اصولوں پر گفت و شنید کے دوران میں بھارت نے اکثر باتیں قبول کر لی تھیں لیکن جب کشمیر سے بھارتی فوجوں کے اخراج کا مسئلہ سامنے آیا تو بھارت نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ اسی صورت آزادانہ استصواب رائے ممکن تھا۔

پاکستانی نمائندے نے بھارتی حکومت پر الزام لگایا کہ اُس نے کشمیر کے ایک سیاسی راہنما شیخ عبداللہ کو اگست ۱۹۵۳ء سے محض اس لیے گرفتار کر رکھا ہے کہ اُس نے کشمیر پر بھارتی آئین کے اطلاق کی مخالفت کی تھی۔ اُس وقت سے کشمیری راہنما فقط اس جرم کی پاداش میں قید کیے جا رہے ہیں کہ وہ آزادانہ استصواب رائے کے حق میں ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ریاستی فوج کے علاوہ اس وقت بیاسی ہزار بھارتی سپاہی کشمیر میں موجود ہیں۔

پاکستانی نمائندے نے سیکورٹی کونسل سے درخواست کی کہ وہ بھارت کو کشمیر کی نام نہاد اسمبلی کے نئے دستور پر عمل پیرا ہونے سے باز رکھے اور اقوام عالم کے سامنے دونوں ملکوں میں جو معاہدہ ہوا تھا اُس کے مطابق کشمیر میں جلد از جلد استصواب رائے کرانے کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو۔

بھارت کا نقطہ نظر

بھارت کی نمائندگی کرتے ہوئے وی۔ کے۔ کرشنا مینن نے کہا کہ جب سے مسئلہ کشمیر سیکورٹی کونسل میں پیش ہوا ہے، کشمیر کے حالات بڑی حد تک بدل چکے ہیں اور اب ان پر سیکورٹی کونسل کی پہلی قراردادوں کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ اس لیے اُن کا ذکر کرنا گڑے مُردے اکھیڑنے سے کم نہیں۔ علاوہ بریں اقوام متحدہ کا کوئی نیا فیصلہ کشمیر کے سلسلے میں بھارت پر کوئی پابندی عائد نہیں کر سکتا۔

مسئلہ کشمیر پر اپنی حکومت کی پوزیشن واضح کرتے ہوئے مسٹر مینن سیکورٹی کونسل کے ۲۳ اور ۲۴ جنوری کے اجلاس میں مسلسل سات گھنٹے اڑتالیس منٹ بولتے رہے۔ اُن کے اہم نکتے یہ تھے:

کہ بھارت خود مسئلہ کشمیر کو سیکورٹی کونسل میں لایا ہے کہ اصل میں پاکستان نے کشمیر پر قبائلیوں کے حملے کی حمایت کی تھی اور اس حملے میں خود بھی شامل تھا، کہ مہاراجہ کشمیر کو یہ قانونی حق حاصل تھا کہ وہ کشمیر کے الحاق کے متعلق بھارت سے گفت و شنید کرتا اور اس بنا پر اُس کے الحاق کے عمل کے جائز ہونے پر کسی قسم کا شک نہیں کیا جا سکتا۔

کشمیر پر حملے کے بعد کے دور کا حوالہ دیتے ہوئے بھارتی نمائندے نے کہا کہ ۲۶ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو مہاراجہ کشمیر نے بھارت سے کشمیر کے الحاق کی پیش کش کی۔ دوسرے دن اُن کی یہ پیش کش منظور کر لی گئی۔ "ہم ایک فیڈریشن ہیں" مسٹر مینن نے کہا۔ ہمارا ملک گروہ بندیوں پر مشتمل نہیں۔ جو ریاست کسی فیڈریشن سے الحاق کرتی ہے اُسی میں ہوتی ہے۔ ہمارے قانون میں اس کی گنجائش نہیں کہ وہ ریاست دوبارہ

تو وہ کو جب چاہے علیحدہ کر لے۔ اس لیے جب کوئی ہمیں کہتا ہے کہ ہم کشمیر کو اپنے ملک سے الگ کر دیں تو وہ ہمیں اپنے قانون کے خلاف عمل پیرا ہونے کی دعوت دیتا ہے۔" انھوں نے کہا کہ مہاراجہ کشمیر اپنی ریاست کا کرتا دھرتا تھا اور اس خاص معاملے میں اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ مہاراجہ آئینی یا غیر آئینی ہے ...... یہاں تو فقط ریاست کے نظریے کا سوال ہے۔ مہاراجہ ریاست کا حکمران تھا اور ایک حکمران کی حیثیت سے اُسے الحاق کے معاہدے پر دستخط کرنے کا پورا پورا حق حاصل تھا۔

بھارتی نمائندے نے کہا کہ ایک ابتدائی قرارداد کی رُو سے پہلے بھارت اور پاکستان کے مابین ایک صلح نامہ پر دستخط ہونے تھے اور اس کے بعد کشمیر میں استصواب رائے کرایا جانا تھا۔ لیکن چونکہ پاکستان نے کشمیر سے اپنی فوجیں نہیں ہٹائیں اور نہ ہی صلح نامے پر دستخط ہوئے ہیں۔ اور اس دوران میں پاکستانی فوجیں اکثر کشمیر پر حملہ آور ہوتی رہی ہیں۔ اس لیے استصواب رائے کے متعلق دونوں ممالک کی رضامندی فقط ایک خواہش سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی خواہش کا یہ اظہار کسی صورت میں بھی بین الاقوامی قانونی معاہدے کی حیثیت حاصل نہیں کر سکتا۔" بھارتی نمائندے نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا کہ کشمیر سے بہت سی بھارتی فوج واپس بلا لی گئی ہے۔ لیکن اب وہاں جتنی بھی فوج ہے وہ کشمیر کی اپنی فوج ہے اس کے برعکس آزاد کشمیر میں پاکستانی فوج کی پینتالیس بٹالین موجود ہیں۔

"جہاں تک کشمیری قانون ساز اسمبلی اور اس کے ۱۷ نومبر والے آئین کا تعلق ہے تو یہ کوئی نئی چیزیں نہیں جنھیں کوئی خاص مقصد پورا کرنے کے لیے ہنگامی طور پر معرض وجود میں لایا گیا ہو۔ کشمیر کے لیے ایک مجلس قانون ساز کا خیال خاصا پرانا اور کشمیر پر حملے سے پہلے کا ہے۔ یہ مجلس وہاں کے عوام کے مطالبات کا ایک حصہ تھی۔ لیکن اُن کے مہاراجہ کے کچھ اپنے منصوبے تھے اور وہ کسی نوآبادیاتی ریاست کے باشندوں کی طرح انھیں کوئی حقوق نہ دینا چاہتا تھا۔ بہرحال کشمیر پر جب حملہ ہوا تو وہاں کے عوام نے اپنی مجلس قانون ساز بنانے کا فیصلہ کر لیا۔" مسٹر مینن نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہ کشمیر کی مجلس قانون ساز میں منظور کیا جانے والا ۱۷ نومبر کا دستور کوئی چھپنے کی چیز نہیں۔ یہ الحاق کا نتیجہ ہے۔ یہ تو کشمیر کی داخلی حکومت کا مسئلہ ہے اور اگر پاکستان کو کشمیر اور بھارت کے تعلقات قبول کرنے سے انکار ہے تو جہاں تک دستور کا تعلق ہے اس کے بجائے پاکستان کو تقسیم ہند کے قانون الحاق اور بھارت کا انکار کرنا چاہیے۔"

پاکستانی نمائندے نے ۲۰ جنوری کو بھارتی نمائندے کا جواب دیا جب کہ چھ دن پہلے سیکیورٹی کونسل کشمیر میں استصواب رائے کے متعلق اپنی پہلی قرارداد کی تصدیق میں ایک اور قرارداد منظور کر چکی تھی۔ پاکستانی نمائندے نے مسٹر مینن کی تقریر پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہندوستانی ریاستوں کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ الحاق کے سوا دوسرے سیاسی تعلقات پر اظہار رائے کر سکیں .... لیکن وہ آزاد نہیں رہ سکتی تھیں کیونکہ ان کی کوئی بین الاقوامی حیثیت نہیں۔" پاکستانی نمائندے نے کشمیر کے ایک سابق وزیراعلیٰ اور مشہور کانگرسی مسٹر گوپالا سوامی آئنگر کے ایک بیان کا حوالہ دیا جو انھوں نے ۱۹۴۸ء میں دیا تھا: "کشمیر کے مستقبل کا سوال کہ کیا یہ بھارت سے الحاق توڑ کر پاکستان سے الحاق کرے گا یا آزاد رہ کر اقوام متحدہ کا رکن بنے گا، بلاشبہ وہاں کے عوام ہی حل کر سکتے ہیں۔" پاکستانی نمائندے جناب فیروز خاں نون نے اعلان کیا کہ ۵ جنوری ۱۹۴۹ء کو اقوام متحدہ کے کمیشن کی قرارداد قبول کر کے بھارت یہ تسلیم کر چکا ہے کہ اقوام متحدہ کی زیر نگرانی متفقہ طریقوں سے آزادی اور غیر جانبداری سے کشمیر میں استصواب رائے کے ذریعے اس کے مستقبل کا تعین کرنا باقی ہے۔"

جہاں تک مسٹر کرشنا مینن کی اس بات کا تعلق ہے کہ بھارتی دستور میں "علیحدگی" کی کوئی گنجائش نہیں۔ مسٹر نون نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا "تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ کشمیر جس کا الحاق اب زیر بحث ہے۔ پاکستان سے الحاق نہیں کر سکتا تھا ..... مسٹر مینن اس نکتے کی حمایت یقیناً زیادہ سنجیدگی سے نہیں کر سکتے کہ ایک دستوری ریاست اور کشمیر دستوری ریاست نہیں، یونین کی مرضی سے اپنی حیثیت نہیں بدل سکتی۔ انھوں نے کہا کہ اگر بھارتی دستور بھارتی حکومت کو بین الاقوامی معاہدات کا احترام کرنے

سے روکتا ہے تو اُسے اس دلیل کو ایک بین الاقوامی مجلس کے سامنے پیش ہی نہ کرنا چاہیے تھا۔

غیر مشروط استصواب رائے کا وعدہ

پاکستانی نمائندے نے کشمیر میں استصواب رائے کے متعلق ان نکات کا حوالہ دیا (۱) بھارت کے گورنر جنرل نے ۲۷ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو مہاراجہ جموں و کشمیر کے نام ایک خط لکھتے ہوئے کہا تھا کہ کشمیر کا فیصلہ وہاں کے عوام کی مرضی کے مطابق ہوگا (۲) بھارتی وزیر اعظم نے اپنی کئی تاروں میں پاکستان کے وزیر اعظم سے غیر مشروط وعدہ کیا تھا کہ کشمیر کا فیصلہ وہاں کے عوام کی رائے کے مطابق کیا جائے گا" (۳) ۵ جنوری کی قرارداد کے پہلے پیراگراف میں، جسے بھارتی حکومت نے بلا حیل و حجت تسلیم کر لیا تھا، خاص طور پر کشمیر میں استصواب رائے کا ذکر کیا گیا ہے (۴) سیکورٹی کونسل شروع ہی سے یہ تسلیم کرتی آئی ہے کہ فریقین اس بات پر متفق ہیں کہ کشمیر کا فیصلہ آزادانہ اور غیر جانب دارانہ استصواب رائے سے کیا جائے گا۔"

پاکستانی نمائندے نے کہا کہ پاکستان بھارت کی اس بات سے قطعی متفق ہے کہ کشمیر میں اس وقت تک استصواب رائے نہ ہونا چاہیے جب تک وہاں سے ساری فوج نہ بلا لی جائے لیکن اس سلسلے میں بھارت تا حال حیل و حجت سے کام لے رہا ہے اور اپنی فوج کو واپس بلانے پر آمادہ نظر نہیں آتا۔"

جہاں تک بھارت کے یہ کہنے کا تعلق ہے کہ کشمیر میں استصواب رائے سے متعلق اقوام متحدہ کی پہلی قرارداد کے وقت سے اب تک کشمیر کے حالات بہت بدل چکے ہیں جس کے باعث وہ قرارداد بے کار ہو چکی ہے" تو یہ سب حیلہ سازی ہے"۔ مسٹر نون نے کہا "وہاں کے حالات کچھ ایسے تبدیل نہیں ہوئے کہ استصواب رائے کی راہ میں مانع ہو سکیں۔ انھوں نے کشمیر میں بھارتی اصلاحات کا موازنہ ان فوائد سے کیا جو برطانوی حکومت کے تحت ہندوستان کو پہنچے تھے اور کہا کہ پنڈت نہرو نے خود آزادی کو ان اصلاحات پر ترجیح دی تھی۔ مسٹر نون نے کہا کہ انگریزوں نے تو فقط آزادی بند کو ندرے ملتوی کیا تھا لیکن مسٹر مینن کے الفاظ کے مطابق تو بھارت نے کشمیر کے عوام پر آزادی کے دروازے ہی بند کر دیے ہیں"۔

آخر پاکستان کے وزیر خارجہ نے سیکورٹی کونسل سے کہا کہ وہ بذات خود مسئلہ کشمیر کے جمود کو توڑنے میں پیش قدمی کرے۔ انھوں نے کشمیر سے بھارتی اور پاکستانی فوج کے اخراج، اقوام متحدہ کی فوج کے داخلے، دونوں اطراف سے مقامی فوجی رضا کاروں کو خلاف قانون قرار دینے اور اقوام متحدہ کی زیر نگرانی کشمیر میں آزادانہ استصواب رائے اور وہاں کے عوام کو اپنی قسمت کا فیصلہ خود کرنے کے حق کا مطالبہ کیا۔

۸ فروری ۱۹۵۷ء کو مسٹر مینن دوبارہ سیکورٹی کونسل سے مخاطب ہوئے۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ بھارت حتی الامکان اپنے بین الاقوامی وعدوں کا احترام کرے گا لیکن کونسل کو صحیح صحیح طور پر یہ بتانا پڑے گا کہ بھارت کے وعدے کیا ہیں۔ جہاں تک کشمیر کا تعلق ہے بھارت نے آئینی قدم اُٹھایا ہے اور کونسل کی قراردادوں کی مخالفت نہیں کی۔ کشمیر کی مجلس قانون ساز نے جو قدم اُٹھایا ہے وہ کوئی نئی بات نہیں۔ اس نے کوئی نیا قانون نہیں بنایا۔ بین الاقوامی وکلاء کی زبان میں یہ تخلیقی عمل کی بجائے توثیقی عمل ہے .... دونوں ریاست کے تعلقات نئے نہیں بلکہ بہت پرانے ہیں"۔ انھوں نے الزام لگایا کہ کونسل اس نکتے پر گمراہ ہو گئی ہے کہ ۲۶ جنوری کو بھارت نے کسی ریاست کو اپنے ساتھ ملا کر اپنی حدود کو وسیع کر لیا ہے۔ یہ علاقہ تو عرصہ دراز سے بھارت کا ایک حصہ ہے۔ ۲۶ جنوری کو فقط اتنا ہوا ہے کہ کشمیر کی مجلس دستور ساز توڑ دی گئی تھی"۔ بہرحال انھوں نے کہا کہ ممکن ہے ان کی حکومت خاص شرائط کے تحت الحاق کشمیر کا امتحان کرنے کی خاطر استصواب رائے پر رضامند ہو جائے۔

نئی قراردادوں کی پیش کش

جب ۱۵ فروری کو سیکورٹی کونسل کا دوبارہ اجلاس ہوا تو اس کے سامنے چار ممالک کی تیار کی ہوئی قرارداد تھی۔ وہ چار

جانبدار آسٹریلیا، کیوبا، برطانیہ اور امریکہ تھیں۔ انہوں نے کونسل کے صدر گونار جارنگ سے درخواست کی کہ وہ ایک کمیشن لے کر بھارت اور پاکستان جائیں۔ قرارداد کی رو سے کونسل کے صدر کو دونوں حکومتوں سے مل کر تنازع کشمیر کے تصفیے کی کوشش کرنی تھی اور پاکستان کی اس تجویز کا معائنہ کرنا تھا کہ استصواب سے پہلے ریاستی فوج کو کشمیر سے نکال کر اس کی جگہ اقوام متحدہ کی فوج متعین کی جائے۔

چار طاقتوں کی قرارداد نے مسٹر جارنگ سے کہا تھا کہ وہ بھارتی اور پاکستانی حکومت سے ایسی تجویزوں پر گفت و شنید کریں جو اُن کے خیال کے مطابق کشمیر سے بھارتی و پاکستانی فوج کے اخراج کے سلسلے میں مفید ثابت ہو سکتی ہیں یا جو سیکورٹی کونسل کی دوسری قراردادوں کی روشنی میں تنازع کشمیر کا خاطر خواہ حل پیش کر سکتی ہیں"۔ اس کے ساتھ ہی وہ دونوں حکومتوں کے نمائندوں کے بیانات اور اقوام متحدہ کی فوج کے عارضی استعمال کو بھی پیش نظر رکھیں"۔ برصغیر پاک و ہند کے دورے سے متعلق مسٹر جارنگ کو یہ حقوق دینے کے بعد قرارداد نے اُن سے کہا کہ وہ اس دورے کے بارے میں ۱۵ اپریل ۱۹۵۷ء کو اپنی روداد سیکورٹی کونسل کے سامنے پیش کریں"۔

علاوہ بریں قرارداد نے دونوں حکومتوں کو دعوت دی کہ وہ صدر کی اس جدوجہد میں ہر قسم کا تعاون کریں اور کونسل کے جنرل سیکرٹری اور اقوام متحدہ کے نمائندہ برائے پاک و ہند ڈاکٹر فرانک گراہم سے درخواست کی کہ وہ مسٹر گونار جارنگ کی ہر طرح مدد کریں۔

یہ قرارداد پیش کرتے وقت برطانیہ کے نمائندے سر پیئرسن ڈکسن نے کونسل کے صدر سے کہا۔ "کونسل کی طرف سے آپ کو تمام حقوق حاصل ہوں گے کہ آپ فہم و فراست، غیر جانبدار فیصلے اور اپنی بلند کوششوں سے اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کریں ۔۔۔ یہ مسئلہ جس نے عرصے سے امن عالم کو خطرے میں ڈال رکھا ہے، ہم فقط تنازع کشمیر کے تصفیے ہی کے خواہاں نہیں ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ پاک و بھارت کے مابین تمام جھگڑوں کا تصفیہ ہو جائے"۔

برطانوی نمائندے نے اس بات پر زور دیا کہ کشمیر سے اخراج فوج کے تصفیے کی ناکامی کی وجہ اُن خطرات کا خدشہ ہے جو دونوں طرف افواج کی موجودگی سے پیدا ہو سکتا ہے"۔ اس لیے دونوں اطراف کو کشمیر میں اقوام متحدہ کی فوج کے موجود ہونے کی تجویز پر غور کرنا چاہیے۔

لیکن بھارتی نمائندے نے کونسل سے کہا کہ یہ قرارداد کشمیر میں اقوام متحدہ کی فوج کی موجودگی کے حوالے سے "غلطی بے معنی" ہے۔ سیکورٹی کونسل ہمیں یہ تجویز منظور کرنے پر مجبور نہیں کر سکتی کہ ہم اپنی مقدس زمین پر غیر ملکی فوجیں اتار لیں۔ اپنی دو گھنٹے کی تقریر کے اختتام پر مسٹر مینن نے کہا۔ "ہم ہر اس کوشش کو رد کر دیں گے جس کے ذریعے ہماری سرحدوں پر اقوام متحدہ کی فوج اور اس کے بعد جنگی سامان لایا جائے گا۔ ایسے اقدامات اور جنگی معاہدوں نے پہلے ہی ہمارے ملک کو سرد جنگ کا نشانہ بنا دیا ہے"۔

بعد میں سوویٹ روس نے چار طاقتوں کی قرارداد میں چند تبدیلیوں کی خواہش کی۔ پہلی تبدیلی قرارداد کے اس پیراگراف کو حذف کرنا تھا جس میں اقوام متحدہ کی فوج کی تجویز پیش کی گئی تھی۔ دوسری تبدیلی مسٹر جارنگ کی تجویزوں سے کشمیر میں اقوام متحدہ کی فوج کی موجودگی یا وہاں سے بھارتی فوج کے اخراج کے ضمن میں تھی۔ تیسری تبدیلی ۱۵ اپریل ۱۹۵۷ء کی تاریخ کو ملتوی کرنا تھا۔ جس دن مسٹر جارنگ نے سیکورٹی کونسل کے سامنے اپنی رپورٹ پیش کرنی تھی۔ ان تبدیلیوں پر مبنی سوویٹ روس کی قرارداد جب سیکورٹی کونسل میں پیش ہوئی تو سوویٹ ترمیم ایک کے مقابلے میں دو ووٹوں سے نامنظور ہو گئی۔ آٹھ ممالک نے ووٹ نہ دیا۔ اصل قرارداد کے حق میں نو ووٹ ڈالے گئے۔ سوویٹ روس مخالف تھا اور سویڈن نے ووٹ نہ دیا۔ روس کی طرف سے مخالف ووٹ رجسٹر ہونے (ویٹو کی حیثیت سے) کے باعث یہ قرارداد منظور نہ ہو سکی۔

۲۱ فروری ۱۹۵۷ء کو سیکورٹی کونسل نے صفر کے مقابلے میں دس ووٹوں کی اکثریت سے مسٹر جارنگ کا اقوام متحدہ کی فوج والی تجویز کے بغیر بھارت اور پاکستان جا کر تنازع کشمیر کا تصفیہ کرنے کی قرارداد منظور کی۔

اے۔ ایم ۔ روزن تھال
نمائندہ: نیویارک ٹائمز

حسین سرزمین پر بادِ مسا دِ صبا

کراچی میں ایک پاکستانی ڈپلومیٹ نے جو عام طور پر بڑے دھیمے مزاج اور خوش گوار طبیعت کا مالک ہے اور جسے موسیقی سے لگاؤ ہے، اپنی مٹھی بھینچتے ہوئے اور اُسے کافی کی میز پر مارتے ہوئے کہا کہ اگر اسے اور اُس کے ہم وطنوں کو کشمیر کی خاطر لڑنا اور جان دینی پڑی تو وہ کبھی گریز نہ کریں گے۔

نئی دہلی میں ایک بھارتی افسر نے اپنی گھومنے والی کرسی پر دھک کر سیدھے ہوتے میز کی سمت قدرے جھکتے ہوئے کہا کہ کشمیر ہمیشہ بھارت کا ایک حصہ تھا اور اگر اسے اور اس کے ہم وطنوں کو یہ ثابت کرنے کی خاطر لڑنے اور مرنے پر مجبور کیا گیا تو وہ ایسا کر گزریں گے۔

تقریباً گزشتہ ایک دہائی سے دنیا کشمیر کے متعلق بھارت اور پاکستان کے مابین جھگڑے کی خبریں سنتی چلی آرہی ہے کشمیر کشمکش اور خوف و ہراس کا ایک ایسا مرکز بنا ہوا ہے جس نے چالیس کروڑ بھارتیوں اور ساٹھ کروڑ پاکستانیوں کے مابین کے راستے میں ایک دیوار کھڑی کر رکھی ہے۔ اور خواہی نخواہی اُن کے مستقبل کو دھندلا کر رکھ دیا ہے۔

بھارت اور پاکستان کی خارجہ پالیسی پر کشمیر اس قدر اثر انداز ہوا ہے کہ دنیا اس کا ٹھیک طرح اندازہ نہیں کرسکتی۔ بھارت اور پاکستان میں دوسرے ممالک کی دوستی کا اندازہ اس امر سے کیا جاتا ہے۔ کہ تنازع کشمیر میں اُن کی ہمدردیاں کس ملک کی طرف ہیں۔ وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے عرب ممالک سے گہرے تعلقات قائم کرنے کی جو تحریک چلا رکھی ہے اُس کا ایک بنیادی مقصد یہ بھی ہے۔ کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان تنازع کشمیر میں عرب ممالک کی ہمدردی حاصل نہ کر سکے روس کے متعلق بھارت کا رویہ بھی کسی حد تک تنازع کشمیر ہی کی پیداوار ہے بھارتی سیاستدان یہ بات کبھی نہیں بھولتے کہ جب کبھی مسئلہ کشمیر اقوام متحدہ میں سر اٹھاتا ہے۔ تو سکیورٹی کونسل کی بڑی حد تک مخالف فضا میں سوویٹ روس کی ہمدردی ہی بھارت کا آخری دفاعی مورچہ ہوتی ہے۔

کشمیر کو حاصل نہ کرسکنے میں پاکستان کو جو ناکامی ہوئی ہے اُس کی تلخی ایک اہم حد تک اس ملک پر بھی اثر انداز ہوئی ہے۔ کسی بھی عام پاکستانی سے پوچھ لیں کہ اُسے امریکی اسلحہ کیوں درکار ہے وہ یہ سلحہ سوویٹ روس یا سرخ چین سے اپنے ملک کو بچانے کی نسبت بھارت کے خلاف استعمال کرنے کی امکانی ضرورت پوری کرے گا۔ یا کم از کم کشمیر حاصل کرنے کے لیے اس کی ضرورت محسوس کرتا ہوگا۔ یہ کشمیر ہی ہے جس نے پاکستانی سیاسی زندگی کو آسیب زدہ بنا دیا ہے۔ کشمیر جو پاکستانیوں کے لیے ناکارہ پن کے ترش احساس میں اضافہ کرتا ہے۔ کشمیر جو ہر سیاست دان کا مطمح نظر ہے، کشمیر جسے تحریک یا نعرے یا ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

بڑی طاقتوں کو کشمیر خواہ کتنا ہی عام اور کھٹائی میں پڑا ہوا مسئلہ کیوں نہ دکھائی دے، اس کے عام جغرافیائی محل وقوع نے اسے ایک ایسا مسئلہ بنا رکھا ہے جسے ٹھپ نہیں کیا جا سکتا۔ کشمیر کی مشرقی سرحدوں پر تبت واقع ہے جو اشتراکی چین کے قبضے میں ہے۔ اس کے شمال مشرق میں چین کا صوبہ سنکیانگ ہے۔ اس کے شمال مغرب کی سمت افغانستان سے پرے سوویٹ ترکستان ہے۔ قصہ مختصر اس خوبصورت وادی کے چاروں طرف اشتراکیت نے گھیرا ڈال رکھا ہے مقبوضہ کشمیر کے وہ بھارتی افسر جو پہلے اس بات سے انکار کرتے تھے کہ کشمیر کی حکومت میں اشتراکی عنصر موجود نہیں، اب یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ کشمیری حکومت کو اشتراکی عنصر سے جلد از جلد پاک کرنا چاہیئے کشمیری حکومت سے باہر بعض ایسے سیاست دان بھی ہیں۔ جن کا یہ خیال ہے کہ بھارت

اور پاکستان کشمیر حاصل کرنے کی تلخ کشمکش میں یہ حقیقت نظرانداز کر گئے ہیں۔ کہ اگر وہ متحد نہ ہوئے تو کشمیر پہ اشتراکی قابض ہو جائیں گے۔ خواہ وہ مقامی اشتراکی ہوں یا غیر ملکی۔

تنازعِ کشمیر کس طرح پیدا ہوا؟ یہ خوبصورت خطۂ فردوس کس طرح دنیا کا سب سے بڑا متنازع فیہ مسئلہ بن گیا ہے؟

اس کی تشریح چھ صدیاں پہلے شروع ہوتی ہے۔ چودھویں صدی عیسوی تک یہ سرزمین ہندو اور بدھ حکمرانوں کے قبضے میں تھی تب ایک مقامی مسلم خاندان اس پر قابض ہو گیا۔ ۱۵۸۶ء میں مغل شہنشاہ اکبر ہندوستان پر قابض ہو گیا اور تقریباً دو سو برس تک کشمیر مغل شہنشاہوں کی موسم گرما کی تفریح گاہ بنا رہا۔

جب مغل خاندان کا شیرازہ بکھر گیا تو ہندوستان کے ایک حصے پر افغان سپاہی قابض ہو گئے۔ افغانوں کو سکھوں نے مار بھگایا اور انگریزوں نے ۱۸۴۶ء میں سکھوں کی کمر توڑ دی اور انگریزوں نے کشمیر کو اپنے ایک ہندو دوست مہاراجہ گلاب سنگھ کے ہاتھ فروخت کر ڈالا۔ گلاب سنگھ انگریزوں کے ماتحت تھا۔ اور اس ماتحتی کی علامت کے طور پر ہر سال انگریزوں کو دو خوبصورت کشمیری شالیں اور تین رومال بطور نذرانہ پیش کرتا تھا۔

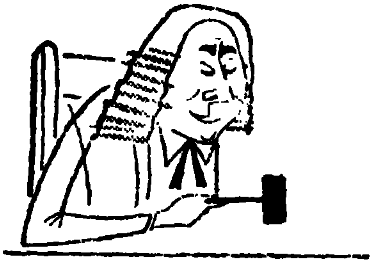
اس رسم کا اختتام ۱۹۴۷ء میں ہوا۔ یہ وہ سال تھا جب برطانوی مقبوضہ ہندوستان، برطانوی سلطنت کا ہیرا دو آزاد ملکوں میں تقسیم ہو گیا۔ اُس وقت تک ۵۶۲ مہاراجے، نواب اور شہزادے تو انگریزوں کی سرپرستی میں مختلف ہندوستانی ریاستوں پر حکومت کرتے رہے تھے۔ ۱۹۴۷ء میں اس حقیقت سے دوچار ہوئے کہ اب نہ تو بھارتی اور نہ ہی پاکستانی حکومت انہیں پہلے کی طرح اپنی ریاستوں پر حکمران رہنے کی اجازت دے گی۔

نظریاتی طور پر اُس وقت اس بات کا فیصلہ انہیں مقامی حکمرانوں کے ذمے تھا کہ کیا وہ بھارت میں شامل ہونا چاہتے ہیں یا پاکستان میں یا پھر آزاد رہنا چاہتے ہیں۔ لیکن مشترک دباؤ اور سالانہ وظیفے کے وعدے کے تحت بہت سے مقامی حکمرانوں نے آزاد رہنے کا خیال دل سے نکال دیا اور اپنے جغرافیائی محلِ وقوع اور ہندو مسلم آبادی کی اکثریت کو مدِنظر رکھ کر بھارت یا پاکستان کے ساتھ شامل ہو گئے۔ بعض مقامی حکمرانوں نے الحاق کرنے میں کچھ شان اور دبدبے کا مظاہرہ بھی کیا لیکن آخر کار سب کو یہ مرحلہ طے کرنا ہی پڑا۔

لیکن تین مقامی حکمرانوں نے اپنی آزادی برقرار رکھنے کی اُمید میں بھارت اور پاکستان کو ٹرخانا بھی چاہا۔ اُن میں سے پہلا نظامِ حیدرآباد دوسرا نواب آف جوناگڑھ اور تیسرا مہاراجۂ کشمیر ہری سنگھ تھا۔ ہری سنگھ جانتا تھا کہ مسلم اکثریت والی ریاستِ کشمیر کا حکمران ہونے کے باعث وہ اپنی ریاست کا الحاق پاکستان سے کر کے زیادہ عرصہ بااقتدار نہ رہ سکے گا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اگر اُس نے بھارت سے الحاق کر لیا تو اس صورت میں بھی بھارت کی کوئی نمائندہ حکومت کشمیر پر مسلط ہو جائے گی جس سے اُس کا اپنا اقتدار چھن جائے گا۔

کشمیر کے کاروبار، جغرافیائی محلِ وقوع اور مسلم اکثریت کا تقاضا کہ اس ریاست کا الحاق پاکستان سے کیا جائے۔ کشمیر اپنی زیادہ تجارت پاکستان سے کرتا تھا۔ کشمیر کے آسان ترین راستے پاکستان سے ملے ہوئے تھے اور اس کے چالیس لاکھ باشندوں میں سے ۷۷ فی صدی مسلمان تھے اور بانی زیادہ تر ہندو برصغیر ہند کی تقسیم کی بنیادی وجہ مسلمان۔ انہا ؤں کا یہ مطالبہ تھا کہ ہندوستانی مسلمانوں کا اپنا ایک الگ ملک ہونا چاہیے۔ اگر اُس وقت ہری سنگھ پاکستان سے کشمیر کا الحاق کر لیتا تو بھارت کوئی زیادہ شدید احتجاج نہ کرتا۔ لیکن ہری سنگھ نے سودا بازی کی۔ اُس نے پاکستان سے ایک معاہدہ جاریہ کیا جس کی رُو سے پاکستان نے کشمیر کے محکمۂ ڈاک و تار کو بدستور چلانے کا ذمہ لے لیا اور کشمیر کو ایندھن اور خوراک مہیا کرنے کا وعدہ کیا۔ لیکن ابھی تک ہری سنگھ نے ریاست کا الحاق پاکستان سے نہیں کیا تھا۔ یہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کا واقعہ ہے۔

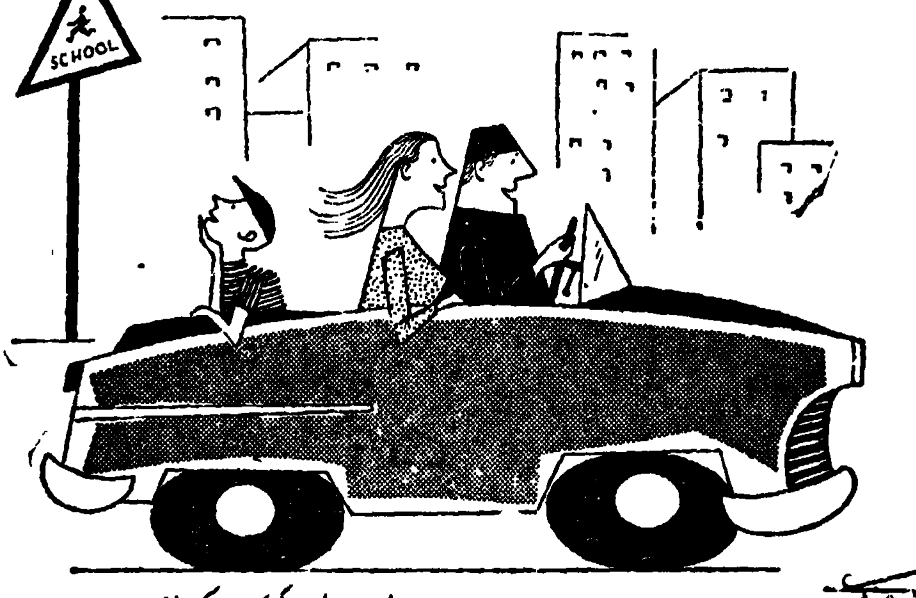
اگست سے اکتوبر ۱۹۴۷ء کا عرصہ ایک ہیجانی اور خونی دور تھا۔ پاکستان سے بھاگے ہوئے ہندو بنیا جموں میں آئے جو کشمیر کا جنوبی صوبہ ہے۔ بھارت سے بھاگے ہوئے



کیا آپ ٹائر میں ہوا کا صحیح دباؤ نہ رکھنے کے قصوروار ہیں؟

پٹرول کی بچت کرنے کے لئے ٹائر میں ہوا کے دباؤ کی جانچ کیجئے

ایسے ٹائرز جن میں ہوا کم ہو نہ صرف جلد ضائع ہو جاتے ہیں بلکہ سڑک پر ٹائر کے زیادہ گھساؤ کی وجہ سے آپ کی کار میں پٹرول بھی زیادہ خرچ ہوتا ہے۔ ہمیشہ اپنی گاڑی کے ٹائروں میں ہوا کے دباؤ کو کار کے ساتھ دی جانے والی ہدایات کے مطابق صحیح رکھا کیجئے اور اس طرح پٹرول کی بچت کیجئے۔



اور ہر میل پر پیسے کی بچت کے لئے

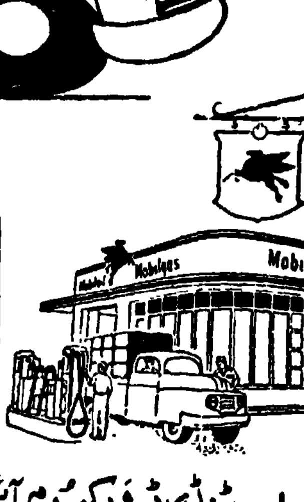
موبل گیس

استعمال کیجئے۔ اس کے ہر ایک گیلن سے آپ کی کار زائد میل چلتی ہے۔

موبل آئل

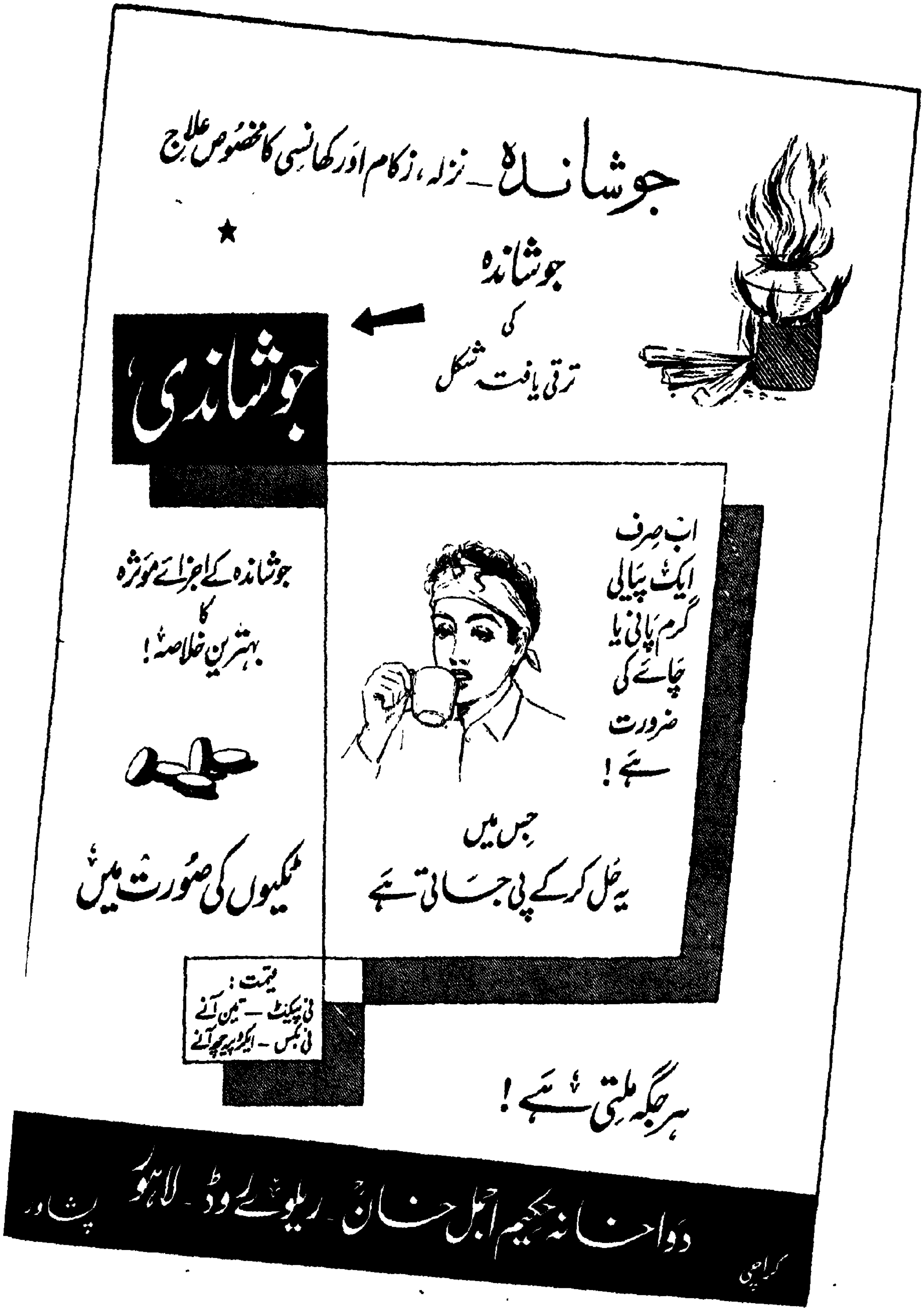
کے استعمال سے آپ کی کار کا انجن زیادہ عرصہ تک کارآمد رہتا ہے

اسٹینڈرڈ ویکیوم کے یہ دونوں پراڈکٹس زیادہ باکفایت ڈرائیونگ کیلئے مشہور ہیں



اسٹینڈرڈ ویکیوم آئل کمپنی (محدود ذمہ داری کے ساتھ یو۔ایس۔اے میں قائم شدہ) کراچی۔ڈھاکہ۔لاہور۔

JWT SV 8770


جوشاندہ ۔ نزلہ، زکام اور کھانسی کا مخصوص علاج
جوشاندہ
کی
ترقی یافتہ شکل
جوشاندی
جوشاندہ کے اجزائے مؤثرہ
کا
بہترین خلاصہ!
ٹکیوں کی صورت میں
اب صرف
ایک پیالی
گرم پانی یا
چائے کی
ضرورت
ہے!
جس میں
یہ حل کرکے پی جاتی ہے
قیمت:
فی پیکٹ — تین آنے
فی بکس — ایک روپیہ چھ آنے
ہر جگہ ملتی ہے!
دواخانہ حکیم اجمل خان ۔ ریلوے روڈ ۔ لاہور
پشاور
کراچی

مسلمان پناہ گیر جموں سے گئے۔ پاکستان بن جانے پر شیخ محمد عبداللہ
کی قیادت میں ہری سنگھ کے خلاف ریاست میں سیاسی بغاوت سر اٹھا
رہی تھی۔ پاکستان کے سرکاری افسر ڈر رہے تھے کہ ہری سنگھ انہیں دھوکا
دے گا۔ ہری سنگھ نے شکایت کی کہ پاکستان نے ایندھن اور خوراک کی
رسد روک لی ہے۔ انہوں نے ان اشیا کی فوری رسد کے لئے بھارت
سے کہا۔ اس یقین کی عدم موجودگی میں کہ اب ہری سنگھ کون سی کروٹ
لے گا۔ پاکستان نے خود ہی پہلا قدم اٹھایا۔

۲۲ر اکتوبر ۱۹۴۷ء ہری سنگھ اور کشمیر کے امن کا آخری دن تھا۔
اس دن مسلمان قبائلی پٹھان جو پاکستان کے شمال مغربی سرحدی صوبے
میں رہتے ہیں پاکستان کا دو سو میل رقبہ طے کر کے کشمیر پر حملہ آور
ہو گئے۔ وہ وادی جہلم سے گذر کر سری نگر سے فقط تیس میل دور
رہ گئے۔ زر و زن کی ہوس نے انہیں بارہ مولا میں روک لیا اس ہوس
کے بدلے انہیں سنگین ہار بھی پڑی۔

یہ صورت حال دیکھ کر مہاراجہ نے بھارت سے فوری امداد
کی درخواست کی۔ بھارت نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن جو اس وقت ہندوستان
کا گورنر جنرل تھا کے مشورہ پر مہاراجہ کو لکھا کہ پہلے وہ کشمیر کا الحاق
بھارت سے کرے۔ ہری سنگھ کوئی اور راستہ نہ دیکھتے ہوئے اس
بات پر متفق ہو گیا۔ اسی اثنا میں پاکستانی قبائل سری نگر کے قریب
پہنچ چکے تھے۔

۲۵ر اکتوبر کی رات کو ہری سنگھ نے اپنے محافظ کو کہا کہ اگر
بھارت سے کوئی مدد کا پیغام نہ آیا تو وہ اسے رات کو سوتے
میں گولی مار دے۔ لیکن مدد کا پیغام آ گیا۔ ۲۶ر اکتوبر کو ہری سنگھ
نے کشمیر کا الحاق بھارت سے کر دیا۔ اس پر بھارت ہوائی جہازوں
کے ذریعے کشمیر میں اپنی فوج اتارنے لگا۔ یہ عمل بڑا خطرناک
تھا۔ جب بھارتی فوج کا پہلا دستہ سری نگر کے ہوائی اڈے
پر پہنچا تو قبائلی حملہ آور مشین گن کی گولی کی مار تک سری نگر کے
قریب پہنچ چکے تھے۔ لیکن حملہ آوروں نے بارہ مولا میں جو
دیر کی تھی اس سے بھارتی فوجوں کو مورچے سنبھالنے کا وقت
مل گیا اور وہ حملہ آوروں کو پسپا کر کے بارہ مولا تک لے گئیں۔
تیرہ دن کے اندر اندر بھارتی فوجوں نے بارہ مولا پر قبضہ کر لیا
اور بیس دن کے اندر وہ حملہ آوروں کو دھکیل کر اوڑی تک
لے گئیں۔ جو سری نگر سے ۶۵ میل کے فاصلے پر ہے۔

یکم جنوری ۱۹۴۸ء کو بھارت مسئلہ کشمیر کو اقوام متحدہ
میں لے گیا اور اس نے پاکستان پر کشمیر پر حملہ آور ہونے کا
الزام لگایا۔ کشمیر سے متعلق اس وقت کے اہم قانونی نکتے آج
بھی اس مسئلے کے اہم قانونی نکتے ہیں جو ذیل میں درج ہیں۔

۱۔ کیا واقعی پاکستان کشمیر پر حملے کا مرتکب ہوا تھا؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان نے قبائلیوں کو
اپنی حدود کے اندر سے گزر کر کشمیر میں داخل ہونے کی اجازت
دی تھی۔ یہ بھی ثبوت مہیا ہو چکا ہے کہ قبائلیوں نے پاکستانی
اسلحہ استعمال کیا تھا اور وہ پاکستانی افسروں کی قیادت میں
لڑ رہے تھے۔ جولائی ۱۹۴۸ء تک پاکستان نے تسلیم کر لیا تھا کہ
اس کی باقاعدہ فوج کشمیر میں لڑتی رہی ہے۔ مگر فقط بھارتی فوجوں
کو اپنی سرحدوں سے دور رکھنے کے لئے۔

پاکستان کا یہ کہنا ہے کہ بھارت اور ہری سنگھ کشمیر کو اس
کے عوام کی مرضی کے مطابق اپنے پسندیدہ ملک سے الحاق نہیں
کرنے دیتے۔ اس پر کشمیریوں نے اپنے مہاراجہ کے خلاف
بغاوت کر دی ہے اور قبائلی اپنے بھائیوں کی مدد کے لئے چلے
گئے ہیں۔ پاکستان کا دعویٰ ہے کہ اخلاقی طور پر تو بھارت نے
کشمیر پر حملہ کیا ہے۔

۲۔ کیا بھارت سے کشمیر کا الحاق کرنا مہاراجہ کا جائز
فعل تھا؟

بھارت سے معاہدۂ الحاق پر دستخط ہونے سے پہلے
شیخ عبداللہ نے کہا تھا کہ کشمیری عوام کو آزادانہ طور پر
یہ فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہونا چاہیے۔ اس سلسلے میں پاکستان کی
طرف سے ۴ر نومبر ۱۹۴۷ء کو وہاں کے وزیر اعظم لیاقت علی خان نے
ان الفاظ میں اظہار خیال کیا تھا ”بھارت سے کشمیر کا الحاق ایک
مکمل سازش ہے جو وہاں کے بزدل مہاراجہ نے حملہ آور بھارتی حکومت
کی مدد سے کشمیر کے عوام کے ساتھ کی ہے۔“

لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہری سنگھ جیسے سینکڑوں دوسرے

حکمرانوں کے الحاق بھارت اور پاکستان نے قبول کئے تھے۔ اس نکتے پر بھارت کے قدم مضبوط ہیں اور کئی غیر ملکی قانونی ماہر یہاں بھارت کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں۔

مذکورہ بالا دو سوال جو تنازع کشمیر کے قانونی پہلوؤں کی بنیاد ہیں۔ آج تک اقوام متحدہ میں بلا واسطہ طور پر حل نہیں ہو سکے۔ مسئلہ کشمیر کے متعلق اقوام متحدہ میں بھارت کا اولین ترجمان بہت کمزور تھا اور پاکستان کے چابک دست ترجمان ظفر اللہ خان سے اس کا کوئی مقابلہ نہ تھا۔ لیکن سیکیورٹی کونسل کے ممبران مختلف سیاسی وجوہ کی بنا پر پہلی دفعہ مسئلہ کشمیر کو ٹال کر گئے۔ اسی وجہ سے یہ مسئلہ اس قدر سست رفتار ہو گیا ہے کہ اب قانونی طور پر اس کا کوئی حل تلاش کرنا محال نظر آنے لگا ہے۔

سکیورٹی کونسل نے اس سال اہم ترین کام یہ کیا کہ دونوں فریقوں کو کشمیر میں جنگ بند کرنے پر متفق کر لیا۔ جنگ بندی یکم جنوری ۱۹۴۹ء کو عمل میں آئی۔ اس کے سات ماہ بعد خط جنگ بندی بھی متعین کر دیا گیا۔ اس خط کے باعث بھارت کے حصے میں کشمیر کی تین چوتھائی آبادی اور تقریباً دو تہائی رقبہ آیا جو سیاسی، جذباتی اور اقتصادی طور پر اصل کشمیر ہے۔

اس وقت بھارت کے قبضے میں جموں، خوبصورت وادی کشمیر اور لداخ کا علاقہ ہے جس کی سرحدیں تبت سے ملتی ہیں۔ اس کے برعکس پاکستان کے حصے میں کشمیر کا مغربی حصہ آیا ہے۔ جو زیادہ تر پتھریلا اور غیر زرخیز ہے۔ (جسے پاکستان آزاد کشمیر کہتا ہے) علاوہ بریں اس کے حصے میں کشمیر کا کچھ شمالی علاقہ بھی آیا ہے جس میں گلگت بھی شامل ہے اور جس کی سرحدیں اشتراکی چین سے ملی ہوئی ہیں

اگرچہ خط جنگ بندی کی دونوں طرف بھارت اور پاکستان بڑے تساہل سے بیٹھے ہوئے ہیں لیکن کشمیر سے متعلق جمود کو توڑنے کی کوشش بدستور جاری ہے۔ اس سلسلے میں زیادہ تر بحث ایک نکتے کے گرد گھومتی رہی ہے۔ اور وہ ہے استصواب رائے۔

جس صبح ہری سنگھ نے معاہدۂ الحاق پر دستخط کئے تھے۔ لارڈ مونٹ بیٹن نے نہرو سے کہا تھا کہ یہ الحاق کشمیر میں استصواب کی شرط پر ہو گا۔ نہرو متفق ہو گیا تھا۔ پاکستان نے بھی استصواب کا خیال قبول کر لیا تھا۔ سیکورٹی کونسل کی بنیادی قراردادیں اس کے کمیشن کی رپورٹیں اور اقوام متحدہ کے ثالثوں کا کام۔ یہ سب جدوجہد استصواب رائے کی خاطر تھیں۔ لیکن یہ سب کوششیں آج تک ناکام رہی ہیں۔

اس کی سطحی وجہ یہ ہے کہ بھارت اور پاکستان کشمیر سے اخراج فوج کے عمل سے متفق نہیں ہوتے اور یہ اخراج استصواب رائے سے پہلے ضروری ہے۔ دونوں طرفوں کو خطرہ رہا کہ وہ ووٹوں کے سلسلے میں اپنی اپنی فوج کو استعمال کریں گی۔ فوج کے متعلق بھارت اور پاکستان کے دلائل اُن گہرے اختلافات کا عکس ہیں جن کے تحت یہ دونوں ملک مسئلہ کشمیر کو دیکھتے ہیں۔ بھارت کا مطالبہ ہے کہ کشمیر میں سے پاکستانی فوج نکال دی جائے اور آزاد کشمیر فوج کو ممنوع قرار دیا جائے۔ جو بھارت کے نزدیک ایک دوسری وردی میں پاکستانی فوج ہی ہے۔ ادھر پاکستان کے خیال کے مطابق آزاد کشمیر کی فوجیں بھارتی فوجوں کی نسبت کشمیر میں یقیناً زیادہ قانونی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس سے اب زیادہ اہم حقیقت یہ ہے کہ بھارت پاکستان کو کشمیر پر حملہ آور تصور کرتا ہے اور پاکستان بھارت کو ایک ایسا ڈاکو کہتا ہے جس نے تشدد کے ذریعے کشمیر پر قبضہ کر رکھا ہے۔

اس وقت تک دونوں جانب سیاسی رنجش اس قدر بڑھ چکی ہے کہ استصواب رائے کی گفتگو محض ایک حیلے کے طور پر استعمال ہونے لگی ہے۔ اگرچہ بھارت نے گزشتہ دو تین برس میں استصواب رائے کے خیال سے قطعاً انکار تو نہیں کیا لیکن حقیقت میں اس کا کچھ ایسا ارادہ بھی نظر نہیں آتا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بھارتی مقبوضہ کشمیر کو بھارت اپنا ایک اہم حصہ بناتا جا رہا ہے۔ کشمیر میں ایک مجلس قانون ساز بنا دی گئی ہے۔ جس نے ریاست کو بھارت کا ایک حصہ بنا دیا ہے۔ اس طرح وہاں جاگیرداری نظام کا خاتمہ ہو گیا ہے اور مہاراجے کا بیٹا کرن سنگھ ریاست کا ناظم اعلےٰ بنا دیا گیا ہے

ویسے کشمیر کا اصلی حکمران شیخ محمد عبداللہ تھا جو ہندوستان کا ایک نامور لیڈر تھا اور نہرو کا گہرا دوست۔ جب شیخ عبداللہ نے آزادی کشمیر کی تحریک کو چلانا شروع کیا تو اس پر بھارتی راہنماؤں کے کان کھڑے ہو گئے اور انہوں نے اسے وزیر اعلیٰ کے عہدے سے معزول کر دیا اور اسے گرفتار کر کے قید میں ڈال دیا۔

اس پس منظر سے اُن وجوہ کے کچھ اشارے مہیا ہوتے ہیں جن کے باعث بھارت کشمیر میں استصواب رائے سے گھبراتا ہے اور یہیں اقوامی تنقید کا نشانہ بنا۔ ہے پہلی وجہ یہ ہے کہ بھارت کا خیال ہے کہ پاکستان نے آزاد کشمیر کے علاقے سے اپنی فوجیں پوری طرح ہٹا کر پیچھے کنارہ کشی نہیں کی ہوئی۔ باقی دو وجوہ گہری ہیں جن کا تعلق بھارت کی فطرت سے ہے۔

بھارت کو ایک آزاد ملک بنے فقط دس برس گزرے ہیں ابھی تک بھارت کے اندر فرقہ پروری کی بعض تحریکیں چل رہی ہیں۔ بھارت کا خیال ہے کہ اگر اس نے کشمیر میں ہتھیار ڈال دیئے تو یہ تحریکیں ملک کا شیرازہ بکھیر دیں گی۔ بھارت کے اندر ابھی تک چار کروڑ مسلمان آباد ہیں۔ اُن کے اور ہندوؤں کے درمیان صلح کا رشتہ بڑا نازک ہے بھارت کا خیال ہے کہ اگر استصواب رائے سے کشمیر پاکستان کی طرف چلا گیا تو اس سے بھارت میں فرقہ وارانہ فسادات چھڑ جائیں گے۔ جس سے بھارتی مسلمانوں کی جانوں کا خدشہ پڑ جائے گا۔ جیسا کہ ۱۹۴۷ء میں ہوا تھا۔

پاکستان کے نزدیک یہ دلیل مضحکہ خیز ہے۔ وہ اسے یوں بیان کرتا ہے۔ ایک ملک کسی دوسرے کے علاقے پر قبضہ کر لیتا ہے۔ وہاں زبردستی اپنا قانون نافذ کر دیتا ہے۔ وہاں کی آبادی کو اس کے قومی رشتوں اور مذہبی میراث سے محروم کر دیتا ہے اور پھر تنبیہ کرتا ہے کہ اگر اسے چرائی ہوئی چیز کو واپس کرنے پر مجبور کیا گیا تو اس کی وحدت بکھر جائے گی۔ پاکستان کے لئے کشمیر اس قدر اہم ہے کہ اس میں مزید مبالغہ آرائی نہیں ہو سکتی۔ پاکستان کو یقین ہے کہ اگر کشمیر میں استصواب ہوا تو وہاں کے عوام پاکستان کے حق ہی میں ووٹ ڈالیں گے۔ لیکن دس برس کی طویل بحثوں کے باوجود ابھی تک کشمیر کا اصل علاقہ بھارت کے قبضے میں ہے۔ اس سے پاکستانی بڑی حد تک بیزار ہو گئے ہیں۔ اقوام متحدہ بھارت کے رویے سے مایوس ہو چکی ہے۔ اور پاکستان کے دوست مغربی ممالک بھی۔

پاکستانیوں کا یہ بھی بیان ہے کہ جنگی اور اقتصادی نقطۂ نظر سے کشمیر بھارت کی نسبت پاکستان کے لئے کہیں زیادہ ضروری ہے۔ مغربی پاکستان کی بڑی بڑی سڑکیں اور ریلیں لائن کشمیر کے متوازی چلتی ہیں۔ پاکستان کا یقین ہے کہ وہ اس وقت تک بھارت کے حملے یا کسی زبردست غیر ملکی دباؤ سے محفوظ نہیں رہ سکتا جب تک اس کے سر کی ٹوپی" یعنی کشمیر بھارت کے ہاتھ میں رہے گی۔ اقتصادی لحاظ سے کشمیر کی بہت سی تجارت اس علاقے سے ہوتی تھی یا سارا اپنا تجارت اس راستے سے گزرتا تھا۔ جواب پاکستان میں شامل ہے۔ پاکستان کی سب سے اہم دلیل یہ ہے کہ اگر کشمیر پر بھارت کا مستقل قبضہ ہو گیا تو وہ کشمیر سے نکلنے والے اور پاکستان میں بہنے والے سندھ، جہلم اور چناب جیسے دریاؤں کا پانی اپنے قبضے میں کر لے گا۔ جس سے مغربی پاکستان کی زراعت پہ تباہ کن اثر پڑے گا۔

کیا اس مسئلے کا کوئی حل بھی ہے۔

اس سلسلے میں ایک اہم حقیقت اُمید بندھاتی ہے۔ یہ تنازع زیادہ تر وادیٔ کشمیر کے متعلق ہے۔ جو بیضوی شکل کی ہے۔ اور جس کی لمبائی ۸۴ میل اور اوسط چوڑائی ۲۵ میل ہے اور جس کی آبادی سولہ لاکھ افراد پر مشتمل ہے۔ ہو سکتا ہے کہ پاکستان جموں اور لداخ حاصل کرنے کے لئے نہ اٹھے۔ ادھر بھارت آزاد کشمیر کو ایک کھویا ہوا علاقہ تصور کرتا ہے۔

ویسے دونوں طرفیں اب بھی یہی کہتی ہیں کہ انہیں ساری

ریاست چاہتے۔ بہرحال اگر ایسا ہو، جغرافیائی محل وقوع اور آبادی کے انتقال کی بنا پر دونوں طریقوں اس بات پر منتج ہو سکتی ہیں کہ آزاد کشمیر، جموں اور لداخ کے علاقے نکال کر باقی کشمیر کو تقسیم کر دیا جائے۔ لیکن کوئی طرف بھی وادیٔ کشمیر کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوتی۔ دونوں فریق غلط اس لیے نہیں جھگڑ رہے کہ یہ وادی فقط جنگی اور اقتصادی نقطہ نظر سے اہم ہے بلکہ اس لیے کہ وادی اس چیز کی علامت بن گئی ہے جس کی خاطر دونوں لڑ رہے ہیں۔ پاکستان کے نزدیک یہ کشمیری مسلمانوں کو پاکستان سے ملنے کا حق ہے لیکن بھارت کے لیے یہ اس نظریے سے منحرف ہو جانا ہے کہ برصغیر ہند کے ہندو اور مسلمان دو جداجدا قومیں ہیں۔ اس مسئلے کا ایک ممکن حل یہ بھی ہے کہ ایک دفعہ پھر تقسیم کا عمل دہرایا جائے اور وادی کشمیر کو بھارت اور پاکستان میں تقسیم کر دیا جائے اور اس کے ساتھ ہی کشمیریوں سے کہہ دیا جائے کہ وہ آزادانہ طور پر کشمیر کی سرحدوں سے باہر تجارت کر سکتے ہیں۔ ممکن ہے اس طرح تنظیمی امور کا شیرازہ بکھر جائے لیکن مسئلہ کشمیر کے موجودہ جمود اور بھارت اور پاکستان کے مابین موجودہ دشمنی کی روشنی میں تو یہی حل بہتر ہو گا۔

دوسرا ممکن حل آزادی ہے۔ یہ بھی ممکن ہو سکتا ہے کہ اگر کشمیریوں کو آزادی کا موقع دیا جائے تو وہ نہ تو بھارت اور نہ ہی پاکستان میں شامل ہوں۔ اقوام متحدہ کی سرپرستی میں کشمیر کی آزادی، ایک ایسا خیال ہے جو بہت سے کشمیری سیاستدانوں کے ذہن میں ہے۔ اور ان میں شیخ محمد عبداللہ بھی شامل ہے۔ یہ حل کارگر ہو سکتا ہے بشرطیکہ اقوام متحدہ کشمیر کو بھارت، پاکستان اور اشتراکیوں سے بچائے رکھنے کا یقین دلائے۔ پاکستان کشمیر میں استصواب رائے کے لیے تیار ہو جائے گا، جس سے کشمیریوں کے لیے تین راہیں کھل سکتی ہیں، یعنی یا تو بھارت یا پاکستان سے مل جائیں یا پھر خود مختار ہو جائیں۔

لیکن بھارت کسی ایسی تجویز پر رضامند نہ ہو گا جس سے اس کی سلامتی خطرے میں پڑ جائے اور اس کا یہ مطلب ہے کہ وہ نہ تو کشمیر کو آزادی دینا چاہتا ہے اور نہ ہی استصواب رائے جس کے الحاق کے حق میں ہے۔ بھارت اس امید پر زندہ ہے کہ کشمیریوں کو بھارت سے اس قدر فوائد ہوں گے اور وہ بھارت سے اس طرح گھل مل جائیں گے کہ دس بیس برس میں مسئلہ کشمیر فقط برائے نام رہ جائے گا جیسے ٹیکساس سے میکسیکو واپس لیا جاتا۔ یہ ایک موازنہ ہے جسے بھارتی وزیر دفاع بعض اوقات استعمال کرتا ہے۔ لیکن اگر یہ امید ناکام ثابت ہوئی اور کشمیری جذباتی طور پر بھارت کا حصہ نہ بنے تو پھر ممکن ہے کہ بھارت اس وقت آزاد کشمیر بنانے کی اجازت دے دے جب وہ آج کی نسبت زیادہ متوازن اور مستحکم ہو جائے۔

بہرحال کشمیر کا جو بھی حل ہو وہ بھارت اور پاکستان کے مابین موجودہ تناؤ کے ماحول میں کبھی ممکن نہیں۔ پاکستانیوں اور بھارتیوں کے درمیان ایک تلخی کی فضا ہے۔ اگر دونوں ملکوں کے راہنما تھوڑے عرصے کے لیے اس تلخی کو دور کریں اور باہمی اقتصادی تعاون کی کوشش کریں تو ان کے درمیان باہمی اعتماد کی ایک ایسی فضا پیدا ہو سکتی ہے جس سے مسئلہ کشمیر قابلِ حل ہو سکتا ہے۔ یہ بہت بڑا مطالبہ ہے۔ لیکن اس کے بغیر یہ مسئلہ حل بھی نہیں ہو سکتا اور اس طرح کشمیر برصغیر ہند اور شاید دنیا کے امن کے لیے ایک خطرہ بنا رہے گا۔

[illegible]
پروفیسر آف پولیٹیکل سائنس
[illegible] یونیورسٹی

کشمیر اور بھارت کی خارجہ پالیسی

کشمیر کے متعلق پاکستان اور بھارت کا تنازعہ [illegible] سے زیادہ پرانا ہو چکا ہے۔ اس دوران میں [illegible] جنگ کے قریب تک دکھائی [illegible] لیکن [illegible] اضطراب [illegible] دونوں اطراف [illegible] بہت [illegible] سے [illegible] خاص [illegible] پہنچ [illegible] پاکستان اور بھارت [illegible] اپنی فوجیں [illegible] خرچ کر رہے ہیں [illegible] بالکل [illegible] نہیں [illegible] دونوں [illegible] کشمیر میں اس قدر الجھ گئے ہیں کہ [illegible] سوویٹ روس [illegible] ہوئے [illegible] لگے ہیں۔

سیاسی [illegible] اس مضطرب [illegible] قیمت [illegible] زیادہ ہے۔ [illegible] کی ایک [illegible] فضا پیدا کر رہا ہے [illegible] ہو رہی ہے [illegible] مسئلے [illegible] نصف [illegible] نہیں۔ اس [illegible] مشترکہ [illegible] سے حل طلب مسائل سے پریشان [illegible] ایشیائی قوموں کے [illegible] تعمیری [illegible] امکانات [illegible] ہیں [illegible] ایشیائی قوموں اور [illegible] سکتے ہیں۔ اس سے ان قوموں کو ایک مسلسل تذبذب [illegible] گرفتار کر دیا ہے جو دونوں اطراف سے دوستانہ [illegible] رکھنا چاہتے ہیں۔ [illegible] طاقتوں کو ان ملکوں کے اندر [illegible] اور ان پر غلبہ پانے کی ترغیب دیتا ہے۔ اس نے بھارت کو اقوام متحدہ کے معاملات میں سرگرمی سے حصہ لینے سے روک رکھا ہے۔ [illegible] اس اخلاقی [illegible] کو کمزور کر دیا ہے جو وہ بین الاقوامی [illegible] میں استعمال کر سکتے تھے۔

اس جھگڑے کے تصفیے کی بہت سی کوششیں کی گئی ہیں۔ [illegible] ۱۹۴۹ کے آغاز [illegible] میں اس [illegible] متوجہ ہوگئی تھی۔ اس

تنازعے پر [illegible] شمار [illegible] جنرل [illegible] [illegible] اور ڈیکسن [illegible] ڈبلیو [illegible] کمیشن [illegible] کئے گئے [illegible] کے احباب [illegible] اور [illegible] مشورے [illegible] دونوں متعلقہ اطراف کے [illegible] کا نتیجہ اس کے سوا اور [illegible] دونوں [illegible] جھگڑ [illegible] ایک دوسرے کے [illegible] قانونی [illegible] دونوں سے [illegible] کی [illegible] صفحے [illegible] مباحثے کی [illegible] اقراروں پر عمل [illegible]

اس دوران [illegible] زیادہ [illegible] حال [illegible] شدید [illegible] آخر [illegible] بھارت نے کشمیر کا اپنے ساتھ الحاق کر کے [illegible] کا تصفیہ کر لیا [illegible] اس تنازعہ کا [illegible] تصفیہ کرنا چاہتا ہے تو بھارت کے اس "تصفیے" کو ملحوظ خاطر رکھے۔

اس تنازعے کی طوالت [illegible] نوعیت اور ایشیا [illegible] بین الاقوامی سیاست کے تغیر نے اس جھگڑے [illegible] پیچیدہ بنا دیا ہے۔ نتیجۃً باہر کے جو لوگ اس جھگڑے کا تصفیہ کرانے کے خواہاں تھے اس سلسلے میں خود کو معذور پانے لگے کہ دونوں متعلقہ اطراف کے مفادات کے حسن و قبح کو دیکھ سکیں اور غیر جانبدار رہتے ہوئے [illegible] جھگڑے [illegible] اقرار کا تعین کر سکیں۔

[illegible] طور پر کشمیر کے جغرافیائی محل وقوع سے وابستہ ہیں خصوصاً چین اور سوویٹ روس کی ہمسائیگی کے باعث۔ علاوہ بریں یہ اس کے بعض دریاؤں سے وابستہ ہیں جو [illegible] پاکستان میں

قدرت کے لئے سب سے اہم ہیں یہ پہاڑی سحر آفریں وادیاں ہیں جو سیاحت کا مرکز ہیں اور وہ قیمتی مقدار خام مواد ہیں جو یہاں مہیا ہوتے ہیں۔ لیکن اس تنازعہ کے تمام سے اہم تنازعات، سوائے نہری پانی کے دونوں اطراف نے نفرت و شبہ کے کسی موقع پر ان چیزوں کا ذکر نہیں کیا۔

اگر تنازعہ کشمیر کو چند لفظوں میں بانٹ کر انہیں الگ الگ حل کرنے کی کوشش کی تو بدقسمتی سے اس صورت میں بھی اس جھگڑے کی تہ تک نہ پہنچا جائے گا۔ یہ تہ بنیادی طور پر اعتقادی و نظریاتی ہے اس لئے مفاہمتی یا مصالحت کی حدود سے باہر ہے۔ بھارت خود کو سیکولر (غیر مذہبی) ملک کہتا ہے کشمیر (جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے) کا الحاق خود سے کر کے بھارت یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ ہندو اور مسلمان مل جل کر امن سے رہ سکتے ہیں اور بھارت کی نظریاتی بنیاد خاصی محکم ہے۔ اس حقیقت سے قطع نظر مسلم اکثریت والے علاقوں کو خود میں شامل کرنے کا پاکستان کو حق حاصل ہے کشمیر کا پاکستان سے الحاق تین کروڑ بھارتی مسلمانوں کے لئے سنجیدہ نوعیت کے مسائل کھڑے کر دے گا۔

اس کے برعکس پاکستان خود کو اسلامی ملک کہتا ہے۔ لہٰذا اس کے لئے کشمیر کو اپنی حدود میں شامل کرنا اس نظریے کی تکمیل کرنا ہے جس پر پاکستان کی بنیاد رکھی گئی ہے یعنی برصغیر ہند کے مسلمانوں کے لئے ایک جداگانہ ملک کی تخلیق۔ اس نظریے کی بنیادی خوبیوں کے علاوہ اس کی تکمیل بہت سے پاکستانیوں کے لئے عالم اسلام میں عزت کا سوال بھی ہے۔

اس قسم کی نظریاتی سوچ بچار دونوں ملکوں کے خصوصاً موجودہ راہنماؤں کے نزدیک خاص اہمیت رکھتی ہے کیونکہ وہ آزادی کی طویل جدوجہد میں ایک دوسرے کے خلاف بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے ہیں۔ اگرچہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس قسم کی نظریاتی سوچ بچار کی اہمیت کم ہوتی جائے گی۔ لیکن وہ وقت آنے تک ممکن نہیں کہ دونوں حریفوں کی حیثیت میں کوئی فرق آئے کیونکہ دونوں ملکوں کی سیاسی مصالح اس تجربے کے سبب زہر سا رچا رہے گا۔

دولتِ مشترکہ پر اثر

بعض باہر کے ملک جن کا اس جھگڑے سے قریبی تعلق ہے دولتِ مشترکہ کے رکن ہیں جنہیں یہ "اندرون خانہ" تنازعہ کا جھگڑا بہت پریشان کر رہا ہے۔ دولتِ مشترکہ کے بہت سے وفادار حامی (جن کی زیادہ تعداد آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ میں ملتی ہے) اپنے اس خوف میں حق بجانب نکلے ہیں کہ ایشیا کے کسی ملک کو دولتِ مشترکہ میں شامل کرنا پریشانی سے خالی نہ ہوگا۔ ان کا خیال ہے کہ دولتِ مشترکہ کے استحکام اور ہم آہنگی کا انحصار ایک قسم کے احساسِ وفاداری ورثے میں ملے ہوئے رشتۂ خون پر ہے جس میں ایشیائی رکن شریک نہیں ہو سکتے۔ اسی باعث دولتِ مشترکہ کے پرانے رکن اپنے جھگڑوں کا تصفیہ آسانی سے کر لیتے ہیں۔ لیکن بعض ایشیائی ملکوں کو دولتِ مشترکہ کا رکن بنا لینے سے اس کی بنیادیں متزلزل ہو گئی ہیں اور اس کی بنیادی نوعیت بدل گئی ہے۔ اس اقدام نے ایک منظم ڈھانچے کو ایک ایسے کارگر ہتھیار میں بدل دیا ہے جسے اس کا ہر رکن اپنے مفاد کی خاطر استعمال کرنا چاہتا ہے۔

مانا کہ دولتِ مشترکہ میں آج کل یہی کچھ ہو رہا ہے لیکن کیا ایشیائی ملکوں کو اس کا رکن بنانے سے پہلے بھی اس میں یہی کچھ ہوتا تھا؟ یہ ایک ایسی بات ہے جسے دولتِ مشترکہ کے نظام کے پرجوش یا جذباتی حامی بہ آسانی ماننے کو تیار نہ ہوں گے۔ پھر بھی وہ کبھی کبھار یہ ضرور تسلیم کریں گے کہ دولتِ مشترکہ کے تعلقات کی استواری کا کچھ نہ کچھ انحصار اس کے جامع اور باضابطہ نظام اور اس کے فوائد پر ہے اور اگر یہ فوائد انحطاط پذیر ہو گئے تو اس سے اس نظام کی جامعیت پر اثر پڑے گا۔ ٹھوس ثبوتوں کی موجودگی میں اس سے انکار کرنا ناممکن ہو گا۔ عرصہ ہوا لندن کو دولتِ مشترکہ کی "آواز" کی حیثیت نہیں رہی۔ اس کی یہ وجہ نہیں کہ اس کے بہت سے رکن "بالغ" ہو گئے ہیں لہٰذا اپنی پالیسیوں کا اظہار خود کر سکتے ہیں بلکہ اس لئے کہ یہ پالیسیاں ایک دوسرے کے متوازی نہیں رہیں۔

مثلاً انفرادی طور پر دولتِ مشترکہ کے رکنوں کو معلوم ہوا ہے کہ ان کے قومی مفاد اتنے مختلف ہیں کہ ان کا اظہار دولتِ مشترکہ کے کسی مجموعی مفاد کی صورت میں نہیں ہو سکتا مثلاً بھارت اور دوسرے رکنوں کی غیر جانبداری دولتِ مشترکہ کی بعض اہم پالیسیوں کو مربوط نہیں ہونے دیتی۔ دولتِ مشترکہ کے رکن اشتراکی چین اور اس کے طرزِ عمل

کے بارے میں ایک دوسرے کے ہم نوا نہیں۔ علاقائی سمجھوتوں کے باعث ان
سے اس کے رکنوں کو جیسے بڑا ذاتی انداز میں متضاد حیثیتوں میں تقسیم کر دیا
دیا ہے ان کے کاروباری مفادات وغیرہ۔ دولت مشترکہ کے اجتماعی مفاد
سے مطابقت نہیں رکھتے۔ آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ جیسے وفادار ملکوں
نے امریکہ سے مل کر دفاعی انتظامات کر لئے ہیں اور کر رہے ہیں۔ ان کے
مابین جو معاہدہ ہوا ہے اس میں برطانیہ ایک رکن کی حیثیت سے تو کجا ایک
ناظر کی حیثیت سے بھی شامل نہیں۔

اس رجحان کا یہ نتیجہ ہوا ہے کہ دولت مشترکہ کے وزرائے
اعظم کی کانفرنسوں کے موقع پر بعض اہم مسائل مثلاً فوجی معاہدات
اور کسی دوسرے ملک سے سمجھوتہ وغیرہ۔ فقط اس لئے چھوڑ دیے جاتے
ہیں کہ ان سے باہمی تعلقات کی فضا میں یقیناً بگاڑ پیدا ہو جائیگا
دولت مشترکہ کے بعض حامیوں کا خیال ہے کہ کسی بات پر غیر متفق ہونا دولت
مشترکہ کے تمام ممبروں کا روایتی حق ہے۔ یا ایسے معاملات جن پر عدم اتفاق ہے
انہیں نظر انداز کرنا ان کا روایتی طرز عمل ہے۔ لیکن دولت مشترکہ
میں اختلاف رائے کے موضوع دن بدن اتنے زیادہ ہوتے جا رہے ہیں کہ
یہ دولت مشترکہ کے نظام اور مقصد پر برے انداز میں اثر انداز ہونے
لگے ہیں۔ دولت مشترکہ جس میں پہلے ہر ایک کے مفاد کو پیش نظر رکھا جاتا
تھا اور اختلافات بہ آسانی دور ہو جاتے تھے۔ اب بعض عام مفادوں
کا اکھاڑہ بن گئی ہے ـــــــ البتہ عام مفاد جو اچھے پیمانے پر وسیع
اختلافات لئے ہوئے ہیں۔

اس صورت حال میں تنازع کشمیر نے بہت اضافہ کیا ہے۔
دولت مشترکہ کے بہت سے ممبروں کی یہ خواہش کہ اس جھگڑے کا
تصفیہ دولت مشترکہ کے اندر ہی ہو جائے خاصی عیاں ہے۔ لیکن
اس سلسلے میں ثالثی کی متعدد کوششیں ناکام ثابت ہوئی ہیں بلکہ
الٹا ان سے دولت مشترکہ کے اندر زیادہ کھچاؤ پیدا ہو گیا ہے یہاں
برطانیہ نے زیادہ تر چپ رہنا ہی مناسب سمجھا ہے اور غیر جانبدارانہ
پالیسی اختیار کئے رکھی ہے۔ لیکن اس کی اس پالیسی نے اسے بھارت
اور پاکستان کی نظروں میں کسی حد تک مجرم سا بنا دیا ہے۔ آسٹریلیا
نے اس جھگڑے میں زیادہ دلچسپی لی ہے کیونکہ وہ شمالی قریب
کے ہمسایہ ممالک سے اچھے تعلقات استوار کرنے کا متمنی ہے۔

۱۹۵۱ء میں دولت مشترکہ کے وزرائے اعظم کی کانفرنس کے دوران
میں اور اس سے پہلے آسٹریلیا کے وزیر اعظم مسٹر مینزیز نے اس
تنازع کے تصفیے کی خاص کوشش کی تھی اور کشمیر میں آزادانہ
استصواب کی نگرانی کے کئی طریقے تجویز کئے تھے۔ لیکن ان طریقوں پر
صرف نکتہ چینی کرنے کے سوا بھارت کا اور کوئی ردعمل نہ تھا۔

اس تجویز کے سلسلے میں اور عام سطح پر بھی ہر اس تجویز کے
سلسلے میں جس نے مغرب کی سرزمین پر جنم لیا ہو خواہ اس کا منبع دولت
مشترکہ ہی کیوں نہ ہو بھارتی انتہاپسندوں کا جذباتی اور نفسیاتی بگاڑ
حیرت کی نظر سے نہ دیکھا جائے گا۔ اسی باعث دولت مشترکہ
ایک خاص مغربی ادارہ سمجھا جانے لگا ہے اور بھارت میں اسے
اقوام متحدہ سے بہت معمولی گردانا جاتا ہے۔ اسی نکتے کی طرف اشارہ
کرتے ہوئے ۱۲ فروری ۱۹۵۱ کو پنڈت نہرو نے بھارتی پارلیمنٹ میں
کہا تھا کہ دولت مشترکہ کی افواج کے زیر نگرانی کشمیر میں استصواب
رائے کرانا کسی طرح برداشت نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ماضی قریب
کی تاریخ نے ان افواج کو مشکوک بنا دیا ہے۔ بعد میں پنڈت نہرو
نے خود اقوام متحدہ کی فوج کا داخلہ بھی کشمیر میں ناقابل قبول ٹھہرا
دیا اگرچہ اس مرتبہ انکار کی بنیاد انہوں نے کچھ اور مقرر کی۔

بھارت کا نقطۂ نظر

تنازع کشمیر کے تصفیے میں اقوام متحدہ کو بھی اتنی ہی کامیابی
ہوئی ہے جتنی دولت مشترکہ کو۔ ساتھ ہی اس جھگڑے میں بھارت کی
ہٹ دھرمی نے اقوام متحدہ کے دوسرے مسئلوں کے سلسلے میں
بھارت کی پوزیشن پر برا اثر ڈالا ہے۔ کشمیر کی صورت حال نے مجموعی
طور پر اس کے نقطۂ نظر کو تعصب کے رنگ میں رنگ دیا ہے۔
کشمیر کے متعلق اقوام متحدہ کا کوئی عمل یا غیر عمل بھارت کی نظروں
میں ایک کسوٹی بن گیا ہے۔ اسی باعث وہ اقوام متحدہ میں وقتاً فوقتاً
پیش ہونے والے دوسرے مسائل کے متعلق اقوام متحدہ کے عمل اور
غیر عمل کو اسی انداز سے دیکھتا اور دکھاتا ہے جو کشمیر کے مسئلے پر بھارتی
موقف کی حمایت کرے کیونکہ اس طرح وہ تنازع کشمیر کے متعلق اپنے
رویے کو برحق ثابت کر سکتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں بھارت اقوام متحدہ

میں پیش ہونے والے اکثر مسائل کو انفرادی خوبیوں اور خامیوں کی روشنی میں دیکھنے کے بجائے انہیں تنازعۂ کشمیر کی روشنی میں دیکھتا ہے۔ بہت سے معاملوں میں مسئلہ کشمیر ایک ایسی کسوٹی بن گیا ہے جس کے مطابق بھارت نے اقوام متحدہ میں اپنا موقف طے کر رکھا ہے۔ یہ موقف خصوصاً اس لحاظ سے اس کے لئے فائدہ بخش ہے کہ بھارتی حکومت یہ سوچتی ہے کہ ممکن ہے یہ طرز عمل کسی نہ کسی طرح تنازعۂ کشمیر کے تصفیے کو اس کے حق میں کرنے کے لئے کسی وقت مددگار ثابت ہو اگرچہ اسے اس ضمن میں اقوام متحدہ کی بعض دوسری قوموں کے متعلق ایسی پالیسیاں اختیار کرنی پڑی ہیں جو کسی طرح باہم مربوط و ہم آہنگ نہیں اور جنہیں اگر کوئی اور قوم بھارت کے سلسلے میں برتتا تو بھارت کسی صورت انہیں قابل قبول نہ سمجھتا۔ ظاہر ہے کہ سرکاری طور پر کوئی حکومت اپنی اس نوعیت کی پالیسیوں کا کھلم کھلا اقرار نہیں کرتی۔ لیکن ان کو سرکاری بیانوں کے بین السطور اور اخباروں کے اداریوں میں بخوبی تلاش کیا جا سکتا ہے۔

مثلاً جنگ کوریا کو مسئلہ کشمیر سے بہ آسانی تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ سیکورٹی کونسل میں شمالی کوریا کو حملہ آور قرار دینے اور بھارت کے مطالبے کے خلاف پاکستان کو کشمیر پر حملہ آور قرار نہ دینے کے فیصلے پر بڑی تلخی پیدا ہوئی۔ کوریا میں جارحانہ عملی قدم اٹھانے اور مسئلہ کشمیر پر پس و پیش کرنے کا یہ تضاد معنی خیز ہے۔ کشمیر کو کوریا کے پانسے کا مسئلہ نہ بنانے پر بھارت بڑا چیں بجبیں ہوا تھا۔ (بعد میں پاکستان نے بھی یہی کچھ کیا تھا مگر متضاد وجوہ کی بنا پر)

کوریا میں چینی جارحانہ اقدام کے سدباب کے سلسلے میں سیکورٹی کونسل کی جو دو قرار دادیں منظور کی تھیں ان کے حق میں بھارت نے اس امید پر ووٹ دیا تھا کہ جب بھارت سیکورٹی کونسل میں کشمیر پر پاکستان کے حملے کے متعلق کوئی قرار داد پیش کرے گا تو دوسرے ممبر اس کی حمایت کریں گے۔ بعد میں جنگ کوریا کی خاطر ایک سے زیادہ ایمبولینس یونٹ دینے سے بھارت کا انکار اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ وہ کشمیر میں اپنی فوجیں رکھنا چاہتا ہے۔ اقوام متحدہ کا یہ اصرار کہ جب تک شمالی کوریا سارے کوریا میں سے اپنی فوجیں نہ ہٹائے گا وہاں اقوام متحدہ کی زیر نگرانی آزادانہ استصواب رائے کا ہونا مشکل ہے۔ بھارت کو اس لئے گراں گزرا کہ یہ اقوام متحدہ کی ایک دوسری قرار داد کی ضد تھا جس میں کشمیر سے پاکستانی فوجیں ہٹائے بغیر وہاں استصواب رائے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ اقوام متحدہ کے ایسے فیصلوں کا سہارا لے کر بھارت نے کشمیر کے متعلق اپنے رویے کو مضبوط کر لیا۔ اس طرح بھارت نے اس بنا پر شمالی کوریا میں پولیس کی گرفتاریوں کی مخالفت کی کہ اقوام متحدہ نے ایسی قسم کا حربہ پاکستان کے خلاف کیوں نہیں استعمال کیا۔

بھارت کا یہ رویہ کہ اقوام متحدہ میں پیش ہونے والے اکثر مسائل کا رشتہ مسئلہ کشمیر سے جوڑا جائے اس کی ایک اور مثال اقوام متحدہ کی وہ قرار داد ہے جو ۸ نومبر ۱۹۵۶ کو سیکورٹی کونسل نے روسی فوجوں کو ہنگری سے واپس بلانے اور وہاں اقوام متحدہ کی زیر نگرانی استصواب کرانے کے سلسلے میں منظور کی تھی اور جس کی بھارت نے مخالفت کی تھی۔ ہنگری سے روسی فوجیں واپس بلانے اور وہاں انتخابات کرانے کے فیصلے پر بھارت کی مخالفت کی وجہ صاف نظر آتی ہے۔ اس مخالفت کا رشتہ اس مخالفت سے با آسانی جوڑا جا سکتا ہے جو بھارت نے کشمیر سے اپنی فوجیں ہٹانے اور وہاں اقوام متحدہ کی زیر نگرانی انتخابات کرانے کے سلسلے میں اقوام متحدہ کی قرار دادوں پر کی تھی۔ دوسری طرف ہنگری کی صورت حال بھارت کی تلون مزاجی کی ایک مزید مثال پیش کرتی ہے۔ اگرچہ بھارت نے ہر موقع پر پاکستان کو کشمیر پر حملہ آور ٹھہرانے کا مطالبہ کیا ہے لیکن اس نے روس کو ہنگری پر حملہ آور قرار دینے سے انکار کر دیا ہے کیونکہ مسٹر نہرو کسی کو گالی دینا غیر تعمیری فعل سمجھتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ اس سے مسائل حل نہیں ہوتے۔

کشمیر سے متعلق بھارت کے تجربے نے بین الاقوامی جھگڑوں کو پرامن طریقوں سے حل کرنے کی طرف اس کے رویے کو سرد سا بنا دیا ہے بخصوص جب فیصلہ کسی تیسری پارٹی نے کرنا ہو مثلاً کوئی ثالث مقرر کر دیا جائے یا یہ بین الاقوامی عدالت کے سپرد کر دیا جائے۔ بھارت اس قسم کے تکلفات میں پڑنے کے حق میں نہیں، وہ چال بازی اور دوغلے پن کو ترجیح دیتا ہے۔ اس طرح وہ غیر ملکیوں خصوصاً مغربی باشندوں کو یہ کہہ کر اپنے معاملات میں دخل اندازی نہیں کرنے دیتا کہ یہ ہمارے اپنے معاملے ہیں اور ہم خود ہی ان سے نپٹ لیں گے۔ اس سے صاف ظاہر

جو زمانہ گزشتہ اور اسے اپنے طور پر حل کرنے کی بھارت کی خواہش کیونکہ اسے اقوام متحدہ مطمئن کرنے سے قاصر ہے) اس کے علاوہ اس بات کو تقویت پہنچاتی ہے کہ اس تنازعہ کو حل کرنے کے سلسلے میں تمام مغربی طریقے ایک "ضمنی" یا "ریک منی" اریہ مسٹر نہرو کی اپنی اصطلاح ہے ، سے محروم ہیں اور ایشیائی قوموں کو ان کے اپنے معاملات تصفیہ کرنے کے لئے ان کے حال پر چھوڑ دیا جانا چاہیئے۔

اگر مسٹر نہرو کی یہ خواہش پوری کر لی جائے کہ بھارت ایک ایسے ایشیا کی قیادت کرتا ہے جو برابری کے سلوک، عزت اور رتبے کے مطالبات کے تحت متحدہ محاذ قائم کرکے مشترک مغرب کا مقابلہ کر سکتا ہے تو اس کے لئے موجودہ طرز عمل ضروری ہے لیکن ایسے متحدہ محاذ کی ساخت کے سلسلے میں تنازعہ کشمیر ایک سنجیدہ خطرہ ہے کیونکہ یہ مسٹر نہرو کی ان نصیحتوں کو کمزور کر دیتا ہے جو وہ دوسری قوموں کو کرتے رہتے ہیں کہ وہ اپنے تنازعوں کا تصفیہ تشدد کے بجائے پرامن گفت و شنید سے کریں۔ متحدہ محاذ ہی نہیں ہر قسم کے مسئلے سے بھارت کی زود حسی جھلکتی ہے۔ اس کا نقطۂ نظر تنگ اور تناظر مسخ ہو چکا ہے۔

معاہدے

سیٹو اور بغداد پیکٹ سینٹو جیسے معاہدوں کے خلاف بھارتی آواز اتنی تیز ہرگز نہ ہوتی اگر تنازع کشمیر نے سر نہ اٹھایا ہوتا اور پاکستان ان معاہدوں میں شریک نہ ہوتا۔ مارچ ۱۹۵۶ میں سیٹو کے سرکاری اعلان اور مارچ ۱۹۵۶ میں بغداد پیکٹ کے بیان میں کشمیر کے متعلق ایک بے ضرر سے حوالے نے کہ کشمیر کا حل ممکن ہے ، بھارت کو سیخ پا کر دیا تھا اور وہ احتجاج پر اتر آیا تھا۔ یہ حوالے امن دشمنی کے ثبوت گردانے گئے۔ بھارت نے کہا کہ سیٹو اور بغداد پیکٹ جیسے فوجی معاہدے اس امن کو تباہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جسے بھارت ایشیا میں قائم کر رہا ہے ، یہ معاہدے برصغیر کو "سرد جنگ" میں گھسیٹنے کے درپے ہیں۔ لیکن جب ۱۹۵۵ میں بلگانن اور خروشچیف سرکاری دورے پر آتے اور اس دوران میں انہوں نے اپنے ... کشمیر کو بھارت کا ایک اہم حصہ کہا تھا تو اس پر بھارت ... ہوا اور اسے یہ احساس نہ رہا کہ یہی بیان اس جھگڑے کو

"سرد جنگ" میں کھینچ لایا ہے۔ ویسے روس کے پہلے نائب وزیر مسٹر اے. آئی. مائیکویان جب مارچ ۱۹۵۶ میں پاکستان کے دورے پر آئے ہوئے تھے تو انہوں نے بلگانن اور خروشچیف کے اس بیان کی تردید کرنے سے واضح کر دیا تھا کہ کشمیر ... مستقبل کا تعین فقط کشمیری کر سکتے ہیں مگر اس بیان کو بھارت نے نظر انداز کر دیا تھا پھر یہ بھی محل نظر ہے کہ بھارت نے بعد از جنگ کے اولین معاہدے کا — جو روس اور سرخ چین کے درمیان ۱۹۵۰ میں طے پایا تھا — کبھی ذکر بھی نہیں کیا ، ورنہ اس پر چیں بجبیں ہوا ہے۔

دوسری طرف اقوام متحدہ میں کشمیر کے متعلق امریکہ کی نہیں بلکہ وہ غیر جانبدارانہ حیثیت نے (شاید اسی غیر جانبداری کے باعث) اسے بھارت کی نگاہوں میں جانبدار بنا دیا ہے۔ بھارت کا یہ تاثر اس وقت اور بھی گہرا ہو گیا جب امریکہ نے پاکستان کو اسلحہ اور دوسرا سامان جنگ دیا تھا کشمیر پر قبضہ کرنے کا بھوت بھارتیوں پر کچھ اس طرح سوار ہو گیا ہے کہ وہ اس امر کی نقطۂ نظر کو قبول ہی نہیں کرتے کہ بھارت کو اپنے تحفظ کے سلسلے میں کچھ ایسے مسائل بھی درپیش ہیں (مثلاً چینی خطرہ) جو مسئلہ کشمیر سے قطع نظر فوری حل کے طالب ہیں۔

یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ مسئلہ کشمیر نے بھارتی سوچ کو اس طرح بدل دیا ہے کہ بین الاقوامی سیاست کے بارے میں اس کا طرز عمل اور طرز فکر بدل گئے ہیں اور یوں ان ممالک کا ایک جگہ بیٹھ کر کسی جھگڑے کا تصفیہ کرنا مشکل ہو گیا ہے جو بھارت کے دوست ہیں لیکن وسیع نقطۂ نظر کے مالک ہیں۔ اس جھگڑے سے بھارت اور پاکستان کو جو نقصان برداشت کرنا پڑ رہا ہے وہ تو ایک طرف رہا اس کا ایک برا نتیجہ یہ بھی ہے کہ اس نے امن عالم میں بھارت کے تعاون کو گھٹا دیا ہے۔ فقط اسی سبب یہ جھگڑا اور اس کا حل دنیا کے لئے ایک توجہ کا باعث بن گیا ہے۔ علاوہ بریں ، بھارت کی خواہشات کی پرواہ کئے بغیر جوں جوں سرد جنگ برصغیر میں داخل ہوتی چلی جائے گی ، ایسے بڑے اور اہم مسائل سامنے آجائیں گے کہ کشمیر کا مسئلہ ایک طرف رہ جائے گا اور بھارت اور پاکستان جنگ کی لپیٹ میں آجائیں گے۔

مسئلہ کشمیر کے متعلق بھارت کی غیر معمولی زود حسی نے اس کے لئے ان خطرات کا اندازہ کرنا اور ان سے ضروری نتائج اخذ کرنا مشکل بنا

دیا ہے۔ بہرحال وہ تمام فوجی احتیاطیں جو بھارت اپنی شمالی سرحد پر برت رہا ہے اور وہ تمام طریقے جن سے وہ ہلکی سٹرائکنگ یونیٹیں بنا رہا ہے اس حقیقت کی غمازی کرتے ہیں کہ اسے بھی احساس ہے کہ حقیقی خطرہ کس طرف سے نمودار ہوگا۔ ممکن ہے بھارت کی یہ بانجھی اسے اور پاکستان کو ایک دوسرے سے قریب تر کر دے اور دونوں ملک مستقبل میں ایک ٹھوس امن کی بنیاد رکھنے میں کامیاب ہو جائیں۔

(کرنٹ ہسٹری، جون ۱۹۵۸ء)۔

لائف
۸ر فروری ۱۹۵۷ء

اقوامِ متحدہ کو زبردست چیلنج

ادارہ اقوام متحدہ جسے صدر آئزن ہاور نے امریکی خارجہ پالیسی کی کسوٹی بنا رکھا ہے، ایک ایسے نازک اور فیصلہ کن امتحان کا سامنا کر رہا ہے جو پہلے کبھی امریکی قرارداد ... کا طالب ہے۔ یہ امتحان کشمیر ہے کہ جس کے معاملے میں بھارت ایک طرف تو اقوام متحدہ کو حکم کی تعمیل سے انکار کر رہا اور دوسری طرف اس نے طلوع ... پارہ پارہ ... عملات میں معدوم ... کیے ہیں۔ نیز اپنے ہی وعدے کی خلاف ورزی کر رہا ہے۔

بیشتر امریکنوں کے لیے کشمیر ایک ایسا ہی اجنبی اور دور افتادہ ملک ہے۔ جیسا کہ ان کے لیے ۱۹۴۷ء سے پہلے کوریا تھا۔ اور ان کی بہت قلیل تعداد اس کے معاملات میں دلچسپی لیتی ہے۔ پر انہیں ضرورت بھی کیا ہے کہ اپنے فوری معاملات کو چھوڑ کر ایسے دور کے مسئلے میں دلچسپی لیں۔ لیکن اقوام متحدہ میں تو امریکنوں کو بہت دلچسپی ہے۔ اور مسئلہ کشمیر اس ادارے کی توقیر کو گھٹا یا بڑھا سکتا ہے۔ اس لیے امریکنوں اور ان کے راہنماؤں کے لیے کشمیر کا مسئلہ بے حد اہم ہونا چاہیئے۔ علاوہ بریں اس مسئلے نے ایک دفعہ تو بھارت اور پاکستان کو جنگ کے دروازے پر لا کھڑا کیا تھا اور اگر اسے حل کئے بغیر ہی چھوڑ دیا گیا تو یہ یقیناً خون خرابے کا باعث بن سکتا ہے۔ کیونکہ سرخ چین اور سوویٹ روس کی سرحدیں کشمیر سے ملتی ہیں جس سے بین الاقوامی جنگ کا آتش فشاں پہاڑ کسی وقت بھی پھوٹ سکتا ہے۔

۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی تقسیم کے تھوڑے عرصے بعد ہی مسئلہ کشمیر نے جنم لے لیا۔ اسی تقسیم کی رو سے پاکستان معرض وجود میں آگیا۔ یہ ملک ہندوستان کے مسلم اکثریت والے علاقوں پر مشتمل ہے۔ اس وقت یہ فیصلہ بھی ہوا تھا کہ ہندوستان کی ریاستیں بھارت یا پاکستان میں شامل ہو سکتی ہیں لیکن خود مختار نہیں رہ سکتیں۔ اگرچہ ۴۴,۰۰,۰۰۰ ۴۴ لاکھ عوام میں سے اکثریت مسلمانوں کی ہے (وہاں مسلمانوں اور ہندوؤں کا تناسب ۳:۱ ہے۔ فقط جموں کے صوبے میں ہندوؤں کی اکثریت ہے) لیکن جب ۱۹۴۷ء میں وہاں ہندوؤں اور مسلمانوں میں خون خرابہ شروع ہو گیا اور قبائلی پٹھان مسلمان اپنے مسلمان بھائیوں کی مدد کے لیے ریاست میں قافلوں کی صورت میں آئے، تو مہاراجہ نے خود ... جلد بازی سے کام لیتے ہوئے کشمیر کا "الحاق" بھارت سے کر دیا۔ پاکستان ان قبائل کی اسلحہ اور دوسری ضروریات کے سلسلے میں مدد کرنے لگا اور ساتھ ہی اس نے مغربی کشمیر میں ان مقامی رضاکاروں یا آزاد فوجوں کی بھی مدد کا سلسلہ شروع کر دیا جو اس عرصے میں منظم ہو گئی تھیں۔ اس پر بھارت نے ہندوؤں کی حفاظت اور مسلمانوں سے مقابلے کی خاطر اپنی فوجیں کشمیر میں اتار دیں۔ اس وقت بھارت کے وزیر اعظم مسٹر نہرو نے بذات خود اقوام متحدہ سے درخواست کی تھی کہ امن پسندی کا ثبوت دیتے ہوئے اس معاملے میں دخل اندازی کرے اور جنگ بند کرا دے۔

اقوام متحدہ کے ایک وفد نے دونوں اطراف سے جنگ بند کرنے کی درخواست کی اور دونوں کو مندرجہ ذیل باتوں پر متفق کر لیا۔ (۱) ایک خط جنگ بندی کھینچا جائے۔ (۲) دونوں اطراف اسلحے کا استعمال ترک کر دیں اور (۳) آزادانہ استصواب رائے کرایا جائے جس کے ذریعے کشمیریوں کو حق حاصل ہوگا کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق بھارت یا پاکستان میں شمولیت کر سکیں۔ اڈمیرل چسٹر ڈبلیو نمٹز کو استصواب رائے کا ناظم مقرر کیا گیا لیکن یہ استصواب رائے آج تک نہیں ہو سکا۔ اقوام متحدہ کے ثالث ڈاکٹر فرینک گراہم کی چار سالہ مخلصانہ کوششوں کے باوجود اس مسئلہ پر دونوں اطراف کے مابین گفت و شنید ہمیشہ ناکام رہی ہے کہ کیسے اور کب بھارتی فوجوں اور مغربی کشمیر کے مقامی رضاکاروں کو ممنوع قرار دے کر کشمیر کے علاقے سے نکالا جائے۔

اس عرصے کے دوران میں بھارت نے مقبوضہ کشمیر میں ایک

کمیٹی "مجلس قانون ساز" بنا ڈالی۔ یہ اسمبلی فقط ہندوؤں کی اقلیت کی نمائندگی کرتی ہے لیکن اپنے آپ کو ساری ریاست کی نمائندہ کہتی ہے۔ اس بودے دعوے پر اس اسمبلی نے ۲۶ جنوری ۱۹۵۷ء کو ووٹوں کی اکثریت سے کشمیر کا بھارت سے الحاق کر دیا۔ اسی بات نے سیکورٹی کونسل کو اس مہینے صفر کے مقابلے میں دس ووٹوں سے ایک نئی قرارداد کے ذریعے اپنی گزشتہ تمام قراردادوں کی تصدیق کرنے پر مجبور کر دیا۔ یہ قراردادیں کشمیر میں استصواب رائے کرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ لیکن سیکورٹی کونسل کے مباحثے میں حصہ لیتے ہوئے بھارتی چیف نمائندے کرشنا مینن نے نہ صرف نئی قرارداد کی مذمت کی بلکہ یہ بھی کہا کہ اب کشمیر کا "باقاعدہ" بھارت سے الحاق ہو جانے کے باعث استصواب رائے کے گزشتہ تمام وعدے اپنی اہمیت کھو بیٹھے ہیں۔ مسٹر مینن کی زبان میں بھارت کے دلائل ایک ایسے مجرم سے ملتے جلتے تھے جو اپنے والدین کو قتل کرنے کے بعد اس بنا پر رحم کا طلب گار ہو کہ وہ یتیم ہو گیا ہے۔ پنڈت نہرو کے لیے اس انتہا پسندانہ رویے کی کچھ داخلی وجوہ ہیں کیونکہ انہیں عام انتخابات کا سامنا کرنا ہے۔ لیکن دنیا کے سامنے اس مسئلے پر نہرو کی کوئی اخلاقی حیثیت باقی نہیں رہی اور اس حیثیت کو قائم رکھنے کی خاطر اس کی ہر چال مکاری پر مبنی ہے۔

اب پاکستان نے سیکورٹی کونسل سے درخواست کی ہے کہ وہ کشمیر سے ہر قسم کی فوج کو ہٹانے کے لیے اپنی فوج کا استعمال کرے۔ کیونکہ جب تک کشمیر سے بھارتی فوجیں نہ نکلیں گی اور سیکورٹی کونسل کی فوجیں نہ آئیں گی۔ استصواب رائے پر عمل درآمد ناممکن ہے۔ کوئی انتہا پسندانہ قدم اٹھانے سے پہلے اقوام متحدہ کو چاہیئے کہ وہ اس عمل میں بھارت کو شریک کرنے کی ہر ممکن کوشش کرے۔

اس سلسلے میں سیکورٹی کونسل ایک یہ مفید قدم اٹھا سکتی ہے کہ کسی بین الاقوامی شہرت کی مالک شخصیت (مثلاً ٹرائیگولی یا پال ہنری سپاک) سے درخواست کرے کہ وہ پاکستان اور بھارت جائے اور ان ملکوں کو اپنی اپنی فوجیں کشمیر سے نکال لینے پر متفق کرے۔ اگر امریکہ اقوام متحدہ سے بین الاقوامی امن کی امیدیں وابستہ رکھنا چاہتا ہے تو اسے یہ مسئلہ حل کرنے میں پیش پیش حصہ لینا چاہیئے۔

کشمیر اقوام متحدہ کی تازہ ترین علانیہ نافرمانی ہے۔ صدر ناصر اور ہنگری کی نافرمانیوں کی یاد ابھی تک ذہنوں میں تازہ ہے۔ لیکن اگر کشمیر کی علانیہ نافرمانی نہیں تو یہ متعدی مرض ضرور ثابت ہو سکتی ہے۔ اگر بھارت امریکہ کے بندھے ٹکے اصولوں کی تعریف کرتا ہے (وہ اصول جن کا اظہار امریکہ نے جنگ سویز کے موقع پر کیا تھا) لیکن اپنے لیے بین الاقوامی اخلاق کے دوغلے معیار کا مطالبہ کرتا ہے تو اس صورت میں امریکہ کے لیے یہ مشکل ہو جائے گا کہ اپنی خارجہ پالیسی کی بنیاد اقوام متحدہ پر قائم رکھے۔ اقوام متحدہ اپنا کام اسی صورت میں جاری رکھ سکتی ہے اگر اس کے احکام کی نافرمانی کرنے کے بجائے ان پر عمل پیرا ہوا جائے۔ رخنہ اندازیوں کے بجائے مل جل کر کام کیا جائے۔

ہمیں اس بات کا اقرار ہے کہ خود بھارت نے مل جل کر کام کرنے کی مثال میں ایک اور غیر جانبدار ملک یوگوسلاویہ کے شانہ بشانہ حصہ لیا تھا جب اس نے اس قرارداد کی حمایت کی تھی کہ مصر میں مقیم اقوام متحدہ کی فوج خلیج عقبہ اور غزہ کے علاقے کی مختار رہے تاآنکہ مصر اور اسرائیل میں صلح ہو جائے۔ اس طرح کی قراردادوں پر عمل درآمد سے جہاں اقوام متحدہ کے وقار میں اضافہ ہوتا ہے۔ وہاں پنڈت نہرو کے کشمیر کے بارے میں متضاد رویے کا پول بھی کھلتا ہے۔

حقیقت میں کشمیر ایک ایسا مسئلہ نہیں کہ اس کے باعث اقوام متحدہ کے اختیارات میں توسیع کی ضرورت ہو یا مغربی طاقتوں اور افریقی ایشیائی ملکوں کے مابین غلط فہمیاں پیدا ہوں یا اسے روایتی دشمنوں اور دوستوں کی تمیز کی کسوٹی بنایا جائے۔ یہ تو بنیادی طور پر نیک نیتی کا سوال ہے یعنی کیا اقوام متحدہ سے کی جانے والی درخواستیں باعزت لوگوں کی درخواستیں تھیں اور کیا ان کے الفاظ پر کھرے سکوں کی طرح بھروسہ کیا جا سکتا ہے؟


حال ہی میں ہم نے ان
اخلاقی معیاروں سے
زیادتی ہوتے دیکھی ہے
جنہیں اقوام عالم نے بڑی
خوشی سے تسلیم کر لیا
ہے
اقوام متحدہ
کشمیر

پنڈت جواہر لال نہرو

مسئلہ کشمیر کے بارے میں بھارت کا موقف

"نصرت" نے پاکستان میں بھارتی سفارت خانے سے "کشمیر نمبر" کے لئے بھارتی موقف کی وضاحت کے لئے کچھ مسالہ مہیا کرنے کی درخواست کی تھی۔ اس درخواست کے نتیجے میں وزیر اعظم بھارت پنڈت جواہر لال نہرو نے میک گل یونیورسٹی، مانٹریال، کینیڈا کے پروفیسر ڈاکٹر مائیکل بریچر کو جو انٹرویو ۱۲ جون ۱۹۵۶ء کو دیا تھا، وہ درج ذیل ہے ——————

مائیکل بریچر۔ جناب وزیر اعظم! جیسا کہ آپ کی تحریروں اور کانگریس کی کئی قراردادوں سے ظاہر ہوتا ہے میرا خیال ہے آپ ایک عالمی وفاق (فیڈریشن) کے بہت بڑے حامی رہے ہیں۔ آپ کی نظر میں یہ ایک ایسا مقصد ہے جس کی طرف سب ملکوں کو بڑھنا چاہیئے۔ کیا آپ کا خیال ہے کہ آجکل سماجی، اقتصادی اور سیاسی نظاموں میں جو رخنے پڑ گئے ہیں وہ اس قدر گہرے اور سخت ہیں۔ کہ مستقبل قریب میں عملی طور پر اس وفاق کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

جواہر لال نہرو۔ میں سمجھتا ہوں کہ آئیڈیل کے طور پر یہ بات ناگزیر ہے کیونکہ کوئی نہ کوئی عالمی تنظیم تو قائم ہو کر رہے گی۔ آپ اس کو عالمی وفاق (فیڈریشن) کہہ سکتے ہیں۔ مجھے یہ نہیں معلوم کہ اس کی صورت کیا ہوگی البتہ یہ ایک ڈھیلا ڈھالا وفاق ہوگا لیکن مجھے ایسا نہیں لگتا کہ مستقبل قریب میں یہ وفاق بن جائے گا۔ ہاں میں یہ دیکھتا ہوں کہ اس کی طرف قدم بڑھ رہے ہیں۔ مگر میرا خیال ہے کہ عالمی وفاق کے بارے میں محض گفتگو کرنا اب قطعی مضحکہ خیز اور بے معنی بات ہے اس سلسلے میں آج کل دنیا کے دو سب سے زیادہ طاقتور ملک امریکہ اور روس کی ہی مثال لے لیجئے میں نہیں سمجھتا کہ دونوں ملک اس بری طرح ایک دوسرے سے الگ تھلگ ہیں جیسا کہ وہ خود یا دوسرے لوگ خیال کرتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ دونوں ملکوں میں اپنے الگ الگ نظام ہوتے ہوئے بھی کافی نمایاں یکسانیت ہے اور میرا خیال ہے کہ ان ملکوں کے درمیان جو خلیج ہے وہ کم ہو جائے گی۔ اگر ایک بار خوف اور جنگ کی موجودہ فضا کو ختم کر دیا جائے تو یہ خلیج کافی تیزی کے ساتھ کم ہو سکتی ہے۔

مائیکل بریچر۔ اس کی بدولت ان دونوں میں زیادہ تعاون پیدا کرنے اور ایک دوسرے کے نقطہ نظر کو سمجھنے کا موقع ملے گا

جواہر لال نہرو۔ جی ہاں۔ اور یہی نہیں بلکہ ایک کا دوسرے پر اثر پڑے گا۔

مائیکل بریچر۔ جناب وزیر اعظم! اجازت ہو تو گھر سے قریب کی صورت حال پر نظر ڈالیں؟ کشمیر کے مسئلہ پر آپ نے حال میں جو بیانات دیے ہیں اور پاکستان نے آپ کی جو یہ تجویز مسترد کر دی ہے کہ جنگ بندی کی لائن کو تقسیم کی بنیاد بنا کر اس مسئلہ کے حل کے بارے میں گفتگو کی جائے تو اب ہمارا راستہ کیا ہوگا؟

جواہر لال نہرو۔ کشمیر کا مسئلہ سلجھانے کے صرف تین طریقے ہیں۔ اگر آپ کو پسند ہو تو ایک طریقہ ہے جنگ، یہ خارج از بحث ہے۔ اب دو سرے طریقے رہ جاتے ہیں، قانونی اور آئینی طریقے۔ یا اگر میں اس کو عملی طریقے کا نام دے سکوں تو وہ یہ ہو کہ خوامخواہ قانونی موشگافیوں میں نہ الجھا جائے اور معاملات کو ان کی اصلی صورت میں دیکھا جائے۔ جنگ کا تو سرے سے تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اگر لوگ مجھ سے اس مسئلہ کے قانونی اور آئینی پہلوؤں پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں تو میں ان پر گفتگو کرنے کو بالکل تیار ہوں۔ اگر وہ عملی پہلوؤں کو زیر بحث لانا چاہتے ہیں تو میں اس کے لئے بھی تیار ہوں۔ میں نے دونوں طریقے تجویز کئے ہیں۔ کل پرسوں ہی پارلیمنٹ میں چترال کے بارے میں مجھ سے ایک سوال پوچھا گیا تھا"

اور مجھ سے قانونی حیثیت کے بارے میں دریافت کیا گیا میں نے قانونی حیثیت واضح کر دی......

تعلق نہیں۔ اگر کشمیر میں اس کے برعکس دوسرا نظریہ قبول کر لیا جاتا تو اس کا کچھ نہ کچھ اثر ہوتا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہندوستان کے ٹکڑے ہو جاتے، ہاں ہندوستان میں ہندو اور مسلمان دونوں کے فرقہ پسند عناصر اس سے بہت متاثر ہوتے۔ یہ بات ہمارے لئے بہت اہمیت رکھتی ہے کہ ہم کشمیر میں کوئی غلط اقدام کر کے ملک کے اندر اس قسم کے سخت منافرت انگیز رجحانات نہیں پیدا کرنا چاہتے۔

مائیکل بریچر۔ اگر اجازت ہو تو میں کشمیر کے بارے میں ایک اور سوال دریافت کرنا چاہوں گا تاکہ رائے شماری کے بارے میں عام خیالات کی وضاحت ہو جائے۔ اگر ایک لمحہ کے لئے یہ فرض کر لیا جائے حالانکہ یہ عام طور سے مفروضہ ہی ہوگا واقعتاً بہت بعید — بہرحال اگر فرض کر لیا جائے کہ پاکستان کشمیر سے اپنی فوجیں ہٹا لے اور اقوام متحدہ کی قرار دادوں کے تحت (ان قرار دادوں کا جو مفہوم ہندوستان نکالتا ہے اس کے مطابق) اپنی تمام ذمہ داریاں پوری کرے تو کیا ہندوستان بین الاقوامی نگرانی میں رائے شماری کرانے کے سوال پر دوبارہ غور کرنے کو تیار ہو جائے گا یا آپ کی رائے میں کشمیر کے مسئلے کے حل کے لئے رائے شماری اب کسی صورت میں بھی صحیح طریقہ نہیں۔

جواہر لال نہرو۔ آپ مجھ سے ایک مفروضہ سوال کر رہے ہیں میں کسی بھی صورت میں "رائے شماری" کو مسترد نہیں کر سکتا حقیقت یہ ہے کہ جس ملک میں جمہوری حکومت ہے وہاں میعادی طور پر رائے شماری ہوتی رہتی ہے۔ جہاں کہیں انتخابات ہوتے ہیں یہی صورت ہوتی ہے بشرطیکہ انتخابات آزاد اور منصفانہ ہوں جمہوریت کا نظام ہی میعادی رائے شماری پر قائم ہے۔

مائیکل بریچر۔ میں رائے شماری کے ایسے تصور کا ذکر کر رہا تھا....

جواہر لال نہرو۔ میں جانتا ہوں۔ لیکن میرا مطلب یہ ہے کہ کشمیر ایک خود مختار ریاست ہے جو خود انتخابات کراتی ہے اور جہاں حکومت کا جمہوری نظام ہے۔ اگر وہ کسی بات سے مطمئن نہیں ہے تو وہ ہندوستان کے دستور کے تحت بہت زوردار طریقے سے اور آئینی طریقے سے اپنے عمل سے یا دوسرے طور پر اپنی عدم اطمینانی کا اظہار کر سکتی ہے۔ لیکن اگر آپ مجھ سے یہ سوال کریں کہ اگر ہر ایک شرط پوری ہو جائے تو کیا میں رائے شماری سے انکار کر دوں گا؟ میں کہتا ہوں۔ نہیں۔ لیکن عملی طور پر ہم اس معاملے پر گزشتہ سات یا آٹھ سال سے غور کرتے رہے ہیں اور ابھی پہلی شرط تک پوری نہیں ہوئی، دوسری شرطوں کا تو ذکر ہی کیا۔

مائیکل بریچر۔ آپ کا مطلب تمام پاکستانی فوجوں کے ہٹائے جانے سے ہے؟

جواہر لال نہرو۔ جی ہاں۔ میرا یہی مطلب ہے۔ مگر آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ ہم ہمیشہ رائے شماری کے بارے میں ایک پہلو پر زیادہ زور دیتے آئے ہیں اور وہ یہ کہ اگر رائے شماری ہو تو منصفانہ، آزاد اور سیاسی رائے شماری ہو۔ ایسی رائے شماری نہیں جس میں وحشیانہ طور پر مذہبی جذبات کو ابھارا جائے اور مذہب کو درمیان میں لا کر لوگوں کے لئے واقعتاً سیاسی اور اقتصادی بنیادوں پر کوئی فیصلہ کرنا ناممکن بنا دیا جائے۔

مائیکل بریچر۔ اگر کبھی رائے شماری ہوئی تو کیا یہ بات رائے شماری کی شرطوں میں شامل ہو گی۔

جواہر لال نہرو۔ ہم شروع ہی سے یہ بات برابر کہتے آئے ہیں لیکن یہ شرط کس طرح پوری ہو گی، یہ میں نہیں جانتا۔

مائیکل بریچر۔ جناب وزیراعظم! فرقہ وارانہ فسادات، مسئلہ کشمیر اور ہندو پاکستان کے مابین دیگر حل طلب مسائل کی صورت میں تقسیم کے جو المناک نتائج نکلے ہیں ان کے پیش نظر کیا آپ سمجھتے ہیں کہ مستقبل قریب میں دونوں ملکوں کے درمیان حقیقی مفاہمت کی توقع ہو سکتی ہے؟

جواہر لال نہرو۔ اس سوال کا جواب دینے سے پہلے میں ایک متعلقہ مسئلے کے بارے میں کچھ کہوں گا۔ بہت سے لوگ یہ سوچتے اور کہتے ہیں کہ کشمیر کا مسئلہ ایک بڑا مسئلہ ہے جو ہند و پاکستان کے درمیان اچھے تعلقات کی راہ میں حائل ہے۔ ایک اعتبار سے یہ ٹھیک بھی ہے لیکن بنیادی طور پر یہ صحیح نہیں۔ میرا

مائیکل بریچر۔ اس کے مذہبی پہلوؤں پر گئے بغیر؟

جواہر لال نہرو۔ اگر آپ قانون چاہتے ہیں تو قانون ہے۔ اگر آپ مسئلے کے حل کے لئے عملی طریقہ پسند کرتے ہیں تو یہ اعلیٰ طریقہ کار دو باتوں پر منحصر ہوگا۔ سب سے پہلے تو جتنا کہ کوئی بات نہ ہو دوسرے معاملات کو ان کی اصلی صورت میں قبول کر لیا جائے کیونکہ کوئی بھی دوسرا طریقہ کار اختلافات کا باعث ہو سکتا ہے۔

مائیکل بریچر۔ اچھا۔ اس حقیقت سے قطع نظر کہ کشمیر قانونی طور سے ہندوستان میں شامل ہو لیا ہے ہندوستان کے لئے کشمیر کی اتنی قدر و اہمیت کیوں ہے؟ کیا اس کا ہندوستان میں غیر مذہبی ریاست قائم کرنے اور اس ملک میں فرقہ وارانہ امن قائم رکھنے کی کوششوں سے کوئی تعلق ہے؟

جواہر لال نہرو۔ جی ہاں، غالباً اس مسئلے کا سب سے اہم پہلو یہی ہے۔ اس کا ایک جغرافیائی پہلو بھی ہے جو ایسا اہم نہیں۔ کشمیر کا گذشتہ دو ہزار برس تین ہزار سال سے ثقافتی اور دیگر اعتبار سے ہندوستان کے ساتھ گہرا تعلق رہا ہے۔ یہ بودھ اور اسلامی تہذیبوں کا سب سے بڑا مرکز رہا ہے۔ شاید کشمیر میں ہندوستان کے کسی بھی علاقے کے مقابلے میں فرقہ وارانہ جذبات بہت کم رہے ہیں اور ہندو مسلمان اور دوسرے لوگوں میں شاید ہی لڑائی جھگڑا ہوا ہو اور اگر کبھی یہ لوگ آپس میں لڑے جھگڑے بھی تو بہت تھوڑی دیر۔ ان کا طریق زندگی عام طور سے کم و بیش ایک ہی سا ہے ان کا کلچر ایک ہے، ان کی زبان، ان کا رہن سہن اور وہ تمام چیزیں جو کلچر میں شامل ہیں یکساں ہی ہیں وہ لوگ اس وقت بھی آپس میں میل ملاپ اور رضامندی خوشی کے ساتھ رہے جبکہ ہندوستان میں گڑبڑ ہوئی۔ ہم نے کبھی، یہاں تک کہ ہندوستان کی تقسیم کے وقت بھی دو قوموں کا نظریہ قبول نہیں کیا۔ یعنی یہ کہ ہندو الگ قوم ہیں اور مسلمان الگ قوم۔ اگر مسلمان ہندوستان سے الگ ہونا چاہتے ہیں تو وہ دوسری بات ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ہندوستان کا ایک خاص علاقہ الگ رہنے کے حق میں ہے لیکن ہم اس دو قومی نظریے کو قبول نہیں کرتے حتیٰ کہ اگر ہر ایک مسلمان یہی کہے حالانکہ ہر ایک مسلمان ایسا نہیں کہتا پھر بھی ہم اسے قبول کرنے کو تیار نہیں کیونکہ اگر ایک مرتبہ ہم ذہنیات مان لیں کہ مذہب قومیت کی بنیاد ہوتی ہے تو ہندوستان کے بارے میں ہمارا سارا تصور ختم ہو جائے گا۔ ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جس میں بہت سے مذاہب ہیں چاہے ایک مذہب کے ماننے والوں کی تعداد دوسروں سے زیادہ ہو مگر سبھی مذہب بڑے ہیں۔ دوسرے ملکوں کی طرح ہمیں بھی قومیت کی بنیاد دوسری باتوں پر رکھنا ہوگی مذہب پر نہیں۔ البتہ مختلف مذاہب کو اپنی اپنی جگہ پوری آزادی ہوگی۔ پاکستان بنا جب مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد نے یہ فیصلہ کیا تو ہم نے اس کو مان لیا۔ بہت سے مسلمان وہاں چلے گئے بہت سے ہندو یہاں آئے۔ پھر بھی تین کروڑ پچاس لاکھ مسلمان ہندوستان میں رہ گئے آج ہندوستان میں مغربی پاکستان کے مقابلے میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہے۔

مائیکل بریچر۔ یہ تو ایک ایسی حقیقت ہے جس کا عام طور سے علم نہیں۔

جواہر لال نہرو۔ اس کا علم یوں نہیں، کیوں کہ پاکستان کے دو حصے ہیں جیسا کہ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کشمیر میں تقسیم سے پہلے ہی مسلم لیگ اور کشمیر کی قومی تحریک کے درمیان کشمیر کے دل و دماغ کے لئے ایک کشمکش چل رہی تھی۔ اس وقت ہمارا کوئی تعلق نہ تھا۔ اس کے بعد ہمارا تعلق ہوا اور کشمیر کی قومی تحریک نے سمجھ بوجھ کر مسلم لیگ کا دو قومی نظریہ مسترد کر دیا۔ یہ تقسیم سے پہلے کی بات ہے۔ قدرتی طور پر ہم نے اس بات کا خیر مقدم کیا۔ ہم نے وسیع تر قومی تحریک میں ان لوگوں کا ساتھ دیا۔ اس کے بعد ملک کی تقسیم ہوئی اور ہندوستان میں فسادات شروع ہو گئے مگر کشمیر میں کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی اور جب کشمیر آئینی اور عوامی دونوں اعتبار سے ہندوستان میں شامل ہوا، آئینی اعتبار سے مہاراجہ کی معرفت جس کو ایسا کرنے کا پورا حق تھا اور عوامی اعتبار سے آرگنائزیشن کے ذریعہ تو سیاسی اور دیگر پہلوؤں سے قطع نظر یہ بات ہمارے لئے بہت اہم تھی، کیوں کہ اس سے ہمارے اس نظریے کی تائید ہوتی کہ قومیت کا مذہب سے

مطلب یہ ہے کہ کشمیر کا مسئلہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان دیگر اختلافات کا ایک نتیجہ ہے۔ اگر مسئلہ کشمیر کا حل ہو جائے اور وہ دوستانہ طریقے پر نہیں، پھر بھی بنیادی اختلافات قائم رہیں گے۔ اگر اس مسئلے کا حل حقیقی دوستانہ طریقے پر ہوا تو بلاشبہ اچھا اثر پڑے گا۔ اہمیت اس بات کو حاصل ہے کہ مسئلہ کشمیر کا دوستانہ حل نکلے نہ کہ جبری حل، جس سے دیگر مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔

مائیکل بریچر۔ جی ہاں۔ میرا خیال ہے بہت سے لوگ اس سے اتفاق کریں گے۔ مگر یہ بنیادی اختلافات کیا ہیں؟

جواہر لال نہرو۔ میں یہ کہوں گا کہ بنیادی طور پر یہ نظریاتی اختلافات ہیں اور مجھ کو پھر اس موضوع کی طرف جانا پڑے گا جس کا میں ابھی ذکر کر رہا تھا۔ یعنی دو قومی نظریے کی بات اور قومیت کیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ ایک افسوس ناک ذہنیت ہمارے یہاں ہے صرف مسلمانوں میں نہیں بلکہ کچھ لوگوں میں۔ وہ کہتے ہیں "برطانیہ سے پہلے ہم ہندوستان کے حکمران تھے۔ اب پھر ہم کیوں نہ ہندوستان پر حکومت کریں۔ ہم دلی پر قبضہ کر لیں گے ہم یہ کریں گے ہم وہ کریں گے" بلاشبہ یہ بے ڈھنگی اور احمقانہ باتیں ہیں۔ مگر ایسی باتوں سے عمل اور ردِ عمل پیدا ہوتا ہی ہے یہ بھی کہوں گا کہ جہاں تک پاکستان اور ہندوستان کے عوام کا تعلق ہے تقسیم کے وقت سے اب ان کی ذہنی کیفیت زیادہ اچھی اور دوستانہ ہے حالات بہت بہتر ہو گئے ہیں درحقیقت ان لوگوں میں انفرادی یا اجتماعی حیثیت سے کوئی نفرت یا اختلاف نہیں ایک قوم کی حیثیت سے سیاسی مسائل اٹھ سکتے ہیں یا کسی مذہبی بات پر ان کے جذبات کو ابھارا جا سکتا ہے لیکن جب ہندوستانی گروہ کی صورت میں پاکستان جاتے ہیں تو ان کا خیر مقدم کیا جاتا ہے اور انہیں گلے لگایا جاتا ہے۔ اسی طرح جب پاکستانی یہاں آتے ہیں تو ان کا خیر مقدم کیا جاتا ہے اور انہیں گلے لگایا جاتا ہے آپ کو معلوم ہی ہے ہماری زبان ایک ہے اور ہماری بہت سی چیزیں مشترک ہیں۔

مائیکل بریچر۔ پاکستان کے موجودہ سیاسی بحران کا اگر کوئی اثر ہو سکتا ہے تو وہ دونوں ملکوں کے زیادہ دوستانہ تعلقات کے قیام کی راہ میں کس طرح ہو گا؟

جواہر لال نہرو۔ اس سوال کا جواب دینا مشکل ہے۔ جب کوئی ملک خوفزدہ ہوتا ہے تو وہ کوئی قدم بھی اٹھانے سے ڈرتا ہے۔

مائیکل بریچر۔ کیوں کہ وہ نہیں سمجھتا کہ اس کی اپنی بنیادیں مضبوط ہیں؟

جواہر لال نہرو۔ جی ہاں۔ وہ خوفزدہ ہیں۔ وہ ہندوستان کا خوف پیدا کرتے رہتے ہیں۔ اس خوف کا کوئی جواز نہیں۔ کیوں کہ کسی بھی صورت میں یہاں تک کہ محدود ترین قومی مفاد کے پیش نظر بھی پاکستان میں مداخلت نہیں کرنا چاہتے ہم انہیں ایک آزاد ملک کی حیثیت سے پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ ہمارے لئے بھی اچھا نہیں کہ ہمارا پڑوسی ملک ترقی نہ کرے۔ کیوں کہ اس سے سیاسی بحران، جھگڑے اور طرح طرح کے اختلافات پیدا ہوتے ہیں۔ اگر پاکستان سیاسی یا اقتصادی لحاظ سے کمزور ہو جاتا ہے تو وہاں خوف کا عنصر بڑھ جاتا ہے، اور لوگوں کی توجہ ہٹانے کے لئے جان بوجھ کر اس سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ من چلی حرکت، اور ایسی دوسری باتوں سے ہمیشہ خطرہ ہی رہتا ہے اور جیسا کہ پہلے ہو چکا ہے، اس سے ہندوستان اور پاکستان کے مابین زیادہ دوستانہ تعلقات کی قدرتی ترقی رک جاتی ہے

مائیکل بریچر۔ ہند و پاکستان کے تعلقات کے بارے میں میں ایک آخری سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ان الجھے ہوئے مسئلوں کو الگ الگ سلجھانے کی بجائے ایک وسیع نقطۂ نظر اختیار کرنے سے ٹھوس نتائج نکل آئیں؟ اس کا آپ نے بھی کئی دفعہ ذکر کیا ہے۔ اس سلسلے میں ہندوستان اور پاکستان کے مابین بڑے بڑے حل طلب مسائل طے کرنے کے لئے یہ ایک ایسی کوشش ہو گی جس کے ذریعہ دونوں ملکوں کے سارے جھگڑوں کے بارے میں کوئی اصولی اتفاق ہو سکتا ہے

جواہر لال نہرو۔ ہمیں تمام مسئلوں پر گفتگو کرنے میں کوئی اعتراض نہیں۔

مسئلہ کشمیر کے گوناگوں پہلو

عیاں حقیقتیں اور نہاں معانی

(ایک مختصر دائرۂ معارف)

"بھارتی حکومت بین الاقوامی معاملات میں جس بلند نظری کا
پرچار کرتی ہے جب یہ نظر آتے کہ اپنی اس بلند نظری کو
بھارت ہی نے کشمیر کے مسئلے میں خاک میں ملا دیا ہے تو
دل پر ایک احساس نامرادی چھا جاتا ہے ۔"

برٹرینڈ رسل
(نیو ہوپز فور اے چینجنگ ورلڈ)
۱۹۵۱ء ۔۔۔ صفحات ۱۲۵-۱۴۶

یہ چند صفحات مسئلہ کشمیر کے گوناگوں پہلوؤں سے بحث کرتے ہیں۔ انھیں نیو یارک کے فری کشمیر سنٹر نے
ترتیب دیا ہے اور یہ کوشش کی ہے کہ ان کے ذریعے سے اہل کشمیر کے موقف کی کامل وضاحت ہو جائے
اور اس ضمن میں جن خدشات کا اظہار کیا جاتا ہے ان کا تجزیہ ہو جائے ۔

ترجمہ : جاوید شاہین

تنازعِ کشمیر کیا ہے اور یہ ایک بین الاقوامی مسئلہ کیونکر بن گیا؟

تنازعِ کشمیر بھارت اور پاکستان کے مابین اس بات کا جھگڑا ہے کہ کیا کشمیر کے عوام کو اُن کے مستقبل کا فیصلہ خود کرنے کا موقع دینا چاہیے کہ نہیں۔ اس تنازع کی اہمیت کسی دوسرے بین الاقوامی مسئلے کی اہمیت کی طرح مختلف نظروں کو مختلف انداز میں نظر آتی ہے۔

اقوامِ متحدہ: اس کے اصول اخلاق کے نقطۂ نظر سے تنازعِ کشمیر ایک اہم بین الاقوامی مسئلہ ہے جو بڑے واضح طور پر اصولِ خود ارادیت سے متعلق ہے۔ اس کا نمایاں کردار یہ حقیقت ہے کہ یہ اصول فریقین نے قبول کر لیا ہے۔ فقط اس کے اطلاق کو ایک فریق نے التوا میں ڈال رکھا ہے۔

خالص سیاسی نقطۂ نظر سے یہ تنازع اس لیے بے مثل ہے کہ یہ دو ایشیائی ملکوں کے مابین ہے۔ یہ دونوں ملک نئے نئے آزاد ہوئے ہیں اور ان کا محلِ وقوع ایسا ہے کہ یہ جنوبی اور مغربی ایشیا کے حالات پر اور بلکہ اُن کی ملکی حدود سے بہت آگے تک اثر انداز ہو سکتے ہیں۔

آزاد دنیا کے نقطۂ نظر سے یہ تنازع بڑی خطرناک نوعیت کا ہے کیونکہ اس نے ایشیا کے ایک بڑے علاقے کو بحرانی بنا رکھا ہے جو ایک سیاسی نظامِ حکومت میں جنگ سے الگ رکھا گیا تھا۔ یہی وہ علاقہ ہے جو دنیا کے تیز سیاسی تجزیے میں حاشیے کی حیثیت رکھنے کی بجائے اب حادثات و واقعات کے اکھاڑے کا مرکز بن رہا ہے۔

امن اور اجتماعی تنظیم کے نقطۂ نظر سے یہ تنازع دو گنجان آباد ملکوں کی ترقی و استحکام کے راستے میں دیوار بنا ہوا ہے اور اپنے اندر جنگ کا ایسا آتش گیر مواد لیے ہوئے ہے جو بہت سی انسانی زندگیوں کی ہلاکت کا سبب بن سکتا ہے۔

بھارت اور پاکستان دونوں ملک دنیا کی ۱/۵ آبادی پر مشتمل ہیں۔ تنازعِ کشمیر بنی نوع انسان کی اتنی بڑی تعداد کی موجودہ بہبود اور آئندہ طرزِ عمل پر اثر انداز ہو رہا ہے۔ اگر یہ جھگڑا جاری رہا تو اس کی انسانی اہمیت اس خطرے سے زیادہ ہے کہ یہ خیرہ سا نہیں کہ بعد میں اس کے سیاسی نتائج اور دوسری پیچیدگیوں پر قابو پایا جا سکے گا؟

کشمیر کے محلِ وقوع کی کیا معنویت ہے؟

سرکاری طور پر جو علاقہ ریاست جموں اور کشمیر کے نام سے پکارا جاتا ہے اُس کا مقبولِ عام نام کشمیر ہے۔ یہ ریاست برصغیر پاک و ہند کا دور افتادہ شمالی حصہ ہے اور مرکزی اور جنوبی ایشیا کے درمیان واقع ہے۔ اس طرح یہ ایشیا کا دل ہے۔ جنگی نقطۂ نظر سے اس کا محلِ وقوع بڑا اہم ہے کیونکہ اس کی سرحدیں پانچ مختلف ممالک سے ملتی ہیں۔ وہ پانچ ملک یہ ہیں: پاکستان، افغانستان، سوویٹ روس، چین اور بھارت۔ جہاں تک بھارت اور پاکستان کا تعلق ہے، یہ ریاست پاکستان سے زیادہ ملحق ہے۔ اس کی سات سو میل لمبی سرحد پاکستان سے ملتی ہے اور ساڑھے تین سو میل لمبی سرحد بھارت سے۔ اس کی بھارت سے ملحقہ سرحد زیادہ تر پہاڑوں پر مشتمل ہے اور موسمِ سرما میں برف کے باعث ناقابلِ عبور ہو جاتی ہے۔ اس سرحد کا فقط تیس میل لمبا ایک حصہ قابلِ عبور ہے۔ اس کے برعکس پاکستان سے ملحقہ کشمیر کی سرحد کو سڑکیں اور دریا کتنے ہی مقامات سے کاٹتے ہیں جن کے ذریعے کشمیر سارا سال خارجی دنیا سے اپنا تعلق قائم رکھ سکتا ہے۔

کشمیر اپنے رقبے اور آبادی کے لحاظ سے کس قدر اہم ہے؟

کشمیر کا رقبہ ۸۴۴۷۱ مربع میل ہے جو ہالینڈ، بلجیم، ڈنمارک، آسٹریا اور البانیہ کے مشترکہ رقبے کے برابر ہے۔ یا دوسرے الفاظ میں آئرلینڈ سے تین گنا اور سوئٹزرلینڈ سے چھ گنا زیادہ ہے۔ ۱۹۴۱ء کے اعداد و شمار کے لحاظ سے اس کی آبادی ۴۰،۲۱،۶۱۶ نفوس تھی اب یقیناً اس کی آبادی پینتالیس لاکھ کے قریب ہوگی۔ یہ آبادی شام، نیوزی لینڈ، ڈنمارک، آئرلینڈ، لبنان اور لیبیا جیسے ممالک کی الگ الگ آبادی سے زیادہ ہے۔

موجودہ تنازع سے پہلے کشمیر کی کیا حیثیت تھی؟

۱۹۴۷ء سے پہلے برطانوی ہندوستان میں کشمیر ان ساڑھے پانچ سو ریاستوں میں سے ایک تھی جو برطانوی حکومت کے ماتحت تھیں۔ یہ ہندوستانی ریاستیں ایسی قلمرو یا علاقے تھیں جن کے حکمران وہ موروثی جاگیردار تھے جن کے آباؤ اجداد نے اس برصغیر کو فتح کرنے میں انگریزوں کی مدد کی تھی۔ کشمیر کا سابق جاگیردار حکمران جسے مہاراجہ کہا جاتا تھا ایک ایسے لٹیرے حکمران کا جانشین تھا جس نے برطانوی حکومت کو ۱۸۴۶ء میں پچھتر لاکھ روپے دے کر اس علاقے پر حکمرانی کی اجازت لے لی تھی۔ لیکن یہ اجازت محض داخلی امور کو چلانے تک محدود تھی۔ جہاں تک خارجی معاملات کرنسی، ڈاک خانہ اور دفاع کا تعلق ہے یہ سب امور برطانوی ہندوستانی حکومت کے اختیار میں تھے۔

۱۹۴۷ء سے پہلے کشمیر کی سیاسی حالت کیا تھی؟

۱۹۴۷ء سے پہلے کشمیر کی سیاسی حالت کا نمایاں پہلو وہاں کے مہاراجہ اور کشمیری عوام کے درمیان کشیدگی تھی۔ اس کشیدگی کی بڑی وجہ یہ حقیقت تھی کہ مہاراجہ کی حکومت خالص جاگیردارانہ تھی اور عوام کو تقریر و تحریر کے ذریعے اظہار خیال کی آزادی نہ تھی۔ ایک مزید حقیقت یہ بھی ہے کہ مہاراجہ بذات خود تو ہندو تھا لیکن اس کی ۸۰ فی صد رعایا مسلمان تھی۔ اس نے بڑے ظالم قوانین بنا رکھے تھے مثلاً اگر کوئی مسلمان گائے کو ذبح کرتا تو اسے دس سال کی سزا دی جاتی کیونکہ ہندو گائے کو اپنا دیوتا سمجھ کر اس کی پوجا کرتے ہیں۔ مسلمانوں کو شہری اور فوجی محکموں میں بلند عہدوں سے محروم رکھا جاتا تھا۔ نتیجۃً عوام نے ان حالات میں اپنی آزادی کے لیے ۱۹۳۰ء کے آغاز ہی سے ایک تحریک جاری رکھی تھی۔ اس تحریک کی سربراہ آل جموں اینڈ کشمیر مسلم کانفرنس تھی۔ اسی تحریک کی بدولت مسلمانوں کو ریاستی حکومت میں موزوں نمائندگی ملنے لگی تھی۔ اس صدی کی چوتھی دہائی میں مسلم کانفرنس کے مطالبے پر محدود اختیارات پر مبنی ایک مجلس قانون ساز بھی ریاست میں قائم کی گئی اور مسلم کانفرنس کو انتخابی نشستوں میں اکثریت حاصل رہی۔

۱۹۴۷ء میں کس واقعہ نے کشمیر کے موجودہ تنازع کو جنم دیا تھا؟

۱۹۴۷ء میں برطانیہ ہندوستان کی حکومت سے دست بردار ہو گیا۔ آزادی کے موقع پر برصغیر دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ایک کا نام بھارت اور دوسرے کا نام پاکستان رکھا گیا۔ بھارت میں ہندوؤں کی اکثریت تھی اور پاکستان میں مسلمانوں کی۔ اس موقع پر برصغیر کی ریاستوں سے کہا گیا کہ وہ بھارت یا پاکستان جس سے چاہیں اپنا الحاق کر سکتی ہیں۔ برطانوی حکومت نے انہیں خود مختار کر دیا تھا۔ بہر حال یہ تو فقط آئینی پوزیشن تھی۔ ویسے تینوں پارٹیاں یعنی برطانیہ، بھارت اور پاکستان اس بات پر متفق تھیں کہ یہ ریاستیں اپنے جغرافیائی محل وقوع اور اپنی آبادی کی ہندو یا مسلم اکثریت

کے لحاظ سے بھارت یا پاکستان سے اپنا الحاق کریں گی اور اگر کوئی ریاست بھارت یا پاکستان سے الحاق کرنے سے پہلے سوچ بچار کرنا چاہتی ہے تو وہ اُس ڈومینین سے حالات برقرار رکھنے کا معاہدہ کرے گی جس کے وہ زیادہ قریب واقع ہوگی۔

کشمیر ایک ہندوستانی ریاست تھی جس میں عوام کی اکثریت مسلمان تھی اور جو پاکستان سے زیادہ قریب تھی۔ اس کے ڈاک، تار، ذرائع آمد و رفت اور دوسرے محکمے پاکستان کی سرحدوں سے زیادہ وابستہ تھے چنانچہ جب ۱۵ اگست کو پاکستان معرض وجود میں آیا تو کشمیر کے مہاراجہ نے اُن تمام معاملات پر حکومت پاکستان سے حالات برقرار رکھنے کا معاہدہ کر لیا جن حالات پر اس کا سابق برطانوی ہندوستانی حکومت سے ایک معاہدہ طے تھا۔ یہ اس حقیقت کو تسلیم کرنے کا جغرافیائی طریقہ تھا کہ جہاں تک کشمیر کا تعلق ہے پاکستان سے اس کا الحاق بالکل یقینی ہے اور پاکستان اور کشمیر کے تعلقات کو باقاعدہ بنانے کے لیے مستقبل قریب میں ایک تازہ معاہدہ کیا جائے گا اور اس معاہدے کی شکل و صورت ویسی ہی ہوگی جیسی کہ کشمیر اور برطانوی ہندوستانی حکومت کے مابین معاہدے کی تھی۔ لیکن اس واضح بات اور جغرافیائی اور اقتصادی مطالبے کو پس پشت ڈالتے ہوئے مہاراجہ حقیقت میں بھارت سے الحاق کرنے کی فکر میں تھا۔ چونکہ وہ ہندو تھا اور مسلمانوں سے نفرت کرتا تھا اس لیے وہ ہندو ڈومینین سے اپنی ریاست کا الحاق کرنا چاہتا تھا۔ پاکستان سے یہ معاہدہ ہونے پر جب اُسے اطمینان ہو گیا کہ اس کے ڈاک تار اور مواصلات وغیرہ محکمے اب محفوظ رہیں گے اُس نے فوری طور سے اپنی ریاست، بھارت میں شامل کرنے کی غرض سے بھارتی رہنماؤں سے گفت و شنید کرنی شروع کر دی۔ چند بھارتی لیڈر اور بعض دوسری ہندو ریاستوں کے مہاراجہ جنہوں نے اپنے مسلم عوام کو اپنی ریاستوں سے نکال دیا تھا، اگست اور ستمبر میں کشمیر آئے اور وہاں کے مہاراجہ سے ملے۔ تب ہندوؤں کی تنظیم راشٹریہ سیوک سنگھ کے فوجی تربیت یافتہ دستے کشمیر میں داخل ہونے لگے۔ حالات کے اس تغیر سے کشمیر کے عوام گھبرا گئے۔ اُن کا مطالبہ تھا کہ اُن کے ملک کو فطری طور سے پاکستان میں شامل ہونا چاہیے۔ ان کی مخالفت پر قابو پانے کے لیے مہاراجہ نے انہیں فوج کی مدد سے دبایا اور انہیں ملک بدر کرنا شروع کر دیا۔ اس پر عوام نے بغاوت کر دی اور یہ بغاوت ۲۵ اگست ۱۹۴۷ء کو نیم فوجی قسم کی شکل اختیار کر گئی۔ اُسی دن باغ نامی ایک مقام پر پونچھ کشمیر کے لوگ جمع ہوئے اور انہوں نے مہاراجہ کی فوج کے خلاف ایک منظم فوجی تحریک شروع کر دی۔ اُن کی تحریک کی کامیابی کے دو سبب ہیں۔ اول ۱۹۳۱ء سے اب تک کی اُن کی طویل جدوجہد کا یہ نقطۂ عروج تھا۔ دوم اُن کی تنظیم کے سربراہ وہ فوجی نوجوان تھے جو برطانوی فوج سے تازہ تازہ برخاست ہو کر آئے تھے اور دوسری جنگ عظیم میں اہم محاذوں پر لڑ چکے تھے اور خوب تجربہ کار تھے۔ اس طرح بھارت اور پاکستان کے بحیثیت آزاد ملکوں کے معرض وجود میں آنے کے فوراً بعد ہی مسئلہ کشمیر نے جنم لے لیا۔ کشمیر کے جابر حکمران اور اُس کے عوام کے درمیان اختلافات کی خلیج زیادہ وسیع ہو گئی اور کشمیر کے مستقبل کے متعلق ایک جھگڑا اُٹھ کھڑا ہو گیا۔

اس کے بعد کیا ہوا؟

عوام نے اپنی یہ جدوجہد دو ماہ تک جاری رکھی۔ رفتہ رفتہ اس کی رفتار تیز تر ہوتی گئی اور انہوں نے اپنی ایک باقاعدہ فوج اور حکومت قائم کر لی۔ اس حکومت کا نام آزاد کشمیر تھا۔ بعد میں اس کی مدد دو طاقتور عناصر نے کی۔ پہلا عنصر تو وہ مسلمان افسر تھے جو مہاراجہ کی فوج کو چھوڑ کر باغیوں میں شامل ہو گئے تھے۔ دوسرا عنصر پاکستان اور افغانستان کی سرحد پر رہنے والے قبائلی پٹھان تھے جن کے کشمیری عوام سے گہرے خاندانی اور جذباتی رشتے تھے۔ ان دو عناصر کی مدد سے آزاد کشمیر کی فوج نے مہاراجہ کی فوج کو شکست دی اور ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو آزاد کشمیر حکومت قائم کر لی اور ۲۵ اکتوبر کو مہاراجہ کو اپنے دارالحکومت سری نگر سے بھاگ جانے پر مجبور کر دیا۔ مہاراجہ فرار ہو کر کشمیر کے جنوبی حصے (جموں) میں چلا آیا اور یہاں اُس نے بھارتی حکومت سے امداد مانگی۔ لیکن بھارت نے کہا کہ مہاراجہ کو فوجی مدد دینے سے پہلے اُسے ایک معاہدے (معاہدۂ الحاق) پر دستخط کرنے ہوں گے جس کی رُو سے یہ اعلان ہوگا کہ کشمیر بھارت کا ایک حصہ بن گیا ہے۔ مہاراجہ نے الحاق کے معاہدے پر ۲۶ اکتوبر کو دستخط کیے اور دوسرے دن بھارتی حکومت نے بھارت سے کشمیر کا الحاق قبول کر لیا۔ اس رسمی کارروائی سے کئی گھنٹے پہلے ہی بھارتی حکومت ہوائی جہازوں کے ذریعے اپنی فوج کشمیر روانہ کر

چکی تھی۔

کیا بھارت سے کشمیر کا یہ الحاق قطعی تھا اور کیا اس طرح کشمیر قانوناً بھارت کا ایک حصہ بن گیا ؟

نہیں۔ مہاراجہ کی الحاق کی پیش کش قبول کرتے ہوئے لارڈ مونٹ بیٹن، جو اُن زمانے میں برطانوی حکومت کی طرف سے ہندوستان کے گورنر جنرل تھے، اپنے ۲۷ اکتوبر ۱۹۴۷ء کے ایک خط میں مہاراجہ کشمیر کو ذیل کی سطور لکھیں :

"میری حکومت کی خواہش ہے کہ جب کشمیر میں امن و قانون بحال ہو جائے اور یہ حملہ آوروں سے خالی ہو جائے تو اس ریاست کے الحاق کا مسئلہ وہاں کے عوام کی رائے کے مطابق حل کیا جائے۔"

اُسی دن بھارت کے وزیر اعظم مسٹر جواہر لعل نہرو نے برطانیہ کے وزیر اعظم مسٹر ایٹلی کو ایک تار بھیجا جس میں لکھا تھا :

"میں یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ان ہنگامی حالات میں کشمیر کی مدد کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ کشمیر کا الحاق بھارت ہی سے ہوگا۔ ہمارا اصل یہ ہے جسے ہم متعدد بار عوام کے سامنے دہرا چکے ہیں، کہ جب کسی متنازع علاقے یا ریاست کے الحاق کا فیصلہ وہاں کے عوام کی خواہش کے مطابق ہونا چاہیے اور ہم اب بھی اپنے اسی نظریے پر قائم ہیں۔"

دو مہینے بعد مسٹر نہرو نے پاکستان کے وزیر اعظم کو ایک تار ارسال کرتے ہوئے اسی صورت حال کو دہرایا :

"کشمیر کے الحاق کا فیصلہ وہاں کے عوام کی خواہشات کے اور اُن کی رائے کے مطابق ہوگا۔"

اس طرح خود بھارت کے اپنے بیان کے مطابق کشمیر کا اس سے الحاق ہنگامی اور عارضی تھا اور اسے اُس وقت تک قطعی نہ سمجھا جا سکتا تھا جب تک وہاں کے عوام ایک غیر جانبدارانہ استصواب رائے سے اس کا فیصلہ نہ کر دیں حقیقتاً یہ الحاق اس قدر غیر فطری تھا اور اس فعل نے پاکستان کے اعتماد کو اس قدر ٹھیس پہنچائی تھی کہ بھارت اپنے اس غاصبانہ فعل کو چھپانے کی خاطر یہ الفاظ کہنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اس سے قطع نظر کہ بھارت کے ان الفاظ میں خلوص کی رمق تھی کہ نہیں لیکن اُس کی اس یقین دہانی میں سنجیدگی کا عنصر ضرور تھا اور یہ کہ یہ الفاظ اخلاقی طور پر اُس کے لیے ایک بوجھ بن کر رہ گئے۔ قانوناً یہ سودا ناجائز تھا کیونکہ سودا چکانے والا ایک جاگیردار تھا جس کا اپنے ملک پر اب کوئی اختیار نہ رہا تھا۔

علاوہ بریں یہ بیت یا سودا تھا یہ بھارت کے اُس نقطۂ نظر کے صریحاً خلاف تھا جس کا پرچار وہ دوسری ریاستوں کے الحاق کے سلسلے میں کرتا رہا تھا۔ یوں ہوا کہ ایک دوسری ریاست جونا گڑھ جو ایک چھوٹے سے بحری راستے سے پاکستان سے منسلک تھی، اُس نے اپنا الحاق پاکستان سے کر لیا لیکن چونکہ اس کی آبادی ہندو اکثریت پر مشتمل تھی۔ اس لیے اُس ریاست کے پاکستان سے الحاق پر بھارت نے بڑی شدت سے احتجاج کیا

۲۲ ستمبر ۱۹۴۷ء کو بھارتی حکومت نے پاکستانی حکومت کو ایک تازہ تار بھیجا جس میں اُس نے اس الحاق کو بھارتی علاقے پر غاصبانہ قبضہ قرار دیا۔ بھارتی حکومت نے اسے پاکستان کی سرحد کو وسیع کرنے اور بھارت کی سالمیت کو تباہ کرنے کی ایک واضح کوشش سے تعبیر کیا اور اُن اصولوں کی خلاف ورزی گردانا جن پر تقسیم ہند عمل میں لائی گئی تھی تب بھارت نے زبردستی جونا گڑھ پر قبضہ کر لیا اور پھر اپنے اس فعل کو بھول کر کشمیر پر بھی قابض ہو گیا۔ ایسا کرنے سے اُس نے ایک ایسے جاگیردار حکمران کا الحاق قبول کیا تھا جسے یہ الحاق کرنے کا حق حاصل نہ تھا۔ اس لیے مہاراجہ کا الحاق قبول کرنا بھارت کے لیے ایک ایسا فعل تھا جو اس کے اپنے ہی گزشتہ طرز عمل کی نفی کرتا ہے۔

کا الحاق قبول کرنا بھارت کے لیے ایک ایسا فعل تھا جو اُس کے اپنے ہی گزشتہ طرز عمل کی نفی کرتا ہے۔

کشمیر میں بھارتی مداخلت کے کیا نتائج نکلے ؟

کشمیر میں بھارت کی مداخلت کے نتائج تہ دار ہیں۔ ناقص ہتھیاروں سے مسلح آزاد فوجوں کے لیے ایک رکاوٹ، کشمیریوں کی ایک بھاری

تعداد کا پناہ گزینوں کی حیثیت سے پاکستان میں آنا، کشمیری مسلمانوں کی جانی اور مالی تباہی، سری نگر میں ایک نام نہاد حکومت کا معرضِ وجود میں آنا، عوام پر طرح طرح کی پابندیاں، دسمبر ۱۹۴۷ء تک کشمیر کی پہاڑیوں میں ایک خونریز جنگ اور مئی ۱۹۴۸ء میں پاکستانی فوجوں کا کشمیر میں داخلہ۔ قصہ مختصر بھارت کی مداخلت نے کشمیر میں قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا۔

کشمیر میں بھارت کی مداخلت کا اولین نتیجہ یہ نکلا کہ مہاراجہ نے بذاتِ خود بلا واسطہ کشمیری مسلمانوں کی تباہی کی اجازت دے دی۔ جموں کے مسلمانوں کو پہلے تو بھارتی اور کشمیری ہندو فوج نے چند گھنٹے اُن کے گھروں میں محصور کیے رکھا اور انھیں ہتھیار ڈالنے کو کہا جس سے انھوں نے انکار کر دیا۔ تب ڈوگرا فوج نے اُن سے کہا کہ اگر وہ ہتھیار ڈال دیں تو انھیں حفاظت سے پاکستان پہنچا دیا جائے گا۔ جب جموں اور گردونواح کے علاقوں کے مسلمان، اس وعدے پر اعتبار کرتے ہوئے قافلے کی شکل میں پاکستان کی طرف روانہ ہوئے تو ڈوگرا اور بھارتی فوج نے اُن پر حملہ کر دیا اور انھیں دھکیل کر دوبارہ جموں شہر میں لے جایا گیا۔ یہاں مسلمان مردوں کو قتل کیا گیا، عورتوں کی عصمت دری کی گئی اور بچوں کو اغوا کیا گیا۔ تقریباً دو لاکھ انسانوں کا یہ قتلِ عام ۴ سے ۸ نومبر ۱۹۴۷ء کے درمیان ہوا۔ بھارتی فوج کے کشمیر میں داخلے کے ایک ہفتے بعد اُسی راستے پر جہاں سے بھارتی فوج کشمیر میں داخل ہوئی تھی۔

اس کے شانہ بشانہ وادیٔ کشمیر میں نیشنل کانفرنس جو بھارت سے کشمیر کے الحاق کی حمایت میں تھی کو حکومت چلانے کی ذمہ داری سونپ دی گئی۔ شہری آزادی کو دبایا جانے لگا اور ہزاروں پُرامن شہریوں کو حراست میں لے لیا گیا یا انھیں محلوں میں نظر بند کر دیا گیا۔ بھارتی ہوائی فوج، جس کا مقابلہ کرنے کے لیے آزاد فوجوں کے پاس مناسب اسلحہ نہ تھا، بلا اقیاز بم باری کرنے لگی اور اس کی مدد سے بھارتی اور ڈوگرا بری فوجیں جموں اور سری نگر سے مغرب کی سمت بڑھنے لگیں۔ یہ فوجیں چوکاٹھی اور نوشہرہ کے مقام پر آکر رُک گئیں۔ کیونکہ یہاں سے آگے بھارتی فوجوں کی بمباری زیادہ مؤثر ثابت نہ ہو سکتی تھی۔ تب لڑائی پر ایک جمود سا طاری ہو گیا جو ۴۸-۱۹۴۷ء کا سارا موسم سرما جاری رہا۔ کئی غیر فیصلہ کن جنگیں ہوئیں۔ جہاں سپاہیوں کی دو بدو جنگ ہوئی وہاں تو بھارتی فوجیں شکست کھا گئیں لیکن جہاں انھیں توپیں وغیرہ استعمال کرنے کا موقع مل گیا وہاں آزاد فوجوں کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ بہرحال ۱۹۴۸ء کے موسم بہار میں بھارتی فوجوں نے جم کر لڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ اُن کے حملے سے پاکستانی سرحدوں کی سلامتی خطرے میں پڑ گئی۔ درحقیقت اس سے پہلے بھارتی جنگی طیارے مری اور ایبٹ آباد کے قریب بعض ایسے مقامات پر بھی بم باری کر چکے تھے جو پاکستان کی سرحد کے اندر تھے۔ اگر بھارتی ارادوں کے مطابق بھارتی فوجوں کی پیش قدمی کا یہ عمل جاری رہتا تو اس صورت میں کشمیر کے مغربی علاقوں سے مہاجروں کا ایک سیلِ بے پناہ پاکستان میں در آتا جو فوری طور پر اس کے ذرائع آمد و رفت اور پانی کی رسد کو مفلوج کر دیتا۔ اس موقع پر پاکستان نے اپنی سرحدوں کے دفاع کے لیے پاکستان کے اندر ہی اپنی فوجوں کو دفاعی محاذ سنبھال لینے کا حکم دے دیا۔ انھوں نے ۱۹۴۸ء کا سارا سال یہ مورچے بڑی کامیابی سے سنبھالے رکھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اپنی متعدد کوششوں کے باوجود بھارتی فوج پاکستان کے گردونواح کے علاقوں میں آگے نہ بڑھ سکی۔ جہاں تک دوسرے علاقوں کا تعلق ہے بھارتی فوجوں نے اپنے بڑھیا اسلحہ کی مدد سے آزاد فوجوں کی مدافعت کو دبا دیا اور اس طرح کشمیر کے اہم حصوں پر اپنے قدم مضبوط جما لیے۔

کیا پاکستان کشمیر کے مسئلے میں اسی طرح سامنے آیا تھا؟

فوجی نقطۂ نگاہ سے تو پاکستان کشمیر کے مسئلے میں اسی طرح سامنے آیا تھا۔ لیکن سیاسی اور اخلاقی لحاظ سے پاکستان اس منظر پر بھارت سے پہلے کا نمودار ہو چکا تھا۔ پاکستان اور کشمیر میں ایک ایسا رشتہ موجود تھا اور اب بھی ہے جو کشمیر کی ہر صورتِ حال میں ایک اہم عنصر ہے اور جسے بھارت کی کوئی کوشش توڑ نہیں سکتی۔ اس رشتے کو برطانیہ، کانگرس اور مسلم لیگ نے واضح طور پر تسلیم کیا ہے اور یہ وہ تین پارٹیاں

دونوں کی رضامندی سے اس برصغیر کو آزادی ملی تھی اور تقسیم ہند عمل میں آئی تھی۔ یہ رشتہ تین اہم طریقوں سے ظاہر ہوتا ہے۔

اول: آزادی اور تقسیم ہند کے عمل سے پاکستان برطانوی ہندوستانی حکومت کے اُس علاقے کا جانشین مختار بن گیا جو کشمیر سے ملحق تھا اور جس پر کشمیر کے ذرائع آمد و رفت اور اقتصادی رسد کا انحصار تھا۔ اس طرح کشمیر اور پاکستان میں ایک بنیادی رشتہ قائم تھا جس نے بھارت کے ہندو راجا کو بھی آزادی کے پہلے روز یعنی ۱۵ اگست کو پاکستان کے ساتھ حالات برقرار رکھنے کا معاہدہ کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس معاہدے کی رُو سے پاکستان کشمیر کے ڈاکخانے، ٹیلی گراف، سول سپلائز اور دوسرے تمام خارجی نوعیت کے تنظیمی امور کا قانونی مختار بن گیا

دوم، کشمیر مسلم اکثریت والا علاقہ تھا اور یہاں کی مسلم آبادی پاکستان میں شامل ہونے والے بعض علاقوں کی مسلم آبادی سے بھی زیادہ تھی۔ اس طرح اگر کشمیر پاکستان کا حقیقی حصہ نہیں تھا تو کم از کم مسلم اکثریت کے لحاظ سے یقیناً تھا۔

سوم، کشمیر کی تمام سیاسی جماعتیں ماسوا نیشنل کانفرنس کے جس کے سرپرست مسٹر نہرو تھے اور اب بھی ہیں، متفقہ طور پر کشمیر کا الحاق پاکستان سے کیے جانے کے حق میں تھیں۔

ان تین عناصر نے شروع ہی سے پاکستان کو کشمیر کا جائز حقدار بنا دیا تھا۔ فقط رسمی طور پر کشمیر کا بھارت سے الحاق تقسیم ہند کے اصول کی خلاف ورزی تھا اور پاکستان کے حق پر غاصبانہ حملہ تھا۔

یہ بات بڑی اہم ہے کہ بھارت کی اس سوء بازی کا جو اثر پاکستان پر ہوا تھا اُس کے اثرات خود مسٹر نہرو کی حکومت کے ذہن میں دبائے سے دب نہ سکے۔ اسی باعث الحاق کے فوراً بعد مسٹر نہرو کو حکومت برطانیہ اور حکومت پاکستان کو یقین دہانی کی ضرورت محسوس ہوئی اسی باعث کشمیر کے حالات کو سدھارنے کی خاطر پاک و ہند کی حکومتوں میں اُسی وقت گفت و شنید شروع ہو گئی تھی۔ یہ گفت و شنید پاک و بھارت کے مابین بلا واسطہ گفت و شنید تھی جو اولاً دونوں حکومتوں کے گورنر جنرلوں کے درمیان ہوئی اور پھر بعد میں ان حکومتوں کے وزرائے اعظم کے مابین ہونے لگی۔ کشمیر کے الحاق کو قبول کرنے کی واضح شرط استصواب رائے تھی اور اس پر دونوں حکومتوں کے گورنر جنرل ۳۰ اکتوبر ۱۹۴۷ کو بات چیت کر چکے تھے۔ لیکن چونکہ یہ گفت و شنید زیادہ آگے نہ بڑھ سکی اس لیے اس جھگڑے کو اقوام متحدہ میں پیش کرنے کا خیال دونوں حکومتوں کو بیک وقت آیا۔ یہ الگ بات ہے کہ اُن کے مقاصد الگ الگ تھے جہاں تک مسٹر نہرو کا تعلق ہے وہ اپنی تحریر کو مبہم رکھ کر مطلق تھے لیکن ۱۲ نومبر ۱۹۴۷ کو پاکستان کے وزیر اعظم نے ایک بیان دیا جس میں انھوں نے واضح طور پر کہا۔

"اقوام متحدہ کے چارٹر کا یہ بنیادی اصول ہے کہ طاقت کو حق پر غالب آنے سے باز رکھا جائے۔ اس لیے سارے مسئلہ متنازع کشمیر کو بین الاقوامی رائے کے سامنے لانا بہتر ہوگا۔ ہم اقوام متحدہ سے یہ درخواست کرنے کو تیار ہیں کہ وہ فوری طور پر ریاست جموں اور کشمیر میں اپنا نمائندہ مقرر کرے تاکہ وہاں جنگ بند ہو جائے۔ وہ کشمیر سے خارجی قوتوں کے اخراج کا پروگرام بنائے۔ غیر جانب دارانہ استصواب رائے ہونے تک ریاست میں ایک غیر جانب دارانہ حکومت نظم و نسق قائم کرے اور کشمیر کے الحاق کے متعلق وہاں کے عوام کی رائے پر کسی قسم کا دباؤ نہ پڑنے دے۔"

تب ۲۱ نومبر کو مسٹر نہرو نے پاکستان کے وزیر اعظم کو لکھا:

"میں متعدد بار کہہ چکا ہوں کہ جونہی کشمیر سے خارجی حملہ آور نکال دیے جائیں گے اور وہاں امن و امان کا دور دورہ ہو جائے گا۔ تو وہاں کے عوام کو کسی بین الاقوامی تنظیم مثلاً اقوام متحدہ کے تحت استصواب رائے کے ذریعے کشمیر کے الحاق کا فیصلہ کرنے کا موقع فراہم کر دیا جائے گا۔"

انھوں نے اپنی یہ پیشکش ۱۲ دسمبر کو پھر دہرائی۔

تب یہ نکتہ واضح ہو گیا کہ اس تنازع کا تصفیہ کرانے میں دونوں اطراف کے مشورے سے اقوام متحدہ کی مدد حاصل کی جائے گی

بہرحال بھارت نے اس تنازع کا فیصلہ کرانے کے تعمیری مقصد کی خاطر اقوام متحدہ کا دروازہ نہیں کھٹکھٹایا تھا بلکہ وہ پاکستان کی مذمت کرنے کے ارادے سے وہاں گیا تھا۔ لیکن یہ بات اس بنیادی حقیقت کو بدلنے سے قاصر رہی کہ شروع ہی سے کشمیر کی صورت حال بھارت اور پاکستان کے مابین تنازع کی صورت حال تھی۔

اس طویل روداد سے یہ حقیقت نمایاں ہو جاتی ہے کہ یہ پاکستان نہیں تھا جو باہر سے کشمیر کے منظر پر نمودار ہوا تھا۔ اس کے برعکس یہ تو بھارت تھا اور ہے جو خواہ مخواہ دوسروں کے پھٹے میں ٹانگ اڑا رہا ہے۔

اِس تنازع میں اقوام متحدہ نے مختصراً کیا حصہ لیا ہے؟

اقوام متحدہ نے تنازع کشمیر میں پہلے پہل جو حصہ لیا اُس کے نتائج یقیناً حوصلہ افزا تھے لیکن بعد میں اُس کی جدوجہد اکارت ثابت ہوئی۔ حوصلہ افزا اس لیے کہ (۱) اسے کشمیر میں بند ۵ ماہ پرانی جنگ ختم کرانے میں کامیابی ہو گئی (۲) کہ اس نے اس تنازع کے تصفیے، فوجوں کے انخلاء اور استصواب رائے کے اصول اور طرزِ عمل کو تراشا اور دونوں طرفوں سے انھیں قبول کرا لیا

تنازع کشمیر کے متعلق اقوام متحدہ کی جدوجہد کا نمایاں پہلو یہ رہا ہے کہ اقوام متحدہ کے سامنے فقط یہی ایک ایسا جھگڑا ہے جس کے دونوں امیدوار ایسے ایک سمتی تجویز کے تحت حل کرنا چاہتے ہیں۔ جہاں تک استصواب رائے کے اصول کا تعلق ہے اسے دونوں فریقوں نے اس جھگڑے کو اقوام متحدہ میں لے جانے سے پہلے ہی قبول کر لیا تھا۔ جنوری سے اپریل ۱۹۴۸ء تک اس جھگڑے پر مفصل بحث کے دوران میں حفاظتی کونسل نے اس جھگڑے کے تصفیے کے متعلق جامع اصول وضع کر لیے، اُن کے اطلاق کو واضح کر دیا اور اُن کے طریق عمل کا نقشہ کھینچ دیا۔ اس طرح اس تنازع کے تصفیے کا ایک خاکہ تیار ہو گیا اور یہی وہ خاکہ ہے جو اب تک موجود ہے اور جس پر مزید کوئی اصلاح نہیں کی گئی۔ تفصیلات کے لیے مسئلہ کشمیر اور اقوام متحدہ والا مضمون جو کشمیر نمبر میں الگ جگہ درج ہے ملاحظہ فرمائیں)

اب جو کشمیر کا مسئلہ کھٹائی میں پڑا ہے تو اس کی اصل وجہ کیا ہے؟

کشمیر سے متعلق موجودہ جمود کی صحیح وجہ یہ ہے کہ بھارت نے یو۔ این۔ سی۔ آئی۔ پی کی ۱۳ راگست ۱۹۴۸ء اور ۵ جنوری ۱۹۴۹ء کی دو قراردادوں کو جامۂ عمل پہنانے سے انکار کر دیا ہے اور اقوام متحدہ اپنے حکم کی بھارت سے تعمیل کرانے سے قاصر ہے۔ بھارت اور پاکستان اس بات پر متفق تھے کہ کشمیر میں ایماندارانہ استصواب رائے ہو گا اور اس استصواب سے پہلے علاقوں سے فوجیں نکالی دی جائیں گی لیکن بھارت۔ اپنے اس وعدے سے منحرف ہو گیا ہے۔

جنوری ۱۹۴۹ء سے اب تک جنرل میک نوٹن سر اوون ڈکسن، ڈاکٹر فرانک گراہم گونار یارنگ، پاکستان اور دولت مشترکہ کے کئی وزرائے اعظم اور بھارت اور پاکستان کے کئی دوست ممالک کے سیاست دانوں کی وساطت سے اقوام متحدہ کے بھارت اور پاکستان کے کمیشن نے بھارت کو استصواب رائے کی ترغیب دی ہے لیکن بھارت نے کشمیر سے اپنی فوجیں نکالنے سے صاف انکار کر دیا ہے اور نہ ہی کسی ایسے منصوبے کی داغ بیل ہی ڈالی ہے۔

بھارت نے اقوام متحدہ کی غیر جانبدار فوج کے کشمیر میں داخلے کی شدید مخالفت کی ہے۔ ایسی فوج کا مقصد کشمیر میں دونوں اطراف پاک و ہند کی فوجوں کا نہایت پُرامن طریقے سے اخراج اور ریاستی۔ مہاراجہ اور آزاد کشمیر کی فوجوں کو نہتا کرنا تھا۔ بھارت بالکل نہیں چاہتا کہ اقوام متحدہ

کی غیر جانبدار فوج کشمیر میں داخل ہو اور وہاں استصواب رائے کے لیے خوش گوار فضا تیار کرے۔

مزید براں اُس نے ناظم استصواب کی بات ماننے سے ہمیشہ گریز کیا ہے جس کا کام خط متارکہ جنگ کے دونوں طرف استصواب کے لیے خوش گوار فضا پیدا کرنا تھا۔

کشمیر کا موجودہ جمود اس لیے وجود میں آیا ہے کہ بھارت کشمیر سے دست بردار نہیں ہونا چاہتا۔ وہ جانتا ہے کہ اگر عوام کی مرضی کے مطابق کشمیر کا فیصلہ کیا گیا تو اُسے اِس خطے سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔

لیکن اپنے طرزِ عمل کے جواز میں بھارت کے کیا دلائل ہیں؟

بھارت اس سلسلے میں کئی دلائل دیتا ہے مگر وہ سب کے سب لفاظی پر مبنی اور تضاد کا پہلو لیے ہوئے ہیں۔ وہ نہرو اور مینن کے درجہ بدرجہ متلون غرور کے ساتھ پیش کیے جاتے ہیں۔ بہرحال لفاظی اور الزام تراشی کے موٹے پردوں کے نیچے ذیل کے نکتے دیکھے جا سکتے ہیں۔

پہلا: پاکستان نے کشمیر پر حملہ کیا ہے۔ پاکستان کے قبائلی پٹھان اور رضاکار کشمیر میں آ کر لڑتے رہے ہیں اور بعد میں اُن کی مدد کے لیے پاکستانی فوجیں کشمیر میں داخل ہو گئی تھیں۔ جب تک یہ حملہ آور کشمیر کو مکمل طور پر خالی نہ کر دیں گے کشمیر کے تصفیے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

دوسرا: کشمیر سے نکل جانے کا یہ مطلب ہے کہ کشمیر پر پاکستان کا کوئی دعویٰ نہ ہوگا اور نہ ہی مقبوضہ کشمیر سے بھارتی فوج کے اخراج اور نہ ہی استصواب رائے کے معاملے میں پاکستان کو کسی مطالبے کا حق ہوگا۔ پاکستان کے لیے کشمیر سے اپنی فوج نکالنا لازم ہے۔ علاوہ بریں آزاد فوجوں کو ہٹا کر کے انھیں منتشر کیا جائے اور سری نگر کی حکومت کو سارے کشمیر کی جائز حکومت سمجھا جائے۔ دوسرے الفاظ میں پاکستان کشمیر کے منظر سے بالکل غائب ہو جائے۔

تیسرا: پاکستان نے بذاتِ خود ۱۳ اگست ۱۹۴۸ء اور ۵ جنوری ۱۹۴۹ء کی قراردادوں پر عمل نہیں کیا۔ مسٹر نہرو نے پاکستان پر الزام لگایا ہے کہ پاکستان اقوام متحدہ کی قراردادوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کشمیر میں برا جمان ہے۔

چوتھا: کشمیر کے الحاق کے متعلق مہاراجہ نے جس معاہدے پر دستخط کیے تھے وہ قطعی معاہدہ تھا اس لیے ریاست پر بھارت کا جائز حق ہے اس بنا پر کشمیر میں کسی غیر جانب دار فوج یا اقوام متحدہ کا داخلہ بھارتی علاقے میں مداخلت کرنے کے مترادف ہوگا۔

پانچواں: اقوام متحدہ کی ۱۳ اگست ۱۹۴۸ء اور ۵ جنوری ۱۹۴۹ء کی قراردادیں کوئی معاہدہ نہیں تھیں بلکہ عمل کا ایک منصوبہ تھیں۔ یہ منصوبہ فقط انھیں حالات میں مادی شکل اختیار کر سکتا تھا۔ چونکہ اسے اُس وقت لباس عمل نہیں پہنایا گیا اور تب سے اب تک حالات بہت بدل چکے ہیں۔ اس لیے یہ منصوبہ اب ناکارہ ہو چکا ہے۔

چھٹا: بھارت کشمیر میں کوئی ایسا رد و بدل نہ ہونے دے گا جس سے اس کا تحفظ خطرے میں پڑ جائے۔ چونکہ پاکستان مغربی طاقتوں کا حلیف ہے خصوصاً امریکہ کا اس لیے اس صورت حال کا تقاضا ہے کہ بھارت کو کشمیر سے اپنی فوج نہ نکالنی چاہیے۔

ساتواں: کشمیر میں استصواب کرانے سے وہاں کی آبادی کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا پڑے گا جس سے وہاں کی گزشتہ دس برس کی معاشرتی و اقتصادی ترقی ملیا میٹ ہو جائے گی۔

آخری: کشمیر میں استصواب سے مذہبی جذبات مشتعل ہو جائیں گے جس سے بھارتی مسلمانوں کی اقلیت خطرے میں پڑ جائے گی۔

یہاں یہ ذکر کرنا برمحل ہوگا کہ بھارتی دلائل کو مختصراً بیان کرنے سے اُن میں ایک قسم کا تعلق پیدا ہو گیا ہے اور اُن کے بہت سے تضاد دب گئے ہیں۔ پاکستان کے حملے اور اقوام متحدہ کی قراردادوں کو لباس عمل نہ پہنانے کے متعلق بھارت کے دلائل پر جداگانہ سوالات کے



آپ کو

اور اس کی طرح ہزاروں دوسرے لٹیرے آپ کو، ریلوے کو،
اور قوم کو لوٹنے میں سرگرم ہیں؛

ان لٹیروں کو بے نقاب کیجئے

جب بھی سفر درپیش ہو ٹکٹ خرید کر سفر کیجئے

ٹکٹ چوروں کو پکڑنے میں ریلوے سے تعاون کیجئے



شعبۂ تعلقات عامہ شائع کردہ: نارتھ ویسٹرن ریلوے

تحت بحث کی جائے گی۔ استصواب کے باعث کشمیر کی آبادی کا شیرازہ بکھرنے کا جو اندیشہ بھارت نے ظاہر کیا ہے اُسے بھی بعد میں زیر بحث لایا جائے گا۔ بہرحال پہلی نظر میں دو چیزیں نمایاں نظر آتی ہیں۔

اوّل: ایک طرف کشمیر کو اپنا علاقہ ظاہر کرنے اور مہاراجہ کے الحاق کی قطعیت گردانے اور دوسری طرف کشمیر میں استصواب رائے کے ذریعے اس الحاق کا فیصلہ قبول کرنے میں ایک تضاد ہے۔ سیدھے سادے الفاظ میں اگر کشمیر کے عوام کو بھارت یا پاکستان سے شامل ہونے کا موقع دیا جائے جیسا کہ بھارت نے خود وعدہ کیا تھا تو اس صورت میں اُن پر بھارت کا حق قطعی ہرگز نہیں ہے۔ اگر یہ حق قطعی اور مکمل ہوتا تو پھر انہیں بھارت یا پاکستان میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کی اجازت دینے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ بھارت نے کشمیر سے فوجی اخراج کے بعد وہاں استصواب رائے کرانے کا وعدہ کیا تھا۔ یا تو اس کے اس وعدے سے کشمیر پر اس کی نام نہاد حکمرانی پر حرف آگیا یا پھر اُس کا وعدہ خلوص پر مبنی نہ تھا۔ دوسری صورت کا یہ مطلب ہوا کہ بھارت نے اقوام متحدہ کی کشمیر سے متعلق ساری کارروائی اور استصواب رائے اور فوج کے اخراج کے متعلق گزشتہ دس برس کی گفت و شنید میں صریحا بدنیتی اور بے دلی سے شرکت کی تھی۔ اور پھر اگر کشمیر سے متعلق اقوام متحدہ کی ۱۳ اگست ۱۹۴۸ء اور ۵ جنوری ۱۹۴۹ء والی قراردادیں کوئی معاہدہ نہ تھیں اور فقط عمل کا ایک منصوبہ تھیں تو پھر ان کو لباس عمل نہ پہنانے کے سلسلے میں پاکستان پر کوئی الزام عاید نہیں ہوتا۔ اور اگر یہ ایک معاہدہ تھا تو پھر اسے لباس عمل پہنانے کی ذمہ داری دونوں اطراف پر عاید ہوتی ہے اور بھارت اس ذمہ داری سے ناحال انحراف کر رہا ہے۔

دوم: اپنی بہترین صورت میں بھی یہ دلائل کشمیر کی صورت حال کے بنیادی عنصر سے ہرگز متعلق نہیں یعنی کشمیری عوام کا اپنے مستقبل کا خود فیصلہ کرنے کا حق۔ کشمیری عوام سے متعلق بھارتی حکومت نے فقط ایک دلیل دی ہے اور وہ یہ ہے کہ انھوں نے گزشتہ دس برس میں بھارتی حکومت کے زیر سایہ خاصی معاشرتی اور اقتصادی ترقی کی ہے۔ یہ دعویٰ یا تو صحیح یا پھر غلط ہو سکتا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو پھر استصواب رائے کی صورت میں کشمیری عوام اپنے ہمدرد (بھارت) کے حق میں ووٹ ڈالیں گے اور اس طرح کشمیر کی آبادی کا شیرازہ نہیں بکھرے گا۔ اس کے برعکس اگر یہ غلط ہے تو پھر بھارت ایک غلط دعویٰ کر رہا ہے۔ بالکل اُن تمام کی طرح جو دوسرے علاقوں پر غاصبانہ قبضہ کرنے کے بعد اس قسم کی لاف زنی کرتے ہیں کشمیر پر اپنے قبضے کو برحق ثابت کرنے کے لیے بھارت اپنے تحفظ کی دلیل بھی پیش کرتا ہے مگر یہ دلیل بھی مؤخر الذکر نتیجے ہی کی حمایت کرتی ہے۔

بھارت کے اس الزام میں کتنا وزن ہے کہ پاکستان نے کشمیر پر حملہ کیا ہے؟

چونکہ اس الزام میں صریحاً وزن نہیں، اس لیے جب آغاز ہی میں ۱۹۴۸ء میں بھارت نے اقوام متحدہ سے پاکستان کے حملہ آور ہونے کی شکایت کی تو حفاظتی کونسل کے تمام اراکین نے اس شکایت کو قابل غور نہ سمجھا۔ یہ ایک ایسا الزام ہے جسے غیر جانب دار عوامی رائے تو ایک طرف سوویٹ روس جیسے بھارت کے حامی ملک نے بھی حمایت کے قابل نہیں سمجھا۔

حقیقت میں اس الزام کی کوئی بنیاد ہی نہیں ہے۔ اگست، اکتوبر ۱۹۴۷ء میں جو کچھ ہوا تھا وہ یہ تھا جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ کشمیری عوام خصوصاً مغربی کشمیر کے عوام نے جن کا علاقہ تین اطراف سے پاکستان سے ملتا ہے۔ مہاراجہ کے خلاف بغاوت کر دی جس کی فوج نے انھیں ملک بدر کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس بغاوت نے فطرتاً قبائلی پٹھانوں اور پاکستانی رضاکاروں کو اُن کی حمایت کے لیے مستعد کر دیا کیونکہ ان لوگوں کی بہت سے کشمیری مسلمانوں سے رشتہ داری تھی اور وہ انھیں یوں قتل ہوتا ہوا نہ دیکھ سکتے تھے۔ جب آزاد فوجوں نے مہاراجہ کو شکست دی تو اُس نے بھارت سے مدد چاہی اور مسلح مداخلت کی درخواست کی۔ بھارتی فوجوں نے اس طرح مغربی کشمیر میں

[redacted]

قدمی کی کہ اس سے نہ صرف پاکستان کی سرحدوں کو خطرہ پیدا ہو گیا بلکہ مغربی کشمیر کے علاوہ پاکستان کے عوام کی زندگیوں کا شیرازہ بکھرنے کا لاحق ہو گیا۔ نتیجۃً پاکستان اپنی سرحدوں کی حفاظت کی خاطر اور لوگوں کی زندگی کا شیرازہ مجتمع رکھنے کے لیے کشمیر کی سرحد کے اندر ایک محدود پر اپنے دفاعی محاذ قائم کرنے پر مجبور ہو گیا۔ یہ اُس نے مئی ۱۹۴۸ء میں کیا تھا۔ کشمیر میں لڑائی شروع ہونے کے نو ماہ بعد۔

لیکن ان حقائق سے قطع نظر جن سے تمام غیر جانب دار نامہ نگار بخوبی واقف ہیں، کشمیر پر حملہ آور ہونے کے سلسلے میں پاکستان پر بھارت کا الزام اس لیے بھی بے بنیاد ہے کہ اُس کی تردید خود بھارت کا طرزِ عمل کرتا ہے اور جب اس سے کشمیر کے الحاق کے متعلق کشمیری عوام کی رائے کو کہا جاتا ہے تو وہ ایک دم بدک جاتا ہے۔ اگر پاکستان کشمیر پر حملہ آور ہوتا تو اس صورت میں کشمیری عوام اس کا شکار ہونے۔ تب بھارت کشمیر میں استصواب رائے کرانے پر زور دیتا جس کے تحت پاکستانی حملے کے شکار کشمیری عوام پاکستان کے خلاف اور بھارت کے حق میں دیتے۔ لیکن چونکہ پاکستان کشمیر میں استصواب رائے کے حق میں ہے اور اس کے برعکس بھارت اس کی مخالفت کرتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بھارت کے الزام میں کس قدر سچائی ہے۔ یہ بات واضح کرتی ہے کہ دونوں اطراف میں سے "حملہ آور" کون ہے۔

مسٹر نہرو کے اس الزام میں کتنا وزن ہے کہ پاکستان کشمیر میں بیٹھا ہوا ہے اور یوں کشمیر سے متعلق اقوامِ متحدہ کے کمیشن برائے بھارت اور پاکستان کی ۱۳ اگست ۱۹۴۸ء اور ۵ جنوری ۱۹۴۹ء کی قراردادوں کو لباسِ عمل پہنانے سے گریز کر رہا ہے؟

اس الزام میں بھی کوئی وزن نہیں اور مسٹر نہرو خود اس حقیقت سے واقف ہیں۔ اوّل تو کشمیر کا وہ حصہ جو بھارت کے قبضے میں نہیں اور جہاں بھارتی پیش قدمی نہ کر سکی وہاں کشمیری عوام ہی "بیٹھے ہوئے" ہیں (یہ مسٹر نہرو کی اپنی اصطلاح ہے)، وہی کشمیری عوام جنہوں نے سن ۱۹۴۷ء اور ۱۹۴۸ء میں آزاد کشمیر فوج منظم کی تھی۔

دوم: جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے تو اس پر اس دیکھ بھال کی ذمہ داری عاید کی گئی ہے کہ کہیں غیر بھارتی علاقے کی طرف سے خطِ جنگ بندی کو توڑنے کی کوئی کوشش تو نہیں کی جا رہی۔ درحقیقت بھارت نے خود یہ تقاضا کیا تھا کہ جنگ بندی کا معاہدہ بھارت اور پاکستان کے درمیان رہنا چاہیے نہ کہ بھارت اور آزاد فوجوں کے درمیان۔ اس لیے اگر پاکستان خود کو اس منظر سے پرے ہٹا دے تو پھر جنگ بندی کی نگرانی کون کریگا؟ علاوہ بریں پاکستان کی عدم موجودگی میں اقوامِ متحدہ کے کمیشن برائے پاک و بھارت کی قراردادوں کو لباسِ عمل کون پہنائے گا؟ ان قراردادوں سے صاف ظاہر ہے اور بھارت اس سے متفق ہے کہ ان قراردادوں کو لباسِ عمل پہنانے میں تین نمایاں مرحلے طے کرنے ہوں گے۔ جنگ بندی، صلح اور استصواب۔ پہلے مرحلے جنگ بندی کے دوران میں دونوں اطراف کو جنگ بند کرنی ہوگی۔ صلح کے مرحلے پر پاکستان کو اپنی اور بھارت کو اپنی فوجیں کشمیر سے ہٹانی ہوں گی اور استصواب کے وقت کشمیر سے ہر قسم کی فوج نکالنی ہوگی اس میں آزاد فوجیں ایک طرف اور بھارتی اور ریاستی فوج دوسری طرف شامل ہے۔ اس لیے ان قراردادوں کو لباسِ عمل پہنانے کے لیے دونوں اطراف سے نیک نیتی مطلوب ہے جس مرحلے پر بھی یک طرفہ معاملہ نہیں۔ دوسرے الفاظ میں اگر پاکستان اس یقین دہانی کے بغیر کشمیر سے اپنی تمام فوجیں نکال لے کہ بھارت بھی کشمیر سے اپنی فوجیں نکال رہا ہے تو یہ صورتِ حال کشمیر کے متعلق دونوں اطراف میں سمجھوتے یا معاہدے کی حامل نہ ہوگی۔ اس کا یہ مطلب ہوگا کہ بھارت کی جارحانہ پیش قدمی کے لیے آزاد کشمیر بھی خالی کر دیا گیا ہے۔ اس لیے یہ اقوامِ متحدہ کی قراردادوں کو لباسِ عمل پہنانا تو نہ ہوا۔ یہ تو انھیں تہس نہس کرنا ہوا۔ حقیقت یہ نہیں کہ اقوامِ متحدہ کی قراردادوں پر پورا اترنے میں پاکستان ناکام رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُس نے انھیں رد کرنے سے انکار کر دیا ہے۔

سوم: اقوامِ متحدہ کے ریکارڈ میں یہ بات موجود ہے کہ پاکستان نے شروع سے اب تک کشمیر سے اپنی فوج نکال لینے کے متعلق پہنے

دعوے سے کبھی انحراف نہیں کیا بشرطیکہ بھارت بھی ایسا کرنے کو تیار ہو۔ لیکن بھارت کبھی اس کے لیے تیار نہیں ہوا۔ لہٰذا اس سلسلے میں پاکستان مورد الزام نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ اس صورت حال کے متعلق پاکستان کا واضح نقطۂ نظر اس کی اس تجویز سے صاف نمایاں ہے کہ کشمیر میں اقوام متحدہ کی فوج کا داخل ہونا چاہیے۔

پاکستان کے وزیر خارجہ نے ۱۶ جنوری ۱۹۵۷ء کو اقوام متحدہ میں کہا تھا "حفاظتی کونسل کو دونوں اطراف سے کہنا چاہیے کہ وہ کشمیر سے اپنی فوجیں نکال لیں اور اسے یہ بھی یقین کر لینا چاہیے کہ مقامی فوج جو حفاظتی کونسل کے ماتحت ہوگی کیا اس میں مناسب حد تک تخفیف کی گئی ہے کہ نہیں۔ ریاست کے تحفظ اور داخلی امن کی ذمہ داری اقوام متحدہ کی فوج کے سپرد ہونی چاہیے اور یہ فوج اس علاقے میں ایک دم بھیج دینی چاہیے۔ اس کے علاوہ ریاست سے بھارتی یا پاکستانی اور مقامی فوجیں نکال دینی چاہئیں اور ریاست کی پولیس میں غیر کشمیری افسران و ملازمین کے اختیارات بھی چھین لینے چاہئیں۔ علاوہ بریں یہ بھی درخواست کی جاتی ہے کہ ناظم استصواب کے تقرر کی تاریخ جلد از جلد مقرر کی جائے۔ صرف انھیں طریقوں سے کشمیر کی صورت حال سلجھ سکتی ہے۔"

یہ تجویز قبول کرنا کشمیر سے اخراج فوج اور وہاں استصواب رائے کرانے کے معاہدے کو لباس عمل پہنانے کے مترادف ہوگا۔ پاکستان کا یہ تجویز پیش کرنا اور بھارت کا اسے رد کر دینا اس امر کا قطعی ثبوت ہے کہ اقوام متحدہ کی کشمیر سے متعلق قراردادوں کو کون لباس عمل پہنانے کو تیار ہے اور کون نہیں۔

اگر دلیل کی خاطر کشمیر پر بھارت کا دعویٰ صحیح مان لیا جائے تو کیا کشمیر میں اقوام متحدہ کی فوج کا داخلہ بھارت کے علاقے میں دخل اندازی ہوگی؟

بھارت کا یہ دعویٰ محض ایک جاگیردار کے اقدام پر کھڑا کیا گیا ہے۔ یعنی مہاراجہ کا بھارت سے کشمیر کا الحاق کرنا۔ یہ الحاق جعلی ہے کیونکہ یہ فعل ایسی نوعیت کا ہے اور ایسے حالات میں انجام دیا گیا ہے کہ اس کا نتیجہ کشمیر پر بھارتی اختیار ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اول: یہ ایک ایسے فرد کا فعل ہے جو اسے انجام دینے کے وقت اپنا حق اور اقتدار کھو چکا تھا۔ دوم: خود یہ تقسیم ہند کے ان اصولوں کی خلاف ورزی تھی جن کے تحت ہی بھارت معرض وجود میں آیا اور اس نے اپنی حکومت قائم کی تھی۔ اس لیے فقط دلیل کی خاطر بھی کشمیر پر بھارت کا دعویٰ کسی صورت میں جائز تصور نہیں کیا جا سکتا۔

بہر حال اگر یہ دعویٰ جائز تصور کر بھی لیا جائے تو پھر ایک دلچسپ سوال پیدا ہوتا ہے۔ یعنی پھر اقوام متحدہ کے فیصلوں کی صحیح منصفانہ بنیاد کیا ہے؟ کیا امن کی سلامتی کے لیے اُن فیصلوں کی بنیاد مختلف قوموں کے اختیارات کو ہم آہنگ کرنے پر نہیں؟ کیا یہ فیصلے اپنا تعمیری مقصد رکھتے ہیں کہ نہیں؟ کیا متعلقہ قوموں کو انھیں قبول کرنا چاہیے کہ نہیں، کیونکہ ان قوموں نے اقوام متحدہ کے چارٹر پر دستخط کرتے وقت اقوام متحدہ کے فیصلوں کو قبول کرنے کا حلف اٹھایا تھا۔ کیا اقوام متحدہ کے چارٹر کے پچیسویں آرٹیکل میں یہ واضح طور پر درج نہیں کہ "اقوام متحدہ کے اراکین حفاظتی کونسل کے فیصلوں پر اتفاق کرنے اور انھیں لباس عمل پہنانے کا عہد کرتے ہیں"۔

یا کیا یہ فرمان زبردستی ٹھونسے گئے ہیں اور اس طرح جائز اختیارات کے لیے ضرر رساں ہیں؟

کشمیر میں اقوام متحدہ کی فوج کے داخلے کے سوال کا سامنا کرتے وقت بھارت اقوام متحدہ کی قانونی طاقت کے متعلق دو متضاد صورتوں میں سے فقط ایک کو اپنا سکتا ہے۔ اگر دوسرے بین الاقوامی مسائل کی طرح بھارت اس مسئلے میں بھی یہ تسلیم کرتا ہے کہ حفاظتی کونسل کے فیصلے قومی اختیارات کی نفی کا پہلو نہیں لیے ہوتے تو اس صورت میں وہ کشمیر پر اپنے مفروضہ دعوے کی حمایت نہیں کر سکتا اور اس دعوے کی بنا پر اقوام متحدہ

کی فوج کو کشمیر میں داخل ہونے سے نہیں روک سکتا۔ اگر اس کے برعکس بھارت کا یہ خیال ہے کہ اقوام متحدہ کے فیصلے قومی اختیارات کی نفی کرتے ہیں تو پھر بھارت نے خود بعض دوسری قوموں کے اختیارات میں نفی کرنے میں حصہ لیا ہے۔ خصوصاً مصر کے معاملے میں یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ مصر میں موجودہ اقوام متحدہ کی فوج میں بھارتی فوج کا ایک گروہ بھی شامل ہے اور وہ اب بھی مصری علاقے میں موجود ہے۔ اگر مصری حکومت کی رضامندی سے یہ فوج مصر میں قیام پذیر ہے تو اس سے مادی طور پر اس معاملے کی نوعیت نہیں بدل جاتی۔ یہ تو فقط مصر کی رضامندی کی یقین دہانی تھی جس کا اس نے اقوام متحدہ کی رکنیت اختیار کرتے ہوئے عہد کیا تھا کہ وہ اقوام متحدہ کے فیصلوں کو قومی اختیارات کی نفی نہ جانے گا۔

یہاں اس بات کا اضافہ کر دینا مناسب ہوگا کہ قومی اختیارات اور اقوام متحدہ کے کسی فیصلے کے درمیان اسی وقت تصادم پیدا ہو سکتا ہے جب کہ معاملہ بنیادی طور پر گھریلو نوعیت کا ہو۔ کشمیر کا معاملہ بھارت کا گھریلو معاملہ نہیں۔ بھارت خود اس تنازع کو اقوام متحدہ کے سامنے لایا تھا۔ بھارت نے اقوام متحدہ کے کمیشن برائے پاک و ہند کی ۱۳ اگست ۱۹۴۸ء اور ۵ جنوری ۱۹۴۹ء کی قراردادیں خود قبول کی تھیں جن کو جامۂ عمل پہنانے کے لیے کشمیر میں اقوام متحدہ کی فوج کا داخلہ ضروری ہے۔ علاوہ بریں بھارت نے پہلے ہی اقوام متحدہ کی فوج کے ایک دستے کو کشمیر میں خط جنگ بندی کی نگرانی کی اجازت دے رکھی ہے اور پھر بھارت نے اقوام متحدہ کی ۵ جنوری ۱۹۴۹ء کی قرارداد کی رو سے کشمیر میں اقوام متحدہ کی طرف سے استصواب کے ناظم کا تقرر بھی قبول کر رکھا ہے۔ یہ ناظم استصواب کی تنظیم کے لیے پوری قوت استعمال کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔ اگر بھارت کے یہ اقرار اس کے کشمیر پر مفروضہ دعوے کو مجروح نہیں کرتے تو پھر کشمیر میں اقوام متحدہ کی فوج کا داخلہ بھی اس کے لیے نقصان کا باعث نہیں ہو سکتا۔ یہ ظاہر ہے کہ کشمیر میں اس قسم کی فوج بھیجنے کا فعل ان تمام دوسرے فعلوں سے مختلف نہیں ہو سکتا جنہیں پہلے ہی بھارت انجام دے چکا ہے یہ تو فقط اسی سلسلے کی ایک نئی کڑی ہوگی۔

کشمیر میں اقوام متحدہ کی فوج کا داخلہ فقط بھارت کے ایک سوال کا جواب دینے کے لیے تجویز کیا گیا تھا۔ سوال یہ ہے کہ اگر استصواب رائے سے پہلے کشمیر سے ہر قسم کی فوج نکال لی گئی تو پھر وہاں امن اور قانون کی ضمانت کون دے گا۔ جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے پاکستان ایک مقامی فوج کی تنظیم کے حق میں ہے۔ اس کے برعکس بھارت نے استصواب رائے کے ان طریقوں کو رد کر دیا ہے۔ اگر غیر جانبدار نگرانی کے تحت ریاست میں ایک مقامی فوج بنائی جائے تو اس صورت میں اقوام متحدہ کی فوج کی ضرورت محسوس نہ ہوگی۔ لیکن اگر بھارت مقامی فوج کے حق میں نہیں تو پھر اقوام متحدہ کی فوج کا کشمیر میں ہونا ناگزیر ہے اور ظاہر ہے کہ بھارت مقامی فوج کے خلاف ہونے کی صورت میں اقوام متحدہ کی فوج کے حق میں یقیناً ہوگا۔ بھارت ایک تو سوال پوچھتا ہے مگر اس کے جواب سے گریز کرتا ہے۔

فوجی نقطۂ نظر سے کشمیر کی اہم ریاست اگر پاکستان کا ایک حصہ بن جائے تو کیا اس سے ایشیا میں سرد جنگ تیز ہو جائے گی کیونکہ پاکستان مغربی طاقتوں کا حلیف ہے؟

نہیں۔ جس چیز نے جنوبی ایشیا کو سرد جنگ کے گڑھے میں دھکیل رکھا ہے وہ تنازع کشمیر ہے نہ کہ اس کا منصفانہ حل۔ جب کوئی بین الاقوامی تنازع طوالت اختیار کر جاتا ہے تو اس کے نتائج کا پیش ازیں اندازہ کرنا بیش از بیش مشکل ہو جاتا ہے۔ گزشتہ دس بارہ برس کے تجربات بتلاتے ہیں کہ مسئلہ کشمیر کسی نہ کسی طرح بھارت اور پاکستان کی تمام پالیسیوں پر ...... اثر انداز ہوتا رہا ہے۔ جس کے سبب ان دونوں ملکوں کے تعلقات مائل بہ تخریب رہے ہیں اور ان کے درمیان اختلاف کی خلیج وسیع ہوتی رہی ہے۔ یہ تنازع موجودہ سرد جنگ کا آغاز ثابت ہوا ہے۔ اس تنازع کا حل اس سرد جنگ کو ختم کر سکتا ہے۔ اگر یہ مسئلہ ایک دفعہ مناسب طور پر حل کر دیا جائے تو پھر بھارت اور پاکستان کے لیے ... تعاون اور مشترکہ دفاع کے فطری راستے کے سوا اور کوئی راستہ کھلا نہ ہوگا۔ بھارت اور پاکستان میں کشمیر کے متعلق تصفیہ اقوام متحدہ کے کردار کو محکم کر دے گا اور ان دونوں ملکوں کے درمیان خیر سگالی کا رشتہ پیدا ہو جائے گا۔ اس تنازع کا تصفیہ کم از کم جنوبی ایشیا میں بین الاقوامی کھچاؤ کو بڑی حد تک دور ہی کرے گا اس سے

جائے گا نہیں۔

جہاں تک مغربی طاقتوں سے پاکستان کے فوجی اتحاد کا تعلق ہے تو یہ خالص دفاعی انتظام ہے۔ یہ پاکستان کے نقطۂ نظر اور مغربی طاقتوں کے نقطۂ نظر سے بھی دفاعی اتحاد ہے۔ امریکہ نے پاکستان کو اس یقین دہانی کے بعد فوجی امداد دی ہے کہ مؤخرالذکر اسے بھارت کے خلاف استعمال نہ کرے گا۔ سیٹو اور سینٹو جس کا رکن پاکستان بھی ہے، یہ تنظیمیں جنوبی ایشیا اور وسط ایشیا کو خارجی حملے سے بچانے کے لیے بنائی گئی ہیں۔ اگر کشمیر پاکستان کا حصہ بن جائے تو ان تنظیموں کی موجودگی میں اس کا دفاع محفوظ ہو جائے گا۔ اب موجودہ حالات میں کشمیر کا دفاع فقط بھارتی فوج کا مرہون منت ہے لیکن چونکہ کشمیری عوام بھارت سے کوئی سیاسی ہمدردی نہیں رکھتے اس لیے وہ بھارتی فوج سے بھی تعاون نہیں کریں گے اور کسی وقت بھی اس کے خلاف آواز بلند کر سکتے ہیں۔ اس لیے کشمیر کے دفاع کا کام اس فوج کے ذمے چھوڑنا دانشمندی سے بعید ہے۔

بہرحال یہ بعید از قیاس ہے کہ پاکستان کا مغربی طاقتوں سے اتحاد کسی طرح تنازع کشمیر کے ایماندارانہ حل پر اثرانداز ہو سکتا ہے۔ امن کی جوت امن سے جلتی ہے نہ کہ جنگ سے۔

کیا مقبوضہ کشمیر میں جمہوریت کا دور دورہ ہے اور کیا یہ معاشرتی و اقتصادی ترقی کر رہا ہے؟

معاملہ اس کے برعکس ہے۔ ان گنت ایسے حقائق مہیا ہو سکتے ہیں جو مقبوضہ کشمیر میں جمہوریت کے دور دورے اور معاشرتی و اقتصادی ترقی کی تردید کرتے ہیں۔ یہ حقائق اس قدر واضح ہیں کہ ان کی تفصیل میں جانا جواب کو ضرورت سے زیادہ طوالت دینا ہوگا۔ ان کا خلاصہ فقط دو ذیلوں میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ اول، سیاسی حقائق اور دوم اقتصادی حقائق۔

سیاسی حقائق

(۱) جیسا کہ بھارت نے خود بھی تسلیم کیا ہے کشمیر کے بھارت سے الحاق کا اقدام کسی جمہوری نمائندہ جماعت کا اقدام نہیں تھا بلکہ ایک جاگیردار حکمران کا اقدام تھا۔ حالانکہ خود مہاراجہ کو دارالسلطنت سے بھگا دیا گیا تھا۔

(۲) بہرحال بھارت نے مہاراجہ کے اس فعل کے ثبوت میں ہردلعزیز کشمیری راہنما شیخ عبداللہ کا نام پیش کیا تھا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ چونکہ مہاراجہ کے اس فعل کو شیخ عبداللہ کی حمایت حاصل ہے اس لیے اسے کشمیری عوام کی حمایت بھی حاصل ہے۔ حفاظتی کونسل میں یہ معاملہ پیش کرتے وقت بھارت نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ شیخ عبداللہ بلاشبہ کشمیری عوام کا مقبولِ عام رہنما ہے اور اس نے اس الحاق کی حمایت کی ہے۔ لیکن یہ بات ریکارڈ میں موجود ہے کہ اسی شیخ عبداللہ نے اگست ۱۹۵۳ء میں کہا تھا کہ بھارت سے کشمیر کا مستقل الحاق ایک غیر حقیقی اور بیگانہ فعل ہے اور پاگل پن کی دلیل ہے۔" وہی شیخ عبداللہ اگست ۱۹۵۳ء سے قید خانے میں پڑا سڑ رہا ہے۔ اس پر کوئی الزام لگا کر مقدمہ بھی نہیں چلایا جا رہا۔

(۳) بھارت کے زیرسایہ پرورش پانے والی کشمیر کی موجودہ حکومت ایک نام نہاد جماعت جموں کشمیر نیشنل کانفرنس کی حکومت ہے۔ یہ وہی جماعت ہے جسے کشمیر کے مہاراجہ نے کشمیری عوام کی مقبولِ عام جماعت جموں اینڈ کشمیر مسلم کانفرنس کا مقابلہ کرنے کی خاطر ہر قسم کی پابندی سے آزاد کر دیا تھا۔ مؤخرالذکر جماعت ہی نے کشمیر میں ۱۹۳۴ء اور ۱۹۳۸ء میں ہونے والے دونوں عام انتخابات جیتے تھے۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے نیشنل کانفرنس نے ریاست کی دستور ساز اسمبلی میں ایک بھی نشست حاصل نہ کی تھی۔

(۴) ۱۹۴۷ء کے بعد کشمیر میں دستور ساز اسمبلی کے دو برائے نام "انتخابات" ہوئے تھے۔ یہ اسمبلی ریاست میں بھارتی حکومت کے حق میں تھی اور اب بھی ہے۔ ان انتخابات کے پس پردہ جو مکر و فریب پوشیدہ تھا اس پر دنیا بھر کے اخبارات نے تبصرہ کیا ہے۔ اول تو نیشنل کانفرنس کے بہت سے

امیدوار کسی مخالفت کے بغیر ہی منتخب ہو گئے تھے۔ اُن کے مخالفین کو قید کر لیا گیا۔ اغوا کر لیا گیا اور انھیں اذیت پہنچائی گئی۔ نتیجۃً انھیں ووٹ ڈالنے کی اجازت بھی نہ دی گئی۔ دوم، فقط قلیل التعداد نشستوں کے لیے ہندو مخالف جماعتوں کو انتخابات میں حصہ لینے کی اجازت دی گئی۔ لیکن اُن کے ووٹ بھی پڑا سے گئے۔ نیشنل کانفرنس کے امیدواروں نے جی بھر کر جعلی ووٹ ڈلوائے اور یوں بندوبست کیا گیا کہ فقط سرکاری امیدوار ہی فتح یاب ہوں۔ ان انتخابات کے متعلق دنیا کے مشہور ہفت روزہ "اکانومسٹ" نے لکھا تھا "ایک سرا سر جعل سازی"۔ مانچسٹر گارڈین کے الفاظ یہ تھے: "صاف ظاہر تھا کہ انتخابات آزادانہ ماحول میں منعقد نہیں ہوئے"۔ "نیویارک ٹائمز" کی رائے تھی۔ "انھیں ہرگز انتخابات نہیں کہا جا سکتا"۔

(۵) ریاست میں کئی مقبول عام سیاسی جماعتیں ہیں: مثلاً جموں اور کشمیر مسلم کانفرنس، محاذِ استصواب کشمیر، کشمیر پولیٹیکل کانفرنس، کشمیر ڈیموکریٹک یونین، کسان مزدور کانفرنس وغیرہ۔ یہ تمام جماعتیں پاکستان سے کشمیر کے الحاق کی حق میں ہیں۔ یہ تمام جماعتیں دبا دی گئی ہیں اور ان کے راہنماؤں کو یا تو حراست میں لے لیا گیا ہے یا پھر ریاست بدر کر دیا گیا ہے۔ ریاست میں (PREVENTIVE DETENTION ACT) نامی ایک قانون نافذ کر دیا گیا ہے جس کے تحت کسی شخص کو بھی پانچ برس کے لیے وجہ بتائے بغیر قید کیا جا سکتا ہے۔ اس قسم کی حراست کے خلاف قانونی چارہ جوئی کرنے کی بھی اجازت نہیں۔

(۶) یہ تشدد و ظلم اہم سیاسی جماعتوں پر ہی اثر انداز نہیں ہوا بلکہ ساری ریاست میں سیاسی گرم بازاری سرد پڑ چکی ہے۔ عوامی جلسے ایک تو ویسے ہی خلاف قانون بنا دیے گئے ہیں اور اگر کہیں کوئی جلسہ منعقد ہو بھی جائے تو اسے پولیس اور فوج کی مدد سے منتشر کر دیا جاتا ہے اور ایسی فوج کو "امن پسند فوج" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ عوام کو کھلم کھلا سزائیں دی جاتی ہیں۔ عورتیں اغوا کر لی جاتی ہیں اور شہروں اور دیہات کی آبادی کو بھارتی حکومت کے خلاف بات کرنے پر بھی حراست میں لے لیا جاتا ہے۔ سیاسی قیدیوں کی تعداد ان گنت ہے اور عام خیال کیا جاتا ہے کہ یہ ہزاروں تک پہنچتی ہے۔

اقتصادی حقائق

(۱) مقبوضہ کشمیر کے دریا کشمیر سے نکلنے کے بعد پاکستان کے علاقے میں بہتے ہیں۔ اس کا مطلب کشمیر کی عمارتی لکڑی کے کاروبار کا نقصان ہے چونکہ کشمیر میں جنگلات با افراط ہیں اس لیے یہاں کی عمارتی لکڑی اور اسی نوع کی دوسری اشیا اس کی آمدنی کا ۴۳ فی صد ہیں۔ یہ لکڑی بیرونی منڈیوں کو فقط انھیں دریاؤں کے ذریعے بھیجی جا سکتی ہے جو پاکستان میں بہتے ہیں۔ آج کل سڑک کے ذریعے اس لکڑی کو بھارت لے جانے میں اس قدر اخراجات بڑھ گئے ہیں کہ یہ کاروبار ہرگز منافع بخش نہیں رہا۔ نتیجہ کے طور پر اس سے کشمیر کی معیشت پر کاری ضرب پڑی ہے۔

(۲) کشمیر کی آمدنی کا دوسرا ذریعہ ملکی و غیر ملکی سیاح ہیں۔ یہ سلسلہ دو وجوہ کے باعث تقریباً منقطع ہو چکا ہے۔ اول: ماسوا پاکستان کے کشمیر کے اندر ہر موسم میں داخل ہونے کا کوئی قابلِ اعتماد راستہ نہیں۔ دوم: سیاسی انتشار۔ یہ یقین دلانے کے لیے کہ کشمیر میں ملکی و غیر ملکی سیاحوں کی آمد و رفت کا سلسلہ بالکل بحال ہو چکا ہے بھارتی حکومت یہ اشتہار بازی کر رہی ہے کہ کشمیر میں ہر سال تقریباً پچاس ہزار سیاح آتے ہیں۔ بہرحال یہ تعداد مبالغہ آمیز ہے۔ ان میں دورے پر آنے والے سرکاری افسروں کے علاوہ وہ تاجر بھی شامل ہیں جو اپنے کاروبار کے سلسلے میں تھوڑی دیر کے لیے کشمیر آتے ہیں اور جو کشمیر کی بنی ہوئی فن کارانہ اشیا بالکل نہیں خریدتے اور نہ ہی وہاں کے ہوٹلوں وغیرہ میں لمبے وقفے کے لیے قیام پذیر ہو کر کشمیر کی آمدنی میں اضافہ کرتے ہیں۔

(۳) کشمیر کی نزدیک ترین بندرگاہ کراچی ہے جو پاکستان کا دارالحکومت ہے۔ اس کی سڑکوں کا سلسلہ بھارت سے ملنے کے بجائے پاکستان سے ملا ہوا ہے۔ اس لیے کشمیر کی زیادہ تر درآمد و برآمد پاکستان ہی کے راستے سے ہوا کرتی تھی۔ اب یہ درآمد و برآمد بمبئی اور کلکتہ جیسی دور افتادہ بھارتی بندرگاہوں کے ذریعے سے ہوتی ہے جس کے باعث ان کی قیمتیں بہت بڑھ گئی ہیں۔ چونکہ کشمیر کی نوّے فی صد عمارتی لکڑی، اسّی فی صد ادنیٰ مصنوعات اور پچاسی فی صد ہاتھوں سے بنی ہوئی فن کارانہ اشیا باہر بھیجنے کے لیے ہوتی ہیں۔ اس لیے برآمدی کاروبار کے مفلوج ہو جانے سے کشمیر کو مالی لحاظ سے جو نقصان اٹھانا پڑا ہے، اُس کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے۔

یہ خاص خاص سیاسی و اقتصادی حقائق ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور عام اور بنیادی حقیقت ہے جو کشمیر کی موجودہ صورتِ حال کی صحیح عکاسی کرتی ہے کہ اس تنازع کی نوعیت اور ماحول اس قسم کے ہیں کہ یہ وہاں کے عوام کی روزمرہ زندگی کے ہر شعبے پر اثر انداز ہو رہا ہے۔ اگر بغور تجزیہ کیا جائے تو یہ سیاسیات سے غیر متعلق سیدھے سادے عوام ہیں جو اس تنازع کا خمیازہ بھگت رہے ہیں۔ ان کے خاندان منقسم ہو چکے ہیں، اُن کی رفاقت کے رشتے ٹوٹ چکے ہیں، اُن کی زندگی کے خاکے بگڑ چکے ہیں اور اُن کا معاشرتی ڈھانچا متزلزل ہو چکا ہے۔ جب تک اس تنازع کا تصفیہ وہاں کے عوام کی آزاد مرضی کے مطابق نہ ہوگا وہ کبھی احساسِ تحفظ حاصل نہیں کر سکتے اور نہ ہی کبھی معاشرتی و اقتصادی ترقی حاصل کر سکتے ہیں۔ جب تک کشمیر پر بھارت کا قبضہ ہے وہاں خوف و ہراس اور تذبذب کا دور دورہ رہے گا۔

ایسا کیوں ہے جبکہ ایشیا میں بھارت کو ایک حقیقی جمہوری ملک کہا جاتا ہے؟

یہ اس لیے ہے کہ بھارت اور کشمیر کے مابین جمہوری تعلقات نہیں ہیں۔ یہ نوآبادیاتی قسم کے تعلقات ہیں۔ یہ اُسی قسم کے تعلقات ہیں جیسے ۱۹۴۷ء سے پہلے برطانیہ اور ہندوستان کے مابین ہوا کرتے تھے۔ برطانیہ جمہوریت کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔ لیکن ہندوستان میں برطانوی حکومت جمہوری نہ تھی۔ چونکہ بھارت ووٹوں کے ذریعے کشمیری عوام کی آزادانہ رائے معلوم کرنے سے گریز کرتا ہے اس لیے وہ کشمیر پر تشدد کے ذریعے حکومت کرنا چاہتا ہے۔ بھارت نے کشمیر میں انھیں لوگوں کو اقتدار بخشا ہوا ہے جو اپنے ذاتی مقاصد کے پیشِ نظر بھارت کی حمایت کرتے ہیں۔ ایسا کرتے وقت بھارت کشمیر پر طرح طرح کی پابندیاں عاید کرنے پر مجبور ہے۔ مثلاً عام انتخابات کا التوا، شہری آزادی پر پابندی، لوگوں کو دہشت زدہ کرنا، سیاسی راہنماؤں کی طویل نظر بندی وغیرہ وغیرہ۔ یہ ایک باقاعدہ نوآبادیاتی صورتِ حال ہے جو نوآبادیاتی نظام کے نام نہاد مخالف بھارت نے کشمیر میں پیدا کر رکھی ہے۔

کشمیر میں استصوابِ رائے کس طرح بھارت میں ہندو مسلمان تعلقات پر اثر انداز ہوگا؟ کیا اس سے مذہبی تعصب کا شعلہ نہ بھڑک اُٹھے گا جس سے بھارتی مسلمانوں کی اقلیت کا تحفظ خطرے میں پڑ جائے؟

کشمیر میں ایماندارانہ استصوابِ رائے کا فطری نتیجہ بھارت اور پاکستان کے درمیان امن کی فضا کا قیام ہوگا۔ یہ فضا اُس کھچاؤ اور تلخی کو دور کر دے گی جو گزشتہ دس برس سے جمع ہو رہی ہے۔ اگر ایک دفعہ ان دو ہمسایہ ملکوں کے درمیان انصاف اور رفاقت کی بنیاد رکھ دی گئی تو عین ممکن ہے کہ یہ دونوں ملک امریکہ اور کینیڈا کی طرح آپس میں گہرے تعلقات پیدا کریں اور اپنی تمام تجارتی، سفری اور ثقافتی دیواریں توڑ دیں۔ اگر بھارتی ہندوؤں اور مسلمانوں کی درمیانی خلیج بھارت اور پاکستان کے کشیدہ تعلقات کا ردِعمل ہے تو اسے دونوں ملکوں کے معاملات طے کرنے سے پُر کیا جا سکتا ہے۔ چونکہ ان دونوں ملکوں کے درمیان مختلف معاملات کا تصفیہ فقط کشمیر میں منصفانہ استصواب کے باعث ہی ہو سکتا ہے۔ اس لیے یہ واضح ہے کہ یہ استصواب بھارت میں معاشرتی و مذہبی تناؤ کو کم کر دے گا اور بھارتی ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات خراب کرنے کے بجائے انھیں عام سطح پر لے آئے گا۔

اس مسئلے کے متعلق یہ بڑا معقول اور انسانی رویہ ہے۔ لیکن پنڈت نہرو اس کے خلاف دلائل دیتے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ اگر کشمیر کے چالیس لاکھ مسلمان پاکستان سے مل گئے تو بھارت کے ساڑھے تین کروڑ مسلمان ہندوؤں کے ہاتھوں قتل ہو جائیں گے۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ دلیل نہیں ہے بلکہ ایک دھمکی ہے۔ یہ تو ہندوؤں کو ایسا قدم اٹھانے کی ترغیب دینے کے برابر ہے۔ لیکن اگر اس دلیل کو ظاہری طور پر

بھی لیا جائے تو اس سے ایک نجیدہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کیا بھارت ایک مہذب ملک ہے کہ نہیں؟ اگر بھارت ایک مہذب ملک ہے اور وہاں صحیح جمہوریت قائم ہے جس کا دعویٰ بھارت کرتا ہے تو اس پر قطع نظر اس کے کہ اس کے اور ایک بیرونی ملک کے درمیان کیسے معاملات ہیں تو اس پر اپنی مسلمان رعایا کی زندگی اور عزت کے تحفظ کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ لیکن اگر بھارت غیر مہذب ملک ہے [illegible] مسلمان شہری بالکل محفوظ نہیں ہیں خواہ وہ کشمیری مسلمان ہی کیوں نہ ہوں [illegible] بے رحم ہندو [illegible] مسلمانوں کو کسی وقت بھی کسی بہانے بھی صفحۂ ہستی سے مٹا سکتے ہیں۔ وہ بھارتی مسلمانوں کو [illegible] پاکستان کے درمیان جنگ ہونے کی صورت میں زیادہ آسانی سے قتل کر سکتے ہیں۔ [illegible] اس موقع پر قتل عام [illegible] میں آئے۔

پنڈت نہرو کی مذکورہ بالا دلیل [illegible] کہ کشمیر میں استصواب ہونے سے بھارت میں ہندو مسلم فسادات کی آگ بھڑک [illegible] استصواب کا نتیجہ کشمیر کا پاکستان سے الحاق ہی ہو گا۔ دوسرے الفاظ میں وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ انھوں نے کشمیر [illegible] کے خلاف کشمیر پر قبضہ کر رکھا ہے [illegible] حکومت اور وہاں کی مجلس قانون ساز کو عوام کی حمایت حاصل ہے [illegible] مذکورہ دلیل کے مطابق [illegible] مسلمان [illegible] شخص جیسی ہے جیسے ضمانت کے طور پر دشمن کے حوالے کیا گیا ہو جیسا کہ شیخ عبداللہ نے اپنے جنوری ۱۹۵۸ء [illegible] کیا بھارت کی جمہوریت اتنی بودی ہے کہ وہ کشمیریوں کو اپنی خود ارادیت دینے کے لیے [illegible] کے گھر [illegible] ہو جائے گی؟ کوئی پوچھے کہ کیا بھارتی جمہوریت میں مسلمان اقلیت کی جان و مال کے تحفظ کی خاطر کشمیری مسلمانوں کو بطور ضمانت [illegible] گیا ہے؟

چونکہ پنڈت نہرو اپنی دلیل کے ان مضمرات کو [illegible] نہیں رکھتے [illegible] اپنی اس دلیل کو [illegible] کے بجائے ایسے اشاروں کنایوں میں ظاہر کرتے ہیں۔ اگر پنڈت نہرو اسے سنجیدگی سے لبوں پر لاتے تو اس کا مطلب [illegible] بھارتی ریاست کی چار کروڑ رعایا کے تحفظ کی خاطر چالیس لاکھ مرد و زن کو بطور ضمانت [illegible] کے پاس رکھا جائے۔ ایسے مطالبے کی سنگین نوعیت کسی قسم کے تبصرے کی محتاج نہیں۔

جب کہ تقریباً چار کروڑ مسلمان بھارت میں رہتے ہیں تو پھر یہ کس لیے ضروری سمجھا گیا ہے کہ چالیس لاکھ مسلمان بھارت سے کٹ کر پاکستان سے مل جائیں؟

اس سوال نے مسئلہ کشمیر کا دل چھو لیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ سوال اُس اصول کو بھی نظرانداز کر گیا ہے جس کی بنیاد پر بھارت اور پاکستان دو الگ الگ آزاد ملکوں کی حیثیت سے معرض وجود میں آئے تھے۔

تقسیم ہند اور برطانوی مقبوضہ ہندوستان کی آزادی کا اصول مختصراً یہ تھا کہ ہندو اکثریت والے علاقے بھارت میں شامل ہونے چاہئیں اور مسلم اکثریت والے علاقے پاکستان میں۔ کشمیر کا مسئلہ فقط اس لیے پیدا نہ ہوا تھا کہ وہاں چالیس لاکھ مسلمان بستے ہیں بلکہ اس لیے کہ وہ ایک ایسے علاقے میں آباد ہیں جو جغرافیائی لحاظ سے پاکستان سے ملحق ہے اور تاریخی طور پر اس سے منسلک ہے۔ اس لیے بھارتی اور کشمیری مسلمانوں کو ایک جیسا نہیں سمجھا جا سکتا۔ بھارتی مسلمان سارے بھارت میں پھیلے ہوئے ہیں۔ وہاں کوئی ایسا علاقہ نہیں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہو [illegible] پاکستان سے ملحق بھی ہو۔ اسی باعث تقسیم ہند نے انھیں بھارتی قوم کا ایک حصہ بنا دیا ہے اور انھوں نے اپنی حیثیت قبول بھی کر لی ہے۔ جہاں تک کشمیری مسلمانوں کا تعلق ہے تو ان پر مذکورہ بالا کسی شرط کا اطلاق نہیں ہوتا۔ تقسیم ہند کے اقدام سے وہ کسی طرح بھارتی قوم نہیں بنتے۔ اس کے برعکس یہ حقیقت ہر کسی نے تسلیم کی ہے کہ وہ پاکستان کا حصہ بن سکتے ہیں۔ اس لیے [illegible] کے تحفظ کا سوال [illegible] کے مستقبل کے سوال سے بالکل الگ ہے۔

یہ اس مسئلے کا بنیادی نکتہ ہے۔ بہرحال، یہ دوسرا نکتہ بھی بالکل برمحل ہے۔ برصغیر کی تقسیم ایک ایسا عمل تھا جو من مانی کارروائی ہونے کے بجائے بیشتر متعلقہ عوام کی خواہشات پر بھی مبنی تھا۔ سندھ، بنگال اور پنجاب کی قانون ساز اسمبلیوں کے ووٹوں کے علاوہ صوبہ سرحد اور سلہٹ میں استصواب رائے عامہ بھی دریافت کی گئی تھی۔ یہ دونوں علاقے اُس زمانے میں مشکوک سیاسی حیثیت کے مالک تھے۔ اس لیے وہاں کے عوام کو خود یہ فیصلہ کرنے کا موقع دیا گیا کہ آیا وہ بھارت سے الحاق کرنا چاہتے ہیں یا پاکستان سے۔ انہوں نے بڑے جوش و خروش سے پاکستان کو منتخب کیا۔ اُس وقت یہ درخواست نہ کی گئی تھی کہ اس علاقے کے مسلمان بھارت ہی میں رہنے دیے جائیں کیونکہ اور بہت سے مسلمان بھارت میں رہتے تھے۔ اُس وقت یہ اصول مدِنظر رکھا گیا تھا کہ بعض نمایاں علاقوں کے مسلمانوں کو حق خود ارادیت دیا جائے یہی اصول مسئلہ کشمیر کے ضمن میں بھی کارفرما ہے۔ اور پھر کشمیری مسلمان بھارت سے "رشتہ توڑنے" کی کوشش نہیں کر رہے۔ کیونکہ انہوں نے تو کبھی رضاکارانہ طور پر بھارت سے اپنا رشتہ جوڑا ہی نہیں۔ اخلاقی اور قانونی طور پر وہ کبھی بھارتی حکومت سے خوش نہیں ہوئے۔ انہیں تو جسمانی طور پر بھارتی فوجوں نے جکڑ لیا ہے بھارتی تشدد کے اختتام اور استصواب رائے کا مطالبہ کر کے وہ قومی حیثیت تبدیل نہیں کر رہے۔ وہ پہلی دفعہ اپنی حیثیت کا تعین کرنے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ یہ موقع دیے بغیر انہیں بھارتی مسلمانوں کی طرح بھارتی قوم تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اُن کے متعلق یہ مسلمہ حقیقت ہے اور اسی مسلمہ حقیقت کا کشمیر کے اُن غیر مسلموں پر بھی اطلاق ہوتا ہے جو مقبوضہ کشمیر میں بھارتی حکومت کی طوالت کے خلاف بغاوت کر رہے ہیں۔

کیا کشمیر کا مسئلہ مذہبی نوعیت کا ہے؟ کیا فقط مسلمان کشمیری ہی پاکستان سے الحاق چاہتے ہیں؟

نہیں۔ خود کشمیریوں کے نقطۂ نظر سے یہ مسئلہ اتنا ہی مذہبی ہے جتنا اقتصادی، معاشرتی یا اخلاقی ہے۔ اسی سبب بہت سے نامور کشمیری ہندو فقط اس لیے کشمیر میں بھارتی تشدد کا شکار ہو رہے ہیں کیونکہ ان کا ایمان ہے کہ کشمیر بھارت کا حصہ بن کر خوش حال نہیں رہ سکتا اور اس کا فطری مقام پاکستان میں ہے۔ مسٹر پریم ناتھ بزاز اور مسٹر رگھوناتھ ویشنوی کشمیر کے بہت سے نامور ہندو محب الوطنوں میں سے دو ہیں جنہیں بھارتی حکومت نے کئی دفعہ اس لیے نظر بند کیا ہے کہ انھوں نے بھارت سے کشمیر کے الحاق کی مخالفت کی تھی۔ وہ کشمیر میں اہم سیاسی جماعتوں کے راہنما ہیں۔ مثلاً کشمیر پولیٹیکل کانفرنس اور کشمیر ڈیموکریٹک یونین اور یہ صاف ظاہر ہے کہ وہ کسی مذہبی بنا پر کشمیر کا پاکستان سے الحاق نہیں کرنا چاہتے۔ وہ یہ الحاق خالص انسانی اور جمہوری وجوہ کی بنا پر چاہتے ہیں۔ علاوہ بریں چند ہندوؤں نے مل کر دہلی میں ایک جماعت منظم کی ہے جس کا نام ہے "تنازع کشمیر ختم کرو کمیٹی"۔ یہ لوگ دیوانے نہیں ہیں۔ وہ اس مسئلے کو جذباتی نقطۂ نظر سے نہیں دیکھتے اور اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ تنازعِ کشمیر کا اسی طرح جاری رہنا کشمیر، پاکستان اور بھارت سب کے لیے مہلک ہے۔

تنازعِ کشمیر میں بھارت اور پاکستان دونوں ملکوں کی کون کون سی چیزیں داؤ پر لگی ہوئی ہیں؟

یہ ایک متضاد مطالبہ ہے۔ چلیے پہلے پاکستان کو لیتے ہیں۔ کشمیر پاکستان کے دفاع، اُس کی معیشت اور سب سے زیادہ اُس کے قومی استحکام پر اثر انداز ہوتا ہے۔

جہاں تک دفاع کا تعلق ہے یہ ضرب المثل ہے کہ کشمیر تحفظِ پاکستان کے سلسلے کی ایک بنیادی کڑی ہے۔ کشمیر کے برسوں پرانے ذرائع آمد و رفت اور ڈاک تار کا نظام اس ریاست کو فطری طور پر پاکستان سے منسلک کرتے ہیں۔ ایک غیر ملکی طاقت کے ہاتھوں میں کشمیر فقط غیر محفوظ ہی نہ ہوگا بلکہ یہ پاکستان کے لیے ایک مسلسل خطرہ بھی بنا رہے گا۔ اس کی سرحدیں سوویٹ روس سے ملی ہوئی ہیں اور یہ چھدری آبادی والے

علاقوں سے گھرا ہوا ہے، ایسے علاقے جو کشمیر میں ایک مضبوط حکومت قائم ہونے ہی سے قابو میں رہ سکتے ہیں۔ جب تک کشمیر میں ایک مستحکم حکومت وجود میں نہ آئے گی یہ علاقے شرانگیز کارروائیوں کی آماجگاہ بنے رہیں گے اور ان کارروائیوں کا اولین اثر پاکستان پر پڑے گا۔ (حال ہی میں لداخ میں چینی مداخلت اس دلیل کا بہت بڑا ثبوت ہے) مغربی پاکستان کی شہ رگ اس کی شاہراہ اور ریلوے لائن جو پشاور اور لاہور کے درمیان گزرتی ہے۔ کشمیر کی سرحد سے صرف تیس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اسی باعث فن حرب کے ماہرین نے کشمیر کو ہمیشہ ایک ایسا تیر کہا ہے جس کا رخ پاکستان کے دل کی طرف ہو۔

دوم: پاکستان کا اقتصادی مفاد بڑی حد تک کشمیر سے وابستہ ہے۔ اگر کشمیر پاکستان کا حصہ بن جائے تو یہ مشترکہ علاقہ ایک اقتصادی اکائی بن جائے گا۔ جیسا کہ ۱۹۴۷ء سے پہلے تھا۔ کشمیر ان دریاؤں کا منبع ہے جو مغربی پاکستان کے اہم نہری نظام کی زندگی کا سبب ہیں۔ اگر کشمیر بھارت کے قبضے میں چلا گیا تو پاکستان کی ساری زراعت خطرے میں پڑ جائے گی اور بھارت اور پاکستان کے درمیان پانی کا تنازع نئی اور نازک صورت اختیار کر جائے گا اور پھر بھارت، کی طرح جو پاکستان سے تقریباً چار گنا بڑا ہے۔ پاکستان کے پاس معدنیات، بجلی اور جنگلات کا کوئی ذخیرہ موجود نہیں ماسوا کشمیر کے۔

سوم: کشمیر کا اپنی قسمت کا فیصلہ خود کرنا بذات خود پاکستان کے معرض وجود میں آنے کا ایک اہم حصہ ہے۔ پاکستان برطانوی ہندوستان کے مسلم اکثریت والے علاقوں کے حق خود ارادیت کے طفیل بنا تھا جب تک کشمیر کو حق خود ارادیت کے ذریعے اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کا موقع نہ دیا جائے گا۔ پاکستان ادھورے پن کے احساس کا شکار رہے گا، اور اس کا استحکام خطرے میں رہے گا۔ یہی وہ احساس ہے جو پاکستانی عوام کو بھارت کے کشمیر پر ناجائز قبضے کے متعلق شدید احتجاج کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

پاکستان کے مقابلے میں بھارت کا نہ تو دفاعی اور نہ ہی کوئی اقتصادی مفاد کشمیر سے وابستہ ہے۔ حقائق اور اعداد و شمار کی روشنی میں بھارتی راہنما یہ کہنے پر تو مجبور ہو گئے ہیں کہ کشمیر کو اپنے قبضے میں رکھنے سے انھیں کوئی اقتصادی فائدہ نہیں۔ البتہ وہ اس دعوے پر مصر ہیں کہ دفاعی لحاظ سے کشمیر ان کے لیے اہم ہے۔ لیکن ایماندارانہ جائزہ بتاتا ہے کہ بھارت کا یہ دعویٰ غلط ہے۔ نظری طور پر فقط دو ملک کشمیر کے ذریعے سے بھارت پر حملہ کر سکتے ہیں۔ ایک پاکستان اور دوسرا سوویٹ روس۔ سوویٹ روس کو اس فہرست سے خارج کیا جا سکتا ہے۔ اس برصغیر پر بلاواسطہ فوجی حملہ یا تو ایران کے راستے اور یا پھر بلوچستان کے راستے ہو سکتا ہے اور موخرالذکر پاکستان کا حصہ ہے۔ یا پھر افغانستان سے گزر کر درۂ خیبر کے راستے۔ درۂ خیبر بھی پاکستان کا حصہ ہے۔ جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے تو اس کے پاس دہلی پر بلاواسطہ حملہ کرنے کے، کشمیر کے بجائے اور کئی آسان راستے ہیں۔ اس لیے اگر کبھی پاکستان نے کشمیر پر حملہ کیا بھی تو وہ کشمیر کو کبھی اس مقصد کے لیے استعمال نہ کرے گا۔ نتیجۃً اگر کشمیر پاکستان کے قبضے میں آ جائے تو اس سے بھارت کو کوئی خطرہ نہیں۔ دوسرے الفاظ میں بھارت کے لیے کسی دفاعی حاجت کے پیش نظر کشمیر کو اپنے قبضے میں رکھنا ضروری نہیں۔ پاکستان کے وزیر خارجہ نے آٹھ فروری ۱۹۵۰ء کو اس ساری صورت حال کا اقتباس حفاظتی کونسل میں پیش کر دیا تھا۔ انھوں نے کہا تھا:-

"آپ جس نقطۂ نظر سے چاہیں اس صورت حال کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ بھارت کو کوئی ایسی ضرورت یا مجبوری نہیں کہ وہ کشمیر سے الحاق کرے۔ بھارت تو فقط ایک جوا کھیل رہا ہے۔ اگر وہ اس جوئے میں کامیاب ہو گیا تو اس سے پاکستان تباہ ہو جائے گا اور اس کے اس جوئے کا مقصد بھی یہی ہے۔ کشمیر پر قبضہ بھارت کی معیشت یا اس کے دفاع و تحفظ میں کوئی اضافہ نہیں کر سکتا اس کے برعکس کشمیر پاکستان کے لیے بے حد اہم ہے۔ اگر کشمیر کا الحاق بھارت سے ہو گیا تو یہ صورت حال پاکستان کے لیے بہت مہلک ہو گی اور وہ دفاعی اور معاشی نقطۂ نظر سے بھارت کا دست نگر ہو کر رہ جائے گا۔ دونوں طرفوں سے یہی کچھ داؤ پر لگا ہوا ہے۔"

پنڈت نہرو کے ذہن پر کشمیر کا اس طرح مسلط ہونا کس بات کی وضاحت کرتا ہے؟

یہ عام یقین کہ پنڈت نہرو جذباتی طور پر کشمیر سے وابستہ ہیں کیونکہ وہ خود بھی کشمیری ہیں غلط فہمی کی پیداوار ہے۔ پنڈت نہرو اتنے ہی کشمیری ہیں جتنے صدر آئزن ہاور جرمن ہیں۔ ان کے بہت قدیم آباؤ اجداد کشمیر کے رہنے والے تھے جیسا کہ بہت سے پاکستانی لیڈروں کے آباؤ اجداد تھے جہاں تک پنڈت نہرو کی ذات کا تعلق ہے وہ اس وقت کشمیر کے لیے مکمل اجنبی تھے جب وہاں کے عوام نے ایک ہندو ڈوگرہ حکمران کے خلاف آزادی کی جدوجہد شروع کی تھی۔ بعد میں انہوں نے دو کشمیری رہنماؤں شیخ عبداللہ اور پریم ناتھ بزاز سے تعلقات قائم کر لیے اور ان کی وساطت سے وہ کشمیر کی سیاست میں حصہ لینے لگے۔ لیکن اب یہی وہ دو شخص ہیں جو پنڈت نہرو کے نظریہ کشمیر کے سخت مخالف ہیں اور جو نتیجۃً قید خانے اور جلا وطنی میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اس لیے یہ کہنا کہ پنڈت نہرو جذباتی طور پر کشمیر سے وابستہ ہیں سراسر جھوٹا بیان ہے۔

پنڈت نہرو کے ذہن پر کشمیر کے تسلط کی چند اور وجوہ ہیں۔

اول دفاع کے نقطۂ نظر سے کشمیر کا محل وقوع کچھ اس قسم کا ہے کہ اس پر قبضہ کرنے سے بھارت پاکستان کو نرغے میں لے سکتا ہے کشمیر کی مدد سے بھارت کو پاکستان پر برتری حاصل ہو سکتی ہے اور کشمیر سے نکلنے والے دریاؤں کو اپنے قبضے میں کر کے وہ پاکستان کی زراعت کو تباہ کر سکتا ہے۔

دوم: کشمیر بے حد خوبصورت جگہ ہے جس پر قبضہ کرنا مسٹر نہرو کے ذہنی سکون کا باعث ہے۔

سوم: چونکہ کشمیر مسلم اکثریت والا علاقہ ہے اسے بھارت کے ساتھ شامل کر کے مسٹر نہرو یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ وہ اس اصول کو توڑنے میں کامیاب ہو گئے ہیں جس پر تقسیم ہند کی بنیاد رکھی گئی تھی۔

تیسری وجہ شاید اہم ترین ہے۔

جس اصول کے تحت اس برصغیر کی تقسیم عمل میں آئی تھی وہ یہ ہے کہ ہندو اکثریت والے علاقے بھارت میں شامل ہوں گے اور مسلم اکثریت والے علاقے پاکستان میں۔ اس اصول کو برطانیہ، ہندوؤں اور مسلمانوں نے مشترکہ طور پر قبول کیا تھا اور اسی کے باعث بھارت اور پاکستان نے دو آزاد مملکتوں کی حیثیت سے جنم لیا تھا۔ ایک طویل عرصے تک اس اصول کی مخالفت کرنے سے مسٹر نہرو نے پیش بینی اور حقائق پر نگاہ رکھنے کا ثبوت نہیں دیا تھا۔ تقسیم ہند کے اس اصول سے مسٹر نہرو بظاہر تو خوش تھے مگر اندر سے اس کے خلاف تھے۔ ان کی یہی ذاتی مخالفت اور قیام پاکستان کے خلاف ان کا بغض انہیں مجبور کرتا ہے کہ وہ کشمیر کو زبردستی اپنے قبضے میں رکھ کر اہل پاکستان کے جذبات کو ٹھیس پہنچائیں۔ پاکستان کے عوام اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ مسٹر نہرو کی کشمیر پالیسی کے پیچھے کون سی چیز پوشیدہ ہے اور یہ ان کا پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے خلاف بغض کا جذبہ ہے۔ یہ جذبہ جسے وہ کھلے بندوں تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔

مسٹر نہرو کی اس پالیسی کے متعلق بھارتی عوام کی کیا رائے ہے؟

بھارت کا باشعور اور ذمہ دار طبقہ مسٹر نہرو کی اس مہم سے کبھی خوش نہ تھا جب ۱۹۴۷ء میں کشمیر میں لڑائی چھڑی تو جنوبی وسطی اور شمالی علاقوں کے لاکھوں بھارتی عوام پریشان و مشکوک ہو گئے۔ پریشان اس لیے کہ آخر اس جنگ کی ضرورت کیا تھی اور مشکوک اس لیے کہ اس کے نتائج حوصلہ افزا نہ تھے۔ یہ تشکیک طوالت پکڑتی گئی۔ اس کے متعلق لوگ دو وجہ سے خاموش رہے۔ اول: مسٹر نہرو نے کشمیر کے مسئلے میں اپنی انتہا

پسندی داخل کر رکھی تھی۔ دوم: انھوں نے اپنی اس پالیسی کو اپنی اس عزت و شہرت کا سہارا دے رکھا ہے جو انھوں نے بین الاقوامی اور ملکی معاملات میں حاصل کر رکھی ہے۔ ان کے نقاد اُن کی کشمیر پالیسی پر کھلے بندوں تنقید نہیں کرتے بلکہ جب کبھی مسٹر نہرو کی پالیسی ان کے سامنے واضح شکل میں آگئی تو وہ ایسا کرنے سے کبھی گریز نہ کریں گے۔

بہرحال بھارتی عوام دن بدن اس حقیقت سے آشنا ہو رہے ہیں کہ تنازع کشمیر اُن کی عزت اور بین الاقوامی شہرت کے دامن پر ایک داغ بنتا جا رہا ہے۔ وہ اس امر سے بھی باخبر ہو رہے ہیں کہ یہ تنازع اُن کی خارجہ پالیسی پر منفی انداز میں اثر انداز ہو رہا ہے اور اس کے باعث بھارت کے غیر ملکی احباب کا حلقہ محدود ہو رہا ہے۔ نجی اجلاسوں میں اکثر یہ سوال پوچھا جاتا ہے کہ کیا کشمیر پر برقرار قبضہ کیے رکھنا یا کہ ناراضی مول لینا بھارت کے لیے سودمند سودا ہے؟ یا پھر کیا ایک قریب ترین ہمسایے کو ناراض کر کے دنیا کو اپنے بازیوں سے متاثر کرنا بھارت کے لیے ایک دانشمندانہ رد عمل ہے؟ بہرحال یہ بھارتی عوام کے کچھ ذاتی شکوک ہیں لیکن اگر بین الاقوامی رائے کو مسئلہ کشمیر پر قطعی انداز میں اثر انداز ہونے دیا جائے تو یہ شکوک شدید نوعیت اختیار کر جائیں گے۔

مسئلہ کشمیر بھارت اور پاکستان کی خارجہ پالیسی پر کس طرح اثر انداز ہوا ہے؟

تنازع کشمیر نے بھارت اور پاکستان کے درمیان ایک کشیدگی پیدا کر دی ہے۔ قریبی ہمسایہ ہونے کے باعث اس قسم کی کشیدگی اُن کی پالیسیوں پر اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ پاکستان کشمیری عوام کے حق خود ارادیت کا ہمنوا ہے۔ بھارت انھیں زبردستی اپنا غلام بنائے رکھنا چاہتا ہے۔ دونوں ملکوں کا الگ الگ موقف ہے جو اُن کی رقابت اور دشمنی کو ہوا دینے کا پہلو ہے۔ چونکہ پاکستان کا نقطۂ نظر اقوام متحدہ اور امن کے نقطۂ نظر سے مطابقت رکھتا ہے اس لیے اس میں کوئی تخریبی عنصر نہیں۔ یہ عالمی امن اور آزادی کے رجحانات کی نفی نہیں کرتا۔ اس کے برعکس بھارت کا موقف ایسی نوعیت کا ہے جو ایک مجرم کو سہارے کی تلاش میں سرگرداں رکھتا ہے۔ اس کا نتیجہ ایک مبہم اور متزلزل پالیسی ہے۔ بھارت کا مطمع نظر یہ ہے کہ کشمیر میں بین الاقوامی نگرانی کے تحت استصواب رائے نہ ہونے دیا جائے اور یہی اُس کی خارجہ پالیسی کا بڑا مقصد ہے جو بعض اوقات ایسے میدانوں میں ظاہر ہوتا ہے جن کا تعلق کشمیر سے دور کا بھی نہیں ہوتا۔

اس کی ایک مثال ہنگری کے متعلق بھارت کا رویہ ہے۔ فقط بھارت ہی ایک ایسا غیر اشتراکی ملک تھا جس نے ہنگری میں آزاد اور غیر جانبدارانہ ووٹ کے متعلق اقوام متحدہ کی قرارداد کی مخالفت کی تھی۔ ایسا اُس نے اپنے کسی ایسے اصول کی بنا پر نہیں کیا تھا جسے وہ کھلے بندوں برحق کہتا اور دوسروں کو اس کی تلقین کرنے کو کہتا۔ اُس نے تو یہ فقط ایک ایسی مثال قائم کرنے کے لیے کیا جو آئندہ کشمیر میں اُس کے کام آ سکے۔ دوسرے الفاظ میں بھارت ہنگری کو آزاد دیکھنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ وہ کشمیر کو آزاد نہیں دیکھنا چاہتا۔ درحقیقت بھارت کی یہ پالیسی پنڈت نہرو کی ذاتی انا کی آئینہ دار ہے۔

تنازع کشمیر کے التوا میں پڑے رہنے کی ایک اور زندہ مثال بھارت کی سیٹو اور بغداد پیکٹ (سنٹو) کی مخالفت کرنا ہے۔ اگر مسٹر نہرو دیانتدارانہ طور پر غیر جانبداری کا پیرو تھا تو وہ زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا تھا کہ مذکورہ بالا معاہدوں میں حصہ نہ لیتا جس طرح سوئٹزرلینڈ اور سویڈن نے بڑی واضح پالیسی کے تحت خود کو ایسے معاہدوں سے الگ رکھا ہوا ہے۔ اس سے کم از کم اتنا ضرور ہوتا کہ یہ معاہدے پنڈت نہرو کو برانگیختہ نہ کرتے اور وہ ان کے خلاف زہر نہ اگلتے رہتے۔ اگر بھارت گروہ بندی کے خلاف ایک پاکیزہ اور مفید اصول رکھتا تو مسٹر کرشنا مینن اس کا اظہار درشت لہجے میں نہ کرتے۔ ویسے اگر دیکھا جائے تو سیٹو اور بغداد پیکٹ (سنٹو) سے بھارت کو کوئی نقصان نہیں پہنچ رہا۔ اس کے برعکس وہ جنوبی اور مغربی ایشیا کے دفاعی استحکام کی صورت میں ان تنظیموں سے کچھ فائدہ ہی اٹھا رہا ہے۔ لیکن چونکہ بھارت

پاکستان کی مسلسل مخالفت کے باوجود کشمیر پر قبضہ جاری رکھنے پر اصرار کر رہا ہے اس لیے وہ نہیں چاہتا کہ پاکستان ان تنظیموں کے باعث مضبوط ہو جائے اس لیے اس کی پالیسی کے مطابق یہ تنظیمیں تباہ کی مستحق ہیں۔ اگر ان کی تباہی سے پاکستان کسی خطرے میں گھر جاتا ہے اور یہ خطرہ بھارت کو بھی خود دبوچ لینے لگے تو بھارت اس خطرے میں گھرنے کو کشمیر کو ہاتھ سے چھوڑنے پر ترجیح دے گا۔ بھارت کی خارجہ پالیسی کا یہ لب لباب ہے اور بھارت کے تمام ہمسایے اس سے بخوبی واقف ہیں یہ خارجہ پالیسی بھارت محض تنازع کشمیر کے باعث اختیار کرنے پر مجبور ہو گیا ہے

اس جھگڑے کے متعلق بڑی بڑی طاقتوں خصوصاً امریکہ، برطانیہ اور سوویٹ روس کا کیا رویہ رہا ہے؟

اقوام متحدہ میں مسئلہ کشمیر پر بحث کی روشنی میں اس کے متعلق یہ دلچسپ حقیقت دیکھنے میں آتی ہے کہ تمام طاقتوں کا خواہ وہ بڑی ہوں یا چھوٹی کشمیر کے متعلق سب کا رویہ بڑی حد تک ایک جیسا رہا ہے یہ رویہ ایک اصول کا حامل ہے اور وہ اصول یہ ہے کہ بلا خوف و جبر کشمیر کا تصفیہ وہاں کے عوام کی آزادانہ رائے کے مطابق کیا جائے

بلحاظ تمام ممالک میں وہ ممالک شامل ہیں جو ۱۹۴۸ء سے حفاظتی کونسل میں مسئلہ کشمیر کی بحث میں حصہ لے رہے ہیں یا اسے سن رہے ہیں۔ ان ممالک میں سے کسی نے بھی بھارت کی اس شہ بہت کو ذرہ بھر وقعت نہیں دی کہ پاکستان حملہ آور ہے۔ یہ ممالک مختلف نسلوں اور مختلف سیاسی گروہوں کے رکن ہیں اور ان کے نام یہ ہیں۔ ارجنٹائنا، آسٹریلیا، برازیل، کینیڈا، چین، چلی، کولمبیا، کیوبا، مصر، ایکواڈور، فرانس، یونان، عراق، نیدرلینڈ، ناروے، جاپان، سویڈن، ترکی، سوویٹ روس، یوکرینی ایس ایس آر، برطانیہ، امریکہ اور یوگوسلاویہ۔

بہرحال جانبداری کی ایک واحد عجیب و غریب مثال سوویٹ روس ہے۔ اس ملک نے اس تنازع کی خوبیوں کے متعلق ایک متضاد حیثیت اختیار کر رکھی ہے۔ اس نے حفاظتی کونسل کی اس قرارداد کے حق میں ووٹ دینے سے گریز کیا تھا جس میں کشمیر سے اخراج فوج کے بعد استصواب رائے کی تجویز پیش کی گئی تھی کہنے کا یہ مطلب ہے کہ روس نے کشمیر کے تصفیے کے اصولوں کو رد بھی نہیں کیا تھا۔ اس کے برعکس اس نے ان تجاویز کی مخالفت کی تھی جن میں کوئی راہ عمل پیش کی گئی تھی۔ مثلاً استصواب رائے سے پہلے کشمیر میں امن بحال رکھنے کے لیے اقوام متحدہ کی فوج کا داخلہ تاکہ اس فوج کی مدد سے حفاظتی کونسل کی قراردادوں کو عملی جامہ پہنانے میں سہولت رہے۔ روسی نمائندوں کی تقریروں میں دو متضاد بیان پہلو بہ پہلو ملتے ہیں۔ اوّل کہ کشمیر کا جھگڑا وہاں کے عوام خود ہی حل کر چکے ہیں۔ دوم یہ کہ اس جھگڑے کا تصفیہ بھارت اور پاکستان کے مابین بلا واسطہ گفت و شنید سے ہو جانا چاہئے ان دو باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یا تو کشمیر کے تنازع کا تصفیہ ہو چکا ہے یا پھر ابھی نہیں ہوا۔ اگر کشمیری عوام اس کا تصفیہ کر چکے ہیں تو پھر پاکستان اور بھارت کے مابین بلا واسطہ گفت و شنید کی کیا ضرورت ہے۔ اس کے برعکس اگر اسے بلا واسطہ گفت و شنید سے حل کرنے کا کام ابھی باقی ہے تو اس صورت میں کشمیری عوام نے اس کا تصفیہ نہیں کیا۔ یہ غیر منطقی پوزیشن اختیار کرنے میں سوویٹ روس نے اپنی خاص حکمت عملی کی نمائش کی ہے اور اس تنازع کے متعلق کوئی واضح بات کہنے سے گریز کیا ہے اور ایسا راستہ اختیار کیا ہے جس سے ایک پارٹی کی ہمت افزائی تو ضرور ہوتی ہے مگر دوسری پارٹی بھی شدید احتجاج نہیں کر سکتی۔ دوسرے الفاظ میں یہ ایک بین الاقوامی تنازع کو زندہ رکھنے کی پالیسی ہے۔

سوویٹ روس کے جنبہ دارانہ رویے کے برعکس امریکہ اور برطانیہ نے حفاظتی کونسل میں اس مسئلے کے متعلق ایک تعمیری رویے کی ساخت میں بڑا اہم حصہ لیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کے تعمیری نقطہ نظر کی یہ وجہ نہیں کہ پاکستان نے ان سے کوئی فوجی دوستی یا کوئی اور معاہدہ کر رکھا ہے ان کا یہ موقف ۱۹۴۸ء سے چلا آتا ہے اور پاکستان نے ان سے کہیں ۱۹۵۴ء میں باہمی دوستی کے معاہدے کیے تھے۔ امریکہ میں خواہ ڈیموکریٹ پارٹی برسر اقتدار ہو یا ریپبلکن، اسی طرح برطانیہ میں خواہ لیبر پارٹی کی حکومت ہو یا قدامت پسندوں کی۔ ان سب حکومتوں نے ہمیشہ اس صداقت کا ساتھ دیا ہے کہ تنازع کشمیر کا کوئی فیصلہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک وہاں کے عوام کو اظہار رائے کی آزادی نہ دی جائے

دوران ۱۹۴۷ء میں کشمیر میں جو کچھ ہوا اس کے تمام پہلو غیر تعمیری، مشکوک اور مبہم نوعیت کے ہیں۔ چھوٹی حکومتوں نے بھی اس نقطہ نظر کی حمایت کی ہے۔ اگرچہ ان ممالک میں سے بعض کے تعلقات بھارت سے بے حد دوستانہ ہیں لیکن انھوں نے کبھی یہ محسوس نہیں کیا کہ اس مسئلے میں بھارت کی حمایت کی جائے۔ اقوام متحدہ سے باہر بھی اس جھگڑے کے متعلق ان تمام قوموں کا جو اقوام متحدہ کے اندر اس سے وابستہ رہی ہیں یہی رویہ رہا ہے کہ اس جھگڑے کا منصفانہ فیصلہ کیا جائے۔ لندن میں دولت مشترکہ کے اجلاس میں سیٹو اور مشرق وسطیٰ کی دفاعی تنظیموں کی کانفرنسوں میں بار بار دہرایا گیا ہے کہ کشمیر کی قسمت کا فیصلہ وہاں کے عوام کو اپنی مرضی کے مطابق کرنے کا اختیار دیا جائے۔ پاکستان میں گاہے بگاہے آنے والے مختلف ممالک کے سیاستدان بھی یہی کچھ کہتے رہے ہیں۔ صدر آئزن ہاور نے بھی یہ امید ظاہر کی ہے کہ ایسے علاقائی جھگڑے اقوام متحدہ کے اصولوں کی روشنی میں مستقل طور پر بہتر اور منصفانہ انداز میں طے ہو سکتے ہیں۔

بھارت اور پاکستان اس جھگڑے کا تصفیہ اپنے مابین بلا واسطہ گفت و شنید سے کیوں نہیں کر لیتے؟

یہ جھگڑا بھارت سے بلا واسطہ گفت و شنید سے حل نہیں ہو سکا کیونکہ ماضی میں ایسی گفت و شنید کی کوشش متعدد بار کی گئی ہے اور وہ ہر دفعہ مکمل ناکام ثابت ہوئی ہیں۔ حقیقت میں اس تنازع کو اقوام متحدہ میں لے جانے سے پہلے پاکستان نے بھارت سے بلا واسطہ بات چیت کر کے اس کا حل تلاش کرنا چاہا تھا۔ اس مسئلے کے اقوام متحدہ میں لے جانے کے بعد بھی پاکستان نے بلا واسطہ اور بالواسطہ طور پر بھارت سے گفتگو کر کے اس تنازع کا تصفیہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ ان گفتگوؤں میں پاکستان کا موقف یہی تھا کہ کشمیر سے ہر قسم کی فوج نکال کر وہاں استصواب رائے کرایا جائے۔ پاکستان کا یہ حق کسی قسم کی سودے بازی نہ تھی۔ ان کوششوں کو ذرہ برابر کامیابی نصیب نہ ہوئی۔

۱۹۵۰ء میں اقوام متحدہ کے نمائندے سر اوون ڈکسن نے دونوں ملکوں کے وزرائے اعظم کی ایک کانفرنس کا انتظام کیا تاکہ کشمیر سے افواج نکالنے کا خاکہ تیار کیا جائے۔ سر اوون کے بیان کے مطابق اس کانفرنس میں بھارت نے اس تنازع کے تصفیے کی ناقابل عمل اور ناممکن تجاویز پیش کیں جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ یہ کانفرنس ناکام ہو گئی۔

اسی سال پاکستان کے مرحوم وزیر اعظم لیاقت علی خاں پنڈت نہرو سے کئی دفعہ دہلی اور کراچی میں ملے اور ان سے کہا کہ کشمیر کی قسمت کا فیصلہ وہاں کے عوام کو غیر جانبدارانہ ووٹوں کے ذریعے کرنے کا موقع دیا جائے۔ پنڈت نہرو نے ہر مرتبہ اس کی مخالفت کی۔

۱۹۵۰ء اور ۱۹۵۱ء میں دولت مشترکہ کے وزرائے اعظم نے بھارت اور پاکستان کے وزیروں کو مسئلہ کشمیر پر متفق کرنے کی کوشش کی۔ ان کی مختلف تجویزوں سے پاکستان کے وزیر اعظم تو متفق تھے مگر پنڈت نہرو بات بات پر طیش میں آ جاتے تھے اور انھوں نے کسی طرح بھی کسی قسم کا تعاون نہ کیا۔

اس تجربے کے باوجود مسٹر محمد علی نے جو بعد میں پاکستان کے وزیر اعظم بنے، مسٹر نہرو سے ۱۹۵۳ء میں لندن، دہلی اور کراچی میں اس مسئلے پر طویل گفتگو کی۔ انھیں کانفرنسوں میں دہلی میں منعقد ہونے والی ایک کانفرنس میں کامیابی کی تھوڑی سی صورت دکھائی دی۔ جب دونوں وزرائے اعظم نے ۲۱ اگست ۱۹۵۳ء کو ایک مشترکہ بیان میں کہا کہ کشمیری عوام کی خواہشات کا احترام کرنے کا بہترین طریقہ کشمیر میں استصواب رائے ہے۔ اور ناظم استصواب کا تقرر اپریل ۱۹۵۴ء تک ہو جانا چاہیے۔ مگر پنڈت نہرو اس وعدے سے بھی بہت جلد منحرف ہو گئے اور اس کی یہ وجہ بتائی کہ امریکہ سے پاکستان کی فوجی دوستی اس وعدے کی تکمیل کے راستے میں روڑا بن گئی ہے۔

پنڈت نہرو کے اس رویے سے ہمت نہ ہارتے ہوئے پاکستانی رہنماؤں نے ۱۹۵۵ء میں ایک مزید کوشش کی جب کہ سابق گورنر جنرل مسٹر غلام محمد اور سکندر مرزا پاکستان اور بھارت کے مابین تمام جھگڑوں کا دوستانہ تصفیہ کرنے کی نیت سے دہلی گئے۔ پنڈت نہرو نے ان کے اس دوستانہ رویے کو محض کمزوری سمجھا اور ایک ہٹ دھرمی اختیار کر لی۔

عظیم الشان کام

نارتھ ویسٹرن ریلوے کے مرکزی مکینیکل ورکشاپ مغلپورہ کے ملاحظہ
کے بعد صدر مملکت جنرل محمد ایوب خاں نے ازراہ کرم فرمایا

مجھے اس کارگاہ میں ہونے والے عظیم الشان کام کو دیکھ کر از حد مسرت ہوئی ہے

ہم

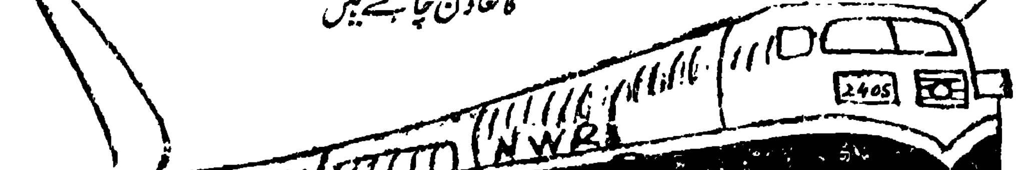
اپنی اس عزت افزائی میں اپنی ساری قوم کو شامل کرتے ہیں

ہم

خدمت قومی کے اس عظیم کام کے لیے اپنے آپ کو از سر نو وقف کرتے ہیں

ہم

اپنے ذمہ تمام خدمات کو خوش اسلوبی سے انجام دینے کے لیے آپ
کا تعاون چاہتے ہیں



نارتھ ویسٹرن ریلوے

۱۹۵۶ء میں چودھری محمد علی، پاکستان کے اگلے وزیر اعظم پنڈت نہرو سے لندن میں ملے اور کشمیر کے تصفیے کے متعلق ایک آخری کوشش کی لیکن پنڈت نہرو نے اُن کی ایک نہ سنی۔

ظاہر ہے یہ تجربے پاکستان کے لیے حوصلہ شکن تھے اور انھوں نے بلاواسطہ گفت و شنید سے اس جھگڑے کا فیصلہ کرنے کے تمام امکانات کو دھندلا دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی تنازع کا بلاواسطہ گفتگو سے فیصلہ کرنے کے لیے تحمل مزاجی صلح جوئی اور معاملات کو سمجھنے کی صلاحیتوں کی ضرورت ہے اور انھیں صلاحیتوں کا بھارتی قائدین میں کم از کم کشمیر کے مسئلے میں فقدان ہے۔

کیا کشمیر کے متعلق بھارت اور پاکستان میں مصالحت نہیں ہو سکتی؟

کیوں نہیں۔ لیکن اقوام متحدہ کا یہ فیصلہ کہ کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ وہاں کے عوام کی آزادانہ رائے شماری سے کیا جائے، فقط یہی مصالحت کا ایک طریقہ ہے۔ بھارت اس بنا پر کشمیر کا دعویدار ہے کہ کشمیر کے مہاراجہ نے اس کا الحاق بھارت سے کیا تھا۔ لیکن پاکستان جغرافیائی، اقتصادی، مذہبی اور انسانی نقطۂ نظر سے اس بنا پر اپنا حق جتاتا ہے۔ اس کا بہترین حل یہ ہے کہ دونوں دعوے تسلیم نہ کیے جائیں اور اقوام متحدہ کی نگرانی میں کشمیری عوام کو آزادانہ طور پر یہ موقع دیا جائے کہ کیا وہ بھارت سے ملنا چاہتے ہیں یا پاکستان سے۔ اس کے علاوہ کسی اور قسم کی مصالحت اخلاقی طور پر قابل قبول نہیں ہو سکتی کیونکہ کشمیری عوام محض جانور نہیں جنھیں سیاسی مطالبے کے مطابق جس طرف چاہے ہانک دیا جائے۔ تنازع کشمیر کا واحد حل یہی ہے کہ عوام کو حق خود ارادیت دیا جائے۔

مذکورہ بالا باتیں تنازع کشمیر کے جامع تصفیے سے متعلق ہیں۔ جہاں تک راہ عمل اور تفصیلات کا تعلق ہے تو کشمیر سے متعلق اقوام متحدہ کے بہت سے پہلے مصالحتی کوشش ہوتے تھے۔ مثلاً پاکستان کا یہ مطالبہ تھا کہ کشمیر کی موجودہ حکومت جو بھارتی حکومت کے زیر اثر ہے، ممنوع قرار دی جائے اور استصواب رائے کے زمانے میں وہاں ایک ایسی حکومت قائم کی جائے جو بھارت اور پاکستان دونوں کے لیے قابل قبول ہو۔ بھارت نے اس مطالبے کی مخالفت کی۔ اس بنا پر پاکستان نے اپنے مطالبے کو قدرے نرم کر دیا اور کہا کہ کشمیر کی حکومت بدستور قائم رہے لیکن اُسے کوئی حق نہ ہو کہ وہ ناظم استصواب کے کاموں میں دخل دے اور ... ناظم استصواب کے اختیارات کو محدود کرے۔ پاکستان کے مصالحت کی ایک اور مثال اس کا اس کشمیر کی فوج کا تسلیم ... ہے جو بھارتی فوج کے کشمیر سے اخراج کے بعد کشمیر میں رہ جائے گی۔ ڈاکٹر فرانک گراہم نے اس مسئلے پر طویل گفت و شنید کی تھی اور اُن کی رپورٹ بتاتی ہے کہ پاکستان نے ان کی بہت سی ایسی تجاویز بھی منظور کر لی تھیں جو بڑی حد تک ... ان کی اپنی تجویزوں کی ایک طرح سے ضد تھیں۔ ... قومی جھگڑے کا تصفیہ کرنے کے لیے کسی ملک کو دوسرے کی بات ماننی پڑتی ہے۔ مگر یہ اقدام اسی وقت مفید ثابت ہوتا ہے اگر دونوں فریقوں کا کسی بنیادی اصول پر یقین ہو۔ اگر ایک جانب خلوص کی کمی ہو جیسا کہ مسئلہ کشمیر میں بھارت کا رویہ رہا ہے تو اس صورت میں مصالحت کا کوئی نتیجہ نکلنا محال ہو جاتا ہے۔

کیا کشمیر کے متعلق بھارت پر زیادہ دباؤ ڈالنے میں یہ خطرہ تو پوشیدہ نہیں کہ وہ اشتراکی بلاک سے مل جائے اور مغربی طاقتوں کے خلاف ہو جائے؟

ایک آزاد ریاست کی حیثیت سے ... وقت سے، اور اگر زیادہ ... کیا جائے تو جنگ کو ... ماننے سے ...

غیر جانبداری کی پالیسی پر عمل کر رہا ہے۔ اس پالیسی پر عمل کرنے سے بھارت نے کئی ایسے اقدامات کیے ہیں جو بالواسطہ مغربی جمہوریتوں کے خلاف اور سوویٹ روس اور اشتراکی چین کے حق میں تھے۔ اگر بھارت کی یہ پالیسی کسی تصادم کی پیداوار ہونے کے بجائے موجودہ بین الاقوامی سیاسی کشمکش میں ایشیا کی حیثیت کو صحیح طور پر مدنظر رکھ کر مرتب کی گئی ہے تو اس صورت میں بھارت کو اس پر ثابت قدمی سے جا رہنا چاہیے اور اسے کسی ذاتی مفاد یا محدود مسئلے پر اثرانداز نہ ہونا چاہیے۔ تب اُسے دیانت دارانہ طور پر کوئی ایسی درخواست کرنے یا دھمکی دینے سے گریز کرنا چاہیے جس پر کاربند ہونے کا ہلکا سا بھی شائبہ ہو۔ لیکن حقیقت میں وہ ایسا نہیں کر رہا۔ اپنی ظاہرہ غیر جانبدارانہ پالیسی کے باوجود وہ مغربی جمہوریتوں کے اس اندیشے سے فائدہ اٹھا رہا ہے کہ کہیں بھارت اشتراکی بلاک سے نہ مل جائے۔ اس طرح وہ بالواسطہ یہ چاہتا ہے کہ اُس کی خوشامد کی جائے۔ وہ ایک طرح سے بلیک میلنگ پر اترا ہوا ہے۔ اُس کی یہ چال خود اس کے دعووں اور عزائم ہی سے عدم مناسبت نہیں رکھتی جن کا اسے دعویٰ ہے۔

اس دلیل کی مکمل بیان پیشگی ضروری ہے کہ بھارت کن حالات میں اشتراکی بلاک سے مل سکتا ہے۔ یہ واضح ہے کہ اگر بھارت اپنی موجودہ غیر جانبدارانہ پالیسی ترک کر کے اشتراکی بلاک میں پناہ گزیں ہو جائے تو یہ فقط خارجہ پالیسی کا تغیر ہی نہ ہوگا۔ اس سے اُس کے سارے عزائم کا نقشہ بدل جائے گا۔ یہ تغیر اس کی ابھرتی ہوئی جمہوریت کو بالکل تباہ کر دے گا۔ اس کا مطلب اُس کے اس عزم کا خاتمہ ہوگا کہ اُسے ایشیا کا لیڈر سمجھا جائے۔ اس کا مطلب اُس کی بین الاقوامی شخصیت کی موت ہوگا۔

یہاں یہ تجویز نہیں کیا جا رہا کہ اس قسم کا تغیر ممکن نہیں ہے۔ بات اس پہلو پر ہو رہی ہے کہ اگر بھارت نے کوئی اس قسم کا انتہا پسندانہ قدم اٹھایا تو اس سے اس کی معاشرتی اور اقتصادی زندگی کے ہر شعبے پر اثر پڑے گا۔ ہو سکتا ہے کشمیر پنڈت نہرو کی کمزوری ہو۔ ممکن ہے اُن کے بہت سے بین الاقوامی تعلقات پر کشمیر اثرانداز ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بھارت کی ساری خارجہ پالیسی کشمیر سے گردنی گئی ہو۔ یہ اشتعال جذبات کا سبب بھی بن سکتا ہے۔ لیکن جنگ کی عدم موجودگی کی صورت میں کشمیر کسی طرح بھی بھارت کی معاشرتی و اقتصادی زندگی کے کسی شعبے پر اثرانداز نہیں ہوتا۔ اس لیے اگر اس مسئلے کے حل کی خاطر بھارت پر زیادہ دباؤ ڈالا جائے تو اس بات کے بہت کم امکانات ہیں کہ وہ اشتراکی بلاک میں شامل ہو جائے۔ اس خطرے کا کوئی وجود نہیں۔

اس مسئلے پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اگر کشمیر کے سلسلے میں بھارت اور پاکستان کے مابین جنگ چھڑ گئی تو ہو سکتا ہے اس وقت بھارت اشتراکی بلاک سے مل جائے لیکن اگر اس جھگڑے کا فیصلہ صلح صفائی سے ہو جائے تو اس کا امکان نہیں۔ فقط اس صورت میں ممکن ہے کہ موجودہ حالات زیادہ بگڑتے جائیں۔ کشمیری اور پاکستانی عوام کے صبر کی طنابیں ٹوٹ جائیں، اقوام متحدہ اپنی بے بسی تسلیم کر لے اور کشمیری عوام تنگ آ کر بغاوت کر دیں۔ اگر کشمیر کے عوام نے بغاوت کر دی یا خط جنگ بندی کی دوسری طرف بسنے والے کشمیریوں کے جذبات مشتعل ہو گئے تو اس کے نتائج نہایت خطرناک ہوں گے۔ اس ناچار خطرے کا سدباب بے حد ضروری ہے۔ کشمیر اُن طاقتوں کی سیاست دانی کے لیے ایک چیلنج ہے جس کے باعث اقوام متحدہ کی بنیادیں استوار ہیں۔ اگر اس سیاست دانی کو کامیاب اور مفید انداز میں بروئے کار لانا مقصود ہے تو پھر باطل کا پردہ چاک کرنا ہوگا اور گریہ جھگڑوں کو نظرانداز کرنا ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی اس جھگڑے کا منصفانہ فیصلہ کرنے کے لیے تمام تر کوششیں کرنی ہوں گی۔

تنازعِ کشمیر کے پرامن اور منصفانہ فیصلے کے بین الاقوامی نتائج کیا ہوں گے؟

تنازعِ کشمیر کے پرامن اور منصفانہ فیصلے کے اثرات فقط کشمیر تک ہی محدود نہ رہیں گے۔ اوّل اس سے بھارت اور پاکستان کے مابین کھچاؤ کا ایک بڑا سبب دُور ہو جائے گا۔ یہ بات اُن کی معاشی حالت اور بین الاقوامی معاملات پر خوشگوار اثر ڈالے گی۔ چونکہ یہ دونوں ملک جنوبی اور مغربی ایشیا پر گہرا اثر ڈال سکتے ہیں۔ اس لیے ان کی باہمی ہم آہنگی دنیا کے لیے تعمیری نوعیت کی ہوگی۔

کشمیر نمبر ۱۹۶۰ء

دوم: اس جھگڑے کا تصفیہ اقوامِ متحدہ کے کردار کو بڑے واضح انداز میں محکم کر دے گا۔ اگر اقوامِ متحدہ کسی ایسے ملک سے دب جاتی ہے جو فوجی لحاظ سے بہت طاقتور ہے تو یہ ایک الگ بات ہے مگر ایسی بات شاید فوجی اقتدار کے حقائق کی روشنی میں ناگزیر ہو لیکن اس کے برعکس اگر یہ ادارہ کسی ایسے ملک سے دبتا ہے جو فوجی لحاظ سے کمزور ملک ہے تو یہ المیہ ناگزیر نہیں کہلا سکتا۔ اس صورت میں یہ اقوامِ متحدہ کی عزت اور اقتدار کو کمزور کرتا ہے۔ اسی لیے بہت سے تحمل مزاج عالمی ناظروں کا یقین ہے کہ کشمیر اقوامِ متحدہ کے لیے ایک امتحان ہے اور اس کا منصفانہ حل اس بین الاقوامی ادارے کی توقیر بڑھا دے گا۔

سوم۔ تنازعِ کشمیر کا حل امن کے ایک بنیادی اصول کو محکم تر کر دے گا۔ یعنی حقِ خود ارادیت کا اصول۔ اگر کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ غیر جانبدارانہ طور پر کرنے کا موقع دیا جائے تو اس طرح ایک بہترین مثال قائم ہو جائے گی جس سے حقِ خود ارادیت کا نظریہ اپنی بیش بہا افادہ اور فرسودہ صورت سے ایک واضح اور قابلِ عمل اصول کی شکل اختیار کر جائے گا اور یہ علاقائی جھگڑوں کے تصفیے کے سلسلے میں بیش قیمت اضافہ ہوگا۔

یوں کشمیر ایک عالمی تنازع ہے اور اس کا حل دنیا بھر کے لیے ضروری ہے۔

عمرؓ
فاروق اعظم

ایک عظیم انسان
ایک عظیم کتاب

اس کتاب کی اشاعت اسلامی تاریخ اور
مقاصدِ دین کی قابلِ صد ستائش خدمت ہے

مولانا غلام رسول مہر

محمد حسین ہیکل کی تصنیف عمر فاروق اعظم کو جو مرتبہ فنِ سوانح نگاری
اور اندازِ نگارش کے اعتبار سے عربی ادب میں حاصل ہے
اس کا تقاضا تھا کہ اسے حبیب اشعر جیسا مترجم ملتا اور مکتبہ جدید جیسا ناشر

علامہ نیاز فتح پوری

محمد حسین ہیکل —— حبیب اشعر —— مکتبہ جدید لاہور

۵۰۰ صفحات　بڑا سائز　بہترین معیاری پیش کش　قیمت ۲۰/

چودھری غلام عباس

آزادیٔ کشمیر کا دارومدار

کشمیر کا مسئلہ حد درجہ تار گرفتار ہونے سے اس وقت تک الجھا ہوا ہے۔ جن حالات میں لڑائی بند کرنے کا سمجھوتہ ہوا اس کے یہی نتائج ہو سکتے تھے کیونکہ بعض مغربی ممالک اسی طرح اس مسئلہ کو کھٹائی میں ڈال سکتے تھے اور وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ تمام مغربی جمہوریتیں عملاً اس معاملہ میں اپنی بین الاقوامی مصلحتوں کا شکار ہو گئیں۔ روس پہلے ہی بھارت کا حلیف تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سوائے ظاہرداری، دفع الوقتی اور اشک شوئی کے سیکورٹی کونسل عملاً غیر مؤثر ہو گئی اور اس کا یہ حکم اس وقت تک جوں کا توں ہے۔ کشمیر کے مسئلہ میں موجودہ بین الاقوامی پوزیشن یہ ہے لہٰذا:

بھارت کا رویہ آج تک غاصبانہ، غیر منصفانہ اور غیر حقیقت پسندانہ رہا ہے اس لیے اصلاح احوال کی توقع عبث ہے۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے مغربی جمہوریتیں نہ صرف اب عملاً غیر جانبداری کا ڈھنڈورا پیٹ رہی ہیں بلکہ غیر جانبدار ممالک کو جن میں بھارت سرفہرست ہے، ہر قیمت پر رام کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ صدر امریکہ کا حالیہ دورہ زیادہ تر اسی بنا پر تھا اور ظاہر ہے کہ ایسے حالات میں کشمیر کے معاملہ میں اُن سے کوئی خاص توقع نہیں ہو سکتی تھی۔ سیکورٹی کونسل چند مخصوص ممالک کی لونڈی بن چکی ہے اور اس کی پالیسی اب اپنی سابق جانشین لیگ آف نیشنز کی طرح کے مخصوص قومی و سیاسی مفاد پر مبنی ہے۔ کوریا اور ہنگری ایک طرف، اور الجیریا اور کشمیر دوسری طرف۔ یہ ممالک اس کونسل کے کھلی کارروائیوں کی متضاد مثالیں ہیں۔ پاکستان کی غلطی یا مجبوری یہ ہے کہ اُس نے نہایت دیانت داری اور وسعت قلبی سے بین الاقوامی معاہدوں کی پابندی کی اور آنکھیں بند کر کے اپنے حلیف ممالک کے وعدوں پر اعتبار کیا۔ آزاد کشمیر اب بھی پوری کامیابی سے کشمیر کو "الجیریا ثانی" بنا لینے کی سکت اور صلاحیت رکھتا ہے لیکن آزاد کشمیر بدقسمتی سے اصولاً اور اخلاقاً پاکستان کے بین الاقوامی معاہدوں کا اس وقت تک پابند ہے۔ غلام کشمیر نے گزشتہ ۱۲ سالوں میں ایثار اور قربانی کے جو جوہر دکھلائے ہیں، جن شدید اور نامساعد حالات کا سامنا کیا ہے اور جن روح فرسا مظالم اور شدائد کا مردانہ وار مقابلہ کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ اس وقت تک یہی مجاہدین غلام کشمیر کے پائے ثبات اور قوت و عزم مدافعت اور مقابلہ میں سرِمو فرق نہیں آیا۔ شیخ عبداللہ، ان کے رفقاء کار اور سینکڑوں اور کارکن سالوں سے زندان غلام کشمیر میں قید ہیں لیکن پانی سر سے اب اتنا زیادہ گزر چکا ہے کہ کشمیری اب پاکستان کا منہ تک رہے ہیں۔ اس کے باوجود بھی کشمیر کو پاکستان سے شامل کرنے کا ان کا عزم و ایمان ویسے کا ویسا ہے لیکن یہ بات کہ آیا وہ تن تنہا لاکھوں خونخوار بھارتی فوج کی موجودگی میں عملاً کچھ اور کر سکیں گے، محل نظر ہے۔

ان حالات میں کشمیر کی آزادی کا دارومدار صرف ہماری اپنی قوت عمل پر ہے۔ تحریک آزادی کشمیر ایک متبرک اور مقدس تحریک ہے اور ایک نہ ایک دن یہ عملی طور پر بروئے کار آ کر رہے گی اور غلام کشمیر انشاء اللہ پاکستان کے ساتھ ملحق ہو کر رہے گا۔

شیخ محمد عبداللہ

کشمیر اور بھارت کے وعدے

> ذیل میں شیخ عبداللہ کے اس بیان کی مکمل عبارت درج ہے جو ۱۷ فروری ۱۹۵۸ء کو دہلی اور سری نگر کے اخبارات میں بیک وقت شائع ہوا تھا۔ شیخ صاحب کی اپنی نظر میں بھی یہ بیان اُن کے نقطۂ نظر کی مکمل نمائندگی کرتا ہے۔

مسئلہ کشمیر کے بنیادی نکات

"اپنی ساڑھے چار برس کی نظربندی سے رہا ہونے کے بعد میں نے اپنا نقطۂ نظر اور ریاست کے سیاسی مستقبل کو پیش آنے والے مختلف مسائل کے ممکن حلوں کی تشریح کرنے کی کوشش کی ہے اور ذیل کے نکات کی بڑی حد تک وضاحت کرنے میں کامیاب رہا ہوں۔

(الف) جب تک ریاست جموں اور کشمیر کے مستقبل کا کوئی قطعی فیصلہ نہ ہوگا۔ یہاں کی سیاسی غیر یقینی فضا اور عوام کے موجودہ اقتصادی مصائب ختم نہیں ہو سکتے۔

(ب) بھارت اور پاکستان کے موجودہ کشیدہ تعلقات نقط ایشیا کی سالمیت کے لیے ہی ایک عظیم خطرہ نہیں ہیں بلکہ یہ ریاست کے عوام کی تباہی کی بھی علامت ہیں۔ ان کشیدہ تعلقات کی وجہ میں تنازعہ کشمیر پیش پیش ہے۔

(ج) ریاست کے مستقبل کا فیصلہ اس کے عوام کے ہاتھوں میں ہے اور یہ فیصلہ فقط اسی وقت مرادی شکل اختیار کر سکتا ہے اگر اہل کشمیر کو ایسے بین الاقوامی مسلمہ طریقوں کے تحت جنھیں متعلقہ طرفین اور یوں ساری دنیا تسلیم کرتی ہو غیر جانبدارانہ بین الاقوامی نگرانی میں حق خود ارادیت دیا جائے۔

مجھے اس بات کا گہرا دکھ ہے کہ بعض مفاد پرست لوگ میرے نقطہ ہائے نظر کو عوام سے چھپائے رکھنے کی خاطر ۱۹۵۳ء ہی سے دروغ گوئی کی تحریک میں مشغول ہیں۔ اور انھوں نے میرے نقطہ ہائے نظر کو مسخ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ یہ لوگ اپنے مفاد کے پیشِ نظر چاہتے ہیں کہ مسئلہ کشمیر اسی طرح لٹکتا رہے۔ حالانکہ وہ اس حقیقت سے بھی باخبر ہیں کہ ان کی مادرِ وطن کی ترقی اور بین الاقوامی امن اور آشتی کا یہی تقاضا ہے کہ یہ مسئلہ جلد از جلد حل ہو جائے۔

جو لوگ اس مسئلے کے منصفانہ اور اطمینان بخش تصفیے کے مخالف ہیں انھوں نے پانچ برس پہلے مجھ پر یہ ایک جھوٹا الزام لگایا تھا کہ میں نے ایک غیر ملکی طاقت سے ساز باز کی ہے۔ اب میری رہائی کے بعد انھیں لوگوں نے واضح وجوہ کی بنا پر مجھے کمیونسٹ ٹھہرانے کی تحریک چلا رکھی ہے۔ چونکہ گزشتہ پانچ برس میں مجھ پر کسی غیر ملکی حکومت سے سازش کرنے کا الزام ثابت نہیں ہو سکا۔ اس لیے اب انھوں نے میرے خلاف کمیونزم کا الزام گھڑا ہے۔ تاکہ بھارت میں اور دوسری ہر جگہ رائے عامہ کو میرے خلاف کیا جائے۔ اور اتنا عرصہ نظر بند رہنے سے لوگوں کے دلوں میں میرے لیے ہمدردی کے جو جذبات پیدا ہو گئے ہیں، انھیں کم کیا جائے۔

ان لوگوں کا ایک دوسرا مقصد یہ بھی ہے کہ اپنی بے کار کوشش سے میری زبان بندی کر دیں۔ میں اس حقیقت سے آگاہ ہوں کہ اِن لوگوں کے قبضے میں اخبارات، دولت اور دوسرے ذرائع ہیں۔ جن کی مدد سے وہ جھوٹ کو سچائی میں بدل سکتے ہیں۔ اس کے برعکس میں ان تمام سہولتوں سے محروم ہوں۔ اس کے باوجود میرا ذہن شک سے پاک ہے۔ کشمیر کے طویل جھگڑے کو ختم کرنے کے سلسلے میں میری جدوجہد کو کمیونزم سے کوئی واسطہ نہیں۔

حقیقت میں میری یہ کوشش ان لوگوں کی خدمت ہے۔ جو گزشتہ دس برس سے اس جھگڑے کے تصفیے کی عدم موجودگی میں اَن گنت مصائب کا سامنا کر رہے ہیں۔ اِس حقیقت سے کون منکر ہو سکتا ہے کہ اس تنازعہ کے تصفیے کی ناکامی فقط جموں اور کشمیر

کے مسلمانوں ہی کے لیے باعثِ مصیبت نہیں بلکہ ریاست کی ساری آبادی کے لیے تردّد اور تذبذب کا باعث ہے۔

اس تنازعہ کا تصفیہ فقط ایشیا کے امن اور سالمیت ہی کا سبب نہ ہوگا۔ بلکہ اُس ناسور کو بھی مندمل کرے گا جو بھارت اور پاکستان کی روحوں میں رِس رہا ہے۔ اب ہر دانا انسان یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ اس تنازعہ کو حل کرنے کے سلسلے میں میری کوشش کو کمیونزم کے مترادف سمجھنا کہاں تک انصاف پر مبنی ہے،

میرا یہ محکم یقین ہے کہ حقیقی سیکولرازم جمہوریت کی جان ہے۔ لیکن میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ عوام کی خواہشات کے مطابق کشمیر کے الحاق اور تنازعہ کشمیر کے قطعی فیصلے کا مطالبہ کس طرح سیکولرازم کے اصولوں کو مجروح کر سکتا ہے؟

یہ پہلا موقع نہیں ہے کہ مجھ پر کمیونسٹ ہونے کا الزام لگایا گیا ہے۔ گزشتہ ۲۰ برس میں شمالی ہندوستان کے بہت سے اخبارات نے اکثر مجھ پر یہ الزام لگایا ہے کہ ہر مرتبہ حقائق نے اسے جھوٹا ثابت کیا ہے۔ تحریک آزادی کشمیر کے دوران میں بہت سے واقعات اس حقیقت کے گواہ ہیں۔ ۱۹۳۱ء میں انھیں اخبارات نے یہاں تک لکھ دیا تھا کہ میں کشمیر کا بادشاہ بننے کا خواہشمند ہوں۔ اور مناسب وقت آنے پر اسی مقصد کے لیے سری نگر کی جامع مسجد میں ایک تاج بھی رکھا ہوا ہے۔

بہر حال انجام کار صداقت فتح یاب ہوئی اور تحریکِ آزادی ساری ریاست میں پھیل گئی۔ بعد میں یہ الزامات فقط جھوٹے ہی نہیں بلکہ حسد سے پُر ثابت ہوئے۔ علاوہ بریں ساری دنیا نے یہ حقیقت بھی سراہی کہ کشمیر کے غیر مسلموں کی جان و مال کی حفاظت کے لیے مسلمانانِ کشمیر نے جو طرزِ عمل اختیار کیا تھا۔ برصغیر ہند میں اس کی نظیر نہ تھی۔

آج ۱۹۵۸ء میں پھر وہی شر پسند لوگ اپنے پرانے ہتھکنڈے استعمال کر رہے ہیں اور حیرت کی بات ہے کہ آج ان میں وہ لوگ بھی شامل ہو گئے ہیں جنھوں نے ۱۹۴۷ء میں اپنے ہمسایوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگے تھے اور جنھوں نے مہاتما گاندھی کے ظالمانہ قتل پر جشنِ مسرت منایا تھا اور مٹھائی تقسیم کی تھی۔

اس کے باوجود مجھے یقین ہے کہ مجھے بدنام کرنے کی تازہ کوشش بھی ناکام ہوگی۔ اور میرے اقلیت پر مبنی ہم وطن (ہندو اور سکھ) ہمیشہ کی طرح مجھے اپنا ہی خواہ، بہترین دوست اور اُن کے جائز حقوق کا محافظ پائیں گے۔ میرے گزشتہ عمل سے ہر کوئی اندازہ کر سکتا ہے کہ مستقبل میں میرا رویّہ کیسا ہوگا؛ اس لیے میں ان افترا پردازانہ الزامات کا جواب دینے میں اپنا اور اپنے ہم وطنوں کا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔

جب مفاد پرستوں کے پروپیگنڈا کی اڑتی ہوئی گرد بیٹھ جائے گی تو میرے ہم وطن مجھے میرے گزشتہ اعمال اور ان واقعات کی روشنی میں جو اب تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں۔ دیکھ سکیں گے اور اس قسم کے شر انگیز پروپیگنڈے کا شکار ہونے سے انکار کر دیں گے۔

حقیقی سیکولرازم کی بنیاد اکثریت اور اقلیت دونوں طبقوں کے جائز حقوق کے تحفظ پر ہوتی ہے۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ ریاست کی اکثریت، ریاست کی اقلیت کے جائز حقوق کے تحفظ کو کمیونزم تصور نہیں کرتا۔ اور مجھے امید اور یقین ہے کہ اسی طرح ریاست کی اقلیتیں بھی ریاست کی اکثریت کے جائز حقوق کے تحفظ کو کمیونزم سے منسوب نہ کریں گی۔

وعدے کی خلاف ورزی

مجھ پر یہ الزام لگایا گیا ہے کہ میں نے بھارت سے کشمیر کے الحاق کے سلسلے میں وعدہ خلافی کی ہے۔ میں اپنی ساری قوت سے اس کی تردید کرتا ہوں۔ کہ وعدہ خلافی کی ذمہ داری کسی اور پر عاید ہوتی ہے۔ کوئی وعدہ یک طرفہ نہیں ہوتا۔ کشمیر کے الحاق کے معاملے میں بھارت اور کشمیر کی حکومتوں نے بعض ذمہ داریاں قبول کی تھیں۔ لیکن بدقسمتی سے بھارتی حکومت نے کشمیری حکومت کی بہترین جدوجہد کے باوجود اپنے حصے کی ذمہ داریاں پوری نہ کیں۔ جب مجھ پر وعدہ خلافی کا الزام لگایا جاتا ہے تو اس سوال کا جواب دینا میرا فرض بن جاتا ہے کہ اُن وعدوں کو جامۂ عمل نہ پہنانے کی ذمہ داری کس پر عاید ہوتی ہے؛ جو بھارتی حکومت

لئے قبائلیوں کے حملے سے لے کر ۱۹۵۳ء میں میری نظربندی کے وقت تک ریاست کشمیر کی حکومت سے کیے تھے۔

اس بات کو بہت ہوا دی جا رہی ہے کہ میں نے نومبر ۱۹۴۷ء میں سری نگر کے لال چوک میں ایک بہت بڑے مجمع کے سامنے پنڈت نہرو کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا لیکن اس سلسلے میں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ اسی اجلاس میں مجھ سے تھوڑی دیر پہلے پنڈت جی نے کیا کہا تھا: بھارتی حکومت کی پالیسی کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا:۔

"یہ یاد رکھنا چاہیے کہ کشمیر میں موجودہ جد و جہد مقبول عام قیادت میں کشمیری عوام کی حملہ آوروں کے خلاف جدوجہد ہے۔ اس نازک وقت جو آپ کی مدد کے لیے آئے ہیں ہماری فوجیں یہاں فقط آپ کے ملک کو خارجی حملہ آوروں سے بچانے کی خاطر ہیں۔ جونہی کشمیر حملہ آوروں سے آزاد ہو جائے گا۔ ہماری فوجوں کو مزید یہاں ٹھہرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ اور آپ اپنی خواہشات کے مطابق اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے حقدار ہوں گے۔"

لال چوک کے جلسے سے کچھ روز پہلے ۲ نومبر ۱۹۴۷ء کو وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنے ایک نشریے میں بھارتی حکومت کی پالیسی کا اعلان کرتے ہوئے کہا تھا:۔

"ہمیں یہ احساس دامن گیر ہے کہ ہم اس بحرانی دور میں کشمیری عوام کو اپنے خیالات کے اظہار کا پورا پورا موقع دیئے بغیر اس بات کا قطعی فیصلہ نہیں کریں گے۔ اپنی قسمت کا فیصلہ انجام کار انھیں کے ہاتھوں میں ہے۔ میں یہ بات بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اس تمام عرصے میں ہماری یہ پالیسی رہی ہے کہ جہاں کہیں کسی ریاست کا بھارت یا پاکستان سے الحاق کے متعلق تنازعہ ہے وہاں اس بات کا فیصلہ کرنے کا حق اس ریاست کے عوام کو پہنچتا ہے۔ اسی پالیسی کے تحت ہم نے کشمیر کے ساتھ معاہدہ الحاق میں ایک شق اس امر کی رکھی ہے۔"

جب بھارت کا آئین تیار ہو گیا تو ریاست جموں اور کشمیر کو ۱۔ دفاع ۲۔ معاملات خارجہ۔ اور ۳۔ ذرائع آمد و رفت اور تار و رسل کے سوا ایک خودمختار ریاست کا درجہ دیا گیا تھا (بھارتی آئین کا سیکشن ۳۷۰) یہ ایک اٹل وعدہ تھا۔

کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آج یہ تمام وعدے، اور یقین دہانیاں کیا ہوئیں؟ اور ان سے منحرف ہونے کی ذمہ داری کس پر عاید ہوتی ہے۔ وزارت عظمیٰ سے میری غیر قانونی اور غیر آئینی برطرفی اور مقدمہ چلائے بغیر مجھے عرصۂ طویل تک نظر بند رکھنا بذات خود اس امر کی افسوسناک مثالیں ہیں کہ مقدس وعدوں اور یقین دہانیوں کی کس قدر قدر و منزلت کی گئی ہے۔

میرے بدخواہ مجھے اس معاملہ میں بھی قصور وار گردانتے ہیں کہ میں "آئین ساز اسمبلی" کے فیصلے کو قطعی کیوں نہیں تسلیم کرتا؟ اس سلسلے میں یہ حقیقت فراموش نہ کرنی چاہیے کہ بھارتی حکومت نے خود الحاق کے معاملے میں آئین ساز اسمبلی کے فیصلے کو قطعی نہیں جانا۔

سر بی۔ این۔ راؤ مرحوم نے سکیورٹی کونسل میں بھارتی وفد کے لیڈر کی حیثیت سے ۹ مارچ ۱۹۵۱ء کو کہا تھا:

"میری حکومت کا یہی نظریہ ہے۔ البتہ آئین ساز اسمبلی اس سوال پر خواہ جو جی چاہے۔ اظہار کرے۔ مگر اسے اس سلسلے میں کسی فیصلے کا اختیار نہیں۔"

اور پھر ۲۹ مارچ ۱۹۵۱ء کو انھوں نے کہا تھا:۔

"اگر آئین ساز اسمبلی اس مسئلے پر کوئی رائے دینا چاہتی ہے تو اسے طبعی طور پر کوئی روک نہیں سکتا۔ لیکن یہ رائے نہ تو میری حکومت پر کوئی فرض، عاید کرتی ہے اور نہ ہی سیکورٹی کونسل کی کاروائی پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔"

نتیجۃً سیکورٹی کونسل نے ۳۰ مارچ ۱۹۵۱ء کو ایک قرارداد منظور کی جس کے ابتدائی حصے ذیل میں درج ہیں:۔

"یہ جانتے ہوئے کہ بھارت اور پاکستان کی حکومتوں نے

"اقوامِ متحدہ کے کمیشن برائے بھارت و پاکستان کی ۱۳ اگست ۴۸ء اور ۵ جنوری ۱۹۴۹ء کی قرار دادوں کی بہت سی باتیں تسلیم کر لی ہیں اور یہ بات مان لی ہے کہ ریاست جموں اور کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ اقوامِ متحدہ کی نگرانی میں جمہوری طریقے پر غیر جانبدارانہ اور آزادانہ طور پر ہوگا۔

"اور یہ مشاہدہ کرتے ہوئے کہ ۲۷ اکتوبر ۱۹۵۰ء کو آل جموں اینڈ کشمیر نیشنل کانفرنس" کی جنرل کونسل نے ایک قرارداد منظور کی تھی جس کی رو سے اس مقصد کے لیے ایک مجلس آئین ساز کی تشکیل تجویز کی گئی تھی کہ وہ ریاست جموں اور کشمیر کے مستقبل کے الحاق کا فیصلہ کرے گی۔

"ذمہ دار حلقوں کے بیانات سے مزید یہ جانتے ہوئے کہ جس علاقے سے اس مجلسِ آئین ساز کا انتخاب ہوگا۔ وہ فقط ریاست جموں اور کشمیر ہی ہوگی۔

"متعلقہ حکومتوں اور افسروں کو سیکورٹی کونسل کی ۲۱ اپریل ۱۹۴۸ء اور ۳ جون ۱۹۴۸ء اور ۱۴ مارچ ۱۹۵۰ء کی قرار دادیں اور اقوامِ متحدہ کے کمیشن برائے بھارت و پاکستان کی ۱۳ اگست ۱۹۴۸ء اور ۵ جنوری ۱۹۴۹ء کی قراردادوں کے اصول یاد دلاتے ہوئے کہ ریاست جموں اور کشمیر کا قطعی فیصلہ اقوامِ متحدہ کی نگرانی میں جمہوری طریقوں سے وہاں کے عوام کی خواہشات کے مطابق آزاد اور غیر جانبدارانہ استصواب رائے سے ہوگا

"یہ یقین رکھتے ہوئے کہ "آل جموں اینڈ کشمیر کانفرنس" کی جنرل کونسل کی سفارشات پر معرضِ وجود میں آنے والی مجلس قانون ساز اور اس مجلس کا ریاست کے مستقبل اور اس کے سارے یا کسی حصے کا الحاق کرنے کا فیصلہ مذکورہ بالا اصول کے مطابق ریاست کے مستقبل کے متعلق کوئی قطعی فیصلہ نہ ہوگا۔"

۱۹۵۵ء میں بھارتی پارلیمان میں اس موضوع پر ایک سوال ——— کا جواب دیتے ہوئے پنڈت جواہر لال نہرو نے ریاست کے الحاق کے متعلق کشمیر کی مجلسِ قانون ساز کے فیصلے کو غیر قانونی قرار دیا تھا اور کہا تھا کہ اس سے کشمیر کے بارے میں بین الاقوامی تنازعہ حل نہیں ہوتا۔

مقدمے کے حقائق

علاوہ مجلس قانون ساز کا یہ فیصلہ اُن تاریخی واقعات سے جداگانہ طور پر نہیں دیکھا جا سکتا۔ جو بعد میں ظہور میں آئے سوال فیصلے کا نہیں بلکہ اُن ذرائع کا ہے جن کی وساطت سے یہ فیصلہ معرضِ وجود میں آیا تھا۔ مجلسِ قانون ساز کو کام کرتے ہوئے اور مسئلہ الحاق کے متعلق کوئی قطعی فیصلہ کرنے کے درمیان پانچ برس کا عرصہ حائل ہو چکا ہے۔

مجلسِ قانون ساز جسے خطِ جنگ بندی کے اس طرف ۱۹۵۱ء میں عوام کی مدد حاصل تھی بعد میں اپنا اعتماد کھو بیٹھی۔ اس کی بڑی وجہ ۹ اگست ۱۹۵۳ء اور اس کے بعد پیش آنے والے واقعات ہیں۔

مجلس کی اولین صف کے اراکین کو قید میں ڈال دیا گیا اور انھیں اس کی کارروائی میں حصہ لینے سے روک دیا گیا۔ جن اراکین کو قید نہیں کیا گیا تھا۔ انھیں گرفتاری اور نظر بندی کی دھمکیاں دے کر مجلس کی کارروائی میں شرکت کرنے سے باز رکھا گیا۔ علاوہ بریں انھیں طرح طرح کے حسین لالچ بھی دیئے گئے۔

نتیجۃً وہ عوام کا اعتماد کھو بیٹھے۔ اب اِن اراکین اور انھیں منتخب کرنے والوں کے درمیان کوئی تعلق نہ رہا تھا۔

یہ حقیقت کبھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ دستور کو آخری شکل دینے سے پہلے اسمبلی کے لیڈر کو ایک گہری سازش کے تحت گرفتار کر لیا گیا تھا۔ اور جب عوام نے اس غیر قانونی اور ناجائز فعل کے خلاف آواز اٹھائی تو اُن پر تشدد کیا گیا اور سینکڑوں مردوں، عورتوں اور بچوں کا ناحق خون بہا دیا گیا۔ یہ تشدد کا دور کئی ماہ جاری رہا۔

پورے چار برس تک اسمبلی کے اراکین کو اس بات پر مجبور کیا گیا کہ وہ اسمبلی کی تشدد آمیز روش اختیار کریں۔ جن اراکین نے ایسا کرنے سے انکار کیا۔ انھیں زندان میں ڈال دیا گیا اور بعد میں یہ اعلان کر دیا گیا کہ دستور کو آخری اور مکمل شکل دے دی گئی ہے۔

سلامتیٔ طبع کے تقاضے

اگرچہ میں نظر بند تھا لیکن پھر بھی قومی مفاد کو پیشِ نظر رکھتے

ہوتے ہیں کہا ہے بجا ہے عوام اور متعلقہ لوگوں کو اُن خطرناک نتائج سے آگاہ کرنے کی کوشش کرتا رہا یہ مجلسِ دستور ساز کی طاقت کو نیشنل کانفرنس کے جماعتی تصادم کے لیے استعمال کرنے سے ظہور میں آتے تھے۔ ۳۰ ستمبر ۱۹۵۴ء کو ایک تار کے ذریعے میں نے مجلسِ قانون ساز کے صدر سے کہا کہ:

"نئے لوگوں پر اعتماد کے ووٹ پر غور کرنے سے پہلے مجھے اسمبلی میں بیٹھنے کی اجازت دی جائے۔"

اور پھر جب ۱۴ر اگست ۱۹۵۶ء کو دستور کو آخری شکل دی جانے والی تھی میں نے اسمبلی کے صدر کو ایک خط لکھا۔ جس میں میں نے کہا تھا :-

"۹ راگست ۱۹۵۳ء کے واقعے اور اسمبلی کے اندر اور باہر کے شرمناک واقعات سے موجودہ حکومت اور اسمبلی اپنے اراکین کا مکمل اعتماد کھو چکی ہے اور اب عوام کو ان پر سیاسی اور اقتصادی طور پر ذرہ برابر بھروسا نہیں رہا۔ یہ فریب دہی اور جعل سازی ہو گی کہ اس قسم کی جماعت عوام اور آئندہ نسلوں کے لیے بنیادی قانون تیار کرے۔ عوام کے احساسات کی اس سے زیادہ کیا قدر شناسی ہو سکتی ہے ؛ اس لیے میں خود پر یہ فرض سمجھتا ہوں کہ آپ کو ایسے عمل سے گریز کرنے کے لیے کہوں۔"

نیز ۲۴ راکتوبر ۱۹۵۶ء کو میرے ہم کار مرزا محمد افضل بیگ نے مجلسِ قانون ساز کو تنبیہ کے طور پر کہا تھا:-

"یہ مجلس مسئلۂ الحاق کا قطعی فیصلہ کرنے یا دستور کو تیار کرنے کی مجاز نہیں۔ کیونکہ یہ عوام کا اعتماد کھو چکی ہے۔"

لیکن یہ تنبیہیں بے کار ثابت ہوئیں۔ جس سے وہ اور لیجسلیٹو اسمبلی کے کئی دوسرے ممبر مجلس قانون ساز سے بائیکاٹ کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اس لیے ۹ راگست ۱۹۵۳ء کے بعد اِس اسمبلی نے دستور کے نام پر جو کچھ بھی کیا ہے وہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

ایک ایسے دستور کے متعلق جس کی تاریخ اور پس منظر اِس قسم کا ہو اِس سے فقط اُس کے بنانے والے ہی خوش ہو سکتے ہیں۔ لیکن اگر وہ یہ امید کریں کہ لوگ ایسے دستور کی عزت کریں۔ یا یہ دستور عوام کے احساسات کا عکس ہے تو یہ سراسر زیادتی اور فہم سے بالاتر بات ہے۔

جو لوگ ابھی تک یہ دعویٰ کرتے ہیں ــــ کہ ۹ راگست ۱۹۵۳ء کے بعد کا مجلسِ قانون ساز کا فیصلہ عوام کے اعتماد کا حامل ہے۔ انھیں استصواب رائے سے نہ ڈرنا چاہیے بلکہ انھیں تو اِس کا استقبال کرنا چاہیے۔

اِن حالات کے پیشِ نظر میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ مجلسِ قانون ساز کے فیصلوں کو تسلیم نہ کرنا کیوں اور کس طرح میرے لیے غداری کا سبب بن سکتا ہے۔

قول و قرار

ریاست کی ساری سیاسی تحریک کے دیرینہ اہم مقاصد میں سے ایک مقصد یہ بھی تھا کہ ریاست کے عوام کے لیے حقِ خود ارادیت حاصل کیا جائے۔ استصواب رائے کے ذریعے عوام کا اظہارِ خیالات ایک ایسا فارمولا تھا جسے متعلقہ طرفین نے قبول کیا تھا۔ سیکورٹی کونسل نے بھی یہی فیصلہ کیا تھا کہ اس کی زیرِ نگرانی آزاد اور خوشگوار فضا میں کرایا گیا ـــ استصوابِ رائے ہی سے اِس مسئلے کا ایماندارانہ حل ہو سکتا ہے۔ اور یہ اقوامِ متحدہ کے چارٹر کے عین مطابق ہو گا۔ متعلقہ طرفین اپنے اس وعدے کی متعدد بار تصدیق کر چکے ہیں۔

ریاست کے عوام استصوابِ رائے کے فارمولے کو اپنی دیرینہ خواہشات اور انھیں ۱۹۴۷ء سے درپیش ایک پیچیدہ مسئلے کا واضح حل سمجھتے ہیں۔ ان کا سیاسی نظریہ ستائیس سالہ طویل جدوجہد کی پیداوار ہے اور ان کا ہمیشہ یہ یقین رہا ہے کہ "صحیح حکمران عوام ہی ہوتے ہیں"۔

یہ ریاست جو روپے کی خاطر فروخت کی گئی تھی اور جو تقریباً ایک صدی تک غلامی کی لعنت کا شکار رہی۔ فطری طور پر اِس مطالبے کو سب سے زیادہ اہمیت دیتی رہی اور اُس نے

حقِ خودارادیت اور جمہوری حکومت کو اپنا سب سے بڑا مقصدِ حیات بنا لیا۔

انڈین نیشنل کانگریس ہمیشہ ہمارے حق میں آواز اٹھاتی رہی ہے اور ہمارے مطالبے کی حامی رہی ہے۔ اسی بنیادی اصول کے تحت کانگریس کے دوسرے رہنما عموماً اور پنڈت جواہرلال نہرو خصوصاً ریاست کی تحریکِ آزادی میں شروع ہی سے ہماری مدد کرتے رہے ہیں۔ اس سلسلے میں میں اُن قرار دادوں کا حوالہ دے سکتا ہوں جو "آل جموں اینڈ کشمیر نیشنل کانفرنس" کے سالانہ جلسے میں سوپور کے مقام پر ۱۹۴۵ء میں منظور کی گئی تھیں۔ میرے پاس اُن تقریروں کے حوالے بھی موجود ہیں جو اس موقع پر پنڈت جواہرلال نہرو، مولانا آزاد، خان عبدالغفار خان، خان عبدالصمد خان اور کانگریس کے دوسرے چوٹی کے لیڈروں نے کی تھیں۔ اس جلسے میں عوام کا حقِ خودارادیت کا مطالبہ قرار دادوں کا مرکزی خیال تھا۔

کانگرس کے لیڈروں نے ہر حال میں فقط ہمارے حقِ خودارادیت کے مطالبے ہی کی تصدیق نہیں کی بلکہ جب میں "کشمیر چھوڑ دو" کی تحریک میں قید ہو گیا تھا تو انھوں نے میری دفاع میں ہر طرح کی مدد کی تھی۔ پنڈت نہرو ہماری جدوجہد میں اپنے تعاون کی علامت کے طور پر نہ صرف احاطۂ عدالت میں قید ہوئے تھے بلکہ انھوں نے مسٹر آصف علی مرحوم اور دوسروں کے ہمراہ میرے کیس کی پیروی بھی کی تھی۔

اور جب برصغیر تقسیم ہوا اور قبائلیوں نے کشمیر پر حملہ کر دیا تو تب بھی اسی حقِ خودارادیت کے تحفظ کی بنا پر ہی بھارتی حکومت نے کشمیر میں اپنی فوجیں بھیجی تھیں اور جب ۲۶ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کو مہاراجہ ہری سنگھ نے ریاست کشمیر کا الحاق بھارت سے کر دیا تو بھارتی حکومت نے یہ الحاق قبول کرنے کے ساتھ ہی یہ بھی کہا تھا کہ کشمیری عوام اس معاہدے کو بدلنے کا حق رکھتے ہیں۔

عوام کے اس دیرینہ مطالبے کو تسلیم اور ان کی خواہشات کا احترام کرتے ہوئے اس وقت بھارتی گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ۲۷ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کو مہاراجہ کو لکھا تھا۔

"آپ نے جن خاص حالات کا ذکر کیا ہے۔ انھیں مدنظر رکھتے ہوئے میری حکومت نے بھارت ڈومینین سے کشمیر کا الحاق قبول کر لیا ہے۔ اپنی اسی پالیسی پر ثابت قدم رہتے ہوئے کہ جس ریاست کے الحاق کا مسئلہ باعثِ تنازعہ بن گیا۔ وہاں مسئلۂ الحاق عوام کی خواہشات کے مطابق طے کیا جائے گا۔ میری حکومت کی خواہش ہے کہ جونہی کشمیر میں امن اور قانون بحال ہو جائے اور یہ سرزمین حملہ آوروں سے خالی ہو جائے تو ریاست کے الحاق کا مسئلہ وہاں کے عوام کی خواہشات کے حوالے سے کیا جائے۔"

یہ وعدے کئی برس تک پارلیمنٹ اور اس کے باہر سیکورٹی کونسل کے سامنے، کشمیر اور دوسری جگہوں پر، عوامی جلسوں میں متعدد بار دہرائے گئے۔ اگر کوئی سنکی آدمی ان وعدوں کو لباسِ عمل پہنانے کے سلسلہ میں شک وشبہ کا اظہار کرتا تو ان کی پر زور تردید کر کے اسے خاموش کر دیا جاتا۔

تب ایک ایسا وقت آیا کہ بھارت اور پاکستان کی حکومتوں نے بلا واسطہ گفت وشنید سے یہ جھگڑا طے کرنے کی کوشش کی۔ مئی ۱۹۵۳ء میں ہم نیشنل کانفرنس کے اراکین سے کہا گیا کہ ہم بھی اس مسئلے کے حل کے لیے مختلف تجویزیں پیش کریں۔

کشمیری نقطۂ نظر

۹ر جون کو نیشنل کانفرنس کے سربراہوں کی ایک چوٹی کی کانفرنس نے متفقہ طور پر ذیل کے فیصلے منظور کیے اور پنڈت نہرو کو بھجوا دیے گئے۔

مختلف اجلاس میں بحث ومباحثہ کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ذیل کی تجویزیں ہی بھارت اور پاکستان کے مابین تنازعہ کشمیر کا ایک باعزت اور پرامن حل ہو سکتی ہیں۔

الف، ۴ جون ۱۹۵۳ء کے اجلاس کی کارروائی میں جو شرطیں تفصیل سے بیان کی گئی ہیں اُن کے تحت پوری ریاست میں استصوابِ رائے کرایا جاتا ہے۔

(ب) ساری ریاست کی آزادی۔

(ج) ساری ریاست کی آزادی، مگر خارجہ معاملات اور (دفاع) بھارت اور پاکستان کے ہاتھوں میں ہو۔

(د) ڈکسن کی تجویز۔ لیکن استصواب رائے والا علاقہ (آز)اد ہونا چاہیئے۔

بخشی (غلام محمد) صاحب اس بات کی بڑی پرزور حمایت کرتے تھے کہ (د) تجویز کو سرِ فہرست رکھنا چاہیئے اور اسی تجویز کو تنازعہ (کشمیر) کا باعزت اور قابلِ عمل حل سمجھنا چاہیے۔ لیکن مولانا سعید کا خیال تھا کہ تجویزوں کی ترتیب صحیح ہے اور یہی رہنی چاہیئے۔

بدقسمتی سے بھارت کے کرتا دھرتا ان تجویزوں کی قدر و قیمت سراہ نہ سکے۔ اور اس سلسلے میں بات آگے نہ بڑھ سکی۔ اسی اثنا میں حالات نے ایک گھناؤنی شکل اختیار کر لی اور ۹ اگست کو کشمیر میں دھاندلی برپا ہو گئی جس کا تذکرہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

میری نظر بندی کے بعد اگست ۱۹۵۳ء کے اختتام میں بھارت اور پاکستان کے وزرائے اعظم دہلی میں ایک دوسرے سے ملے۔ اور چند روز اسی موضوع پر بحث کرنے کے بعد کہ تنازعہ کشمیر کا بہترین حل کیا ہو گا۔ انہوں نے ایک مشترکہ بیان میں اس محکم رائے کا اظہار کیا کہ مسئلہ کشمیر ریاست کے عوام کی خواہش کے مطابق حل کیا جائے۔ اور لوگوں کی خواہش کا احترام کرنے کا بہترین طریقہ غیر جانبدارانہ استصواب رائے تھا۔"

بخشی غلام محمد نے ریاست کے وزیر اعظم کی حیثیت سے ۲۱ اگست ۱۹۵۳ء کو اخبارات میں ایک بیان دیتے ہوئے کہا تھا۔

" حقِ خود ارادیت کے اصول کی بنیاد پر ریاست جموں اور کشمیر کے مستقبل کے فیصلے کے متعلق میں دونوں وزرائے اعظم کے مشترکہ بیان کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ بھارتی حکومت کا یہ قدمی فیصلہ ہے۔ اور اسے ہمارا غیر مشروط تعاون حاصل ہے۔"

اس طرح استصواب رائے ایک ایسا حل بن جاتا ہے جو کشمیری اور بھارتی عوام کی جدوجہد آزادی سے نقطہ میل ہی نہیں کھاتا بلکہ جسے گاہے گاہے اس تنازع سے متعلقہ تمام لوگوں نے تسلیم کیا ہے۔

امن کی درخواست

متعلقہ لوگوں سے میری پُرجوش درخواست ہے کہ وہ گزشتہ وعدوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے بہ جمود توڑیں اور تنازعہ کشمیر کا ایک ایسا عملی حل سوچیں جو باعزت اور سب کے لیے باعث اطمینان ہو اور جو تحفظِ امن اور برصغیر کے عوام کی ترقی کا سبب ہو۔ وقت کا مطالبہ اس مسئلے سے خوف زدہ ہونے کے بجائے دلیری اور فراخ دلی سے اس کا سامنا کرنا ہے۔

پنڈت پریم ناتھ بزاز

کشمیر کا الحاق — ہندوستان کہ پاکستان

سوال: ——— میں کشمیر کے مستقبل کے بارے میں آپ کے خیالات جاننا چاہتا ہوں۔ کہا جاتا ہے کہ آپ پاکستانی ہیں اور مسلم لیگ کے نظریہ جداگانہ قومیت کو مانتے ہیں۔ میرے خیال میں بھی آپ کشمیر کے پاکستان سے الحاق کی حمایت کرتے ہیں۔ اور موجودہ صورت حال کو برقرار رکھنے کے سخت مخالف ہیں۔ مجھے اس پر سخت اچنبھا ہوا ہے کیونکہ یہ ایک عجیب سی بات ہے کہ آپ جیسا تعلیم یافتہ ہندو جو ایک کہنہ مشق سیاست دان وسیع اور روشن خیالی کے لئے کافی مشہور ہے اس قسم کے نرالے اور فرقہ وارانہ اعتقادات رکھتا ہو۔ میری رائے میں یہ باتیں ایک ذلیل بھگت کے شایان شان نہیں ہیں۔

جواب: ——— میرے سیاسی نظریات کے متعلق آپ نے جو باتیں بھی سنی ہیں وہ یا تو مسخ شدہ ہیں یا بے بنیاد۔ میں اس مفہوم میں پاکستانی نہیں ہوں جو پاکستان کا موجودہ برسر اقتدار طبقہ لیتا ہے میں مسلم لیگ کے دو قومی نظریہ کو بھی نہیں مانتا۔ میں نے لیگی تصورات کی ہمیشہ نکتہ چینی کی ہے اور دو قومی نظریئے کی بیس سال ہوئے عین اس وقت مخالفت کی تھی جب پہلی بار اسے قائداعظم محمد علی جناح نے مسلم لیگ کے سامنے اپنے صدارتی خطبے میں پیش کیا تھا۔ میں نے بلا مبالغہ ان گنت مضامین روزنامہ ہمدرد میں لکھے تھے جن میں ثابت کیا گیا تھا کہ اس نظریہ پر عمل کرنے میں سخت دشواری پیش آئے گی اور اس کے نتائج تباہ کن ہوں گے۔ میری کتاب "گاندھی ازم، جناح ازم اور سوشل ازم" میں جو شاید آپ نے نہیں دیکھی صاف لکھا ہے کہ برعظیم ہندوستان کے تمام باشندے ایک قوم ہیں ان کو محض مذہبی بنیادوں پر تقسیم نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ان میں یگانگت کی اور بہت سی چیزیں مشترک ہیں اس کے باوجود اور مسئلہ کے تمام پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے میں نے اس امر کی ہمیشہ تائید کی ہے کہ کشمیر کو صرف پاکستان کے ساتھ الحاق کرنا چاہیئے اور بھارت کے ساتھ شامل نہیں رہنا چاہیئے۔ میرا خیال ہے کہ ہندوستانی فوجوں نے ریاستی باشندوں کی مرضی کے خلاف کشمیر پر قبضہ جما رکھا ہے۔ یہ اقدام سراسر وحشیانہ چھینا جھپٹی ہے جو کسی صورت بھی برداشت نہیں کی جا سکتی

اس کا نتیجہ خطرناک ثابت ہوگا اس وقت تو صرف مسلمان ہی بھارتی حکومت کے مظالم کا تختہ مشق بنے ہوئے ہیں مگر آگے چل کر بدقسمتی سے اگر یہی صورت حال رہی تو ہندوؤں کو بھی اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا جو شاید مسلمانوں کی نسبت زیادہ تلخ ہو لہذا میں پکا ہندو اور سچا کشمیری ہونے کی حیثیت سے یہ مطالبہ کروں گا کہ ہندوستانی فوجیں میرا پیارا وطن چھوڑ دیں۔ کشمیری جنتا خود کسی ایک ملک کے ساتھ الحاق کا فیصلہ کرے گی۔ وہ مملکت ہندوستان ہو یا پاکستان۔ وہ صرف اس طرف جھکیں گے جدھر ان کا اپنا فائدہ ہوگا۔

آپ کے خیال میں قوم پرستی یا غیر مذہبیت صرف بھارت اور کانگریس کی اجارہ داری ہے۔ اور ایک سلجھے ہوئے قوم پرست کا عین فرض ہے کہ وہ کشمیر کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کی ڈٹ کر حمایت کرے، خواہ کشمیری عوام اس کو پسند کریں یا نہ کریں۔ معاف رکھئے! میں تعصب کی اس بیماری کا شکار نہیں ہوں۔ میں نے ہمیشہ کوشش کی ہے کہ میرے سیاسی نظریات معقول اور سائنٹیفک ہوں۔ میں گاندھوی نظریۂ قومیت کا اتنا ہی نکتہ چین ہوں۔ جتنا کہ دو قومی نظریہ کا۔ ہندو پریس نے اپنے ان تھک اور لگاتار پراپیگنڈے سے آپ کو اس فریب میں مبتلا کر رکھا ہے کہ کانگریس ہی صرف متحدہ قومیت کی علمبردار جماعت ہے اور وہ کسی فرقہ میں کوئی امتیاز روا نہیں رکھتی جمہوریہ ہند ایک ایسی لادینی حکومت ہے جہاں تمام فرقوں کے ساتھ ایک جیسا سلوک برتا جاتا ہے" نظر انداز کر کے اس حقیقت کو آپ نے زیو بانی سمجھ لیا ہے۔ آپ چاہتے ہیں کہ دوسرے لوگ بھی اندھا دھند آپ کی پیروی کرنے لگ جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ میرے خیالات آپ کے نزدیک قوم پرستی کے خلاف قابل گردن زدنی ہیں

آپ کو علم ہے کہ قوم پرست لیڈر اپنے ان لمبے چوڑے بولوں کے باوجود کہ ہندوستان اکھنڈ رہے گا جھٹ سے پاکستان کے قیام کو مان گئے۔ برعظیم کی تقسیم فرقہ وارانہ بنیادوں پر ہوئی۔ ملک کا وہ حصہ جہاں ہندو زیادہ تھے ہندوستان کہلایا اور جن علاقوں میں مسلم اکثریت تھی الگ کر کے

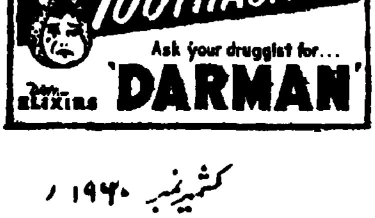
پاکستان بنا دیا گیا۔ کانگرسی مہاپرشوں نے دعوےٰ کیا کہ شمال مغربی سرحدی صوبہ کے باشندے گاندھی جی کے فلسفہ کے شیدائی ہیں۔ اور وہ کبھی پاکستان کے ساتھ شامل نہیں ہوں گے۔ اس قسم کا دعویٰ آسام کے ایک ضلع سلہٹ کے بارے میں بھی کیا گیا۔ یہاں بھی مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ لیکن جوں ہی رائے عامہ معلوم کی گئی حقیقت ظاہر ہو گئی۔ اور کانگرس کے سارے دعوے باطل ثابت ہوئے۔ لہٰذا صاف ظاہر ہے کہ ہندوستان برِ عظیم کے سارے مسلمانوں کے لئے متحدہ قومیت کے نظریہ میں کوئی کشش نہیں ہے اور وہ ہر صورت میں اپنا الگ وطن بسا کر رہنا چاہتے ہیں۔

کشمیر میں بھی مسلمان گنتی میں سب سے زیادہ ہیں۔ لہٰذا انصاف پسندی اور جمہوریت کا تقاضا ہے کہ یہ خطّہ بھی پاکستان کے ساتھ شامل ہو۔ سلہٹ اور شمال مغربی سرحدی صوبہ کے انجام کو جانتے ہوئے پھر یہ زعم کرنا سراسر نادانی ہے کہ کشمیری مسلمان ہندوستان کے ساتھ رہنا پسند کریں گے۔ چنانچہ اس بات کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے اور رفع شک کے لئے میں نے اور مجھ سے متفق لوگوں نے ستمبر ۱۹۴۷ء کے شروع میں اس امر پر زور دیا کہ کشمیری مُعتی بالغوں کو رائے دہندگی کا حق دے کر آزادانہ اور غیر جانبدارانہ استصواب سے سلجھائی جائے۔ اگر یہ بھی دلیش بھگتی، جمہوریت نوازی اور قوم پرستی نہیں ہے تو میں حیران ہوں کہ پھر اور کیا ہے؟

سوال: ——— پاکستان محض مسٹر جناح کی ہٹ سے بنا۔ اس کی حوصلہ افزائی برطانوی سامراج نے کی۔ اب جبکہ انگریز جا چکا ہے کسی صورت بھی کشمیر کو پاکستان کے ساتھ ناطہ جوڑنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ کیونکہ یہ خطہ ہندوستان کا جزو لاینفک ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر کشمیر ہندوستان سے کٹ گیا اور پاکستان کے ساتھ مل گیا۔ تو اس کے لئے بہت نقصان دہ ہو گا۔

جواب: ——— آپ نے تقسیم ہند کے اسباب کا جو جائزہ لیا ہے۔ وہ غلط ہے۔ آپ کے دعویٰ کی بنیاد عام ہندوؤں اور گاندھی بھگت قوم پرستوں کا وہ نقطۂ نظر ہے جس کو کانگرسی پریس اور راہنماؤں نے سختی سے اپنا رکھا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ کانگرس اور مسلم لیگ دونوں تقسیم کے ذمہ دار ہیں۔ اگر کانگرس کے کرتا دھرتا دوسرے فرقوں کے حقوق کی حفاظت کے دعووں کا عملی ثبوت دیتے اور کسی قسم کا امتیازی سلوک نہ برتا جاتا تو تقسیم کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ ہندوستان بھر میں کانگرس کی گدی گاندھی جی کے قبضے میں تھی۔ یہ تنظیم "ہندو جاگرتی" کے رنگ میں رنگ گئی۔ لڑائی تو انگریز کے خلاف لڑی جا رہی تھی لیکن مہاتما جی کا نعرۂ جنگ یہ تھا کہ ویدوں کے زمانے کی طرف لوٹ چلو۔ ملاشبہ پسماندہ اور مذہب زدہ ہندو عوام میں اس نعرے نے جذباتی بیداری پیدا کر دی لیکن یہ ضرر رساں بھی ثابت ہوا کیونکہ تمام غیر ہندو لوگ خاص کر مسلمان سخت متنفر ہو گئے۔ وہ فطرتاً محسوس کرنے میں حق بجانب تھے کہ انگریز کے چلے جانے کے بعد اگر کانگرس برسر اقتدار آ گئی تو ان کے دین اور ان کی تہذیب کو نقصان پہنچے گا۔ وہ اس نازک لمحہ کسی اچھے راہنما کی تلاش میں تھے جو ان کو قائد اعظم کی شخصیت میں مل گیا۔ قائد اعظم محمد علی جناح نے مسلمانوں کی اس دبی دبی سی خواہش کو دو قومی نظریئے کی صورت میں نمایاں کر دیا۔

گاندھی ازم اگر ترقی پسند اصول پر قائم رہتا۔ تو اس کا تانا بانا اس برِ عظیم کے تمام فرقوں کے اتحاد اور جذبۂ قوم پرستی سے تیار ہوتا۔ اور اس پر ہندو تہذیب کے احیا کا رنگ نہ چڑھایا جاتا تو مسلمان کبھی قائد اعظم کے دو قومی نظریہ کے قریب نہ جاتے۔ قائد اعظم کے الفاظ نے کروڑوں مسلمانوں پر جادو کا سا اثر کیا اس بات کا بین ثبوت نہیں ہے کہ جو کچھ وہ کہتے تھے اس میں سچائی پائی جاتی تھی؟ یہ کہہ دینا بالکل نادانی ہے کہ کروڑوں مسلمانوں نے جن میں بڑے بڑے دانشور بھی تھے مسٹر جناح کی پیروی اپنی مرضی سے نہیں بلکہ انگریز کے اشارے پر کی۔ اگست ۱۹۴۷ء تک مسٹر جناح کے پاس کوئی حاکمانہ اقتدار نہ تھا۔ حتّٰے کہ ان کی سیاسی جماعت مسلم لیگ بھی تنظیمی لحاظ سے کانگرس کے مقابلہ میں بہت کمزور تھی۔ اپنے نظریات کی نشر و اشاعت کے لئے ان کے پاس کوئی پریس بھی نہ تھا۔ پھر بھی وہ گاندھی نیشلزم کے خلاف تمام منتشر قوتوں کو جمع کر کے صف آرا کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اگر کانگرس جیسی بااثر جماعت میں کوئی بنیادی نقص نہ ہوتا تو مسلمان اس کو چھوڑ کر لیگ میں کیوں شامل ہوتے؟ واقعی اس تنظیم میں بنیادی نقص تھا اور وہ صرف ایک فراخ دل انسان ہی کو نظر آ سکتا ہے۔ وہ نقص یہ تھا کہ گاندھی ازم کی اساس ترقی پسندانہ قوم پرستی پر نہیں تھی۔ نہ ہی وہ فرقہ داریت سے بالاتر تھا۔ یہ تھا ایک تنگ نظر ہندو فرقہ پرستی ہے جس نے ہندوستانی قومیت



کا سوانگ رچایا ہوا تھا۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ کانگرس کے پراپیگنڈا کا فریب کھاتے ہوئے ہندو اس حقیقت کو سمجھ نہیں سکے۔ جوں جوں مسٹر جناح اور مسلم لیگ مقبول ہوتی گئی ہندو اپنی فرقہ پرستی کو گاندھی ازم میں چھپا کر مسلمانوں پر فرقہ پرستی کا الزام دھر کر انہیں برا بھلا کہتے رہے۔ ایک دوسرے کے خلاف اس ہم بازی نے دونوں قوموں میں ناچاقی کی خلیج وسیع کر دی اور پاکستان بن کر رہا۔ کانگرسی رہنماؤں نے تقسیم کو اس لئے نہیں مانا کہ انگریز کا دباؤ تھا بلکہ یہ گاندھی جی کے اس فلسفہ کا قدرتی ردعمل تھا جس پر وہ کاربند چلے آ رہے تھے۔ مسٹر جناح کے نظریۂ جداگانہ قومیت کو پیش کرنے سے کئی برس پہلے سے ہندو خود دھیرے دھیرے اسی نصب العین (ہندو فرقہ پرستی) کو اپنا چکے تھے۔ اس کی واضح دلیل یہ ہے کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن جو تقسیم ہند کے ڈرامے کا رسوائے عالم فنکار بھی ہے کانگرسی راہنماؤں کی رائے میں اب تک ہندوستان کا سچا دوست سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ تشکر اور دوست نوازی کے جذبے میں سرشار ہو کر ان راہنماؤں نے اس کو گورنر جنرل ایسے عہدہ کے سنگھاسن پر بھی بٹھایا۔ لہذا یہ کہنا کہ تقسیم کو انگریزی سامراج کے دباؤ سے مجبور ہو کر کانگرسی مہاپرشوں نے مان لیا تھا کبھی قابل قبول نہیں ہو سکتا

جو کچھ برِ عظیم ہندوستان کے معاملہ میں بیت چکا ہے وہی کچھ جلد یا بدیر کشمیر کے معاملہ میں بھی کانگرسی راہنماؤں کو دیکھنا ہے۔ ان کو نظر آئے گا کہ ان کی ساری تگ و دو کے باوجود ریاستی مسلمان ہندوستان کے ساتھ الحاق کے سخت مخالف ہیں۔ ان کے لئے پاکستان میں قدرتی کشش ہے۔ اس کی کئی ایک وجوہات ہیں۔ خاص کر تمدنی یگانگت اور مذہبی رشتے نے ان کو پاکستانی عوام کے بالکل قریب کر رکھا ہے۔ یہی اسباب کانگرسی لیڈروں کو مجبور کریں گے کہ وہ ریاست کشمیر سے دست بردار ہو جائیں۔ تقسیم سے پہلے کشمیر واقعی ہندوستان کا ایک حصہ تھا لیکن اب دونوں کا ناطہ مخدوش اور ناپائیدار ثابت ہوگا۔ خطہ کشمیر پاکستان کا ایک قدرتی جزو ہے اس کو ہر صورت میں پاکستان کے ساتھ رہنا چاہیئے۔ آپ کا یہ کہنا کہ ہندوستان سے الگ ہو کر پاکستان میں شامل ہو جانے سے کشمیر تباہ ہو جائے گا۔ ایک خوش فہمی سے زیادہ نہیں ہے جس میں آپ کو نام نہاد قوم پرستی کی پہیلی نے مبتلا کر رکھا ہے۔ ورنہ حقیقت کچھ اور ہی ہے۔

سوال:۔۔۔۔ مہاتما گاندھی کی تعلیمات ہمہ گیر تھیں انہوں نے تمام قوموں اور طبقوں کی آزادی ترقی اور آسودگی کے لئے جنگ کی ان کے مقابلہ میں جناح صاحب ایک فرقہ پرست اور تنگ خیال لیڈر تھے۔ ہر دو میں کوئی وجہ مشترک نظر نہیں آتی۔ اگر مسلمان مذہبی دیوانے نہ ہوتے اور ان میں وطن کی محبت کا تھوڑا سا بھی جذبہ ہوتا تو وہ ضرور مہاتما جی کی قیادت قبول کرتے۔ مسٹر جناح کی غلط راہنمائی نے ان کو ایسی راہ پر لگایا جس نے یہ ساری تباہی مچائی ہزاروں انسان مارے گئے۔ لاکھوں بے خانماں ہو گئے کیا ایسے حالات میں کشمیری مسلمانوں کو مسٹر جناح کی بنائی ہوئی راہ چھوڑ کر گاندھی مت ایسا شاندار اور ہمہ گیر عقیدہ اختیار نہ کرنا چاہیئے؟

جواب:۔۔۔ آپ نے گاندھوی فلسفہ اور قائد اعظم محمد علی جناح کے نظریہ کے متعلق جو کچھ خیال آرائی کی ہے یہ ایک معمولی درجے کے جرنلسٹ کا سطحی جائزہ ہے لیکن ایسے شاہکار نکتہ رس اور سمجھدار لوگوں کے نزدیک کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ اگر ہم دونوں راہنماؤں کے سیاسی نظریات کا مطالعہ کریں تو پتہ چلے گا کہ دونوں میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ دونوں کا پس منظر ایک جیسا ہے۔ اگر کوئی اختلاف ہے تو وہ یہ ہے کہ ایک ہندوؤں کا لیڈر رہے اور دوسرا مسلمانوں کا۔ اس لئے دونوں نے اپنے راستے الگ الگ راہ عمل اختیار کی لیکن بنیادی طور پر دونو ایک ہی مقصد کے لئے لڑ رہے تھے۔ گاندھی جی کی سیاسی تعلیمات ہمہ گیر ہرگز نہیں ہیں سب سے قطع نظر یہ صرف ایک تڑپ ہی تھی جو مہاتما جی ہندو جاتی کی آزادی کے لئے اپنے سینے میں دبی رکھتے تھے۔ یہ ایک رجعت پسندانہ قوم پرستی تھی جس کی آبیاری ویدوں اور پرانوں کے پراچین عہد سے کی جا رہی تھی۔ بھلا ایک غیر ہندو کو اس سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ گاندھی جی کی وقت بے وقت بیان بازیوں کے باوجود یہ کانگرسی نیشنل ازم عملی لحاظ سے سب کے لئے نہ تھا۔ اس کی بنیاد تنگ دلی، جبر اور غیر ہندوستانی نسلوں کے ساتھ نفرت پر رکھی گئی تھی۔ اس ماحول میں مسلمان بھی صرف اس لئے باغی قرار دیئے گئے کہ ان کا مذہب و تمدن ہندوستانی نہ تھا۔ بلکہ عرب سے آیا تھا۔ یہ نقطہ نگاہ ہندوؤں کے ذہن میں کافی پکا ہوتا گیا اور آخر کار جناح ازم کا ظہور اس کا ردعمل تھا۔ جس طریقے اور جن اصولوں پر گاندھی جی نے ہندوؤں کو ابھارا اسی طریقے اور انہی بنیادوں پر قائد اعظم نے مسلمانوں کو ابھارا۔ انہوں نے بھی اسلامی مذہب ماضی کی شاندار تاریخ کا حوالہ دے کر [illegible]

قرابت پرستی اور قوم پرستی کے رجحانات کو گرمایا۔ فرق یہ تھا کہ جناح صاحب زیادہ باتیں نہیں کرتے تھے۔ نہ ہی انہوں نے کبھی اپنے آفاقی ہونے کا عالم فریب دعوے کیا۔ وہ اگرچہ کم گو تھے مگر بے باک۔ بات تولے پاؤ رتی کی کھری کھری کہتے ہی تھے اور اس پر سختی سے عمل بھی کرتے تھے غرض وہ ایک ہوشیار سیاست دان تھے۔

صرف وہی لوگ جن کی نگاہیں دور بین نہیں ہیں یہ خیال کر سکتے ہیں کہ قائد اعظم محمد علی جناح اور مہاتما گاندھی بنیادی طور پر ایک دوسرے کی ضد ہیں حقیقت میں یہ ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔ اگر اکھل بھارتی اور سرمایہ دار ہندو حرص و طمع کے باعث اندھے نہ ہو گئے ہوتے اور ان کے دل میں مسلمانوں کے مفاد کے تحفظ کا جذبہ اور ان کے عقائد کا احترام ہوتا تو اسے ہندوستان میں قائد اعظم اور مہاتما جی ہی دو ایسی نازہستیاں تھیں جو ایک دوسرے کی مخالف رخ چلنے کی بجائے متحد اور متفق ہو جاتیں۔

سوال:— آپ جانتے ہیں کہ اکتوبر ۱۹۴۷ء میں قبائلیوں نے کشمیر پر حملہ کیا۔ لوگوں کو لوٹا اور مارا، عورتوں کی آبروریزی کی۔ اس تاخت و تاراج میں پاکستان کا ہاتھ تھا۔ مہاراجہ نے صرف مجبور ہو کر ہندوستان سے مدد مانگی۔ کشمیر کے عوام کے صحیح نمائندوں نے جو نیشنلسٹ ہیں، اس کی تائید کی۔ ہندوستان نے اپنی فوجیں بھیج کر ہمیں اس غارت گری سے بچا لیا اور اس طرح اس نے انسانیت کا احترام کر کے اپنی اخلاقی سربلندی کا ثبوت دیا۔ اس کے برعکس پاکستان نے قبائلیوں کی نہ صرف اخلاقی حمایت کی بلکہ عملی طور پر ان کی کمک کے لئے اپنی فوجیں بھیجیں۔ ہم ہندوستان کی مروت اور پاکستان کی دشمنی کو کیسے فراموش کر سکتے ہیں۔ سمجھدار لوگوں کی نگاہوں میں ہندوستان کا اخلاقی موقف بہت اونچا ہے۔

جواب:— بیشتر اس کے کہ ہم کسی پر یک طرفہ جرم عائد کریں یا یہ بات معلوم کریں کہ حملہ آور کون ہے؟ ضروری ہے کہ ہم اکتوبر ۴۷ء کی قبائلی مداخلت سے پہلے اور بعد کے حقائق کا جائزہ لیں۔ بھارت کے اکثر لوگ ایسا نہیں کرتے۔ چنانچہ وہ ہمیشہ غلط رائے قائم کرنے کی ٹھوکر کھاتے ہیں۔

سب جانتے ہیں کہ ہندوستان جون ۱۹۴۷ء میں ماؤنٹ بیٹن تجویز کے مطابق مذہبی بنیادوں پر تقسیم کیا گیا تھا۔ اس تجویز میں کشمیر کا مستقبل بالکل واضح تھا اس کے لئے سوائے پاکستان کے ساتھ الحاق کے کوئی اور چارہ نہ تھا لیکن فوراً بعد کانگرسی راہنماؤں نے نتائج سے آنکھیں بند کر کے مسلم اکثریت کی خواہش کے خلاف ہندیونین سے ناطہ جوڑنے کے لئے اکسانا شروع کیا۔ اس سال مہاتما گاندھی اگست کے پہلے ہفتہ میں کشمیر آئے اور مہاراجہ کے ساتھ بات چیت کر گئے۔ جیل میں نیشنلسٹ اراکین سے بھی بات چیت ہوئی۔ وہ بھی اس شرانگیز اور تباہ کن منصوبہ کو مان گئے۔

مہاراجہ سے کہا گیا کہ وہ غیر جانبداری کا سوانگ رچائے رکھے لیکن راج دربار کی پالیسی نے چغلی کھائی کہ ہوا کا رخ کدھر ہے۔ عین اس موقع پر نیشنل کانفرنس اور مسلم کانفرنس دونوں جماعتوں کے لیڈر جیلوں میں تھے۔ اول الذکر پر بغاوت کا الزام تھا اور مؤخر الذکر صرف ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے کسی حکم کی خلاف ورزی کی پاداش میں نظر بند تھے۔ نیشنلسٹ لیڈر کافی لمبی میعاد کے لئے سزا یافتہ قیدی ہونے کے باوجود اچانک رہا کر دیئے گئے لیکن مسلم کانفرنس کے کارکن جو محض نظر بند تھے دانستہ آہنی سلاخوں کے پیچھے رکھے گئے۔ وہ تمام اخبارات جنہوں نے الحاق پاکستان کے لئے زور دیا اور ہندیونین کے ساتھ ناطے کی مخالفت کی یا تو بالکل بند کر دیئے گئے یا قانونی شکنجے میں کس دیئے گئے۔ دوسری سیاسی جماعتوں کے راہنماؤں کی زبان بندی ہوئی کئی ایک قید کر دیئے گئے۔ بہت سے جلاوطن ہوئے۔ صرف نیشنلسٹ لیڈر ہی مزے میں تھے۔ یہ کھلم کھلا میٹنگیں کر سکتے تھے اور جلسے جلوس نکال سکتے تھے۔ اسی دوران میں پونچھ کے نہتے لوگوں پر ڈوگرہ فوجوں نے گولیاں برسائیں اور کئی گاؤں جلا دیئے یہ سارا واقعہ اگست، ستمبر، اور اکتوبر میں رونما ہوا۔ مہاراجہ کو ساری صورت حال سے کئی بار خبردار کیا گیا لیکن بے سود ثابت ہوا۔ ۲۲ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو قبائلی مجبور ہو کر اپنے کشمیری مسلمان بھائیوں کی مدد کے لئے آ گئے۔ یہ بالکل خستہ اور شکستہ حالت میں تھے۔ ان کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ ان کو حملہ آور کیسے کہا جا سکتا ہے میں کسی قبائلی کے وحشیانہ لوٹ کھسوٹ کے انفرادی فعل کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھتا لیکن ہمیں معلوم کرنا چاہیئے کہ اس اجتماعی حیثیت میں اس یلغار میں کون سا جذبہ کارفرما تھا۔ وہ صاف عیاں ہے وہ چاہتے تھے کہ کشمیری عوام کو مہاراجہ کے مظالم اور ہتھ چھٹ نیشنلسٹ کارکنوں کی لوٹ مار سے چھڑایا جائے پھر ہمیں اس حقیقت کو کبھی نظرانداز نہیں کرنا چاہیئے کہ ہندوستانی فوجوں نے غارت گری اور عورتوں کی آبروریزی کچھ کم نہیں کی۔

اس صورت میں جبکہ ہندوستان فرقہ وار لحاظ سے تقسیم ہو چکا تھا کانگرسی لیڈروں کا کوئی حق اخلاقی نہ تھا کہ وہ کشمیر پر جبڑے دوڑیں خصوصاً

وہ ریاست میں کہ انہوں نے جوناگڑھ کے اعلان الحاق پاکستان کو تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ لہٰذا پنڈت جواہر لال نہرو کی نئی نئی تاویلوں کے باوجود بھارت کا کشمیر پر قبضہ جمائے رکھنا آئینی اور جمہوری لحاظ سے صریحاً ناجائز ہے یہ افسوسناک واقعہ ہمیشہ تاریخ ہند کے دامن پر ایک بدنما دھبہ بن کر رہے گا۔

سوال: ــ تو پھر کشمیر کی گتھی پر امن اور دوستانہ طریقے پر سلجھانے میں آپ کون سا طریقہ کار تجویز کر سکتے ہیں؟

جواب: ــــ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں۔ کہ یہ مسئلہ ہر بالغ کو رائے دہندگی کا حق دے کر آزادانہ اور غیر جانبدارانہ استصواب رائے سے حل کیا جائے۔ اس مقصد کے پیش نظر ضروری ہوگا کہ تمام غیر کشمیری فوجیں خواہ باقاعدہ ہوں یا بے قاعدہ پاکستان کی ہوں یا ہندوستان کی، ریاست سے نکل جانی چاہئیں۔ ریاست کا تمام نظم و نسق نیک نام و غیر جانبدار ہاتھوں میں سونپا جائے۔ تمام سیاسی پارٹیوں کو پبلک کے سامنے نقطۂ نظر پیش کرنے میں سہولت ملنی چاہئے۔ کسی غیر ریاستی فرد یا جماعت کو ریاست میں داخل ہو کر کسی قسم کے سیاسی پراپیگنڈے کی اجازت نہیں ہونی چاہئے۔ اس کے بعد عوام جو بھی فیصلہ کریں متعلقہ لوگوں کو اس کے سامنے جھکنا ہوگا۔

سوال: ــــ کیا آپ اس امر سے بے خبر ہیں کہ کشمیری مسلمان مسلم کانفرنس کے مذہبی نعرہ کی رو میں بہہ سکتے ہیں۔ ہمارے ملک کے مسلمان عوام تعلیمی اور ذہنی تربیت کے لحاظ سے بہت پس ماندہ ہیں۔ ان میں صحیح ترقی و آزادی کی قدر و قیمت پرکھنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ معاملہ کی اہمیت کے احساس سے اپنا ووٹ استعمال نہیں کریں گے بلکہ پنے ہم مذہب اور پاکستانی خیال کے لوگوں کی جذباتی اپیل سے متاثر ہو کر رہیں گے میں آپ سے اس بات میں متفق ہوں کہ بہت تھوڑے ایسے مسلمان ہوں گے جو ہندوستان کو اپنا ووٹ دیں گے لیکن پھر بھی میں کہوں گا کہ ہندوستان کے حق میں ووٹ دینا ان کے قومی مفاد کا ضامن ہوگا۔ ہندوستان ایک جمہوری، غیر مذہبی اور ترقی خواہ نظام حکومت ہے۔ کانگرس کے لیڈر اس کا بارہا اعلان کر چکے ہیں۔ ہمارا دستور و آئین ان اعلانات کے مطابق تیار کیا گیا ہے۔ اس نظام حکومت میں ذات پات، رنگ و نسل اور عقیدے کے تمام امتیازات کو مٹا دیا گیا ہے اس کے مقابلہ میں مسلم لیگی لیڈر ہر گھڑی یہ اعلان کرتے ہیں کہ شریعت اسلامیہ کے اصولوں پر پاکستان ایک مذہبی نظام حکومت ہوگا۔ یہ تو سراسر نفرت انگیز اور رجعت پسندانہ اقدام ہے۔ گویا یہ ۱۹۴۷ء ایسے دور جدید میں کٹر ملائیت قائم کر رہی ہے۔ ایک جمہوریت پرست اس قسم کے نظام حکومت کے ساتھ کس طرح وابستگی کا حامی ہو سکتا ہے۔ ایک غیر مسلم خاص کر ہندو ایسے ماحول میں رہنے کو کبھی تیار نہیں۔ مسلمانوں کو حق خود ارادیت دینا اچھی بات ہے۔ لیکن جب ہم جانتے ہیں کہ وہ مذہبی جنون کے اثر میں آ کر غلط فیصلہ کریں گے تو ہمارا فرض ہے کہ ان کو نیک و بد سمجھا کر سیدھی راہ پر لایا جائے۔

جواب: ــ اب آپ نے بہت کمزور موقف کا سہارا لینا شروع کر دیا ہے۔ آپ کو یہ حق پہنچتا ہی کس طرح ہے کہ آپ خواہ مخواہ مسلمانوں کی مرضی کے خلاف ان کی بہتری کی ذمہ داری سنبھالتے پھریں۔ یہ تو کسی کے پیچھے میں ٹانگ اڑانا ہے۔ آپ کو بتلا دیا گیا ہے کہ تجویز شدہ استصواب رائے عامہ کے وقت ہر فرد یا جماعت کی طرح آپ کو اپنے نظریات کے پرچار کا پورا موقعہ ملے گا۔ اگر آپ کا یہی خیال ہے کہ ہندوستان ایک جمہوری آسودہ حال اور ترقی پسند نظام حکومت ہے اور اس کے برعکس پاکستان ایک خالص مذہبی ادارہ کی حیثیت رکھتا ہے تو اس نظریے کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کر کے کشمیری عوام کے روبرو پیش کرنے کی آپ کو مکمل اجازت ہوگی۔ پروپیگنڈے کی رو میں مراعات جو ہر فریق کو حاصل ہوں گی آپ بھی ان سے استفادہ حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ ایک بے دلیل اور جمہوریت کش مطالبہ ہے کہ کشمیری عوام کو محض اس لئے حق خود ارادیت سے محروم کر دیا جائے کہ ان کا مذہبی اپیل کی رو میں بہہ جانے کا اندیشہ ہے۔ اس لئے ان کو زبردستی ایک ترقی خواہ اور جمہوری حکومت کا غلام بنا دینا چاہئے۔ ہر جماعت کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنے مطمح نظر اور سیاسی عقیدے کا کھلم کھلا پرچار کرے۔ باقی رہا اپنے مستقبل کا فیصلہ تو وہ صرف کشمیری عوام ہی کر سکتے ہیں۔ خواہ یہ فیصلہ غلط ہی کیوں نہ ہو۔ یہ ہے جمہوریت کے بنیادی اصول کا صحیح مدعا۔ جن پر میں آج تک قائم ہوں۔

آپ کے سوال کا پورا جواب دینے سے پہلے دو چیزوں کا جائزہ لینا چاہتا ہوں۔ اوّل یہ کہ وادیٔ کشمیر میں آج کل ایسے حالات پیدا کر دیئے گئے ہیں کہ وہاں اس وقت کوئی جماعت پاکستان کی حمایت میں پراپیگنڈہ نہیں کر سکتی اس کے برعکس ہندوستان کے حامی نیشنلسٹوں کو کھلی چھٹی ملی ہے پچھلے تین سالوں سے وہ اپنے خیالات کا اعلانیہ پرچار کر رہے ہیں حکومت کا سارا نظم و نسق ان کے قبضہ میں ہے۔ وہ مخالف فریق کی آواز کو جبر سے

سے دبائے ہوئے ہیں۔ گورنمنٹ کی مشینری شاید متعصب رائے عامہ تک ان کے ہاتھ میں رہے۔ لہٰذا آپ کو یقین کرنا چاہیئے کہ اس وقت پاکستان بنانے والوں کے خلاف تمام دشمن عناصر کا پلڑا بھاری ہے۔

دوم آپ کا یہ کہنا کہ کشمیری عوام ذہنی اور تعلیمی اعتبار سے بہت پیچھے ہیں۔ بالکل بے معنی اور غلط سی بات ہے۔ یہ نظریہ کانگرسی منطق و فلسفہ کے بھی خلاف ہے۔ ذرا سوچیں تو سہی کہ آج سے تین برس پہلے یعنی آزادی کے اعلان کے وقت اگر ہندوستانیوں کو یہ کہا جاتا کہ آپ ابھی آزادی کے اہل نہیں ہیں کیونکہ آپ کی اکثریت جاہل اور پس ماندہ ہے لہٰذا ابھی آپ کو انگریزی سامراج کی سرداری میں رہنا چاہیئے تو کیا کوئی غیرت مند قوم پرست یہ دلیل ماننے کو تیار ہو سکتا تھا؟ اس کا جواب دیانت داری کا تقاضا ہے کہ نفی میں ہوگا۔ پس اس روشنی کے زمانے میں کوئی بھی عقلمند شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ فلاں ملک کو آزادی نہ دی جائے کیونکہ وہاں کے لوگ ان پڑھ اور پسماندہ ہیں۔ آزادی تو ہر انسان کا پیدائشی حق ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت کسی نارکی آڑ لے کر یہ حق چھین نہیں سکتی۔ ویسے بھی ایک عام کشمیری سیاسی تربیت اور سوجھ بوجھ کے لحاظ سے ایک عام ہندوستانی سے زیادہ بیدار مغز واقع ہوا ہے۔ اور اچھے برے میں پوری تمیز کر سکتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ آپ اصل میں پاکستان کے مذہبی نعرہ سے خائف نہیں ہیں۔ کیونکہ آپ بھی حقیقت کو سمجھتے ہیں۔ اگر یہی نعرہ ہندوستان کے ساتھ الحاق میں معاون ثابت ہوا تو کوئی بھی قوم پرست اس کو برا محسوس نہیں کرے گا۔ خود کشمیری نیشنلسٹ مسلمان ریاست کے مسلمانوں کو مذہب کے نام پر اپیل کرتے رہے ہیں۔ مگر کسی نے محض اس لئے کوئی اعتراض نہیں کیا بلکہ خوب حوصلہ افزائی کی کہ اس سے گاندھی جی کی قوم پرستی کو تقویت پہنچتی تھی۔ لیکن مذہب کے نام کی اپیل جب ان کے مفاد سے ٹکر کھاتی ہے تو فرقہ دارانہ جنون اور قابل ملامت بن جاتی ہے۔ ع ایں چہ بوالعجبی است

آپ نے پاکستان کے اس اعلان پر کہ یہ ایک اسلامی حکومت ہوگی بڑی سخت نکتہ چینی کی ہے۔ لیکن آپ بھول گئے ہیں کہ ہر ایک کانگرسی مہاتما گاندھی سے لے کر ایک معمولی کارکن تک دنیا کو یہی بتاتے رہے ہیں کہ ان کا آدرش ہندوستان میں رام راج قائم کرنا ہے۔ میری التجا ہے۔ کہ آپ نے ان دونوں میں فرق کیا ہے۔ اگر صرف کسی جدید طرز کی حکومت کے ماتحت لفظ اسلام ہی آپ کے اشتعال کا باعث ہے تو لفظ رام راج کیوں نہیں ہے؟ یہ بھی

ایک طرح کی مذہب پرستی اور تالیت پسندی ہے۔ اگر مہاتما گاندھی رام راج کی تمنا کے ساتھ کانگرسی لوگ غیر مذہبی نظام حکومت، جمہوریت اور متحدہ قومیت کا بھی خواب دیکھ سکتے ہیں تو پاکستانی رہنماؤں کو بھی ایسا کرنے کا حق حاصل ہے۔ وہ بھی تو بار بار کہتے ہیں کہ وہ اپنے ملک میں ایسی جمہوریت قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں ہر مسلمان اور غیر مسلمان کو زندگی کے ہر شعبہ میں مساوی حقوق اور مساوی سہولتیں میسر ہوں گی۔ اگر ایک پکا جمہوریت پرست ہندوستان میں زندگی بسر کر سکتا ہے تو وہ پاکستان میں بھی پورے اطمینان سے زندہ رہ سکتا ہے۔ اگر ایک مسلمان ہندوستان میں کوئی تنگی محسوس نہیں کرتا تو ایک ہندو کو بھی پاکستان میں اپنا جیون بتانے میں کوئی دقت اور خوف محسوس نہیں کرنا چاہیئے۔

سوال:— اگر آپ کا یہی خیال ہے کہ بھارت ایک خالص ہندو راج اور پاکستان ایک مسلم حکومت بن رہا ہے اس لئے کشمیر جو مسلم اکثریت کا علاقہ ہے۔ پاکستان کے ساتھ شامل ہونا چاہیئے تو اس صورت میں کیا آپ محسوس نہیں کرتے کہ یہ ریاست کے لاکھوں ہندو باشندوں کے ساتھ ظلم ہوگا۔ اگر مسلمان ہندو مرکز کی سرداری قبول نہیں کر سکتے تو پھر ہندو اسلامی مرکز کی سرداری کیوں قبول کریں۔ اس گتھی کو آپ کیسے سلجھائیں گے؟

جواب:— آپ کا اعتراض واقعی معقول ہے درحقیقت تقسیم ہند نے اقلیتوں کا مسئلہ حل ہی نہیں کیا۔ بلکہ ایک لحاظ سے یہ اور الجھ گیا ہے۔ تمام جمہوریت پرست عناصر نے جن میں ہم بھی شامل تھے آئندہ ان ہونے والے واقعات کی پیش گوئی کرتے ہوئے فرقہ وارانہ بنیادوں پر ملکی تقسیم کی مخالفت کی تھی۔ لیکن گاندھیائی قوم پرستی کے کردار نے مسلمانوں میں ایسا ردعمل پیدا کر دیا اور حالات ایسے مرحلے پر پہنچ گئے کہ سوائے تقسیم کو ماننے کے کوئی چارہ نہ رہا۔ یہ ہمارا قصور نہیں ہے اور تاریخ میں جو کچھ آ چکا ہے۔ اس پہ سیخ پا ہونا اب بے فائدہ ہے۔ اب ہمارے سامنے ایسی صورت حال موجود ہے کہ جس سے پچھلی غلطی کا ازالہ ہو سکتا ہے ہمیں اکثریت کے مفاد کا زیادہ سے زیادہ احترام کرنا چاہیئے ریاست کی پاکستان کے ساتھ شمولیت میرے خیال میں مسلمانوں کو نسبتاً زیادہ خوش اور مطمئن کر سکے گی۔ اب رہ گیا اقلیتوں کا مسئلہ۔ سو اگر ساری ریاست پاکستان کے ساتھ ملحق ہوگی تو زیادہ خوش [illegible] ترقی کا باعث ہوگا لیکن ان اسباب سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جن کی بنا پر صوبہ

جموں کے ڈوگرہ ہندو پاکستان کے ساتھ رہنا نہیں چاہتے۔ اگر واقعی ایسا ہے تو ان ہندوؤں کو اپنی مرضی کے مطابق فیصلہ کرنے کی اجازت ہونی چاہیئے۔ صوبہ جموں کے وہ علاقے جہاں ہندوؤں کی غالب اکثریت ہے جغرافیائی لحاظ سے بھارت کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ جس طرح ہم صوبہ کشمیر کے مسلمانوں کے حق میں دلائل دے چکے ہیں اسی طرح ہمیں ان غیر مسلموں کو حق خود ارادیت دینے میں پس و پیش نہیں کرنا چاہیئے۔ حکومت پاکستان نے اگر ڈوگرہ ہندوؤں کو ان کا یہ حق نہ دیا تو یہ اپنا موقف کمزور کرے گی گویا اپنی حمایت میں جو دلائل اس نے اب تک پیش کئے ہیں ان کی خود ہی تردید کر رہی ہے۔ باقی رہا وادی کشمیر کے ہندوؤں اور سکھوں کا معاملہ تو ان کے لئے ایسی سہولتیں اور موافق ماحول پیدا کر دیا جائے تاکہ یہ لوگ الحاق پاکستان کے بعد اپنے وطن میں پرامن اور باآبرو و باوقار زندگی بسر کر سکیں۔ اس میں شک نہیں کہ ابھی چند سالوں تک پاکستان اور بھارت میں اقلیتوں کی زندگی کٹھن رہے گی۔ یہ ماضی کے تلخ حقائق کی پیداوار ہے اس کی تلافی صرف اس طرح ہو سکتی ہے کہ خوش اخلاقی، رواداری، بردباری اور انصاف پسندی کے خیالات کو عام کیا جائے۔ یہ خیال کرنا بالکل حماقت ہوگا کہ ہندوؤں کا بھلا صرف ریاست کے مسلمانوں کو پاکستان سے الگ کرکے اور انہیں ان کے حق خود ارادیت سے محروم کرکے ہی ہو سکتا ہے۔ ایسا سوچنا انتہائی تباہ کن ثابت ہوگا۔

البتہ میں واقعی یہ بات آپ کے ذہن نشین کرنا چاہتا ہوں کہ کانگریسی قوم پرست پاکستان کو طعن و تشنیع کا ہدف بناتے وقت ہندو یونین کے نقائص کو بھول جاتے ہیں۔ اس شخص کو جسے حق کی تلاش ہو چاہیئے کہ فراخدلی سے حالات کا جائزہ لے اور ٹھنڈے دل کے ساتھ کوئی رائے قائم کرے۔ مان لیا کہ پاکستان ایک مثالی حکومت نہیں ہے مگر ہندو یونین کے مقابلہ میں تو یہ زیادہ آسودہ حال ہے۔ ترقی یافتہ نہ سہی، اگر منافقت واقعی قابل نفرت برائی ہے تو پاکستان لائق ستائش ہے کہ یہ اس برائی سے پاک ہے کیونکہ کھلم کھلا کہتا ہے کہ پاکستان کا نظام حکومت اسلامی ہوگا۔ اور اس کے ساتھ یہ دعوے بھی کرتا ہے کہ یہاں اقلیتوں اور غیر مسلموں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے گا۔ کیونکہ اسلام اپنے پیروؤں پر ایسا کرنے کا فرض عائد کرتا ہے۔ اس کے برعکس کانگریس غیر مذہبی نظام حکومت کے قیام کا ڈھنڈورا پیٹتی ہے مگر درپردہ عملی طور پر پراچین زمانے کی طرح سورن ہندوؤں کا رام راجیہ قائم کرنے میں مصروف ہے۔

کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ کرتے وقت ہمیں حقائق، اور تازہ تبدیلیوں کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔ صرف زبانی اعلانات کافی نہیں ہونگے۔ کشمیر مسلم اکثریت کا خطہ ہے۔ بلحاظ گنتی کے ان باشندوں کا جغرافیائی، اقتصادی، مذہبی اور تمدنی رشتہ پاکستان کے ساتھ وابستہ ہے، ہندوستان کے ساتھ نہیں۔ قدرتی طور پر کشمیر کو پاکستان کے ساتھ اپنا ناطہ استوار کرنا چاہیئے بھارت کے ساتھ نہیں۔ اگر زبردستی یا فریب کاری سے کشمیر ہندوستان کے ساتھ پیوست کر دیا گیا تو خوب یاد رکھیے گی کشمیری ایک مستقل بوجھ تلے دب جائیں گے اور خوشی کی زندگی بسر نہیں کر سکیں گے۔ مثال کے طور پر دیکھیئے کہ پاکستانی جھنڈا عام اسلامی پرچم کی طرح سبز رنگ کا ہے۔ اور اس میں ہلال کا نشان رکھا ہوا ہے۔ بھارتی جھنڈا ترنگا ہے، اور اس میں دھرم چکر بنا ہوا ہے۔ جو قدیم ہندو دھرم کی نشانی ہے۔ کیا آپ تسلیم کر سکتے ہیں کہ مسلمان ترنگے جھنڈے کے سامنے جھک کر وہی مسرت محسوس کرے گا جو اس کو ہلالی پرچم کو سلامی دے کر ہوگی؟ اور پھر بار بار مسلمان کے جذبات کا رنگ ہوگا۔ جب وہ جانا گانا۔ اور بندے ماترم جیسے ترانے گانے پر مجبور ہوگا۔ لیکن اگر یہی مسلمان جب پاکستان کا قومی ترانہ گائے گا تو اس کے سینے میں خوشی کا بے پایاں سمندر موجزن ہوگا۔ یہی صورت قومی زبان کی ہے۔ اگر ہندوؤں کی موجودہ ذہنیت اس طرح چند سال اور رہی تو قوی امکان غالب ہے کہ اردو زبان بھارت سے مٹ جائے گی۔ اس وقت کشمیری مسلمانوں کو مجبور کیا جائے گا کہ وہ دیوناگری میں ہندی یا سنسکرت کو قومی زبان کی حیثیت سے پڑھیں تو اس وقت مسلمانوں میں کتنی بے چینی پھیلے گی اور یہ خیال کرکے وہ کس قدر حسرت زدہ ہونگے کہ اگر وہ پاکستان کے ساتھ شامل ہوتے تو آج وہ فارسی اور عربی حروف میں اردو لکھتے پڑھتے ہوتے۔

سوال: ــــ کیا یہ مناسب نہیں ہو سکتا کہ ریاست آزاد ہی رہے؟

جواب: ــــ مجھے اس امر میں آپ سے پورا اتفاق ہے۔ برعظیم ہند کی فرقہ وارانہ فسادوں پر تقسیم، اس سے پہلے اور بعد کے دردناک واقعات کے پیش نظر واقعی یہ بہتر تھا کہ کشمیر دونوں ملکوں میں حالات پرسکون سطح پہ آنے تک آزاد رہتا۔ یہ مشورہ میں نے اور میرے ہم خیال دوستوں نے اپریل ۱۹۴۷ء سے پہلے ہی راج دربار کو دیا تھا لیکن مہا سبھائی ہندو اس قدر

جنون زدہ اور کشمیری قوم پرست اقتدار کے اس قدر بھوکے تھے کہ وہ متواتر اصرار کرتے گئے کہ ریاست ہندوستان میں شامل ہو ہندوؤں کا خیال تھا کہ ہندوستان اپنی فوجی طاقت سے آسانی کے ساتھ مسلم رائے عامہ کو کچل سکتا ہے اور پاکستان ڈر کے مارے زبان بھی نہیں ہلا سکے گا کشمیری قوم پرستوں نے نا ٹک رچایا کہ اگر ریاست ہندوستان کے ساتھ ملحق ہوگی تو یقینا اقتدار ان کے ہاتھ میں ہوگا اور مخالفین کو خواہ وہ کتنے ہی ہر دلعزیز کیوں نہ ہوں گے، طاقت کے ساتھ ختم کر سکتے ہیں۔ اس قدر اندھیر گردی مچی کہ دنیا کی رائے کی کسی نے پرواہ نہیں کی، اور اس کے بعد جو کچھ رونما ہوا ہے اسے دہرانا نہیں چاہتا۔ آپ سب بخوبی جانتے ہیں لیکن یہ بات صاف ہو چکی ہے کہ جنگ کشمیر نے کسی ایک مملکت کے ساتھ الحاق کو ناگزیر بنا دیا ہے۔ اور اب یہ ریاست کسی صورت بھی آزاد نہیں رہ سکتی کشمیر کو آزاد رکھنے کے لئے بہت سے اسباب کی ضرورت ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس کے لئے تمام طبقوں کے عوام کی رضامندی لازمی ہے۔ ہم ایسے خطہ میں رہتے ہیں جہاں پانچ بڑے بڑے ممالک کے جن میں اشتراکی روس بھی شامل ہے ڈانڈے ملتے ہیں۔ ان تمام ممالک کو ہماری آزادی کے تحفظ کا پیمان باندھنا ہوگا۔ ورنہ ہم میں اپنی اتنی طاقت نہیں ہے کہ ہم اپنے دفاع کے لئے کوئی فوج رکھ سکیں خاص کر ہند اور پاکستان کو صاف دلی اور خلوص کے ساتھ ہماری آزادی کے احترام کا حتمی وعدہ کرنا ہوگا تقسیم سے پہلے کشمیری مسلمانوں اور پاکستان نے کچھ وجوہ کی بنا پر کشمیر کے آزاد رہنے کی حمایت کی تھی۔ اگر اس وقت ریاستی ہندو اور مہاراجہ میں تھوڑی سی بھی عقل ہوتی۔ تو وہ فوراً شکریہ کے ساتھ اس تجویز کو مان لیتے لیکن کانگرس نے اپنی عادت کے مطابق سازش کا جال بننا شروع کر دیا اور مہاراجہ کو اس میں پھنسا کر خودکشی کی راہ پر لگا دیا۔ ان مسلمانوں سے اب ریاست کو آزاد رکھنے کی توقع رکھنا فضول ہے جنہوں نے اپنی بے مثال قربانیوں سے ڈوگرہ راج کا تختہ الٹا۔ اور پاکستان کی اخلاقی و مادی امداد سے ہندوستانی سامراج کو بھگا دیا ہے۔ اس کے علاوہ موجودہ جنگ نے کشمیر کا سارا پنجر ڈھیلا کر دیا ہے۔ اور اب کسی بڑی طاقت کے سہارے سے ہی اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکے گا۔ ہمیں اس حقیقت کو نہ بھول جانا چاہیئے کہ چھوٹی چھوٹی حکومتوں کے الگ تھلگ ہو کر آزاد اور زندہ رہنے کے دن بیت چکے ہیں موجودہ دور میں دنیا بھر کی قوموں کی ترقی اور خوش حالی کا راز ایک دوسرے کے ساتھ مل کر رہنے اور دوستی کا رشتہ مضبوط کرنے میں مضمر ہے۔ چونکہ کشمیر نے کبھی کسی جمہوری نظام کو نہیں دیکھا۔ اس لئے اگر یہ آزاد رہا تو اس کے رجعت پسند اور ترقی دشمن خطہ بن جانے کا اندیشہ ہے۔ اگر ہم نے اپریل ۱۹۴۷ء کے دوران میں اس کے آزاد رکھنے کی رائے دی تھی تو وہ مستقل طور پر آزاد رہنے کے لئے نہیں تھی بلکہ ہمارا عندیہ تھا کہ ہم صرف کچھ عارضی میعاد کے لئے آزاد رہیں تاکہ ہم ہمسایہ مملکتوں میں حالات کے اتار چڑھاؤ کا مشاہدہ کر سکیں اور آخر میں ہم کسی ایک کے ساتھ الحاق کا فیصلہ کر سکیں

سوال: ــــ آپ کہتے ہیں کہ کشمیر ایک علاحدہ خطہ کی حیثیت سے آزاد نہیں رہ سکتا۔ میں مانتا ہوں کہ آپ کا استدلال اس معاملہ میں بہت قدرتی ہے۔ اگر آپ یہ بھی تو کہتے ہیں کہ جمہوری ملک کی مانند پاکستان میں صحیح آزادی مفقود ہے۔ یہ نرالی سی بات ہے کہ آپ پھر بھی کشمیر کو پاکستان کے ساتھ ملحق ہونے پر زور دے رہے ہیں۔

جواب: ــــ اگر آپ واقعی مجھ سے اس بات پر متفق ہو گئے ہیں کہ کشمیر الگ تھلگ آزاد نہیں رہ سکتا۔ تو بہتر یہ صورت رہ جاتی ہے کہ کشمیر کسی ایک مملکت یعنی پاکستان یا ہندوستان کے ساتھ الحاق کرے میں واضح کر چکا ہوں کہ کشمیر لیول ہندوستان میں شامل نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا اس کو صرف پاکستان کے ساتھ الحاق کرنا چاہیئے مجھے اس سے بھی انکار نہیں کہ پاکستان کے ساتھ الحاق کے بعد وہ آزادی جس کا میں تصور کرتا ہوں کشمیریوں کو فوراً نہیں مل سکے گی ہمیں بہت سے مصائب و مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا ممکن ہو سکتا ہے۔ کہ مسلمانوں کی نسبت ہندو پاکستانی ریڈیو کے اس امید افزا وعدہ کے باوجود کہ اقلیتوں کا مستقبل بہتر ہوگا زیادہ مصیبت میں پڑ جائیں۔ نیز نفسیاتی ماحول اس قدر ناخوشگوار ہے کہ ہندو بے خوف خطر ابھی وہاں نہیں رہ سکتا عملی طور پر ابھی غیر مسلم اس مساویانہ سلوک سے مستفید نہیں ہوئے جس کا پاکستان کا برسر اقتدار طبقہ ہمیشہ اعلان کرتا رہتا ہے

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کوئی ایسی راہ بھی موجود ہے جو کشمیری غیر مسلموں کی بہتری کی ضامن ہو سکے؟ فرض کیجیئے کہ کسی نہ کسی طرح کشمیر ریاستی مسلمانوں کی مرضی کے خلاف ہندوستان کے ساتھ ملحق رہتا ہے کیا اس صورت میں ریاستی ہندو چین، امن اور آسودگی کی زندگی گذار سکے گا۔ ہندوؤں کا تنگ نظر یہ طبقہ یہی سمجھتا ہے کہ وہ واقعی ہندوستان کے ساتھ

خوش رہ سکے گا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہندیونین کا ہندو مرکز ریاستی مسلمانوں کے کسی بھی تشدد کے خلاف ڈھال کا کام دے گا۔ خیالی لحاظ سے یہ وچار ٹھیک ہے۔ مگر ہمیں دیکھنا ہوگا کہ اس کی عملی صورت کیا ہوگی۔ ہمیں تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان رضامندی کے ساتھ الحاق ہند کو ہرگز نہیں مانیں گے۔ حکومت ہند کو یا تو مسلمانوں کی ایسی کٹھ پتلی جماعت کے ہاتھ میں اقتدار سونپنا ہوگا جو نمائندہ حیثیت کی مالک نہیں ہوگی یا خود براہ راست یا بالواسطہ ہندو جماراجہ نظام حکومت کو سنبھالنا ہوگا۔ بہرصورت مسلمان رفتہ رفتہ معاندانہ رویہ اختیار کرتے جائیں گے۔ ان کے سینوں میں مرکزی حکومت ہند کے خلاف بغاوت کا لاوا ابلنا شروع ہو جائے گا پھر اس لاوے کو دبانا حکومت کے بس کا روگ نہیں ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکے گا کہ بھارتی فوجیں کشمیر کے بندوبست پر ہمیشہ کے لئے قبضہ جمائے رکھیں مگر فرقہ وارانہ مسئلہ زیادہ خطرناک بنتا چلا جائے گا۔ کیونکہ یہ کشمکش ہندو استبدادیت کے خلاف مسلم شورش کی شکل اختیار کرے گی۔

جوں جوں وقت گذرتا جائے گا یہ کشمکش زیادہ تلخ اور ہولناک ہوتی جائے گی۔ سیاسی لحاظ سے بیدار اور تعلیم یافتہ مسلمان طبقہ کسی نہ کسی جائز عذر اور مطالبہ کی آڑ لے کر شاکی اور ناراض رہے گا غرضیکہ کوئی بھی خوددار حساس اور آزادی کا متوالا کشمیری مسلمان کانگریسی رہنماؤں کے منظور نظر اور کٹھ پتلی نیشنلسٹوں کا ساتھ نہیں دے گا۔ حکومت پاکستان اور اس کے عوام مسلمانان کشمیر کو بھارت کے خلاف ہمیشہ اکساتے رہیں گے۔ سات سو میل لمبی ریاستی سرحد پر آئے دن گوریلا حملے بھی جاری رہیں گے اور اس طرح یہ وسیع سرحدی علاقہ ہمیشہ غیر آباد اور ویران رہے گا۔ جب کبھی اکسائے ہوئے اور بے چین مسلمان ہند یونین کے خلاف سرکشی اختیار کریں گے تو سب سے پہلے وہ مقامی ہندو باشندوں پر ہی جھپٹ پڑیں گے۔ کیونکہ یہ ہندو ان کے خیال میں دشمن ہندو حکومت کے حلیف ہونگے۔ ان حالات میں سارا ملک امن اور سلامتی سے محروم رہے گا۔ ہم پہلے ہی گذشتہ تین برسوں میں تلخ تجربات سے دوچار ہو چکے ہیں۔ عام طور پر ہندو اس زعم میں پھنسے ہوئے ہیں کہ جلد یا بدیر موجودہ حالت سدھر جائے گی اور اس امید موہوم میں وہ ہر موجودہ سختی کو صبر کے ساتھ برداشت کرتے چلے جا رہے ہیں۔ لیکن حالات تب تک سدھر نہیں سکتے جب تک یہ گتھی مسلم اکثریت کی خواہش کے مطابق پرامن اور دوستانہ طریقے پر سلجھائی

نہیں جاتی۔ اگر اس طریقہ سے کوئی فیصلہ نہ ہوا تو آئندہ ملکی صورت حال اور زیادہ ابتر ہوتی جائے گی۔ کشمیر صرف اس صورت میں ہندوستان کے ساتھ ملحق رہ سکتا ہے کہ یا تو مسلم آبادی کو بالکل ملیا میٹ کر دیا جائے یا اسے برعظیم کے دور دراز علاقوں مثلاً مدراس یا اڑیسہ کی طرف جلاوطن کر دیا جائے۔ وادئ کشمیر کے کسی بھی مسلمان کو کوئی سبز باغ دکھا کر خوش نہیں کیا جا سکتا۔ وہ سب کے سب ہمیشہ ہندوستانی سامراج کی سخت گیری اور تشدد سے نالاں رہیں گے۔ اور اندرونی بدامنی و شورش کا باعث بنے رہیں گے۔ ہر ملک کے فسادات ہمیشہ اکثریت کی نسبت اقلیت کو زیادہ نقصان پہنچاتے ہیں۔ اس حقیقت سے ذرا سا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اگر یہ ریاست پاکستان کے ساتھ ملحق ہو جائے تو اس کا اندرونی امن و امان بحال ہو کر پائیدار ثابت ہو سکتا ہے۔ روزمرہ کے پرامن حالات پھر لوٹ کر آ سکتے ہیں اور ہندو بھی موجودہ حالت کی نسبت زیادہ اطمینان کا سانس لے سکیں گے۔ ہندو موجودہ کٹھ پتلی حکومت کی بے انصافی کو فراموش نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اس نے ان کے جائز حقوق کو محض اس لئے اپنی اغراض کی بھینٹ چڑھایا تاکہ مسلمان خوش ہو کر ہندوستان کے ساتھ چپکے رہیں۔ پہلے پہلے ہندو یہ خیال کرتے کہ یہ سارا ڈھونگ عارضی ہے اور صرف ہندوستان کے حق میں مسلمانوں کی خوشنودی حاصل کرنا ہے۔ انہوں نے محض مسلمانوں سے ووٹ حاصل کرنے کے لئے اپنا سب کچھ نچھاور کر دیا۔ لیکن اب یہ جانتے ہیں کہ اتنی بڑی قیمت ادا کرنے کے باوجود مسلمان خریدا نہیں جا سکا۔ اور وہ بدستور پاکستان کا حامی بنا رہا ہے اور انہوں نے اب یہ بھی بھانپ لیا ہے کہ اگر اس مسئلہ کا فوری حل نہ ہوا تو ان کو آئندہ اور زیادہ قربانیاں دینی پڑیں گی جو ان کی تباہی و ہلاکت کا پیش خیمہ ہوں گی۔ اسی سبب سے ہزاروں کشمیری ہندو ریاست کو چھوڑ چکے ہیں اور اس وقت یہ ہندو بھارت کو پاکستان کے خلاف اکسائیں گے اور اکثریت کی خواہش کو دبانے کا تہیہ کریں گے تو اس کا نتیجہ تباہی اور مصائب کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ مستقبل اور زیادہ بھیانک اور خوفناک بن جائے گا۔ ان کو چاہیئے کہ ایسا کرنے کی بجائے وہ جرأت مندی سے کام لے کر معقول اور جمہوری طرز عمل کا مطالبہ کریں۔ ان کا یہ قدم ان کے روشن مستقبل کی دلیل ہوگا۔ میں یہ ہرگز ماننے کو تیار

نہیں ہوں کہ طرح طرح کی سختیاں جو ہندوؤں کو پاکستان اور مسلمانوں کو ہندوستان میں درپیش آ رہی ہیں ہمیشہ موجود رہیں گی۔ یہ ایک عارضی دور ہے۔ بہت جلد دونوں مملکتوں کی اقلیتوں کی حالت سدھر جائے گی۔ اس سدھار کی محرک دنیا کی رائے عامہ اور زیادہ متعلقہ قوموں میں ذہنی بیداری، رواداری اور ان کا جمہوری شعور ہوگا۔ اگر کشمیری ہمدرد فراخدلی، دانشمندی اور پوری سمجھ سے کام لے کر مسئلہ کشمیر کے بارے میں اپنی روش تبدیل کریں تو وہ مبارک گھڑی قریب آ گئی ہے جس میں وہ اپنی اور پاکستان کے ایک کروڑ بیس لاکھ ہندو باشندوں کی کافی خدمت کر سکیں گے۔ ایک سچے آزادی خواہ کا فائدہ اس مسئلہ الحاق میں صرف یہ ہے کہ آزادی کی راہ عمل ہموار رہے اور کوئی خطرناک خیال گمراہ نہ کر دے۔ یہ صرف پاکستان کے ساتھ رشتہ جوڑ کر ہو سکتا ہے۔ اگر کشمیر کو زبردستی ہندوستان کے ساتھ منسلک رکھنے کی کوشش کی گئی تو آزادیٔ وطن کی ساری جدوجہد پس پشت پڑ جائے گی اور اس کی بجائے فرقہ وارانہ کشمکش سیاسی پنڈال پر چھا جائے گی۔ سوائل جذباتی پن کا شکار بن جائیں گے اور مذہبی جنون کا رجحان سیاسی اور اقتصادی مسائل کو ملیامیٹ کر کے رکھ دے گا۔ اس کے برعکس اگر کشمیر نے یقینی طور پر پاکستان کے ساتھ اپنا ناطہ جوڑ لیا تو فرقہ وارانہ کشمکش اس وقت نابود ہو گی اور ملک کی سیاسی و اقتصادی آزادی کے لئے پرجوش جدوجہد از سر نو جاری ہو جائے گی۔

سوال: — آپ نے آزادیٔ کشمیر کا بار بار تذکرہ کیا ہے۔ کیا آپ کو یہ تسلیم کرنے میں کوئی عذر ہے کہ کشمیری عوام کو اس روز مکمل آزادی مل گئی تھی جس روز ریاست نے ہند یونین کے ساتھ الحاق کیا تھا؟ ڈوگرہ راج عملی طور پر ختم ہو گیا ہے اور اب حکومت کشمیری مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے۔ وادیٔ کشمیر کے عوام کو آج تک ایسی آزادی کبھی نہیں ملی تھی۔ اس کی مثال تاریخ میں بھی نہیں پائی جاتی۔ مجھے شک ہے کہ کشمیری مسلمان پاکستان کی مرکزی حکومت کی مداخلت سے محفوظ رہ سکیں۔ اس مملکت کے ساتھ شامل ہو کر یہاں کے عوام پوری آزادی حاصل نہیں کر سکیں گے لہٰذا آپ جیسے سیاست کار کو آزادیٔ کشمیر کے داعی ہیں۔ عوام کی پوری آزادی کے پیش نظر الحاق ہند کی تائید کرنی چاہئیے۔ نہ کہ پاکستان کے ساتھ الحاق کی۔ اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: — ہندوستانی حکومت نے یہ وسیع اختیارات صرف ایک محدود گروہ کے ہاتھوں میں سونپ رکھے ہیں۔ اس گروہ کے سارے افراد اس حکومت ہند کے پٹھو ہیں اور وادی کے معرکوں کا ان میں ایک بھی نمائندہ نہیں ہے۔ ان کو یہ اقتدار اس لئے بخشا گیا ہے تاکہ ریاستی مسلمانوں کو جھکا دے کر ہندوستان کے حق میں ان سے ووٹ لئے جا سکیں۔ جوں ہی کہ ان کا مقصد پورا ہوا یہ سارے وسیع اختیارات ان سے چھین لئے جائیں گے اور ان کی جگہ ایسے قوانین نافذ ہوں گے جن کے تحت کشمیری عوام بشمول نیشنلسٹ صاحبان کی ساری آزادی ختم کرا کے رکھ دی جائے گی۔ اس وقت ہندوستان سامراج کے آہنی ہاتھ کا ہمیں پتہ چلے گا۔ درحقیقت ہر شخص کو علم ہے کہ ہندوستان کی یہ فریب کارانہ پالیسی کشمیر میں اب تک تو ناکام ثابت ہو رہی ہے۔ چونکہ کشمیری نیشنلسٹ عوامی لیڈر نہیں ہیں لہٰذا وہ اپنے اقتدار کا ناجائز استعمال کر رہے ہیں۔ ہر جگہ لوگ ان کے مظالم سے فریاد کناں ہیں۔ خاصکر ہندو بھی جن کو حکومت ہند کے مفاد کے پیش نظر اس کی منافقانہ پالیسی کے ساتھ تعاون کرنا چاہئیے تھا۔ موجودہ غیر عوامی نیشنلسٹ طبقہ کے ہاتھوں نالاں ہیں اور ان کے خلاف اپنی ناراضی کا کھلم کھلا اظہار کر رہے ہیں۔

جہاں تک ڈوگرہ راج کا تعلق ہے معمولی سی سیاسی سوجھ بوجھ رکھنے والا شخص بھی جان سکتا ہے کہ یہ ابھی ختم نہیں ہوا۔ یہ اب بھی زندہ ہے اور اسی طرح ظالم بھی۔ صرف سیاسی چال بازی کے تحت مہاراجہ پردے کی اوٹ میں چلا گیا ہے تاکہ بھارتی سامراج کے پٹھو اس کے تاج و تخت کو کشمیری عوام کی بغاوت کے شعلوں سے محفوظ کر سکیں۔ جوں ہی کہ یہ بغاوت دب گئی۔ مہاراجہ پھر باہر آ کر اپنی گدی سنبھال لے گا۔ اس کے اختیارات طاقت اور وقار بحال کرا دیئے جائیں گے اور نیشنلسٹ پھر اپنی پرانی ڈگر پہ جوتیاں چٹخاتے نظر آئیں گے۔ بھارت کی موجودہ حکومت ممکن ہے کہ ساری جمہوریہ کے تمام راجگان کو بے تاج و تخت کر دے مگر مہاراجہ کشمیر کو گدی سے نہیں اتارے گی۔ کیونکہ یہ خطہ مسلم اکثریت والا ہے اور ایک مسلم حکومت کی سرحد پر واقع ہے۔ یہاں ہندو راج کی آن اور وقار کے لئے بھارت ہندو مہاراجے کو پوری طاقت سے لیس کر دینا چاہتا ہے۔

اب ہم فرض کر لیتے ہیں کہ مہاراجہ کو نیشنلسٹ طبقہ کی خوشی حاصل کرنے کے واسطے گدی سے اتار دیا جاتا ہے تاکہ نیشنلسٹوں کا یہ عندیہ پورا ہو جائے کہ کشمیری مسلمان لازماً ہندوستان کے ساتھ رہیں گے، بشرطیکہ ڈوگرہ حکومت ختم کر دی جائے۔ کیا اس صورت میں بھی حالات کے سدھرنے کی توقع ہو سکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ کیونکہ ڈوگرہ حکمران کی جگہ ہندوستانی مرکز براہ راست

آجائے گا۔ کشمیری ایک آقا کی غلامی سے نکل کر دوسرے آقا کے پنجے میں جا پھنسیں گے۔ مسلمانوں کی حالت ابتر ہوگی۔ اگرچہ مسلمانوں کے لئے بھارت کی ہندو حکومت اور ڈوگرہ راج بنیادی طور پر برابر ہیں لیکن پھر بھی یہ لوگ ایک مطلق العنان راجے سے روٹھ کر کچھ سہولتیں اور رعایتیں وقتاً فوقتاً حاصل کر سکتے ہیں۔ مگر بھارت کی سخت گیر آمریت سے اس قسم کی توقع رکھنا بے وقوفی ہوگی۔

سوال: — حکومت ہند اپنے آئین نو کے تحت ایک آزاد جمہوریہ بن چکی ہے۔ اس آئین میں عوام کی شہری آزادی کے بنیادی حقوق کا بلا لحاظِ مذہب و ملت تحفظ کیا گیا ہے۔ نیز کہ اس آئین میں ایسی دفعات رکھی گئی ہیں جن کی رو سے کشمیری عوام کو مکمل خود مختاری کے حقوق دیئے گئے ہیں لہٰذا آپ کو اور آپ کے ہم نوا لوگوں کو یقین کرنا چاہئے کہ کشمیر اگر مستقل طور پر ہندوستان کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کرے تو اس کا مستقبل محفوظ اور شاندار ہوگا۔

جواب: — یہ ٹھیک ہے کہ ہندوستان نے اب اپنا آئین بھی تیار کر لیا ہے۔ مگر یہ آئین صرف برائے نام جمہوری ہے۔ دورِ جدید میں دو قسم کے پارلیمنٹری آئین رائج ہیں۔ ایک امریکی طرز کا ہے۔ دوسرا انگلستانی نوعیت کا۔ ہندوستانی نوعیت کی بنیاد کچھ اس ڈھنگ سے دونوں پر رکھی گئی ہے کہ ہر دو میں جو قدرے خوبیاں تھیں ان کو تو نظر انداز کر دیا گیا ہے مگر جتنی برائیاں تھیں ان کو اپنا لیا گیا ہے۔ غالباً صدر جمہوریہ ہند امریکی صدر کی نسبت زیادہ با اختیار ہوگا لیکن اس کی تقرری براہِ راست عوام کے ووٹوں سے نہیں ہوگی جس طرح کہ امریکہ میں ہوتا ہے لیکن پھر بھی وہ ان لامحدود اختیارات کا مالک ہوگا۔ جو زمانہ ماضی میں مطلق العنان بادشاہوں کو حاصل رہے ہیں۔ یہ صورت حال تمام دلائل اور تحفظ کے علانات کی نفی کرتی ہے۔

جمہوریہ ہند کے اس نئے آئین میں نہ صرف ایکٹ ۱۹۳۵ء کی اس رسوائے عالم دفعہ نمبر ۹۳ کی صدائے بازگشت موجود ہے جس کی کانگرسی رہنما بارہا مذمت کر چکے ہیں۔ بلکہ اس ضمن کی دوسری دفعات بھی صدر کو اتنے وسیع اختیارات دیتی ہیں کہ جتنے کبھی سامراجی دور کے کسی وائسرائے کو بھی نہیں ملے تھے۔

اس دستور نو کے مطابق ہندوستان ایک وفاقی یونین نہیں ہوگا اس کی بجائے ایک ایسی حکومت ہوگا جس میں مکمل اختیارات صرف مرکز کو حاصل ہوں گے۔ صوبائی گورنر چنے نہیں جائیں گے صرف صدر ان کو نامزد کیا کرے گا۔ مرکز نہ صرف صوبوں کے معاملات میں مداخلت کا مجاز ہوگا بلکہ صوبائی حکومتوں کی تشکیل بھی اس کی منشا سے ہوگی۔ تفرقہ اور انتشار کو روکنے کی آڑ لے کر کانگرسی لیڈروں نے آئین کی تیاری کے وقت ہر لحظہ یہی زور دیا کہ مرکز کو زیادہ سے زیادہ با اختیار کیا جائے۔ "مرکزیت" کا یہ ڈھونگ سراسر جمہوریت کش ہے۔

اس آئین کی بدولت ایک موقع باز اور حریص شخص آسانی سے آمر مطلق بن سکتا ہے۔ پس ہندوستان میں جمہوریت کا مستقبل روشن ثابت نہ ہوگا بلکہ ہمیشہ تاریک رہے گا۔

میں مانتا ہوں کہ اس آئین میں کشمیر کے واسطے خاص رعائتیں رکھی گئی ہیں لیکن یہ صرف عبوری دور کے خاتمہ تک رہیں گی۔ اس کے ساتھ ہی صدر جمہوریہ کو پورے طور پر اس امر کا مجاز کر دیا گیا ہے کہ وہ کشمیر کے معاملے میں جو چاہے خود ہی کارروائی کر سکتا ہے۔ علاوہ ازیں آئین کی یہ دفعات شاستروں کے مقابلے میں شلوک تو نہیں ہیں کہ ان میں کوئی رد و بدل ناممکن ہو اگر کشمیر نے مستقل طور پر ہندوستان کے ساتھ شامل ہونے کا فیصلہ کر لیا تو پارلیمنٹ جس میں ہندو ممبروں کی زیادہ گنتی ہوگی ضرور ان دفعات میں ترمیم کر کے مرکزی حکومت کو ایسے اختیارات سونپ دے گی جن سے کشمیر پر پورا قبضہ جما لیا جائے گا۔ ہندوستان کے ہندوؤں کو یہ ہرگز گوارا نہیں ہے کہ کشمیری مسلمان کوئی من مانی کریں۔ اور نتیجہ یہ کہ ہندوؤں کا اقتدار اور مفاد مسلمانوں کی خوشحالی اور ترقی کو قربان کر کے محفوظ کیا جائے گا۔ غیر مطمئن مسلم عوام کو مشکوک نگاہوں سے دیکھا جائے گا، اور ان پر پاکستان سے ساز باز کرنے کے اکثر ایسے الزامات لگا کر جن سے صدر جمہوریہ ہند کے لئے وجہ جواز موجود ہوگی کہ وہ کشمیر کی مقامی حکومت کو معطل کر کے ہنگامی قانون نافذ کرے۔

سوال: — آپ یہ مانتے ہیں کہ پاکستان کے حالات اچھے ہموار نہیں ہیں۔ کچھ سالوں کے بعد اس ملک کی اقلیت اپنے آپ کو غیر محفوظ محسوس کرے گی۔ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا۔ کہ جب تک پاکستان میں حالات پرامن نہیں ہو جاتے کشمیر میں موجودہ صورتِ حال کو برقرار رکھا جائے؟

جواب: — جب تک دونوں ملکوں کے باہمی تعلقات دوستانہ نہیں ہوتے ان کے عوام امن و سلامتی کے دور کا منہ بھی نہیں دیکھ سکتے اور ان کا انحصار صرف مسئلہ کشمیر کے جمہوری اور منصفانہ حل پر ہے۔ اگر کشمیر

کا جھگڑا بیچ میں نہ ہوتا تو یقینی امر تھا کہ ... مارکیٹ ۔ باہمی حالات آزادی کے ان تین سال کے دوران میں بہت ... ہو گئے ہوتے اور تقسیم نے جو کار ... ختم کیا ۔ مجھے ... ہو چلے ہوتے زیادہ مشکلات اور پیچیدگیاں دونوں ملکوں میں صرف کشمیر ... نے پیدا کر رکھی ہیں ۔ یہ حقیقت تسلیم کرنی ... کوئی انکار نہیں کر سکتا ... بنگال کے اس نئے المیہ کا سبب بھی کشمیر کا ... جھگڑا ہے ... ہیں ... اگر ... اپنے آباؤ اجداد کے گھروں سے مار ... نکالے گئے ۔ لہٰذا کشمیر میں موجودہ صورت ... برقرار ... حالات کو ... جا سکتا بلکہ یہ اور خراب ہوتے جائیں گے اور اس ... دونوں بڑی مملکتوں میں امن اور آشتی کی کوئی امید نہیں رہے گی ۔ آپ کو یہ ... فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ اس وقت ہندوستان اور پاکستان اپنے بجٹ کا ... حصہ جو کروڑوں روپیہ کے لگ بھگ ہے اسی مسئلہ کشمیر کے باعث فوج پر خرچ کر رہے ہیں ۔ دونوں ملکوں میں ... تعمیر کے منصوبے معطل پڑے ہیں ... کم اخراجات کا یہ ... قومی آمدنی پر اسی طرح ... تو ان ملکوں کی ترقی اور نشوونما کا رک جانا لازمی امر ہو گا ۔ لہٰذا مسئلہ کشمیر کی مزید طوالت عظیم کے عوام کی تباہی و بربادی کا باعث ہو گی ۔

خود غرض حلقہ آپ کی تجویز سنے تو خوش ہو گا ۔ یہ کتنی مضحکہ خیز بات ہے کہ مسئلہ کشمیر کو تب تک چھیڑا ہی نہ جائے جب تک کہ دونوں ملکوں کے حالات بحال نہیں ہو جاتے ۔ حالانکہ حالات تبھی بہتر ہو سکتے ہیں کہ پہلے کشمیر کی گتھی کو دوستانہ طریقے سے سلجھایا جائے ۔ ہمیں اس خود غرض حلقے کو اپنے عزائم پورا کرنے کا موقع ہی نہ دینا چاہیے اور یہ صرف اس جھگڑے کو پرامن طریقے سے ختم کر کے ہی ہو سکتا ہے ۔

سوال: ——— فرض کیجیے کہ کشمیری لوگ آزادانہ اور غیر جانبدارانہ رائے شماری کے موقعہ پر ہندوستان کے حق میں اپنا ووٹ ڈالتے ہیں ۔ لیکن پاکستانی پھر بھی یہ اصرار کریں گے کہ وادی میں مسلمانوں کی اکثریت ہے ۔ لہٰذا انہیں ملنی چاہیے ۔ اس صورت میں آپ کا موقف کیا ہو گا ؟

جواب: ——— میں یہ خیال بھی نہیں کر سکتا کہ پاکستانی اتنے ہٹ دھرم اور احمق ہیں کہ جب آزادانہ اور غیر جانبدارانہ رائے شماری میں کشمیری عوام اپنے الحاق کا فیصلہ ہندوستان کے حق میں کر چکے ہوں گے تو پھر بھی یہ کشمیر کا مطالبہ کریں گے ۔ اور اگر واقعی پاکستانیوں نے اس فیصلہ کے بعد کشمیر کا مطالبہ کیا تو میں ان کو غاصب اور جارح قرار دوں گا ۔ اور جو بھی وسائل میسر اس وقت موجود ہوں گے ان کے ذریعہ میں ان سے جنگ کروں گا کیونکہ یہ اس وقت ہمارے ملک کے فی الحقیقت دشمن ہوں گے ۔ ایک دفعہ عوام کی مرضی غیر مبہم اور واضح الفاظ میں سامنے آ جائے چونکہ جمہوریت پرست کی راہ عمل بالکل صاف ہو گی ۔

مسئلہ کشمیر کا تقاضا

سردار محمد ابراہیم خان
سابق صدر آزاد کشمیر

[illegible] سو سالہ دور حکومت میں (۱۸۴۶ء سے ۱۹۴۷ء تک) کشمیر کے ہندو حکمرانوں نے [illegible] مظالم توڑے تھے۔ ان میں ایک [illegible] نہیں تھا۔ مسٹر نہرو کے آزاد بھارت میں کشمیر [illegible] لیجسلیٹو [illegible] ۱۹۵۷ء کے انتخابات میں ایک سو تیس امیدوار کامیاب ہوئے تھے۔ [illegible] ایک بھی مسلمان نہیں تھا۔ اسی سال بھارتی فضائیہ کے امتحان میں [illegible] امیدوار کامیاب ہوئے تھے۔ ان میں بھی کوئی مسلمان نہیں تھا۔ کشمیری مسلمانوں اور پاکستانی ہندوؤں [illegible] سامنے ان کے حالات [illegible] برصغیر میں پہلے یہ ایک علیحدہ وطن کا مطالبہ [illegible] مقاصد کے پیش نظر [illegible] ان میں تقاضے [illegible] سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی کشمیر [illegible] ہندو حکمران ہمارے [illegible] عہد [illegible] میں کشمیری عوام خود اپنے وطن میں غلاموں سے بھی بدتر [illegible] مسلمانوں نے جمہوریت کی ارتقا پذیر طاقتوں کو دیکھ کر یہ اندازہ لگا لیا کہ ہندو کی بھاری اکثریت بالآخر ان کے اوپر غلبہ حاصل کر لے گی۔ مسٹر نہرو کے سیکولر بھارت نے ان اندیشوں کو بالکل صحیح ثابت کر دیا [illegible] حالیہ واقعات نے ثابت کر دیا ہے کہ کشمیری مسلمانوں کا یہ فیصلہ کہ وہ [illegible] پاکستان سے وابستہ کر دیں اور پاکستان کا یہ نظریہ کہ وہ مسلمانوں کا ملجا و ماویٰ بنا رہے بالکل صحیح تھا۔ اسی طرح کافی عرصہ قبل جب ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ ہم اپنی قومی خود مختاری دوبارہ حاصل کر لیں تو اس کی بھی محرک ہماری ماضی کی تاریخ ہی تھی۔ ممکن ہے کہ بعض نیک نیت غیر ملکی مبصر مسٹر نہرو کی دو رخی سے اب بھی فریب کھا جائیں لیکن ہم کشمیری مسلمان بخوبی جانتے ہیں کہ ہمارے وطن پر ان کا حملہ [illegible] پاکستان پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لینے کا پیش خیمہ تھا۔ مسٹر نہرو بلکہ سیکولر نظام کا بڑے جوش و خروش سے پرچار کرنے اور اسے کامیاب بنانے کی سر توڑ کوشش کر رہے ہیں اور پاکستان پر قبضہ اس عمل کا آخری قدم ہو سکتا ہے۔

انتہا پسندی کی یہ چال مسٹر نہرو کے لیے بہت مفید ثابت ہوگی۔ ۵۰۰ کشمیری [illegible] حصے پر قابض ہیں۔ یہ روس کے حق میں بھی مفید ہے۔ کشمیر کا قبضہ سے مسٹر نہرو کو فوجی اعتبار سے پاکستان پر بالادستی حاصل ہو جائے گی۔ اور دو حصوں میں بٹا ہوا کشمیر [illegible] کے نکلنے [illegible] سے بہت [illegible] مواقع پیدا کر دے گا تاکہ دنیا [illegible] فائدہ اٹھانے کی چال چل رہے ہیں۔ ایک طرف روس سے [illegible] نے اور دوسری جانب مغربی ملکوں کو ڈرا دھمکا کر فائدہ اٹھانے میں مسلسل مصروف ہیں۔ اس طرح کشمیر میں آدم خوروں کا گڑھ [illegible] رہتا ہے۔ کیونکہ بنا بریں اس سے ان حضرات کو فائدہ پہنچنے کی امید ہے۔ لیکن اس حقیقت کو کسی نے محسوس نہیں کیا کہ اس سے کشمیر کے عوام کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا اور ان کے صبر کا پیمانہ کبھی چھلک بھی سکتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی کوئی نہیں محسوس کرتا کہ جن لوگوں کو عرصہ دراز تک پامال کیا اور بارہا فریب دیا جاتا ہے۔ ان کا غیض و غضب کیا رنگ لا سکتا ہے۔

ہم نے کشمیر کی جنگ صرف اس لیے بند کر دی تھی کہ اقوام متحدہ نے آزادانہ اور منصفانہ استصواب رائے کا وعدہ کیا تھا۔ حالانکہ ہمیں یقین تھا کہ میدان جنگ میں فتح بالآخر ہماری ہی ہوگی۔ ہم بھارتی فوجیوں سے نبرد آزما ہو چکے تھے اور ہم جانتے تھے کہ ہر قسم کے سامان جنگ سے لیس ہونے کے باوجود ان کی صلاحیتوں میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ جب ہم سے اپیل کی گئی کہ ہم ہتھیاروں کی بجائے امن پر بھروسہ کریں اس وقت ہم نے لڑائی جیتنا شروع کر دی تھی ہم نے امن کے حق میں فیصلہ کر کے دراصل اقوام متحدہ کے حق میں فیصلہ کیا تھا۔ اس واقعہ کو گیارہ سال گزر چکے ہیں۔ اس دوران میں ہم مسلسل انتظار کرتے رہے ہیں کہ اقوام متحدہ اپنے قول پر عمل کرنے اور اپنے منشور کا احترام کرنے کے لیے کوئی قدم اٹھائے۔ حکومت آزاد جموں و کشمیر کے صدر کی حیثیت سے میں دو بار امریکہ جا چکا ہوں وہاں مجھے اقوام متحدہ کے صدر دفتر میں

مغربی ملکوں کے مندوبین سے ملاقات کا بھی شرف حاصل ہوا۔ دونوں بار ہمیں اپنے دل میں یہ یقین کا احساس کرایا کہ جمہوری ملکوں کو بدقسمت کشمیر کے پامال عوام کے جائز عزائم کا احساس ہے۔ لیکن حالات اس سے آگے نہیں بڑھے۔ ہم کئی سال سے آس لگائے بیٹھے ہیں۔ حالانکہ حالات اس رجائیت کے لیے سازگار نہیں ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ہم عددی اعتبار سے کمزور ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ ہمارے وسائل محدود ہیں۔ ڈوگرا حکومت کے تحت کشمیریوں کے لیے یہ فیصلہ کرنا ممکن نہیں تھا۔ کہ وہ اپنے لیے کس کا انتخاب کریں —— زندگی کا یا موت کا؟ مسٹر نہرو کی توپوں کے سائے میں ہمیں معلوم ہو گیا ہے کہ زندگی موت سے بھی بدتر ہے۔ اس لئے راستہ بالکل صاف اور واضح ہے۔ کیا دنیا کی طاقتیں اپنا دل نہیں ٹٹولیں گی۔ وہ اپنے اندر اتنی ہمت پیدا نہیں کریں گی کہ وہ مسٹر نہرو کی گیدڑ بھبکیوں سے مرعوب ہونا چھوڑ دیں؟

امریکہ ہی کو لیجئے —— سویز کے معاملے میں اگر وہ اپنے ثابت قدم حلیفوں برطانیہ اور فرانس کی خفگی مول لے کر جنرل اسمبلی کو کارروائی پر آمادہ کر سکتا تھا۔ تو وہ ایک ناقابل اعتماد دوست بھارت کے خلاف بھی کارروائی کی یقیناً سفارش کر سکتا ہے۔

کشمیر کا مسئلہ بالکل سیدھا اور صاف ہے۔ کشمیر کے عوام پاکستان سے الحاق کرنا چاہتے تھے۔ مہاراجہ بھارت سے مل جانا چاہتا تھا۔ اس لیے وہ قتل عام پر اتر آیا۔ عوام نے بغاوت کی اور اسے تاج و تخت سے محروم کر دیا۔ مہاراجہ نے بھارت سے فوجی امداد کے لئے اپیل کی اور مسٹر نہرو نے اپنی فوجیں روانہ کر دیں۔ بعد میں اس لڑائی نے بھارت اور پاکستان کی جنگ کی صورت اختیار کر لی لیکن اقوام متحدہ کی مداخلت پر لڑائی روک دی گئی۔ فریقین میں طے پایا کہ ہر جانب سے فوجی انخلا کے بعد استصواب رائے کیا جائے گا۔ اب بھارت اپنی جارحانہ کارروائی کو کالعدم قرار دینے سے انکار کر رہا ہے۔ اور اس کے لئے جو عذر پیش کر رہا ہے وہ بالکل لغو ہیں۔ وہ جو اعتراضات کر رہا ہے۔ وہ اس سمجھوتے کے دائرے سے باہر ہیں اور ان کا اصل مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ جو سیدھے سادے الفاظ میں صرف اتنا ہے کہ "ایک ایسی فضا میں جو ہر قسم کے دباؤ سے آزاد ہو عوام کی مرضی معلوم کی جائے" یہ مقصد حاصل کرنا آسان ہے۔ اقوام متحدہ کی فوج اگر سینا اور سویز کے علاقے میں برطانیہ اور فرانس کی مسلح افواج کی جگہ لے سکتی ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے۔ کہ یہ کشمیر میں بھارتی اور پاکستانی فوجوں کی جگہ بھی نہ لے سکے۔

میاں بشیر احمد

کشمیر اور ہم

کشمیر کا جو ذکر کیا تو نے ہمنشیں ! ایک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے !

آج کشمیر کا نام سنتے ہی ہر پاکستانی کے دل میں ایک جوش کا جذبہ اُٹھتا ہے۔ کوئی غصے میں آجاتا ہے، کوئی آہ بھر کر چپ ہو جاتا ہے، کوئی پنڈت نہرو کو صلواتیں سنانے لگتا ہے، کوئی عدل و انصاف کے نام پر متحدہ اقوام سے اپیل کرتا ہے، کوئی کہتا ہے جس کی لاٹھی اُس کی بھینس اور تنبیہ کرتا ہے کہ ہم وطنو! اگر تم اپنا حق حاصل کرنا چاہتے ہو تو اپنے آپ کو مضبوط بناؤ اور ہندوستان سے جنگ کرنے پر تیار ہو جاؤ کیونکہ یہ جنت ارضی بغیر خون بہائے نہ مل سکے گی۔ بعضوں کا خیال ہے کہ کشمیر کے حصول کا مسئلہ اس لیے اہم نہیں ہے کہ اس سے پاکستان کے علاقے میں ایک جائز قسم کا اضافہ ہو گا۔ بلکہ اس لیے کہ کشمیر کے بغیر خود پاکستان کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔ مغربی پاکستان کے دریا سب کشمیر سے ہو کر آتے ہیں۔ ہندوستان جب چاہے ان کا پانی روک کر ہمارے اس حصہ ملک کو ایک لق و دق بیابان میں تبدیل کر سکتا ہے۔ کشمیر غیروں کے پاس ہوتے ہوئے ہمارے لیے اپنی حفاظت کا سوال بھی ایک خطرناک صورت اختیار کر لیتا ہے۔ پھر بعض انسانیت یا اسلام کا نعرہ لگا کر غیرت دلاتے ہیں کہ بے چارے مقہور و مجبور کشمیریوں کو اُن کا انسانی حق ملنا چاہیے۔ آزاد مسلمانوں کو مظلوم مسلمانوں کی امداد کرنی چاہیے۔ خاص طور سے جب وہ اُن کے پڑوسی ہوں۔ انہیں کی قوم کے بے کس و بے بس افراد ہوں اور جبر و اکراہ کے نیچے دبے اور پسے جا رہے ہوں۔ اس جوش و خروش کے مقابل میں محتاط اور سرد مزاج لوگ سمجھاتے ہیں کہ آج کل جنگ کرنا مذاق نہیں اور طاقت ور ہمسائے سے چھیڑ خانی قرین مصلحت بھی نہیں، مناسب ہے کہ جو کچھ ترغیب اور صلح جوئی سے کیا جا سکے کیا جائے۔ صلح صفائی بہر صورت ایک خونی جنگ یا ہر روز کی کشاکش سے بہتر ہے!

پاکستان کی حکومت پچھلے بارہ تیرہ برس سے کشمیر کے متعلق ایک قسم کی "قانونی جنگ" اور لفظی مباحثے میں مصروف رہی ہے۔ ایک روایت کے مطابق قائد اعظمؒ نے کشمیر کو پاکستان کا ایک ضروری جزو اور جائز حق سمجھ کر اُس پر قبضہ کر لینے کا ارادہ کیا تھا لیکن ان کے مشیروں نے انہیں امکانِ جنگ کے خطرات سے آگاہ کر کے خاموش رہنے کا مشورہ دیا۔ اس کے بعد ہندوستان اور پاکستان یہ مقدمہ "متحدہ اقوام" کی مجلس عامہ میں لے گئے جہاں بارہ برس سے اُس کی بیسیوں پیشیاں ہوئیں اور اس سلسلے میں سیکڑوں کمیٹیوں نے ہزاروں کارروائیاں کیں۔ دونوں طرف سے لاکھوں جنگجو کشمیر کے اندر اور اُس کی سرحدوں پر پہلے گرم جنگ اور پھر سرد جنگ میں برسرِ پیکار رہے اور آج تک طرفین کی بندوقیں، توپیں اور ہوائی جہاز ایک دوسرے کو نشانہ بنانے پر شب و روز تُلے ہوئے ہیں۔ دونوں طرف سے کروڑوں روپیہ خرچ ہوا اور ہو رہا ہے۔ علاوہ ازیں تُو تُو میں میں کا بازار گرم ہے۔ "متحدہ اقوام" میں قراردادیں منظور ہوئیں، متعدد کمیشن مقرر ہوئے، کئی اکابر ثالث بالخیر بن کر آئے اور اپنا سا منہ لے کر واپس چلے گئے۔ پاکستان نے مصالحت کی ہر تجویز کا خیر مقدم کیا لیکن ہندوستان نے بالعموم اسے دخل در معقولات کہہ کر مسترد کر دیا۔ استصواب رائے کی تجویز کو خواہ اُسے اہل کشمیر کا حق سمجھا جائے یا ہندوستان اور پاکستان کا فرض سب نے تسلیم کیا لیکن عملاً ہندوستان نے ہر طرح سے اُسے ٹھکرا دیا اور آخر کار یہ کہہ کر گویا اُسے قطعاً مسترد کر دیا کہ اب حالات اور کے اور ہو گئے ہیں اور اب رائے شماری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ اول تو کشمیر بوجہ مہاراجہ کشمیر کے الحاقی اعلان کے اور ایک نام نہاد کشمیری) دستور ساز اسمبلی کے فیصلے کی بنا پر ہندوستان سے جائز اور قطعی طور پر ملحق ہو چکا ہے اور دوسرے پاکستان کو بلکہ دنیا بھر کو اس کے متعلق کوئی بات کرنا بھی جائز نہیں جب تک پاکستان آزاد کشمیر سے اپنا ناجائز قبضہ نہ اُٹھائے۔ سچ یہ ہے کہ ہندوستان بھی اس "کالے کے عملی اقدام پر عمل پیرا

ہے اور اس کے سامنے پاکستان کے سارے نعرے، متحدہ اقوام کی ساری قراردادیں اور کشمیریوں کی تمام چیخ و پکار محض صدا بصحرا ہو کر رہ گئی ہے! مجاہدِ کشمیر شیخ عبداللہ قید خانے کی کال کوٹھڑی میں بند ہے۔ لاکھوں کشمیری گھر سے بے گھر ہو چکے ہیں، لاکھوں ہندوستانی کچھ فوجی اور کچھ غیر فوجی کشمیر کے پہاڑوں اور وادیوں میں متحرک دکھائی دیتے ہیں۔ مختصر یہ کہ آج کشمیر کی حسین وادی میں جو ہے سو ہے فتح مندانہ طور پر اپنے اشوک چکر کا پھریرا اٹھائے براجمان ہے اور جو ہونا چاہیئے اپنی کاغذی جھنڈیاں لیے دنیا کے گلی کوچوں میں ذلیل و خوار ہو کر مارا مارا پھر رہا ہے!

یہ ہے کشمیر کی رام کہانی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اسے سن سنا کر "بندۂ مومن" کیا کہتا ہے اور کیا کرنا چاہتا ہے؟ کوئی نئی بات یا وہی پرانی باتیں؟ وہی زبان پر خدا کا نام اور دل میں صرف اپنی خود غرض آرزوں کی بھرمار؟ مشکلوں کے ہجوم میں غصّے سے وہی مُنہ پر سُرخی اور بدن میں کپکپی؟ لب پر دنیا جہاں کو الٹ دینے کے نعرے اور قدم وہی اپنے گھر کی طرف رواں؟ یہی؟ کیا ہم امید رکھتے ہیں کہ ہماری انقلابی حکومت کسی نئے اقدام سے سرزمینِ ہند میں ایک ایسا زلزلہ برپا کر دے کہ کشمیر کا علاقہ آن کی آن میں اس سے کٹ کر خود بخود ہماری گود میں آ پڑے؟ کیا ہم صبح و شام گڑگڑا کر یہ دعائیں مانگ رہے ہیں کہ خدا کے فرشتے دنیا بھر کی مملکتوں کے اربابِ حل و عقد کے دلوں کو رحم و انصاف کے جذبات سے گداز کر دیں اور وہ سب اپنی فوجیں لے کر ہند پر چڑھ آئیں اور ہمیں جلد سے جلد کشمیر دلا کر پھر ہنستے کھیلتے اپنے گھروں کو لوٹ جائیں؟ کیسی ہے یہ اُمید، کیسی ہیں یہ دعائیں!

ہماری حکومت تو جو کرے گی، سو کرے گی دنیا بھر کے مدبر بھی جو نہ کریں گے سو نہ کریں گے لیکن آخر ہماری اپنی نیت کیا ہے ہمارا اپنا کیا ارادہ ہے؟ کیا ہم اپنے آپ کو بے کس و بے چارہ سمجھ کر ہی بیٹھے رہیں گے، زمانے کو کج رو، قسمت کو بُرا اور دشمن کو جابر و ظالم کہہ کر ہی جی کی بھڑاس نکالتے رہیں گے؟ چار آنسو بہا کر دس آہیں کھینچ کر ہم یقین کیے رہیں گے کہ دنیا شیطان صفت ہے صرف ایک ہم فرشتہ سیرت اور نیک طینت ہیں؟

آخر ہم کب تک یوں اپنے آپ کو دھوکا دیتے رہیں گے۔ قدرت کے قانون کو کب تک ہم یوں توڑتے مروڑتے رہیں گے؟ یا کیا ہم سمجھتے ہیں کہ اگر ہم سب مل کر آج شام ایک قرارداد منظور کر لیں کہ ہم کل صبح ہی یک قلم اپنا گھر بار چھوڑ چھاڑ کر بندوقوں اور تلواروں اور نیزوں اور کلہاڑیوں اور درانتیوں اور لٹھوں سے مسلح ہو کر کشمیر پر ہلّہ بول دیں گے اور "یا تخت یا تختہ" کا آوازہ بلند کرتے ہوئے آگے کو چل دیں گے تو ہم یقیناً اپنی منزلِ مقصود کو پا لیں گے؟

کیا ہمیں اس امر کا احساس نہیں کہ کشمیر کو حاصل کرنے کے لیے ہمیں پہلے اپنی حاصل شدہ ملکیت کو سمیٹنا ہے ہمیں پہلے اُن نعمتوں کی کماحقہٗ قدر جاننی ہے جو بغیر زیادہ جد و جہد کے گویا بیٹھے بٹھائے ہی ہمیں مل گئیں؟ اور اس لیے ہم نے اپنی ناشکری اور ناحق شناسی میں ھل من مزید کا بے محل نعرہ لگایا۔ ہم نے یہ نہ سوچا کہ دنیا میں کوئی چیز ہماری نہیں ہو سکتی جب تک ہم میں اپنی شب و روز کی مسلسل مساعی سے اُس کا استحقاق پیدا نہ ہو جائے۔ اور اگر بدقسمتی سے وہ ہمیں آسانی سے مل بھی جائے تو ہم کبھی اُس سے حقیقی معنوں میں نہ لطف اندوز ہو سکتے ہیں نہ فیض یاب۔ ہم نے کبھی یہ سمجھنے کی کوشش ہی نہ کی کہ ہمیں جو کچھ پہلے مل چکا ہے ابھی ہمیں اُسے بھی پانا ہے، ابھی ہمیں اُسے بھی حاصل کرنا ہے، ابھی ہمیں خود اُس کے قابل بھی بننا ہے!

چیزیں تو چیزیں ہیں وہ ہمارے باہر ہیں ہمیں اُن سے کیا سروکار، پہلے ہمیں اپنے اندرونِ دل کا جائزہ لینا ہے، پہلے ہمیں اپنی سیرت کو سنوارنا ہے، پہلے ہمیں اپنے اصلی جوہر کو پہچاننا اور اُسے کام میں لانا ہے! حقیقت یہ ہے کہ جب تک ہماری قوم کے افراد میں خود غرضی کا مادّہ موجود ہے اتنا وافر ہے کہ ہمارے رگ و پے میں یوں جاری و ساری ہے تو کشمیر کا خیال بھی "ایں خیال است و محال است و جنوں"۔ ایسے حال میں کشمیر من و سلویٰ کی طرح بھی آسمان سے ٹپک پڑے تو وہ ہماری روح کی تشنگی و گرسنگی کو مٹا نہ سکے گا، وہ ہمیں مل بھی جائے تو ہم اُسے قائم نہ رکھ سکیں گے ——— لیکن جس روز اور جہاں جہاں قوم

کا ایک فرد بھی راستی اور ایثار اور محنت اور محبت اور انسانی محبت و ہمدردی کی طرف عملاً قدم بڑھائے گا جب اُس میں خود غرضی کم اور انسان دوستی بڑھے گی تو اُس کے کئی اور بھائی بند بلکہ اُس کی پوری قوم اُس سے متاثر ہو کر اُس راہ پر چل نکلے گی جس سے جا بجا پھر کئی رستے نکل کر شدہ بہ شدہ کشمیر کی وادیوں میں اور اُس کی چوٹیوں تک بلکہ اُن سے بھی آگے دُور دُور تک جا پہنچیں گی۔

اگر کشمیر پر واقعی ہمارا حق ہے تو وہ ایک دن ہمیں مل کر رہے گا لیکن آج اُس کے حصول کے لیے بے تابی، اسی بے تابی اور وہ بھی محض بے تابی لاحاصل ہے اور ضرر رساں۔ پہلے ہم اپنا روزمرہ کا کام تو کریں اپنے گرد و نواح کو اپنے ہمسایوں اپنے ماحول کو خود اپنے آپ کو جانیں اور پہچانیں —— ہم حقیقی طور پر اچھے بنیں گے تو دنیا یقیناً خود آگے بڑھ کر ہمارا خیر مقدم کرے گی۔

عبدالرحمٰن چغتائی

آزادیٔ کشمیر کا سنگِ بنیاد

کشمیر آج سے غلام نہیں، یہ صدیوں سے غلام چلا آ رہا ہے۔ میں نے جب کشمیر دیکھا تھا تو غلامی اہلِ کشمیر کے ذہنوں میں رچی ہوئی محسوس ہوتی تھی —— اصل میں غلامی یا آزادی کوئی ہنگامی مسئلہ ہے بھی نہیں۔ جب تک اندازِ نظر نہ بدلے غلامی یا آزادی کے فیصل سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔

میں نے کشمیر میں غلامی کو اتنے وسیع پیمانے پر جاری و ساری دیکھا کہ میرے خیال میں دنیا کے کسی گوشے میں غلامی کی اتنی گہری تہیں لوگوں کے جسموں، ذہنوں اور روحوں پر مسلط نہ ہوں گی جتنی یہاں تھیں۔ اور تو اور مغل بادشاہوں نے بھی غلامی کی ان تہوں کو چاک نہ کیا۔ اُن کے عہد میں تو غلامی بھی دلبری معلوم ہوا کرتی تھی۔ انہوں نے انتہائی فراخ دلی سے ہندوؤں کو سینے سے لگایا انہیں عہدے دیئے۔ دربار میں جگہ دی بلکہ ان سے رشتے ناطے تک کیے۔ کاش ان کی فراخدلی سے کچھ حصّہ اہلِ کشمیر کو بھی ملتا اور یوں شاید اس سرزمین کے لوگ بھی زندگی کی رونق میں حصّہ لیتے۔ کشمیر کے چپے چپے پتے پتے پر اکبر جہانگیر اور شاہجہان لکھا ہوا نظر آتا ہے لیکن جب میں کشمیر میں تھا تو میں نے شاید ہی کسی کشمیری مرد کو بھرپور قہقہہ بلند کرتے سنا ہو یا کسی کشمیری عورت کو اپنے بچے کا گرم جوشی سے منہ چومتے دیکھا ہو جیسے وہ کہہ رہی ہو کہ یہ میرا بچہ ہے۔

صدیوں کے استبداد نے کشمیریوں کی عزتِ نفس اور خود اعتمادی کو ایسی کاری ضرب لگائی کہ اُن کی پوری زندگی میں غلامانہ طرزِ عمل کی جھلکیاں عام ہو گئیں۔ مغلوں اور انگریزوں کے دور میں کشمیر کو ایک تفریح گاہ سمجھا جاتا رہا اور کشمیریوں کو معمولی خدمت گار۔ آہستہ آہستہ یہ صورتِ حال مستقل سی نظر آنے لگی اور کشمیری عوام کے مزاج میں رچ بس گئی۔

اب سوال یہ نہیں کہ کشمیر کے مسلمانوں کو آزادی ملنی چاہیئے۔ میں کہتا ہوں، کشمیر کے ہندوؤں کو بھی اس آزادی کی ضرورت ہے۔ پھر سوال محض یہ نہیں کہ کشمیر کو سیاسی آزادی مل جائے اور وہ بھارت یا پاکستان سے الحاق کر لے۔ اصل بات تو یہ ہے وہاں آزادانہ طرزِ فکر اور طرزِ عمل پروان چڑھیں۔ پھر ساری آزادیاں آسان ہو جائیں گی اور جب میں یہ سوچتا ہوں تو میرے دل میں امید کی کرن پھوٹتی ہے کہ کشمیر کی آزادی اب دور نہیں۔ اس آزادی کا سنگِ بنیاد اب خاصے عرصے سے رکھا جا چکا ہے۔ اہلِ کشمیر اپنی قسمت بدلنے کے لئے کمرِ ہمت باندھ چکے ہیں۔ اب دنیا کی کوئی طاقت انہیں آزادی سے باز نہیں رکھ سکتی۔ اور مجھے پورا یقین ہے کہ جب میں دوبارہ کشمیر دیکھوں گا تو اہلِ کشمیر میں خود اعتمادی اور عزتِ نفس کا دور دورہ دیکھوں گا، انہیں دنیا کے امیر سے امیر اور مہذب سے مہذب ملکوں کے باشندوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتے دیکھوں گا۔

مولانا غلام رسول مہر

اہلِ کشمیر کا بنیادی حق

کشمیر کا مسئلہ دراصل اسی وقت پیدا ہوگیا تھا جب گزشتہ صدی کے عشرۂ دوم میں سکھوں نے اس خطۂ جنت نظیر پر قبضہ کیا تھا اور وہاں کی پچانوے فی صد اسلامی آبادی پر ظلم و جور کی بجلیاں گرنے لگی تھیں۔ سکھوں کا دور ختم ہوا تو ان کی جگہ ڈوگروں نے لے لی۔ پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے تک ڈوگروں کی حکمرانی پر ایک سو سال کے لیل و نہار گزر چکے تھے اس حکمرانی کی پوری سرگزشت صرف تین لفظوں میں پیش کی جا سکتی ہے۔ یعنی "خون"، "پسینہ" اور "آنسو"۔ کشمیری مسلمانوں کے حقوق کا خون بے دریغ بہتا رہا۔ اور ان کے جسموں کا خون بہانے میں بھی حتی الامکان کوتاہی جائز نہ سمجھی گئی۔ ان مسلمانوں نے ہنر مندی و کاروانی میں آنکھوں کا تیل ٹپکایا جسمانی محنت و مشقت میں اپنا پسینہ پانی کی طرح بہایا۔ مگر ان کے پسینے کا دامن خون کے آنسوؤں کے سوا کچھ حاصل نہ کر سکا۔

پاکستان وجود میں آیا تو کشمیر کے متعلق صرف یہ سوال پیدا ہوا کہ ہندوستان یا پاکستان میں سے کسی ایک کے ساتھ الحاق کے صحیح فیصلے کا معیار کیا ہو سکتا ہے؟ اسی معاملے نے کشمیر میں جنگ کی صورت اختیار کر لی تھی۔ آخر ۱۹۴۹ء کے اوائل میں لڑائی ختم ہوگئی اور یہ اصول ہندوستان و پاکستان دونوں نے منظور کر لیا کہ الحاق کے باب میں فیصلے کے حقیقی حقدار صرف اہلِ کشمیر ہیں۔ وہ رائے عامہ کی بنا پر بالاتفاق یا اکثریت سے جو کچھ طے کریں گے اسی پر عمل ہوگا۔ یہی صحیح معیار تھا اور اسی طرح کشمیر میں اطمینان و دلجمعی کا دور شروع ہو سکتا تھا۔

صبح کب ہوگی؟

"نصرت" نے کشمیر نمبر نکالنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس نمبر میں ہر قسم کی قیمتی معلومات فراہم ہو جائیں گی۔ مثلاً مسئلہ کشمیر کی سرگزشت، اس کے مختلف پہلوؤں پر تبصرہ اور اس امر کی تعیین کہ مختلف مواقع پر مختلف امور میں کوتاہی کس فریق سے ہوئی؛ اور راہِ حق و صواب سے انحراف کس نے کیا؛ یہ تمام معاملے اپنی جگہ بڑے اہم اور توجہ طلب ہیں۔ یقیناً "نصرت" کی سعی و اہتمام سے ایسی معلومات یکجا ہو جائیں گی کہ کوئی شخص چاہے تو صرف یہ خاص نمبر ایک نظر دیکھ کر مسئلہ کشمیر کے مختلف پہلوؤں سے پوری طرح آگاہی حاصل کر لے۔ بعض دوسری خدمات کی طرح "نصرت" کی یہ خدمت بھی ہر لحاظ سے قابلِ قدر اور مستحقِ تبریک ہے۔ تاہم مجھ سے پوچھا جائے تو اصل معاملہ صرف ایک قوم کے حق کا ہے جو بہترین صلاحیتوں کا مرجع و مصدر ہونے کے باوجود ڈیڑھ سو سال سے بدنصیبی کی چکی میں پس رہی ہے۔ پاک و ہند کی اکثر اقوام کے خانۂ تقدیر کا اندھیرا اجالے سے بدل گیا لیکن اہلِ کشمیر کی شبِ تاریک کے افق پر ابھی تک کوئی ایسا نشان جلوہ افروز نہیں ہوا۔ جسے طلوعِ سحر کا مقدمہ سمجھا جا سکے۔

اصل مسئلہ

اصل مسئلے کو کوئی پیچیدہ بنانا چاہے تو بیسیوں عذر تراش سکتا ہے۔ خواہ وہ کتنے ہی بے بنیاد کیوں نہ ہوں۔ مگر دراصل اس میں کوئی پیچیدگی نہیں۔ مطالبہ یہ اور صرف یہ ہے۔ کہ کشمیر کے مستقبل کا معاملہ اہلِ کشمیر سے تعلق رکھتا ہے۔ ان کی رائے آزاد فضا میں معلوم کر لینی چاہیئے۔ اور اس رائے کے مطابق فیصلہ ہو جانا چاہیئے۔ اصلاً بھی فیصلے کے مجاز اہلِ کشمیر ہی ہیں اور ۱۹۴۹ء میں جو کچھ طے ہوا تھا وہ بھی یہی تھا۔ اگر کوئی فریق فیصلے کی اس حقیقی بنیاد و اساس سے اعراض کرتا ہے تو وہ اولاً عہد و اقرار سے انحراف کا مجرم ٹھہرتا ہے۔ ثانیاً اس صورت فیصلہ کو پس پشت ڈالتا ہے۔ جو جمہوریت کے نقطۂ نگاہ سے واحد منصفانہ صورت ہے۔ یعنی استصواب رائے۔
میں سمجھتا ہوں کہ ہر معاملے میں دو رائیں ہو سکتی ہیں مہر

فریق اپنے نقطۂ نگاہ کے اثبات اور فریق مخالف کے نقطۂ نگاہ کی تضعیف کے لیے ہر طرح کی موشگافیاں کر سکتا ہے۔ تاہم اہل کشمیر کے بنیادی حق سے اختلاف و اعراض کی کیا گنجائش ہے؟

کہا گیا ہے کہ "اہل کشمیر" نے کچھ مدت پیشتر ایک فیصلہ ہندوستان کے حق میں کر دیا تھا۔ لیکن ساری دنیا جانتی ہے کہ وہ اہل کشمیر کا فیصلہ نہ تھا۔ صرف ان لوگوں کا فیصلہ تھا جو مقبوضہ کشمیر میں بخشی غلام محمد کے حامی تھے۔ یقیناً ایک محدود گروہ کا فیصلہ جس کی اصل کیفیت سے کسی کو کچھ آگاہی نہیں۔ اہل کشمیر کا فیصلہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اگر یہ فیصلہ واقعی اہل کشمیر کا ہوتا تو کیا آج بخشی غلام محمد سے بڑھ کر بھی کسی کو ہر دلعزیزی حاصل ہو سکتی تھی؟ مگر دنیا جانتی ہے اور دیکھ رہی ہے کہ آج بخشی صاحب سے بڑھ کر اہل کشمیر کے نزدیک کوئی معتوب نہیں۔ خواہ وہ مقبوضہ کشمیر میں رہتے ہوں یا آزاد کشمیر میں۔ نیز میں کہتا ہوں کہ اگر بخشی صاحب اور ان کے حامیوں کو اس رائے پر کسی بھی درجے میں وثوق ہے تو وہ آزاد فضا میں استصواب سے کیوں گریزاں ہیں؟ حیلہ سازیوں اور بہانہ طرازیوں کی کمین گاہوں میں منہ چھپا کر بیٹھے رہنے کے لیے کیوں مضطرب ہیں؟ اگر وہ سچے ہیں تو ان کے بیان کردہ فیصلے کی تصدیق ہو جائے گی۔ اگر وہ اس کے لیے تیار نہیں تو ظاہر ہے کہ یہ امر ان کے دل کے کھوٹ اور ان کے موقف کی ناپائیداری کی بین دلیل اور قاطع برہان ہے۔

حق و انصاف کا مطالبہ

ہم ان لوگوں میں سے ہوں جو تفصیلات کی بحثوں میں وقت صرف کرنے کے بجائے صرف بنیادی مسئلے کو مرکز توجہ بنا لینا ضروری سمجھتے ہیں۔ تفصیلات کی بحثیں بارہا ہوئیں اور نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ کیوں اسی چیز کو مدار گفتگو نہ بنایا جائے جس پر سب کچھ موقوف ہے۔ یعنی اہل کشمیر کا فیصلہ۔

میں بین الاقوامی دائرے کی ہر قوت، ہر ادارے اور ہر فرد سے صرف یہ پوچھتا ہوں کہ اس معاملے کے متعلق تو دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ فیصلے کے اصل حقدار اصولاً بھی اہل کشمیر ہیں اور ۱۹۴۷ء میں طے بھی یہی ہوا تھا۔ ہندوستان اور پاکستان کے ساتھ کسی کے سیاسی روابط کی نوعیت خواہ کچھ ہو لیکن اہل کشمیر کے مذکورہ بالا حق کی حمایت میں تامل کی کون سی وجہ ہے؟ جمہوریت یا حق و انصاف کے کس ضابطے کی بنا پر کسی کے لیے اس باب میں سکوت جائز ہے؟

بارہا گفتگوئیں ہوئیں اور صرف انتظامات استصواب پر اختلاف کے باعث ناکام ہوتی رہیں۔ انجمن اقوام متحدہ نے اقوام عالم کے بیسیوں دردوں اور پریشانیوں کا مداوا اپنے ذمے لے رکھا ہے اور وہ مداوا ڈھونڈنے میں لگی رہتی ہے، کیا یہ ممکن ہے کہ کشمیر کے ناسور کا علاج زیادہ مؤثر طریق پر شروع کر دے؟ یہ نہ ہو کہ دوا کی ایک خوراک آج پلا دی۔ پھر مدت تک مریض کی خبر نہ لی۔ آخر اہل کشمیر کب تک اپنے حق کے لیے پریشان رہیں گے؟ ۱۸۴۶ء میں انگریزوں نے کشمیر کو اس طرح فروخت کیا تھا کہ امریکی آبادکاری کے ابتدائی دور میں حبشی غلام بھی شاید ہی اس طرح بکے ہوں۔ اس واقعے پر ایک سو چودہ سال گزر چکے ہیں۔ ابھی کب تک انہیں معرض امتحان میں رکھنا منظور ہے؟

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

مسئلہ کشمیر اور حق پرستی

کشمیر کا معاملہ ہماری قومی زندگی کے لیے غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔

اس معاملے میں میرا نقطۂ نظر نہ وطن پرستانہ ہے نہ قوم پرستانہ ۔ میں سارے معاملات کو سراسر حق پرستی کی نظر سے دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں ۔ اور یہی میرا نقطۂ نظر کشمیر کے معاملے میں بھی ہے میری یہ قطعی رائے ہے کہ کشمیر پر قبضہ کرنے میں ہندوستان نے سراسر زیادتی کی ہے اور اس کے مقابلے میں پاکستان کا دعویٰ بالکل حق بجانب ہے۔ میں کشمیر کو پاکستان کا ایک قدرتی حصہ سمجھتا ہوں ۔ میرے نزدیک جغرافیائی، نسلی، تاریخی، معاشی، تمدنی، مذہبی ہر لحاظ سے کشمیر پاکستان سے تعلق رکھتا ہے نہ کہ ہندوستان سے ، سیدھی اور صاف بات یہ ہے کہ ہندوستان نے کشمیر پر قبضہ اس وجہ سے نہیں کیا کہ وہ اس کا حق تھا۔ بلکہ صرف اس وجہ سے کہ تقسیم کے وقت پاکستان کمزور تھا اور ہندوستان اتنی طاقت رکھتا تھا کہ اپنے حق سے زائد ایک چیز حاصل کر لے میں اس وقت اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا کہ ہماری کمزوریوں کے ساتھ ہماری کوتاہیاں کیا تھیں ۔ بہرحال یہ واقعہ اپنی جگہ بالکل عیاں ہے کہ اگر پاکستان نے اس وقت کشمیر پر قبضہ کر لیا ہوتا تو کوئی معقول آدمی یہ تصور نہیں کر سکتا۔ کہ ہندوستان بھی اسی طرح کشمیر کا دعویٰ لے کر اٹھتا جس طرح آج پاکستان اٹھا ہے اور وہ بھی پاکستان کی طرح یہ چیلنج کرتا کہ آؤ ، کشمیر میں استصواب رائے عام کرا کے دیکھ لو ۔ وہ خود جانتا ہے کہ ہندوستان و پاکستان کی تقسیم محض مذہب کی بنیاد پر ہوئی تھی ۔ وہ خود جانتا ہے کہ وہی علاقے پاکستان بنائے گئے ۔ جہاں مسلمان اکثریت میں تھے اور وہی علاقے ہندوستان میں شامل کیے گئے ۔ جن میں ہندوؤں کی اکثریت تھی ۔ وہ خود جانتا ہے کہ تقسیم سے پہلے اور تقسیم کے دوران میں جو کشت و خون ہوا ، جو قتل عام ہوا ۔ جو لوٹ مار ہوئی ۔ وہ سراسر اس بنیاد پر ہوئی کہ ہندوؤں اور سکھوں کے نزدیک ہر مسلمان کشتنی تھا اور مسلمان کے نزدیک ہر ہندو اور سکھ گردن زدنی تھا ۔ ان ساری باتوں کو جانتے ہوئے کون یہ مان سکتا ہے کہ کشمیر جیسے مسلم اکثریت کے علاقے کو ہندوستان واقعی ایمانداری کے ساتھ اپنا حق سمجھتا اور اگر پاکستان اس پر قابض ہو گیا ہوتا تو ہندوستان بھی یہ دعویٰ کرنے کی جرأت کر سکتا کہ استصواب رائے کرا کر دیکھ لیا جائے، کشمیر کے باشندے ہندوستان سے الحاق کے حق میں رائے دیں گے ۔ پس یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے جسے ایک ہٹ دھرم آدمی کے سوا کوئی جھٹلا نہیں سکتا ۔ کہ کشمیر پر ہندوستان کا قبضہ حق کی بنیاد پر نہیں ہوا بلکہ سراسر طاقت کی دھاندلی سے ہوا ہے اور اس معاملے کا سب سے زیادہ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ ہندوستان نے یہ صریح بے شرمانہ دھاندلی اس زمانے میں کی جبکہ گاندھی جیسا اخلاق کا علمبردار وہاں موجود تھا اور اس شخص کے ہاتھوں کی جو انگریزوں کی غلامی کے دور میں سیاست کو طاقت کے بجائے اخلاق پر قائم کرنے کا سب سے زیادہ بلند بانگ مدعی بنا ہوا تھا۔ یعنی پنڈت جواہر لال نہرو ۔

کشمیر اور جوناگڑھ کے معاملے میں ہندوستان نے بیک وقت جو دو مختلف پالیسیاں اختیار کی ہیں ۔ پنڈت نہرو کے سوا اور کون آدمی ایسا ہوگا جو عقل رکھتے ہوئے ان دونوں پالیسیوں کو متضاد ماننے سے انکار کر سکے؟ ایک جگہ آپ اس بنیاد پر قبضہ کرتے ہیں کہ وہاں کا حکمران چاہے مسلمان ہو ۔ مگر آبادی کی اکثریت ہندو ہے ۔ دوسری جگہ آپ اس بنیاد پر قبضہ کر لیتے ہیں کہ وہاں کی آبادی کی اکثریت چاہے مسلمان ہو مگر حکمران ہندو ہے ایک جگہ کا حکمران پاکستان سے الحاق کا اعلان کرتا ہے تو آپ اسے یہ کہہ کر ماننے سے انکار کرتے ہیں کہ حکمران نے الحاق کا فیصلہ باشندوں کی رضامندی حاصل کیے بغیر کر دیا ہے دوسری جگہ کا حکمران ٹھیک اسی طرح باشندوں کی رضامندی حاصل کیے بغیر ہندوستان سے الحاق کا اعلان کرتا ہے تو آپ اسے فوراً قبول کر لیتے ہیں اور اس الحاق کی دستاویز کو ایک سراسر آئینی دستاویز سمجھ کر دانتوں سے پکڑ لیتے ہیں۔ ایک جگہ آپ کے نزدیک اپنے علاقے کی قسمت کا فیصلہ کرنا باشندوں کا کام ہے اور حکمران کا فیصلہ بالکل بے معنی ہے ، کیونکہ وہاں کے باشندوں کی اکثریت ہندو اور حکمران مسلمان ہے دوسری جگہ اس کے برعکس حکمران کا فیصلہ آپ کے نزدیک بالکل بامعنی اور سو فی صد قانونی ہے اور اس کو تسلیم کرنے کے لیے باشندوں کی مرضی معلوم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ۔ کیونکہ وہاں حکمران ہندو ہے اور باشندوں کی اکثریت مسلمان ۔ کیا یہ کھلا ہوا تضاد نہیں ہے ؟ یہ حرکتیں ایک ایسے سیاسی لیڈر کے سوا اور کون کر سکتا ہے جو حق اور انصاف اور راستی کے بجائے قوت اور زور کی بنا پر اپنی پالیسی بناتا ہو اور بالکل ایک ابن الوقت OPPORTUNIST

کی طرح ہر موقع کے لیے ایک نیا اصول گھڑ لیتا ہو ؟ واقعہ یہ ہے کہ پنڈت نہرو نے لیف اس طرز عمل سے اپنی اُس ساری عزت و وقعت کو خاک میں ملا دیا ہے جو انہوں نے عمر بھر سیاست میں اخلاق کی علمبرداری کر کے حاصل کی تھی۔

اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں یہ بھی ظاہر کر دوں کہ میری نگاہ میں کشمیر کے معاملے کی اصل اہمیت اور غیر معمولی اہمیت کس وجہ سے ہے اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ہم اپنے ملک کے لیے ایک وسیع علاقہ حاصل کرنا چاہتے ہیں یا اپنے ملک کی معیشت کے لیے کشمیر کو ناگزیر پاتے ہیں۔ یہ ایک قوم پرست اور وطن پرست کا نقطۂ نظر تو ہو سکتا ہے مگر ایک حق پرست کا نقطۂ نظر نہیں ہو سکتا۔ ہمارے لیے اس معاملے کی ساری اہمیت صرف اس وجہ سے ہے کہ کشمیر کے ۳۰ - ۲۵ لاکھ مسلمانوں کا مستقبل ہم کو خطرے میں نظر آتا ہے مشرقی پنجاب سے مسلمانوں کے اخراج کے بعد انڈین یونین میں کشمیر کی شمولیت میرے نزدیک مسلمانانِ کشمیر کے لیے سخت مہلک ہے۔ ان کو ہندوستان کے ساتھ اور تمام دنیا کے ساتھ تعلق رکھنے کے لیے جس راستے سے گزرنا ہوگا۔ وہ پٹھانکوٹ سے لے کر دہلی تک مسلمانوں سے خالی ہو چکا ہے اور ایک مدت دراز تک وہ مسلمانوں کی آمد و رفت کے لیے سخت خطرناک رہے گا۔ یہ بھی کچھ بعید نہیں ہے کہ جن اغراض کے لیے پاکستان کی سرحد سے قریب کے تمام علاقے مسلمانوں سے خالی کرائے گئے ہیں۔ انہی اغراض کے لیے کل کشمیر کو بھی مسلمانوں سے خالی کرانے کی کوشش کی جائے۔ لہٰذا خود باشندگانِ کشمیر کی سلامتی بھی اسی میں ہے کہ کشمیر پاکستان میں شامل ہو۔ کون نہیں جانتا کہ جموں کے علاقے سے بکثرت مسلمان نکالے جا چکے ہیں ؟ کس کو معلوم نہیں ہے کہ پٹھانکوٹ سے دہلی تک کا علاقہ مسلمانوں سے خالی ہو چکا ہے ؟ کس سے یہ بات چھپی ہوئی ہے کہ ہندوستان نے قصداً ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت اپنے ان تمام علاقوں کو مسلمانوں سے خالی کرایا ہے جو مغربی پاکستان کی سرحد سے متصل واقع ہیں اور اب ایسی پالیسی پر مشرقی پاکستان کی طرف بھی عمل ہو رہا ہے ؟ اس کو دیکھتے ہوئے کبھی یہ توقع ہی نہیں کی جا سکتی کہ اگر کشمیر کی قسمت کا آخری فیصلہ ہندوستان کے حق میں ہو گیا۔ تو ہندوستان زیادہ مدت تک اپنے انتہائی شمالی سرے پر ایک مسلم اکثریت کے علاقے کو برداشت کرتا رہے گا۔ کبھی نہ کبھی وہ وقت ضرور آئے گا۔ جب کشمیر کی ساری مسلمان آبادی، مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کی طرح گھروں سے نکالی جائے گی اور مار مار کر اس کو بیک بینی و دو گوش پاکستان کی طرف دھکیل دیا جائے گا ـــ آج کشمیریوں کو جو تھوڑی بہت حمایت ہندوستان میں ہو رہی ہے یہ ہمیشہ رہنے والی چیز نہیں ہے یہ سب کچھ تو بس اسی وقت تک ہے جب تک کشمیر کا قضیہ معلق ہے اس کے یکسو ہو جانے کے بعد یہ ہرگز امید نہیں کی جا سکتی کہ ہندوستان اس مسلم اکثریت کو پاکستان کے قریب یوں اطمینان سے جیتا رہنے دے گا۔ اس لیے ان لاکھوں انسانوں کی خاطر جو کشمیر میں بستے ہیں ان کی جان، ومال اور آبرو کی خاطر، اور ان کے پیدائشی انسانی حقوق کی خاطر ہم یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ انہیں ہندوستان کے چنگل سے نکالا جائے اور ہم صاف کہتے ہیں کہ اس مقصد کے لیے ہم آخری حدود تک جانے کو تیار ہیں۔

سید محمد تقی
مدیر روزنامہ جنگ

کشمیر اور انسانیت کا مستقبل

پروفیسر برٹرینڈ رسل نے جن سے پچھلے دنوں مجھے لندن میں ایک طویل فلسفیانہ بحث کا موقع ملا تھا ایک بڑی دلچسپ کتاب "سماج پر سائنس کا دباؤ" ـــــ کے نام سے لکھی ہے جس میں انہوں نے جدید سماجوں پر سائنس جو اثرات ڈال رہی ہے ان کا اپنے مخصوص ادب آمیز علمی انداز میں ذکر کیا ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے ایک جگہ کشمیر کا ذکر کرتے ہوئے ہندوستان کے وزیر اعظم پنڈت نہرو کے طرز عمل پر کڑی تنقید کی ہے۔ مسٹر رسل نے کچھ اس طرح کی بات کی ہے کہ جب مسٹر نہرو جیسا بظاہر معقول شخص بھی کشمیر کے معاملے میں دھاندلی پر اتر آتا ہے تو اس وقت ان لوگوں کو بڑی مایوسی ہوتی ہے جو گروہوں، جماعتوں اور ملکوں کے اختلافات ہوشمندی اور ایمان داری کے ساتھ طے کرنے پر زور دیتے ہیں۔ کشمیر کے سلسلے میں مسٹر نہرو کے طرز عمل پر پروفیسر رسل کی یہ تنقید دراصل اس نقطۂ نظر کی نمائندگی کرتی ہے جو اس معاملے میں دنیا کے غیر جانبدار سنجیدہ لوگ رکھتے ہیں۔ دنیا کے دوسرے تنازعوں کی طرح کشمیر کے معاملے میں بھی پورے قضیے پر محض جذباتی انداز میں سوچنے کی کوشش کی جاتی ہے اس لیے کہ بدقسمتی سے یہ جذباتی انداز انسانی فطرت سے کچھ اس قدر ہم آہنگ معلوم ہوتا ہے کہ بعض دفعہ یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہیں تفکر اور سوچ انسان کے عام فطری رجحان کے خلاف تو نہیں ہے۔ اگر ماضی کی تاریخ اور اس کے تجربات بطور ثبوت کے استعمال کیے جا سکتے ہیں تو یہ کہنا تاریخ کے سابقہ عمل کے عین مطابق ہوگا کہ تفکر اور غیر جذباتی انداز نظر ایسا نایاب رہا ہے جو کبھی اتفاق ہی سے دستیاب ہو سکا ہے۔ انسان نے عام طور پر جذبات میں بند ہو کر سوچا اور اپنی خواہشوں کے تقاضوں کے مطابق عمل کیا ہے۔ اس لئے اگر کشمیر کا قضیہ گہرے جذبات کی الجھنوں میں پھنسا رہا ہے تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہیئے۔ کشمیر کا قضیہ ابتدا میں جس منطق سے پیدا ہوا وہ یہ تھی کہ غیر منقسم ہندوستان کی ریاستوں میں اقتدار اعلیٰ ریاستوں کے حکمران رکھتے تھے یا ریاستی عوام ـــــ یہ موقف جمہوری آداب اور روایتوں کے عین مطابق تھا لیکن ریاست کشمیر کے سلسلے میں بھارت کو جو جواز مہیا ہو سکا وہ یہ تھا کہ ریاست کے حکمران نے بھارت میں شمولیت کی خواہش یا فیصلہ کیا تھا اور اس لئے اس خاص معاملے میں یہ مان لینا چاہیئے کہ اقتدار اعلیٰ ریاستی حکمران کو حاصل تھا۔ مگر اس عہد میں زیادہ عرصہ اس جیسے غیر جمہوری موقف پر رکنا ممکن نہ تھا۔ اب آخر یہ کیسے ہوتا کہ جمہوری آداب اور تقاضوں کو کشمیر کی سرحد تک تو قابل اطلاق قرار دیا جاتا مگر کشمیر و جموں کے علاقہ میں ایک بالکل نئی منطق کام میں لائی جاتی۔ اس لئے جلد ہی بھارت کو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ کشمیر کا قضیہ کشمیری عوام کی اپنی مرضی سے طے ہوگا اور یوں اس بات کی تجدید ہو گئی کہ اقتدار اعلیٰ عوام کو حاصل ہے۔ ریاست کے حکمران کو نہیں۔ گویا یہ تسلیم کر لیا گیا کہ جموں اور کشمیر کے حکمران نے بھارت میں شمولیت کا جو فیصلہ کیا تھا وہ صحیح نہ تھا اس لئے کہ والیٔ ریاست کو اس قسم کی شمولیت کا فیصلہ کرنے کا کوئی حق حاصل نہ تھا۔ بھارت کے موقف میں اس معقولیت پسندانہ تبدیلی کے بعد مسئلے نے جو رخ اختیار کیا وہ یہ تھا کہ پاکستان اور بھارت دونوں اس بات پر متفق ہو گئے کہ کشمیر کی قسمت کا فیصلہ کشمیری عوام کے آزاد استصواب رائے سے ہوگا، طاقت اور تشدد کی دلیل سے نہیں ـ یہ فیصلہ جمہوری اقدار کی جیت تھا لیکن جلد ہی مسٹر نہرو نے اپنے موقف کو بدل دیا اور چند ایسے معاہدوں کی وجہ ٹھہرا کر جو پاکستان نے اپنے دوستوں سے کیے تھے کشمیری عوام سے ان کا یہ حق چھین لیا کہ وہ اپنی قسمت کا فیصلہ آپ کر سکتے ہیں۔ لیکن پاکستان کے کسی صحیح یا غلط اقدام کی وجہ سے کشمیری عوام خود ارادیت کے حق سے کیسے محروم کیے جا سکتے ہیں، مسٹر نہرو نے اس کی تائید میں کوئی دلیل نہیں دی۔ بھارت کے اس موقف میں تبدیلی کے بعد اب مسئلے نے جو

رخ اختیار کیا وہ یہ ہے کہ پاکستان اور اقوامِ متحدہ تو اہلِ کشمیر کے حق خود ارادیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ ان دونوں کا موقف یہ ہے کہ قضیۂ کشمیر کا حل اس آزادانہ استصواب رائے سے ہوگا جس میں اہلِ کشمیر بھارت یا پاکستان میں شمولیت کا فیصلہ کریں گے لیکن بھارت ان فیصلوں کو حتمی قرار دیتا ہے جو کشمیر اسمبلی نے بھارت میں شمولیت کی حمایت میں کئے ہیں۔ اب اگر صورت یہ رونما ہوئی ہوتی کہ کشمیر اسمبلی نے پہلے بھارت میں شمولیت کا فیصلہ کیا ہوتا اور اس کے بعد بھارت نے کشمیر پر قبضہ کیا ہوتا تو بات بالکل صحیح ہو جاتی لیکن یہاں صورت اس کے بالکل برعکس ہوئی کہ کشمیر پر بھارت کا قبضہ پہلے ہوا اور اس قبضے کے زمانہ میں فیصلہ بعد میں لیا گیا۔ حق طاقت سے پیدا ہوتا ہے یا دلیل سے۔ یہ جھگڑا خاصا پرانا ہے۔ تاہم پچھلے چند سو سال میں، انسان کو طوعاً و کرہاً یہ مان لینا پڑا کہ حق دلیل سے پیدا ہوتا ہے طاقت سے نہیں۔ بھارت نے کشمیر کے معاملے میں جو موقف اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ حق طاقت سے پیدا ہوتا ہے دلیل سے نہیں، دلیل طاقت کے استعمال کے بعد ضرورت اور مناسب حالات دیکھ کر گھڑ لی جاتی ہے۔ لیکن ہندوستان کے وزیر اعظم مسٹر نہرو کے ساتھ انصاف کے پیش نظر ہمیں چند قدم پیچھے ہٹ کر ان دلیلوں کو بھی سننا چاہیئے جنہیں وہ بیان کم کرتے ہیں مگر جو ان کے تحت الشعور میں ضرور موجود رہتی ہیں۔ مسٹر نہرو کا استدلال کچھ اس قسم کا ہے ـــــ پاکستان کا مطالبہ محض جذباتی مطالبہ تھا جسے مجبورکن حالات میں تسلیم کیا گیا ہے۔ اس مطالبے کے ساتھ کوئی منطق تو موجود تھی نہیں۔ حالات کا دباؤ تھا کہ ایک جذباتی مطالبے کو ماننا پڑا اب اگر تقسیم کی ساری منطق ہی جذبات سے اٹھی ہو اور پورا برصغیر غیر منطقی اساس پر بٹا ہو تو صرف کشمیر کے معاملہ میں ایک غیر منطقی موقف کو کیوں ہدفِ اعتراض قرار دیا جائے۔ ایک بہت بڑی جذبات پرستی اور غیر منطقیت کے جواب میں اگر ایک چھوٹی سی جذبات پرستی اور غیر منطقیت کی جا رہی ہے تو اسے موردِ طعن قرار دینے کا کیا موقع ہے۔ کشمیر کے سلسلے میں مسٹر نہرو کا استدلال اگر واقعی یہی ہے تو یہ استدلال ان کے اندازِ فکر کو سمجھنے میں کسی قدر بھی مفید کیوں نہ سمجھا جائے مگر قابلِ قبول لازماً قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس استدلال میں جن تین قضیوں سے کام لیا گیا ہے وہ یہ ہیں۔ پہلے برصغیر کی تقسیم محض جذباتی منطق سے وجود میں آئی تھی۔ دوسرے یہ کہ ایک بڑی جذباتیت پرستی کے جواب میں ایک چھوٹی جذباتیت پرستی پر چلنے کا جواز پیدا ہو جاتا ہے اور تیسرے یہ کہ کشمیر کے معاملے میں بھارت جذبات پرستی پر عامل ہے مگر یہ چھوٹی جذباتیت پرستی ہے اس نسبتہً بڑی جذباتیت پسندی کے مقابلے جو قیامِ پاکستان کی اساس ہی تھی۔

سب سے پہلے قضیہ ـــ تقسیمِ ہند ـــ کو لیجئے۔

یہاں تقسیمِ ہند کی بحث چھیڑنے کا مقصود نہیں ہے لیکن سوال یہ ہے کہ تقسیمِ ہند کے مطالبے کو جذباتیت قرار دیتے وقت ـــ لفظ جذباتیت ـــ سے کیا مراد لی جاتی ہے۔ کیا کانگرس اور مسلم لیگ دونوں متحدہ ہند کا مطالبہ کرتیں تو بین الاقوامی سماج قائم کرنے کے آئیڈیل کے پیش نظر اس مطالبے کو جذباتیت پسندی قرار دینا غلط ہوتا۔ یہ دعویٰ کہ برصغیر کی تقسیم محض مذہبی اختلاف کی بنا پر ہوئی ہے تسلیم نہیں ہے تقسیم کا سبب تہذیبی تھا جس میں مذہبی اختلاف بھی شامل ہے تاہم اگر تقسیم کی واحد اساس مذہب ہی کو مان لیا جائے اور اگر مذہب کو جذباتیت پرستی ہی مان لیا جائے تو بھی سوال یہ ہے کہ قومیت کو جذباتیت کے طعنے سے کیسے بچایا جا سکے گا۔ لیکن ان تمام دلائل کو نظر انداز کر کے یہ مان لیجئے کہ پاکستان کا قیام جذباتیت پسندی کے نتیجہ میں عمل میں آیا اور مسٹر نہرو کی کانگرس نے بہ اکراہ یہ مانا تھا کہ برصغیر دو آزاد ملکوں کا نام ہے جن میں سے ایک بھارت اور دوسرا پاکستان ہے۔ مسٹر نہرو کے یہ تسلیم کر لینے کے بعد ۱۴ یا پندرہ اگست ۱۹۴۷ء کو جو صورت تھی وہ یہ تھی کہ برصغیر دو آزاد ملکوں سے عبارت تھا جن میں سے ایک پاکستان اور دوسرا بھارت تھا۔ اب اس مقام پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پاکستان اور بھارت کو اپنے باہمی اختلافات کے حل میں کس پالیسی پر عمل کرنا چاہیئے۔ ایک پالیسی وہ ہے جس پر جنگل کے بسنے والے کروڑوں سال سے چل رہے ہیں وہ پالیسی یہ ہے کہ جس کے پنجے میں زیادہ قوت ہو وہی دوسرے کو مار کھائے اور دوسری پالیسی وہ ہے جسے انسانوں نے حال ہی میں بڑی قربانیاں دیکر معلوم کیا ہے۔ وہ پالیسی یہ ہے کہ قوموں کے جھگڑے جمہوری آداب اور بین الاقوامی قانون کی رو سے، جو دلیل و منطق سے پیدا ہوا ہے طے ہونے چاہئیں۔ مسٹر نہرو بڑی آسانی سے پہلی پالیسی پر چل سکتے ہیں جو کہ زوں

سال کی آزمائی ہوئی اور ۱۲ سال سے ان کے لئے کشمیر کی حد تک مفید ثابت ہوتی چلی آرہی ہے۔ مگر اس پالیسی میں خطرہ یہ ہے کہ اسے بھارت سے کوئی زیادہ طاقتور ملک اپنا کر بھارت کی شمالی سرحد پر پیش قدمی شروع کر سکتا ہے جو بہت زیادہ پیچیدگیاں پیدا کر سکتی ہے۔ اس لئے ہی تو انسانوں نے بڑی بڑی ٹھوکریں کھا کر فیصلہ یہی کیا ہے کہ صحیح پالیسی دوستی ہی ہے اور اسی میں مآل کار سب کا بھلا ہے۔

اب اگر بات یہی طے ہو کہ قوموں کے قضیے دلیل و منطق اور معقولیت ہی سے طے ہونے چاہئیں، ہوائی جہازوں اور توپوں کے اوسط سے نہیں تو پھر ایک بار یہ تسلیم کر لینے کے بعد کہ پاکستان ایک جداگانہ اور آزاد ملک ہے بھارت کو کشمیر یا اور کسی جھگڑے میں دھاندلی کرنے کا حق باقی نہیں رہتا اور اس لئے یہ دلیل کہ تقسیم ہند (مسٹر نہرو کے بقول) بڑی دھاندلی تھی جس کے جواب میں کشمیر کی چھوٹی دھاندلی کا جواز پیدا ہو جاتا ہے۔۔ ناقابل قبول ہے۔ پاکستان سے ہر اختلاف بین الاقوامی اصولوں کی روشنی میں طے کرنا ہوگا طاقت کی منطق اور آگ برسانے والے گولوں کی دلیل سے نہیں۔ سوال یہ ہے کشمیر کا قضیہ کیسے طے ہو۔ صورتیں صرف دو ہیں۔ آزاد استصواب کے ذریعے ـــ یا ـــ کشمیر کے علاقہ میں پہلے فوج لے آنے کی دلیل سے۔

پہلے فوج لے آنے کی دلیل ہٹلر نے وضع کی تھی لیکن یہ دلیل ہیروشیما میں ٹوٹ گئی ہے۔ اس لئے اب واحد راستہ یہ ہے کہ بات معقولیت اور جمہوری آداب کی کی جائے اور یہ سمجھنا مشکل ہے کہ اہل کشمیر کے استصواب رائے کو آخری حکم ماننے کے بجائے اور وہ کون سا راستہ ہے جو معقولیت اور جمہوریت کے تقاضوں سے پیدا ہوتا ہے۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ پنڈت نہرو اس حل کو تسلیم نہیں کرتے اور حل ہی کو کیا تسلیم نہیں کرتے ایک اچھے خاصے بین الاقوامی ادارے کے فیصلے کو بھی ٹھکرا رہے ہیں۔ اب ایسی صورت میں مسٹر نہرو کو کیسے یہ سمجھایا جائے کہ وہ شیروں اور بھیڑیوں سے عقل سیکھنے کے بجائے بین الاقوامی ادارے کی دلیل و منطق کو سنیں اور اپنے اس موقف کو بدلیں جو ان کے خلاف استعمال ہونے لگا تو پھر وہ بڑی مشکل میں پھنس جائیں گے۔

کشمیر کے مسئلے کا یہ تو تھا وہ پہلو جو بھارت سے تعلق رکھتا ہے کشمیر کے معاملے کا پاکستان سے جہاں تعلق پیدا ہوتا ہے وہ بھی ہمارے لئے کچھ سوچنے کا متقاضی ہے۔ کشمیر کے سلسلے میں پاکستان کا یہ موقف کہ کشمیر مسلم اکثریتی علاقہ ہے اور اس لئے اسے پاکستان میں شامل ہونا چاہئے اب اتنا اہم نہیں رہا ہے اور مجھے یہ شبہ ہے کہ یہ پہلے بھی اتنا اہم نہیں تھا جتنا بہت سے حضرات باور کرتے رہے ہیں۔ آج کشمیر کے مسئلے کی جو نوعیت بن گئی ہے وہ کچھ اس قسم کی ہے کہ ایک تو یہ قضیہ بین الاقوامی اختلافات کو طاقت سے طے کرنے نہ کرنے کے اصول کی کسوٹی بن گیا ہے اور دوسرے اس مسئلہ نے جو رخ اختیار کر لیا ہے اس سے یہ سوال پیدا ہو گیا ہے کہ کیا کسی ملک کو ایک بین الاقوامی ادارے کے فیصلوں کو ٹھکرا کر اپنی من مانی کرنے کی اجازت دی جا سکتی ہے۔ یہ سوال کہ کشمیر پاکستان کا حصہ بنے یا بھارت میں رہے بھارت اور پاکستان کے لئے جو کچھ بھی اہمیت کیوں نہ رکھتا ہو، لیکن اصل اہمیت جو بین الاقوامی اطلاق رکھتی ہے اس سوال کی ہے کہ کیا بین الاقوامی جھگڑوں میں جمہوری آداب اور ضابطوں کے بجائے اندھی طاقت کو فیصلہ کن قرار دینے کا اصول تسلیم کیا جا سکتا ہے اور کیا انسانیت کا مستقبل اس وقت تک بیمار کن تباہیوں سے بچنے کی ضمانت حاصل کر سکتا ہے جب تک ایک بین الاقوامی ادارے کے فیصلے کو سب کے لئے قابل عمل قرار نہ دیا جائے گا۔ فرض کیجئے کشمیر بھارت ہی کے قبضے میں رہے اور پاکستان پچھلے بارہ سال کی طرح آئندہ بھی اس صورت حال کو برداشت کرنے کے لئے تیار ہو جائے تو کیا پاکستان کی اس خاموشی کا مطلب یہ ہوگا کہ نازی نظریے کے احیاء کو برداشت کر لیا جائے اور بین الاقوامی اصول و آداب کی اس شکست کو تسلیم کر لیا جائے جس کے بعد انسانیت کا مستقبل کبھی خطرے کی زد سے نہیں بچ سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ کشمیر کا مسئلہ چند وسیع اطلاقات کا حامل ہے، چند ایسے اثرات رکھتا ہے جس کا تعلق عام انسانیت اور اس کے مستقبل سے ہے۔ پاکستان کو کشمیر کی خاطر ہی نہیں بلکہ بین الاقوامی سلامتی کے پیش نظر بھی مسئلے کے اس رخ کو پیش ـــ کرنا چاہیے کہ اگر کشمیر کے سلسلے میں پاکستان ہار گیا تو وہ ایسے بین الاقوامی اصولوں کو شکست ہو جائے گی جنہیں منوانے کے لئے انسانیت نے عظیم قربانیاں دی ہیں۔ اور جن کی شکست برداشت کر کے آج کی نسل ایسے اندھیاروں میں جا پھنسے گی جن سے بچ نکلنا ممکن نہ ہوگا۔

ـــــ

میر عبدالعزیز

لداخ — چین — بھارت

بھارت کے وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے چین کے وزیر اعظم مسٹر چو اِن لائی کو بھارت آنے اور چین بھارتی سرحدی تنازع پر گفتگو کرنے کی دعوت دی ہے۔ یہ خبر اُن غیر جانبدار مبصروں کے لیے یقیناً باعث حیرت و تعجب ہے۔ جنہوں نے حال ہی میں بھارتی وزیراعظم کا یہ بیان پڑھا تھا۔ کہ فی الحال اس مسئلے پر چین اور بھارت کی گفتگو سے کوئی مفید مقصد حاصل ہونا محال ہے۔

کچھ عرصہ پہلے مسٹر چو اِن لائی نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ ہمالیائی سرحدوں پر بھارتی اور چینی فوجیں ساڑھے بارہ بارہ میل پیچھے ہٹ جائیں اور متنازع فیہ علاقہ خالی کر دیں۔ اس تجویز کو بھارتی قائدوں نے رد کر دیا تھا۔ اور بھارتی پریس نے اُسے اپنے لیے باعث ننگ قرار دیا تھا لیکن اب روسی مداخلت کی وجہ سے پنڈت نہرو نے سابقہ رویہ ترک کر دیا ہے۔ اور وہ چین سے گفت و شنید کرنے پر راضی ہو گئے ہیں ——— لیکن خدا ہی جانتا ہے کہ کن شرائط پر ——— "جس کی لاٹھی اس کی بھینس ——— یا سیاسی زبان میں جو قابض ہے۔ وہی حاکم ہے" ——— کشمیر کے معاملے میں بھارت پچھلے بارہ سال سے اسی پالیسی پر عمل پیرا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ اب چین سے بات کرتے ہوئے پنڈت نہرو چین کو بھی "لاٹھی" رکھنے کا حق ضرور دیں گے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ کشمیر کا تنازع، پاکستان کے ساتھ سلامتی طبع سے حل کرنے میں ناکام رہنے کے بعد پنڈت نہرو نے اب یہ فیصلہ کیا ہے کہ بے زبان لداخیوں کی قیمت پر چین کو خوش کر دیا جائے۔

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ چین نے ضلع لداخ کا تقریباً دس ہزار مربع میل رقبہ قبضے میں کر رکھا ہے۔ بھارت یہ کر سکتا ہے کہ یہ رقبہ چین کے حوالے کر دے اور NEFA (شمال مشرقی سرحدی علاقہ) اور دوسرے علاقوں میں چھنے ہوئے رقبے واپس لے لے۔ قابل غور بات یہ ہے۔ کہ برطانوی ہند اور اُس وقت کی چینی حکومت کے درمیان سرحدی تنازعات کبھی طے نہ ہو پائے تھے۔ لیکن لداخ کا معاملہ آخری طور سے ۱۸۴۲ء میں چینی تبت اور جموں کے ڈوگرہ حکمرانوں کے درمیان طے پاگیا تھا۔ چین نے کبھی میک ماہن لائن کو تسلیم نہیں کیا۔ گائی ونٹ نے لندن کے آبزرور میں حال ہی میں لکھا ہے کہ "چین سے بھارت کا تنازع اس سرحد کا ہے جسے برطانوی شاہی طاقت نے متعین کیا تھا۔ جب برطانیہ نے ہندوستان کو فتح کر لیا تو اُس نے اُس کی سرحدوں کو اُس حد تک وسعت دینی شروع کی جتنی دور وہ بغیر کسی بڑی جنگ کے پہنچ سکتا تھا۔ اس عمل میں برطانیہ نے کچھ ایسے سرحدی علاقے پر بھی قبضہ کر لیا جو بیشتر غیر ہندوستانی باشندوں کا مسکن تھا۔ چین اور بھارت کی سرحد جس حد تک متعین ہے وہ یا تو یک طرفہ اور من مانی ہے۔ یا پھر یہ ان معاہدوں کی بنا پر متعین ہوئی ہے۔ جنہیں پیکنگ اب تسلیم نہیں کرتا گو چہ اس سلسلے میں اُس وقت کی مرکزی چینی حکومت سے باقاعدہ بات، چیت ہوئی تھی۔"

لیکن یہ بات لداخ پر صادق نہیں آتی کیونکہ لداخ کبھی برطانوی ہند کا حصہ نہ تھا۔ نسلی اور لسانی بُعد کے باوجود کشمیر اور لداخ کی تقدیر ایک دوسرے کے ساتھ ان گنت سالوں سے منسلک چلی آرہی ہے۔ لداخ کو جموں کے ڈوگرہ سردار گلاب سنگھ کے جرنیل زور آور سنگھ نے ڈوگرہ راجدھانی کا حصہ بنایا تھا یہ جرنیل لاسہ تک پہنچا تھا اور اس نے وہاں کی لامائی حکومت کو شکست دی تھی لیکن بعد ازاں تبت کی مہلک سردی اور برف میں اپنی فوج سمیت تباہ ہو گیا تھا۔ ۱۸۴۲ میں تین بڑوں کی ایک کانفرنس ہوئی تھی جس میں ڈوگروں، تبت اور مرکزی چینی حکومت کے نمائندوں نے تبت اور ڈوگرہ راجدھانی کی حدیں آخری طور سے متعین کی تھیں۔ اسی ڈوگرہ راجدھانی نے ۱۸۴۶ میں جموں اور کشمیر ریاست کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ اکسائی چین (چینی سرحدی علاقہ) لداخ میں شامل کر

دیا گیا تھا۔ اور پچھلے ایک سو پندرہ سال سے یہ علاقہ ان نقشوں میں اسی حیثیت میں ظاہر کیا جاتا رہا ہے جو برصغیر ہند میں رائج رہے ہیں

لیکن اب یوں دکھائی دیتا ہے۔ کہ بھارتی حکومت بین الاقوامی متنازع فیہ ریاست جموں و کشمیر کے اس حصے کو سرخ چین کے حوالے کرنے پر مائل ہے۔

چین نے برما اور انڈونیشیا سے اسی انداز اور نوعیت کے، معاملات جس طرح سے طے کیے ہیں اس کے پیش نظر چین اور بھارت کے موجودہ تنازع میں بھارت کا مسلک بہت مشتبہ اور کمزور ہے۔ یہ انتہائی دھاندلی ہے کہ بھارت ایسے علاقے کی سودا بازی کرے جس پر اس کا حق ثابت ہی نہیں۔

صدر محمد ایوب خان نے صاف اور واشگاف الفاظ میں، اعلان کر دیا ہے کہ چین اور بھارت میں کسی معاہدے کی بنا پر اگر بھارت لداخ یا اس کا کوئی حصہ چین کے حوالے کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ تو پاکستان اس معاہدے کو کسی طرح تسلیم نہ کرے گا۔ ریاست جموں و کشمیر کا ایک ایک انچ رقبہ متنازع فیہ ہے اور اس کے آخری الحاق کا فیصلہ ریاست کے عوام کا حق ہے جو وہ اقوام متحدہ کے تحت منعقد ہونے والے آزادانہ اور غیر جانبدارانہ استصواب رائے کے ذریعے استعمال کریں گے۔

یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ بھارتی حکومت پچھلے بارہ سال سے کشمیر پر محض اس لیے قبضہ جمائے بیٹھی ہے کہ اس معاملہ میں کمیونسٹ ممالک اس کی پیٹھ ٹھونکتے رہے ہیں۔ کشمیر کے معاملے میں بھارت نے جو بے بنیاد اور ناواجب عمل اختیار کر رکھا ہے۔ تمام جمہوری ممالک اس کے سخت نکتہ چین ہیں یہ حقیقت ہے کہ اسی نکتہ چینی نے پنڈت نہرو کو مجبور کر دیا کہ وہ سوویٹ بلاک ہی کی تائید و حمایت حاصل کر لیں۔ اب بھی ان کی ہرگز کوئی ایسی نیت معلوم نہیں ہوتی کہ وہ اہل کشمیر سے، انصاف کریں اور انہیں حق خود ارادیت دیں چینی بھارت سے اس لیے ناراض ہو گیا ہے۔ کہ بھارت نے دلائی لامہ کو پناہ دی تھی۔ اب کہ مصیبت بھارت کے دروازوں تک آ پہنچی ہے تو پنڈت نہرو دلائی لامہ اور تبت کے بارے میں تو سب کچھ بھول گئے ہیں اور وہ اسی چین سے گفت و شنید پر راضی ہو گئے ہیں۔ جس کے ہاتھوں سے ہزاروں اہل تبت کا خون ابھی تک ٹپک رہا ہے۔ وہ اسی طرح چینی کمیونزم کی دل داری کر رہے ہیں۔ جس طرح ایک سابق برطانوی وزیراعظم نے جرمن فاشزم کی دل داری کی تھی۔ خود بھارت کا جمہوریت نواز طبقہ ایشیائی چیمبرلین کی اس پالیسی کو ناپسند کر رہا ہے۔ چاہیے تو یہ کہ بھارتی جمہوریت پسند اس قیمتی موقع پر پورا زور ماریں۔ لداخ کو اگر چین کے بھاڑ میں جھونک بھی دیا جائے تو چین کی استعماریت کے آگے بند نہ بندھ جائے گا ——— چین ہو یا روس کمیونزم کی غرض تو پوری دنیا کی تسخیر ہے۔ اگر روس کی مداخلت یا ثالثی سے کوئی سمجھوتہ ہو بھی جائے تو اس کا واحد مقصد یہ ہوگا کہ اس عرصے میں چین ناقابل تسخیر ہمالائی سرحد پر اپنی فوجی طاقت کی شیرازہ بندی کر سکے۔

بھارت کے لیے سب سے مناسب راستہ یہی تھا۔ کہ وہ کشمیر کے معاملے میں پاکستان سے اختلافات دور کر لیتا اور بعد ازاں مشترکہ دفاع کی پیشکش کے تحت اپنی سرزمین کی حفاظت کا اہتمام کرتا۔ لیکن بھارتی چیمبرلین کی یہ نیت ہرگز نظر نہیں آتی۔ لے دے کے یہی امید ہے کہ بھارت کا سمجھدار طبقہ وہاں کامیاب رہے گا جہاں پنڈت نہرو ناکام رہے ہیں۔ کیونکہ اگر بھارت کمیونزم کا شکار ہو گیا تو یقیناً یہ صورت نہ صرف بھارت کے لیے بلکہ انسانی آزادی کے لیے مہلک ثابت ہوگی۔

آرمن شینفر

شیخ محمد عبداللہ سے ایک ملاقات

اکیس اپریل کو میں تین گھنٹے شیخ عبداللہ کے پاس بیٹھا جن کا شمار نئے ایشیا کی سب سے زیادہ نزاع انگیز ہستیوں میں ہوتا ہے۔ وہ کشمیر کی بھارت کی مدد سے قائم حکومت کے وزیر اعظم بھی ہیں اور نیشنل کانفرنس نامی کشمیری سیاسی جماعت کے صدر بھی، جو انڈین کانگریس سے وابستہ ہے۔ ہماری نشست ان کے باغ میں ہوئی۔

وہ تقریباً پچاس برس کے دراز قد اور تنومند آدمی ہیں۔ اس سے پہلے ہماری ملاقات نہ ہوئی تھی، اگرچہ دہلی میں اور دیگر مقامات پر میں نے انہیں دیکھا تھا۔ قبل ازیں وہ کافی عرصہ جیل میں رہ چکے تھے۔ یہ سزا انہیں مہاراجہ نے دی تھی۔ میں نے انہیں پسند کیا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ انہوں نے مجھے اتنا وقت کیوں دیا کیونکہ انہوں نے کوئی نئی بات نہیں کہی اور اس طرح کشمیری تنازعے کے متعلق، مروجہ بھارتی پروپیگنڈا دہراتے رہے۔ لیکن ہماری ملاقات ایک دلچسپ موقع پر ہوئی تھی یعنی مقبوضہ کشمیر کے علاقہ جموں میں رنبیر سنگھ پورہ کے مقام پر ان کی تقریر کے چند دن بعد یہی وہ تقریر تھی جس کے بعد سے بھارتی نگاہوں میں انکی مقبولیت بتدریج کم ہو گئی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ جموں میں بھارت کے وزیر دفاع شری گوپال سوامی آئینگر کی کچھ باتوں سے، جو ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۳ء تک مہاراجہ کی حکومت میں کشمیر کے وزیر اعظم رہ چکے تھے، برانگیختہ ہو گئے تھے

ان کے لباس اور رہن سہن کے ظاہری انداز سے میں متعجب ہوا۔ انہیں ایک غریب شال باف کا بیٹا کہا جاتا ہے اور بھارت میں انہیں جمہور کا فرد بنا کر پیش کیا گیا تھا۔ مشہور استراخانی ٹوپی تو واقعی انہوں نے پہن رکھی تھی لیکن باقی چیزیں، نیلا ڈاڈبل بریسٹ سوٹ، ریشمی نکٹائی، پالتو کتا، صاف ستھرا باغ، پس منظر میں بڑا سا مکان، اس بات کی غماز تھیں کہ وہ ایک مغربیت پسند سیاست داں تھے اور آسودہ حال، اوسط طبقے کے انداز میں زندگی بسر کر رہے تھے۔

اور یہ کوئی عیب نہیں۔ بس پہلے ان کے متعلق غلط تاثر پیدا کیا گیا تھا جس کے لئے غالباً وہ ذمہ دار نہ تھے۔ یہ مغربیت بہت دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد کے واقعات سے یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ کانگریس پارٹی نے اپنی نفس کشی اور سادگی پسندی کا جو ڈھنڈورا پیٹ رکھا تھا وہ زیادہ تر جھوٹ تھا۔ ۱۹۳۷ء میں اس کے سربراہوں نے، جب وہ برطانوی راج کے خلاف کشمکش کر رہے تھے، صوبائی وزارتیں قبول کرتے ہوئے بڑی خود نمائی کے ساتھ اپنے مشاہروں کا معتدبہ حصہ لینے سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن جب آزادی مل گئی تو وہ نہ تو پوری تنخواہیں وصول کرنے سے ہچکچائے اور نہ ہی بظاہر انہوں نے سوچا کہ روش کی یہ تبدیلی تشریح کی محتاج ہے۔ لیکن یہ عیاں ہے کہ لوگ خواہ وہ سانولے ہوں یا گورے، اقتدار کے یکساں عہدوں پر فائز ہو کر یکساں نوعیت کے معاشری اقدام کرتے ہیں۔ مثلاً پنڈت نہرو، جو پہلے نئی دہلی میں برطانوی شان و شوکت پر کڑی نکتہ چینی کرتے تھے، نئے ہندوستان کا وزیر اعظم بنتے ہی اس محل میں ——— اسے محل ہی کہنا پڑے گا ——— جا براجے جو برطانوی کمانڈر ان چیف کے لئے تعمیر کیا گیا تھا۔ سری نگر کے اس سنیدوں سے گھرے باغ میں مقبوضہ کشمیر کے وزیر اعظم سے تین گھنٹے کی ملاقات کے میرے تاثرات یہ تھے کہ وہ ایک دلیر، راست باز اور چست انسان ہیں ——— گو ذہنی طور پر ان کی رسائی زیادہ نہیں ——— پرزور شخصیت کے مالک ہیں اور غالباً اسی لئے ظلم رسیدوں کے موثر قائد ہیں۔

ان کا دل واضح طور پر فرقہ وارانہ جذبات سے قطعی پاک تھا۔ انہوں نے ایک خوشگوار حقیقت کا ذکر کیا جسے میں مشاہدہ کر چکا تھا وہ یہ کہ سری نگر میں اور آس پاس، یقیناً ان کے انتظامیہ کی کوشش سے، ہندو، مسلمان اور سکھ تپاک سے مل جل کر رہتے تھے۔ سب سے زیادہ وہ مجھے ایسے کشمیری دوست معلوم ہوئے جس کے دل میں اپنے ہموطنوں کی حالت سدھارنے کا جوش بھرا ہوا تھا۔ ان کی تمام توجہ وادی کشمیر پر تھی۔ وہی ان کی تمام سیاسی زندگی کا مرکز اور مقصد تھی۔ باقی برصغیر کے حالات سے ان کو زیادہ سروکار نہ تھا۔

غالباً پٹھانوں کے حملے کا بار بار ذکر کرنے کی ایک وجہ یہی متحرکہ کشمیری جذبہ تھا۔ اس موضوع پر بھارتی بریمی کہ میں نے کبھی لوہی کا

طرح حقیقی نہیں سمجھا۔ اس وقت جو انسانیت سوز حرکات ہو رہی تھیں ان کے مقابلے میں یہ بربریت بھی غیر متناسب معلوم ہوتی تھی۔ بھارتی بربریت بھی دراصل زیادہ تر ایک قسم کا پروپاگنڈا تھا جسے پاکستان کے خلاف استعمال کیا جا رہا تھا۔ لیکن شیخ عبداللہ کی یہ بربریت بھی مجھے یقین ہے حقیقی تھی۔ کشمیری ہونے کی وجہ سے انہوں نے ذاتی طور پر ستم زدہ محسوس کیا تھا۔ انہیں یاد تھا کہ ان کے بزرگوں کے زمانے میں اسی راستے سے کشمیر پر حملے ہوتے رہے تھے۔ ان کی نظر میں حملہ آور ساتھی مسلمان نہ تھے —— ویسے بھی عبداللہ غیر فرقہ پرست ہیں —— بلکہ ظالم بدیسی تھے۔ "مسٹر اسٹیفنز، اگر حملہ ہی کرنا تھا تو وہ آخر پونچھ کیوں نہ چلے گئے تاکہ وہاں کے لوگوں کی جابر کے خلاف مدد کرتے؟ بھلا سری نگر کی طرف لوٹ مار کرتے ہوئے دھاوا بولنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"جابر" سے مہاراجہ مراد تھا۔ دوران ملاقات مہاراجہ کے لئے ایسے بہت سے ضرر رساں اور غضب ناک الفاظ استعمال کئے گئے۔ شیخ عبداللہ نے کہا کہ وہ حملہ آوروں کے قریب پہنچنے پر سری نگر سے "رات کو چور کی طرح" بھاگ گیا تھا۔ لیکن یہاں میں نے دخل اندازی کی جرأت کی۔ وہ بزدل جابر تھا یا نہیں تھا —— اور اس بارے میں ہماری رائے یکساں تھی —— ہندوستان سے اس کا الحاق یقیناً بھارتی فوجوں کے کشمیر میں موجود ہونے کا واحد جواز تھا؟ کیا اخلاق کا تقاضا یہی تھا کہ اس کا اس درجہ مرہون منت ہونے کے باوجود اسے فوراً ہی بے دخل کر دیا جائے؟ کیا اس سے بھارت کے "قانونی کیس" پر برا اثر نہیں پڑتا؟ اس بات کو شیخ عبداللہ نے نظر انداز کر دیا اور بھارت کے حیدر آباد اور جونا گڑھ پر قبضہ کرنے کے بارے میں جو سوال میں نے پوچھے ان کا بھی انہوں نے جواب نہیں دیا۔ وہ عرصۂ دراز سے مظلوم کشمیریوں کے قائد کی حیثیت سے بات کر رہے تھے۔ یہ مسئلے حل کرنا بنیادی طور پر دہلی کا کام تھا اور بہرصورت مہاراجہ ڈوگرہ آمر اور قابلِ مذمت شخص تھا۔

اپنے وطن میں یکسر مشغول رہنا، دوسری جگہوں پہ واقع ہونے والی تبدیلیوں کو نظر انداز کرنا —— یہ باتیں ان کے ۱۹۴۷ء میں ہندوستان میں شامل ہونے کے نازک فیصلے کی، جو لاکھوں زندگیوں پر اثر انداز ہوا ہے، یقیناً جزوی تشریح کرتی ہیں۔ اس فیصلے میں ان کے گرفتار رہنے کا ہاتھ بھی ہوگا جس کی وجہ سے انہیں اس تیزی سے بدلتے ہوئے زمانے میں نئے سیاسی رجحانات پر بحث کرنے اور ان قوم پرست مسلمانوں میں سے بیشتر سے ملنے کا موقع نہیں ملا جو اس وقت کانگرس سے علیحدہ ہو رہے تھے۔ ان کی باتوں سے یہ ظاہر ہوا کہ انہوں نے پہلے پہل پاکستان پر سنجیدگی سے توجہ نہ دی تھی اور اب وہ معرض وجود میں آگیا تھا تو اس کے قائم رہنے کی انہیں امید نہ تھی۔ بہت سے اور لوگ بھی، جو ان سے زیادہ واقف کار تھے، اسی مغالطے میں مبتلا تھے۔

اس کے علاوہ انہیں ذاتی وفاداریوں کا اور ذاتی امنگوں کا لحاظ بھی رکھنا تھا۔ ان کے تقریباً سب دوست کانگرسی تھے؛ شیخ عبداللہ کی اور ان کی سیاسی زندگیاں ملی جلی رہی تھیں۔ ان کے درمیان انہیں سربلند ہونے کا یقین تھا۔ کانگرس میں ایسا مسلمان قائد مشکل ہی سے رہ گیا تھا جسے مسلم عوام کی پوری طرح حمایت حاصل ہو۔ بھارت محض زیادہ طاقتور ملک ہی نہ تھا، وہ انہیں خصوصی اختیارات اور اعزاز بھی عطا کر سکتا تھا۔ دوسری طرف وہ مسٹر جناح سے جھگڑ چکے تھے؛ اور اگر یہ سنگین ذاتی نااتفاقی دور ہو بھی جاتی تو بھی لیگ میں ان کی حیثیت لازمی طور پر یہی ہوتی کہ بہت سے مقامی مسلم قائدوں میں سے ایک قائد سمجھے جاتے۔

اس میں شک نہیں کہ اپنی راہ متعین کرتے وقت انہوں نے اپنے مفاد پر نظر رکھی؛ بیشتر لوگ ایسا کرتے ہیں۔ لیکن وہ سچے دل سے یہ دلیل پیش کر سکتے تھے کہ اس طرح حاصل کی ہوئی طاقت کو اپنے ساتھی کشمیریوں کی بہبود کے لئے آدرشی طرح کام میں لانا ممکن ہے۔ شاید وہ مزاجاً تشہیر اور داد کو پرکشش پاتے تھے اور اس کام کے لئے کانگرس پارٹی اب بھی بہتر طور پر منظم تھی۔ ہندو پاک کے سیاست دانوں کے لئے خود پسندی سب سے بڑا خطرہ ہے۔ خوشامد میں اور ہیرو پرستی کی ان متعدد لطیف اور خاکسارانہ شکلوں میں گھر رہنا جن سے مشرقی رعیتیں اپنے رہنماؤں کو خراجِ عقیدت پیش کرتی ہیں، عوام کی آنکھوں کا تارا ہونا، جاہل غربا کا لاڈ پیار کرنا، میرے خیال میں ہر کسی کا دماغ خراب کرنے کے لئے کافی ہے۔

نشاط باغ میں ہوا میں ہلتے سفیدوں کے نیچے ان کے پاس بیٹھے بیٹھے میں نے خود سے پوچھا، پچھلے پانچ چکرا دینے والے اور ہولناک برسوں پر مڑ کر نظر ڈال کر کیا انہیں اپنے نازک فیصلے پر پشیمانی نہیں ہوتی؟ پاکستان تباہ نہ ہوا تھا اور نہ اب اس کے تباہ ہونے کی توقع تھی۔ ان کی مرضی سے پاکستان کی سرحد پر آباد تیس لاکھ مسلمان ہندوستان

میں شامل ہو گئے تھے جس طرح سے یہ واقعہ پیش آیا تھا وہ تقسیم ہند کی اصل ساخت کی توہین تھی۔ برصغیر میں کسی مسلم اکثریت یا ہندو اکثریت کے ملک کے ساتھ ایسا برتاؤ نہ ہوا تھا اور کشمیریوں کی خواہشوں کو کبھی جمہوری طور پر معلوم نہ کیا گیا تھا۔ شیخ عبداللہ کی حکومت بھارتی سنگینوں، یعنی زیادہ تر ہندو سنگینوں، کے سہارے قائم تھی، کئی لحاظ سے وہ اچھی حکومت تھی۔ وہ سرگرم اور کٹر طور پر غیر فرقہ دار تھی، اس کے پاس منصوبے تھے اور زرعی اصلاحات کے معاملے میں بڑی مائل بہ ترقی تھی۔ لیکن تاریخ کی نظر میں وہ شاید ایک غیر فطری حکومت ثابت ہو۔

ان کی زبیر سنگھ پورہ کی تقریر سے یہ مترشح تھا کہ وہ بے چین تھے اور اپنے مقام کو کم آرام دہ محسوس کر رہے تھے۔ بظاہر اب ان کا خیال تھا، اگر پہلے نہ تھا، کہ بہت سے ہندو کانگرسی غیر مذہبی رواداری کی آڑ میں کٹر فرقہ پرست اور تنگ نظر تھے۔ اس میں وہ پاکستانیوں سے کم نہ تھے بلکہ ذات پات کے نظام کی وجہ سے غالباً زیادہ ہی گئے گزرے تھے۔

لیکن موجودہ حالات میں وہ اپنے فیصلے کو مٹانا چاہتے تو بھی مٹا نہ سکتے تھے۔ وہ خود کو بہت زیادہ پابند کر چکے تھے، حالات انہیں پیچھے چھوڑ گئے تھے۔ جو سوال میں نے خود سے کیا تھا اسے ان سے پوچھنا ظاہر ہے ممکن نہ تھا۔ وہ محض ایک حیران کرنے والی بیکار کوشش ثابت ہوتا اور اس کا کوئی ٹھیک جواب نہ ملتا اور یہ سوال اب میں ان سے کرنا بھی نہ چاہتا تھا کیونکہ میرے دل میں ان کے لئے محبت پیدا ہو گئی تھی۔ انٹرویو کی فضا بدل چکی تھی۔ جونہی میں نے اپنے پیشہ ورانہ انداز ترک کر کے، انہیں یہ بتایا کہ میرا اپنا مسئلہ کیا تھا اور میں نے "سٹیٹسمین" کی ادارت کیوں چھوڑی تھی، ہماری گفتگو بے تکلف اور گرم دل ہو کر پروپاگنڈے کی تکرار سے پاک ہو گئی۔

میں نے انہیں ایک باہمت اور روشن خیال انسان پایا، جو ایسے اصولوں کا، جو اپنے طور پر اچھے ہوں، حامی تھا، جو ہم میں سے بہت سوں کی طرح ۱۹۴۷ء کی تبدیلیوں کی افراتفری، رفتار اور بے مثال وسعت کا شکار ہوا، اور اب شاید ایک لاثانی طور پر تنہا اور پریشان کن عہدے پر فائز تھا۔

ٹنڈر نوٹس

سوشل ویلفیئر آرگنائزیشن کے منظور شدہ ٹھیکیداران سے پختہ ریٹ ٹنڈر مندرجہ ذیل کاموں کے لیے دو بجے بعد دوپہر ۱۰ مارچ ۱۹۶۰ء کو وصول کیے جائیں گے۔ ٹنڈر ہذا ٹھیکیداران یا ان کے منظور شدہ نمائندگان کے سامنے کھولے جائیں گے۔ زر ضمانت رسید سرکاری خزانہ یا کسی منظور شدہ بنک کی ڈیپازٹ ایٹ کال کی صورت میں ٹنڈر ہذا کے ساتھ آنا ضروری ہے۔ ٹنڈر مبلغ ایک روپیہ کے سرکاری رسیدی ٹکٹ پیش کرنے پر دیا جائے گا۔ دیگر تفصیلات برائے کام و شرائط دفتر ہذا سے کسی وقت دفتری اوقات میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ ٹھیکیداران کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ اپنے ریٹ اور پریمیم کا تجزیہ کر کے ساتھ رکھیں جو کہ انھیں بوقت ضرورت زیر دستخطی کو پیش کرنا ہوگا

نمبر شمار	نام کام	تخمینہ	زر ضمانت	مدت
۱-	ٹیوب ویل لگوانے کا کام جو کہ کارپوریشن حدود کے اندر ہوگا - گروپ "اے"	۳۵۰۰/-	۷۰/-	۲ ماہ
	" " گروپ "بی"	۳۵۰۰/-	۷۰/-	۲ ماہ
	" " گروپ "سی"	۳۵۰۰/-	۷۰/-	۲ ماہ
	" " گروپ "ڈی"	۳۵۰۰/-	۷۰/-	۲ ماہ

اقبال احمد بیگ ایگزیکٹو انجنیئر صاحب سیکنڈ سوشل ویلفیئر ورکس ڈویژن لاہور

جناب خورشید حسن خورشید صدر آزاد کشمیر سے ایک ملاقات

جناب خورشید نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

" جب سے ڈاکٹر گراہم کی آخری رپورٹ شائع ہوئی ہے کشمیر میں ایسے واقعات رونما ہوئے ہیں ، پھر بھارت اور مقبوضہ کشمیر میں بھارت کی کٹھ پتلی حکومت نے ایسے اقدامات کئے ہیں کہ جموں اور کشمیر کے عوام ان سے انتہائی بری طرح متاثر ہوئے ہیں۔ ایسے کچھ اقدامات کا ایک نقشہ پاکستان کے اقوام متحدہ میں مستقل نمائندے نے سکورٹی کونسل کے سامنے پیش بھی کیا ہے لیکن حسب دستور اس نے اس پر کوئی عملی کاروائی ضروری نہیں سمجھی "

جب یہ پوچھا گیا کہ ان واقعات اور اقدامات کے سدباب کے لئے جناب صدر سکورٹی کونسل سے کیا توقع رکھتے ہیں تو انہوں نے فرمایا۔

" حال ہی میں واقعات نے ایک نیا رخ اختیار کر لیا ہے بھارتی حکومت جس نے کشمیر پر غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہے کشمیر کی سرحدوں کی حفاظت میں چینی پیش قدمی کے سامنے بالکل بے بس اور ناکارہ ثابت ہوئی ہے۔ چنانچہ چینیوں نے لداخ کے ہزاروں میل رقبے پر قبضہ کر لیا ہے۔ پھر بھارت چین سے اس معاملے میں جس کمزوری سے پیش آ رہا ہے اس سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ کشمیر جو ایک متنازع فیہ علاقہ ہے وہ بھارت کے ہاتھوں میں ہرگز محفوظ نہیں۔ اس صورت حال نے یہ لازم بنا دیا ہے کہ اقوام متحدہ اس اہم بنا پر ایک کمیشن مقرر کرے کہ جموں اور کشمیر ریاست کی بین الاقوامی سرحدوں کی حفاظت میں بھارت ناکام رہا ہے۔ موجودہ حالات میں سکورٹی کونسل کشمیر کے تنازع میں پاکستان یا بھارت دونوں فریقین میں سے کسی کو ان سرحدوں کی حفاظت کا ذمہ دار نہیں ٹھہرا سکتی اور نہ انہیں مجبور کر سکتی ہے۔ موجودہ صورت حال اہل کشمیر کے لئے انتہائی غیر یقینی اور ناقابل قبول ہے۔" جب جناب خورشید سے یہ پوچھا گیا کہ کیا اقوام متحدہ کے اس کمیشن کے تقرر سے مسئلہ کشمیر کے حل میں مزید دیر نہ ہو گی تو جناب خورشید نے کہا

" میں جس طرح کے کمیشن کا مطالبہ کرتا ہوں اسے اس بات کا جائزہ لینا ہو گا کہ استصواب رائے کے مرحلے تک ریاست کشمیر کی سلامتی اور اس کی سرحدوں کی حفاظت کو کیونکر بہترین طور سے باقی رکھا جائے۔ اس کمیشن کو کام وہاں سے شروع کرنا چاہیئے جہاں آخری گراہم کمیشن نے اسے چھوڑا تھا۔"

جناب خورشید نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا

" لداخ پر چینی قبضے کے ساتھ ساتھ میں اس کمیشن کی ضرورت اس لئے بھی محسوس کرتا ہوں کہ بھارت نے مقبوضہ کشمیر پر ظلم و ستم کا ایک لا متناہی سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ شیخ عبداللہ اور ان کے ساتھیوں پر ایک طویل اور مضحکہ خیز مقدمہ چلایا جا رہا ہے اور پاکستان کی حمایت میں جو آواز بھی اٹھتی ہے اسے اندھا دھند دبانے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اپنی جگہ یہ سب باتیں بھی اس بات کا تقاضا کرتی ہیں کہ کشمیر میں اقوام متحدہ اپنا ایک کمیشن مقرر کرے۔ بھارت نے حال ہی میں جو نام نہاد دستوری اقدامات مقبوضہ کشمیر کی ملازمتوں کو بھارت سے ملحق کرنے اور بھارتی سپریم کورٹ اور الیکشن کمیشن کا کشمیر پر اطلاق کی صورت میں کئے ہیں وہ بھی اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ بھارت نے کشمیر پر قابض فوجوں کے لئے پکی بیرکیں بنا دی ہیں اور بے شمار شہریوں کو ان کی جگہ سے بے گھر کر کے بھارتی فوجوں کے لئے ان کی زمینوں اور جائدادوں پر قبضہ کر لیا ہے۔ یہ تمام اقدامات اقوام متحدہ کی قرار دادوں کی مکمل نفی کرتے ہیں اور ان سے ان قرار دادوں کی ظاہری اور باطنی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ بھارتی حکومت نہ صرف ان قرار دادوں کے تحت اپنی ذمہ داریوں کو نبھانے میں ناکام رہی ہے بلکہ اس نے ان کی باقاعدہ خلاف ورزی کی ہے "

اب گفتگو کا رخ پاکستان کی طرف پلٹا اور جناب خورشید کی توجہ صدر مملکت پاکستان کے حالیہ بیان کی طرف مبذول کرائی گئی

جو انہوں نے کشمیر کے بارے میں دیا تھا تو جناب خورشید نے کہا۔

" صدر ایوب کے بیان نے حد متارکہ جنگ کے دونوں جانب امید کی کرن پیدا کر دی ہے۔ اہل کشمیر کو اب محسوس ہوتا ہے کہ پاکستان کی موجودہ حکومت کام کی قائل ہے اور وہ اہل کشمیر کو حق خود ارادیت دلانے کے لئے کسی کوشش سے دریغ نہ کرے گی۔ صدر ایوب کی شخصی طاقت نے بھی اہل کشمیر کی ہمتوں کو بلند کر دیا ہے۔"

جب یہ پوچھا گیا کہ کیا اقوام متحدہ کے کمیشن کے اس تقرر کے مطالبہ میں حکومت پاکستان بھی ان کی ہم نوا ہے تو صدر آزاد کشمیر نے کہا۔

" مجھے پوری امید ہے کہ حکومت پاکستان اس کمیشن کے تقرر کے لئے نہ صرف اقوام متحدہ میں آواز اٹھائے گی بلکہ اصرار کرے گی۔"

اب جناب خورشید سے درخواست کی گئی کہ وہ کچھ دن پہلے نیو یارک میں پرنس علی خاں نے ٹیلی ویژن پر جو انٹرویو دیا تھا اس کے بارے میں اپنی رائے دیں۔ اس انٹرویو میں ریاست کشمیر کی خود مختاری کو مسئلہ کشمیر کے تین ممکن حلوں میں سے ایک حل کے طور پر پیش کیا تھا۔ خورشید صاحب نے کہا۔

"کشمیر کی خود مختاری اہل کشمیر کے موقف سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ پرنس علی خاں نے اہل کشمیر کے ان عزائم کی ترجمانی نہیں کی جو الحاق سے متعلق ہیں۔ تحریک آزادی کشمیر تحریک پاکستان کا لابدی حصہ ہے۔ کشمیر کو ایک الگ اور خود مختار ریاست بنانا اہل کشمیر کے عزائم میں کبھی شامل نہیں رہا۔"

اب گفتگو کا رخ عالم اسلام کی جانب پھر گیا۔ جناب خورشید سے دریافت کیا گیا کہ کیا دوسرے اسلامی ممالک بھی تحریک آزادی کشمیر سے ہمدردی رکھتے ہیں تو انہوں نے یہ انکشاف کیا کہ حال ہی میں صدر پاکستان جناب محمد ایوب خان نے ملک کے پہلے صدر کی حیثیت سے حلف اٹھایا تو اس موقع پر سعودی عرب، سوڈان اور مراکو کے سربراہوں نے صدر آزاد کشمیر کو آزادی کشمیر کے ضمن میں مکمل حمایت کا یقین دلایا تھا۔"

آزاد کشمیر کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے کہا۔

" میری حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ اصولی طور پر پاکستان میں رائج ہونے والی تمام اصلاحات آزاد کشمیر میں بھی رائج کی جائیں۔ چنانچہ بنیادی جمہوریتوں اور زرعی اصلاحات کے بارے میں عنقریب اعلان ہو جائیگا۔"

مسٹر عبدالمجید ایڈیٹر سول اینڈ ملٹری گزٹ سے ایک ملاقات

" تنازعۂ کشمیر بھارت اور پاکستان کے درمیان اس بات کا جھگڑا ہے کہ کیا کشمیری عوام کو بھارت یا پاکستان سے الحاق کے سلسلے میں اپنی قسمت کا فیصلہ خود کرنے کا حق دینا چاہیے کہ نہیں پاکستان اس فیصلے کے حق میں ہے لیکن بھارت اس سے منکر ہے وہ کشمیری عوام کو اُن کے حقِ خود ارادیت سے محروم رکھنا چاہتا ہے " عبدالمجید صاحب نے مسئلۂ کشمیر پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا۔

" اور یہ مسئلہ بین الاقوامی اُسی وقت بن گیا تھا جب پنڈت نہرو نے اپنی فوجیں زبردستی سرزمین کشمیر پر اتار دی تھیں مہاتما گاندھی نے مہاراجہ کشمیر کو ہندو مت اور کلچر کے نام پر مجبور کیا تھا کہ وہ کشمیر کا الحاق بھارت سے کرے۔ اسی مقصد کی خاطر انہیں دنوں مہاتما گاندھی بھی کشمیر گئے تھے۔ لیکن جب یہ پوچھ گچھ شروع ہوئی کہ مہاتما جی کشمیر میں کیا لینے گئے تھے تو انہوں نے جواب دیا کہ میں نے ۱۹۱۴ء میں ایک پرانا وعدہ کیا تھا اور اب محض اس وعدے کو لباسِ عمل پہنایا ہے"

" گذشتہ دنوں ایک غیر ملکی نے مجھ سے کہا تھا کہ جوں جوں پاکستان مسئلہ کشمیر میں دیر کر رہا ہے یہ کیس اس کے حق میں کمزور پڑتا جا رہا ہے تو میں نے اُسے جواب دیا کہ ایسا کوئی خدشہ نہیں۔ جب ہر بیس برس کے بعد ALSACE اور LORRION کے علاقے کبھی فرانس اور کبھی جرمنی کے ہاتھ منتقل ہوتے رہتے ہیں تو پنڈت نہرو کے جارحانہ اقدام کو کشمیر کے بارے میں حرفِ آخر تصور نہیں کیا جا سکتا۔" اور جہاں تک اس خدشے کا تعلق ہے کہ کشمیر میں استصوابِ رائے بھارت میں ہندو مسلم فساد کا سبب بن سکتا ہے تو یہ محض نہرو کا ڈھونگ ہے۔ نہرو بھارت کو ایک سیکولر ریاست کہتا ہے اور جمہوریت کا علم بردار ہے۔ اگر اس کی حکومت دیانت دار ہے تو اپنے مسلم شہریوں کی جان و مال کی حفاظت اُس کا فرض ہے۔ کیا بھارتی حکومت اتنی ہی تنگ نظر ہے کہ وہ کشمیریوں کے جائز مطالبے پر بھارت میں ہندو اکثریت کو مسلم اقلیت کا خون بہانے کی اجازت دے گی؛ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ پنڈت نہرو اس بہانے کی اوٹ میں کشمیر پر زبردستی قبضہ جمائے رکھنا چاہتے ہیں۔"

جب یہ سوال زیرِ بحث آیا کہ کیا موجودہ بین الاقوامی سیاسی حالات میں کشمیر ایک خود مختار ریاست بن سکتا ہے تو مجید صاحب نے کہا کہ نہیں۔" اس طرح تو کشمیر ایک بین الاقوامی اکھاڑہ بن جائے گا۔ کشمیر کے تمام راستے ہر موسم میں پاکستان سے ملحق ہیں اس کے دریا پاکستان کے اندر آتے ہیں۔ اسکی آبادی بڑی بھاری اکثریت میں مسلمان ہے اس کا فطری لگاؤ پاکستان کے علاوہ کسی اور علاقے سے ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کے جغرافیائی تقاضے اتنے زبردست ہیں کہ وہاں اگر سکھوں کی اکثریت بھی ہوتی تو اس کے لیئے بھی پاکستان سے الحاق کے علاوہ کوئی اور درست چارہ کار نہ ہوتا اور اگر کشمیر خود مختار ریاست بن بھی جائے تو یہ ریاست بھارت اور پاکستان دونوں کیلئے خطرے کا باعث ہوگی۔

جہاں تک بھارت اور پاکستان کے مشترکہ دفاع کا تعلق ہے، اس میں سب سے بڑی رکاوٹ مسئلہ کشمیر ہے۔ ان دونوں ملکوں کے عوام اور حکومتیں اس مسئلے کے متعلق بے حد حساس ہو چکے ہیں اور جب تک یہ مسئلہ حل نہ ہوگا ان دونوں ملکوں کے درمیان مشترکہ دفاع کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

میرے یہ پوچھنے پر کہ کیا کشمیر کے معاملے میں پاکستان نے کوئی غلطی کی ہے" مجید صاحب نے جواب دیا" پاکستان نے اس سلسلے میں کئی ایک غلطیاں کی ہیں۔ سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ پاکستان نے اپنے "مغربی دوستوں پر ضرورت

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی سے ایک ملاقات

* بھارت اور پاکستان کے درمیان کشمیر کے متعلق تنازع اس بات کا ہے کہ پاکستان باشندگان کشمیر کو اپنی قسمت کا فیصلہ خود کرنے کا حق دلوانا چاہتا ہے ۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے مسئلہ کشمیر پر اظہار خیالات کرتے ہوئے فرمایا: لیکن ہندوستان اس سے انکار کرتا ہے ۔ درآں حالیکہ آغاز ہی میں یہ بات بین الاقوامی سطح پر بالاتفاق طے ہو چکی تھی کہ کشمیر میں استصواب کرایا جائے گا اور باشندگان کشمیر کی اکثریت کا منشا جیسا ہوگا ۔ اس کے مطابق یہ فیصلہ ہوگا کہ اس ریاست کو بھارت کے ساتھ ملنا چاہیئے یا پاکستان کے ساتھ لیکن بعد میں بھارت نے جو رویہ اختیار کیا وہ صاف طور پر اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ اسے یہ یقین ہے کہ اگر کشمیر میں استصواب ہوا تو فیصلہ اس کے خلاف ہوگا ۔ اس لیے وہ طاقت کے بل پر حاصل کی ہوئی چیز کو طاقت ہی کے بل پر اپنے قبضے میں رکھنا چاہتا ہے ۔ یہ مسئلہ بین الاقوامی مسئلہ اس لیے بنا ہے کہ بھارت آغاز ہی میں اس بات کا فیصلہ انصاف سے کرنے کے بجائے اس مسئلے کو اقوام متحدہ میں لے گیا اور بین الاقوامی سطح پر اس مسئلے میں پیچیدگی فقط اس لیے پیدا ہوئی کہ دنیا کی طاقت ور قوموں نے انصاف کی بنا پر اسے طے کرنے کے بجائے اس کو اس نقطۂ نظر سے دیکھنا شروع کر دیا کہ بھارت اور پاکستان میں سے کون ان کے مفاد کے لیے زیادہ اہمیت رکھتا ہے اور ان کے لیے کس کی دلداری کرنا زیادہ مفید ہوگا ۔ اگر ان کا یہ نقطۂ نظر نہ ہوتا اور وہ سراسر انصاف کی بنیاد پر جیسا کہ اقوام متحدہ کے چارٹر کا منشا تھا اس مسئلے کو حل کرنا چاہتیں تو یہ مسئلہ آج سے دس برس پہلے ہی حل ہو چکا ہوتا اور کسی بین الاقوامی مسئلے کی حیثیت سے اس کا وجود باقی نہ رہتا ۔

جب یہ سوال زیر بحث آیا کہ کیا کشمیر میں استصواب رائے بھارت میں ہندو مسلم فساد کا سبب بن سکتا ہے تو مولانا مودودی نے فرمایا: حقیقت میں ایسا ہونا تو نہیں چاہیئے لیکن اگر بھارت کے ہندوؤں کے سوچنے کا یہ انداز ہو کہ ایک علاقے پر بہرحال ان کا قبضہ رہنا چاہیئے اس کے باشندے رضامند ہوں یا نہ ہوں اور اس کے باشندوں کی مسلم اکثریت اگر ان کے تسلط میں رہنے پر راضی نہ ہو تو اس کا بدلہ بھارت کے دوسرے حصوں میں رہنے والے مسلمانوں سے لینا جائز ہے ۔ تو اس صورت میں بلاشبہ یہ مسئلہ بھارت میں ہندو مسلم فساد کا سبب بن سکتا ہے لیکن کیا دنیا کا کوئی شریف اور معقول آدمی یہ مان سکتا ہے کہ ہندو مسلم فساد کا یہ سبب کوئی معقول سبب ہے ۔

یہ پوچھنے پر کہ پاکستان کن وجوہ کی بنا پر کشمیر کا مطالبہ کرتا ہے، مولانا صاحب ایک لمحے خاموشی کے بعد کہنے لگے: "پاکستان نے کشمیر کا مطالبہ کبھی نہیں کیا بلکہ وہ باشندگان کشمیر کے لیے حق خود مختاری کا مطالبہ کرتا رہا ہے اور آج بھی یہی

سے زیادہ اعتبار کیا ہے اور اسی لیے مسئلۂ کشمیر آج تک کھٹائی میں پڑا ہوا ہے ۔ امریکہ خصوصیت سے جس اثر و رسوخ سے کام لے سکتا تھا اس نے اس اثر و رسوخ سے کام نہیں لیا تو نتائج کے اعتبار سے روسی سازش اور امریکی تساہل میں کوئی فرق نظر نہیں آتا ۔

ویسے اس مسئلے میں پاکستان کا موقف واقعی مستحکم ہے ۔ دوسری باتوں کے علاوہ میرے خیال میں پاکستان کو اس بات پر زیادہ زور دینا چاہیئے کہ چونکہ کشمیر مسلم اکثریت والا علاقہ ہے اور یہ فطری طور پر پاکستان سے ملحق ہے اس لئے پاکستان سے اس کا الحاق ضروری ہے

علاوہ بریں دفاعی نقطۂ نظر سے کشمیر پاکستان کی سالمیت کے لیئے بے حد اہم ہے ۔ اس کی سرحدیں سوویٹ روس اور اشتراکی چین سے ملحق ہیں جس کے باعث ہماری پشت کبھی محفوظ نہیں رہ سکتی ۔ زرعی نقطۂ نظر سے مغربی پاکستان کے تین دریا جہلم، چناب اور سندھ کشمیر سے نکلتے ہیں ان دریاؤں پر مغربی پاکستان کے پورے زرعی نظام کا دارومدار ہے ۔ اگر کشمیر بھارت کے قبضہ میں چلا جائے تو وہ ان دریاؤں کا رخ بدل کر مغربی پاکستان کی زراعت تباہ کر سکتا ہے ۔

کرتا ہے اس معاملہ میں پاکستان کا موقف یہ نہیں ہے کہ کشمیر ہمارے حوالے کر دیا جائے ہمارا موقف تو یہ ہے کہ کشمیر کے باشندوں کو یہ حق دیا جائے کہ وہ اپنی قسمت کا فیصلہ خود کریں۔ اور اگر ان کی اکثریت کا یہ فیصلہ ہو کہ یہ ریاست پاکستان سے ملحق ہونی چاہیئے تو پھر اسے پاکستان ہی سے ملحق ہونا چاہیئے اس مطالبے کی وجہ صاف ظاہر ہے۔ ہمیں اس امر کا پورا یقین ہے کہ کشمیر کے باشندوں کی اکثریت بھارت کے ساتھ ملحق نہیں ہونا چاہتی۔ بھارت نے انہیں زبردستی اپنے تسلط میں رکھ چھوڑا ہے اور چونکہ یہ اکثریت ہماری ہی ہم مذہب ہے اس لیے ہمیں ان کا یہ غصب شدہ حق اُسے دلانے سے لازماً دلچسپی ہے اور ہونی بھی چاہیئے۔ کشمیر میں ہماری دلچسپی کی نوعیت ٹھیک وہی ہے جو حیدر آباد دکن کے سلسلے میں بھارت کی تھی فرق اگر ہے تو یہ ہے کہ بھارت نے اپنی دلچسپی کے تقاضے زبردستی پورے کیے لیکن ہم اپنے مطالبات ایک پُرامن منصفانہ اور جمہوری طریقے سے پورا کرانا چاہتے ہیں۔"

اب بھارت اور پاکستان کے مشترکہ دفاع میں کشمیر کے حائل ہونے کا مسئلہ زیرِ بحث آ چکا تھا۔ بھارت اور پاکستان کے مشترکہ دفاع کا ایسی حالت میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا جبکہ دونوں ملکوں کی فوجیں کشمیر کی سرحدوں پر خصوصاً اور باقی سرحدوں پر عموماً ایک دوسرے کے مقابل کھڑی ہوں اور ایک ملک اپنے حق کے لیے اور دوسرا اپنے غاصبانہ مال کی حفاظت کے لیے لڑنے کے واسطے صرف ایک اشارے کا منتظر ہو۔ مشترکہ دفاع تو انہیں قوموں کے درمیان ممکن ہے جن کے مابین کوئی اہم تنازع نہ ہو۔ جن کی عزیز چیزیں مشترک ہوں اور وہ مل کر ان کی حفاظت کرنا چاہتی ہوں لیکن جہاں ایک قوم کی متاعِ عزیز پر دوسری قوم زبردستی قابض ہو وہاں مشترکہ دفاع کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دوسری کسی قوم سے تو ابھی ہمیں صرف یہی اندیشہ ہے کہ کہیں وہ ہماری کسی متاعِ عزیز پر ڈاکہ نہ ڈال دے لیکن یہ قوم جس سے مشترکہ دفاع کی باتیں کی جا رہی ہیں۔ پہلے ہی ہماری ایک متاعِ عزیز پر ڈاکہ ڈالے بیٹھی ہے اس سلسلے میں اگر مشترکہ دفاع کا تصور کیا جا سکتا ہے تو پھر وہ قومیں جنہوں نے ہم پر ابھی ڈاکہ نہیں ڈالا ہے اور جن سے فقط ابھی ڈاکے کا اندیشہ ہے آخر ان کے ساتھ مشترکہ دفاع کا معاہدہ کیوں نہیں کیا جا سکتا؟

یہ پوچھنے پر کہ وادیٔ لداخ میں چینیوں کے گھس آنے سے مسئلۂ کشمیر پر کیا اثر پڑا ہے؟ مودودی صاحب نے فرمایا "اس کے کئی طرح کے اثرات پڑے ہیں۔ اس کا اخلاقی اثر یہ ہے کہ اس معاملے میں بھارت کے رویّے سے یہ بات کھل گئی ہے کہ وہ کشمیر کو سچے دل سے اپنے گھر کا ایک حصہ نہیں سمجھتا بلکہ مالِ غنیمت تصوّر کرتا ہے اور اگر اب اس مالِ غنیمت میں کسی دوسرے غاصب نے بھی اگر حصہ بٹا لیا ہے تو وہ اس سے لڑ مرنے کی کوئی ایسی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ اس کا سیاسی اثر یہ پڑا ہے کہ کشمیر کی حفاظت کے معاملے میں بھارت کی نااہلی ثابت ہو گئی ہے اور باشندگانِ کشمیر کے اس اطمینان کا بھی کوئی وجہ باقی نہیں رہی کہ بھارت کے ساتھ ملحق رہنے کی صورت میں بھارت ان کے ملک کی سالمیت کی ضمانت دے گا۔ اس کا دوسرا سیاسی اثر یہ ہے کہ یہ مسئلہ بین الاقوامی حیثیت سے مزید پیچیدہ ہو گیا ہے اب تک کشمیر فقط بھارت اور پاکستان کے درمیان وجہ تنازع تھا لیکن اب بھارت کی غفلت اور نااہلی کے باعث دنیا کا ایک تیسرا بڑا ملک بھی اس پیچیدگی میں الجھ گیا ہے۔ پاکستان کے دفاع کے نقطۂ نظر سے بھی یہ واقعہ بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے اگر کشمیر کی طرف پیش قدمی کا دروازہ چینیوں پر کھل جائے جیسا کہ لداخ کی طرف سے کھلتا نظر آتا ہے تو کشمیر کا مسئلہ صرف پاکستان اور بھارت کے لیے ہی نہیں بلکہ دنیا کے لیے پہلے سے زیادہ خطرناک ہو جائے گا۔ اور خطرے کا سب سے پہلا نشانہ ہم ہوں گے۔"

مولانا صاحب نے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا "موجودہ بین الاقوامی سیاسی حالات میں کشمیر کا ایک خود مختار ریاست بن جانا کوئی قابلِ عمل اور قابلِ لحاظ تدبیر نہیں۔ کشمیر اپنے رقبے اور آبادی کے لحاظ سے ممکن ہے اس قابل ہو لیکن اپنے ذرائع اور وسائل کے لحاظ سے خود مختار ریاست بننے کا اہل نہیں اور نہ ہی موجودہ بین الاقوامی حالات میں تنہا اپنی حفاظت کر سکتا ہے اُسے لامحالہ اپنی معاشی ضروریات کے سبب بھی اور اپنے دفاع کے لیے بھی بھارت یا پاکستان دونوں میں سے ایک پر انحصار کرنا ہوگا۔"

کشمیر کے مسئلے میں پاکستان سے پچھلے سالوں میں جو کوتاہیاں ہوئیں آپ کا خیال تھا کہ اس مرحلے پر انہیں دہرانا کسی فائدے سے خالی ہوگا۔ مولانا صاحب کے نزدیک یہ ماضی کی غلطیاں تھیں جو ماضی کے ساتھ گزر تو گئیں مگر اپنے تاثرات یقیناً چھوڑ گئیں۔ اب ہمیں ان اثرات سے نپٹنے کی فکر کرنی چاہیئے اس بحث میں الجھنے اور وقت ضائع کرنے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ کہ غلطیاں کیا تھیں"۔ اور جہاں تک مسئلۂ کشمیر میں پاکستان کے مؤقف کا تعلق ہے یہ سراسر مبنی برحق ہے' مولانا نے اپنے سنجیدہ لہجے میں بات جاری رکھی" اور کم سے کم جو چیز مستحسن ہو سکتی تھی وہ یہی مؤقف ہے۔ میں کم سے کم کا لفظ اس لیے استعمال کر رہا ہوں کہ پوری طرح مستحسن مؤقف تو یہی ہو سکتا تھا کہ غاصب نے غصب کرنے کے لیے جس طرح طاقت استعمال کی تھی ہم حق کے لیے اسی طرح طاقت استعمال کرتے"۔

ڈاکٹر عبدالحمید (صدر شعبہ سیاسیات پنجاب یونیورسٹی) سے ملاقات

تنازع کشمیر برصغیر ہند کی تقسیم کے باعث وجود میں آیا ہے۔ ہندوستان کی تقسیم اس اصول کے تحت عمل میں آئی تھی کہ ہندو اکثریت والے علاقے بھارت ڈومینین میں شامل ہوں گے اور مسلم اکثریت والے علاقے پاکستان ڈومینین میں۔ جہاں تک ہندوستانی ریاستوں کا تعلق تھا، ان کے حکمرانوں سے کہا گیا تھا کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق جس ڈومینین سے چاہیں الحاق کر لیں لیکن اپنے محل وقوع اور آبادی کی اکثریت کا خاص خیال رکھیں"۔ ڈاکٹر عبدالحمید صاحب نے مسئلہ کشمیر کے پس منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ "لیکن مہاراجہ کشمیر نے اپنی ریاست کے محل وقوع اور مسلم اکثریت کو نظر انداز کر کے ریاست کا الحاق بھارت سے کر دیا اور جب پاکستان نے اس الحاق کے خلاف آواز اٹھائی تو بھارت خود ہی یہ مسئلہ اقوام متحدہ میں لے گیا اور اس طرح یہ مسئلہ بین الاقوامی حیثیت اختیار کر گیا۔

"آپ نے پوچھا ہے کہ بھارت اور پاکستان کے مشترکہ دفاع میں کشمیر کیونکر حائل ہو رہا ہے، تو میرے خیال میں اس مشترکہ دفاع میں کشمیر ہی سب سے بڑی رکاوٹ ہے کیونکہ مشترکہ دفاع اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب ان دونوں ملکوں کے باہمی مسائل حل ہو جائیں۔ آج اگر کشمیر میں خط جنگ بندی کے دونوں طرف بھارت اور پاکستان کی فوجیں کھڑی ہیں تو ظاہر ہے وہ وہاں کوئی پکنک نہیں منا رہیں یا انہیں وہاں آب و ہوا تبدیل کرنے کے لیے کھڑا نہیں کیا گیا۔ جب تک پاکستان و بھارت کے مشترکہ مسائل حل نہ ہوں گے یہ فوجیں وہاں سے کیسے ہٹائی جا سکتی ہیں"

اب یہ موضوع زیر بحث تھا کہ کیا کشمیر میں استصواب رائے سے بھارت میں ہندو مسلم فساد کا سبب بن سکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بڑے بے ساختہ پن سے کہا "ہرگز نہیں۔ یہ تو پنڈت جی کا محض ایک ڈھونگ اور استصواب رائے کو ٹالنے کی تدبیر ہے۔ اگر وہ واقعی یہ سمجھتے ہیں کہ کشمیر میں استصواب رائے سے بھارت میں ہندو مسلم فساد سر اٹھا سکتا ہے تو پھر انہیں بھارت کو ایک سیکولر ریاست نہ کہنا چاہیئے۔ ویسے بھی پنڈت جی حیلہ سازی سے کام لینے کے قائل ہیں۔ کبھی وہ کہتے ہیں کہ اب حالات بدل چکے ہیں اور کبھی اس بہانے کی آڑ لیتے ہیں کہ پاکستان سیٹو اور سینٹو جیسی تنظیموں میں شامل ہو گیا ہے۔ ویسے وہ دلی طور پر اس حقیقت کے قائل ہیں کہ اگر کشمیر میں استصواب ہوا تو وہ کبھی کامیاب نہ ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اب بھارتی حکومت کشمیر میں ہندوؤں اور سکھوں کو دھڑا دھڑ آباد کر رہی ہے تاکہ مسلم اکثریت کو اقلیت میں بدل دیا جائے۔ پنڈت جی کی یہ امتیازی خصوصیت ہے کہ وہ تنگ نظری سے کام لے کر اکثر مسائل کو خوبصورت زبان میں بیان کر سکتے ہیں جہاں وہ ساری دنیا کو امن اور آشتی کا سبق دینے کے مدعی ہیں وہاں اپنے ایک ہمسایہ ملک کے ساتھ بعض تنازعات پر امن طریقے پر حل نہیں کر سکتے۔ بقول اقبال ؎

نگہ دارد برہمن کار خود را
نمی گوید بکس اسرار خود را
مرا گوید از تسبیح بگذر
بدوش خود کشد زنار خود را

جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ پاکستان کن وجوہ کی بنا پر کشمیر کا مطالبہ کرتا ہے تو اس کی بہت سی وجہیں ہیں"، ڈاکٹر صاحب نے اپنے دھیمے لہجے میں بات جاری رکھی۔ "اول، چونکہ کشمیر مسلم اکثریت والا علاقہ ہے اس لیے اسے پاکستان کے ساتھ ملنا چاہیئے تقسیم ہند بھی اسی اصول پر عمل میں آئی تھی۔ دوم، کشمیر کی حدود فطری طور پر پاکستان سے ملحق ہیں۔ اور اس کے تمام راستے پاکستان کی طرف آتے ہیں۔ سوم، کشمیریوں کو حق خود ارادیت دلانے کے لیے۔ چہارم، اقوام متحدہ کی قراردادوں

کو لباس عمل پہنانے کے لئے، ہم اپنی حدود کو مکمل کرنے کے لئے جب تک پاکستان کشمیر کو حاصل نہیں کرتا اس کی سرحدیں غیر مکمل رہیں گی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ پنڈت جی پاکستان کی سرحدیں مکمل نہیں دیکھنا چاہتے۔ ان کی حتی الامکان یہی کوشش ہے کہ پاکستان دوسرے مسلم ممالک سے ملنے جلنے نہ پائے اور وہ اپنے اس مقصد میں کسی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں اور انہوں نے بین الاقوامی میدان میں پاکستان کو بے اثر بھی کیا ہے۔ پاکستان کی سرحدوں ہی کو نامکمل بنانے کے لئے کبھی وہ پختونستان کا ڈھونگ کھڑا کروا دیتے ہیں اور کبھی تصفیۂ کشمیر میں حیلہ سازی سے کام لینے لگتے ہیں۔ پاکستان کے مطالبۂ کشمیر کی چھٹی وجہ یہ بھی ہے کہ مغربی پاکستان کے تین مشہور دریا سندھ، چناب اور جہلم کشمیر سے نکلتے ہیں۔ یہ دریا مغربی پاکستان کی زراعت میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کے منبع کا ہمارے پاس ہونا بہت ضروری ہے۔ شاید آپ کو یاد بھی ہوگا کہ بھارت نے ایک دفعہ دھمکی بھی دی تھی کہ ہم بعض دریاؤں کا رخ موڑ کر پاکستان کی زراعت تباہ کر دیں گے۔"

اس سوال پر کہ کیا مسئلہ کشمیر میں پاکستان نے کوئی غلطی کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب چند لمحوں کی سوچ کے بعد کہنے لگے۔ "کئی ایک۔ مثلاً بعض افراد نے جنگ کشمیر کو جہاد کہنا شروع کر دیا۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ بھارت نے اسی ایک لفظ کی آڑ لے کر مغربی ممالک میں پاکستان کے خلاف خوب پروپیگنڈہ کیا۔ عیسائی دنیا جہاد کے لفظ پر نہایت آسانی سے بھڑکائی جا سکتی ہے۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد نے بسا اوقات جہاد کے تخیل کو پاکستان کے خلاف استعمال کیا ہے۔

(۲) پنڈت نہرو کے بہت سے امریکی مداح جن میں سے بعض افراد کا شرف نیاز مجھے بھی حاصل ہے، یہ کہتے ہوئے سنے گئے ہیں کہ پاکستان نے جوناگڑھ کا الحاق قبول کرنے میں غلطی کی تھی۔ لیکن وہ یہ نہیں سوچتے کہ اگر پاکستان نے جوناگڑھ کا الحاق قبول کرنے میں غلطی کی تھی تو بھارت نے کشمیر کا الحاق قبول کرنے میں کون سی سیاسی دیانت داری کا ثبوت دیا ہے۔

(۳) ہم نے اقوام متحدہ پر ضرورت سے زیادہ اعتماد کیا ہے۔ اقوام متحدہ نے یہ معاملہ گزشتہ گیارہ برس سے کھٹائی میں ڈال رکھا ہے۔ ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ کشمیر فقط اپنی ہی قوت سے حاصل ہو سکتا ہے۔ قراردادوں پر اعتماد کرنے سے نہیں۔

اب گفتگو کا رخ وادی لداخ میں چینیوں کے گھس آنے کی طرف مڑ گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے نہایت اطمینان سے اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا۔ "جب چین نے وادی لداخ کے بعض حصوں پر قبضہ کیا تھا تو بعض پاکستانی زعما یہ کہتے ہوئے سنے گئے تھے کہ فی الحال یہ پاکستان کا دردِ سر نہیں۔ اگر وہ یہ بات نہ کہتے تو درست تھا۔ لداخ کشمیر کا ایک حصہ ہے اور اب تک بھارت نے اس پر غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہے۔ گزشتہ دنوں اخبارات میں یہ خبر جلی حروف میں دیکھنے میں آئی ہے کہ عنقریب روس کی وساطت سے چین اور بھارت کے مناقشات ختم ہونے والے ہیں اور سودا اس بات پر طے ہوا ہے کہ لداخ کے بعض حصے بھارت چین کی نذر کر دے۔ یہ بھی عجیب قصہ ہے کہ پنڈت جی وہ علاقہ چین کو دینے کو تیار ہیں جس پر اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق ان کا حق تسلیم نہیں کیا جاتا۔"

شخصیت

شیرِ کشمیر ——— شیخ محمد عبداللہ

"جو شخص کشمیر سے واقف ہے وہ کشمیر میں شیخ محمد عبداللہ کی حیثیت سے بھی واقف ہے۔ وہ "شیرِ کشمیر" ہیں۔ اور کشمیر کی دور افتادہ ترین وادیوں کے لوگوں کے دلوں میں ان کی محبت رچی ہوتی ہے"

۲۷ مئی ۱۹۴۶ء جواہر لال نہرو

"اس میں کوئی کلام نہیں کہ کشمیر کے سلسلے میں بھارتی پالیسی سے مجھے بالکل اتفاق نہیں۔ میرا ایمان ہے کہ اس دس سالہ تنازع کا مناسب اور منصفانہ حل ایک ہی ہے کہ اہل کشمیر کو اپنا مستقبل چننے کا وہ حق حاصل ہو جس کا کبھی آپ بھی انتہائی شد و مد سے مطالبہ کرتے تھے"

شیخ محمد عبداللہ

(خط بنام پنڈت جواہر لال نہرو ——— ۱۱ر اپریل ۱۹۵۸ء)

۱۹۳۱ء میں جب کشمیر کی آزادی کی تحریک شروع ہوئی۔ اس وقت شیخ محمد عبداللہ ایک گمنام جوشیلے نوجوان سکول ماسٹر تھے۔ جذبۂ آزادی نے آپ کو میدان میں آنے کی جرأت دلائی۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں آپ اس قافلے کے قافلہ سالار بن گئے۔ جس میں بڑے بڑے عمر رسیدہ بزرگ، سنجیدہ سیاست دان، مذہبی راہنما اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ شامل تھے آپ نے تھوڑے ہی دنوں میں ریاست گیر شہرت حاصل کی۔ اور لوگ آپ کے نام کی مالا جپنے لگے۔

کشمیر میں مسلمانوں کی غالب اکثریت ہے اور تحریک آزادی کشمیر کا سنگ بنیاد بھی مسلمانوں نے ہی رکھا ہے اس لیے کہ ڈوگرہ نظام اور حق تلفیوں کا شکار براہ راست مسلمان ہی تھے۔ تحریک آزادی کشمیر کا ہیرو اور مسلمانوں کا لیڈر کہلانے کے باوجود شیخ عبداللہ ہر کشمیری کو خواہ وہ کسی فرقے کے ساتھ تعلق رکھتا ہو، اپنا بھائی خیال کرتے تھے۔

۱۳ر جولائی ۱۹۳۱ء کے واقعہ ہائلہ کے نتیجے میں جب مہاراج گنج کے علاقے میں بعض دکانوں کو نقصان پہنچایا گیا تو شیخ محمد عبداللہ نے اس طرز عمل کی کھلے الفاظ میں مذمت کی۔ اور مسلمانوں کو یقین دلایا کہ ہماری لڑائی ہندوؤں کے ساتھ نہیں بلکہ غیر ملکی ڈوگرہ حکمرانوں کے ساتھ ہے۔ ہندو ہمارے بھائی ہیں۔ اور ان کو بھی آزادی کا اتنا ہی حق ہے جتنا مسلمانوں کو۔ اگر حکومت اپنے کردہ ایادوں کو پورا کرنے کے لیے ہندوؤں کو فرقہ وارانہ فسادات پر ابھار رہی ہے تو مسلمانوں کو اس سے پرہیز کرنا چاہیئے۔

جموں و کشمیر مسلم کانفرنس نے جو ابتدائی مطالبات پیش کئے تھے وہ کلیتہً عوامی مطالبات تھے اور ان کو نام ہی ابتدائی انسانی حقوق کا دیا گیا تھا۔ ان مطالبات میں پریس اور پلیٹ فارم کی آزادی، مجلس قانون ساز کا قیام، مذہبی مقامات کی واگذاری، زمینوں کا حق ملکیت، مذہبی رسوم کی ادائیگی کی آزادی ایسے مطالبات تھے جن کا مفاد ہر طبقے اور ہر فرقے کے لیے عام تھا۔ البتہ اس مطالبے کو فرقہ وارانہ سمجھا گیا کہ سرکاری ملازمتوں میں تمام فرقوں کو تناسب آبادی کے مطابق نمایندگی دی جائے۔ ریاستی ہندوؤں نے اس مطالبے کو اپنے حقوق میں مداخلت سمجھا، حالانکہ واقعہ یہ نہ تھا۔ کشمیری پنڈتوں کے نمایندہ پنڈت پریم ناتھ بزاز نے گلانسی کمیشن کے سامنے نہایت فراخدلی کے ساتھ اعتراف کیا کہ مسلمانوں کو آج تک خصوصیت کے ساتھ سرکاری ملازمتوں میں حق کی نمایندگی سے محروم رکھا گیا ہے۔ اس لئے ان کا یہ مطالبہ حق بجانب ہے۔

تحریک آزادی کشمیر کو غیر متوقع حالات میں استحکام حاصل ہوتا گیا۔ جس سے ڈوگرہ حکمران گھبرا گئے اور انہوں نے اس تحریک کو فرقہ وارانہ رنگت دینے اور غیر ریاستی ہندوؤں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لئے تگ و دو شروع کی۔ چنانچہ غیر ریاستی ہندو پریس اور تنظیموں نے جن میں کانگریسی پریس پیش پیش تھا موقع بے موقع تحریک آزادی کشمیر کی سخت مخالفت کی اور اس کو خالص فرقہ وارانہ تحریک ثابت کرنے کی کوشش کی۔ البتہ ریاست کے بعض ہندو اور سکھ تحریک آزادی کی بنیادی اغراض سے متفق ہو گئے اور انہوں نے شیخ محمد عبداللہ کے

دماغ میں یہ بات بٹھادی کہ اگر تنظیم کے دروازے غیر مسلموں پر بھی کھول دیئے جائیں تو تحریک میں زیادہ زور پیدا ہو سکتا ہے۔ یہ بات شیخ صاحب کے دماغ میں گھر کر گئی۔ انہوں نے اس سلسلے میں کانگریس راہنماؤں کے ساتھ ملاقاتیں کیں۔ اور آخر کار ۱۹۳۸ء میں مسلم کانفرنس کے بجائے نیشنل کانفرنس کے قیام کا اعلان کر دیا۔

اس تبدیلی کا مطلب شیخ صاحب کے خیال میں یہ تھا کہ تحریک آزادی کو عمومی شکل دے کر مضبوط کیا جائے۔ ۔ ہمیشہ یہی کہتے رہے کہ کشمیر میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور جمہوری آئین کے تحت حکومت کرنے کا انہی کو حق ہے، لیکن یہ درست نہیں کہ غیر ملکی حکومت میں صرف مسلمان ہی مظلوم ہیں، لہٰذا ہمارا فرض ہے کہ ہم مل کر اس ظالم غیر ملکی حکومت کا تختہ الٹ دیں اور اپنی قسمت کے آپ مالک بنیں۔

نیشنل کانفرنس کے قیام کے بعد ہی ۱۹۴۳ء میں مکمل ذمہ دارانہ نظام حکومت کی تحریک شروع کی گئی جو شیخ صاحب کے بنیادی نظریات کی دوسری منزل تھی۔ اس تحریک میں کشمیر کے غیر مسلموں نے بھی حصہ لیا۔ چنانچہ اس وقت کے وزیر اعظم گوپالا سوامی آئنگر نے اس یقین دہانی کے ساتھ دو انتخابی وزارتیں سیاسی تنظیموں کے سامنے پیش کیں کہ یہ ایک تجرباتی قدم ہوگا۔ مسلم کانفرنس نے حکومت کی اس پیش کش کو ٹھکرا دیا۔ لیکن شیخ صاحب نے اپنے دوستوں کے مشورے سے اس پیشکش کو قبول کر لیا اور اپنی جماعت کی طرف سے مرزا محمد افضل بیگ کو ریاستی کابینہ میں بھیج دیا۔ گوپالا سوامی آئنگر ایسے گرگ باراں دیدہ نے مرزا افضل بیگ کے ہاتھ پاؤں اس طرح باندھ دیئے کہ ان کی حیثیت ایک سرکاری کارندے سے زیادہ نہ رہی۔ عوام نیشنل کانفرنس سے بدظن ہو گئے۔ یہ تنظیم ایک بے جان لاش بن کر رہ گئی۔ اب تنظیم کی کشمیری عوام میں ساکھ تھی تو وہ صرف شیخ محمد عبداللہ کا نام اور عوام کی ان کی ذات کے ساتھ دلچسپی تھی۔ اس صورت حال کو دیکھ کر شیخ صاحب دل ہی دل میں پچھتائے اور آخر کار وزارتی مشن کے شملہ پہنچنے پر اپنا اصل مطالبہ پیش کر دیا۔ آپ نے لاہور سے وزارتی مشن کو ایک مفصل تار دیا جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ کشمیر پر ڈوگرہ خاندان کی حکومت کے جواز میں عہد نامہ امرتسر پیش کیا جاتا ہے۔ اب چونکہ انگریز برصغیر ہند کو چھوڑ کر جا رہے ہیں، ان کے جانے کے بعد عہد نامہ امرتسر کالعدم سمجھا جائے گا اور کشمیر کے لوگ بھی اسی طرح آزاد ہوں گے جس طرح برصغیر کے دوسرے حصوں کے لوگ۔ وزارتی مشن کو یہ برقیہ بھیجنے کے بعد شیخ صاحب سری نگر پہنچے اور پہنچنے کے ساتھ ہی مئی ۱۹۴۶ء میں "کشمیر چھوڑ دو" کا نعرہ لگایا اور اس سلسلہ میں پے در پے کئی تقریریں کیں، جن میں واضح الفاظ میں مہاراجہ ہری سنگھ کو کہا گیا کہ کشمیر پر ڈوگروں کو حکومت کرنے کا کوئی حق نہیں، لہٰذا وہ کشمیر چھوڑ کر چلے جائیں۔ اس تحریک کے سلسلے میں شیخ صاحب کو گرفتار کر کے ان پر بغاوت کا مقدمہ چلایا گیا اور ۹ سال قید کی سزا دی گئی۔ کشمیر چھوڑ دو تحریک میں ہندوؤں کے نوجوان طبقے نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور کئی تعلیم یافتہ معزز ہندو اور سکھ شیخ صاحب اور ان کے ہمراہیوں کے ساتھ جیل بھیجے گئے۔ "تحریک کشمیر چھوڑ دو" کے دوران بخشی غلام محمد اور خواجہ غلام محمد صادق کو ریاست سے بھاگنے کا موقع دیا گیا تھا۔ کانگریس نے اگرچہ عملاً اس تحریک سے اپنی لاتعلقی کا اظہار کیا اور اس کو شیخ محمد عبداللہ کا ذاتی فعل قرار دے کر کام چلانے کی کوشش کی لیکن اندرونی طور پر اپنے ارادوں کو پورا کرنے کے لئے بخشی غلام محمد کو بڑی بڑی رقمیں دیتی رہی۔ تاکہ اس طرح برصغیر ہند کی قسمت کا فیصلہ ہونے تک ریاست میں یہ آگ سلگتی رہے۔ ہندوستان کی تقسیم کا فیصلہ ہوتے ہی۔ بخشی غلام محمد نے سردار پٹیل سے گٹھ جوڑ کیا اور بھارت کی کشمیر پر قبضہ کرنے میں اعانت کے سلسلے میں سودا بازی شروع ہو گئی۔

کشمیر میں ٹھاکر جنگ سنگھ اور رائے بہادر شام سندر لال کے ذریعے بخشی غلام محمد مہاراجا ہری سنگھ سے ملا اور اس طرح اس سازش کی بنیادیں مضبوط کر دی گئیں۔ اس زمانے میں شیخ صاحب بھدرواہ جیل میں مقید تھے ان کو بادامی باغ جیل سری نگر میں پہنچایا گیا۔ اور وہاں کشمیر کے مستقبل کے بارے میں ان کے ساتھ بات چیت شروع ہو گئی۔

تین دن کی گفت و شنید کا نتیجہ یہ نکلا۔ کہ شیخ صاحب کشمیر کی مکمل آزادی کے اعلان سے کم کسی بات پر رضامند نہیں ہوئے۔ جب سردار پٹیل کو اس گفت و شنید کے انجام کی اطلاع دی گئی تو تیسرے دن مسٹر کرشنا مینن، پنڈت جواہر لعل نہرو کی طرف سے شیخ صاحب کے نام یہ ذاتی پیغام لائے کہ آپ غیر مشروط طور پر جیل سے باہر آ جائیں۔ کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ کشمیری عوام اور آپ کی مرضی اور خواہش کے مطابق کیا جائیگا۔

شیخ صاحب اس یقین دہانی پر جیل سے باہر نکلے اور اس وقت ڈریر باغ کے ایک جلسہ عام میں اعلان کیا کہ ہم آج پھر اسی جگہ کھڑے ہیں جہاں آج سے سولہ ماہ پہلے تھے۔ ہم کشمیر کی آزادی کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں اور یہ جدوجہد اس وقت تک جاری رہے گی جب تک کشمیر مکمل طور پر آزاد نہ ہو جائے۔ اس دوران میں ہندوستان دو حصوں میں تقسیم ہو گیا ہے۔ اور اس سے ہمارے لئے ایک اور مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔ کہ ہم بھارت کے ساتھ اپنی قسمت کو وابستہ کریں۔ یا پاکستان کے ساتھ۔ لیکن اس مسئلہ کی حیثیت ثانوی ہے۔ الحاق کا فیصلہ کشمیر کے چالیس لاکھ عوام کو کرنا ہے۔ اور وہ اُسی وقت ممکن ہے جب ریاست آزاد ہو۔ ہری سنگھ کو کشمیر کے مستقبل کے بارے میں بولنے کا کوئی حق نہیں۔ کشمیری عوام اگر پاکستان کے ساتھ الحاق کرنے کا فیصلہ کریں تو دنیا کی کوئی طاقت ان کے فیصلے کو رد نہیں کر سکتی اور میں ان کے فیصلے کے سامنے سر تسلیم خم کر دوں گا۔ اس جلسہ میں اسلام زندہ باد اور پاکستان زندہ باد کے نعرے بھی لگتے رہے۔ اس میں شک نہیں کہ شیخ صاحب کو جیل میں اس حد تک متاثر کیا گیا تھا کہ وہ ہندوستان کی نیت پر کسی قسم کا شک و شبہ کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ دوسرے ہی دن سے شیخ صاحب کے مکان پر سیاسیات میں دلچسپی لینے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ جن میں کشمیر کے اہل الرائے سیاسی مدبر بھی تھے، بڑے بڑے مسلمان سرکاری افسر بھی شیخ صاحب کے پرانے رفیق کار بھی اور سیاسی کارکن بھی۔ ان تمام لوگوں نے شیخ صاحب کو اپنے ڈھب پر لانے کی کوشش کی لیکن اس وقت تو شیخ صاحب کو یہی یقین تھا کہ بھارت کشمیر کو ڈوگروں سے آزاد کرانے میں ان کو پوری پوری مدد دے گا۔

اسی اثنا میں بھارت کی فوج کشمیر پہنچا دی گئی۔ ریاست کا نظم و نسق بظاہر شیخ صاحب کے ہاتھ میں دے دیا گیا اور ان کو یقین دلایا گیا کہ بعض آئینی کارروائیوں کو پورا کرنے اور ریاست میں امن قائم کرنے کے ساتھ ہی ڈوگرا استبداد سے کشمیر کی آزادی کا اعلان کر دیا جائے گا۔ شیخ صاحب کو اندھیرے میں رکھنے کے لئے ان کے مطالبے پر مہر چند مہاجن کو واپس بلا لیا گیا۔ ہری سنگھ کو بظاہر معزول کر کے بمبئی بھیج دیا گیا۔ تاکہ شیخ صاحب کو یہ احساس نہ ہو کہ میرے ساتھ دھوکا کیا جا رہا ہے لیکن آخر تابکے "شیخ صاحب کے دل میں یہ احساس پیدا ہونے لگا کہ ان کو ایک نئی غلامی کے جال میں پھنسایا جا رہا ہے اور بھارت کشمیر پر مکمل قبضہ کرنے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ انہوں نے بھارت کے اس رویے کے خلاف احتجاج کیا اور مطالبہ کیا کہ ہمیں اپنی قسمت اور مستقبل کا فیصلہ کرنے کا موقع دیا جائے جس پر ان کو معزول کر کے جیل بھیج دیا گیا اور ان کی جگہ اس آدمی کو لایا گیا جس نے اس شرط پر بھارت کے ساتھ کشمیر کا سودا کیا تھا اور اُس وقت کے لئے زمین ہموار کر رہا ہے ——— یعنی بخشی غلام محمد۔

شیخ صاحب کو جیل بھیجنے کے بعد کئی افسانے تراشے گئے۔ لیکن حقیقت وہی تھی جس کا اظہار شیخ صاحب نے رنبیر سنگھ پورہ اور خانیار کے جلسوں میں کیا تھا یا آنے والی عید کے موقع پر کرنے والے تھے۔

شیخ صاحب کی طویل نظر بندی کے دوران میں پنڈت جواہر لعل نہرو کے سوا بھارت کے اکثر مدبر اور حاکم شیخ صاحب سے ملے اور انہوں نے ان کو اپنے ڈھب پر لانے کی کوشش کی لیکن شیخ صاحب اس بات پر بضد رہے کہ کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ کشمیر کے عوام ہی کر سکتے ہیں۔ [illegible] شیخ صاحب کو اسی وجہ سے مخالف رائے عامہ کے ساتھ دوچار رہنا پڑا تھا کہ لوگ بھارت کے ساتھ ان کے تعلقات کو پاکستان دشمنی کے مترادف سمجھتے تھے اور اب ان پر بھارت یہ الزام لگا رہا تھا کہ وہ بھارت دشمنی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ حالانکہ وہ صرف کشمیر دوستی کے علمبردار تھے۔ اگرچہ اس ضمن میں بھارتی رہنما، اخلاقی اقدار کے مبلغ پنڈت نہرو کے پھیرے میں آگئے تھے۔

اس وقت شیخ صاحب جیل میں ہیں۔ کشمیر کی رائے عامہ ان کے ساتھ ہے۔ بھارتی مقبوضہ کشمیر کی اس نئی تحریک کے ساتھ ریاستی ہندوؤں اور سکھوں کی اچھی خاصی تعداد ہے۔ کیونکہ ان کو اس بات کا یقین ہو چلا ہے کہ بھارت کے ساتھ ریاست کا الحاق ریاست کی تقسیم یا موجودہ تعطل ریاست کو اقتصادی لحاظ سے تباہ و برباد کرنے کے مترادف ہے۔ اس کے علاوہ بھارت نے کشمیر کو شمالی ہندوستان کے ساتھ مدغم کرنے کی جو سازش شروع کر رکھی ہے وہ کشمیری عوام کے لئے بہت بڑے خطرے کا الارم ہے۔

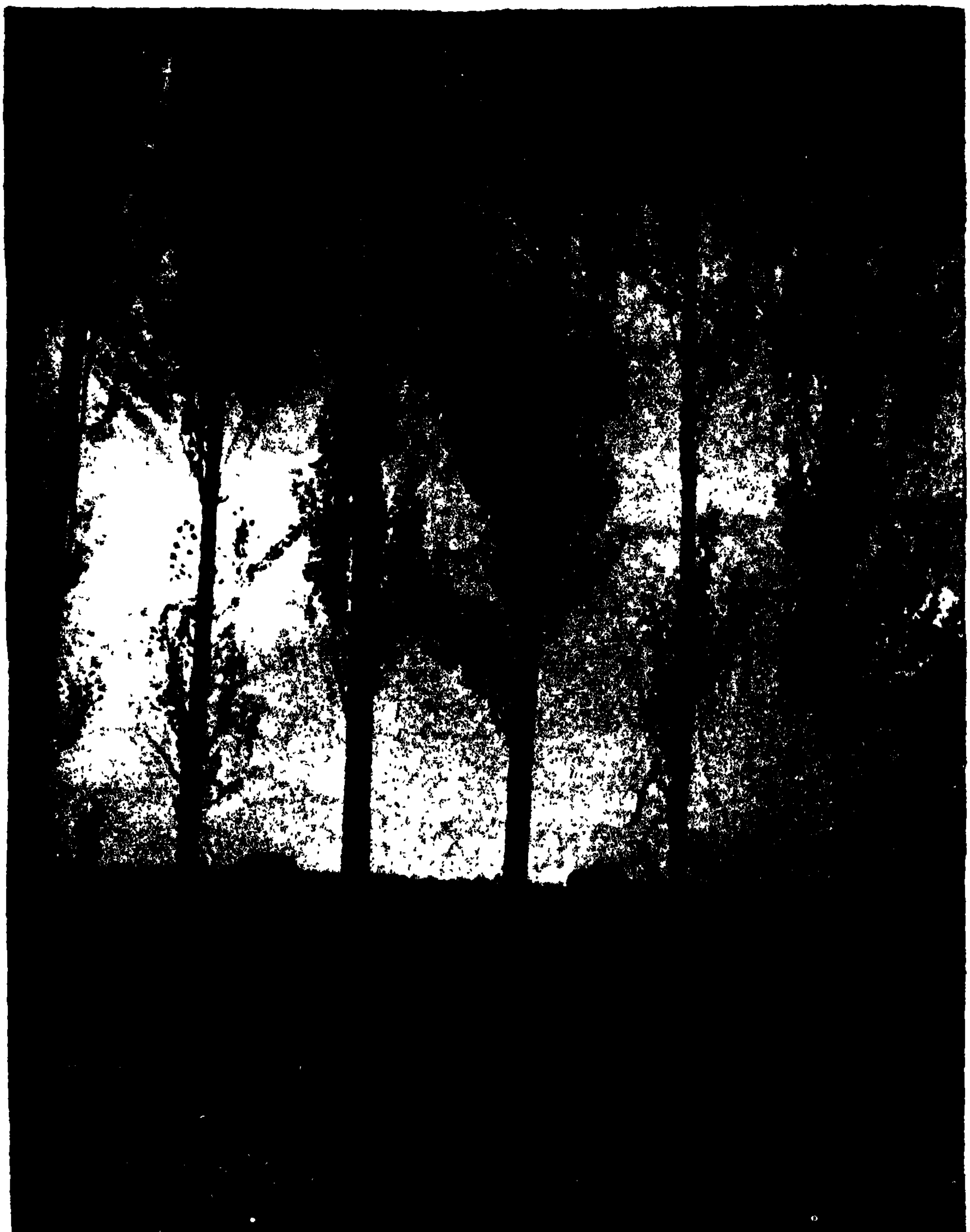
حکومت پاکستان نے کشمیری عوام کو جو یہ ضمانت دی ہے کہ وہ

حق خودارادیت حاصل کرنے کے بعد عوامی خواہشات کی بنیادوں پر اپنے مستقبل کا فیصلہ کریں۔ یہ ایک ایسی پیشکش ہے جس کی بھارت کبھی جرأت نہیں کر سکتا۔ اس وقت شیخ عبد اللہ ہی نہیں بلکہ کشمیر کا بچہ بچہ محسوس کر رہا ہے کہ بھارت کشمیر کے نام پر کچھ طاقتوں کے ساتھ سودا بازی کر کے بین الاقوامی سیاست میں اپنی ساکھ قائم کرنا چاہتا ہے جس کے لئے کوئی کشمیری کسی حالت میں تیار نہیں۔ لداخ کے بارے میں پنڈت جواہر لعل نہرو کی موجودہ روش اس کا بین ثبوت ہے

شیخ صاحب کا اولین اور آخری مقصد کشمیر کی آزادی ہے۔ وہ کشمیر کی سیاست میں ہمیشہ ایک فعال اور متحرک شخصیت رہے ہیں اور یہ ایک قدرتی بات ہے کہ جو شخص ہر وقت حصول مقصد کے لئے بھاگتا دوڑتا ہے وہ ٹھوکریں بھی کھاتا ہے۔ گرتا بھی ہے اور سنبھلتا بھی ہے۔ لیکن ان کی یہ جرأت قابل داد ہے کہ جب ان کو بھارت کی بدنیتی کا احساس ہوا تو انہوں نے عزت و جاہ کی پروا نہ کرتے ہوئے جیل کی زندگی کو ترجیح دی۔ اتنی طویل نظر بندی سے رہائی کے بعد شیخ صاحب کے رویہ اور موقف میں سرِ مو فرق نہیں آیا اور وہ اسی استقامت کے ساتھ اپنے مطالبے پر قائم ہے کہ بھارتی حکمرانوں کو انہیں دوبارہ گرفتار کر کے نہ صرف جیل بھیجنا پڑا بلکہ ان اور ان کے رفقاء کے خلاف غلط اور بے بنیاد مقدمات قائم کئے گئے۔ ان مقدمات کی نوعیت پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ کشمیر کے بارے میں بھارت کے تمام دعوے غلط اور بے بنیاد ہیں۔ شیخ صاحب کے خلاف الزام یہ ہے کہ وہ پاکستان کے ساتھ مل کر بخشی حکومت کا تختہ اُلٹنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس الزام سے بھارت کی وہ ساری عمارت دھڑام سے زمین پر آگری ہے جو اس نے کشمیر پر ناجائز قبضہ رکھنے کے لئے تعمیر کی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ کشمیری بھارت کے ساتھ ہیں۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب شیخ صاحب بھی بھارت کے خلاف ہیں جن کو بھارتی حاکم "مجسم کشمیر" کا خطاب دے چکے ہیں تو پھر وہ کون کشمیری ہے جو بھارت کے حق میں ہے۔ اس کے علاوہ بھارت اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کر سکتا کہ کشمیر کی رائے عامہ شیخ محمد عبد اللہ کے ساتھ ہے۔ جو اس بات کا ایک اور ثبوت ہے کہ بھارت کو کشمیر میں ایک شخص کی بھی تائید حاصل نہیں۔ اسی احساس کے پیش نظر بھارت نے ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور اچاریہ ونوبا بھاوے کے ذریعے کوشش کی تھی۔ کہ شیخ صاحب اپنے مطالبے سے دستکش ہو جائیں چنانچہ اس مقصد کے لئے مقدمہ کی کارروائی بھی التوا میں ڈال دی گئی۔ لیکن شیخ صاحب اپنے مطالبے پر ڈٹے رہے اور اعلان کر دیا کہ "رب السجن احب الی مما یدعوننی الیہ"

الحسینؓ

از: عمر ابو النصر



کشمیر کا ایک عام منظر



اونچے پیڑ



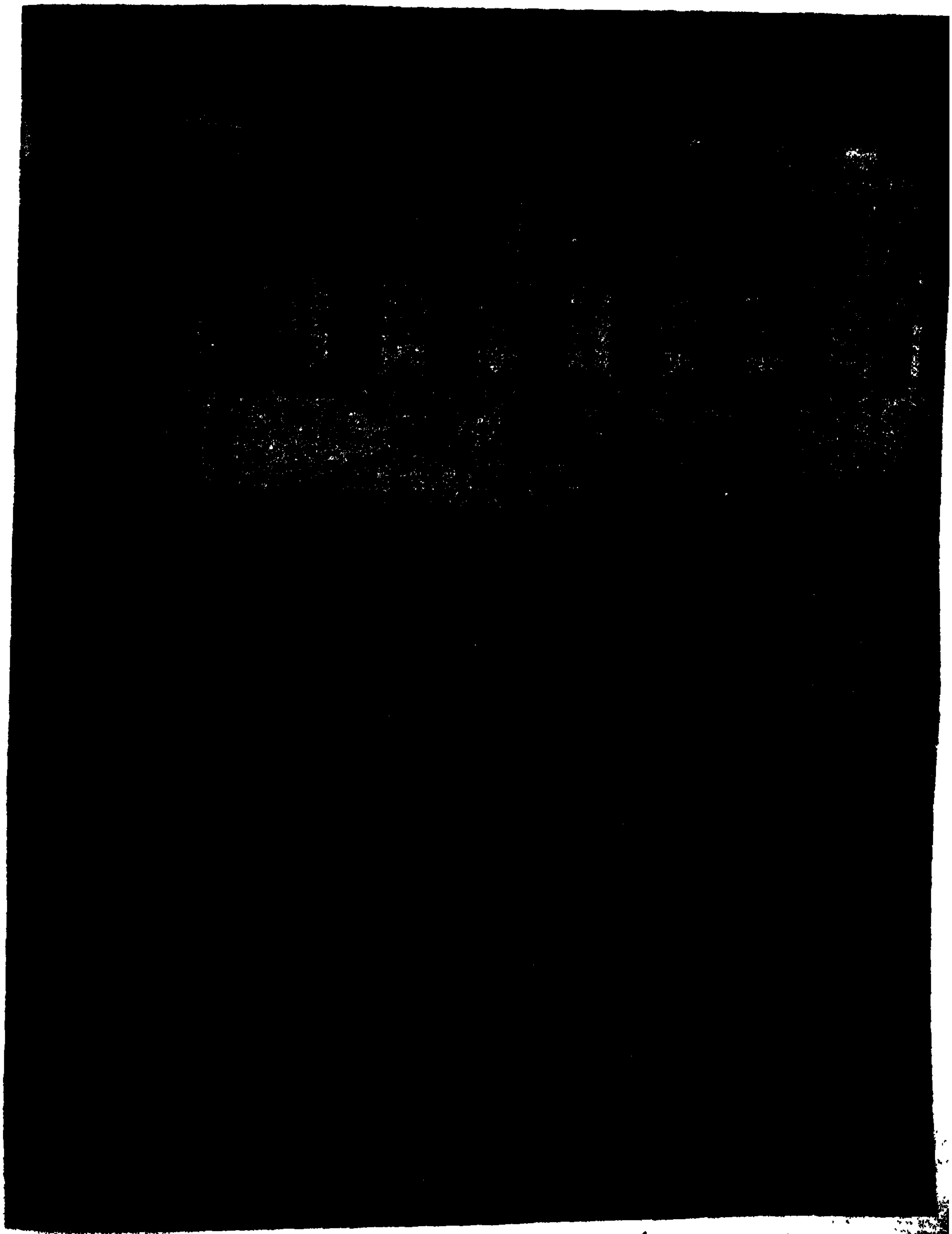
کھلے پانی



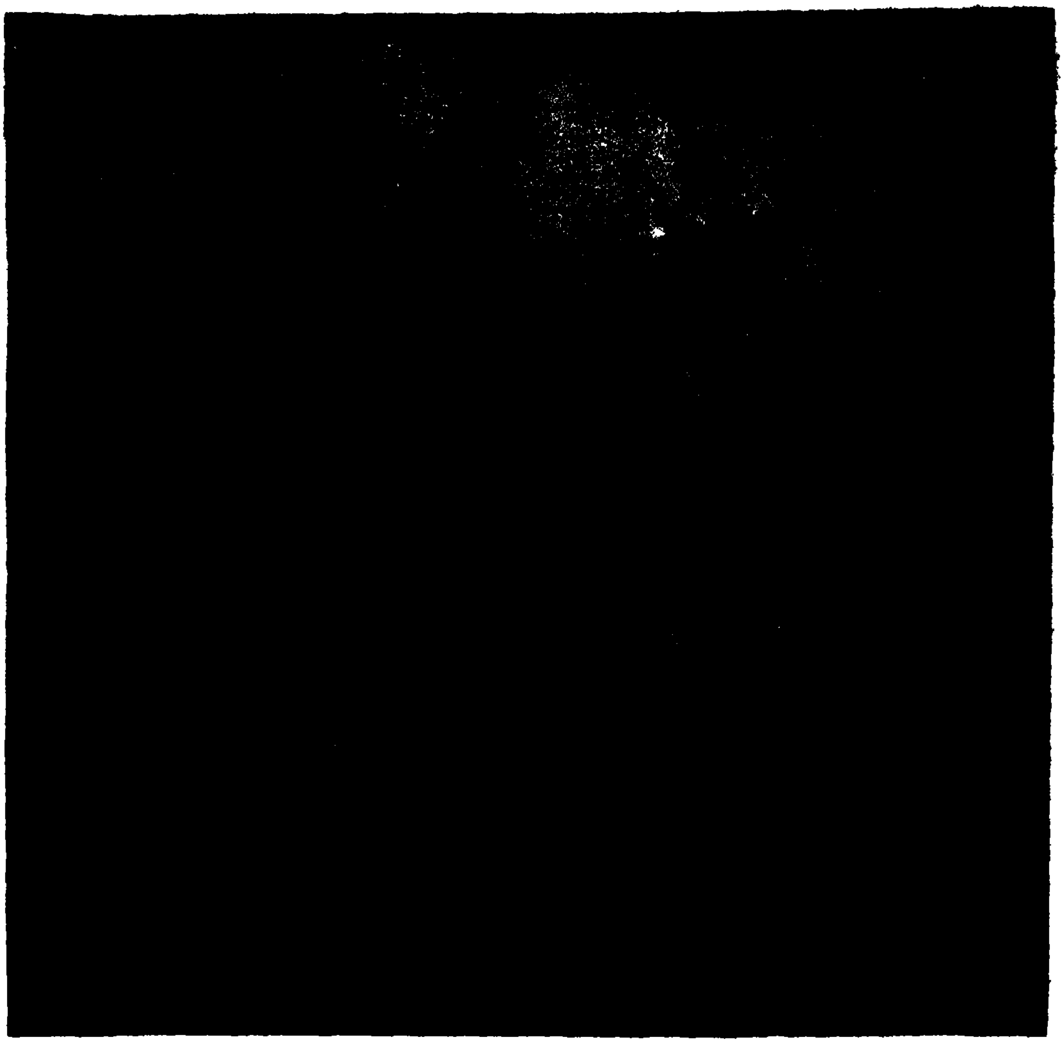
لکڑی منڈی



میوہ منڈی

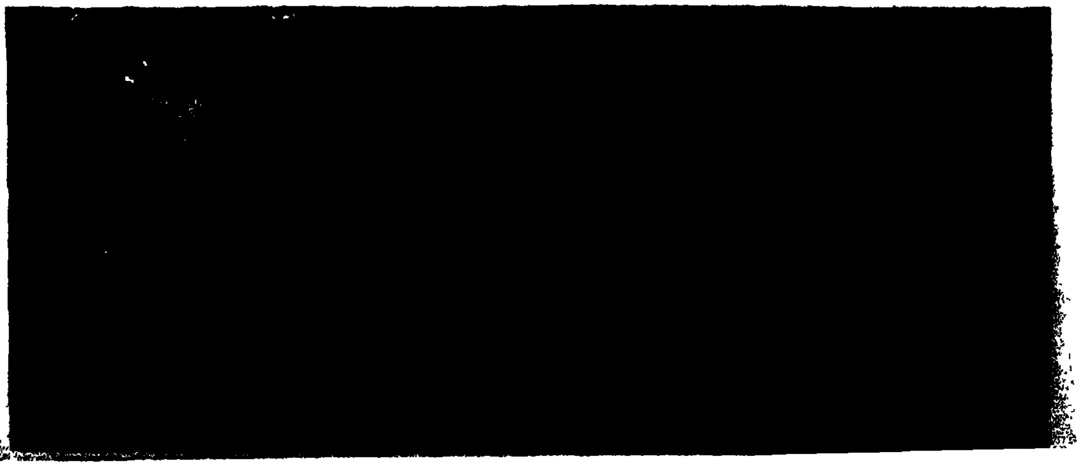


ہری سنگھ کے راج محل کے زیر سایہ مانجھیوں کی کشتیاں

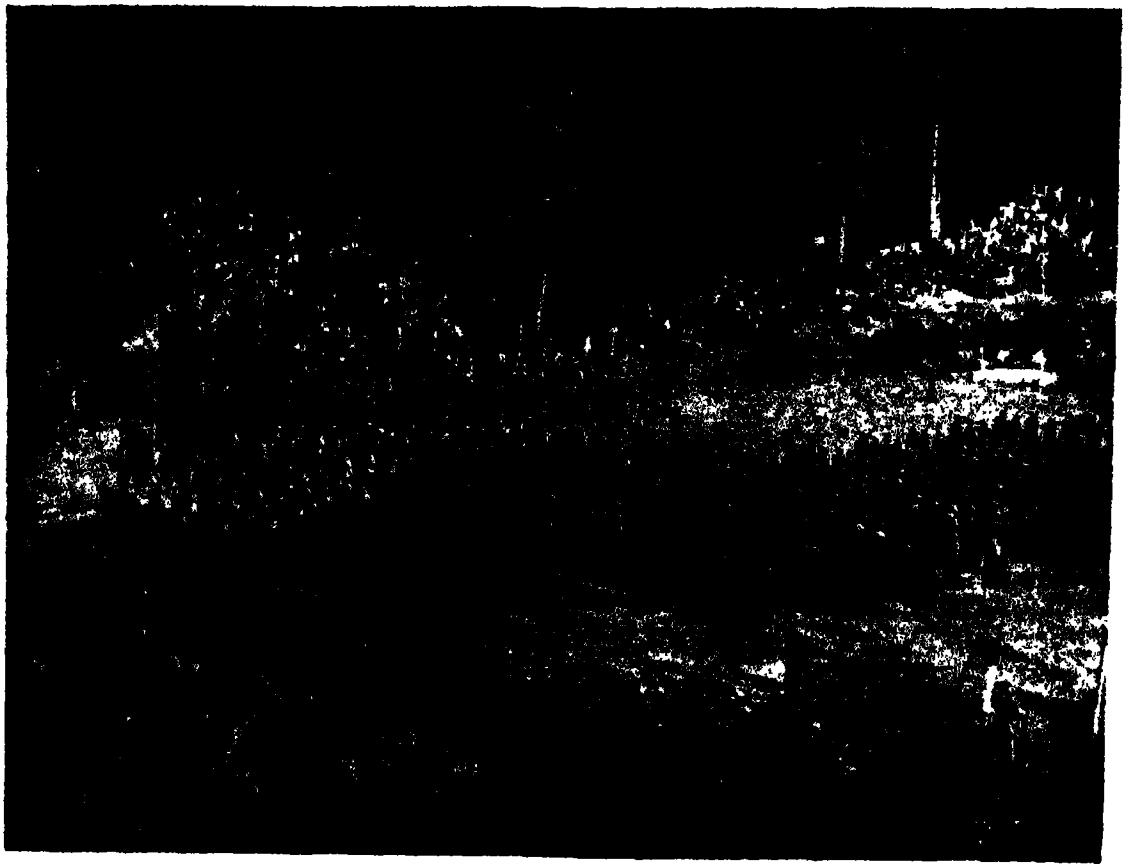


مسجد حضرتِ بل

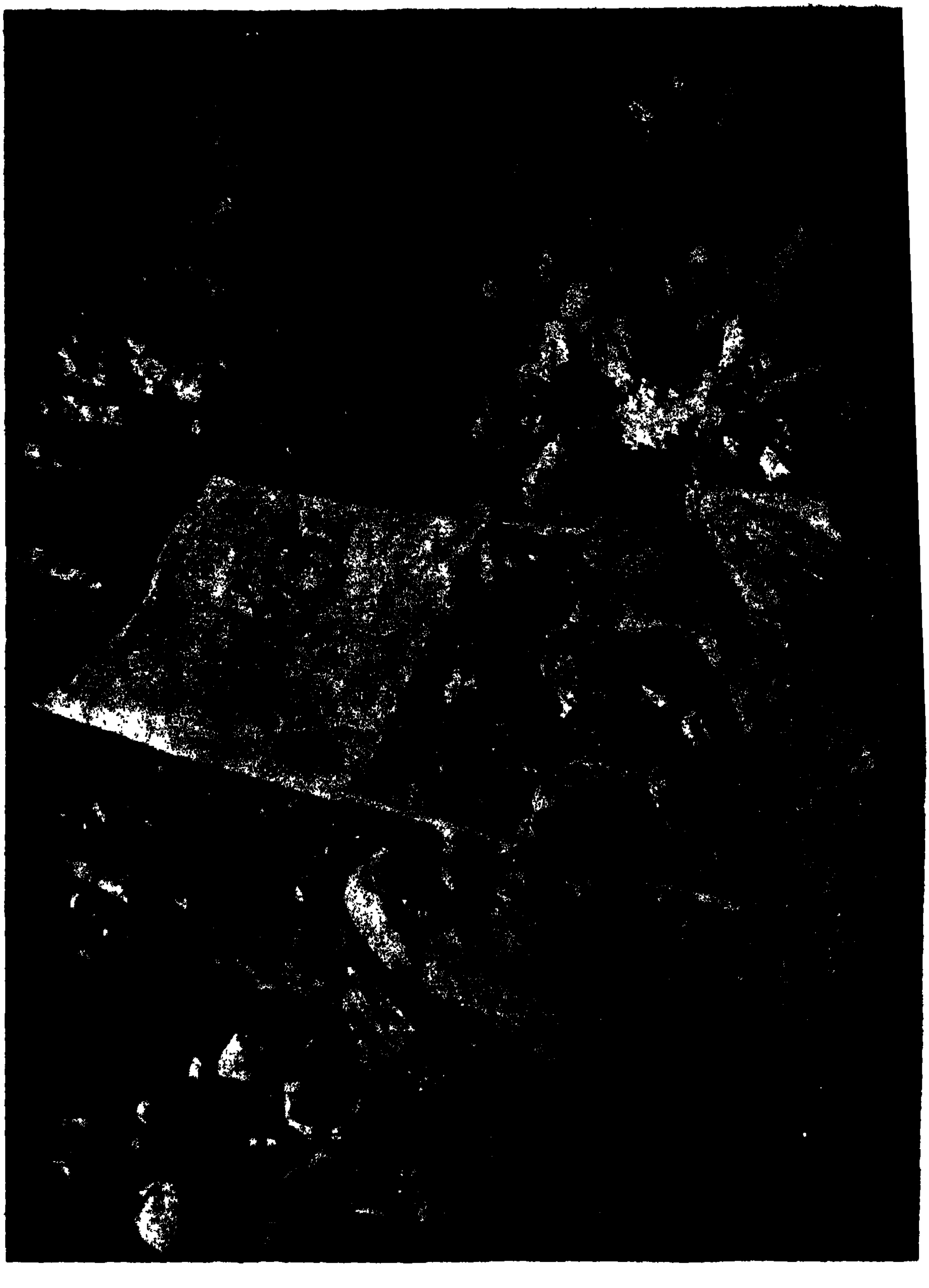
سری نگر میں مغل عہد کا ایک پُل







سرفروشانِ کشمیر





اہلِ کشمیر شیخ محمد عبداللہ کی عارضی رہائی کے بعد ان کی تقریر سن رہے ہیں ،

شخصیت

چودھری غلام عباس

عمر میں پورے چھپن برس اور میانہ قدوقامت، بے حد حساس طبع، ملنساری کے جذبے کا یہ عالم کہ دشمن بھی اپنے کئے پر ندامت محسوس کرنے لگیں تلوار کی طرح تیکھے نقوش اور پروقار کتابی چہرہ گلستانِ کشمیر کا یہ سدا بہار پھول جنت تک اپنے وطن میں رہا مگر گرد حد رنگا و رہا۔ اس کی تیز مہک کشمیر کے گوشے گوشے کو مہکاتی رہی اور آج بھی غریب الوطنی کے عالم میں اس کی ایک ہلکی سی جنبش نگاہ مقبوضہ کشمیر کے چالیس لاکھ ظلم کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے بے دست و پا کشمیری مسلمانوں کے دلوں کی دھڑکن تیز کر سکتی ہے۔ اور وہ اپنے اس نجات دہندہ کی طرف سے کوئی پیغام سننے کے لئے ہر لحظہ گوش برآواز رہتے ہیں۔

آج چودھری غلام عباس کو دیکھ کر یہ اندازہ کرنا نہایت مشکل ہے کہ یہی شخص جب آٹھ دس برس کا لڑکا تھا۔ تو کس قدر شریر، تیز، تند مزاج اور گستاخ لڑکا ہوا کرتا تھا۔ موحیلوں اور بہانوں سے اپنے ہم جو لڑکوں سے جھگڑا لڑائی مول لیتا۔ واقف اور ناواقف لڑکوں سے دست و گریباں ہوتا ہوت کا پکا، زود رنج، جذباتی اور ذکی الحس ہوا کرتا دوسروں کی آگ میں بلا تامل کود پڑنا اس کا معمول تھا۔ شرارتوں میں اکثر آگے ہوتا اور اس میں اسے ایک گونہ گوں مسرت حاصل ہوتی کبھی، کبھی تو اس کی آنکھوں کا پانی اس قدر اتر جاتا کہ بڑوں کا بھی لحاظ نہ کرتا اور اس باعث کئی دفعہ پٹ بھی جاتا۔

ننھا غلام عباس جموں کے ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ اپنے والدین کا سب سے بڑا اور بچپن کے ابتدائی دور میں واحد لڑکا ہونے کے باعث اس کی ناز برداری طبعی تھی۔ علاوہ بریں اس کے ماموں مرحوم نے جو جموں میں ایک ممتاز ہیڈ کلرک تھے مگر اس وقت تک اولاد نرینہ سے محروم تھے غلام عباس کو اس کے والدین سے مانگ لیا تھا اسکے ماموں کو اس سے گہری محبت تھی۔ دوسرے نزدیکی رشتہ دار بھی اس کی دلجوئی میں پیچھے نہ تھے۔ اس ڈھیر ساری شفقت کا یہ نتیجہ ہوا کہ عباس ...... ایک شوخ و گستاخ اور بگڑا ہوا لڑکا بن گیا۔ والدین گھورتے تو وہ ماموں کے گھر چلا جاتا اور اگر ماموں ذرا آنکھیں دکھاتے تو وہ والدین کے گھر چلا آتا اس کا نتیجہ ہوا کہ اس کا دماغ ساتویں آسمان تک پہنچ گیا اور گھر والوں اور باہر والوں کی نظروں میں اس کی خاص قدرو منزلت ہو گئی۔

کتابِ ماضی کی ورق گردانی کرتے ہوئے چودھری صاحب نے اپنی بات جاری رکھی بولے: خود امیر نہ تھا لیکن ہر غریب اور مظلوم کو دیکھ کر مجھے دلی صدمہ ہوتا تھا کبھی یتیم، بھوکے ننگے اور حاجت مند کی حالت کبھی برداشت نہ کر سکتا تھا۔ بغض و کینہ، بدلہ و انتقام، ہجو و غیبت کے جذبات سے میرا دل بالکل پاک تھا۔ میری خوش قسمتی تھی کہ گھر کا ماحول اور میری تربیت بہت اچھی تھی۔ گھر کے تمام بالغ افراد عبادت و ریاضت، صوم و صلوٰۃ اور تہجد و تلاوت قرآن کریم کے پابند تھے۔ عابد والدین بچوں کو سختی سے ان فرائض کا پابند کرتے ہیں۔ یہی حال میرا تھا۔ اپنی تمام شرارتوں اور گستاخیوں کے باوجود بچپن ہی میں مجھے نماز کی عادت پڑ چکی تھی اور آٹھ دس برس کی عمر میں روزہ کا بھی شدت سے پابند ہو گیا تھا۔"

گورنمنٹ ہائی سکول سے میٹرک پاس کرنے کے بعد چودھری صاحب کالج میں داخل ہو گئے۔ ایف۔ اے اور بی۔ اے کے امتحانات اچھے نمبروں سے پاس کرنے کے بعد وہ قانون کی تعلیم حاصل کرنے لاہور چلے آئے اور میاں لاء کالج میں داخل ہو گئے۔ "قیام لاہور کے دوران میں میرا معمول ہو گیا تھا کہ حضرت داتا گنج بخش رح کے مزار پر ہر جمعرات کو فاتحہ خوانی کے لئے ضرور جایا کرتا تھا"۔ چودھری صاحب نے کرسی میں پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ "یہ مئی ۱۹۳۰ء کا واقعہ ہے۔ میرے سالانہ امتحان شروع ہو چکے تھے۔ امتحان کے دنوں میں میں روزانہ مزار پر جایا کرتا تھا۔ ایل۔ ایل۔ بی کے آخری پرچہ کے دن حسبِ معمول داتا صاحب کے مزار پر پہنچا۔ مقبرے کے سامنے ہی کھڑے ہو کر فاتحہ پڑھی اور پھر دعا میں مصروف ہو گیا۔ بعد میں مجھے یوں محسوس ہوا جیسے عالم خواب میں ہوں۔ اسی حالت میں محسوس ہوا کہ کسی غیر مرئی طاقت نے مجھے آہستگی سے یہ کہا ہے

کہ اس سال تمہارا امتحان میں کامیاب ہونا ٹھیک نہیں۔ اس واقعہ کے معاً بعد میری آنکھ کھل گئی۔ چند دنوں کے لئے متفکر اور مایوس تو ضرور ہوا لیکن بعد میں یہ جان کر کہ شاید میرے اپنے دماغ کی خیال آفرینی تھی میں یہ واقعہ بھول گیا۔ علاوہ ازیں میرے پرچے بے حد اچھے ہوئے تھے۔ لیکن جب نتیجہ نکلا تو میں واقعی فیل تھا۔ اس ناکامی نے میرے حوصلے پست کر دیئے اگلے برس اگرچہ میں نے کم محنت کی تھی مگر پھر بھی اچھے نمبروں پر پاس ہوا تھا"

چودھری غلام عباس ایف۔ اے ہی کے زمانے میں سیاسیات کشمیر میں داخل ہو گئے تھے۔ یہ ۱۹۲۲ء کا ذکر ہے کہ کالج کے چند نوجوانوں نے مل کر معطل شدہ ینگ مینز ایسوسی ایشن کو دوبارہ زندہ کیا۔ ان میں نوجوان غلام عباس بھی شامل تھا۔ ان دنوں ریاست میں پریس اور پلیٹ فارم کی آزادی بالکل مفقود تھی۔ نہ معلوم حکومت نے کیوں اور کن حالات میں اس کے اجراء کی اجازت دے دی تھی۔ ہمارے خفیہ اجلاس میں احباب نے جماعت میں عمل کا رنگ بھرنے اور تادم زندگی اس کے استحکام و دوام کے لئے مصروف کار رہنے کی غرض سے حلف اٹھائے۔" چودھری صاحب نے خلاؤں میں گھورتے ہوئے کہا "میں نے بھی قرآن کریم پر حلف اٹھایا۔ مجھے اس وقت معلوم نہ تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ لیکن حقیقتاً اسی ساعت سے میری آئندہ سیاسی زندگی کا غیر ارادی طور پر آغاز ہو گیا تھا۔ اس کے بعد اس وادی پُرخار میں وہ وہ رنج اٹھائے ہیں کہ جی جانتا ہے۔"

جب ازدواجی زندگی کا موضوع زیر بحث آیا تو چودھری صاحب چند لمحوں کے توقف کے بعد کہنے لگے "بی۔ اے کے امتحان کے بعد میری شادی ہو گئی تھی۔ چند دن گزرے تو میں عارضی طور پر لارمبا خفیہ کلرک مقرر ہو کر سری نگر چلا گیا۔ مجھے ملازمت سے طبعاً نفرت تھی۔ مگر چند احباب کے اصرار پر مجبور ہو گیا لیکن وہاں کسی بات پر دفتر میں سیکرٹری اور بعد میں وزیر متعلقہ سے اَن بن ہو گئی اور میں نے ملازمت ترک کر دی اور واپس جموں آ کر پھر سے مسلم ایسوسی ایشن کے کام میں مصروف ہو گیا لیکن اب بیوی کا بوجھ بھی سر پر آن پڑا تھا۔ اس لئے میں اسلامیہ سکول میں ملازم ہو گیا۔ آخر چھ سات ماہ بعد وہاں بھی جھگڑا ہو گیا اور میں نے یہ ملازمت بھی ترک کر دی۔ لیکن اب کے بیکاری نے مجھے قدرے پریشان کر دیا۔ آخر ایک روز بیٹھے بیٹھے میں نے وکیل بننے کا تہیہ کر لیا اور ایسوسی ایشن کا کام ایک دوست کے سپرد کر کے لاہور چلا گیا۔"

لاہور سے واپس آنے کے بعد انہیں وکالت کرنا نصیب نہ ہوئی اور پہلے سے بھی زیادہ تندہی سے ڈوگرا حکومت کا طلسم توڑنے میں مصروف ہو گئے۔ سیاسی دوڑ دھوپ کے لئے سیاسی کارکنوں کو اپنی گرہ سے خرچ کرنا پڑتا تھا۔ چودھری صاحب کا اپنا یہ حال تھا کہ گھر والے ان کی مسلسل امداد کے متحمل نہ ہو سکتے تھے۔ اس لئے سری نگر اور جموں آنے جانے کے لئے انہیں اکثر پریشانیوں کا سامنا رہتا تھا اور اسی سلسلے میں انہوں نے اپنی بیوی کے تمام زیورات ایک ایک کر کے گروی اور بعد میں فروخت کر دیئے۔ اس کے بعد انہوں نے وہ وقت بھی دیکھا کہ ان کی بیوی کے پاس کئی دنوں تک ایک پھوٹی کوڑی بھی نہ ہوا کرتی تھی۔ یہ زمانہ ان کے لئے انتہائی پریشانی اور کشمکش کا تھا۔ اس سے اکثر اوقات ان کا حوصلہ پست ہو جاتا تھا۔ لیکن اس عالم یاس میں قدرت ہمیشہ ان کی ہمت بندھاتی رہی اور وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جاتے رہے۔ ان کے ذاتی اخراجات تو زیادہ نہ تھے۔ البتہ بیوی اور بچوں کی طرف سے ان پر کافی پابندیاں عاید تھیں جنہیں وہ آج تک پوری طرح نہیں نبھا سکے۔ وہ سات بار قید ہوئے لیکن ہر بار گھر والوں کو ناقابل بیان حال پر چھوڑ آئے۔ ایسے حالات میں بے سرمایہ سیاسی کارکنوں کی اپنی قربانی تو معمولی ہوتی ہے۔ اصل قربانی ان کے متعلقین کی ہوتی ہے۔ اس ضمن میں اگر یہ کہا جائے کہ آج تک ان سے زیادہ قربانی ان کے بیوی بچوں نے کی ہے تو یقیناً کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ یہی حال ان کے دوسرے رفقاء کار کا تھا جن کی زیادہ تعداد قومی خدمت کا جذبہ رکھنے کے باوجود مالی پریشانی کے باعث بادل نخواستہ دنیائے سیاست سے رخصت ہو جانے پر مجبور ہو گئے۔ دراصل سیاست فارغ البال لوگوں کا کام ہے۔ تحریک حریت کشمیر میں کبھی کسی سرمایہ دار مسلمان نے عملی حصہ نہ لیا تھا۔

جب میں نے ان سے ان کی پہلی پہلی اسیری کا تذکرہ کیا تو وہ اپنی آنکھوں کو تھوڑا سا بھینچ کر سوچنے لگے جیسے ماضی کی یادداشتوں پر امتداد زمانہ سے جمی ہوئی گرد صاف کرنے میں محو ہوں اس دوران میں ان کے چہرے پر کئی تاثرات ابھرتے، پھیلتے اور مٹ جاتے۔ جیسے سمندر کی خاموش سطح پر ننھی ننھی لہریں مختلف نقوش بنانے میں مصروف رہتی ہیں۔ پھر وہ گمبھیر آواز میں بولے: "وہ غالباً ۱۳ اگست ۱۹۳۱ء کا دن تھا۔ میں سری نگر میں امیرا کدل کے بازار میں کھڑا اپنے ایک دوست سے محو گفتگو تھا۔ اچانک ساری فضا زمین سے آسمان تک گرد و غبار کا ایک تودہ بن گئی۔ اس کے بعد فضا بالکل ساکن ہو گئی۔ اور آسمان کی سیاہی اور زردی تانبے کی سی لالی میں بدل گئی۔ اس دن کی طوفانی آندھی کے متعلق تمام عمر

لوگوں کی ہو رہی تھی کہ ایسا قیامت خیز منظر ساکنان کشمیر نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ اچانک میری نگاہ سامنے کے منظر پر پڑی۔ جگہ جگہ لوگوں کی ٹولیاں باہم گفتگو میں مشغول تھیں۔ میرے کان کھڑے ہو گئے اور میں نے ایک راہگیر سے اس اضطراب کی وجہ دریافت کی۔ تو معلوم ہوا کہ حکومت نے سنٹرل جیل میں نہتے اور بے گناہ مسلمانوں پر گولی چلا دی ہے۔ یہ خبر سنتے ہی میں تیر کی طرح جامع مسجد میں پہنچا۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ ستر بے گناہ مسلمان اجل کو لبیک کہہ چکے ہیں اور بیسیوں حالت نزع میں ہیں۔

" جامع مسجد کا اندرونی اور بیرونی حصہ مردوں، عورتوں، بوڑھوں اور بچوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ آہ و فغاں کی صدائیں زمین و آسمان کا سینہ فگار کر رہی تھیں۔ ظالم ڈوگرے حکمران کی جلادانہ حرکات کے خلاف داد خواہی کے لئے پکارا جا رہا تھا۔ میں خاموشی سے یہ اندوہناک منظر دیکھتا رہا۔ مگر تھوڑی دیر بعد شدت الم سے میرے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے۔ کوئی سنگدل سے سنگدل انسان بھی اس غمناک منظر کو دیکھ کر متاثر اور اشکبار ہوئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔

اسی رات میں اور مسلم کانفرنس کے دو اور رہنما غدے قاضی گوہر رحمان اور ایم۔ یعقوب کنٹریکٹر ایک ہاؤس بوٹ میں تازہ صورت حالات پر بحث کرنے کی غرض سے جمع ہوئے۔ رات کے بارہ بجے تک تبادلۂ خیالات میں مصروف رہے۔ صبح سویرے ہم نے جامع مسجد جانے کا پروگرام بنایا اور سو گئے ابھی نیم خوابی کا عالم تھا کہ کمرے کے باہر بہت سے پیروں کی چاپ سنائی دی۔ میں جلدی سے اٹھا اور اپنے ساتھیوں کو مطلع کیا۔ ہم نے اپنا سامان جلد جلد سمیٹا اور سب سے پہلے میں نے باہر آ کر خود کو پولیس کے حوالے کیا۔

"ہم تین آدمیوں کی گرفتاری کا نظارہ قابل دید تھا۔ انسپکٹر جنرل پولیس، ڈپٹی انسپکٹر جنرل، ایک سپرنٹنڈنٹ، دو اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ، چار انسپکٹر کئی سب انسپکٹر اور بہت سے ادنیٰ عہدیدار ہماری جانب بندوقیں تانے ہوئے تھے۔ حالانکہ کرفیو نافذ تھا اور سارا شہر فوج کے تسلط میں تھا۔ ڈوگرا حکومت کی عیر مآل اندیشی اور گھبراہٹ کی اس سے بہتر اور کیا مثال ہو سکتی ہے کہ ہم تین آدمیوں کی گرفتاری کے لئے پولیس کا اتنا بڑا لشکر تیار کیا گیا تھا۔

اس سلسلۂ بند و سلاسل میں مجھے اور میرے رفیقوں کو کیا کیا تکلیفیں دی گئیں۔ یہ ایک الگ طویل داستان ہے۔ اس کے بعد تو زنداں سے مجھے ایک قسم کا اُنس سا ہو گیا تھا۔ آخری مرتبہ میں ۱۹۴۶ء میں گرفتار کیا گیا۔ اسی زمانہ میں ریاست میں کئی خوشگوار اور ناخوشگوار انقلاب آئے۔ پاکستان بنا۔ ریاست جموں اور کشمیر میں مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی گئی۔ میں جیل کی چار دیواری کے اندر بیٹھا مارنے والوں کی گولیوں کی آوازیں، مرنے والے مظلوموں کی آخری چیخیں، اغوا ہونے والی سینکڑوں معصوم دوشیزاؤں کی بے اثر آہیں اور فریادیں ایک مجبور قیدی کی حیثیت سے کلیجہ تھام کر سنتا رہا۔ اسی آخری زمانۂ قید میں جہاد کشمیر کی ابتدا ہوئی اور جب

"مجھے اسیر تو بدلا ہوا زمانہ تھا"

بہرحال پاکستان آ کر بھی چودھری صاحب نے کشمیر کی جنگ آزادی کی مشعل برداری جاری رکھی۔ ان کی سرگرمیوں اور موقف کا اندازہ ذیل کی دو "دستاویزی" تقریروں اور ایک خط سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔

۸ دسمبر ۵۳ء کو مسلم کانفرنس کے لاہور کنونشن میں تقریر

میں نے عوام کے اصرار کے باوجود اب تک اس لئے صدارت قبول نہیں کی تھی کہ میرا یہ اقدام کہیں کانفرنس میں ان رفقاء کی شمولیت میں حائل نہ ہو جو کسی وجہ سے اس قومی تنظیم سے علیحدہ ہو چکے ہیں۔ میں انہیں یقین دلانا چاہتا ہوں کہ مجھے یا میرے دوسرے رفقا کو عہدوں سے نہ کبھی دلچسپی رہی ہے اور نہ ہمیں اب کوئی دلچسپی ہے۔

جب سے میں ڈوگرا جیل سے رہا ہو کر آیا ہوں اس وقت سے لے کر اب تک میں نے حکومت پاکستان کے ساتھ مسئلہ کشمیر کے سلسلے میں ہر ممکن تعاون کی صرف کوشش ہی نہیں کی بلکہ بعض اوقات میں نے اپنے اصولوں اور ہم سالہ سیاسی ساکھ کو بھی مفاہمت اور تعاون کی خاطر قربان کیا۔ ہم نے پاکستان کی سالمیت اور استحکام کی خاطر سب ذلتیں برداشت کیں بدقسمتی سے ہمارے ارباب اقتدار نے اس کا غلط مطلب لیا۔ مسلم کانفرنس نے ۱۹۴۰ء سے لیکر ۱۹۴۷ء تک سات سال متواتر ڈوگرا حکومت اور نیشنل کانگرس کے ساتھ پاکستان کے مطالبے پر جنگ لڑی اور ریاست کے چپے چپے سے پاکستان کا نعرہ بلند ہوا۔ پاکستان کی خاطر لاکھوں کشمیری مسلمان شہید ہوئے۔ ہم نے مال و متاع کی پرواہ نہ کی اور عزت و آبرو لٹائی۔ یہ

ہفت روزہ نصرت لاہور

سب کچھ پاکستان کے لئے تھا۔ اب ہم یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ پاکستان کی سالمیت کو خطرہ پیش ہو اور ہم خاموشی سے تماشہ دیکھتے رہیں کشمیر میں اس وقت خون بہہ رہا ہے۔ بھارت ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت مسلمانوں کی واضح اکثریت کو ختم کرنے کا تہیہ کئے ہوئے ہے۔ اٹھارہ بیس لاکھ مسلمان وہاں باقی رہ گئے ہیں انہیں بھی ختم کر دیا گیا تو رائے شماری سے کیا حاصل ہوگا۔ براہ راست بات چیت اپنی جگہ بجا ہے لیکن کشمیری عوام کو جہنم میں نہیں پھینکا جا سکتا۔ اپنی قرارداد میں ہم نے جن جذبات کا اظہار کیا ہے وہ قوم کے جذبات ہیں۔ آج مقبوضہ کشمیر میں مسلمانوں کے خون سے جو ہولی کھیلی جا رہی ہے اسے صرف روکا ہی نہیں جا سکتا بلکہ مسئلہ کشمیر کو حل کرنے کے لئے اس موقع پر مؤثر قدم اٹھایا جا سکتا ہے۔ اگر آج ہم مقبوضہ کشمیر کو حاصل نہیں کر سکتے تو آزاد کشمیر بھی زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتا۔

ڈکسن رپورٹ کے بعد کشمیر کا مسئلہ ختم کر دیا گیا۔ ہم یہ دریافت کرتے ہیں کہ اس کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے۔ ایک موقعہ وہ تھا جب قائدِ اعظم زندہ تھے۔ وہ موقعہ بھی گیا۔ دوسرا موقعہ التوائے جنگ کا تھا وہ بھی ہاتھ سے گیا اور اب ۹ اگست کے بعد تیسرا موقعہ بھی ہم نے گنوا دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ مسئلہ حفاظتی کونسل، پنڈت نہرو یا کسی اور نے ختم نہیں کیا بلکہ اس کی ذمہ داری پاکستان کے ارباب اقتدار اور ہم پر عائد ہوتی ہے۔ شیخ عبداللہ کی گرفتاری کے بعد جو حالات پیدا ہوئے تھے ان کی وجہ سے ہم کشمیر کی تحریک میں جان ڈال سکتے تھے۔ آخر ہمارے بھی جذبات ہیں۔ کشمیر لٹتا جا رہا ہے اور بھارت سے پوچھنے والا کوئی نہیں۔ کیا پاکستان صرف اس قدر چاہتا ہے کہ کشمیر کے بیٹے اور بیٹیاں شہادت کے جام نوش کر کے یہاں کے اخبارات کے لئے چار کالمی سرخیاں مہیا کرتے رہیں؟

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو بات مسٹر محمد علی کے دہلی جانے کی محرک ہوئی اس سلسلہ میں دہلی میں کیا ہوا، اگر مقبوضہ کشمیر کے مسلمانوں کو جان و مال کی حفاظت کی کوئی گارنٹی نہیں ملی تو یہ کس کا قصور ہے؟ حکومت پاکستان اور ہم کشمیری عوام کے سامنے جواب دہ ہیں۔

۹ اگست کے واقعات کے بعد بھارت دنیا کی نظر میں سیاسی اور اخلاقی طور پر مردہ ہو گیا تھا ہم نے اس سے فائدہ نہیں اٹھایا میں نے مسٹر محمد علی سے کہا تھا کہ وہ اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر کشمیر کے مسئلے میں جان ڈالیں۔ لیکن ہمیں سخت مایوسی ہوئی ہے اور یہ آخری موقعہ بھی ہمارے ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ ان حالات نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ ہم کشمیر کو آزاد کرانے کے لئے خود میدان میں نکلیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ پاکستان کے بغیر ہم زندہ نہیں رہ سکتے۔ آج پاکستان کی سالمیت اور بقا خطرے میں ہے اور ہم سے قربانیوں کی طلبگار ہے۔ ضمیر کشی کے دن بیت چکے ہیں اور اب ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے خاموش تماشائی نہیں بن سکتے۔ بعض حلقوں نے عبداللہ اور میری ملاقات کی تجویز پیش کی اس پر بعض حکام نے شیخ عبداللہ کی طرف سے ایک جعلی بیان تیار کرایا۔ جس میں کہا گیا تھا کہ عبداللہ نے میرے ساتھ ملاقات کرنے سے انکار کیا۔ اس شرمناک سکینڈل کے ردِ عمل کا ہی یہ نتیجہ تھا کہ کشمیر کو آزاد اور خود مختار قرار دینے کا پروپیگنڈہ کیا گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ آزاد اور خود مختار کشمیر مسئلے کا کوئی حل نہیں مرحوم لیاقت علی خان، خواجہ ناظم الدین اور مسٹر محمد علی کو میں نے دردمندانہ مشورہ دیا تھا کہ وہ دیانتداری سے کشمیر کے متعلق کوئی قدم اٹھائیں۔ اب بھی وہ ہمیں اگر یہ یقین دلا دیں کہ وہ کوئی ٹھوس اور فیصلہ کن قدم اٹھانا چاہتے ہیں تو میری جماعت سب کچھ ان کے لئے ہر قربانی کرنے کو تیار ہے۔

قائدِ اعظم کے الفاظ میں کشمیر پاکستان کے دل و دماغ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم اس دل و دماغ کے لئے کوئی قربانی بڑی نہیں سمجھتے میں آزاد کشمیر کے عوام اور کشمیری مہاجرین سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ ۱۹۳۱ء کا سا عزم پیدا کریں۔ ہم پاکستان کے عوام کے ساتھ مل کر حکومت کو مؤثر اقدام اٹھانے پر مجبور کر سکتے ہیں۔ پاکستان قائدِ اعظم کی محبوب ترین یادگار ہے اور اس یادگار کو ہم ہر قیمت پر مکمل کرتے رہیں گے۔

۴ مئی ۵۸ء کو چودھری صاحب کا خط ـــــ ملک فیروز خان نون کے نام

اب کچھ مدت کے بعد کشمیر کی اصل امید شیخ محمد عبداللہ کو دوبارہ جیل میں بند کر دیا گیا ہے۔ اپنی آزادی کے مختصر عرصے کے

دوران وہ انتہائی مشکلات اور دشواریوں کے مقابلے میں جن تنہا جرأت مندانہ جنگ لڑ رہے تھے اس کے پیش نظر ان کی گرفتاری پہلے سے ہی ایک طے شدہ امر تھا۔ لیکن چونکہ ہم مقبوضہ کشمیر کے عوام سے بہت دور ہیں اس لئے غالباً ہمارے لئے یہ ممکن نہیں کہ جبر و تشدد اور ان انسانیت سوز مظالم کا اندازہ لگا سکیں جن کا مقبوضہ کشمیر کے بے بس اور بدنصیب لوگوں کو اس دوران سامنا کرنا پڑا ہے۔ کاش حکومت پاکستان نے میرے ان بیانات اور خطوط کا بروقت نوٹس لینے کی زحمت گوارا کی ہوتی جو میں نے حکومت کو لکھے تھے۔

ڈاکٹر گراہم کی ناکامی ——— اور شیخ محمد عبداللہ کی دوبارہ گرفتاری کے بعد ہمیں محب وطن پاکستانیوں کی حیثیت سے اتنی جرأت اور دیانت داری کا ثبوت دینا چاہیئے کہ حقائق کی روشنی میں مسئلہ کشمیر کی اب کیا پوزیشن ہے؟ میں اس سلسلہ میں یہ تجویز پیش کرونگا۔

(۱) حکومت پاکستان اس وقت تک کشمیر کا مسئلہ سلامتی کونسل میں نہ لے جائے جب تک اسے یہ یقین نہ ہو کہ اینگلو امریکی بلاک اب پاکستان کے حق میں کوئی فیصلہ کن رویہ اختیار کرے گا۔ بالکل اسی طرح جس طرح روس حق و انصاف کے تمام اصولوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے بھارت کی مسلسل حمایت کر رہا ہے۔

(۲) حکومت پاکستان کو اعلان کر دینا چاہیئے کہ جب تک جموں و کشمیر میں جنگ بندی کے معاہدے کی تمام اہم شرائط جن میں ریاست جموں و کشمیر میں رائے شماری کرانا بھی شامل ہے مقررہ وقت کے اندر پوری نہیں ہوتی اس وقت تک پاکستان اس معاہدے کا پابند نہیں ہوگا جو اقوام متحدہ نے دولت مشترکہ کے ایک اہم رکن ملک کے دباؤ سے ہم پر مسلط کیا تھا۔ اگر مغربی پاکستان کے وزیر اعلیٰ نہروں کے پانی کی امکانی بندش کو پاکستان کے خلاف (بجا طور پر) اعلان جنگ قرار دے سکتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ حکومت پاکستان کشمیر کے معاملے میں بھی اس حقیقت پسندی کا ثبوت دینے سے ہچکچاتی ہے جبکہ اس حقیقت سے کوئی اختلاف نہیں کہ نہری پانی کے مسئلہ کی بنیاد بھی تنازعہ کشمیر ہے۔ اگر حکومت پاکستان بدقسمتی سے ان میں سے کوئی بھی تجویز قبول کرنے کی پوزیشن میں نہ ہو تو اس صورت میں میرا کم سے کم مطالبہ یہ ہوگا کہ بھارت کے ساتھ سفارتی، تجارتی اور دوسرے تمام تعلقات مکمل طور پر منقطع کر دیئے جائیں۔ یہ اقدام جو بہت پہلے کیا جانا چاہیئے تھا اب ناگزیر ہو گیا ہے۔ کچھ اس وجہ سے کہ مسئلہ کشمیر نازک ترین دور میں داخل ہو گیا ہے اور اس کا اصل مقصد مقبوضہ کشمیر کے عوام کو پاکستان کی طرف سے مکمل حمایت کا یقین دلانے کا یہ ایک عملی مظاہرہ ہوگا۔ میرا خیال ہے آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ یہ بدترین قسم کا مذاق ہے کہ بھارت کو جس نے مقبوضہ کشمیر کو شیخ عبداللہ کی گرفتاری کے بعد "سیاسی" نہیں بلکہ عملی طور پر "قبرستان" میں تبدیل کر دیا ہے پاکستان کے ساتھ اچھے تعلقات کا اطمینان حاصل ہو۔ کسی شخص کے لئے بھائی کے قاتل کے ساتھ دوستانہ تعلقات کیا معنی رکھتے ہیں؟ میرے خیال میں بحیثیت قوم پاکستان کو اسرائیل کے بارے میں مصر کے مسلسل معاندانہ رویے سے سبق حاصل کرنے میں کوئی ہرج نہیں ہونا چاہیئے۔ اگر اس موقعہ پر بھی حکومت پاکستان۔۔ یہ معمولی جرأت کا قدم اٹھانے میں پس و پیش کرتی ہے تو کشمیر کے بارے میں اعلانات اور دعاوی کوئی حیثیت نہیں رکھتے اور اس صورت میں مجھے اس امر کی آزادی ہوگی کہ میں مظلوم کشمیری بھائیوں کی طرف سے عائد کئے گئے فرض کی بجا آوری میں وہ قدم اٹھاؤں جو میرے خیال میں اس وقت موزوں اور مناسب ہو۔

۵؍جنوری ۱۹۵۹ء کو سیالکوٹ میں تحریک آزادی کشمیر کے کارکنوں سے خطاب

تحریک آزادی کشمیر بے مقصد ثابت نہیں ہوئی ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو اس کے نتائج بڑے عمدہ برآمد ہوئے ہیں کشمیر کے متعلق پاکستان کی نئی حکومت کے عزائم اور صدر مملکت کے بیانات ہمارے جذبات اور مقاصد کی واضح ترجمانی کرتے ہیں۔ میں ابھی تک پورے طور پر مطمئن ہوں اور کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ صدر محمد ایوب خاں کے خلوص اور دردمندی پر اعتماد نہ کیا جائے۔ صدر نے قائداعظم کے یوم ولادت پر کشمیر کا ذکر کرتے ہوئے قوم کو ایک قول دیا تھا اور خدا کو حاضر ناظر جان کر کہا تھا کہ وہ کشمیر اور نہری پانی کے مسائل کو آبرومندانہ طور پر حل کئے بغیر چین سے نہیں بیٹھیں گے۔

ہمیں اس قول کا پاس کرنا چاہیئے۔۔ اور جب ہم ملک نون اور صدر ایوب کے بیانات کا موازنہ کرتے ہیں تو خود بخود اطمینانِ قلب میسّر ہو جاتا ہے۔ لہٰذا تحریک آزادیٔ کشمیر کے رضا کار اور کارکن جو یہ سوال کرتے ہیں کہ تحریک آزادیٔ کشمیر کا کیا نتیجہ نکلا ہے؟ اور ہمارا آئندہ قدم کیا ہے؟ تو انہیں میرا جواب یہ ہے کہ ہم نے گزشتہ حکومتوں کو گیارہ سال کی مہلت دی۔ گیارہ سال کی طویل مدت کے بعد نون حکومت کی بے بسی اور شیخ محمد عبداللہ کی گرفتاری سے متاثر ہو کر ہم نے اللہ کا نام لیا اور تحریک شروع کی۔ اگر ہمیں خطِ متارکہ جنگ کو پار کرنے کی اجازت دی جاتی تو آج کشمیر کی تاریخ مختلف ہوتی۔ لیکن افسوس ایسا نہ ہوا۔ بہرحال ہمیں اب نئی حکومت کو بھی مناسب وقت دینا ہے اور اصولاً ہمیں ایسا کرنا چاہیئے۔ بالخصوص کشمیر کے متعلق صدرِ مملکت کے حوصلہ افزا اور ایمان افروز بیانات کے بعد ہمارا اخلاقی فرض یہ ہے کہ نئی حکومت کو نہ صرف مہلت دی جائے بلکہ ملک کے داخلی حالات کو بہتر بنانے اور گوناگوں مسائل کو حل کرنے میں ہم سچے دل سے تعاون کرتے ہوئے حکومت کا ہاتھ بٹائیں۔ کیونکہ ایک مضبوط اور مستحکم پاکستان ہی کشمیر کو آزاد کرا سکتا ہے۔

تحریک آزادیٔ کشمیر ۱۳ سال سے جاری ہے اور اس وقت تک ختم نہیں ہوگی جب تک بھارت کے پنجے سے کشمیر کو آزاد نہیں کرایا جاتا۔ اسے عارضی طور پر معطل کیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ پاکستان میں یہ کافی عرصہ معطل رہی لیکن اسے ختم نہیں کیا جا سکتا جیسا کہ مقبوضہ کشمیر میں شیخ محمد عبداللہ اور ان کے ساتھیوں نے اسے زندہ رکھا ہے۔ یہ آج بھی زندہ ہے اور اپنا مقصد حاصل کئے بغیر مر نہیں سکتی۔

بقیہ — کشمیر کا مفکر صحافی — بزاز

واضح رہے کہ بھارت مقبوضہ کشمیر کے ہر داخلی مسئلہ پر اثر انداز ہو کر ان پر مکمل طور پر اپنی مرضی و منشا کے مطابق حکومت کر رہا ہے)۔

بھارت ایسی جابر اور استعمار پسند حکومت کے درمیان رہتے ہوئے بھی یہ محب الوطن صحافی حق و صداقت کی آواز بلند کر رہا ہے جس کو جھٹلانے کی جرأت پنڈت نہرو بھی نہیں کرتے بلکہ اپنی خفت اور شکست کا احساس مٹانے کے لئے یہ کہہ کر جھوٹی تسکین حاصل کرنے کی سعی ناحاصل کرتے ہیں۔ کہ "میں خود کشمیری ہوں"۔ اس سے یہ امر روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتا ہے کہ بزاز نے انقلابِ کشمیر کا جو تصور پیش کیا وہ ایک ایسا اخلاقی، سیاسی اور معاشرتی نظام ہے جس کی پناہ کشمیریوں کو لینی چاہیئے تھی مگر باہمی جھگڑوں اور سیاسی طالع آزماؤں کی خود غرضیوں سے ایسا نہ ہو سکا۔ غرض بزاز ایک فرد تنہا نہیں بلکہ وہ ایک ذہن اور تحریک ہیں۔ جن سے کشمیریوں کا وہ مستقبل وابستہ ہے جہاں فرد اور مملکت دونوں کی آزادی کو تسلیم کیا جائے گا۔

شیخ محمد عبداللہ کی اسیری اور پنڈت پریم ناتھ بزاز کی جلاوطنی کے بعد مقبوضہ کشمیر کے عوام اب ایک ایسے آتش فشاں میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ جو کسی وقت بھی پھٹ کر عدم تشدد کے نام نہاد ڈھنڈورچیوں کو یہ بتا دیں گے کہ دنیا کی کوئی طاقت کسی قوم کو بزورِ شمشیر غلام نہیں بنا سکتی —— اور یہی وہ بنیادی جذبہ ہے جو بزاز کی عظمت کا راز انفرادیت کی حسین تصویر —— اور ان کے فنِ صحافت کی حقیقی روح ہے حقیقی زندگی ہے۔

شخصیت

کلیم اختر

کشمیر کا مفکر صحافی — بزاز

تاریخ صحافتِ کشمیر میں جو چیز قابلِ تقلید اور افادیت کی مالک ہے وہ پنڈت پریم ناتھ بزاز کی حق گوئی اور شخصیت ہے۔ جو اُن کے صحافتی کردار کو دوسروں پر فوقیت بخشتی ہے۔ اپنے دیانت دارانہ اور بے لوث اصولوں کی وجہ سے بزاز کی آواز اب اتنی قابل اعتماد ہو چکی ہے کہ دنیا کی اکثریت کو اس بات کا یقین و بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے ہمیں یہ بات تسلیم کرنے میں چنداں اختلاف نہیں ہونا چاہیئے کہ بزاز ریاست جموں و کشمیر کا وہ اوّلین صحافی ہے جس نے کشمیریوں کے گہرے درد و کرب میں ڈوب کر اپنے خونِ جگر سے نہ صرف ان کی داستانوں کو قلم بند کیا بلکہ نشانِ منزل بنا کر وہ خود بھی شریک سفر بنے ——

یوں تو بزاز سے پیشتر بھی کئی مصنفین نے کشمیر کے حالات تحریر کر کے ایام گذشتہ کی یادوں کو محفوظ کیا۔ مگر حقیقتاً وہ سب تحریریں کسی نئے فکر یا رجحان کی نیو رکھنے سے قاصر رہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان تحریروں کے خالق مختلف سیاسی، معاشرتی اور مذہبی جماعتوں کے زیر اثر رہ کر صرف "داستان گوئی" یا "کسی محدود ماحول کے پابند نظریات" کے پرچارک بن کر رہ گئے تھے۔ فکری طور پر اس اندازِ فکر کا اثر آنیوالے لوگوں پر ہوتا تھا۔ مگر ذہین بزاز نہ تو اس چکر میں اُلجھے اور نہ انہوں نے ان فرسودہ نظریات کی تقلید ہی کی۔ بلکہ ایک ایسے نئے رجحان کی بنیاد رکھی جس میں روشنی بھی تھی اور حرکت بھی۔ کیونکہ بزاز سمجھ گئے تھے کہ ؎

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیٔ منصور نہیں

اب ان کے سامنے دو چیزیں تھیں ——
اول —— کشمیری عوام
دوئم —— کشمیر کے مسائل اور ان کا حل ——

ان چیزوں پر کافی غور و فکر کے بعد بزاز نے کوئی جذباتی یا وقتی چیز پیش نہیں کی بلکہ ایک ٹھوس اور پُر حقائق کتاب "اندرونِ کشمیر" تحریر کی جس کا ہر لفظ جہاں نوحہ و فریاد تھا وہاں ہر باب میں کشمیریوں کے اُبھرتے اور مچلتے جذبات کی پیش کش کی گئی تھی۔ اس کتاب میں بزاز نے جو حالات قلمبند کئے وہ اس سے پیشتر نگاہوں سے پوشیدہ تھے۔ بزاز نے صحافت میں نیا اندازِ فکر اور نیا ڈھنگ پیش کیا — اور ریاست کے بسنے والوں کے سامنے مکمل آزادی کا فارمولا پیش کر دیا —— اور اس نظریہ کے پنپنے کے لئے ماحول کو سازگار بنانے کی سعی شروع کر دی۔ اس سلسلہ میں انہوں نے جو کچھ کیا وہ کسی سے مخفی نہیں پھر بھی ان چیزوں کا مختصراً اظہار ضروری ہے۔ کیونکہ انہوں نے ریاستی سیاست کو "ایک محدود دائرہ" اور چہار دیواری سے نکال کر نہ صرف ریاست کے گوشہ گوشہ تک پھیلانے کی جدوجہد کی بلکہ دنیا کے ہر ذی حس اور باشعور انسان تک کشمیریوں کی دکھ بھری داستان کو بھی پہنچانے کی ٹھانی اور کون اس حقیقت سے انکار کر سکتا ہے کہ وہ اس چیز میں کامیاب نہیں ہوئے۔ بزاز کا یہ کام ایسا لازوال اور ناقابل فراموش ہے کہ ؏

"ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما"

کی سند اسے حاصل ہو چکی ہے — اور اب یہ کہنے میں تعصب نہیں برتنا چاہیئے کہ اگر بزاز یہ کام نہ کرتے تو کشمیریوں کی دکھ بھری زندگی کی کہانی ہنوز اہل علم کی نظروں سے اوجھل رہتی ——

—— جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ بزاز کی تحریریں وقتی، جذباتی یا ہنگامی نہیں ہوتیں بلکہ اس کے پس پردہ وہ حیات افروز اور مقدس جذبہ کارفرما ہوتا ہے جو "اندرونِ کشمیر" اور "کشمیر کا گاندھی — عبداللہ" ایسی قابل قدر اور گراں مایہ کتب تخلیق کرنے کا موجب بنا۔ ان کتابوں میں جہاں پریم ناتھ بزاز نے برطانوی اور ڈوگرا سامراجیت کا تمسخر اُڑایا ہے وہاں کشمیریوں کی جدوجہدِ آزادی کے مستور حقائق پر سے پردہ بھی اٹھایا اور لطف یہ ہے کہ اس جدوجہدِ آزادی میں سرگرم شریک کار ہونے کے باوجود اس کتاب میں کہیں بھی خود نمائی کی جھلک نظر نہیں آتی۔ اس نے مستقبل کے مؤرخ کو یہ کہنے کا موقع نہیں دیا کہ بزاز نے کشمیریوں کی کشمکش

آزادی کے اظہار کے پردہ میں خود کو ہیرو ثابت کرنے کی بھونڈی کوشش کی ہے۔ کیونکہ بزاز تو اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ "ایثار و قربانی" کبھی چھپی نہیں رہتی اور اس کی تشہیر نہ صرف عدم خلوص کا نشان اور کم ظرفی کی دلیل ہے بلکہ جذبہ قربانی کی توہین ہے ــــ اور پھر کون اس بات سے انکار کرنے کی جسارت کرے گا کہ بزاز ــــ "کردار کے غازی" نہ تھے ــــ

اپنی ایک اور کتاب "تاریخ جدوجہد آزادی کشمیر" میں بزاز نے کشمیر کے ہر پہلو اور وہاں کے مکینوں کے ہر شعبۂ حیات کی المناک تصویروں کو اُجاگر کیا ہے اور پھر ان کے سامنے مکمل آزادی کا نصب العین رکھ کر تمام مصائب و آلام سے نجات کو اس ایک نظریہ کا تابع بنانے کی کوشش کی ہے۔ اس تصنیف سے اقوام عالم کے سامنے مسئلہ کشمیر کی حقیقت بالکل واضح ہو گئی ہے اور بھارتی عیاریوں کا مکروہ چہرہ بے نقاب ہو گیا ہے۔ بزاز سے قبل کے مؤرخین اور صحافیوں نے کشمیر اور غیر منقسم ہندوستان میں رہ کر کشمیریوں کی معاشرتی پس ماندگی، اقتصادی زبوں حالی، سیاسی بے بسی اور مذہبی معاملات میں ناروا پابندیوں پر بہت کچھ تحریر کیا اور ان مظالم کی وجہ ایک ظالم و جابر حکمران کو گردانا۔ مگر وہ بزرگ اس بات کو بھول گئے کہ خود اہل ہند بھی ایسے ہی حالات سے دوچار تھے اور ان پر بھی ایک اجنبی اور عیار حکومت مسلط تھی۔ اُن کے بھی صیاد تھے۔ ان مصنفین کی حیثیت سے

تیرے فتراک میں کوئی کبھی نخچیر بھی تھا؟

سے ہرگز زیادہ نہ تھی۔ اور جن لوگوں سے یہ امداد کے طالب تھے وہ خود تاریکی میں بھٹک رہے تھے۔ اور بقول غالب ؎

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

کی بولتی چالتی تصویر تھے۔ اگر کوئی مدد کے لئے آیا بھی تو محض اپنے سیاسی اغراض کے حصول کے لئے یا اپنے مذہبی فرقے کی تبلیغ کے لئے۔ غرض ہر محسن نے اپنے ہی رنگ میں رنگنے کی کوشش کی۔ خیر چھوڑئیے اس دلدوز کہانی کو اسے مؤرخ اپنے مقام پر بیان کرے گا۔

غرض پنڈت پریم ناتھ بزاز کی حقیقت شناس نظروں نے اس حقیقت کو فوراً ہی پا لیا اور پرانی ڈگر کو چھوڑ کر اس اہم مسئلہ کے وقتی اور جذباتی تقاضوں سے قطع نظر کر کے ٹھوس حقائق کی بنیاد پر خارجی دنیا کے انسانوں کو جھنجوڑا اور اپنے آدرشی مردِ حُر شیرِ کشمیر شیخ محمد عبداللہ کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ اہلِ کشمیر کو فرسودہ نظامِ حیات سے نکال کر ایک ایسے سیاسی و تعمیری پروگرام پر چلائیں جو اُن سب کے لئے بہتر ہو۔

یہ حقیقت ہے کہ بزاز نے بالواسطہ یا بلاواسطہ ہمیشہ ہی شیخ عبداللہ کے طریقِ کار کی حمایت کی اور اگر کہیں مخالفت کی بھی ہے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ بزاز شیخ محمد عبداللہ کی قیادت کے قائل نہیں۔ بزاز اس بات سے اچھی طرح آگاہ ہیں کہ شیخ محمد عبداللہ اہلِ جموں و کشمیر کے جسم و جان کی جملہ الجھنوں سے بخوبی آشنا ہیں اور انہیں اہلِ جموں و کشمیر سے والہانہ عشق و محبت ہے اور جو اسی روحِ خلیلی کے باعث بے دھڑک آتشِ نمرود میں کود پڑتے ہیں ــــ

بزاز کے کردار کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے سب سے پہلے کشمیریوں کے اس بے باک لیڈر کا اعتراف کیا اس کا احترام کیا اور اس کو بدنام کرنے یا نیچا دکھانے سے احتراز کیا۔ ہاں ان کی اس جبلی کمزوریوں کو ضرور ہدفِ تنقید بنا کر ٹوکا جن کے باعث شیخ محمد عبداللہ حالات کے دباؤ کے زیر اثر فیصلہ کرنے میں جلد بازی کر جاتے ہیں۔ اگر اس کمزوری کے ساتھ ہی شیخ صاحب میں "شوریدہ سری" کی خوبی نہ ہوتی وہ واقعی ایک ناکام لیڈر ہوتے۔ لیکن وہ اپنی اس شوریدہ سری کے سہارے سفینۂ حیات کو منجدھار سے نکال کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اس "جلد بازی اور شوریدہ سری" کی کشمکش میں اہلِ کشمیر کو کافی آنسو اور خون بہانا پڑا ہے۔ حالانکہ اس کی تنبیہہ بزاز پہلے ہی کر چکے تھے ــــ

سیاسی اعتقادات کی رُو سے بزاز اور عبداللہ بنیادی طور پر ایک ہی شے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پنڈت بزاز "دل کے پاس پاسبانِ عقل" کے قائل ہیں اور شیخ صاحب کا مچلتا ہوا دل ان سے تقاضا کرتا ہے کہ "کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے" اس کی وجہ یہ ہے کہ بزاز کا طائرِ تخیل پہلے ہی سب مراحل طے کر چکا ہوتا اور وہ تمام مسائل پر بنظرِ عمیق غور کر کے عوائق و موانع کا اندازہ کر لیتا۔ مگر شیخ محمد عبداللہ کو عملی طور پر ان چٹانوں سے ٹکرانا پڑتا۔ (بقیہ صـ ۲۷۷ پر)

نتیجہ برآمد نہ کیا جائے کہ شیخ عبداللہ میں دور اندیشی اور دور بینی کا فقدان ہے، مطلب صرف یہ ہے کہ شیخ محمد عبداللہ جب ایک بات کو لے کر آگے بڑھتے تو حکومت یا مخالف طاقتوں سے تصادم ہو جاتا جس سے اصل مسئلہ ثانوی حیثیت اختیار کر لیتا ـــــ انجام کار شیخ محمد عبداللہ اپنے تمام سیاسی مشیروں اور کارکنوں کے ہمراہ داخلِ زنداں ہو جاتے اور پیش آمدہ مسائل کی ترتیب و تنظیم کے لئے کوئی موزوں آدمی نہ رہتا۔ اگرچہ بزازؔ کی پیش از وقت تنبیہ شیخ محمد عبداللہ کو گراں گذرتی لیکن جب ٹھوس حقائق سامنے آتے تو شیرِ کشمیر کو وہ بات تسلیم کرنی پڑتی مگر شومئ قسمت سے حالات پلٹا کھا چکے ہوتے ـــــ

چنانچہ بزازؔ روزِ اول سے یہی کہتے رہے ہیں کہ پہلے کشمیری عوام میں سیاسی شعور اور بیدار مغزی صحیح طریقے سے پیدا کرنی چاہئے جب فضا تیار ہو جائے گی سب حالات ٹھیک ہو جائیں گے۔ مگر کشمیریوں کی بدقسمتی کہ کشمیر کے سیاسی تغیرات نے شیخ محمد عبداللہ اور پنڈت پریم ناتھ بزازؔ کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا اور یہ دونوں بزرگ کشمیر کے داخلی معاملات میں دو الگ الگ گروہوں میں تقسیم ہو گئے ـــــ اور یہ کشمیر کی آزادی کی تاریخ میں نہایت ہی قابلِ افسوس بات ہے۔ یہ ایک المیہ باب ہے ـــــ'

تاہم کوئی مانے یا نہ مانے، میرے خیال میں ان دونوں رہنماؤں کی یہ جدائی اخلاقی طور پر کشمیریوں کے لئے زیادہ نقصان دہ ثابت نہیں ہوئی۔ کیونکہ ان دونوں رہنماؤں نے اپنی تمام تر توجہ ریاستی عوام کی بہبود کی طرف مبذول رکھی ـــ باہمی رقابت کی آویزش سے پاک رہے اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لئے اپنی صلاحیت اور قوت کو ضائع نہیں کیا۔ یہ درست ہے کہ کبھی کبھی "سیاسی گرمی" میں اُبال آیا۔ مگر واقعات اس بات کے شاہد ہیں کہ بزازؔ کے متین اور ٹھنڈے دل و دماغ میں کبھی گرمی پیدا نہیں ہوئی۔ کیونکہ وہ اس بات کو برملا تسلیم کر رہے تھے کہ کشمیریوں کو سیاسی میدان میں ایک ایسا فرد مل چکا ہے جو ان کی دلی دھڑکنوں کا نقیب ہے۔ اس کے بعد کشمیر کے اس نیک دل صحافی نے اپنی ساری توجہ معاشی بدحالی سے خستہ و نیم جان انسانوں کی تنظیم کی طرف مبذول کی۔ اور ان کی تربیت خالص معاشی نقطۂ نظر سے کی۔ بزازؔ کی اس میدان میں سب سے بڑی بات یہ ظاہر ہوئی کہ اس نے کارل مارکس کی تقلید میں صرف معاشی ناہمواریوں کو اصل قرار نہ دیا۔ بلکہ زندگی کے تمام پہلوؤں پر گہری نظر ڈال کر اسے مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا اور کشمیریوں کی معاشی بدحالی کی ایسی مکمل تصویر کھینچی جس سے نہ صرف اہلِ کشمیر اور ہندوستان کی سیاسی پارٹیاں متاثر ہوئیں۔ بلکہ کمیونسٹوں کو بھی یہ خوش فہمی ہو گئی کہ کشمیر کی فضا ان کی سرگرمیوں کو وسیع تر بنانے میں کامیاب ہو سکتی ہے اور انہوں نے مختلف طریقوں سے کشمیر کی سیاست پر اثر انداز ہونا چاہا۔ مگر کشمیری ذہنوں نے ان تصورات کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ بزازؔ کے مستقبل کے کشمیر کی تصویر میں اور کارل مارکس کے فلسفہ کے تراشے ہوئے بُت کے پجاریوں کے موجودہ طرزِ عمل میں وہی فرق ہے، جو وادئ کشمیر اور سائبیریا کے میدانوں میں ہے۔

بزازؔ کی جاری کردہ تحریک اور پیش کردہ نظام معاشیات کا یہاں تک اثر ہوا کہ جب شیخ محمد عبداللہ نے جموں و کشمیر کی عنانِ حکومت سنبھالی تو انہوں نے سب سے پہلے ریاست میں جاگیرداری نظام کا خاتمہ کر کے تمام زمینیں کسانوں اور مزارعین میں تقسیم کر دیں۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ بزازؔ کے تعمیری پروگرام سے شیخ محمد عبداللہ لاشعوری طور پر بے حد متاثر تھے اور وہ اسے اہلِ جموں و کشمیر کے لئے صحیح معنوں میں مفید جانتے تھے۔

اپنی ایک اور کتاب "آزاد کشمیر" میں بزازؔ نے ایک مکمل مثالی نظام کی تفسیر لکھی ہے۔ جس میں انہوں نے بتایا ہے کہ آزادی حاصل کرنے کے بعد ریاست کی سیاست، کلچر، معاشرت، اقتصادیات تعلیم، قانون اور کاروباری زندگی کی کیا شکل ہوگی اور ریاست کی تعمیر و ترقی کے لئے کس طرح کام کیا جائے گا۔ اس کتاب میں انہوں نے کشمیری اذہان کے مطابق تمام حالات کا جائزہ لیا ہے اور جو شکوک و شبہات پیدا ہو سکتے ہیں۔ ان کا اتنا مدلل اور صحیح جواب دیا ہے۔ جس کو پڑھنے کے بعد آدمی کسی قسم کی تشنگی محسوس نہیں کرتا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ انہوں نے کشمیریوں کے کمزور پہلوؤں کو بھی فراموش نہیں کیا اور دنیا پر یہ بات واضح کر دی کہ کشمیریوں کی بہتری اور بہبود کا راز اسی چیز میں مضمر ہے کہ وہ اپنے ناطے اس ملک سے

(بقیہ ۲۷۲ پر)

سردار محمد ابراہیم خاں

علامہ اقبال نے جن نوجوانوں کو افرنگی صوفے رکھنے کا طعنہ دیا تھا۔ سردار محمد ابراہیم بھی کبھی ان میں شامل تھے۔ لیکن جب انوق جہالت آثار کو رسمِ شبیری ادا کرنے نکلے تو قوم نے امامت کی پیش کش کی۔ مگر انہوں نے پیش امام بننے کے بجائے محبِ وطن کہلوانا زیادہ مناسب سمجھا۔

موزوں قد و قامت کے مالک ہنس مکھ۔ سردار محمد ابراہیم خاں آج سے چوالیس سال پہلے پونچھ کے ایک نواحی گاؤں راولاکوٹ میں پیدا ہوئے تھے —— ڈوگرہ راج کے باوجود اس وقت پونچھ میں امن چین کا دور دورہ تھا —— تعصب اور مسلم آزاری کے لحاظ سے پونچھ جموں اور کشمیر سے ہزار درجے بہتر تھا۔ سردار محمد ابراہیم کی ابتدائی تعلیم پونچھ ہائی سکول میں ہوئی —— ایک درویش صفت استاد صوفی نذیر احمد انہیں پڑھاتے تھے —— دنیاوی الجھ اور مادی طمع سے بے نیاز —— ایک خاموش طبع صوفی جو مئے ذات میں مست رہتے۔ استاد کی صحبت کا اثر تھا کہ دنیاوی جاہ کی سنہری بیڑیاں سردار محمد ابراہیم کے پاؤں نہ جکڑ سکیں اور وہ بلند عزائم کے ساتھ منزل کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ سردار صاحب کے گھر کا ماحول مذہبی تھا —— ایک ایسا گھر جہاں تلاوت کی خوش آمند آوازیں گونجتی تھیں اور معرفت کے چشمے بہتے تھے —— انہوں نے قرآن مجید اپنے بڑے بھائی امیر عالم خاں سے پڑھا۔ یوں تو والدین سے کسے محبت نہیں ہوتی لیکن دنیا کے اکثر بڑے لوگوں کی طرح سردار محمد ابراہیم کو بھی اپنی ماں سے بے پناہ محبت رہی ہے۔ یہ محبت آج بھی سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے ان کے سینے میں ہر وقت تازہ رہتی ہے۔

پونچھ سے میٹرک کرنے کے بعد سردار محمد ابراہیم نے اسلامیہ کالج میں داخلہ لیا۔ اسلامیہ کالج سے بی۔ اے کرنے کے بعد سردار محمد ابراہیم اعلیٰ تعلیم کے لئے لندن گئے اور وہاں سے ۱۹۴۱ء میں قانون کی ڈگری لے کر واپس آئے اور ۱۹۴۳ء میں ہائی کورٹ سری نگر میں پریکٹس شروع کی۔ اسی سال گورنمنٹ ایڈووکیٹ مقرر ہوئے ۱۹۴۴ء میں انہیں نائب ایڈووکیٹ جنرل مقرر کیا گیا۔ اگرچہ پونچھ کا ماحول کشمیر کے دوسرے حصوں سے زیادہ پرامن تھا لیکن ہندو افسر قدم قدم پر تعصب برتتے تھے —— ہندو افسروں کی بے انصافیاں مسلمان ملازمین کے سینے کا ناسور بن چکی تھیں —— ہر مسلمان کو ہندوؤں کی طرح ہاتھ باندھ کر سلام کرنا پڑتا تھا —— مسلمان ملازمین کی خودداری بتدریج رخصت ہو رہی تھی —— لیکن راجا کا حکم تھا کہ اس زمین پر جو بھی چلے گردن جھکا کر چلے۔ ان بے انصافیوں پر سردار محمد ابراہیم کا دل کڑھتا تھا لیکن حب الوطنی کا تقاضا یہی تھا کہ وہ تعلیم کو جلد از جلد مکمل کر کے اہلِ وطن کی خدمت کا بیڑا اٹھائیں۔ اس دوران میں انہوں نے کبھی عملی سیاست میں حصہ نہ لیا —— لیکن بے انصافیاں رنگ لا کر رہیں اور جنوری ۱۹۴۶ء میں انہیں ملازمت سے مستعفی ہونا پڑا۔ ۱۹۴۶ء ہی میں ان کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوا۔ جنوری ۱۹۴۷ء میں وہ ریاستی اسمبلی میں پونچھ کے نمائندے منتخب ہوئے اور اسمبلی میں مسلم کانفرنس کے چیف وہپ کی حیثیت سے کام کیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد کشمیر میں جن حالات کا دور دورہ رہا اس میں سردار صاحب نے اہلِ کشمیر کی قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ تحریکِ آزادی میں آپ کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ آپ آزاد کشمیر کے صدر رہے ہیں اور اقوامِ متحدہ میں کشمیر کی ترجمانی کر چکے ہیں لیکن اب وہ اس سے بدظن ہو چکے ہیں

میں نے اقوامِ متحدہ پر ان کے ایمان کی گہرائی معلوم کرنی چاہی میری نیت بھانپ کر وہ ہوا میں انگلی ہلانے لگے۔

" اقوامِ متحدہ سے جھوٹی آس لگانا فضول ہے اقوامِ متحدہ بھی لیگ آف نیشنز بن کر رہ گیا ہے۔ مسئلہ کشمیر کا اولین حل یہی ہے کہ پاکستان پہلے خود متحد اور مضبوط ہو!"

سردار صاحب کی زندگی کے شب و روز کا اندازہ کرنے

کے لئے یہ چند سطریں کافی ہوں گی ——

("ڈوگرہ فوج سری نگر کو گھیرے پڑی تھی۔ رات کی تاریکی بڑھی تو ڈوگرہ فوج نے شہر پر ہلہ بول دیا۔ رات کی چپ چاپ فضا کا سکوت انسانی چیخ پکار سے ٹوٹ گیا۔ ڈوگرہ سپاہی ہاتھوں میں رائفلیں اور ننگی تلواریں لئے بھوکے بھیڑیوں کی طرح مسلمانوں کی تلاش میں سرگرداں تھے، مہاراجہ کے زرخرید سپاہی مسلمانوں کو بھیڑ بکری کی طرح کاٹ رہے تھے۔ سری نگر کے گلی کوچوں میں کہرام مچا تھا۔

سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے مجھے اس شہر میں پابند کیا جا چکا تھا —— جس رات سری نگر میں قتل و غارت کے ہنگامے گرم تھے میں میری بیوی اور معصوم بچہ یہاں موجود تھے۔ مہاراجہ کا خاص طور پر حکم تھا کہ ابراہیم بچ کر جانے نہ پائے۔ تاریکی میں ڈوبے ہوئے سری نگر میں ہر طرف موت، آگ اور تباہی کے پھریرے لہرا رہے تھے میرے لئے چارہ کار نہ تھا کہ میں جان ہتھیلی پر رکھ کر نکلوں اور پاکستانی بھائیوں کو مسلمانان سری نگر کی ہلاکت اور مصیبت کی اطلاع دوں

" میں نے اپنے بیوی بچے خدا کے سپرد کئے رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر باہر نکلا۔ قتل اور آگ کا بازار گرم تھا۔ قدم قدم پر مسلمان کشمیریوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ چپے چپے پر فساد کی چنگاریاں سلگ رہی تھیں۔ مجھے آگ اور خون سے گزر کر پاکستان پہنچنا تھا۔

" میں دریائے جہلم کے کنارے پہنچا تو یہاں بھی ڈوگرہ پولیس کا پہرہ تھا۔ چاق چوبند ڈوگرہ سپاہی کڑی نگاہ رکھ رہے تھے کہ کوئی کشمیری جان بچا کر دریا عبور نہ کرنے پائے۔ دریائے جہلم پایاب تھا۔ اگرچہ برسات کا موسم گزر چکا تھا۔ لیکن دریا کی طغیانی تھی کہ ختم ہونے میں نہ آتی تھی۔ کسی ملاح کو پکارنا اپنی موت کو دعوت دینا تھا ذرا سا شبہ پڑ جانے پر ڈوگرہ سپاہیوں کی گولیاں کی گولیاں میرے سینے سے پار اتر سکتی تھیں۔ میں سری نگر کی مصیبت سے بھاگا تو دوسری مصیبت میری منتظر کھڑی تھی۔ میرے عقب میں بھوکا اور مظلوم سری نگر جل رہا تھا۔ میرے آگے ڈوگرہ سپاہی راستہ روکے کھڑے تھے۔ میں نے اللہ کا نام لے کر ہوا سے بھرا ہوا مشکیزہ پانی میں ڈالا۔ دریا اگرچہ طغیانی پر تھا لیکن یہ طوفان اہل وطن کے اٹھائے ہوئے طوفان سے یقیناً کم تھا۔ میں موجوں سے لڑتا قدم قدم پر طوفان سے کھیلتا ایبٹ آباد پہنچا تو پاکستان خود دارالمحن بن چکا تھا۔ مشرقی پنجاب سے تباہ حال مہاجروں کے قافلے آ رہے تھے۔ مجھے علم ہوا کہ قائداعظمؒ پناہ گیروں کی آبادکاری کا جائزہ لینے لاہور آئے ہوئے ہیں۔ چنانچہ میں اسی خستہ سامانی کی حالت میں لاہور پہنچا۔ لیکن لاہور میں آہوں اور آنسوؤں کا سیلاب آیا ہوا تھا۔ قائداعظم قوم کے دکھ میں اس قدر ٹوٹ چکے تھے کہ ملاقات نہ ہو سکی —— میں مایوس ہو کر مری چلا آیا۔

" پونچھ میں زیادہ تر فوجی لوگ آباد تھے۔ میں نے سوچا اگر اہل پونچھ کو منظم کر دیا جائے تو آزادئ کشمیر کی صورت نکل سکتی ہے۔ اس کا ایک ہی حل تھا کہ انہیں اسلحہ دیا جائے اور ان کی قیادت کی جائے —— اور میں وہ سب کچھ کر گزرنے پر آمادہ تھا۔ جس کی توقع ایک محب وطن سے ہو سکتی ہے۔ اس لگن میں میں نے مشکیزے پر تین دفعہ دریائے جہلم کو عبور کیا۔ گولی کسی وقت بھی مجھے ٹھنڈا کر سکتی تھی۔ لیکن وطن کی محبت پرستی گولیوں میں لئے لئے پھرتی تھی۔ ایک جذبہ تھا کہ خطرات کے باوجود اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھا —— لیکن میرا سری نگر پہنچ سکنا مشکل تھا۔ وطن کے ساتھ ساتھ جب مجھے اپنی بیوی اور بچے کی یاد آتی تو طبیعت سخت پریشان ہو جاتی —— آخر خدا خدا کر کے پونچھ سے آزادی کی لہر اٹھی۔ میری طرح میری بیوی نے بھی ایک رات جان ہتھیلی پر رکھی بچے کو سینے سے لگایا اور اللہ کے بھروسے پر پاکستان روانہ ہو گئی —— وہ گرتی پڑتی کبھی روتی کبھی دل کو تسلی دیتی ساٹھ میل پیدل چل کر پاکستان پہنچ گئی۔")

شخصیت

کے ایچ خورشید صدر حکومت آزاد جموں و کشمیر

کم گو سنجیدہ مزاج ۴۴ سالہ مسٹر کے ایچ خورشید جو ایک متوسط طبقہ کے کشمیری خاندان سے تعلق رکھتے ہیں سرینگر میں پیدا ہوئے طالب علمی کا تمام زمانہ آپ نے سرینگر میں گزارا اور ایس پی کالج سے بی اے تک تعلیم حاصل کی حصول تعلیم کے دوران آپ نے سیاسیات میں گہری دلچسپی لینی شروع کی اور بہت جلد کشمیری رہنماؤں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا کشمیر مسلم سٹوڈنٹس یونین کی بنیاد رکھی اور جنرل سیکریٹری کی حیثیت سے آپ نے ریاست میں تحریک پاکستان کو مقبول بنانے میں اہم حصہ لیا۔ آپ لاہور دہلی جالندھر اور دوسرے کئی مقامات پر آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے سالانہ جلسوں اور ورکنگ کمیٹی کی میٹنگوں میں شامل ہوتے رہے اس دوران تحریک پاکستان سے والہانہ عقیدت اور سیاسی سوجھ بوجھ کی وجہ سے آپ نے مسلم کانفرنس میں بھی اپنا مقام حاصل کر لیا اور دو سال تک مسلم کانفرنس کی مجلس عاملہ کے رکن رہے

۱۹۴۴ء میں جب قائداعظم سرینگر تشریف لائے تو انہوں نے اس بیس سالہ نوجوان کی صلاحیتوں کو بھانپ لیا اور دورہ کشمیر سے واپسی پر مسٹر خورشید کو اپنا پرائیویٹ سیکرٹری بنا کر ساتھ لے گئے قائداعظم کے پرائیویٹ سیکرٹری کی حیثیت سے مسٹر خورشید نے تحریک پاکستان کا اہم ترین دور دیکھا لاڈ پیتھک لارنس کی قیادت میں ۱۹۴۵ء میں کیبنٹ مشن کی آمد دسمبر ۱۹۴۶ء میں قائداعظم اور کانگریسی لیڈروں کا دورہ لندن جس میں مسٹر خورشید مسلم لیگی وفد کے سیکرٹری کی حیثیت سے لندن گئے تھے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی طرف سے انتقال اقتدار کے مذاکرات ان سب میں مسٹر خورشید قائداعظم کے معتمد خصوصی کی حیثیت سے اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے روزانہ کام کرتے رہے اور انہیں قائداعظم کے مکمل اعتماد کا فخر حاصل رہا

۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان کے بعد جب قائداعظم نے گورنر جنرل کا عہدہ سنبھالا تو مسٹر خورشید کو پرسنل سیکرٹری ٹو دی گورنر جنرل بنا دیا گیا یکم اکتوبر ۱۹۴۷ء کو آپ اپنے دیگر افراد کنبہ سے ملنے رخصت پر جب سرینگر پہنچے تو وہاں انہیں گرفتار کر لیا گیا چھ ماہ تک آپ کو سرینگر کے ایک تھانے میں قید تنہائی میں رکھا گیا پھر سرینگر سے آپ کو ۸۰ میل دور رام نگر کے قلعے میں نظر بند کر دیا گیا جہاں آپ کو چھ ماہ تک رکھا گیا رام نگر سے آپ کو پھر سرینگر لے جایا گیا اور مشروط رہائی کی پیش کش کی گئی مقبوضہ کشمیر کی حکومت نے آپ کو معافی نامہ پیش کرنے کو کہا اور آپ کے انکار پر دو بار دہلی بھیجا گیا ڈیڑھ ماہ بعد آپ قیدیوں کے تبادلے کے سلسلے میں پاکستان چلے آئے اور لاہور میں آپ نے صحافت شروع کر دی ۱۹۵۱ء آپ حکومت امریکہ کی دعوت پر امریکہ گئے اور وہاں سے بیرسٹری کرنے لندن چلے گئے ۱۹۵۴ء کے آخر میں بیرسٹری کی ڈگری لے کر پاکستان آئے اور کراچی میں پریکٹس شروع کر دی

جولائی ۱۹۵۵ء میں تحریک آزادی کشمیر شروع کی گئی تو آپ اس میں حصہ لینے راولپنڈی پہنچ گئے اور چند روز بعد چوہدری غلام عباس کے ساتھ حد متارکہ جنگ توڑنے کی غرض سے چناری جاتے ہوئے کوہالہ پل پر گرفتار کر لئے گئے ۵ اکتوبر کو آپ گھوڑا گلی سے چوہدری غلام عباس کے ساتھ رہا ہوئے

مسٹر خورشید بہترین صحافی اور مقرر ہیں، مسٹر خورشید صاحب بلا کے خوش خلق اور ٹھنڈے دل و دماغ کے مالک نوجوان ہیں سیاسی بحث و مباحثہ میں اپنا نقطہ نظر پیش کرتے اور دوسروں کو قائل کرنے کی خاص صلاحیت رکھتے ہیں اور یہی صلاحیت آپ کو موجودہ مقام تک پہنچانے کی باعث بنی ہے۔

آزاد کشمیر منزل بہ منزل

پوری ایک صدی ہی نہیں بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ عرصہ گزرا کہ جنت ارضی کا وہ حسین و جمیل ٹکڑا جسے دنیا کشمیر کے نام سے پکارتی ہے ڈوگرہ سامراج کے پنجۂ استبداد میں گرفتار ہو گیا تھا۔ ان ظلم پیشہ حکمرانوں کی سیاہ کاریاں اور ستم رانیاں اب محتاجِ بیان نہیں رہیں کیونکہ ان کا شرمناک کردار ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔

تاریخ کشمیر کے اس طویل خونیں دور میں کشمیر کے زخم سے برابر خون رِستا رہا اور بجائے مندمل ہونے کے اس نے ایک کرب انگیز ناسور کی شکل اختیار کر لی۔ خون بہتا رہا اور ستم رسیدہ کشمیری اس کی اذیت سے بیقرار ہو کر نالہ و فریاد کرتا رہا وہ نالہ و فریاد جو اس کی روح کی گہرائیوں سے بلند ہوتا تھا۔

ڈوگرہ دور کی نحوست کا تاریک ترین پہلو وہ اقتصادی بحران تھا جس نے ریاست کے پہاڑی علاقوں کو سب سے زیادہ متاثر کیا تھا۔ کیونکہ ڈوگرہ بربریت کے خون آشام دیو اپنے دندان آزاد علاقوں کے غریب باشندوں کی رگِ حیات میں زیادہ بے رحمی سے گاڑ رکھے تھے۔ ان بدقسمت علاقوں میں وہ خطۂ زمین بھی شامل تھا جو آج آزاد کشمیر کے نام سے موسوم ہے۔ یہ علاقہ پانچ ہزار مربع میل پر مشتمل ہے اور اس کی آبادی دس لاکھ کے قریب ہے۔

سنہ ۱۹۴۷ء میں جب فرزندانِ کشمیر نے مادرِ وطن کی آزادی کے لئے ڈوگرہ بربریت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا تو دشمن کے بمبار طیاروں اور آتش بار ٹینکوں نے آزاد کشمیر کے علاقے کو بھون ڈالا یہاں کا سب نظم و نسق درہم برہم ہو گیا۔ شہر، قصبے اور دیہات سب نذرِ آتش کر دیئے گئے۔ اجمالی حالات اگر یہ کہا جائے تو ہرگز مبالغہ نہ ہو گا کہ یکم جنوری سنہ ۱۹۴۹ء کو جب جنگ بند ہوئی تو ہمارے حصے میں ایک ایسا علاقہ آیا جو جنگ کی ہولناکیوں سے تباہ و برباد ہو چکا تھا اور جس میں چاروں طرف بھوک افلاس اور اقتصادی بدحالی کے بھوت ناچتے پھرتے تھے۔

اس مہیب اور گھناؤنے پس منظر میں حکومت آزاد کشمیر نے خدا کا نام لے کر نظم و نسق کو از سرِ نو نئے رنگ میں ابھارنا شروع کیا۔ جب تعمیرِ نو کی بنیاد رکھی گئی تو حکومت کے پاس ذرائع بالکل مفقود تھے۔ لیکن عوام کے جذبے کی داد دینی پڑتی ہے جنہوں نے دلی تعاون سے کام لیا اور حکومت نے اپنے عوام کی امداد سے تعمیر و ترقی کی دشوار گزار منزل کو طے کرنا شروع کر دیا۔ پہلے صبر و استقلال اور باہمی عزم کے ساتھ حکومت آزاد کشمیر اپنے عوام کو ساتھ لے کر ترقی کے اس راستے پر گامزن رہی اور آج گیارہ سال کے بعد آزاد کشمیر کے باشندے بڑے فخر سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ؎

آغشتہ ایم ہر سرِ خارے بخونِ دل

آزاد کشمیر کی گیارہ سالہ ترقی کا سرسری جائزہ ہمارے بیان کی تصدیق کرے گا۔

تعلیم

کسی ملک کی ترقی کے لئے تعلیم کو اولین اہمیت حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حکومت آزاد کشمیر اپنے سالانہ بجٹ کا پانچواں حصہ تعلیم پر خرچ کر رہی ہے۔ ان سالانہ اخراجات کے علاوہ آزاد کشمیر اور پاکستان میں تعلیم حاصل کرنے والے طلباء کو وظائف اور دیگر سہولتیں فراہم کرنے پر زرِ کثیر صرف کیا جاتا ہے۔ آزاد کشمیر میں اس وقت تین کالج، ایک اساتذہ کی تربیت گاہ، طلباء کے لئے ۱۱ ہائی سکول، طالبات کے لئے دو ہائی سکول، ۳۶ مڈل سکول، ۳۶ لوئر مڈل سکول، تقریباً ۵۰۰ پرائمری سکول اور متعدد مکتب قائم ہو چکے ہیں۔ ان اداروں میں اس وقت ۷۰،۰۰۰ طلباء تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ان میں سے اکثر ادارے پنجاب یونیورسٹی سے ملحق ہیں۔ آزاد کشمیر میں خواتین کی تعلیم کی طرف خاص توجہ دی جا رہی ہے۔ فنی، طبی اور غیر طبی تعلیم کی طرف بھی مناسب توجہ دی جا رہی ہے۔ تمام سکولوں کے معیار میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے ایک بورڈ قائم کیا گیا ہے جو بورڈ آف مڈل سٹینڈرڈ امتحانات کہلاتا ہے۔ ہر سال قابل طلباء ڈاکٹری، ویٹرنری، انجینئرنگ، زراعت اور بی ای ڈی وغیرہ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے منتخب کئے جاتے ہیں۔ تعلیم کو عام کرنے کے لئے ضلعی کمیٹیاں قائم کر دی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ اب تک یہاں دو تعلیمی کانفرنسیں اعلیٰ پیمانے پر منعقد کی جا چکی ہیں۔

فنی تعلیم کی سہولتیں فراہم کرنے کی غرض سے یہاں عنقریب ایک فنی تربیت کا سکول بھی کھولا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ یہاں کالجوں کی نئی عمارتوں پر گیارہ لاکھ روپیہ صرف کیا جانے والا ہے۔ اور ان کی تعمیر کے لئے عملی اقدامات کئے جا چکے ہیں۔

مظفرآباد کے کالج کی عمارت تقریباً مکمل ہو چکی ہے اور راولاکوٹ میں لڑکیوں کے کالج کی عمارت زیر تعمیر ہے۔ کتب خانوں کے لئے مزید کتابیں خریدنے اور سائنسی آلات کی خرید کے لئے ایک لاکھ روپے کی رقم منظور کر لی گئی ہے۔ ان سب اقدامات سے ظاہر ہوتا ہے کہ آزاد کشمیر تعلیمی میدان میں تسلی بخش ترقی کر رہا ہے۔

زراعت

آزاد کشمیر بنیادی طور پر ایک زرعی علاقہ ہے اور اس کی بڑی آبادی کا انحصار زراعت پر ہے لیکن یہ انتہائی بدقسمتی ہے کہ یہ علاقہ ہمیشہ غذائی قلت کا شکار رہا ہے۔ ڈوگرہ عہد حکومت میں اس علاقے کی غذائی ضروریات پوری کرنے کے لئے پنجاب سے غلہ درآمد کیا جاتا تھا جو اب مغربی پاکستان میں شامل ہے۔ یہ صورت حال تاحال تبدیل نہیں ہوئی اور اب بھی اس علاقہ میں غلہ کی درآمد پر تقریباً ۱۶ لاکھ روپے صرف ہوتے ہیں اور یہ غلہ رعائتی نرخوں پر فروخت ہوتا ہے۔ قدرتی آفات کی صورت میں ضروریات زندگی اور بھی بڑھ جاتی ہیں ۱۹۴۷ء سے حکومت پاکستان یہاں کے باشندوں کو ضروری اغذیہ فراہم کرتی ہے اس کے علاوہ اس علاقہ میں آباد ۴۰ ہزار مہاجرین جموں و کشمیر کو مفت راشن مہیا کیا جاتا ہے اس کام کو انجام دینے کے لئے ایک محکمہ قائم کیا گیا ہے جس کو سول سپلائی کا محکمہ کہتے ہیں۔ اس کے ڈپوؤں کا جال اس علاقے کے طول و عرض میں بچھا ہوا ہے ان میں غلہ پہنچانے کا کام لاریوں خچروں اور گھوڑوں وغیرہ کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔ ضرورت پڑنے پر ہوائی جہازوں سے بھی کام لیا جاتا ہے۔ قدرتی آفات کی صورت میں متاثرہ آبادی کو بسرعت غلہ فراہم کرنے کے لئے خصوصی انتظامات کئے جاتے ہیں

ان تمام انتظامات کے باوجود مسئلہ یہ ہے کہ اس علاقے کو غذائی اعتبار سے کیسے خودکفیل بنایا جائے یہی وجہ ہے کہ ترقیاتی منصوبوں کی ترتیب کے وقت اس پہلو کی طرف خصوصی توجہ دی جاتی ہے آزاد کشمیر کے ترقیاتی سرکل نے آب پاشی کا ایک تین سالہ منصوبہ تیار کیا ہے جس کے تحت ۲۸ سکیمیں بنائی گئی ہیں۔ ان سب سکیموں کا تعلق نہریں، نالے، تالاب، بند اور ٹیوب ویل وغیرہ تعمیر کرنے سے ہے۔ ان سکیموں کی تعمیر پر ایک کروڑ چھ لاکھ روپے صرف آئیں گے۔ کوٹلی کی آب پاشی کی سکیم بھی انہی سکیموں میں سے ایک تھی جس کی تعمیر پر ۴۶۳۰۰۰ روپے صرف ہوئے۔ اس سکیم کی تکمیل سے کوٹلی تحصیل اپنی غذائی ضروریات کے اعتبار سے خودکفیل ہو جائے گی۔

اس سے مزید ۳ ہزار ایکڑ زمین زیر کاشت آ جائے گی اور یہاں کی غذائی پیداوار میں ۳۰ ہزار من غلہ کا سالانہ اضافہ ہو جائے گا مناسب وقت آنے پر برار کوٹ کی آبپاشی کی سکیم بھمبر کی آبپاشی کی سکیم۔ چاہتر دومیل کی بذریعہ لفٹ آب پاشی کی سکیم دریائے جہلم کے بائیں کنارے کی آب پاشی کی سکیم اور چیلا بانڈے کی آب پاشی کی سکیم پر کام شروع کر دیا جائے گا مذکورہ سکیموں کی تکمیل کے لئے اس سال دو لاکھ پچاس ہزار روپے کی رقم مخصوص کر دی گئی ہے۔ مستقبل قریب میں آزاد کشمیر ترقیاتی سرکل بھمبر بند نالہ اور ڈلی نالہ پر بندوں کی تعمیر کی تجاویز پر تحقیقات شروع کر دے گا۔

یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ آزاد کشمیر کی اقتصادی حالت کو بہتر بنانے کے لئے حکومت پاکستان نے ۱۹۵۵ء میں ایک کروڑ روپے کی امداد دینے کا اعلان کیا تھا۔ اس رقم سے تیرہ لاکھ ستانوے ہزار روپے کی رقم زرعی ترقی کے کاموں کے لئے مخصوص کر دی گئی تھی۔ بعض منظور شدہ سکیموں پر اب تک ۲۵ لاکھ روپے صرف بھی ہو چکے ہیں۔ ان میں سے بعض سکیمیں مکمل ہو چکی ہیں اور بعض پر ابھی کام جاری ہے۔ کوٹلی کی آب پاشی کی سکیم کی تکمیل اور کھٹائی کے مقام پر آب پاشی کے لئے تالاب کی تعمیر کے لئے ۵ لاکھ روپے کی رقم مخصوص کر دی گئی ہے۔

اس علاقے کی زرعی صلاحیت بڑھانے کے لئے پھلوں کی تین بڑی نرسریوں کی توسیع کر دی گئی ہے اور تین نئی نرسریاں قائم کر دی گئی ہیں۔ ان نرسریوں میں مختلف اقسام کے پودے لگانے کے تجربے بھی کئے گئے ہیں جو کامیاب رہے ہیں۔ ان تجربوں میں سب سے اہم تجربہ زعفران کی جڑوں پر کیا گیا جو اٹلی سے درآمد کئے گئے۔ مذکورہ نرسریوں سے علاوہ یہاں دو زرعی فارم قائم کئے جا چکے ہیں اور ایک اور فارم عنقریب قائم ہونے والا ہے۔ اس کام کے لئے ایک لاکھ سے زائد رقم منظور کی گئی ہے پودوں کے تحفظ کی ابتدائی سکیم جس کے لئے ۱۰۰۰۰ روپیہ منظور

کئے گئے تھے۔ مکمل ہو چکی ہے۔ پودوں کی بیماریوں کی روک تھام کے سلسلے میں اس سکیم کے نتائج بہت حوصلہ افزا ہیں۔ اس علاقے کے کاشت کاروں میں ۹۰۰ من کھاد رعایتی نرخوں پر تقسیم کی جا چکی ہے اور ۵۰۰ ٹن مزید کھاد تقسیم کی جانے والی ہے۔ اس کے علاوہ ۶۰۰ من کھاد کی تقسیم کے انتظامات کئے جا رہے ہیں۔ محکمہ زراعت کے لئے ایک ویگن خریدنے کی تجویز منظور ہو چکی ہے۔ اس علاقہ میں اچھی قسم کی گندم پیدا کرنے کے لئے قیمت خرید کے بھاؤ پر گندم کی اچھی قسم کے ۵ ہزار من بیج کاشت کاروں کو مہیا کئے گئے ہیں اور مختلف پودوں کی چالیس ہزار قلمیں تقسیم کی گئی ہیں۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ حکومت آزاد کشمیر نے زرعی ترقی کو اپنا اولین نصب العین قرار دیدیا ہے اور اس مقصد کے حصول کے لئے ایک پانچ سالہ منصوبہ زیر تکمیل ہے جس کے تحت اس علاقے کی ۸۰ ہزار ایکڑ بنجر زمین زیر کاشت لائی جائے گی اس تجویز پر اندازاً ایک کروڑ ساٹھ لاکھ روپے صرف ہونگے حکومت اس سلسلے میں زرعی محکمہ اعداد و شمار قائم کرنے پر غور کر رہی ہے۔ علاوہ ازیں حکومت آزاد کشمیر نے اس علاقے کے کاشت کاروں کو تقاوی قرضے دینے کے لئے معقول رقوم مخصوص کر دی ہیں۔

المختصر آزاد کشمیر زرعی ترقی کے ایک نئے روشن اور پُرامید دور سے گزر رہا ہے۔

افزائش نسل

آزاد کشمیر میں زرعی ترقی اور افزائش حیوانات ایک دوسرے سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ چنانچہ اس علاقہ میں حیوانات کے دو بڑے شفا خانے اور گیارہ ڈسپنسریاں قائم کی گئی ہیں۔ سب شفاخانے جدید آلات سے لیس ہیں اور کارکردگی کے لئے تربیت یافتہ عملہ۔ علاوہ ازیں مختلف علاقوں میں تین ڈبل ڈسپنسریاں بھی قائم ہیں۔ اب عنقریب ہی حیوانات کے لئے ایک گشتی شفاخانہ بھی کھولا جائے گا۔ اس مقصد کے لئے پچاس ہزار سے زائد کی رقم منظور کی جا چکی ہے۔

اس علاقہ میں مویشیوں کی حالت کو بہتر بنانے کی غرض سے افزائش حیوانات کے ۱۲ مراکز قائم ہیں اور ان کی تعداد میں اضافہ کرنے کی سکیمیں زیر تکمیل ہیں۔ یہ علاقہ پولٹری فارم کے قیام کے لئے نہایت ہی مناسب ہے چنانچہ مظفر آباد میں ایک پولٹری فارم قائم کر دیا گیا ہے۔ اب اس فارم کو توسیع دی جا رہی ہے اور اس میں بچے نکالنے کی غرض سے دو ہزار مرغیاں رکھی جائیں گی۔ اس کے علاوہ پونچھ اور میرپور کے اضلاع میں بھی ایک ایک پولٹری فارم کے قیام کی تجاویز زیر غور ہیں۔ اچھی قسم کی بھیڑیں پالنے کا انتظام بھی کیا جا رہا ہے تاکہ ان سے اچھی قسم کی اُون حاصل ہو سکے اور یہ علاقہ اون کی پیداوار کا مرکز بن جائے۔ اس مقصد کے لئے ساڑھے چھ لاکھ روپے کی لاگت سے بھیڑوں کی پرورش کا ایک فارم قائم کیا جا رہا ہے۔ مزید برآں خود محکمے کی توسیع کے لئے ۸ لاکھ روپے کی رقم مخصوص کر دی گئی ہے۔ ان سب اقدامات کے علاوہ ایک پنج سالہ منصوبہ بھی زیر غور ہے جس میں حیوانات کی پرورش اور افزائش کے ہر شعبے کو مدنظر رکھا گیا ہے

صحت

حصول آزادی سے قبل طبی سہولتوں کے لحاظ سے آزاد کشمیر کا علاقہ نہایت پسماندہ تھا لیکن گذشتہ گیارہ برس کے عرصے میں اس شعبہ میں نمایاں ترقی ہوئی ہے۔ اب تک اس علاقہ میں ۴۴ ہسپتال اور ڈسپنسریاں قائم کی جا چکی ہیں۔ جو جدید طبی آلات سے لیس ہیں اور جن میں تربیت یافتہ ڈاکٹر اور نرسیں مامور ہیں۔ ان کے علاوہ یہاں ۱۳ یونانی شفاخانے اور ۱۷ ابتدائی طبی امداد کے مراکز قائم ہیں دور افتادہ علاقوں کو طبی سہولتیں بہم پہنچانے کے لئے تین گشتی شفاخانے قائم کئے گئے ہیں۔ دھیرکوٹ، راولاکوٹ اور کوٹلی میں زچہ بچہ کی بہبود کے مراکز قائم کرنے کے لئے ڈیڑھ لاکھ روپے کی رقم منظور کر دی گئی ہے۔ امید ہے کہ اس پر عنقریب کام شروع ہو گا۔ علاوہ ازیں ہر ضلع میں خاندانی منصوبہ بندی کے مراکز قائم کرنے کے لئے ۳ لاکھ روپے کی رقم مخصوص کر دی گئی ہے۔ ان سکیموں کے علاوہ مظفر آباد میں جذامیوں کا ایک ہسپتال قائم کرنے کی تجویز بھی موجود ہے۔ اور ان کے علاوہ متعدد ترقیاتی تجاویز بھی منظور کی جا چکی ہیں جن کے لئے چار لاکھ تیس ہزار روپے کی رقم صرف کی جائے گی۔ ان تجاویز پر عنقریب عمل شروع ہو جائے گا۔ آزاد کشمیر کے مختلف علاقوں میں ۱۲ ڈسپنسریاں قائم کرنے کی تجویز بھی زیر غور ہے۔ دوسرے پنج سالہ ترقیاتی پروگرام کے تحت دیگر منظور شدہ سکیموں پر ۳۰ لاکھ روپے صرف کئے جائیں گے۔ ان تجاویز میں ایک دماغی امراض کا ہسپتال۔ ایک ٹی بی سینی ٹوریم بنانے اور ڈسپنسریوں کے لئے مزید عمارت تعمیر کرانے کی تجاویز بھی شامل ہیں۔

علاوہ ازیں کھیلوں وغیرہ کے لئے ایک ہال ایک سپٹ تالاب اور ایک کپڑے دھونے کا گھاٹ بنانے کی تجویز پر حکومت غور کر رہی ہے۔

حبنگلات

کشمیر کی جنگ آزادی سے آزاد کشمیر کے جنگلات کو سب سے زیادہ نقصان پہنچا اس لئے کہ جنگ کے دوران یہاں دشمن کی فوج کے دستے متعین تھے جنہوں نے جاتے ہوئے اس علاقے کو تباہ کر دیا۔ آزادی کے فوراً بعد نہ تربیت یافتہ عملہ تھا اور نہ پورا انتظامیہ ڈھانچہ پھر اور مشکلات بھی تھیں جن کی وجہ سے محکمہ جنگلات کی تنظیم مشکل بن گئی تھی۔ لیکن یہ امر نہایت حوصلہ افزا ہے کہ گیارہ سال کے قلیل سے عرصے میں یہ نامکمل سا محکمہ ترقی کر کے فنی نوعیت کا ایک وسیع اور قابل قدر محکمہ بن گیا اور اب اس میں ہر قسم کے فنی تربیت یافتہ افسر متعین ہیں اور اس محکمہ کا مقابلہ پاکستان کے کسی بھی صوبے کے محکمہ جنگلات سے کیا جا سکتا ہے

محکمہ کی موجودہ حالت یہ ہے کہ اب اس کے تحت آٹھ ڈویژن قائم ہیں جن میں تربیت یافتہ جنگلاتی افسر متعین ہیں۔ پہلے اس محکمہ میں صرف چھ گزیٹیڈ افسر تھے لیکن اب ان کی تعداد سولہ تک پہنچ گئی ہے اس کا زیادہ تر عملہ پاکستان کے جنگلاتی کالج اور گھوڑا گلی فارسٹ کالج کا تربیت یافتہ ہے اس محکمہ نے مظفر آباد کے مقام پر اپنا ایک فارسٹ سکول بھی کھولا ہے جس میں فارسٹروں اور فارسٹ گارڈوں کو تربیت دی جاتی ہے جنگلی سرحدوں کو ٹھیک کرنے اور سرحدی ستونوں کے ذریعے جنگلات کی جنگلی سرحدوں کی نشاندہی کرنے کی غرض سے یہاں ایک فارسٹ ڈیمارکیشن ڈویژن قائم کر دیا گیا ہے۔ جنگلات کا کام جدید لائنوں پر چلانے کے لئے ورکنگ پلان کا رکھنا ضروری ہے۔ اس کام کے لئے ایک علیحدہ ڈویژن قائم کیا گیا ہے۔ اس ڈویژن نے ذیلی کے علاوہ مظفر آباد اور میرپور کے جنگلات کے متعلق نقشے وغیرہ مرتب کئے ہیں۔ میرپور پونچھ اور مظفر آباد کے اضلاع کی زیریں پہاڑیوں کے دامن میں زمین کے کٹاؤ کے مسائل حل کرنے کے لئے ایک اور ڈویژن قائم کر دیا گیا ہے جو سوئل کنزرویشن ڈویژن کے نام سے موسوم ہے۔ یہ ڈویژن خراب شدہ رقبہ پر جنگلات لگا کر اور نالوں کے ذریعہ زمین کے پانی کے اخراج سے اسے قابل کاشت بنا دیتا ہے ۱۹۴۷-۴۸ء کے دوران رال سازی کی صنعت کو بہت نقصان پہنچا تھا لیکن آزادی کے بعد اس صنعت نے بتدریج ترقی کی ہے اور اب یہاں چار ہزار من سالانہ رال کی بجائے ۶۰ ہزار من سالانہ رال پیدا کی جاتی ہے۔

۱۹۴۸-۴۹ء کے دوران حکومت کو جنگلات سے تین لاکھ تین ہزار روپے آمدنی ہوتی تھی لیکن جنگلات کی ترقی کے مذکورہ اقدامات کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب ۱۹۵۸-۵۹ء کے دوران حکومت کو اس مد سے ۸۰ لاکھ روپے کی آمدنی ہوئی ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اب یہاں کے جنگلات کو اچھی تنظیم کے اصولوں کے مطابق پوری طرح کام میں لایا جاتا ہے۔ جنگلات کی دولت کو بروئے کار لانے کے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے کہ جنگلات اور وسیع ہو جائیں تاکہ اس سے دولت میں اضافہ ہو سکے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے حکومت آزاد کشمیر نے اٹھارہ ترقیاتی سکیموں کی منظوری دی ہے جن پر ۱۵ لاکھ روپے لاگت آئے گی۔ جنگلات لگانے اور زمین کو کٹاؤ وغیرہ سے بچانے کی سکیمیں ان کے علاوہ ہیں۔ ان پر کوئی ۱۶ لاکھ روپیہ خرچہ آئے گا۔ مذکورہ سکیموں پر کام شروع ہو چکا ہے۔

صنعتی ترقی

آزاد کشمیر کے قصبوں میں لوگ اچھی خاصی تعداد میں آباد ہو چکے ہیں۔ یہ لوگ مختلف دستکاریوں مثلاً کپڑا بننے قالین بنانے، مکان تعمیر کرنے، سونے چاندی کا کام کرنے، لوہے کا کام کرنے اور دیگر اقسام کے کاموں کے ماہر ہیں۔ اس لئے اس بات کی طرف بھی توجہ دی گئی ہے کہ آزاد کشمیر صنعتی میدان میں بھی ترقی کرے۔ اگرچہ اس شعبہ میں ترقی کی رفتار ابھی سست ہے تاہم حوصلہ افزا بھی ہے۔

آزاد کشمیر کی سب سے اہم صنعت ریشم کے کپڑے بنانا ہے۔ اس صنعت کو ترقی دینے کی غرض سے یہاں متعدد بڑی شہتوت کی نرسریاں قائم ہو چکی ہیں اور مزید چار نرسریوں کی منظوری دی جا چکی ہے جو عنقریب ہی قائم کر دی جائیں گی ان نرسریوں میں شہتوت کے درخت لگائے جائیں گے اور کاشتکاروں میں مفت تقسیم کئے جائیں گے۔ کوٹلی کے مقام پر ریشم اٹیرنے کی ایک فیکٹری قائم کر دی گئی ہے ——— اس فیکٹری میں مقامی طور پر پیدا شدہ ریشم کو یوں کو سیدھا جاتا ہے اب کوٹلی کے مقام پر جدید مشینوں سے ریشم اٹیرنے کی ایک بڑی فیکٹری قائم کرنے کے بارے میں غور ہو رہا

ہے۔ آزاد کشمیر میں ریشم کے بیجوں کی پیداوار کا کام بھی شروع کر دیا ہے۔ سائنسی صوبوں کے تحت ریشم کے بیج تیار کرنے کے لئے ایک کارخانے کے قیام کی منظوری بھی دی جا چکی ہے آزاد کشمیر کے کاشت کار جو ریشم کے دھاگے پیدا کرتے ہیں سالانہ کافی روپیہ کماتے ہیں۔

آزاد کشمیر میں کپڑا بننے کے کارخانوں کے قیام کی طرف بھی خاطر خواہ توجہ دی گئی ہے چنانچہ میرپور میں جاتلی کے مقام پر کپڑا بننے کا ایک کارخانہ قائم ہے جس میں سوتی اور ریشمی دونوں قسم کا کپڑا بنا جاتا ہے۔ اس کارخانے میں دستی کھڈیاں بھی ہیں اور برقی کھڈیاں بھی۔ اس کے علاوہ جاتلی کے نزدیک علی بیگ کے مقام پر رال سازی کا ایک کارخانہ قائم ہے آزاد کشمیر کے جنگلات سے رال کثیر مقدار میں حاصل ہو جاتی ہے اور امید ہے کہ یہ صنعت بہت ترقی کرے گی۔ جاتلی کے مقام پر سوڈیم سلیکیٹ کا بھی ایک کارخانہ قائم ہے۔ ضلع پونچھ سہڑا کے مقام پر کھالیں رنگنے کا ایک کارخانہ موجود ہے اور میرپور میں ایک بہت بڑا کارخانہ قائم ہونے والا ہے اس کے قیام کے سلسلے میں ابتدائی اقدامات کئے جا چکے ہیں مظفرآباد میں سلیٹ کا کارخانہ قائم کرنے کی تجویز طے ہو چکی ہے اور مناسب وقت پر اس کے قیام کے سلسلے میں اقدامات شروع کر دیئے جائیں گے۔

جہاں تک گھریلو صنعتوں کا تعلق ہے ضلع میرپور کو آزاد کشمیر کی گھریلو صنعتوں کا مرکز کہا جا سکتا ہے۔ ضلع میرپور میں دستی کھڈیوں سے کپڑا بننے کا کام بہت عام ہے اور وہاں دستی کھڈیوں کے مالکوں نے — امداد باہمی کی انجمن قائم کر رکھی ہے آزاد کشمیر کے تمام اہم مقامات پر گھریلو صنعتوں کے ترقیاتی مراکز قائم کرنے کی تجویز زیر غور ہے۔

آزاد کشمیر میں گھریلو صنعتوں کو فروغ دینے سے حکومت مغربی پاکستان کے محکمہ صنعت نے آزاد کشمیر کے ۱۰۹ کارکنوں کو سوت کاتنے چمڑا رنگنے قالین بننے اور نعل بنانے کی تربیت دینے کی پیش کش کی ہے۔

آزاد کشمیر کی دیہی ترقی کے کام میں محکمہ ترقی دیہات نہایت اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ ۱۹۵۵ء میں اس علاقہ میں یہ کام شروع کیا گیا تھا اور ۱۹۵۵-۵۶ء کے مالی سال میں اس کام کے لئے دو لاکھ پنتیس ہزار روپے سے زائد کی رقم منظور کی گئی تھی ۱۹۵۶-۵۷ء میں اس کام میں مزید توسیع کر دی گئی اور اس کی ترقی کی رفتار کو تیز کرنے کے لئے چار لاکھ چوبیس ہزار روپے کی رقم منظور کی گئی ۱۹۵۷-۵۸ء میں اس کام میں مزید توسیع ہو گئی اور اس کے لئے ۶ لاکھ روپے کی رقم مخصوص کر دی گئی۔ سال رواں میں اس کام کے لئے ۷ لاکھ روپے کی رقم مخصوص کی گئی ہے۔ اس طرح مالی اعانت کے سبب یہ پروگرام منظم طریقے پر آہستہ مگر بتدریج بڑھتا ترقی کر رہا ہے۔ اس کے تحت تین بڑے ترقیاتی پراجیکٹ ایریاں قائم ہیں جن کی آبادی ۲ لاکھ سے زائد ہے۔ اس محکمہ کے دیہات میں جا کر کام کرنے والے عملے کی تعداد میں ہر سال اضافہ ہو رہا ہے۔ چنانچہ اس وقت یہاں ۳ ترقیاتی افسر ۵ نگران اور ۹۸ دیہی کارکن کام کر رہے ہیں عنقریب میرپور میں بھی ایک پراجیکٹ ایریا قائم ہونے والا ہے۔ لائل پور اور لالہ موسیٰ کے تربیتی اداروں میں تربیت حاصل کرنے کے لئے مزید کارکنوں کا انتخاب کیا جا چکا ہے۔ آزاد کشمیر کی دیہی ترقی کے لئے ایک پنج سالہ ترقیاتی منصوبہ بھی تیار کیا گیا ہے۔ جو مغربی پاکستان کے ترقیاتی علاقوں کے منصوبوں کی طرز پر ہوگا ہر ایک گاؤں کی خصوصی ضروریات کے مطابق دیہی ترقی کی سکیموں کو جامہ عمل پہنانے اور اس سلسلے میں ضروری اخراجات کرنے کے لئے ہر ضلع کی مشاورتی کمیٹیوں کو کچھ مالی اختیارات بھی تفویض کر دیئے گئے ہیں۔

دیہی ترقی کے لئے جو رقم ہر سال منظور کی گئی ہے اس میں زر کثیر مندرجہ ذیل کاموں پر صرف کیا جا چکا ہے۔

۱۔ زرعی ترقی — اس کے تحت زرعی آلات خریدے گئے ہیں اچھی قسم کے بیج اور مصنوعی کھاد خرید کر زمینداروں میں تقسیم ہوئی ہے۔

۲۔ افزائش و پرورش حیوانات۔ اس میں مویشیوں کو فوری طبی امداد بہم پہنچانے کے لئے فرسٹ ایڈ بکس خریدنے بھی شامل ہیں۔

۳۔ صحت و صفائی۔ اس میں دیگر کاموں کے علاوہ ادویات کی قیمت بھی شامل ہے۔

۴۔ تعلیم — اس کے تحت دیگر اخراجات کے علاوہ تعلیم بالغاں کے مراکز قائم کرنے پر روپیہ صرف کرنا اور دیہی سکولوں کی عمارات کی تعمیر۔ توسیع اور مرمت وغیرہ شامل ہے۔

۵۔ سماجی سرگرمیاں۔ اس کے تحت نوجوانوں کے کلب۔ زنانہ

اور مردانہ اور چاندتارا کلب اور دیہی انجمنیں قائم کرنا شامل ہے۔

۶. آب پاشی ـــ دیگر کاموں کے علاوہ اس میں زمین کو کٹاؤ سے بچانے کی تدابیر بھی شامل ہیں

۷. پولٹری ـــ اس میں مرغیوں کو مختلف بیماریوں کے ٹیکے لگانا اچھی نسل کی مرغیاں نسل کشی کے لئے تقسیم کرنا شامل ہے۔

۸۔ چھوٹی چھوٹی گھریلو صنعتیں ـــ اس میں دیگر صنعتوں کے علاوہ کمبل بننے اور ریشم کے کپڑے بننے کی صنعت خاص طور پر شامل ہے۔

دیہی امداد کے محکمے کی ہمہ گیر سرگرمیوں کا نتیجہ یہ نکلا ہے اب آزاد کشمیر کے باشندے اس نئے پروگرام کو بہت پسند کرتے ہیں اور وہ وقت دور نہیں جب سماجی بہبود کی سرگرمیوں اور دیہی باشندوں کی فلاح و بہبود کے سلسلے میں اس محکمے کی سرگرمیاں زیادہ نتیجہ خیز ثابت ہوں گی

منگلا ڈیم پروجیکٹ

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے آزاد کشمیر کے ترقیاتی منصوبوں میں سب سے اہم اور عظیم منصوبہ منگلا بند کا منصوبہ ہے۔ یہ بند میرپور میں منگلا کے مقام پر تعمیر کیا جائے گا۔ اس کی تعمیر کے سلسلے میں ابتدائی کام مثلاً فنی اور دیگر قسم کے عملے کے لئے رہائشی مکانات کی تعمیر وغیرہ تقریباً مکمل ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ بہت سی سڑکیں نئے پل اور زمین دوز بند وغیرہ زیر تعمیر یا زیر تکمیل ہیں اور بہت سی نئی نئی سڑکوں نئے پلوں اور زمین دوز نالیوں کی تعمیر کی تجاویز زیر غور ہیں۔ اندازہ ہے کہ اس بند کی تعمیر سے ۹۴۳۴۰ ایکڑ زمین متاثر ہو گی جس میں سے ۲۲۲۴۲ ایکڑ زمین قابل کاشت ہے اور باقی بنجر۔ اس میں ۸۲۴۶ ایکڑ ریاستی زمین اور ۴۷ ۲۷ ایکڑ متروکہ زمین شامل ہے۔

اس منصوبہ کی تعمیر سے ۳۰ لاکھ ایکڑ زمین کی آب پاشی کے لئے پانی مہیا ہو سکے گا۔ علاوہ ازیں اس سے ۳ لاکھ کلوواٹ بجلی بھی مہیا ہو سکے گی۔ جو قریبی علاقوں کو نہایت کم نرخوں پر مہیا کی جائے گی۔ تجویز ہے کہ مقامی زمینوں کو سیراب کرنے کے لئے جھیل کے کنارے کنارے برقی پمپوں کا جال بچھایا جائے گا۔ اس منصوبہ سے جو بجلی پیدا ہو گی اس کے ذریعہ مقامی معدنیات کی دریافت میں مدد ملے گی اور برقی مشینوں کے ذریعہ عمارتی لکڑی کا کام خوب پھلے پھولے گا۔ اس بجلی سے یہاں کی صنعتی ترقی میں بھی ایک انقلاب آئے گا۔ جس سے گھریلو صنعتوں کے ترقی کے دروازے کھل جائیں گے۔ آزاد کشمیر کی اقتصادیات میں مشینوں کے ذریعہ صناعت ایک نیا اور اہم موڑ ثابت ہو گی۔ یہاں مچھلی پکڑنے کے فارم بھی قائم کئے جائیں گے جن سے ۲ ہزار ٹن مچھلی سالانہ حاصل کی جائے گی۔ اس تمام ترقی کا نتیجہ یہ ہو گا کہ نئے نئے شہر اور قصبے معرض وجود میں آئیں گے اور عوام کے لئے کام کرنے کی نئی نئی راہیں کھل جائیں گی۔ آج کل اکال گڑھ کے مقام پر ایک نئے قصبے کی تعمیر کا کام جاری ہے۔ اس قصبہ میں ضلع میرپور کے ۱۴ ہزار افراد کو آباد کیا جائے گا۔ حکومت آزاد کشمیر نے گزشتہ دس برس میں جس قدر ترقیاتی کام کئے ہیں ان میں یہ سب سے عظیم ہے۔

بجلی

کسی ملک کی صنعتی ترقی اور وہاں کے باشندوں کا معیار زندگی بلند کرنے کے لئے بجلی کی اہم ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آزاد کشمیر حکومت نے بھی بجلی کے حصول کو اولیت دی ہے۔ چنانچہ مظفر آباد کو ۲ لاکھ روپے کے صرف سے مالا کنڈ سے بجلی مہیا کی جاتی ہے۔ توقع ہے کہ آئندہ اس علاقہ کی صنعتی ترقی کے لئے بھی اس بجلی سے کام لیا جائیگا۔ بجلی کے موجودہ سکیموں کی بجائے فولاد کے کھمبے نصب کرنے کی ایک تجویز بھی زیر غور ہے۔ اس تجویز کی تکمیل پر ایک لاکھ روپے صرف ہوں گے۔ اس کے علاوہ منگلا ڈیم کی تعمیر سے جو بجلی پیدا ہو گی اس سے میرپور کی مجوزہ چھ فیکٹریوں کو بھی بجلی مہیا کی جائے گی۔ میرپور کے قصبے کو بجلی مہیا کرنے کی سکیم پر عنقریب عمل شروع ہونے والا ہے۔

معدنی دولت

معدنی وسائل کے اعتبار سے آزاد کشمیر ایک اہم علاقہ ہے یہاں بکسائیٹ، بینٹونائٹ سلفیٹ، کوئلے اور سلیٹ کے کثیر ذخائر موجود ہیں۔ ان ذخائر کو سائنسی طور پر ترقی دینے کی غرض سے مختلف ٹھیکہ داروں کو پٹے دیئے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں جو ابتدائی جائزہ لیا گیا ہے اس کے نتائج حوصلہ افزا ہیں اور ماہران معدنیات کو توقع ہے کہ انہیں اس سلسلے میں مزید کامیابی حاصل ہو گی۔

تعمیرات عامہ

ترقیاتی کاموں کی رفتار کو تیز کرنے کے لئے ذرائع آمدورفت کو بہتر بنانا ازحد ضروری ہوتا ہے۔ اس لئے آزاد کشمیر کے محکمہ تعمیرات عامہ کو ازسرنو منظم کیا گیا اور اس کے کام میں سہولتیں پیدا کرنے کے لئے نئی مشینیں اور عمارتی سامان وغیرہ خریدا گیا ہے۔ مزید برآں ۵۴ ہزار روپے کی لاگت سے تحقیقاتی ڈویژن بھی قائم کیا گیا ہے جو سروے اینڈ انوسٹیگیشن ڈویژن کہلاتا ہے۔

اس محکمہ کی ازسرنو تنظیم کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اب یہاں متعدد نئی سڑکیں نئے پل اور عمارات تعمیر ہو چکی ہیں اور بہت سی نئی سڑکوں نئے پلوں اور نئی عمارتوں کی تعمیر کا کام جاری ہے نیلم ویلی روڈ کی تعمیر کے لئے ۱۸ لاکھ روپے کی سکیم منظور ہو چکی ہے اور اس کے پہلے حصہ پر کام شروع ہو چکا ہے۔ جب یہ سڑک بن جائے گی تو اس وادی میں جنگلاتی لکڑی برآمد کرنے میں سہولت پیدا ہو گی اور اس طرح حکومت کی آمدنی میں اضافہ ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ بارمیاں سے کنڈل شاہی تک ایک آٹھ میل لمبی سڑک کی تعمیر کی سکیم بھی تیار ہو چکی ہے اس کی تکمیل پر ۵ ہزار روپے صرف ہوں گے۔ سہاوا سے منگلا تک .. ۲۲۱۵ روپے کی لاگت سے ایک سڑک تعمیر کی جا چکی ہے جس پر صرف خشک موسم میں ہی آمدورفت ہو سکتی ہے۔ کیپارہ۔ منگلا اور منگر پور کے مقامات پر ڈیڑھ لاکھ روپے کی لاگت سے تین پل بھی تعمیر کئے جا رہے ہیں۔ اسی طرح دھمل کوٹ کے مقام پر ۶۵ ہزار روپے کی لاگت سے ایک معلق پل تعمیر کرنے کا منصوبہ بھی مکمل ہو چکا ہے اور ۵۰ ہزار روپے کی لاگت سے ایک اور پل کی تعمیر کا کام شروع ہو چکا ہے

ہسپتالوں، ڈسپنسریوں، کالجوں، سکولوں اور دیگر قسم کی عمارات کی تعمیر پر لاکھوں روپیہ خرچ کیا جا چکا ہے ان میں سب سے بڑی عمارت مظفرآباد کے سی۔ ایم۔ ایچ کی ہے جو اب ہر اعتبار سے مکمل ہو چکی ہے۔ دھیرکوٹ۔ پنجیڑی، گڑھی دوپٹہ اور عباس پور کے مقامات پر ایک لاکھ چھبیس ہزار روپیہ کی لاگت سے ڈسپنسریوں کے لئے نئی عمارات تعمیر کرنے کا منصوبہ مکمل ہو چکا ہے۔ دھیرکوٹ میں بہبودیٔ اطفال کے مرکز کے لئے ایک عمارت زیر تعمیر ہے۔ اس تعمیر پر ۷۰ ہزار روپے صرف ہوں گے مختلف دیہات میں کوہلوں اور نہروں کی تعمیر کا کام جاری ہے۔ مثلاً واقع ضلع میرپور میں پینتیس ہزار روپے کی لاگت سے ٹیوب ویل کھودنے کی سکیم مکمل ہو چکی ہے۔ اسی طرح اڑتالیس ہزار روپے کی لاگت سے ایک آبی شاہراہ تیار کرنے کی تجویز بھی تیار کر لی گئی ہے۔ جہاں تک کالجوں کا تعلق ہے مظفرآباد میں چھ لاکھ تیالیس ہزار روپے کی لاگت سے کالج کی عمارت مکمل ہونے کو ہے۔ اسی طرح راولاکوٹ کے نئے کالج کی عمارت پر کام شروع ہو چکا ہے۔ اس عمارت پر تین لاکھ بیالیس ہزار روپے لاگت آئے گی۔

جہاں تک جنگلاتی سڑکوں کی تعمیر و مرمت کا تعلق ہے اس کام کے لئے بھی کافی رقم کی منظوری دی جا چکی ہے اور میرپور ڈویژن میں تعمیر کا کام شروع ہو چکا ہے پونچھ ڈویژن میں ۲ لاکھ روپے کی لاگت سے ایک جنگلاتی سڑک تعمیر ہو چکی ہے۔

ان کے علاوہ اور بھی تعمیری تجاویز ہیں جن پر عمل درآمد ہونے والا ہے ان سکیموں میں قصبوں کو ترقی دینے۔ رہائشی مکانات تعمیر کرنے تفریحی پارک بنانے، زنانہ صنعتی ادارے قائم کرنے، پینے کا پانی بہم پہنچانے اور اسی نوعیت کی دیگر سکیمیں شامل ہیں سڑکوں کی تعمیر کے لئے ایک پانچ سالہ منصوبہ تیار کر لیا گیا ہے اس منصوبے پر اندازاً دو کروڑ روپے صرف ہوں گے۔

امداد باہمی کی تحریک

حکومت آزاد کشمیر کو دستکاروں اور تاجروں کی ضروریات کا ہمیشہ سے خیال رہا ہے۔ اس سلسلے میں آزاد کشمیر میں امداد باہمی کی تحریک نے نہایت اہم کردار ادا کیا ہے اس قسم کی پانچ سو انجمنیں ہیں جن کی رکنیت ۸ ہزار سے زائد ہے۔ ان انجمنوں کے کاروبار کے اعداد و شمار نہایت حوصلہ افزا ہیں۔ آج کل اس علاقہ میں مختلف مقامات پر امداد باہمی کے چھ بینک قائم ہیں جو نہایت مفید کام سرانجام دے رہے ہیں۔ یہاں منتخب شدہ پنچائتوں کی تعداد ۲۵۰ تک پہنچ گئی ہے۔ اس کے علاوہ اس علاقہ میں ۱۵۱ انجمنیں قائم ہیں جو صنعتی ترقی، زرعی ترقی۔ ذرائع آمدورفت کی ترقی اور سکولوں کو سٹیشنری وغیرہ مہیا کرنے کے لئے قرضے دیتی ہیں۔ اب ان انجمنوں کی رکنیت بڑھانے اور زیادہ سے زیادہ افراد کو اس تحریک سے فائدہ پہنچانے کی کوششیں تیز تر کی جا رہی ہیں۔

یہاں کی اشیائے ضروریات کی کفالت کے لئے ادویات، ریشمی دھاگے، رنگ، سوڈا، کاسٹک، ٹائر ٹیوب اور استعمال شدہ کپڑے کی درآمد کے انتظامات کئے گئے ہیں۔ ان اشیا کو حکومت آزاد کشمیر کے مقرر کردہ مناسب نرخوں پر آزاد کشمیر کے مقامی اور مہاجر تاجروں کے ذریعہ تقسیم کیا گیا ہے۔ آزاد کشمیر مزید رنگ کیمیاوی اشیا، مصنوعی ریشم کے دھاگے، روغن، ٹائروں، برقی تاروں، دیگر برقی اشیا، فولاد، لوہے کی کنڈیاں، قبضے وغیرہ، جی آئی شیٹ، عمارتی اور انجینئرنگ کے سامان، ٹیوب، ادویات، ڈرگس اور سیکنڈ ہینڈ کپڑوں کی درآمد کے انتظامات بھی کر رہا ہے۔

تفریحی پہاڑی گاہوں کی ترقی

حکومت آزاد کشمیر اپنے علاقے کے بعض پہاڑی مقامات کو تفریح گاہوں میں تبدیل کرنا چاہتی ہے تاکہ وہاں سیاحوں کی آمد و رفت شروع ہو سکے۔ اس سلسلے میں ابتدائی اقدامات کئے جا چکے ہیں اور راولا کوٹ کے قریب وادی کولاں کا ارضیاتی جائزہ لینے کا کام شروع ہو گیا ہے۔

یہ وادی پانچ ہزار فٹ بلند ہے اور آزاد کشمیر کے حسین ترین علاقوں میں شمار ہوتی ہے۔

عدلیہ

مقبوضہ کشمیر کی عدلیہ حکمران جماعت کی خواہشات اور احکامات کی تابع ہے۔

اس کے برخلاف آزاد کشمیر میں عدلیہ کا مقام قابل عزت ہے۔ بنچ اور بار دونوں پورے نظم و ضبط سے کام چلاتے ہیں۔ یہاں ہر ایک ضلع میں منظم بار ایسوسی ایشن قائم ہیں۔ جہاں تک بار کا تعلق ہے۔ اس میں ہائی کورٹ کے ججوں اور فل بنچ کے علاوہ ۳ سیشن جج، دس سب جج اور ۳۰ ریونیو مجسٹریٹ شامل ہیں۔ یہاں عوام کے قومی جذبات اور جمہوری روایات مدنظر رکھ کر قانون وضع کیا جاتا ہے۔ اسی پالیسی کے تحت عدالتی فیصلوں میں غیر ضروری تاخیر کو روکنے کیلئے ہی سال میں فوجداری قانون میں ترمیم کی گئی ہے۔

اب ریاست کے زرعی ڈھانچے میں بھی نہایت اہم تبدیلیاں ہونے والی ہیں۔ ان تبدیلیوں سے زراعت پیشہ طبقہ کی خوش حالی میں اضافہ ہوگا۔

منگلا ڈیم ——— آزاد کشمیر کا ایک ترقیاتی منصوبہ

محمد نعیم

ڈوگرہ تسلط سے نجات حاصل کرنا اہل آزاد کشمیر کا آزادی کی طرف پہلا قدم تھا۔ دوسرا قدم اس آزاد شدہ علاقے میں زندگی کو صحت مند خطوط پر ترتیب دینا تھا۔ اس سلسلے میں حکومت آزاد کشمیر نے مختلف ترقیاتی منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کا وسیع پروگرام شروع کیا۔ ان ترقیاتی منصوبوں میں منگلا بند سب سے بڑا منصوبہ ہے۔ پاکستان اور آزاد کشمیر کے اشتراک سے مکمل ہونے والے اس منصوبے پر تقریباً ڈیڑھ ارب روپیہ لاگت آئے گا۔

منگلا بند کی تعمیر آزاد کشمیر کی ترقی اور پاکستان کے زرعی نظام کے استحکام کیلئے ناگزیر ہے۔ مغربی پاکستان کی زمینوں ... کے لئے پاکستان بھارت کا ... اور ... اس سلسلے کو بھارت ہمیشہ ایک سیاسی ہتھیار کے ... پاکستان کے خلاف استعمال کرتا رہا ہے۔ منگلا ... یہ سیاسی ہتھیار ایک دم کند ہو جائے گا اور جہاں پاکستان کی زرعی معیشت بیرونی تسلط سے آزاد ہو جائے گی وہاں آزاد کشمیر کے لئے بھی ترقی کے نئے راستے کھل جائیں گے۔

۱۹۵۵ء میں تقریباً ڈیڑھ سال کے سروے کے بعد منگلا کا مقام دریائے جہلم پر ایک مضبوط بند تعمیر کئے جانے کے لئے منتخب کیا گیا۔ وادی کشمیر میں ویری ناگ کے مقام سے نکل کر دریائے جہلم سینکڑوں میل کا پہاڑی اور میدانی سفر طے کر کے مظفر آباد پہنچ جاتا ہے۔ جہاں کشن گنگا اور موج بستہ دریائے نیلم کو یہ اپنے ساتھ ملاتا ہے۔ پھر آزاد ... کے مختلف علاقوں سے گزرتا ہوا ننگر وٹ کے مقام پر گزرے ... واسطہ ... پونچھ کو اپنی آغوش میں چھپاتا ہے۔ منگلا کے ... پہاڑوں کے ایک تنگ درے سے گزرتا ... اس مقام ...

کے دریائے جہلم کے پانی کو ذخیرہ کیا جائے گا۔ منگلا کا مقام بند کی تعمیر کے لئے اس لئے منتخب کیا گیا ہے۔ کیوں کہ اس جگہ پہاڑوں کا سلسلہ کچھ اس طرح واقع ہے کہ پانی کو ایک وسیع جھیل کی صورت میں روکنے کیلئے صرف ڈھائی میل لمبی اور تقریباً بارہ سو فٹ اونچی ایک دیوار تعمیر کرنی پڑے گی۔

اندازہ لگایا جاتا ہے۔ کہ دریائے جہلم پر بند باندھنے سے جو جھیل بن جائے گی اس کا رقبہ ایک سو مربع میل ہوگا۔ جھیل کے اس پانی کو مغربی پاکستان اور آزاد کشمیر کی زمینوں کو سیراب کرنے کے لئے نہروں کا جال بچھایا جائے گا۔ اور اس طرح سے ہزاروں ایکڑ زمین سیراب ہو جائے گی۔

آزاد کشمیر کی معیشت پر اس منصوبے کا فوری اثر ——— اور صحت مند اثر ——— یوں ہوگا۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق دریائے جہلم پر بند باندھنے سے منگلا کے مقام پر تین لاکھ کلو واٹ بجلی پیدا ہوگی۔ آزاد کشمیر میں بجلی کی پیداوار صنعتوں کی ترقی کا پیش خیمہ ثابت ہوگی۔ میرپور (آزاد کشمیر) کے علاقے میں بکسائیٹ خام مواد کی صورت میں بکثرت پایا جاتا ہے۔ اس دھات سے الومنیم کے برتن بنائے جاتے ہیں۔ ابھی تک اس دھات کو استعمال میں اس لئے نہ لایا جا سکا تھا کیونکہ آزاد کشمیر میں اتنی کثیر مقدار میں سستے داموں بجلی مہیا کرنے کا کوئی انتظام نہیں۔

میرپور میں اس کے علاوہ گھریلو صنعتوں کو ترقی دی جا سکے گی۔ اعداد و شمار کے مطابق میرپور میں اس وقت تیس ہزار کھڈیاں چالو ہیں برقی قوت مہیا ہونے کے بعد اس صنعت کو منظم طور ترقی دی جا سکے گی۔ اور ارزاں نرخ پر کپڑا بنایا جا سکے گا۔ اس کے ساتھ ہی ادویہ سازی کی صنعت بھی فروغ پا سکے گی، میرپور اور مظفر آباد میں خام صورت میں بلو ڈونا کثیر مقدار ہے۔ جسے مختلف دوائیوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔

منگلا بند کی تعمیر سے جو برقی قوت مہیا ہوگی اُسے ریشم سازی کی صنعت میں استعمال کیا جائے گا۔ کوٹلی آزاد کشمیر میں اس وقت مغربی پاکستان میں ریشم سازی کا سب سے بڑا کارخانہ ہے۔ حکومت آزاد کشمیر نے اس کارخانے کو میرپور منتقل کرنے کے لئے چار لاکھ روپے کی رقم منظور کی ہے۔ منگلا بند سے حاصل ہونے والی برقی رو سے اس کارخانے کو میرپور میں منتقل کیا جائے گا۔

اندازہ ہے کہ منگلا بند کی تعمیر سے منگلا جھیل سے پچاس ہزار ٹن مچھلی سالانہ حاصل ہو سکے گی۔ اس طرح سے منگلا کے مقام پر فریزر یا مچھلی سے تیل اور دوسری کارآمد اشیا تیار کی جائیں گی۔

منگلا بند کی تعمیر سے جو ایک سو مربع میل جھیل بن جائے گی۔ ارضی ماہرین کے اندازے کے مطابق میرپور کی آب و ہوا پر اس کا خاطر خواہ اثر ہوگا۔ چنانچہ سالانہ اوسط بارش میں بہت اضافہ ہوگا جس سے یہاں کی زرعی پیداوار میں اضافہ ہوگا۔ زرعی پیداوار بڑھانے کے لئے بند سے حاصل ہونے والی برقی قوت کو بھی استعمال میں لایا جائے گا۔ آزاد کشمیر میں مختلف مقامات پر ٹیوب ویل نصب کئے جائیں گے جن سے بنجر زمینوں کو قابل کاشت بنانے کے لئے پانی دیا جائے گا۔

منگلا بند کی تعمیر کے ساتھ ساتھ آزاد کشمیر میں اور خاص طور پر میرپور میں جگہ جگہ نئی بستیاں تعمیر کی جائیں گی۔ جہاں بند کی تعمیر سے متاثرہ آبادی کو بسایا جائے گا۔ حال ہی میں سرکاری طور پر میرپور میں بلاگالا کے مقام پر کئی کروڑ روپے کی لاگت سے نیا شہر تعمیر کئے جانے کا اعلان کیا گیا ہے۔ سرکاری اعلان کے مطابق اس شہر میں ۲۵ ہزار افراد کو بسایا جائے گا۔ اس شہر کے علاوہ اکال گڑھ، چک سواری اور چک صاحب کے مقام پر چھوٹے چھوٹے شہر تعمیر کئے جائیں گے۔ یہ چھوٹے چھوٹے شہر وسیع جھیل کے کنارے بسائے جائیں گے۔ ان شہروں کی تعمیر بجائے خود تعمیر و ترقی کی طرف ایک قدم ہے، کروڑوں روپے کی لاگت سے تعمیر کئے جانے والے یہ شہر میرپور کے لوگوں کے لئے آمدن اور روزگار کے لئے ذرائع پیدا کریں گے۔

منگلا بند کی تعمیر سے سیاحت (TOURISTTRADE) کی نئی راہیں بھی کھل جائیں گی۔ سیاحت کو ترقی دینے کے لئے حکومت نے کئی مقامات پر جھیل کے کنارے مہمان خانے تعمیر کرنے کا بھی فیصلہ کیا ہے۔ چنانچہ منگلا کے مقام پر کئی لاکھ روپے کی لاگت سے پہاڑی کی چوٹی پر ایک مہمان خانہ تعمیر کیا جائے گا۔

کاروبار کو وسعت دینے کے لئے منگلا تک ریلوے لائن بھی تعمیر کی جائے گی۔ اور شہر کے جہلم پر پل تعمیر کیا جائے گا جس سے جہلم اور میرپور کا فاصلہ ۱۴ میل سے ... [illegible]

میر غلام احمد کشفی

یہ چھوں آزاد کشمیر ریڈیو

کتنا زبردست امتحان تھا! کس قدر صبر آزما دور تھا!! بھارتی توپیں آگ اگل رہی ہیں، بھارتی ہمبار ہزاروں ٹن بم گرا رہے ہیں، شہر و دیہات میں خوف و ہراس کا عالم طاری ہے۔ کسی محب وطن انسان کو معلوم نہیں کہ دوسرے مقامات پر کیا ہو رہا ہے اور آن کی آن میں خود اس پر کیا کچھ گزرے گی۔ توپوں برین گنوں اور بندوقوں کی مسلسل آتشبازیوں، بموں کے دھماکوں اور مباروں کی گرج نے لوگوں کا دن کا چین اور رات کی نیند حرام کر رکھی ہے۔ وہ جاننا چاہتے ہیں کہ حملہ کہاں سے ہوا ہے؟ اور کیوں؟ وہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ جموں کے مسلمان کس حال میں ہیں؟ پونچھ کے مجاہد کیا کر رہے ہیں؟ میرپور میں کیا ہو رہا ہے؟ گلگت اور بلتستان کے غیرت مند لوگ کس حال میں ہیں؟ وہ ملتجی نگاہوں سے ہر راہ رو کو دیکھتے ہیں، دھیمی اور رازدارانہ آوازوں میں پوچھ رہے ہیں کہ کیا ہو رہا ہے؟ مجاہدین آزادیٔ کشمیر کہاں ہیں؟ بھارت کیوں لوگوں پر آتش و آہن کی بارش کر رہا ہے؟ اور کیوں؟ آخر ہماری آزادی میں کون سا پیچ پڑا ہے جبکہ ریاست کا آخری غاصب ڈوگرہ حکمران بھاگ چکا ہے؟ جبکہ ڈوگروں کی ظالم فوجی قوت کو محب وطن ریاستیوں نے پاش پاش کر دیا ہے۔

محب وطن کشمیریوں کے ان مضطربانہ سوالات کا کوئی جواب نہیں ملتا۔ وہ ریڈیو سٹوں کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ وہاں بھارت کے پروپیگنڈا کے سوا اور کوئی آواز سنائی نہیں دیتی۔ اسی دوران میں بھارت نے جموں اور سری نگر میں دو نشرگاہیں کھڑی کر دی تھیں۔ جن کے ذریعے دن رات مجاہدین آزادیٔ کشمیر کو لٹیرے اور ڈاکو کہہ کر مغلظات سنائی جاتی تھیں، تحریک آزادیٔ کشمیر کو کالے رنگوں میں دنیا کے سامنے پیش کیا جاتا تھا۔ ڈوگرہ سازشوں کو تحریک حریت کا نام دیا جاتا تھا۔ پاکستان کے خلاف گند اچھالا جاتا تھا۔ صبح سے شام تک ہر زبان میں اعلانات ہوتے سنتے تھے کہ بھارتی فوجوں نے فلاں محاذ فتح کر لیا، فلاں جگہ باغیوں کو شکست دی، فلاں جگہ لاشوں کے انبار لگے ہوئے ہیں ——

یا الٰہی یہ باغی کون ہیں؟ کن لوگوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر لاشوں کے انبار لگائے جا رہے ہیں۔ بھارت کو ریاست کے معاملات میں دخل دینے کا کیا حق ہے؟ اس نے اپنی فوجیں ہمارے وطن میں کیوں داخل کی ہیں؟ بھارتی فوجیں کس کے خلاف لڑ رہی ہیں؟ ہری سنگھ کے خلاف؟ —— نہیں! اس کو تو محب وطن کشمیریوں نے ملک بدر کر دیا ہے۔ ریاست کے آزادی طلب عوام کے خلاف؟ —— آخر کیوں؟ آزادی ہمارا حق ہے اور بھارت اس میں مداخلت نہیں کر سکتا۔ یہ اور اس قسم کے ہزاروں سوال ہر محب وطن کے دل میں پیدا ہوتے تھے۔ وہ ان کا جواب سننے کے لئے دیوانہ وار ادھر ادھر دوڑتا تھا، لیکن بے سود۔ اوّل تو اسے کوئی جواب نہ ملتا تھا اور اگر ملتا بھی تو ناقابل یقین۔ وہ کبھی فضا میں اپنے کانوں سے اپنے سوالات کا جواب سننے کے لئے بے تاب تھا، صحیح اور بر موقعہ جواب —— جس میں کھوٹ اور جھوٹ نہ ہو جو اس کسوٹی پہ پورا اترے، جس کو حق و صداقت کی کسوٹی کہتے ہیں۔

یقیناً یہ بہت بڑی کمی تھی، جس کو ہر محب وطن محسوس کرتا تھا۔ آخر ۱۶ مارچ ۱۹۴۸ء کے دن ایک دھیمی سی آواز نے فضا میں ارتعاش پیدا کر دیا۔ آزاد کشمیر ریڈیو کے قیام کی خبر جنگل کی آگ کی طرح ہر جگہ پھیل گئی اور شام کے وقت ہر ریڈیو سیٹ کے ارد گرد لوگوں کے ٹھٹھ لگ گئے۔ ہر سیٹ کی سوئی بیتابی کے ساتھ گھمائی جا رہی تھی اور گھمانے والے کا ہاتھ اسی وقت رکتا تھا جب اس کے کان میں آواز آتی تھی "یہ چھوں آزاد کشمیر ریڈیو" —— (یہ آزاد کشمیر ریڈیو ہے۔)"

یہی دھیمی سی آواز چند ہی روز میں اتنی مضبوط اور طاقتور

بن گئی کہ آزادی دشمنوں کے دل دہل گئے۔ آزاد کشمیر ریڈیو کی آواز نے ان کے پروپیگنڈے کا تار و پود بکھیر کر رکھ دیا۔ ریاستی عوام مجاہدین آزادی کشمیر اور جنگی محاذوں کی سرگرمیوں سے آگاہ ہو گئے۔ محبان وطن کو معلوم ہو گیا کہ بھارت نے ڈوگرہ بربریت کو سہارا دینے کے لئے اپنی فوجیں ریاست میں داخل کی ہیں۔ حق و صداقت کی اس گرج سے آزادی دشمن اس درجہ سراسیمہ ہوئے کہ انہوں نے آزاد کشمیر ریڈیو سننا جرم قرار دیا اور ہزاروں لوگوں کو اس جرم کی پاداش میں جیلوں کی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں ٹھونس دیا گیا، لیکن اس کے باوجود حق و صداقت کی یہ آواز دب نہ سکی۔ بھارتی مقبوضہ کشمیر کے محبان وطن نے تہ خانوں میں ریڈیو سیٹ رکھے جہاں صبح و شام سینکڑوں لوگ دشمنان حق کی نظریں بچا کر چالیس لاکھ ریاستی عوام کے دل کی یہ آواز سنتے تھے۔ بھارتی ایجنٹوں نے مقبوضہ کشمیر میں لوگوں کے ریڈیو سیٹوں پر مہریں لگا دیں مگر لوگوں نے یہ مہریں توڑ توڑ کر" آزاد کشمیر ریڈیو کی آواز سنی۔

آزاد کشمیر ریڈیو مجاہدین کشمیر کی طرح ایک بے سروسامان ادارہ تھا۔ یوں سمجھئے کہ مجاہدین کی ہمت سے بھارتی حملہ آوروں سے چھینے ہوئے دو فوجی ٹرکوں سے ایک میں چھوٹا سا ٹرانسمیٹر لگا دیا گیا تھا اور دوسرے ٹرک میں سٹوڈیو ترتیب دیا گیا۔ اس مجاہدانہ نشرگاہ کی مشینری عجیب و غریب گنگا جمنی مجموعہ تھی۔ کہیں سے ٹرانسمیٹر کے پرزے حاصل کئے گئے کہیں سے شارٹ میٹر پر قبضہ کیا گیا۔ کہیں سے مائیک حاصل کیا گیا اور کہیں سے ساؤنڈ بکس اور ان آن مل بے جوڑ پرزوں کو جوڑ کر ایک ایسی چلتی پھرتی نشرگاہ تیار کی گئی جو آزادی دشمنوں کے لئے سوہان روح بن گئی

آزاد کشمیر ریڈیو نے جہاں آزادی کش پروپیگنڈے کو کالعدم بے کار کر کے رکھ دیا، وہاں آزادی چاہنے والوں کے ارادوں کو قوت اور بلندی عطا کی اور اس آواز کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ بھارتی اخبارات کو یہ اعتراف کرنا پڑا کہ لوگ سری نگر ریڈیو اور آل انڈیا ریڈیو پر آزاد کشمیر ریڈیو کے پروگراموں کو ترجیح دیتے ہیں۔ بھارت کے وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے کئی دفعہ آزاد کشمیر ریڈیو کے خلاف انتہائی غم و غصہ کا اظہار کیا، جو اس بات کا ثبوت ہے کہ آزاد کشمیر ریڈیو کی آواز بڑے بڑے آزادی کشوں کو خوف زدہ کر رہی ہے۔

آزاد کشمیر ریڈیو کے دفتر میں روزانہ بھارت اور بھارتی مقبوضات سے سینکڑوں خطوط موصول ہوتے ہیں، جن میں اس حقیقت کا اعتراف موجود ہوتا ہے کہ وہ لوگ نہایت دلچسپی کے ساتھ آزاد کشمیر ریڈیو کے پروگرام سنتے ہیں اور ان کو سراہتے ہیں اور ان حقائق سے متاثر ہوتے ہیں جو اس نشرگاہ سے پیش کئے جاتے ہیں۔ ابھی چند دن کی بات ہے کہ بھارت کے چیف ایجنٹ بخشی غلام محمد نے اپنے ایک بیان میں کہا کہ بھارتی مقبوضہ کشمیر میں جو تحریکیں چل رہی ہیں وہ آزاد کشمیر ریڈیو کے پروپیگنڈے کا اثر ہیں۔ اس بات سے قطع نظر کہ بھارتی مقبوضہ کشمیر میں بھارتی قبضہ سے آزادی حاصل کرنے اور ریاست کا مستقبل پاکستان کے ساتھ وابستہ کرنے کے لئے جو تحریکیں چل رہی ہیں وہ ریاستی عوام کے جذبۂ حریت کا منطقی نتیجہ ہیں پھر بھی دشمن کا یہ کہنا کہ یہ تحریکیں آزاد کشمیر ریڈیو کے پروپیگنڈے کا نتیجہ ہیں اس بات کی شہادت ہے کہ آزاد کشمیر ریڈیو کی آواز آزادی دشمنوں کے حلقوں میں بھی اپنا اثر کئے بغیر نہیں رہتی اور ان کی سختیوں کے باوجود اہل کشمیر آزاد کشمیر ریڈیو ہی کو اپنا ترجمان سمجھتا ہے۔

شیخ محمد عبداللہ

دو خط

یہ دونوں خطوط جو آئندہ صفحات میں نقل کیے جا رہے ہیں، شیخ محمد عبداللہ نے لکھے تھے ——— انھیں ساڑھے تین سال تک قیدِ تنہائی میں رکھنے کے بعد عارضی طور پر رہا کیا گیا تھا۔ ان کا واحد قصور یہ تھا کہ انھوں نے نہرو کو ان کا ایک وعدہ یاد دلایا تھا۔ استصواب رائے کا وعدہ۔

ان خطوط میں تمام باتیں بڑی وضاحت سے کہہ دی گئی ہیں اور ان کی کسی مزید تشریح کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ پہلا خط نام نہاد دستور ساز اسمبلی کے سابق صدر جی۔ ایم صادق کے نام ہے۔ اسی اسمبلی نے بھارت میں کشمیر کے انضمام کا فیصلہ کیا ہے۔ دوسرا خط حفاظتی کونسل کے نام ہے اور ۱۹۵۷ء کے اوائل میں نیویارک پہنچا تھا۔

یہ دونوں خطوط جیل سے خفیہ طور پر باہر بھیجے گئے تھے۔

جی۔ ایم۔ صادق کے نام

پہلی تنبیہہ

یہاں اخبارات کے ذریعے جستہ جستہ جو اطلاعات موصول ہوئی ہیں انھیں پڑھ کر میں نے محسوس کیا ہے کہ آپ ریاست جموں و کشمیر کے آئین کو قطعی شکل دینے کے لیے عنقریب دستور ساز اسمبلی کا ایک اجلاس طلب کرنے والے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہماری ریاست کی تاریخ کا یہ اہم ترین مرحلہ ہوگا اس لیے اس ملک کے لاکھوں مظلوم عوام اور گزشتہ ایک صدی کی عظیم عوامی تحریک کی جانب سے میرے اوپر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ میں آپ کو متنبہ کردوں کہ اس مجوزہ اقدام کے نتائج کتنے سنگین ہو سکتے ہیں۔ اگرچہ اس کا وقت بھی قریب قریب گزر چکا ہے مگر تمام ناسازگار حالات کے باوجود مجھے اب بھی توقع ہے کہ آئندہ قدم اٹھانے سے آپ اس کے مضمرات اچھی طرح سوچ لیں گے اور ایک ایسے راستے پر آگے بڑھنے سے گریز کریں گے جس نے رائے عامہ کو مفلوج کر دیا ہے اور کشمیر کو اتنا نقصان پہنچایا ہے کہ وہ تباہی کے دروازے پر پہنچ گیا ہے۔ آپ کو یہ بھی سوچنا چاہیے کہ کیا موجودہ حالات اور فضا میں کوئی ایسا آئین تیار بھی ہو سکتا ہے جو عوام کے عزائم سے ہم آہنگ ہو۔

۹ اگست کو حکومت کا تختہ الٹنے کے بعد جمہوریت کا گلا گھونٹنے کے لیے پہلا قدم یہ اٹھایا گیا تھا کہ مجھے وزارتِ عظمیٰ سے غیر آئینی طور پر برطرف کر دیا۔ پھر مجھے گرفتار اور نظر بند کر دیا گیا۔

عدم اعتماد کے باضابطہ فیصلے کے بغیر ایوان کے لیڈر کو من مانی کارروائی کے ذریعے عہدے سے برطرف کرنے کی کوئی مثال جمہوریت کی تاریخ میں نہیں ملتی اور کشمیر کے گوشے گوشے میں عوام نے کسی تیاری کے بغیر اچانک بغاوت کر کے اس اقدام کی غیر مبہم مذمت کی ہے۔ حکومت کا تختہ الٹنے کے بعد عوام پر جو حکومت زبردستی مسلط کر دی گئی ہے اسے نام کے لیے بھی عوامی اعتماد نہ تو حاصل ہے نہ وہ آئندہ کبھی ان کا اعتماد حاصل کر سکتی ہے۔ موجودہ حکومت صرف فوج، بھارتی ریزرو پولیس اور امن بریگیڈ کے غنڈوں کے بل پر قائم ہے اور اگر ان کی جانب سے اندھا دھند اور وسیع پیمانے پر ظلم و ستم شروع نہ کر دیا جاتا تو یہ حکومت اس وقت تک ڈگمگا کر گر چکی ہوتی۔

کشت و خون اور گرفتاریاں

۹ اگست کے بعد جو کچھ ہوا ہے اس سے آپ ناواقف نہیں ہیں بشرطیکہ آپ دیدہ و دانستہ اس سے لاعلمی ظاہر نہ کریں۔ یہ

ایک تاریخی حقیقت ہے کہ پورے ملک میں اندھا دھند گولیاں چلائی گئیں اور بہت سے پر امن مرد، عورتیں اور بچوں کی جانیں ضائع ہو گئیں۔ ہزاروں افراد کو گرفتار کر کے انھیں ایذا دی گئی تاکہ وہ اطاعت پر مجبور ہو جائیں۔ اس ظلم و ستم کا بھی لوگوں کو نشانہ بنایا گیا ان میں اعلیٰ سرکاری افسر، باعزت شہری، سربرآوردہ وکلاء، دستور ساز اسمبلی کے ارکان اور ہماری تحریک آزادی کے متعدد سورما بھی شامل تھے۔

جو لوگ اس تشدد کے بعد بھی راہِ راست سے منحرف نہیں ہوئے انھیں ان کے شکستہ و خون آلودہ دست و پا کے باوجود ریاست کے مختلف قید خانوں میں ٹھونس دیا گیا۔ جن لوگوں کو وزراء کی کوٹھیوں، نام نہاد ہوٹلوں اور دوسری نجی عمارتوں میں نظر بند کر دیا گیا۔ ان کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے اور انھیں جس طرح ایذا دی گئی اس کی داستان کچھ کم دل گداز نہیں ہے۔ یہ روح فرسا اور خون خشک کر دینے والا ناٹک کافی عرصہ تک اسی شدت اور زور و شور سے جاری رہا۔ کشمیر عملی طور پر ایک جہنم بن گیا اور ریاست کے گرد ایک آہنی پردہ ڈال دیا گیا تاکہ بیرونی دنیا حقائق سے باخبر نہ ہو سکے۔

آپ نے ان حالات میں اسمبلی کا اجلاس طلب کیا ہے تاکہ بخشی غلام محمد کی قیادت میں قائم کی ہوئی نئی حکومت کے لیے اعتماد کا ووٹ حاصل کیا جا سکے۔ حالانکہ اگست ۱۹۵۳ء کے خونیں ڈرامے کے ہیرو بخشی ہی تھے اور آپ ان کے سب سے بڑے شریک کار تھے۔

جمہوریت کے اصول

مجھے جیل میں اس کی اطلاع جیسے ہی موصول ہوئی میں نے فوراً ہی آپ پر زور دیا کہ میرے خلاف عدم اعتماد یا بخشی غلام محمد کی تحریک پر بحث کے وقت ایوان میں میری موجودگی بہت ضروری ہے میرے خیال میں اس درخواست کی معقولیت اور جواز پر کسی بحث کی ضرورت نہیں ہے۔ ایوان کے لیڈر اور وزیر اعظم کی حیثیت سے مجھے اس تحریک کا سامنا کرنے کا ناقابل تردید حق حاصل تھا۔ جمہوریت کے تمام اصول اور روایات سے اس مقدس حق کی تائید ہوتی ہے لیکن چونکہ آپ خود اس سازش میں شریک تھے اس لیے ظاہر ہے کہ خود آپ کی پوزیشن بھی انتہائی کمزور اور نازک تھی اس لیے آپ کو اپنی خیر اسی میں نظر آئی کہ اب میری درخواست کو قبول کرنے سے انکار کر دیں، مگر اس طرح آپ نے جمہوری اصولوں کی اور بھی سنگین خلاف ورزی کی۔

محض ایک فریب

آپ کو یہ قاعدہ ضرور معلوم ہو گا کہ اجلاس کی کارروائی کے وقت ہر رکن کو ایوان میں موجود رہنے کا حق حاصل ہے۔ یہاں اس کا سوال نہیں کہ کسی رکن کے خیالات کیا ہیں یا اس کے حامیوں کی عددی طاقت کتنی ہے۔ اصل سوال ہر رکن کے اس بنیادی حق کا ہے کہ وہ ایوان میں موجود ہو اور دوسرے ارکان کو ہم خیال بنانے کی کوشش کر سکے۔ ۱۹۵۳ء میں میرے ساتھ اسمبلی کے جو ارکان گرفتار کیے گئے ...... تھے انھیں اجلاس میں شرکت کی اجازت دینے سے انکار کر کے آپ نے یہ حق بھی غصب کر لیا ہے۔ اسی لیے آپ نے دنیا کو اس غلط فہمی میں مبتلا کرنے میں مدد دی ہے کہ موجودہ حکومت کو ایوان کا اعتماد حاصل ہے مگر ہر شخص کو پوری طرح احساس ہے کہ ایوان میں ایسے حالات میں ووٹ لیے گئے تو ان کی کوئی اخلاقی یا قانونی حیثیت نہیں ہو گی بلکہ یہ قطعی طور پر جمہوریت کو فریب دینے کے مترادف ہو گا۔

گزشتہ دنوں جو ثبوت منظر عام پر آئے ہیں ان سے یہ بات بھی پایۂ یقین کو پہنچ گئی ہے کہ ۹ اگست کو حکومت کا تختہ الٹنے کا اقدام ایک گہری سازش کا نتیجہ ہے، جو فرقہ پرست، قدامت پسند اور دوسرے غرض مند طبقوں سے مل کر کی گئی ہے اور ۱۹۴۲ء سے میں جس عظیم تحریک کے ہراول دستے میں شامل رہا ہوں۔ اس کی جڑیں کاٹنے کے لیے بخشی کے سازشی گروہ نے دوسرے خود غرض طبقوں سے ساز باز کر لی تھی۔

کشمیر کے حکمران گروہ نے نہ صرف ان تمام بنیادی اصولوں کو پس پشت ڈال دیا ہے جنھیں صحیح ثابت کرنے کے لیے تحریک آزادی

کے دوران میں ہمارے سیکڑوں رفقاء نے اپنی زندگی تک قربان کر دی تھی بلکہ اس گروہ نے ریاست کشمیر میں شمع آزادی کے پروانوں کے جذبۂ حریت کو پامال کرنے میں بھی کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ اب اس سرزمین پر انسدادی نظر بندی کے غیر آئینی قانون کی مدد سے حکومت کی جا رہی ہے جس کے تحت کوئی بھی شخص کسی وارنٹ کے بغیر گرفتار کیا اور پانچ سال تک کوئی مقدمہ چلائے بغیر نظر بند رکھا جا سکتا ہے۔ اس سفاکانہ قانون کو اندھا دھند استعمال کیا جا رہا ہے اور اس کی زد میں بالعموم حزب اختلاف کے سرگرم ارکان یا ملک کے ایسے لوگ آتے ہیں جن کی جائز سیاسی سرگرمیوں سے آپ کے اقتدار کے لیے خطرہ پیدا ہو سکتا ہے۔

آپ کو ایسی مثالوں کا یقیناً علم ہو گا۔ جب اس ظالمانہ قانون کو جبری استعفیٰ حاصل کرنے اور دستور ساز اسمبلی کے ارکان کو حزب اختلاف میں شریک ہونے کی سزا دینے یا ان تقریروں کو مشتہر کرنے کی پاداش میں تعزیری کارروائیوں کے لیے استعمال کیا گیا ہے جو ایوان میں کی گئی ہیں اور قانون کے تحت جن کا کوئی مواخذہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس وقت بھی جب آپ ملک کے لیے ایک آئین منظور کرنے کا عظیم کارنامہ سرانجام دینے والے ہیں اور حزب اختلاف کے متعدد معزز ارکان نظر بند ہیں اور بعض کو صرف نام کے لیے پیرول پر رہا کر دیا گیا ہے مگر پولیس ان کی انتہائی ذلت آمیز نگرانی کر رہی ہے۔ ان کا قصور صرف اتنا ہے کہ انھوں نے آپ کی حکومت کی حمایت کرنے سے مسلسل انکار کیا ہے۔ ان تمام شرمناک حالات پر طرہ یہ ہے کہ مجھے تین سال سے مقدمہ چلائے بغیر نظر بند رکھا گیا ہے اور اس میعاد میں وقتاً فوقتاً صرف اس لیے توسیع کی جاتی ہے کہ موجودہ حکومت کو مزید زندگی مل سکے خواہ وہ کتنی ہی مختصر ہو۔

امن بریگیڈ

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ وحشیانہ قانون کافی نہیں تھا اور آپ کی حکومت نے کثیر سرمایہ خرچ کر کے امن بریگیڈ یا سپیشل پولیس کے نام سے ایک بہت بڑی سول فوج بھی بھرتی کی ہے جس کا کام صرف یہ ہے کہ وہ عوام کو سر بازار زد و کوب کرے، انھیں دن دہاڑے لوٹ لے اور ان لوگوں کو جو آپ کی حکومت کے مخالف ہیں نشانۂ ستم بنائے اور اسے برسر اقتدار رہنے میں مدد دے۔ یہ تنظیم زیادہ تر غنڈوں، معاشرت دشمن عناصر اور ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جن کا ماضی تاریک تھا ان کا کام صرف یہ ہے کہ پُرامن شہریوں کے دل میں حکومت کی وحشت بٹھا دیں۔

ریاست میں شہری آزادیوں کا نام نشان تک نہیں ہے۔ جائز سیاسی سرگرمی بے دست و پا اور اجتماعی زندگی مفلوج ہو کر رہ گئی ہے۔ بھارت سے کثیر رقم قرض لے کر لوگوں کے منہ بند کرنے، انھیں حکومت کا زر خرید بنانے، انھیں ٹھیکے دینے اور ایسے ہی دوسرے مقاصد کے لیے استعمال کی جاتی ہے تاکہ آپ کی حکومت کو سہارا دیا جا سکے۔

دغا بازی کی انتہا

۹ اگست تک موجودہ حکومت اور اسمبلی نے جو اقدامات کیے ہیں اور ایوان کے اندر اور باہر جو شرمناک کارروائیاں کی ہیں اس کے بعد وہ رائے دہندگان کے اعتماد سے مکمل طور پر محروم ہو گئی ہیں اور انھیں عوام کے سیاسی اور معاشی عزائم کی نمائندگی کرنے کا کوئی حق باقی نہیں رہا۔ اگر اس طرح کی کوئی تنظیم عوام اور آنے والی نسلوں کے لیے آئین تیار کرنے کی کوشش کرے تو یہ دغابازی کی انتہا ہو گی ان کے عزائم سے اس سے بڑی غداری ناممکن ہے۔ اسی لیے میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ آپ کو اس اقدام سے باز رکھوں۔

تاریخ نے یوں تو بہت سے غدار پیدا کیے ہیں لیکن دنیا نے دیکھ لیا ہے کہ عوام کا ہر دشمن تباہ و برباد ہو کر رہ گیا ہے۔ ہمارے وطن کے قریب ہی بھارت میں آزادی کی منزل مقصود کی جانب عوام کی عظیم الشان پیش قدمی روکنے کی بہت سی کوششیں کی گئی ہیں۔ سنگینوں اور مال و دولت کی مدد سے حکمرانوں کے پٹھو کچھ دیر تک آزادی کی طاقتوں کو روکنے میں ضرور کامیاب ہو گئے مگر عوام کا جذبۂ آزادی اتنا زبردست تھا کہ وقت آنے پر یہ تمام پٹھو اور ان کے آقا پر کاہ کی طرح بہ گئے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر آپ نے بھی اپنی

عوام دشمن سرگرمیاں جاری رکھیں اور کشمیر کے عوام پر کوئی آئینی مسلط کرنے کی کوشش کی تو تاریخ اپنے آپ کو دہراتے گی اور عوام آپ کے منصوبوں کا آخر دم تک مقابلہ کریں گے۔ اور کامیابی حاصل کر کے رہیں گے۔

شیخ محمد عبداللہ

حفاظتی کونسل کے نام

اقوام متحدہ کی حفاظتی کونسل کے معزز ارکان ابتدا سے بدلتے ہوئے حالات اس امر کی نشان دہی کرتے ہیں کہ ریاست جموں و کشمیر کا دس سال پرانا مسئلہ بہت جلد آپ کے روبرو پیش ہونے والا ہے اور غالباً امکان ہے کہ آپ اس پر پوری سنجیدگی سے غور کریں گے تاکہ یہ قضیہ قطعی طور پر طے کیا جا سکے۔ یہ ایک قدرتی امر تھا کہ میں اس اہم موقع پر خود آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ اس مسئلہ کے بعض اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالتا اور یہ واضح کرتا کہ اس کو فوراً حل کرنا اور میری ریاست کے باشندوں کی طویل روحانی اذیت کو ختم کرنا کتنا ضروری ہے۔ مگر ایسا ممکن نہیں ہے۔ آپ کو غالباً اس کا علم ہے کہ ریاست کے ایک نظر بندی کیمپ میں میری قید کو تین سال ہو رہے ہیں، جہاں ۹ اگست ۱۹۵۳ء کو حکومت کا تختہ الٹ کر مجھے محبوس کر دیا گیا تھا۔ اس لیے اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ میں آپ کی خدمت میں یہ مکتوب بھیج دوں اور آپ سے یہ استدعا کروں کہ اس میں جو حقائق بیان کیے گئے ہیں ان پر پوری توجہ سے غور کیا جائے۔

۲۔ میں بیس سال سے ریاست جموں و کشمیر میں مطلق العنانی اور اقتصادی لوٹ کھسوٹ کے خلاف عوام کی ایک زبردست جدوجہد کی رہنمائی کرتا ہوں۔ اس تحریک کا بنیادی اور اہم ترین اصول یہ تھا کہ حاکمیت صرف عوام کو حاصل ہونی چاہیے۔ ہماری تحریک کئی آزمائشوں اور پُر آشوب ادوار سے گزری ہے۔ ہمارے بہت سے رفقا نے اپنے محبوب مقصد کے حصول کے لیے اپنی جانیں تک قربان کر دیں اور دوسرے متعدد ساتھیوں نے طرح طرح کی اذیتیں برداشت کیں۔ برصغیر کی المناک تقسیم کے وقت فرقہ وارانہ فسادات کے شعلے اگرچہ پورے ملک میں بھڑک اُٹھے تھے اور بہت سی انسانی جانیں تلف ہو گئی تھیں مگر ریاست جموں و کشمیر نے امن و سکون کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا اور ہم فرقہ وارانہ ہم آہنگی قائم رکھنے کی کوشش میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہو گئے۔ بدقسمتی سے ہندوستان کی تقسیم کے اثرات سے کشمیر پوری طرح محفوظ نہیں رہ سکا اور ۱۹۴۷ء میں شمال مغرب کی جانب سے اس پر قبائلیوں نے حملہ کر دیا۔ اس حملے سے گھبرا کر کشمیر کے مہاراجہ نے بھارت سے فوجی مداخلت کی درخواست کی۔

۳۔ بھارت کی فوجی مداخلت کے لیے چونکہ کوئی قانونی جواز مہیا کرنا ضروری تھا۔ اس لیے مہاراجہ بھارت سے الحاق کی دستاویز پر دستخط کے لیے مجبور ہو گیا۔ تاہم بھارت نے اس الحاق کو صرف عارضی قرار دیا اور یہ اعلان کیا کہ ریاست کے مستقبل کا آخری فیصلہ عوام کے آزادانہ استصواب رائے سے کیا جائے گا۔ ۲۷ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے جو اس وقت بھارت کے گورنر جنرل تھے مہاراجہ کی جانب سے الحاق کی پیشکش کا جواب دیتے ہوئے ایک خط میں لکھا ... "کشمیر میں جیسے ہی امن و امان بحال ہو گیا اور ریاست کی سرزمین حملہ آوروں سے صاف ہو گئی۔ ریاست کے الحاق کا فیصلہ کرنے کے لیے عوام کی رائے دریافت کی جائے گی۔"

۴۔ ۲ نومبر ۱۹۴۷ء کو بھارت کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے ایک نشری تقریر میں اعلان کیا "ہماری دلی خواہش ہے کہ ہم اس بحرانی دور میں اور کشمیری عوام کو اپنی رائے ظاہر کرنے کا پورا موقع دیے بغیر کوئی فیصلہ نہ کریں جو قطعی اور آخری ہو...... الحاق کا فیصلہ لازمی طور پر ریاست کے عوام کی جانب سے ہونا چاہیے ..... ہم اس فیصلہ سے نہ منحرف ہو سکتے ہیں نہ کبھی اس سے انحراف کریں گے۔"

۵۔ بھارت کی جانب سے اقوام متحدہ اور کشمیری عوام دونوں سے بار بار وعدہ کیا جا چکا ہے کہ صرف عوام ہی ایک غیر جانب دار استصواب رائے کے ذریعے الحاق کا فیصلہ کر سکتے ہیں اور بھارت کشمیر میں ہمارے حق خود ارادیت کے محافظ اور علم بردار کی حیثیت سے داخل ہوا تھا اور اسی حیثیت سے اُس نے ہماری مدد سے حملہ آوروں کو باہر نکال دیا۔

۶ - ۱۳ اگست ۱۹۴۸ء اور پانچ جنوری کو اقوام متحدہ کے کمیشن برائے بھارت و پاکستان نے دو تاریخی قرار دادیں منظور کیں جن میں دونوں ملکوں کے با ضابطہ سمجھوتے بھی شامل تھے اور دونوں اس پر متفق تھے کہ الحاق کا فیصلہ اقوام متحدہ کی نگرانی میں آزادانہ اور غیر جانب دارانہ استصواب رائے کے ذریعے کیا جائے گا۔ کشمیری عوام سے یہ بین الاقوامی مواعید قطعی اور غیر مبہم ہیں۔

۷۔ ریاستی حکومت کو آئینی شکل دینے کی غرض سے ۱۹۵۱ء میں بھارتی مقبوضہ کشمیر میں ایک دستور ساز اسمبلی طلب کی گئی۔ پاکستان کو شک ہوا کہ اس دستور ساز اسمبلی کے ذریعے الحاق کا فیصلہ کر کے شاید استصواب رائے کی نوبت ہی نہ آنے دی جائے۔ چنانچہ اس نے حفاظتی کونسل میں اس اقدام پر سخت اعتراض کیا اور یہ موقف اختیار کیا کہ مجوزہ اسمبلی کو الحاق کا فیصلہ کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ اقوام متحدہ میں بھارتی وفد کے قائد سر بی۔ این۔ راؤ نے ۱۲ اور ۲۹ مارچ ۱۹۵۱ء کو حفاظتی کونسل میں تقریر کرتے ہوئے اس اسمبلی کا مقصد پوری طرح واضح کر دیا اور غیر مبہم اعلان کیا کہ جہاں تک الحاق کا سوال ہے۔ یہ اسمبلی الحاق کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کرے گی اور اس سلسلہ میں ان کی حکومت نے جو مواعید کیے تھے ان کی وہ بدستور پابند رہے گی۔ اسی بین الاقوامی وعدے کی بنا پر حفاظتی کونسل نے اپنے فیصلے کا ان الفاظ میں اعلان کیا۔ "اسمبلی نے اگر پوری ریاست کے الحاق یا اس کی آئندہ حیثیت کے متعلق کوئی فیصلہ کرنے کی کوشش کی تو اسے مذکورہ بالا اصول کے تحت (جو حفاظتی کونسل کی مارچ ۱۹۵۱ء کی قرار داد میں بیان کیا گیا ہے) فیصلہ قرار نہیں دیا جائے گا۔" فروری ۱۹۵۵ء میں پنڈت جواہر لال نہرو نے بھارتی پارلیمنٹ میں بعض سوالات کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ کشمیر اسمبلی نے اگر الحاق کے متعلق کوئی فیصلہ دیا تو وہ یک طرفہ ہوگا۔ اس لیے ریاست کے مستقبل پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔

۷۔ دریں اثنا حفاظتی کونسل نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ دونوں حکومتوں کو براہ راست گفت و شنید کے ذریعے اس مسئلہ کو پرامن طور پر حل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

۸۔ نیشنل کانفرنس کے لیڈر کی حیثیت سے اپنی تنظیم کی مجلس عاملہ کے مشورے اور مجلس عاملہ کی نامزد کردہ اعلیٰ سطح کی کمیٹی کی منظوری حاصل کرنے کے بعد میں نے کشمیر کا مسئلہ عوام کی خواہشات کے مطابق حل کرنے کے لیے متبادل تجاویز کی ایک فہرست مرتب کی اور جولائی ۱۹۵۳ء کے اوائل میں انہیں بھارتی وزیر اعظم کے پاس بھیج دیا تاکہ بھارت اور پاکستان کے وزرائے اعظم کی آئندہ گفتگو کے وقت اس قضیہ کے پرامن تصفیہ سے متعلق ہمارا نقطۂ نظر ان سے پنہاں نہ رہنے پائے۔ بدقسمتی سے بھارت نے اس پر پسندیدگی کا اظہار نہیں کیا اور ہمارے خلاف ہو گیا۔

(۹) اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرے اور میرے حامیوں کے خلاف ایک گہری سازش کا جال بچھا دیا گیا۔ بدقسمتی سے کشمیر کا مسئلہ پاکستان اور بھارت کے تعلقات کی کشیدگی کا سب سے بڑا سبب ہے اور ان کے درمیان اگر کوئی تصادم ہوا تو ریاست کشمیر کا اس کی زد میں سب سے پہلے آنا بالکل ناگزیر ہے۔ جب تک یہ جھگڑا قطعی اور دوستانہ طور پر حل نہیں کیا جاتا ریاست کے اندر پرامن ترقی ناممکن ہے۔ یہ بہت وزنی حقائق ہیں جنہیں کوئی ایسا شخص جسے ریاست کا مفاد عزیز ہو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ میں کچھ عرصے تک زور دیتا رہا تھا کہ پاکستان سے اس کا فیصلہ جلد کیا جائے بھارت اس نقطۂ نظر کے خلاف تھا اور میرے ساتھ اس کی ناراضگی نے بتدریج واضح دشمنی کی شکل اختیار کر لی۔

۱۰۔ ہمارے اتحاد کو پارہ پارہ کر کے اپنے شرمناک مقاصد حاصل کرنے کے لیے بھارت نے ہماری صفوں میں افتراق اور فرقہ پرستی کے بیج بوئے اور ریاستی عوام کو بددیانتی پر مائل کرنا شروع کر دیا۔ یہ سازش ۹ اگست ۱۹۵۳ء کو عروج پر پہنچ گئی اور میری حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا۔ اسمبلی میں عدم اعتماد کی کسی تحریک کی منظوری کے بغیر صدر ریاست نے غیر قانونی اور غیر آئینی حکم کے ذریعے رات گئے مجھے اور میری کابینہ کو برطرف کر دیا۔ مجھے اور میری کابینہ کے ایک اور وزیر کو گرفتار کر لیا گیا۔ اور میں مسلسل تین سال سے محبوس ہوں۔ میرے اوپر نہ تو کوئی مقدمہ چلایا گیا ہے نہ کوئی الزام عائد کیا گیا ہے۔

۱۱۔ میری گرفتاری کے ساتھ ہی میرے ہزاروں حامی اور شریک کار بھی جیلوں میں ٹھونس دیے گئے۔ ان میں نائب وزراء، اعلیٰ عہدوں پر مامور گزیٹڈ افسر، معزز تاجر، وکیل، اسمبلی کے ارکان اور دوسرے سربرآوردہ افراد شامل تھے۔ پوری وادی کے عوام کی بے ساختہ بغاوت کو کچلنے

کے بے پناہ طرح کے جابرانہ اقدامات کیے گئے۔ بھارت کی ریزرو پولیس، فوج، رضا کار فوج اور سپیشل پولیس کو پوری آزادی دے دی گئی کہ وہ جسے چاہیں گولی مار دیں اور نہتے عوام پر ہر طرح کے مظالم توڑیں۔ لوگوں کو اطاعت پر مجبور کرنے کے لیے ہزاروں افراد کو زدوکوب کیا گیا یا انھیں جیلوں میں بھوکا مارا گیا۔ جو لوگ ہلاک ہوئے ہیں ان کی تعداد سرکاری طور پر صرف ۳۶ بتائی گئی ہے۔ مگر عام اندازے کے مطابق اصل تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے۔ اس ظلم و ستم کا نشانہ حاملہ عورتوں اور بچوں کو بھی بنایا گیا، لیکن اس کی کوئی عدالتی تحقیقات نہیں کی گئی۔ اسمبلی کے مجلس سے نامدار ارکان کو کسی طرح کا الزام لگائے بغیر نظر بند کر دیا گیا اور بہت سے لوگ اپنے گھروں میں قید کر دیے گئے۔

۱۲۔ انہی لرزہ خیز حالات میں اسمبلی کا ایک اجلاس طلب کیا گیا تاکہ حکومت کا تختہ الٹنے کی کارروائی کی منظوری لی جائے اور نئی حکومت پر اعتماد کا ووٹ حاصل کیا جائے۔ میں نے جیل ہی سے بھارت کے صدر اور وزیراعظم نیز اسمبلی کے سپیکر سے تار کے ذریعے درخواست کی کہ مجھے ایوان میں حاضر ہونے اور جمہوری اصولوں کے مطابق عدم اعتماد کی تحریک کا سامنا کرنے کی اجازت دی جائے لیکن یہ درخواست قابل اعتنا نہیں سمجھی گئی۔ اس طرح اسمبلی کے ارکان کے سینے پر بھرا ہوا پستول رکھ کر اور پوری وادی میں قتل عام کر کے اور عوام کو دہشت زدہ کر کے ایک ایسی حکومت کے لیے اعتماد کا ووٹ حاصل کر لیا گیا، جو بھارتی سنگینوں کے بل پر برسر اقتدار آئی تھی۔ جمہوریت کے ساتھ اس سے بڑی دغا بازی ناقابل قیاس ہے۔ یہ کہنے کی شاید کوئی ضرورت نہیں ہے کہ اخلاقی، قانونی اور آئینی حیثیت سے اس پُرفریب اقدام کی کیا قیمت ہو سکتی ہے۔

۱۳۔ اس طرح بھارت نے ساز باز کر کے کشمیر میں ان تمام لوگوں کو اپنے راستے سے ہٹا دیا، جو اس کے خیال میں اس کے کشمیر دشمن عزائم کی تکمیل میں حائل ہو سکتے تھے۔ پھر اس نے اسمبلی میں الحاق کی توثیق کرائی۔ اس کے متعلق صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ یہ عوام کے ساتھ دغا بازی، ان کے حق خود ارادیت سے غداری اور بین الاقوامی مواعید اور معاہدوں کی سنگین خلاف ورزی ہے۔

۱۴۔ مارچ ۱۹۵۶ء میں بھارت کے وزیراعظم نے ایک اعلان میں کہا ہے کہ کشمیر میں استصواب رائے خارج از بحث ہے۔ اس اعلان سے دنیا بھر کے ضمیر کو زبردست صدمہ پہنچا ہے اور کشمیری عوام دم بخود ہو کر رہ گئے ہیں کیونکہ ان سے ان گنت وعدے کیے جا چکے تھے کہ ایک آزادانہ اور غیر جانب دارانہ استصواب رائے کے ذریعے وہ اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کریں گے۔

اس قلابازی کے حق میں یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ پاکستان جنوب مشرقی ایشیا کی دفاعی تنظیم اور معاہدۂ بغداد میں شریک ہو گیا ہے اور اس نے امریکہ سے فوجی امداد حاصل کر لی ہے۔ اس دلیل کی لغویت بالکل واضح ہے۔ پاکستان نے کچھ بھی کیا ہو یا کچھ بھی کرے اسے کشمیریوں کو خود ارادیت اور اپنے مستقبل کا خود فیصلہ کرنے کے حق سے محروم کرنے کا جائز سبب نہیں بنایا جا سکتا۔ اس کے علاوہ بھارت کے وزیراعظم اس اندیشے کی جانب بھی اشارہ کر چکے ہیں کہ کشمیریوں نے اگر پاکستان کے حق میں رائے دی تو بھارت میں فرقہ وارانہ جذبات مشتعل ہو جائیں گے اور اس کی مسلم اکثریت کی سلامتی خطرے میں پڑ جائے گی۔ یہ دلیل بھی بہت کمزور ہے۔ کیا بھارت کی سیکولرزم اتنی سطحی ہے کہ کشمیری عوام جیسے ہی اپنا حق خود ارادیت بروئے کار لائیں گے۔ یہ ایک ریت کے گھروندے کی طرح گر پڑے گی۔ کیا بھارت کی نام نہاد سیکولرزم جمہوریت میں مسلم اقلیت کے ساتھ منصفانہ سلوک کے لیے کشمیریوں کو یرغمال کے طور پر رکھا جائے گا؟ بھارت نے کشمیریوں سے بار بار وعدہ کیا تھا کہ اپنے مستقبل کا فیصلہ وہ خود ایک آزادانہ اور غیر جانبدارانہ استصواب رائے کے ذریعے کریں گے۔ کیا یہ وعدہ صرف اس صورت میں پورا ہونا تھا کہ بھارت کے حق میں فیصلہ یقینی ہو؟

۱۵۔ بھارت نے بار بار یہ دعویٰ کیا ہے کہ کشمیر بڑی تیزی سے ترقی کر رہا ہے اور وہاں سیاسی تذبذب کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ حقیقت اس دعوے کے عین برعکس ہے۔ کشمیر پر آج کل انسانیت سوز اور وحشیانہ قوانین کے ذریعے حکومت کی جا رہی ہے جن کے باعث ریاست کی تمام معاشرتی اور سیاسی زندگی مفلوج اور تمام ترقی مسدود ہو کر رہ گئی ہے۔ بھارتی جمہوریہ کے صدر کی منظوری کے بعد

ریاست میں انسدادی نظر بندی کا غیر آئینی قانون نافذ کر دیا گیا ہے جس کے باعث تمام شہری آزادیاں ختم ہو گئی ہیں۔ اس قانون کے تحت کسی شخص کو مقدمہ چلائے بغیر نظر بند رکھا جا سکتا ہے۔ اس کی رو سے یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ کسی کو اس کی نظر بندی کا سبب بھی بتایا جائے۔ اس وحشیانہ قانون کو بڑی آزادی سے وقتاً فوقتاً استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے تحت باعزت شہریوں اور سیاسی کارکنوں کو نظر بند کر دیا گیا ہے اور اس کے لیے یہ عذر پیش کیا گیا ہے کہ انھوں نے اسمبلی میں حزب مخالف کے ارکان کی تقریریں مشتہر کی ہیں یا انھوں نے ایوان میں حزب اختلاف کی تائید کے لیے اپنے استحقاق کے مطابق عوام کی تنظیم کی تھی۔ ایوان کے جن ارکان نے حزبِ مخالف میں شریک ہونے کا ارادہ بھی ظاہر کیا، انھیں گرفتار کر لیا گیا۔ بعض حالات میں اسی وحشیانہ قانون کی مدد سے اسمبلی کے ارکان کو استعفیٰ پر مجبور کیا گیا اور ایسی مثالیں تو بہت سی موجود ہیں کہ ارکان کو کھلم کھلا یہ دھمکی دی گئی کہ انھوں نے حکمران پارٹی کی حمایت نہ کی تو انھیں فوجداری کے جھوٹے مقدموں میں ماخوذ کر لیا جائے۔

کشمیر کے جو معزز شہری حکمران پارٹی سے مکمل طور پر اتفاق نہیں کرتے اُنھیں غنڈے لوٹ لیتے ہیں؛ اُن کی توہین کرتے ہیں یا اُنھیں برسرِعام زدوکوب کرتے ہیں ایسے غنڈوں کی تنظیم کے لیے بھارت کا روپیہ بے دریغ خرچ کیا جا رہا ہے۔ بھارت نے خطیر رقم سود پر حاصل کر کے عوامی زندگی میں بددیانتی کو فروغ دیا جا رہا ہے اور اس طرح عوام کا ضمیر خریدنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ لیکن یہ حقیقت بڑی اطمینان بخش ہے کہ ان تمام ناپاک ذرائع کے استعمال کے باوجود عوام کا دامن بے داغ ہے، انھوں نے ابھی تک ظالموں کی اطاعت قبول نہیں کی۔ بلکہ ایک آواز ہو کر بھارت، پاکستان اور اقوام متحدہ سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ اپنا وعدہ پورا کریں اور انھیں آزادانہ طور پر اور جمہوری اصولوں کے مطابق اپنا حق خود ارادیت استعمال کرنے کا موقع دیں۔

بھارتی پریس قریب قریب کسی استثنا کے بغیر استصواب رائے کے تمام رجحانات کا مخالف ہے۔ کوئی اخبار اگر کشمیری عوام سے بھارت کا وعدہ پورا کرنے کی حمایت کرتا ہے یا کشمیر کے موجودہ نظم و نسق پر نکتہ چینی کرتا ہے تو اُسے فوراً رشوت دے کر اس کا منہ بند کر دیا جاتا ہے یا اسے ڈرایا دھمکایا اور ریاست میں اس کا داخلہ بند کر دیا جاتا ہے۔ غیر ملکی نامہ نگاروں کو کشمیر میں داخلے کی بڑی مشکل سے اجازت دی جاتی ہے اور کسی صحافی کو اگر وادی کشمیر میں جانے کا موقع مل بھی جائے تو اس کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے کہ وہ اصل حالات اور حقائق کا مشاہدہ نہ کر سکے۔ وادی کے گرد عملی طور پر ایک آہنی پردہ پڑا ہوا ہے۔ کشمیر کا کوئی شہری یہ جرأت نہیں کر سکتا کہ وہ کسی سیاح سے ملاقات کر کے اس سے اپنی داستانِ غم بیان کر سکے کیونکہ وہ خفیہ پولیس اور اس کی ایذا رسانیوں کے ڈر سے ہر وقت سہما رہتا ہے۔ میرا دعویٰ ہے کہ کوئی شخص ان حقائق کی تردید نہیں کر سکتا۔ اگر کوئی غیر جانب دار ادارہ ان حالات کی تحقیقات کرے تو کشمیریوں کے غصے کا روح فرسا آتش فشاں پھٹ پڑے گا۔ لیکن صحیح حالات صرف غیر جانب دار تحقیقات کے بعد منظرِ عام پر آ سکتے ہیں۔ سری نگر اور جموں کے حالیہ بلدیاتی انتخابات نے کشمیر کی برسرِاقتدار پارٹی کے ظالمانہ اور پُرفریب حربوں کا قطعی ثبوت مہیا کر دیا گیا ہے۔ مسلمانوں کی تنظیموں اور ایسی سیاسی جماعتوں نے جن میں مسلمانوں کی غالب اکثریت ہے۔ ان انتخابات کا مکمل بائیکاٹ کیا۔ تاہم حزبِ مخالف کی بعض تنظیموں نے حکمران پارٹی کا مقابلہ کیا۔ ریاست کے اندر اور باہر کے ہندو پریس نے ان انتخابات کے متعلق حیرت انگیز حقائق کا انکشاف کیا ہے اور بتایا ہے کہ حکمران پارٹی نے کس طرح بددیانتی سے کام لیا ہے۔ فرضی ووٹ ڈلوائے اور طرح طرح کی بدعنوانیاں روا رکھیں۔ یہی قابلِ اعتراض ذرائع اختیار کر کے حکمران پارٹی نے سری نگر میونسپل کارپوریشن کی تمام نشستوں پر قبضہ کر لیا ہے اور جموں کارپوریشن میں اکثریت حاصل کر لی ہے۔

۱۶۔ کشمیری عوام آج کل ناقابلِ بیان آلام و مصائب سے دوچار ہیں۔ ان حالات میں کوئی اقتصادی یا سیاسی ترقی ممکن نہیں ہے۔ کشمیر اس برصغیر کے سیاسی جسم کا رستا ہوا ناسور بن گیا ہے اور اُس نے پاکستان اور بھارت کے تعلقات میں بے انتہا تلخی پیدا کر

دی ہے۔ خطِ متارکہ جنگ پر دونوں ملکوں کی فوجیں ایک دوسرے کے مقابلہ میں صف آرا ہیں اور یہ بارود کا ایک ایسا ذخیرہ ہے جو کسی وقت بھی پھٹ کر ایک تباہ کن جنگ کا پیش خیمہ بن سکتا ہے۔ اس کے سنگین نتائج کے تصور ہی سے روح کانپ اٹھتی ہے۔ اس جنگ کی صورت میں نہ صرف کشمیر صفحۂ ہستی سے نیست و نابود ہو جائے گا بلکہ اس کے نتائج اور بھی زیادہ تباہ کن ثابت ہو سکتے ہیں۔ کیا دنیا کا ضمیر اس قدر مردہ ہو چکا ہے کہ وہ بروقت بیدار نہیں ہوتا؟ اقوام متحدہ کا ایک رکن اگر اپنے بین الاقوامی عہد سے اتنی آسانی سے منحرف ہو جائے اور لاکھوں افراد کے انسانی حقوق کو اس بے پروائی سے پامال کر دے تو مجھے اندیشہ ہے کہ اس سے حفاظتی کونسل کا اثر بالکل ختم ہو جائے گا اور عالمی امن خطرے میں پڑ جائے گا۔

۱۰۔ میں کئی لاکھ کشمیریوں اور برِصغیر کے کروڑوں افراد کے امن اور ترقی کے نام پر آپ سب سے اپیل کرتا ہوں کہ آپ حفاظتی کونسل کے مواعید کی سختی سے حمایت کریں اور اس کے فیصلے کو عملی جامہ پہنائیں۔ میں دنیا کے ان ملکوں سے جنہیں آزادی سے محبت ہے، جو اقوام متحدہ کے منشور پر دستخط کر چکے ہیں اور جنہوں نے منشور کا لفظی اور معنوی دونوں حیثیتوں سے احترام کرنے کا عہد کیا ہے۔ یہ اپیل کرتا ہوں کہ وہ بین الاقوامی اختلافات اور تنازعات سے بالا ہو کر چالیس لاکھ پامال کشمیریوں کے حق کی متفقہ طور پر اور ثابت قدمی سے حمایت کریں اور انہیں ایک آزادانہ غیر جانبدار فضا میں اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کرنے کا موقع دلائیں۔ یہی اپیل میں ان قوموں سے بھی کرتا ہوں جن کے رہنماؤں نے عوام کا حق خود ارادیت تسلیم کرانے کے لیے اپنی جانیں تک قربان کر دی ہیں کشمیری عوام کی روحانی اذیت اور امن کے لیے سنگین خطرے کا صرف اسی صورت میں خاتمہ ہو سکتا ہے۔

مخلص

شیخ محمد عبداللہ

عہد نامہ امرتسر

یہ وہ عہد نامہ ہے۔ جو حکومت برطانیہ اور مہاراجا گلاب سنگھ آف جموں کے درمیان قرار پایا جس میں ایک طرف حکومت برطانیہ کے نمائندے فریڈرک کوری صاحب اور بریوٹ میجر ہنری منٹگمری لارنس (زیر احکام رائٹ آنریبل سر ہنری ہارڈنگ جی سی بی (ممبر پریوی کونسل عالیا حضرت ملکۂ برطانیہ) گورنر جنرل مقررہ آنریبل کمپنی بہادر برائے انصرام امور کمپنی در شرق الہند) اور دوسری طرف مہاراجہ گلاب سنگھ بنفس نفیس شامل ہوئے۔

دفعہ اول — حکومت برطانیہ وہ تمام کوہستانی علاقہ (مع ملحقاتِ آں) جو دریائے سندھ کے مشرق اور دریائے راوی کے مغرب کی طرف واقع ہے۔ (بشمول چمبہ و باستثنائے لاہول) اور جو اس علاقے کا ایک حصہ ہے۔ جو حکومت لاہور نے معاہدہ لاہور مورخہ ۹ مارچ ۱۸۴۶ء کی دفعہ ۴ کے منشا کے ماتحت حکومت برطانیہ کے سپرد کر رکھا ہے۔ مہاراجہ گلاب سنگھ اور ان کے جسمی مذکر وارثوں کے خود مختار قبضے میں منتقل کرتی ہے۔

دفعہ دوم — جو علاقہ دفعہ اول کے مطابق مہاراجہ گلاب سنگھ کے قبضے میں منتقل کیا جا رہا ہے۔ اس کی مشرقی سرکا فیصلہ وہ کمشنر کریں گے جنہیں حکومت برطانیہ اور مہاراجہ گلاب سنگھ اس مقصد کے لئے مقرر کریں گے اور یہ سرحد بعد پیمائش و مساحت ایک علیحدہ دستاویز میں معین کی جائے گی۔

دفعہ سوم — سے پچاس لاکھ تو معاہدے کی تصدیق پر دیا جائے گا اور باقی پچیس لاکھ سال رواں ۱۸۴۶ء عیسوی کی یکم اکتوبر کو یا اس سے پیشتر ادا کیا جائے گا۔

دفعہ چہارم — مہاراجہ گلاب سنگھ کے علاقوں کی حدود کسی وقت بھی حکومت برطانیہ کی منظوری کے بغیر تبدیل نہ کی جائیں گی۔

دفعہ پنجم — اگر مہاراجہ گلاب سنگھ اور حکومت لاہور یا کسی اور ہمسایہ سلطنت کے درمیان کوئی جھگڑا یا مسئلہ پیدا ہوگا تو مہاراجہ اس کو حکومت برطانیہ کی ثالثی کے سپرد کرے گا اور حکومت برطانیہ کے فیصلے کا پابند ہوگا۔

دفعہ ششم — مہاراجہ گلاب سنگھ اپنی اور اپنے وارثوں کی طرف سے عہد کرتے ہیں۔ کہ اگر کبھی برطانوی فوج ان کے مقبوضہ ملک کے ملحقہ علاقہ یا کوہستان میں مصروف کار ہوگی تو وہ اپنی ساری فوج سمیت برطانوی فوج کے ساتھ شامل ہوں گے۔

دفعہ ہفتم — مہاراجہ گلاب سنگھ عہد کرتے ہیں کہ حکومت برطانیہ کی منظوری کے بغیر وہ برطانیہ یا کسی یورپی یا امریکی سلطنت کی رعایا کے کسی آدمی کو اپنے ماتحت ملازم نہ رکھیں گے

دفعہ ہشتم — مہاراجہ گلاب سنگھ عہد کرتے ہیں کہ جہاں تک ان کے حق میں منتقل ہونیوالے علاقوں کا تعلق ہے۔ وہ حکومت برطانیہ اور دربار لاہور کے درمیان علیحدہ علیحدہ مورخہ ۱۱ مارچ ۱۸۴۶ کی دفعات ۵-۶-۷ کے منشا کا احترام کریں گے۔

دفعہ نہم — حکومت برطانیہ مہاراجہ گلاب سنگھ کے علاقوں کو بیرونی دشمنوں سے محفوظ رکھنے کے لئے انہیں امداد بہم پہنچائے گی۔

دفعہ دہم — مہاراجہ گلاب سنگھ حکومت برطانیہ کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرتے ہیں اور اس تسلیم کی نشانی کے طور پر حکومت برطانیہ کی خدمت میں ہر سال ایک گھوڑا اچھی نسل کی بارہ پشمی بکریاں (چھ بکرے چھ بکریاں) اور تین جوڑی کشمیری دو شالوں کی پیش خدمت کیا کریں گے۔

یہ عہدنامہ جس کی دس دفعات ہیں۔ آج کی تاریخ پر فریڈرک کری صاحب اور بریوٹ میجر ہنری منٹگمری لارنس زیر ہدایت رائٹ آنریبل سر ہنری ہارڈنگ جی سی بی گورنر جنرل نمائندگان حکومت برطانیہ اور مہاراجہ گلاب سنگھ (بنفس نفیس) کے درمیان قرار پایا۔ اور اس معاہدہ پر آج کی تاریخ کو رائٹ آنریبل سر ہنری ہارڈنگ جی سی بی گورنر جنرل نے مہر تصدیق ثبت کی۔

قرار یافتہ بمقام امرتسر مورخہ ۱۶ - مارچ ۱۸۴۶ء مطابق ۱۷ ربیع الاول ۱۲۶۲ ہجری۔

ایچ ہارڈنگ
ایف کری
ایچ ایم لارنس

گلاب سنگھ

مہاراجا کشمیر کی بھارت سے الحاق کی درخواست

مائی ڈیر مونٹ بیٹن

میں یور ایکسیلنسی کو اطلاع دینا چاہتا ہوں۔ کہ میری ریاست میں ایک تشویش ناک صورت حالات پیدا ہوگئی ہے۔ جس میں میں آپ کی حکومت کی طرف سے فوری امداد کی استدعا کرتا ہوں۔ آپ اس امر سے آگاہ ہیں کہ ریاست جموں کشمیر نے اب تک ہندوستان و پاکستان دونوں میں سے کسی کے ساتھ بھی الحاق تسلیم نہیں کیا۔ جغرافیائی اعتبار سے ریاست دونوں ملکوں سے متصل ہے اور دونوں کے ساتھ نہایت اہم اقتصادی اور کلچرل تعلقات رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ میری ریاست کی سرحدیں جمہوریہ سوویٹ اور چین کے ساتھ ملتی ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان اپنے خارجہ تعلقات میں اس حقیقت کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ میں اس بات کا فیصلہ کرنے کے لئے کچھ مہلت چاہتا


CLIMAX
ٹیبل فین
ٹرانسفارمر
موٹر
کلائمیکس مصنوعات
پاکستان بھر میں ○ کم خرچ ○ خوبصورت ○ پائیدار
کلائمیکس انجنیئرنگ کمپنی لمیٹڈ
جی ٹی روڈ گوجرانوالہ
روڈ کراچی

تھا کہ مجھے ان دونوں میں سے کس ڈومینین کے ساتھ شامل ہونا چاہیئے اور آیا میری ریاست اور دونوں ملکوں کا بہترین مفاد اس میں نہ ہوگا۔ کہ میری ریاست آزاد رہے ــــــــ اور دونوں سے دوستانہ اور خوشگوار تعلقات قائم رکھے۔

اسی مہلت کے لیئے میں نے ہندوستان و پاکستان دونوں سے درخواست کی کہ وہ ریاست کے ساتھ ساکن معاہدہ کرلیں۔ حکومت پاکستان نے اس چیز کو قبول کرلیا۔ اور ہندوستان نے میری حکومت کے نمائندوں سے مزید بات چیت کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ لیکن محولا بالا حالات کے پیدا ہوجانے کی وجہ سے میں اس گفت و شنید کا انتظام نہ کرسکا۔ واقعہ یہ ہے کہ حکومت پاکستان ساکن معاہدے کے ماتحت ریاست میں ڈاک اور تار کے محکموں کا انصرام کر رہی ہے۔

اگرچہ حکومت پاکستان کے ساتھ ہمارا ساکن معاہدہ ہوچکا ہے۔ لیکن یہ حکومت میری ریاست کو اشیائے خوراک، نمک اور پٹرول کی بہم رسانی کے معاملے میں روز افزوں مشکلات پیدا کر رہی ہے۔ افریدیوں، بے وردی سپاہیوں اور غنڈوں کو جو جدید ہتھیاروں سے مسلح ہیں ریاست میں داخل ہونے کی اجازت دے دی گئی ہے جو پہلے پونچھ کے علاقے میں، پھر سیالکوٹ میں اور آخر میں اس رقبے میں درانہ گھس آئے جو رام کوٹ کی طرف ضلع ہزارہ کے متصل واقع ہے۔ اس یورش کا نتیجہ یہ ہوا کہ ریاست کے پاس جو محدود سی فوج تھی۔ وہ منتشر کرنی پڑی۔ اسے بیک وقت کئی مقامات پر دشمن کا مقابلہ کرنا پڑا۔ چنانچہ جان و مال کی تباہی اور لوٹ مار کو روکنا بے حد دشوار ہو رہا ہے۔ ماہورہ کا بجلی گھر جس سے سارے سرینگر کو بجلی کی طاقت بہم پہنچائی جاتی تھی جلا کر خاکستر کردیا گیا ہے۔ جب میں ان عورتوں کی تعداد پر غور کرتا ہوں جو اغوا اور عصمت دری کا شکار بنائی گئیں تو میرا دل خون ہوتا ہے۔ یہ وحشی لشکر جو ریاست پر چھوڑ دیئے گئے ہیں اب میری حکومت کے گرمائی صدر مقام سری نگر پر قبضہ کرنے کی نیت سے بڑھے چلے آرہے ہیں۔ تاکہ اس کو فتح کرکے ساری ریاست پر چھا جائیں۔

شمال مغربی سرحدی صوبے کے دور دست علاقوں سے قبائل کے لوگ ہجوم کی صورت میں مانسہرہ مظفرآباد کی سڑک پر موٹر ٹرکوں میں باقاعدہ چلے آرہے ہیں۔ ان کے پاس جدید ترین اسلحہ کافی تعداد میں موجود ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے۔ صوبہ سرحد کی حکومت اور پاکستان کی حکومت کے علم کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ میری حکومت نے بار بار اپیلیں کی ہیں لیکن ان حملہ آوروں کو روکنے یا میری ریاست میں آنے سے منع کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ بلکہ پاکستان ریڈیو اور پاکستانی اخبارات تو ان واقعات کی اطلاعات شائع کر رہے ہیں اور پاکستان ریڈیو نے یہ کہانی بھی نشر کی ہے کہ کشمیر میں ایک عارضی حکومت بھی قائم کردی گئی ہے۔ واضح رہے کہ میری ریاست کے مسلم و غیر مسلم لوگوں نے بالعموم اس ہنگامے میں کوئی حصہ نہیں لیا۔

ان حالات میں جو آج میری ریاست میں پیدا ہو رہے ہیں اور صورت حالات کی سنگینی میں میرے لئے اسکے سوا کوئی چارہ نہیں رہا کہ میں انڈین ڈومینین سے امداد کی استدعا کروں۔ یہ طبعی بات ہے کہ جب تک میری ریاست ہندوستان کے ساتھ الحاق قبول نہ کرے۔ حکومت ہند مجھے امداد نہیں دے سکتی۔ لہٰذا میں نے الحاق کا فیصلہ کرلیا ہے اور "الحاق نامہ" اس عریضے کے ساتھ منسلک کر رہا ہوں۔ تاکہ آپ کی حکومت اسے منظور کرے۔ اس طرز عمل کے سوا دوسرا رستہ صرف یہی ہو سکتا ہے کہ میں اپنی ریاست اور اپنی رعایا کو لٹیروں اور ڈاکوؤں کے حوالے کردوں۔ لیکن اس بنیاد پر نہ کوئی مہذب حکومت زندہ رہ سکتی ہے۔ قائم رکھی جاسکتی ہے۔ اس لئے جب تک میں ریاست کا حکمران ہوں اور ملک کے دفاع کیلئے اپنے جسم میں جان رکھتا ہوں ایسی صورت کبھی پیدا نہ ہونے دونگا۔

میں آپ کی حکومت کو اس امر سے بھی اطلاع دینا چاہتا ہوں کہ میں فوراً ایک عبوری حکومت قائم کردونگا اور شیخ عبداللہ سے کہونگا کہ اس نازک صورت حالات میں میرے وزیر اعظم کی معیت میں حکومت کی ذمہ داری کا بوجھ اٹھائیں۔

اگر میری ریاست کو بچانا مقصود ہے تو اس کے لئے فوری امداد سری نگر پہنچ جانی چاہیئے۔ مسٹر مینن کو صورت حالات کی سنگینی کا پورا علم ہے اور اگر کسی مزید تصریح کی ضرورت باقی رہ گئی ہو۔ تو وہ آپ کی خدمت میں تفصیلاً عرض کردیں گے۔ میں بہت عجلت میں ہوں۔ اب میرا آداب قبول فرمایئے۔

آپ کا مخلص

(دستخط) ہری سنگھ

۲۶ر اکتوبر ۱۹۴۷ء

تیسرا حصّہ

کشمیر اور ادبؒ

(ا)

اُردو شاعری

فارسی شاعری

(ب)

فارسی شعراء

اُردو ادیب

کشمیری شاعر

(ج)

قصّہ کہانی

رپورتاژ

حفیظ جالندھری

تصویرِ کشمیر

معرکہ در پیش ہے جذبات کی تفسیر کا
ہو رہا ہے تذکرہ کشمیر میں کشمیر کا
کھینچنا تصویر کا لانا ہے جوئے شیر کا
رنگ بھر دے اے قلم الفاظ میں تاثیر کا
لطف جب ہے کہ اُٹھے ہر نقش اس تحریر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

چار سُو پہرے کھڑے ہیں ساکت و صامت خموش
تاجِ نوراں کے سروں پر جسم ان کے سبز پوش
ایک ہی قانونِ قدرت کے ہیں یہ حلقہ بگوش
کچھ نہیں جز خدمتِ کشمیر کہساروں کو ہوش
رُوکتے ہیں راستہ ہر دشمنِ بے پیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

برف کی اونچائیاں برفاب کی گہرائیاں
رنگ و بُو کی شوخیاں، پھولوں کی بے پروائیاں
سبز قالینوں پہ دیواروں کی بزم آرائیاں
بنتے تنتے چلتے پھرتے ابر کی پرچھائیاں
آگے پیچھے دوڑنا تاریکی و تنویر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

برف کے دیوزاد تودے نُور کے آئینہ دار
نُقرئی جھیلوں میں صبح و شام عکسِ زرنگار
نغمہ خواں جوشاں خروشاں آبشار و جوئبار
خندۂ قدرت گُل اندر گُل بہار اندر بہار
کیوں شگفتہ ہو نہ دل اک شاعرِ دلگیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

ندیاں ہر سو تھرکتی ناچتی گاتی ہوئی
کسمساتی لڑکھڑاتی پیچ بل کھاتی ہوئی
آدمی کیا پتھروں کو وجد میں لاتی ہوئی
اپنی اپنی منزلِ مقصود کو جاتی ہوئی
کرتی جاتی ہیں نگاہوں پر عمل تسخیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

تا بہ دامانِ نظر چیلوں کے دیوداروں کے بَن
سینۂ ہر سنگِ خارا سے رواں نہرِ لبن
بوالہوس کے واسطے لیکن یہ رستے ہیں کٹھن
مر گیا سر پھوڑ کر ان پتھروں سے کوہکن
سن لیا تھا نام بیچارے نے جوئے شیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

دامنِ نشو مرگ سے قائم ہے فطرت کا سہاگ
حسن کی مورت امرناتھ آئنہ ہے شیش ناگ
ہائے چشموں کی روانی ہائے چھیڑا ہو کسے راگ
اک مری آنکھوں کی ٹھنڈک اک مرے سینے کی آگ
نقشِ حیرت ہوں مجھے یارا نہیں تقریر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

دل رُبا دوشیزگی ہے چہرۂ لولاب پر
حسنِ سادہ ہنس رہا ہے عالمِ اسباب پر
کوثر و تسنیم غش ہیں اس ردائے آب پر
رشک ہے فردوس کو اس سبزۂ شاداب پر
آب میں مے کا اثر ہے خاک میں اکسیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

عام شاعر کہہ گئے کشمیر کو جنت نشاں
ورنہ جنت میں یہ حسن و رنگ و شادابی کہاں
کیا ہے جنت چند حوریں اک چمن دو ندیاں
خیر زاہد کی رعایت سے یہ کہتا ہوں کہ ہاں
عالمِ بالا پہ ہے پرتو اسی کشمیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

خوبصورت کھیت بھی، گلزار بھی، کہسار بھی
خوبصورت پھول بھی، اشجار بھی، اثمار بھی
خوبصورت ہر بشر مفلس بھی اور زردار بھی
ظاہرِ کشمیر رنگیں بھی ہے اور پُرکار بھی
باطنِ کشمیر لیکن پیٹ ہے زنجیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

حُسن کی افراط خوبی کی فراوانی یہاں
ہے نظر کو اعترافِ تنگ دامانی یہاں
بہرِ جان و جسم ہر نعمت کی ارزانی یہاں
بے کس و محتاج لیکن نوعِ انسانی یہاں
نقشِ فریادی ہے یہ تقدیر کی تحریر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

وادی و کہسار پر ایسی بہار آئی ہوئی
نخلِ آدم زاد پر لیکن خزاں چھائی ہوئی
اس قدر خوش رنگ کلیاں اور مرجھائی ہوئی
راکھ میں چنگاریاں جیسے ہوں کجلائی ہوئی
حسرت آلودہ ہے چہرہ ہر جوان و پیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

اک طرف مہمان خوش اوقات، خوش دل خوش لباس
اک طرف ہے میزباں فاقہ زدہ تصویرِ یاس
اک طرف مے کا نشہ، پھل کا مزہ، پھولوں کی باس
اک طرف بے کیف مزدوری کا حاصل بھوک پیاس
اک تماشائی ہے اک فرزند ہے کشمیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

ہائے جہلم کے یہ بجرے ہائے یہ آنچل کی اوٹ
چادرِ آبِ رواں دونوں طرف رنگین گوٹ
ہائے مانجھی کا یہ کنبہ جس کا سرمایہ ہے بوٹ
یہ مشقت یہ فلاکت لب پہ نغمہ، دل پہ چوٹ
شِیر سے محروم ہے مالک ہے جو تیئے شِیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

سطحِ ڈل لرزاں، کنول رقصاں شکارے ہیں رواں
ان کے اندر کچھ حسیں بھی پیارے پیارے ہیں رواں
لیٹے لیٹے خوابِ راحت کے سہارے ہیں رواں
آسمانِ حسن پر گویا ستارے ہیں رواں
نیم باز آنکھیں مگر ہر شوق شانہ تیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

کشتیوں کی استراحت اور باغوں کی بہار
دن چناروں کی فضائیں شب چراغوں کی بہار
ہے یہ زرداروں کی اور اونچے دماغوں کی بہار
ان کے جا کر دیکھتے ہیں دل کے داغوں کی بہار
ہے دھواں چولھے کا ان کو مشغلہ کفگیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

جس کی محنت سے چمن میں رُخِ گُل پرخندہ ہے
اس کا گھر تاریک اس کا اپنا منظر گندہ ہے
نقشِ صنّاعی کا جس کی لوحِ دل پر کندہ ہے
اس کی مجبوری کو دیکھو بندگی کا بندہ ہے
سانس لینے میں بھی اس کو خوف ہے تعزیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

مجمعِ اضداد ہیں دیہات بھی اور شہر بھی
موت بھی طاری ہے ان پر زندگی کی لہر بھی
اس زمیں پر آسماں کا لطف بھی ہے قہر بھی
اپنے بچوں کے لیے یہ شہد بھی ہے زہر بھی
آب و گِل کا یہ عجوبہ ہے عجب تخمیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

یہ چمن اغیار کی شعلہ خرامی کے لیے
یہ ثمر شیریں ہیں اپنی تلخ کامی کے لیے
زندگانی ہے یہاں مرگِ دوامی کے لیے
مائیں جنتی ہیں یہاں بچے غلامی کے لیے
ہر نفس اک سلسلہ ہے قیدِ بے زنجیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

حاکم و محکوم میں تیغ و گلو کا امتیاز
اور دونوں پاتے مغرب پر ہیں مجبورِ نیاز
یہ برہمن کے بھجن یہ شیخ صاحب کی نماز
کر رہے ہیں قیدِ نامحسوس کی رسّی دراز
ہے نگاہوں سے نہاں صیاد اس نخچیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

خیر ہم کو کیا غرض اس قوم کے حالات سے
بدگماں ہوتی ہے دُنیا اک ذرا سی بات سے
ہم تو لُطف اندوز ہونے آتے ہیں باغات سے
ہم کو دلچسپی نہیں ہے مالیوں کی ذات سے
لطف کیوں کھوئیں ہم اپنی چشمِ لذت گیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

چشمۂ شاہی پہ آؤ لے کے اک بوتل چلیں
شہر کے جھگڑوں سے گاندربل کی جانب ٹل چلیں
آؤ ویری ناگ دیکھیں آؤ اچھابل چلیں
ہنستے مزدور کو پیروں کے نیچے مَل چلیں
اس کی یہ مسکین صورت دام ہے تزویر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

یہ غریب و مفلس و مجبور ہیں ہم کیا کریں!
کم سخن، کمزور دل مزدور ہیں ہم کیا کریں!
حسن و صنعت کے لیے مشہور ہیں ہم کیا کریں!
ان کے گھر افلاس سے معمور ہیں ہم کیا کریں!
اِن کی صورت ہے نوشتہ کاتبِ تقدیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

دیکھ کر باشندۂ کشمیر کو اندوہگیں
ہنستے ہیں اہلِ تماشا کوئی ہمدردی نہیں
غیر ملکی زائروں کو ہو گیا ہے یہ یقیں
جنتی ہے مزدور ہی اس باغِ جنت کی زمیں
یہ نتیجہ ہے کسی ناگفتنی تقصیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

زائروں کا موسمِ گرما میں رہتا ہے ہجوم
اہلِ دل کم، بیشتر ان میں نظر آتے ہیں شوم
منحصر مزدوریٔ ارزاں پہ ہیں ان کے قدوم
ہیں تو یہ جگنو مگر خود کو سمجھتے ہیں نجوم
یہ زمیں گوشہ ہے ان کی خانگی جاگیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

ان کے دم سے رونقِ گلمرگ، شانِ پہلگام
لیکن ان دونوں میں ہے بدذوقیوں کا اژدہام
رات دن آلودہ کرتا ہے انھیں انبوہِ عام
حسنِ فطرت کا نہیں ان کے دلوں میں احترام
کام ہے تفریح سے جذبہ نہیں توقیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

اس گروہِ عام کا ہے ذوق کتنا بے بساط
یا شکم کی پرورش یا مرد و زن کا اختلاط
آ دکھاؤں میں تجھے راہِ حصولِ انبساط
"شام در باغِ نسیم و صبح در باغِ نشاط"
دیدہ و دل کے لیے ساماں ہے تطہیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

اس سے بڑھ کر اور کچھ چاہے تو شالامار دیکھ
آنکھ رکھتا ہے تو یہ رنگِ گل و گلزار دیکھ
کچھ نہیں دیکھا ابھی، پھر دیکھ پھر اک بار دیکھ
شانِ مغلیہ کے یہ مٹتے ہوئے آثار دیکھ
تو نے دیکھا ہے کہیں ایسا بھی فنِ تعمیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

Thus Spoke
Oscar Wilde



"Nothing is so dangerous as being too modern. One is apt to grow old-fashioned quite suddenly"

But the lady who wears H.M. silks is neither behind the times, nor rushing too much ahead. She is just right —— dressed perfectly in accordance with the current fashions.

Makers of Quality Fabrics **H.M.**

SILK MILLS LTD., KARACHI.

HM/8/ manhattan

کیا تجھے معلوم ہے یہ نہر کیوں ہے بے قرار
سر پٹکتے ہیں زمیں پر کس لیے یہ آبشار
سرنگوں کیوں ہیں یا بہ گِل اور دم بخود ہیں کیوں چنار
سر جھکائے کیوں کھڑے ہیں نخل ہائے بار دار

سبزہ کیوں منہ تک رہا ہے آسمانِ پیر کا؟
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

کون جانے کس لیے رنگین گُل رہتے ہیں غُول
اس حسیں بارہ دری پر سوگ ساطاری ہے کیوں
محوِ عبرت کیوں کھڑے ہیں سنگِ موسیٰ کے ستوں
کیوں شکستہ قلب فوّاروں کو ہے جوشِ جنوں

منتظر ہے باغ کس کے خواب کی تعبیر کا؟
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

چشمِ شاعر کے ہیں آنسو ان کو مٹّی میں نہ رُل
بے خبر انمول جوہر کو ترازو سے نہ تول
ایک گوشے میں ادب سے بیٹھ جا منہ سے نہ بول
او تماشائی! تصوّر شرط ہے آنکھیں نہ کھول

چشمِ دل سے دیکھ نقشہ گردشِ تقدیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

حامیوں سے کوئی کہہ دے بند کر دیں کھیل کود
باغ کو خالی کریں اہلِ نمائش کا وجود
ہو گئی ہے رات سو جاتے کہیں بزمِ نمود
ہونے والا ہے یہاں اب پاک رُوحوں کا ورود

پیش خیمہ آگیا اک بزمِ خلوت گیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

اک سہانی چاندنی رات اور شالامار باغ
دیکھ روشن ہو گیا ہر ایک لالے کا چراغ
خود بخود دُر پُر کر لیے رنگین پھولوں نے ایاغ
عرش پر جانے لگا پامال سبزے کا دماغ

رنگ و بُو کو بھی سہارا مل گیا تشہیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

مطرب آتے نے نواز آتے مزامیر آگئے
نغمۂ خاموش کی بن بن کے تصویر آگئے
دفعتہً بیرونِ در کچھ اہلِ شمشیر آگئے
اندرونِ در شہنشاہِ جہانگیر آگئے

ساتھ اک پُر نور حلقہ عدل کی زنجیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

باغ کا در پھر کھلا بادِ بہاری آگئی
اِک ردائے سبز بہرِ پردہ داری آگئی
صد نقاب اوڑھے ہوئے پرہیزگاری آگئی
پیچھے نورِ جہاں کی بھی سواری آگئی
گرد جھرمٹ عقل کا تہذیب کا تدبیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

غنچہ و گُل میں مثالِ بُو ہوئے دونوں نہاں
باغ میں داخل ہُوا شاہ جہاں صاحبقراں
سخت گیر و دادگُستر قہرماں و مہرباں
ہمرکابِ اقبالِ شاہی شان و شوکت ہم عناں
میر ساماں ساتھ اور سامان بھی تعمیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

محوِ سیرِ باغ ہے یہ مرکزِ توقیر بھی
اب چمن میں گونج اٹھا اک نعرۂ تکبیر بھی
غُل ہوا وہ آئے شاہنشاہ عالمگیر بھی
فقر کے قبضے میں تخت و بخت بھی تسخیر بھی
سامنے قرآن قبضہ ہاتھ میں شمشیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

ہے عجب دھندلی ضیا اُجلا اندھیرا باغ میں
ہر چمن کو نور پوشوں نے ہے گھیرا باغ میں
ہے شناسا اب کوئی تیرا نہ میرا باغ میں
بانیانِ باغ کا اُترا ہے ڈیرا باغ میں
خوف ہے تعزیر کا ان کو نہ دار و گیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

تُو نے دیکھا ہے تصور کیا ہے اب پھولوں کا رنگ؟
آبشاروں کا یہ نغمہ نہر کا یہ جلترنگ
ڈل کے اندر نقرئی لہروں کی پریاں محوِ جنگ
چاند تاروں کو زمیں پر لوٹ جانے کی امنگ
بے خودی طاری ہے عالم ہے عجب تاثیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

چاند ڈل میں ڈوبنے کو ہے سحر ہونے کو ہے
روز کا ہنگامہ پھر پیشِ نظر ہونے کو ہے
ہائے یہ منظر بھی اب زیر و زبر ہونے کو ہے
سُوئے بالا پاک روحوں کا سفر ہونے کو ہے
ہم نفَس عالم ہے یہ اک نالۂ شبگیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

باغ کے در پر بسر راتیں کیا کرتا ہوں میں
نذرِ خاموشی مناجاتیں کیا کرتا ہوں میں
ماضیٔ کشمیر سے باتیں کیا کرتا ہوں میں
بادشاہوں سے ملاقاتیں کیا کرتا ہوں میں
پوچھتا رہتا ہوں مقصد اُن سے اس تعمیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

ہنس کے فرماتے ہیں وہ اے شاعرِ رنگیں بیاں
تُو نے دیکھے شوکتِ انسانِ فانی کے نشاں
دیکھنے والا اگر ہو زندگی کا رازداں
وہ بھی کر سکتا ہے یونہی حُسنِ فطرت کو عیاں
ہے یہ اک ادنیٰ نمونہ قوّت و تدبیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

دیکھنے والے مگر اس بات کو سمجھے نہیں
حوصلے والوں کی نفسیات کو سمجھے نہیں
اِن سبق آموز تعمیرات کو سمجھے نہیں
اور کیا سمجھیں گے اپنی ذات کو سمجھے نہیں
توڑ کر ہمت کھلونا بن گئے تقدیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

زندگانی چار دن کی زندگانی ہی سہی
شوکتِ مغلیہ اب قصہ کہانی ہی سہی
اک سبق دیتی ہیں تعمیریں پُرانی ہی سہی
نقش باقی ہے ہمارا نقش فانی ہی سہی
راز تو کھلتا ہے اس سے عالمِ تغییر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

کیا مجالِ دم زدن شاہوں کے ارشادات پر
شاہدِ عادل ہے تاریخ اُن کے احسانات پر
جو نظر تھی قصر و ایوانات پر باغات پر
کاش وہ مرکوز ہوتی آدمی کی ذات پر
پھر بجا ہوتا گلہ کوتاہیٔ تدبیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

نسلِ انسانی کو ٹھہرایا گیا بے کار و زِشت
رائیگاں ہوتی رہی دہقان کی زرخیز کشت
رنگ و نغمہ، ساغر و مُل، سبزہ و گُل سنگ و خشت
خواب کے عالم کو اہلِ مقدرت سمجھے بہشت
خواب دیکھا مُنہ نہ دیکھا خواب کی تعبیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

اک جہاں کشمیریوں کے حال پر ہنستا ہے آج
نام ہے ان کا فریبی حیلہ گر ترود بہ مزاج
بے دلی، بے اعتمادی، مفلسی اور احتیاج
بندگی صدہا برس کی اور مسلسل سامراج
کس قدر ساماں فراہم ہے یہاں تحقیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

اہلِ حشمت کی یہ قبریں یہ شکستہ کاخ وکُو
زنگ خوردہ اسلحہ ٹوٹے ہوئے جام وسبُو
ہڈیاں مزدور کی ہیں اور کسانوں کا لہو
جس کھنڈر کو دیکھ کر اے دوست افسردہ ہے تُو
یہ خرابہ ہے خدا کی بہتریں تعمیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

عشرتِ ماضی کی ہے خمیازہ کش دنیائے حال
عیش چند افراد کا لایا جماعت پر وبال
ہائے یہ مغموم مائیں زیست کے غم سے نڈھال
ہائے یہ مدقوق بچے، ہائے روٹی کا سوال
ہائے کترا کر نکلنا ان سے ہر رہگیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

ہم وطن ہی جب نہ اپنے ہم وطن کے کام آئے
سر پہ ہمسایے کے ہمسایہ ہی جب طوفاں اٹھائے
کیا بنا سکتی ہے پھر اے دوست تیری ہائے ہائے
یہ مناظر دیکھتا جا اور نہ کر اظہار رائے
ورنہ فتویٰ ایک دن لگ جائیگا تکفیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

حفیظ جالندھری

خون کے چراغ

(شہیدانِ آزادی کے مزاروں کی پکار)

سُرخ پھولوں سے زمیں کشمیر کی ہے سُرخ رُو
لالہ بن کر پھوٹ نکلا ہے شہیدوں کا لہُو
چھوٹے چھوٹے ڈھیر مٹی کے قطار اندر قطار
راہِ آزادی میں لڑنے مرنے والوں کے مزار
معرکہ اس خاک پر گزرا ہے دار و گیر کا
لالہ زار اس کو نہ سمجھو، کھیت ہے شمشیر کا

یہ ہماری جاودانی زندگانی کے نشاں
چاند تاروں کی طرح روشن ہیں زیرِ آسماں
خوشنما جھنڈوں اُڑتے اور لہراتے ہوئے
چہچہاتے آسمانی راگنی گاتے ہوئے
کوئی یہ نغمے شہیدوں کے سوا سنتا نہیں
جنگِ آزادی میں ایسے محو ہیں اہلِ زمیں
اک طرف بھوکی رعایا، اک طرف جاگیردار
اک طرف دہقان، اک جانب سپاہِ شہریار
بیکسوں کی آہیں، مظلوموں کی چیخیں دردناک
شورِ محشر ہے کہ ہم بھی سن رہے ہیں زیرِ خاک
حملہ آور ہیں نہتوں پر مسلح جنگ جُو
آبِ جہلم کی رگیں ہیں اور کشمیری لہُو
یہ لہُو جتنا بہے گا رنگ لاتا جائے گا
راہِ آزادی میں تازہ گُل کھلاتا جائے گا
تابکے آتش سے کھیلے گی کرائے کی یہ فوج
قلزمِ جمہُور میں جاگی ہے آزادی کی موج
فطرتِ انساں کو ہے طوقِ غلامی ناپسند
حُرّیت اُٹھی ہے لے کر پرچمِ عزمِ بلند
اُٹھے ہیں مزدُور جانبازی دکھانے کے لیے
لعنتِ سرمایہ داری کو مٹانے کے لیے
ان کے چہرے ہیں مرقعے جوش و ضبط و صبر کے

توڑ ڈالیں گے یہ سب آئین ظلم و جبر کے
حُسنِ نصب العین ہے جن کی نگاہوں پر نثار
ہم شہیدوں کی نگاہیں اُن کی راہوں پر نثار

اے رفیقو! سرفروشو! سنتے جاؤ ایک بات
ہم بھی زندہ تھے کبھی، ہم کو بھی پیاری تھی حیات
دیکھتے تھے ہم بھی صبح و شام کی رنگینیاں
ان نگاہوں نے بھی کی ہیں حُسن کی گُل چینیاں
ہم بھی ان سینوں میں دل رکھتے تھے دل میں درد بھی
گرم آنسو آنکھ میں، ہونٹوں پہ آہِ سرد بھی
دل دھڑکتا تھا ہمارا بھی نگاہِ ناز پر
رقص ہم بھی کر چکے ہیں زندگی کے ساز پر
ہم نگاہِ حُسن کے طالب بھی تھے مطلوب بھی
عشق ہم نے بھی کیا تھا، ہم بنے محبوب بھی
ہم تمہاری ہی طرح کُودے تھے اس طوفان میں
جان کی بازی لگا دی ہم نے اس میدان میں
تھے غلامی سے تمہاری ہی طرح بیزار ہم
جنگِ آزادی کے تھے پہلے علم بردار ہم
تھا پرِ پرواز اپنا بھی کبھی افلاک پر
آج ہم قبروں میں ہیں، سوتے ہیں فرشِ خاک پر
جسم ہیں سوتے ہوئے جانیں مگر بیدار ہیں
اشتراکِ اہلِ ہمت کے لیے تیار ہیں
معرکہ آراؤ، ہاں آگے بڑھو، بڑھتے چلو
غاصبوں پر تُند شیروں کی طرح چڑھتے چلو
اب تمہارے ہاتھ اس آغاز کا انجام ہے
ہم یہاں کام آ گئے آگے تمہارا کام ہے
زور و زر سے، مکر و حیلہ سے نہ شور و شین سے
موجِ آزادی نہ کترائے گی نصب العین سے
مُنہ اگر آزادیٔ کشمیر سے موڑو گے تم
ہم شہیدوں، ہم وفاداروں کے دل توڑو گے تم

لالہ رُو یہ تربتیں یہ سینہ ہائے داغ داغ
ہم نے اپنے خون سے روشن کیے ہیں یہ چراغ
سرفروشو! ان چراغوں سے ضیا لیتے ہوئے
آگے آؤ، آگے بڑھو نامِ خدا لیتے ہوئے

(جسٹس، محمد شاہدین ہمایوں (مرحوم))

شالامار باغ کشمیر

اے باغ! لوگ کہتے ہیں تم شالامار ہو
اور عظمتِ گذشتہ کی اک یادگار ہو
کیا تم ہی زندہ ناموں کے باعث ہو نامور؟
کیا تم ہی مُردہ سلطنتوں کے مزار ہو
کہتے ہیں تم سے کھُلتے ہیں رازِ دروں کے پیچ
تم اِک کلیدِ قفلِ درِ روزگار ہو!
ہاں کچھ بتاؤ اگلے زمانے کی کیفیت
تم واقعاتِ دہر کے نامہ نگار ہو
خاموش کیوں ہو کچھ تو کہو اپنی داستاں
کس سِترِ سربہ مُہر کے تم رازدار ہو
فوّارہ کی زباں سے کہو کچھ تو اپنا حال
کیوں روتے زار زار تم اے آبشار ہو؟
اور تم بتاؤ پانی کی نہرو! کہ کس لیے
مضطر ہو پیچ کھاتی ہو اور بے قرار ہو؟
کب سے جلا رہا ہے یہ سوزِ دروں تمہیں؟
دل دادہ کس کی یاد میں تم اے چنار ہو؟

ہاں اے مسافر! ایسے سوالوں سے فائدہ؟
زخموں پہ کیوں چھڑکتے نمک بار بار ہو؟
واقف ہو حالِ زار سے پھر پوچھتے ہو حال
تم بھی عجب طرح کے تجاہل شعار ہو
کیا کہیے آہ اپنی جو حالت ہے پوچھ لو!
پیرِ فلک سے گر نہ تمہیں اعتبار ہو
وہ دن بھی تھے کہ تازہ ہی رہتے تھے یہ چمن
کشمیر میں خزاں ہو کہ فصلِ بہار ہو
نُورِ جہاں جو حُسن میں پُتلی تھی نُور کی
اور قد میں جیسے سروِ لبِ جُوئبار ہو
آکر یہاں جماتی تھی وہ دلفریب رنگ
قربان جس پہ جان سے سو لالہ زار ہو
اور آنا اس کے ساتھ شہِ مے پرست کا
جس کی نگہ سے چشمِ طرب میں خمار ہو
سامانِ عیش اور وہ عشرت کی محفلیں
وہ راتیں جن پہ روزِ درخشاں نثار ہو

کہ دو تمہیں کہ جس نے گزارے ہوں ایسے دن / پھولوں سے دل ہمارا نہ کیونکر ہو داغ داغ
اب کیوں نہ اُن کی یاد میں وہ دلفگار ہو / بدتر خزاں سے کیوں نہ ہماری بہار ہو؟
یہ گُل جو دیکھتے ہو وہ سینے کے داغ ہیں / تہذیب اور زمانہ کی ہو جب کہ یہ روش
دل کی بتائیں ہم جو کوئی غم گُسار ہو / چشمِ کرم کا کیا کوئی امیدوار ہو
اس انقلابِ دہر نے پامال کر دیا / بے تاب کیوں ہے سُن کے ہماری یہ داستاں
خاک اپنی اب تو کاش فنا کا غبار ہو / جنّت میں آکے کیوں کوئی یوں اشکبار ہو؟
ان اشکباریوں کا تمہاری اثر ہو خاک / محوِ خیال کیوں ہے؟ ذرا آنکھ تو اُٹھا
سچ تو یہ ہے اگرچہ تمہیں ناگوار ہو / دیکھ! اور محوِ صنعتِ پروردگار ہو!
ظالم ہے سنگدل ہے یہ تہذیب جس کو آج / منظر نہیں، یہ شانِ خدا کا ظہور ہے
تم سمجھے خاص رحمتِ پروردگار ہو / پانی کو چوم، کوہ سے لے ہمکنار ہو
چاندی کا اس کا جسم ہے، سونے کا اس کا دل / لہروں میں، بادلوں میں، ہوا میں، پہاڑ میں
اس تاک میں نگہ کہ گہر کا شکار ہو / وہ رُوح ہے کہ جاں تری اُس پہ نثار ہو
کانوں پہ اس کی آنکھ، فلزات پر نظر / دل چاہتا ہے اپنا ہو مسکن نسیمِ باغ
دھن ہے یہی کہ بھاپ ہو، بجلی ہو، تار ہو / مر جائیے تو ڈل کے کنارے مزار ہو
لیکن کہیں جو قسمتِ بد سے رہی سہی / سو جائیں ایک پتّے کا سینے پہ رکھ کے ہاتھ
اگلے زمانے کی کوئی اک یادگار ہو / مدفن دلِ تپاں کا جو زیرِ چنار ہو
ہوتی نہیں ہے بھول کے بھی اس طرف نگاہ / ناظر! بڑا مزا ہو جو اقبالؔ ساتھ دے
پھر جائے گر مفاد کا کچھ اعتبار ہو / ہر سال ہم ہوں، شیخ[1] ہو اور شالامار ہو

---

[1] مراد آنریبل جسٹس شیخ عبدالقادر سے ہے۔
ستمبر ۱۹۰۶ء

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم

مناجات

کشمیر سے ہر لحظہ چلی آتی ہیں خبریں
اس وادیٔ فردوس میں طوفان ہے برپا
سیلاب کی شدت ہے تو کہسار کی وحشت
بارش کی جو کثرت ہے تو اُمڈا ہوا دریا
بادل کی گرج اور کہیں بجلی کی کڑک ہے
ہے چاروں طرف چھایا گھٹا ٹوپ اندھیرا
طوفان ہواؤں میں ہے پانی میں تلاطم
ساحل کی پناہ اور نہ کشتی کا سہارا
اس بات سے شعلے سے بھڑکتے ہیں جگر میں
اس ڈر سے ہے اپنا دلِ بیتاب لرزتا
کیا حال ہوا ہوگا عزیزوں کا ہمارے
ہوتا نہیں پردیس میں کوئی بھی کسی کا
اے وہ کہ تری یاد سے تسکیں ہے دلوں کو
اے وہ کہ ترا ذکر ہے کلفت کا مداوا
ہر درد میں اپنا ہے تو ہی مونس و غمخوار
ہر خطرے میں تُو حافظ و ناصر ہے ہمارا
تو بیکس و نادار کا والی ہے جہاں میں
تو ناقص و کمزور کا دنیا میں سہارا
روشن ہے تری ذات سے ہر گوشۂ تاریک
الحق تو ہی اندھیرے گھروں کا ہے اُجالا
تو چاہے تو رُک جاتے ہر اک سیلِ حوادث
تو چاہے تو رُخ موڑ پڑے موجِ بلا کا
اس وقت ترے در پہ سرِ عجز جھکا کر
آیا ہوں سنانے دلِ بے تاب کا دُکھڑا
ہاں تیرے سوا کوئی نہیں مونس و غمخوار
ہاں تیرے بغیر اور نہیں کوئی سہارا

یا رب مری بگڑی ہوئی تقدیر بنا دے
"مجھ سے مرا بچھڑا ہوا کشمیر ملا دے"

ادارۂ ثقافت اسلامیہ

کی تازہ مطبوعات

تشبیہات رومی ـــــــــ از: ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

یہ خلیفہ صاحب کی آخری کتاب ہے۔ اس میں انھوں نے بسط و تفصیل کے ساتھ بتایا ہے کہ رومی سا نباض فطرت کس طرح امثال اور تشبیہوں سے کام لے کر فلسفۂ حیات اور کائناتِ روح کے اسرار و غوامض کس آسانی سے حل کر دیتا ہے۔ صفحات ۶۱۲ ـ قیمت آٹھ روپے

سرگزشت غزالی ـــــــــ از مولانا محمد حنیف ندوی

امام غزالی کی "المنقذ" کا اردو ترجمہ۔ امام غزالی نے اس میں اپنے فکری و نظری انقلاب کی نہایت دلچسپ داستان بیان کی ہے اور بتایا ہے کہ کس طرح انھوں نے جبہ و عبا اور مسند و دستار کی زندگی چھوڑ کر گلیم و فقر کی روش اختیار کی ہے اور اپنے لیے تصوف کو بطور آخری نصب العین کے اختیار کیا ہے۔ صفحات ـ قیمت

گلستان حدیث ـــــــــ از: شاہ محمد جعفر ندوی

یہ ان چالیس مضامین کی احادیث کی شرح ہے جو زندگی کے بلند اقدار سے تعلق رکھتی ہیں اور قرآنی احکام کی تشریح ہیں۔ صفحات ۲۰۸ قیمت ۲/۸ روپے

اجتہادی مسائل ـــــــــ از: شاہ محمد جعفر ندوی

شریعت نام ہے قانون کا جو ہر دور میں ایک نیا روپ دھارتا ہے اور دین اس کی وہ روح ہے جو کبھی نہیں بدلتی۔ بلاشبہ ہر دور کے لیے الگ الگ احکام ہوتے ہیں۔ ہر دور میں ایک ہی حکم نہیں چل سکتا۔ ہر دور کے لیے اجتہاد اور بصیرت کی ضرورت ہے جس میں بہت سے مسائل کا از سر نو جائزہ لینا ضروری ہوتا ہے۔ اس کتاب میں ایسے متعدد مسائل سے بحث کی گئی ہے۔ صفحات ۳۶۸ ۴/۸ روپے

کمرشل انٹرسٹ کی فقہی حیثیت ـــــــــ از: شاہ محمد جعفر ندوی

کیا تجارتی سود واقعی وہی ربٰو ہے جس کی قرآن نے ممانعت کی ہے؟ اس مضمون پر یہ کتاب لکھی گئی ہے اور تمام ضروری پہلوؤں پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ صفحات ۱۳۴ قیمت ۱/۸ روپے

تحدید نسل ـــــــــ از: شاہ محمد جعفر ندوی

اس وقت پاکستان کی آبادی میں ہر سال دس لاکھ نفوس کا اضافہ ہو رہا ہے۔ وسائل زندگی اور انسانی آبادی میں توازن رکھنے کے لیے تحدید نسل ضروری ہے۔ تحدید نسل کا مطلب نسل کشی نہیں بلکہ اعتدالِ نسل کشی ہے۔ اس کتاب میں دینی اور عقلی شواہد سے اس مسئلہ پر گفتگو کی گئی ہے۔ صفحات ـ قیمت

حکمائے قدیم کا فلسفۂ اخلاق از: بشیر احمد ڈار

سچائی کسی قوم یا زمانے کی مخصوص ملکیت نہیں اور جدید دور میں جب ہم اپنے عصری تقاضوں کی روشنی میں حقائق تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں تو قدیم حکماء، فلاسفہ اور مصلحین کی کاوشوں کا مطالعہ تاریخی حیثیت سے بہت اہم ہو جاتا ہے۔ صفحات ۵۰۸ قیمت ۶ روپے

ادارہ ثقافتِ اسلامیہ

نرسنگھ داس گارڈن ۔ ۲۔ کلب روڈ لاہور ٹیلیفون 3958

جعفر طاہر

للّہ عارفہ

راوی۔ ادھر کوہساروں کے دامانِ رنگیں میں آباد ہے اک چناروں کی وادی
مہکتے ہوئے مرغزاروں کی وادی، بہکتے ہوئے آبشاروں کی وادی
ہری کھیتیوں، سرمئی گھاٹیوں، نیلے دریاؤں کی جنّتِ دلنشیں ہے
یہی اہلِ دل کا وطن ہے، یہی ریشیانِ گرامی کا خلدِ بریں ہے
وہ چشمہ بہ چشمہ لرزتے ہوئے بیدِ مجنوں کی شاخوں کے معصوم سائے
وہ سایوں کے سیلاب میں کتنے پھولوں کی پریاں شبِ آہنگ شمعیں جلائے
وہ دریا بہ دریا سفینے سفینے کنارے کنارے ہزاروں شکارے
جہاں گل و سبزہ و زعفراں کے وہ ایمان پرور مقدس نظارے
وہ دنیا جسے شاہ میری شہنشاہوں کے فضل و جود و کرم نے سنوارا
نشیبوں کی ذلّت میں دم توڑتی قسمتوں کو دیا الفتوں کا سہارا
جہالت کی تاریکیاں دور ہونے لگیں علم و عرفاں کی زرّیں ضیا سے،
اندھیروں میں لپٹی ہوئی وادیاں جگمگانے لگیں بڑھ کے ماہ و سہا سے
وہ اقلیم کرتے رہے جس کی چوکٹ شاہی سلطان بھی عمر بھر پاسبانی
کئی مدرسے، مقبرے، مسجدیں، خانقاہیں اسی دور کی ہیں نشانی
وہ ابرِ کرم کی طرح کھل کے برسا کئے، دشت و کوہ و بیاباں کی جانب
رہیں ان کی آنکھیں ہمیشہ زمیں کی طرف۔ اپنی دنیا کے انسان کی جانب
کنشت و کلیسا کی تقدیس کے سلسلے میں کیے لاکھ فرمان جاری
مساجد میں حفاظ و قاری، سبھاؤں میں اپنی جگہ شاد پنڈت پجاری
مگر شاہ بڈشاہ کے دور کی مختلف ہے مرے دوستو یہ کہانی
سنو ایک دخترِ برہمن کی یہ داستاں آج کی شب اسی کی زبانی

(آہستہ آہستہ فیڈ آؤٹ)

گھر کا ہنگامہ۔ آمد و رفت کے اشارے، ایک مرد کے پاؤں کی تھکی
ہوئی چاپ۔

شوہر۔ کئی دنوں سے یہ چاہتا تھا کہ تم سے میں ایک بات پوچھوں
کہیں خفا ہو نہ جاؤ، بولو، کہو نا، جانِ حیات پوچھوں؟

للہ۔ یہ میرے سرتاج کہہ رہے ہیں
یہ آپ کیا آج کہہ رہے ہیں!

شوہر۔ کئی دنوں سے یہ آرزو دل میں ہے کہ تم سے یہ راز پوچھوں
کہاں گئیں وہ حسین ادائیں وہ کیا ہوا رنگِ ناز پوچھوں

للہ۔ یہ شکوۂ رنگِ ناز کیا ہے؟
وہ آرزو کیا ہے راز کیا ہے؟

شوہر۔ یہ ماجرا کیا ہے؟ راز کیا ہے؟ یہ سلسلہ کیا ہے راحتِ جاں!
نہ گیسوتے خم بہ خم کی شب ہے نہ صبح رُخسارِ یار، تاباں!

للہ۔ مگر یہ سرکار وہم کیسا؟

شوہر۔ مجھے بتاؤ کہ چشمِ کوثر نواز کے جام کیوں تہی ہیں؟
یہ تشنہ رُو کاکلیں کہ افشاں کی شبنموں کو ترس رہی ہیں!

للہ۔ مگر ہو شبنم یہ آس کیسے

شوہر نہاں ہیں کس غم کی ظلمتوں میں تبسموں کے حسین سویرے؟
دلِ بہار آستاں میں کس درد کی خزاں نے لگائے ڈیرے؟

للہ۔ (مسکرا کر) کوئی تو نشتر چبھو گیا ہے!
حضور کیا آج ہو گیا ہے؟

شوہر۔ میں آج دریافت کر کے چھوڑوں گا میری رانی یہ بات کیا ہے؟
یہ عالمِ بے کسی، یہ آنکھوں میں آنسوؤں کی برات کیا ہے؟

للہ۔ شباب کی دھوپ ڈھل چکی ہے
بہار کی رُت بدل چکی ہے

شوہر۔ مجھے بتاؤ کہ یہ حسین جسم اس قدر زرد زرد کیوں ہے؟
نظر نظر اتنی سرد کیوں ہے رُخِ جواں گرد گرد کیوں ہے؟

للہ۔ مگر جوانی ہے ڈھلتی چھایا
کوئی بھی حیلہ نہ کام آیا

شوہر۔ نہیں نہیں یہ نہیں، مگر گھر میں کونسی شئے بہم نہیں ہے؟
یہ گھر کسی تاجدارِ گیتی ستاں کے محلوں سے کم نہیں ہے!

للہ۔ یہ طفلک و پیر جانتا ہے
یہ سارا کشمیر جانتا ہے

شوہر۔ تو پھر بتاؤ یہ راز کیا ہے جو اتنی کمزور و ناتواں ہو
گماں یہ ہوتا ہے جیسے بستر پہ کوئی بیمارِ نیم جاں ہو

للہ۔ مگر مجھے کوئی غم نہیں ہے
یہ گھر کا جھنجھٹ ہی کم نہیں ہے

شوہر۔ مگر یہ نوکر، نفر، کنیزیں، غلام، خدام، خادمائیں!
یہ داسیاں کس لیے ہیں دو وقت کا بھی کھانا نہ گر پکائیں؟

للہ۔ (مسکرا کر) میں پوچھتی ہوں یہ بات کیا ہے؟
تکلفِ التفات کیا ہے؟

شوہر۔ مجھے خدارا بتاؤ، روتے حسیں پہ یہ اضطراب کیوں ہے؟
یہ سہمی سہمی ہوئی نگاہیں، یہ عالمِ پیچ و تاب کیوں ہے؟
(آواز بھاری ہو جاتی ہے جیسے رو پڑا ہو)

للہ۔ ارے یہ کیا! آپ رو رہے ہیں
یہ کیا مرے پاپ دھو رہے ہیں

شوہر۔ (گلوگیر آواز سے) گماں یہ ہوتا ہے جیسے مجھ سے بھی دل کا دکھڑا چھپا رہی ہو
مگر یہ بھولی ہیں؟ ... جیسے ... پتھر کا ایک ٹکڑا چھپا رہی ہو
یہ چیز ہم سے تو مت چھپاؤ

للہ۔ مرے پتی دیو، جاؤ، جاؤ

شوہر۔ گلوں کو شاید خبر نہیں ہے کہ ان پتوں کی کمر نہیں ہے
ترا تو ہر رنگ آئینہ ہے مگر ہماری نظر نہیں ہے

للہ۔ (گھبراہٹ، بدحواسی) خدارا چھوڑو خدارا چھوڑو
نہ یوں مرے ہاتھ پاؤں توڑو

شوہر۔ دکھاؤ مجھ کو دکھاؤ

للہ جاؤ خدارا جاؤ

شوہر۔ مجھے دکھاؤ ابھی دکھاؤ

للہ خدارا جاؤ نہ یوں ستاؤ

(شوہر پیالہ چھین لیتا ہے)

شوہر (حیرت سے) یہ سنگ بے مایہ کا پیالہ!
غذا کو یہ ایک ہی نوالہ!

للہ۔ مگر یہ اک راز ہے راز! بس اس کی تشہیر ناروا ہے

شوہر (جوش سے) میں پوچھتا ہوں کہ چاولوں کا یہ اک نوالہ تری غذا ہے

للہ۔ یہ ماتاجی سے نہ بات کرنا

شوہر۔ یہ کس لیے اپنے گھر میں ڈرنا

ساس۔ حرام زادی جھگڑ رہی ہے
وہ میرے بچے سے لڑ رہی ہے

شوہر- نمستے ماتا جی!

ساس (غصے کے ساتھ) ہاں نمستے

مگر وہ کہ رہی تھی تجھ سے

شوہر- وہ آپ کی بات کیا کرے گی

ساس- یہ بے حیا مجھ سے کیوں ڈرے گی

شوہر- الٰہی ظلم و ستم کی حد ہے

ساس- تمہیں تو بس ایک مجھ سے کد ہے

شوہر (غصے سے) میں پوچھتا ہوں کہ چاولوں کا یہ اک نوالہ غذا ہے کس کی؟

ساس (غصے سے) نہیں ہے اس کی تو اور کس کی

للہ یہ ایک آئینہ بچ رہا تھا وہ پاش پاش آج ہو چکا ہے۔

ساس (غصے میں) حرام زادی نکل جا گھر سے

للہ- یہ راز فاش آج ہو چکا ہے

شوہر- یہ پیرہن کیوں اتارتی ہو؟

ساس- ارے نگوڑی کو کیا ہوا ہے

للہ- یہ پیرہن کیا لباس کیسا جو راز تھا فاش ہو چکا ہے

ساس (بیٹے سے) ارے مُوا مرجا کھڑا ہے!

شوہر- تو کیا کروں اس کو مار ڈالوں!

للہ- جو راز تھا فاش ہو چکا ہے

تمام کپڑے اتار ڈالوں

ساس- حرام زادی چھنال کنجری

شوہر- خدارا ماتا خموش رہ بھی

ساس- ارے کدھر جا رہی ہے چھوری

شوہر یہ بے حیائی یہ سینہ زوری

ساس- مگر اسے دوڑ کر پکڑ لے

شوہر (دوڑتا ہے) ارے میاں دوڑیو پکڑیو

یہ استری ہوش کھو چکی ہے

للہ- (دوڑتی ہوئی) جو راز تھا فاش ہو چکا ہے

یہ بات بھی عام ہو چکی ہے

ساس- ارے میاں دوڑیو پکڑیو

للہ (دوڑتے ہوئے) تو اب کسی کا ہو پاس کیسا

بدن پہ ہو اب لباس کیسا
جو راز تھا فاش ہو چکا ہے
ماسی۔ یہ بات اب عام ہو چکی ہے
گھر کی خادمہ۔ یہ بات اب عام ہو چکی ہے
شوہر ارے میاں دوڑیو پکڑیو
یہ استری ہوش کھو چکی ہے
لوگ جناب اب شام ہو چکی ہے
جناب اب شام ہو چکی ہے
شوہر۔ یہ بات بھی عام ہو چکی ہے
جناب اب شام ہو چکی ہے (آہستہ آہستہ فیڈ آؤٹ)

(دوسرا منظر)

(للہ بازاروں میں ننگے بدن چل رہی ہے۔ لوگ دیکھ رہے ہیں) ——

۱۔ گماں یہ ہوتا ہے فرش پر عرش سے کوئی حور آگئی ہے
۲۔ وہ جس کے جلووں کا منتظر تھا جہانِ مجبور آگئی ہے
۳۔ یہ حسن، یہ شانِ خود نمائی
۴۔ یہ بے نیازی یہ کج ادائی
۵۔ نہ جانے کیا اس کے من کو بھائی
۱۔ یہ چال جیسے زمردیں گھاٹیوں میں رقصِ غزالِ رعنا
۲۔ یہ برہنہ جسم جیسے ایوانِ صبح سے اٹھ رہا ہو شعلہ
۳۔ یہ قامتِ دل نشیں یہ روئے سحر نشاں یہ جمالِ زیبا
۴۔ یہ ماہ رُو کون ہے محبو!
۵۔ یہ شعلہ خو کون ہے محبو!
۶۔ یہ حیلہ جو کون ہے محبو!
۱۔ یہ کاکلیں جیسے پُرفشاں ہوں فضا میں ایمن کی شوخ تانیں
۲۔ سنہری ابرو کہ جیسے لہروں کی لہلہاتی ہوئی کمانیں
۳۔ یہ لانبی پلکیں کہ جن کی دستک پہ تھرتھرانے لگیں چٹانیں
۴۔ یہ کون عذرائے خود شکن ہے
۵۔ یہ کون لیلائے بے وطن ہے
۶۔ یہ کون سلمائے سیم تن ہے

۱- گماں یہ ہوتا ہے نو عروسِ ارم ہے یا لُعبتِ چمن ہے
مگر ہمیں اس قدر خبر ہے کہ یہ کوئی دُخترِ برہمن ہے
جو اپنے شوہر سے روٹھ کر بے نیازِ تن پوش و پیرہن ہے
۲
۱- یہ کافرہ ہے کہ مومنہ ہے؟
۲- یہ مشرکہ ہے کہ مسلمہ ہے؟
۳- نہیں نہیں ۔ للہ ۔ عارفہ ہے!
۱ جبیں پہ لمحاتِ آفرینش کی نرم کرنیں جھلک رہی ہیں
۲ نظر نظر میں ہزار لب دوختہ امیدیں سسک رہی ہیں
۳ رُخِ گرامی پہ جلتوں کی تجلیاں سی لپک رہی ہیں
۴- یہ کون شہزادۂ محترم ہے؟
۵- یہ کون بانوئے ذی حشم ہے؟
۶- یہ کون سلطانۂ ارم ہے؟
۱- اثر طرازانِ اجتہاد و بلاکشانِ غمِ محبت
۲- یہی کبوتر دمانِ عالم یہی ہیں کیکانِ بزمِ اُلفت
یہی ہیں مجلس فروزِ دنیا یہی ہیں وارستگانِ جنت
۳- اگر کبھی کفش پا اُلٹ دیں
نقابِ رنگِ ہوا اُلٹ دیں
۴- بساطِ ارض و سما اُلٹ دیں

۱- یہ زردیاں رُخ پہ زعفراں کی	یہ حیرتیں چشمِ ارجواں کی
علامتیں شوقِ جاوداں کی	نشانیاں ذوقِ بیکراں کی
سرورِ بے انتہا کی لہریں	یہ دھڑکنیں قلبِ ناتواں کی

۲- یہ حیرتیں بھی ہیں دان اُس کا
یہ جان اس کی جہان اُس کا
یہ دست رکھتے ہیں مان اس کا

۱- جبیں پہ انوارِ معرفت ہیں	نگاہ میں رازِ بیش و کم ہیں
مسرتیں ان کے ہم عناں ہیں	مشیتیں ان کے ہم قدم ہیں
یہ مست و مجذوب لوگ ہیں	آبروئے بُت خانہ و حرم ہیں

۲- نہ مَے نہ برفاب کے تقاضے
نہ اسپ و اسباب کے تقاضے
نہ رخت و کمخواب کے تقاضے

ہفت روزہ "نصرت" لاہور

(للہ کی آواز گونجتی ہے)

للہ۔ دیارِ ظلمت کے رہنے والو مجھے بتاؤ، مجھے دکھاؤ
اگر یہاں کوئی رخت گر ہو اسے بلاؤ ابھی بلاؤ
دیارِ وحشت کے رہنے والو
جہانِ ظلمت کے رہنے والو

۱۔ یہ مست و مجذوب لوگ ہیں سب کے سب ریاکاریوں کے پتلے
۲۔ یہ سر بسر برہنہ بدن بے نور ہیں مکاریوں کے پتلے
۳۔ یہ زرد رو نیک نام بندے
یہ پاک۔ عالی مقام بندے

للہ۔ اگر یہاں کوئی رخت گر ہے تو پھر بتاؤ کہ وہ کدھر ہے
مجھے دکھاؤ اگر کوئی شہر بھر میں خیاطِ باہنر ہے
جو آج رختِ حریر سی دے
جو پوششِ بے نظیر ہی دے

۱ یہ بے ریا، بے خبر، یہ صحرا نورد، یہ مستِ حال توبہ
۲۔ یہ سب ہیں گرگانِ باراں دیدہ یہ نیک و عالی خصال توبہ
۳۔ الٰہی یہ بے نیاز بندے
یہ ان کی چالیں یہ ان کے پھندے

للہ کہو! اگر کوئی رخت گر ہے کہ وقت تاخیر کا نہیں ہے
یہ ساعتِ پیش و پس نہیں ہے یہ لمحہ تعذیر کا نہیں ہے
گھڑی یہ تلقین کی نہیں ہے
گھڑی یہ نفرین کی نہیں ہے

(للہ دوڑتی ہوئی پھر رک کر آواز دیتی ہے)

کوئی گلیم سیہ ہی لا دو کوئی ردائے زبوں ہی لا دو
خدارا اک پیرہن سلا دو خدارا اک پیرہن سلا دو

۱۔ یہ ماجرا کیا ہے بات کیا ہے؟
یہ حاجتِ پارچات کیا ہے؟
۲۔ یہ خود نمائی کا آج اتنا جنون یہ ذوقِ جمال کیسا؟
۳۔ یہ آج اک پیرہن کی خاطر ہے عارفہ کا سوال کیسا؟
۴۔ یہ کوششیں آج کس لیے ہیں؟
یہ پوششیں آج کس لیے ہیں؟

للہ: مجال شرح بیاں جو ہو بھی تو درد کچھ داستاں نہیں ہے
یہ داستاں بھی سنا ہی دیتے مگر کوئی رازداں نہیں ہے
یہاں کوئی مہرباں نہیں ہے
یہاں کوئی ہم زباں نہیں ہے
(للہ دوڑتی ہے)

۱- وہ دوڑتی جا رہی ہے جیسے لپک رہے ہوں زبوں بگولے
بپھر بپھر کر مچلا رہی ہوں قیامتیں زلزلوں کے جھولے

۲- نہ جانے یہ جلد بازیاں کیوں
یہ آج پردہ نوازیاں کیوں

للہ- کوئی لبادہ کوئی دوپٹہ — کوئی سرا دیل چاک شدہ
کوئی سی چادر کوئی سا چولا — کوئی سر انداز پاک شدہ
(للہ دوڑنے لگتی ہے)

للہ- کوئی یہاں ہے جو آشنائے رموز و اسرار دردِ ختن ہے
کہ آج للہ کو آرزو ہے لباس ہے شوقِ پیرہن ہے

مرک کر- یہ ہر طرف قیل و قال کیا ہے؟
نظر نظر میں سوال کیا ہے؟

عورت- یہ عارفہ اہلِ شہر کے دل کی بات شاید سمجھ گئی ہے
سمجھ گئی ہے تو شہرِ خوباں کے بام و در سے الجھ رہی ہے

للہ: نہیں نہیں جاہلوں کی ہر بات کا نہ دوں گی جواب، جاؤ
کوئی قبا کوئی رختِ ناشوب لاؤ، للہ شتاب لاؤ

عورت: یہ بات کیا ہے یہ راز کیا ہے
یہ عالم سوز و ساز کیا ہے

للہ- اگر درندوں کے ایسے رمنے میں روز عریاں بدن پھروں گی
مگر غلط ہے کہ آج اس حال میں کسی مرد سے ملوں گی

عورت- تو کیا یہ سب لوگ جانور ہیں
تو پھر جہاں میں کہاں بشر ہیں

دوسری-

للہ- ہوس پرستو! اگر تمھیں یہ گماں ہوتا ہے کہ تم ہو انساں
تو آج للہ سے یہ بھی سن لو کہ تم ہو روزِ ازل سے حیواں
روا نہیں جانور سے پردا
روا ہے لیکن بشر سے پردا

مرد — بہک رہی ہے یہ پنڈتانی
عورت — بُرا نہ مانو کہ ہے دوانی
مرد — نہیں نہیں یہ تو ہے سیانی
عورت — یہ مست و مجذوب ہے نمانی
مرد — چلو تمہاری ہی بات مانی
ملّا — ہوس پرستو اگر تمھیں یہ گماں ہوا ہے کہ تم ہو انساں
تو آج ملّا سے یہ بھی سن لو کہ تم ہو روزِ ازل سے حیواں
بجا کہ انساں سے ہو پردا
نہ یہ کہ حیواں سے ہو پردا
چلتی ہے . . . . . .

مرد — یہ بحث پہ آج تل گئی ہے
دوسرا مرد — زباں بھی آج کھل گئی ہے
ملّا — میں آج توہینِ آدمیت کروں تو کیسے کروں گوارا
کوئی لبادہ خدارا کوئی ردا کوئی اوڑھنی خدارا
کہ ایک انساں آرہا ہے
وہ مردِ ذیشان آرہا ہے
(دوڑتی ہے)
وہ مرا مہمان آرہا ہے
وہ اک مسلمان آرہا ہے
وہ ایک انسان آرہا ہے
وہ میرا مہمان آرہا ہے
وہ مردِ ذیشان آرہا ہے
وہ اک مسلمان آ . . . رہا ہے . . . .
(آہستہ آہستہ فیڈ آؤٹ)

تیسرا منظر

(قلندروں کی ہا و ہو سے مستانہ گھنگھرو والے ڈنڈے اور عالم رقص کے اشارے)
دم اللہ صمد
دم صابرؒ ولی
دم اللہ صمد

دم صابر ولی
دم اللہ صمد
دم اللہ صمد
دم صابرؒ ولی
علی علی علی
علی علی علی
میراںؒ موج کا دریا
کھولے رحم کی گلی
میراںؒ موج کا دریا
کھولے رحم کی گلی
میراںؒ موج کا دریا
کھولے رحم کی گلی
علی علی علی
علی علی علی
دم اللہ صمد
دم صابرؒ ولی
دم صابر ولی
علی علی علی
دم اللہ صمد
دم اللہ صمد
دم صابر ولی
علی علی علی ۔ (آہستہ آہستہ فیڈ آوٹ)

راوی ۔
سیدالسادات سالارِعجم
دستِ اُو معمارِ تقدیرِ امم
مرشدِ آں خطۂ مینو نظیر
میر و درویش و سلاطیں را مشیر
خطہ را آں شاہِ دریا آستیں
داد علم و صنعت و تہذیب و دیں
آفرید آں مرد ، ایرانِ صغیر

بامنزہائے عجیب و دلپذیر

(قدموں کی آواز)

شاہ ہمدانؒ۔	یہ چٹانوں میں جھلکتے ہوئے سیمیں جھرنے موج صد رنگ دکھاتی ہے کرشمے کیا کیا آج تو جسم کی دیوار کھلی جاتی ہے دامن دشت میں لہراتے ہیں چشمے کیا کیا

(قدموں کی آواز)

شاہ ہمدان:۔	اللہ اللہ! یہ فردوس یہ گلزار یہ باغ یہ شجر شہر طلسمات کی دیواریں ہیں اور دیواروں پہ مرغانِ خوش الحان جن کے پر زمرد کے ہیں پکھراج کی منقاریں ہیں

(قدموں کی آواز)

چار سُو پھرتے ہوئے آ ہوئے زیبندہ خرام
ناز فرما کہیں صحرا میں نسیم نو کار
چشم بینا کے لیے کیا نہیں اس وادی میں
شاہد و شمع و شراب و چمن و چنگ و چنار

(چلنے کی آواز)

راوی۔	شہر نزدیک ہے سرکار سیر آثار و صنا دید تو کر لینے دو التجا کرتی ہیں رہ رہ کے طلائی کرنیں ختم آرائش خورشید تو کر لینے دو

چلنے کے اثنا سے

شاہ ہمدان	ہم فقیروں کے لیے دشت بھی آبادی ہے ہاں مگر یہ تو کہو شہر میں انسان بھی ہیں کون اس مملکت خلد کی شہزادی ہے
مرید۔	سید پاک! سنا ہے کوئی سلطان ہے یہاں یہ سماں رونق فردوس کو شرماتا ہے شہر تو خوب ہے پر یہ بھی بتاؤ نا ہمیں کوئی ان گلیوں میں انسان بھی نظر آتا ہے

(لَد کی آواز گونجتی ہے)

وہ ایک انسان آگیا ہے
وہ مردِ ذیشان آگیا ہے
وہ اک مسلمان آگیا ہے
وہ میرا مہمان آگیا ہے
مجھے خدا کے لیے قبا دو
کوئی قبا دو
کوئی ردا دو
مجھے چھپا لو
کوئی ردا دو
تنور پر سے طبق ہٹا دو
تنور سے یہ طبق اٹھا دو
طبق اٹھا دو
مجھے چھپا لو
مجھے بچا لو
مجھے چھپا لو

غزل سرا

مل گئی قیدِ شبِ غم سے نجات آخر کار
ڈھل گئی ہم نفسو! ہجر کی رات آخر کار

سینۂ آئینۂ صاحب نظراں ہے یارو
صاف آتا ہے نظر جلوۂ ذات آخر کار

اپنا گلزارِ تمنا بھی پھلا پھولا ہے
دی گئی ہم کو بھی یہ تازہ برات آخر کار

آج زندانِ جہاں بھی ہے طرب زارِ وفا
بن گئی ان سے ملاقات کی بات آخر کار

صلۂ بندگیٔ پیرِ مغاں ہے طاہر
اس کے قدموں سے ملی یہ نجات آخر کار

(غزل کے فیڈ ہوتے ہی قدموں کی چاپ اور مختلف آوازیں ابھرتی ہیں)

اسے نکالو
اسے بچا لو

ہفت روزہ نصرت لاہور

اسے نکالو
تنور پر سے طبق ہٹا دو
طبق اٹھا لو
اسے نکالو
اسے بچا لو
یہ آگ جیسے بھی ہو بجھاؤ
اسے بچاؤ
خدا را آؤ
خدا را جاؤ
وہ کوئی درویش آ رہا ہے
اسے بلاؤ
اسے بلاؤ۔ اسے بلاؤ

شاہ ہمدانؒ۔ ستم پرستو، ہماری بیٹی کو اک ردا بھی نہ دے سکے تم
ہماری بانو کو اک اتاری ہوئی قبا بھی نہ دے سکے تم
یہ کون کہتا ہے تم بشر ہو
کہ تم درندے ہو جانور ہو

لوگ۔ حضور اب لطف کی نظر ہو حضور اب لطف کی نظر ہو

شاہ ہمدان۔ ذلیل بندو! ہماری بانو کی التجا تم نے آج رد کی
ہوس پرستو! ستم کی حد کی، جفا شعار و ستم کی حد کی

لوگ حضور اب شرمسار ہیں ہم
حضور اب شرمسار ہیں ہم

شاہ ہمدان۔ ستم گرو! اک ردا کے دینے میں تم نے کیا کیا نہ حجتیں کیں
ہماری للہ کو آج دن بھر نہ تم نے کیا کیا اذیتیں دیں

لوگ حضور خدمت گذار ہیں ہم
جناب خدمت گذار ہیں ہم

شاہ ہمدان۔ تمہاری خدمت گذاریاں تھیں وہ آج سب ہم نے آزما لیں
ہماری نورِ نظر نے کیا کیا نہ شہر میں آہ و زاریاں کیں

لوگ۔ حضور ہم سب کے سب ہیں نادم
جناب ہم سب کے سب ہیں خادم

شاہ ہمدان۔ طبق ہٹا دو! کہ اپنی بانو کو اپنی چادر اُتار دیں ہم
طبق اٹھا دو کہ اپنی بچی کو پوشش زرنگار دیں ہم

لوگ۔ کرم کے امیدوار ہیں ہم
کرم کے امیدوار ہیں ہم

شاہ ہمدان (دلاسے) یہ لو ہماری ردا بہن لو کہ آگ تو ہے حرام تم پر
خدا کی رحمت مدام تم پر، عزیز بیٹی سلام تم پر
میں کرچہ خیام بے ہنر ہوں
میں اپنی بچی کا رخت گر ہوں
میں
اپنی بیٹی کا
رخت گر ہوں
میں اپنی بچی کا رخت گر ہوں
میں اپنی . . . . . . (آہستہ آہستہ فیڈ آوٹ)

قیوم نظر

وادئ کشمیر

آج پھر وادئ کشمیر ترے کوہ و دمن
اپنی صد گونہ بہاروں کی روایات لیے
مجھے دیوانہ بنا دینے کو یاد آتے ہیں
ہر طرف سلسلۂ آبِ رواں سے پیدا
آبشاریں — کہیں گرتی ہوئی خاموشی سے
کہیں اک شورِ مسلسل کو لیے غاروں میں
جھاگ اڑاتی ہیں اور اُس جھاگ کی رعنائی میں
یوں چھپ جاتی ہیں خود جیسے کوئی چیز نہ ہوں

دودھیا چشمے — ستاروں سے زیادہ شاید
بہتے دریاؤں کی عظمت کے خزانوں کے امیں
کہنگی سے بھی پرانے — مگر ایسے تازہ
ابنِ آدم کے لیے حسنِ دو عالم جیسے
اُن کے شاداب کناروں پہ کبھی شعلے رواں
منعقد انجمن ناز کبھی جشنِ بہار
شبِ مہتاب، ہوا مدھ بھری، ساقی نوریں
اور اک بہتے ہوئے سیم گوں نغمے کا فسوں

"چوڑیاں مُرک گئیں، چھوڑ دو موری بیاں"

پھر وہ نتھری ہوئی جھیلیں وہ بسیط آئینے
جن پہ رقصاں ہیں ادا دوست ہوا کے بل پہ
برف کے تودوں کی صورت میں کئی جل پریاں
جن سے کترا کے گزر جاتی ہے بھیڑوں کی قطار
کسی رہ گیر کے سایے سے جو اکثر ڈر کر
اپنے چرواہوں کے پہلو میں سمٹ جاتی ہیں
کہ وہی اُن کے جواں خوابوں کی تعبیریں ہیں

پھر چناروں کے حسیں طائفے — اُن کے چھتے
دھوپ کو راستے میں روکنے کو تنتے ہوئے
جن سے چمن چمن کے شعاعوں کا دمکتا ہوا حسن
گل بدن خاک پہ یوں اُترے بکھر جانے کو
جس طرح برف زمستاں میں گرا کرتی ہے

اور وہ پھیلی ہوئی سیڑھیاں وہ دھان کے کھیت

جن میں صدیوں سے تنومند جفاکش دہقاں
شام تک کام کیے جانے کی دھن میں کھو کر
گنگناتے ہیں کہ احساس کی تلخی نہ بڑھے
ان کے گیتوں میں زمانے کی شکایت نہ کہیں
اپنے بے گانوں کی بے مہری کے افسانے ہیں
اُن کو معلوم نہیں اُن کے نگہباں کیسے
شہد سے سیبوں کی، شفتالوؤں کی دولت کو
اُن کی بھرپور جوانی سے سوا کرتے ہیں
جس سے کچھ بکھری چٹانوں کے نہاں خانوں میں
اک لپکتا ہوا شعلہ سا بھڑک اٹھتا ہے
آج بھی وادیٔ کشمیر ترے کوہ و دمن
ایسے ہی شعلوں کی قسمت کو ہم آغوش کیے
دیکھتے ہیں تری لٹتی ہوئی شادابی کو

جانے کیا تیرے پرستاروں پہ گزری ہے جو یوں
نیل گوں آنکھیں ہیں پتھرائی ہوئی اور وہ لب
جن پہ جھرنوں سے رواں نغمے رہا کرتے تھے
گنگ ہیں، اور وہ فنکاروں کے ٹھٹھرے ہوئے ہاتھ
سوکھی لکڑی کی طرح ٹوٹ چکے ہیں شاید —
تری ناموس پہ اس مرتبہ لاکھوں بے بس
مٹ گئے، کچھ ترے کھیتوں سے لپٹ رہنے کو
کچھ ترے رستوں میں نقشِ کفِ پا کی صورت
اس قدر روندے گئے گویا کبھی تھے ہی نہیں
کچھ تری برف کو گل رنگ بنا کر چپ چاپ
کھو گئے یوں کہ نہ اب کوئی انہیں پائے گا

زیست کے حادثوں نے وادیٔ کشمیر مگر
تیرے لاکھوں ہی جواں بچوں کو محروم رکھا
تیرے دامن کی ہواؤں سے، تری جنت سے
اور وہ مدتوں میداں میں تری یادوں کو
اپنے سینوں سے لگاتے ہوئے بے چین پھرے
اُن کی رگ رگ میں ترا خون ترا جوہر تھا
آج بھی اُن کے خد و خال میں تیری دنیا
یوں جھلکتی ہے کہ تو زندہ و پائندہ ہے
اُن کی تدبیر ترے درد سے بیگانہ نہیں
وقت آیا ہے کہ اب تیرے پریشاں فرزند
تیری آغوش میں جینے کا سہارا لے کر
تیری آزادی کا سامان بنیں، تجھ سے ملیں
اور وہ بہتے ہوئے گیت، وہ شیریں نغمے
جن کو خاموش کیا آہنی آوازوں نے
پھر ترے خون میں نہاتے ہوئے کھیتوں سے اٹھیں

قیوم نظر

جہلم کا بہتا پانی

(ایک گیت)

یہ جہلم، یہ میرا دریا مجھ کو ہنس ہنس تکتا ہے
اس کو مجھ سے، مجھ کو اس سے کون جدا کر سکتا ہے
کتنا خوش ہوتا ہے دکھا کر مجھ کو اپنی جولانی
جہلم کا بہتا پانی

اس کی وادی، جھیلیں، چشمے، مجھ کو جان سے پیارے ہیں
اس کے چھیلے کنارے اپنے ہاتھوں میں نے سنوارے ہیں
میری رگ رگ میں دوڑ آتا ہے مستی آن جانی
جہلم کا بہتا پانی

اس کی لگن میں میں نے ریت کے ہر بندھن کو توڑا ہے
میرے لیے اس نے میدانوں سے بھی ناتا جوڑا ہے
میری کہانی دنیا سے کہتا ہے اپنی زبانی
جہلم کا بہتا پانی

عظیم قریشی

السّلام اَے خوابوں کے گلشن سلام

سرزمینِ پاک کا دِل تُو، نہیں اس میں کلام
تجھ سے میری رُوح میں مضمر ہے اک عشقِ مدام
تیرے ہر گوشے سے پہنچا مجھ کو اُلفت کا پیام
السّلام اَے خوابوں کے گلشن سلام

نقشِ خالق کی جہاں میں جاوداں تصویر تُو
تو تخیل کا کھلونا، گلفشاں تنویر تُو
ہے نشیمن بھی ہمارا، نورِ جاں کشمیر تُو
السّلام اَے خوابوں کے گلشن سلام

وادیٔ کشمیر تُو آ، تو ذرا میرے قریں
تیرے پہلو میں غنیؒ و شاہِ ہمدانؒ جاگزیں
تو جمیل و روح پرور، تجھ سا گُل کوئی نہیں
السّلام اَے خوابوں کے گلشن سلام!

انور افسری

کشمیر

"میرا دیس، مری وادی ہے"

نقشۂ نقشۂ رشکِ جنت، دلکش دلکش منظرِ قدرت
شہرِ نگاراں خلدِ بہاراں، ذرّہ ذرّہ چاند کی صورت
اس بستی پر ہے دل و جاں قرباں ہر نیرنگیٔ فطرت
نیل گگن کی آنکھ کا تارا، اور دھرتی کی شہزادی ہے
اس کی یادوں کی خوشبو نے دل کی دنیا مہکا دی ہے

میرا دیس، مری وادی ہے

اے ہمراہو! اے ہمسفرو! بڑھتے بڑھتے بڑھتے جاؤ
عزم و عمل کی بات نکالو، تیغ و سناں کا ذکر چلاؤ
محفل محفل شمع جلاؤ، گلشن گلشن پھول کھلاؤ
زنگ آلودہ تھی جو پہلے وہ شمشیر اب چمکا دی ہے
حاضر وقت کا لمحہ لمحہ جہدِ مسلسل کا ہادی ہے

میرا دیس، مری وادی ہے

ہم اپنا آرام لٹا کر دشمن کو بے خواب کریں گے
ہم ہی اپنا خون بہا کر یہ گلشن سیراب کریں گے
فرشِ زمیں کو عرش بنا کر ذرّوں کو مہتاب کریں گے
تابشِ عزم و عمل جب ہم نے بستی بستی پھیلا دی ہے
اے خورشیدِ منور! تیری پہلی کرن بھی شرما دی ہے

میرا دیس، مری وادی ہے

صہبا اختر

سناؤ.....

سناؤ چناری کے اس پار سے آنے والی ہواؤ
چناروں کے سائے میں بے خواب آنکھیں تھکی تو نہیں ہیں
ڈلر کی پریشان و بیتاب آنکھیں تھکی تو نہیں ہیں
کہو کچھ کہو! اس شفق زار سے آنے والی گھٹاؤ

کہو! نوحۂ غم کا آہنگ بدلا کہ اب تک وہی ہے
کہو! پا بہ زنجیر و محبوس و معتوب کس حال میں ہیں
کہو میری محبوب وادی کے محبوب کس حال میں ہیں
کہو! سرخ دریاؤں کا رنگ بدلا کہ اب تک وہی ہے

کہو کیا ستمگر ابھی تک وہ زنجیریں پہنا رہے ہیں
وہی داغ در داغ صبحوں کے چہروں کی گہری خراشیں
ہوسناک ہاتھوں کی معصوم جسموں پہ خونیں خراشیں
کہو مہ جبینوں کے ماتھوں کے چاند اب بھی گہنا رہے ہیں

کہو کچھ کہو اتنی چپ چاپ سی اتنی خاموش کیوں ہو
ہوا! یا یہ بارش یہ اشکوں کی بارش میں ہر بات سمجھا
میں ہر عالمِ باد و بارانِ طوفانِ ظلمات سمجھا
مگر میری نادانیاں پوچھتی ہیں سیہ پوش کیوں ہو

حبیب کیفی

اُمیدِ سحر

مسرتوں کی ہوائیں کبھی تو آئیں گی
مرے وطن پہ طرب کی گھٹائیں چھائیں گی
ٹھہر سکا نہ اگر کاروانِ عیش و نشاط
غم و الم کی یہ گھڑیاں بھی بیت جائیں گی
بہار آتے ہی گلشن کا رنگ نکھرے گا
مہک اٹھے گی فضا، کلیاں مسکرائیں گی
طلوعِ صبح تو ہولے بہار کی پریاں
گھنے چنار کے سائے میں گیت گائیں گی
گذشتہ دور کی تلخی کی یاد تک نہ رہے
خوشی کے ساز پہ تانیں نئی اڑائیں گی
نہیں حقیر نہیں جرأتیں ضعیفوں کی
خدا نے چاہا تو اک روز رنگ لائیں گی

خطِ تقدیر کہاں ہے ساقی!

میرے سینہ میں جو پیوست سناں ہے ساقی
ایک بدعہد کے ظلموں کا نشاں ہے ساقی
قافلہ ظلم کے ماروں کا رواں ہے ساقی
پیکرِ جوش ہر اک پیر و جواں ہے ساقی
آج چہروں پہ شجاعت کا نشاں ہے ساقی
اور بدلا ہوا اندازِ بیاں ہے ساقی
عزمِ آزادیٔ کشمیر مبارک جس سے
آج رگ رگ میں رواں برقِ طپاں ہے ساقی
سامنے کوہ بھی آئے تو کہاں رُکتے ہیں،
حوصلہ پختہ ہے اور عزم جواں ہے ساقی
بزمِ اقوام ہی اک درد کا درماں ہوگی؟
اب بھی پہلا سا وہی تجھ کو گماں ہے ساقی
مکر کے ہاتھ کا کھینچا ہوا بیہودہ سا!
ایک خط ہے! خطِ تقدیر کہاں ہے ساقی؟
پنجۂ ظلم سے محفوظ نہیں ہے کوئی
جوئے خوں سینۂ جنت سے رواں ہے ساقی
اپنے احساس کا کب تک میں گلا گھونٹوں گا
اُٹھ بھی! لا دے! مری شمشیر کہاں ہے ساقی

محمد منور

اہلِ خلدؒ کی قسمت

میرے ہیں ایک یارِ گرامی، حرب ہیں وہ
اس دَور میں ہیں ایسے مسلمان خال خال!

اصنامِ رنگ و خون و وطن سے ہیں وہ نفور!
دیوانۂ صہیبؓ ہیں، پروانۂ بلالؓ!

عشقِ رسولؐ ان کے لیے محورِ حیات!
مُنتہائے شوق اُن کا یہی ہے یہی مآل!

خود گھوم پھر کے دیکھ چکے ہیں کئی بلاد!
مقصود جاننا رہا اسلامیوں کا حال

آئینۂ خطوط میں تکتے ہیں روز و شب!
فلپین، استریلیا، یابان، پُرتگال

تعلیم کے بہانے یہاں بھی کیا قیام
مہمانِ ارضِ پاک رہے وہ اڑھائی سال

یاں سے گئے وہ آگرہ، دلّی کی سیر پر
کشمیر کا بھی دیکھ لیا گلشنِ جمال

آکر کہا کہ ہند میں ہندو نے کر دیا
لادینیت کی آڑ میں مسلم کو پائمال

پوچھا جو مَیں نے خطۂ کشمیر کا مزاج
کہنے لگے کہ سخت تریں ہے یہی سوال

اجمال سے کروں گا مگر میں جواب عرض
کشمیر ہے زمین پہ فردوس کی مثال

خوابیدہ ہیں تحیر سے تو رقصاں ہیں ندیاں
سبزہ، سمن، ثمار ہیں تخلیق کا کمال

اس خلد کے مگر ہے مکینوں کا حال بد
ہیں کشتۂ فلاکت و زندانی و وبال

پھر ہاتھ اٹھائے اور ہوئے گویا بہ چشمِ نم
"فرماں سے تیرے کوئی گریزاں ہو کیا مجال

گر اہلِ خلد کی یہی قسمت وہاں بھی ہے
گزرا میں ذوقِ خلد سے اَے ربِّ ذوالجلال"

حفیظ ہوشیارپوری

فارسی شاعری میں کشمیر

(ایک انتخاب)

اس انتخاب میں ان باتوں کا خیال رکھا گیا ہے (۱) گیارھویں صدی عیسوی سے موجودہ زمانے تک جتنے اشعار ملے ہیں جمع کر دیئے گئے ہیں۔ (۲) اشعار کے انتخاب میں ہر صنفِ سخن کا خیال رکھا گیا ہے۔ اس میں رباعیاں بھی ہیں، غزل اور مثنوی کے اشعار بھی۔ (۳) اشعار کو شعراء کے زمانے کے اعتبار سے تاریخ وار ترتیب دیا ہے۔ جہاں کہیں شاعر کی صحیح تاریخ وفات معلوم نہیں وہاں زمانے کے اندازے سے صحیح مقام پر اشعار درج کر دیئے گئے ہیں۔ (۴) ہر شاعر کے کم سے کم شعر دیئے گئے ہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ شعراء اس محفل میں شامل ہو سکیں۔ (۵) کشمیر کی تعریف میں بھی اشعار ہیں اور ایسے اشعار بھی ہیں جن میں کشمیر کا لفظ استعارے یا تشبیہ کے طور پر آیا ہے۔ (۶) کشمیری پنڈتوں کا کلام بھی شامل ہے۔

---

(۱)

فرخی سیستانی

(وفات ۱۰۳۷ء)

مارا رہِ کشمیر ہمی آرزو آید — ماز آرزوئی خویش تنابیم بیک موی
گاہ است کہ یکبارہ بہ کشمیر خرامیم — از دستِ بتاں پنبہ کنیم از سرِ بت گوی

(۲)

ضیاء الدین ہری

(عہدِ سلجوق)

گلبن حکایت از بتِ کشمیر میکند — سوسن نشان زلعبتِ فرخاری دہد

(۳)

امیر معزی

(وفات ۱۱۴۷ء)

بلند قامتِ ایشاں چو سرو در کشمیر — بدیع صورتِ ایشاں چو نقش در کشمیر

(۴)

سعدی شیرازی

(۱۱۷۵ - ۱۲۹۲ء)

ندانم از چہ گِل است آں نگارِ یغمائی — کہ خط کشیدہ در اوصافِ نیکوانِ چگل

بدیں کمال ندارند حسن در کشمیر — چنیں بلیغ ندانند سحر در بابل

(۵) حافظ شیرازی

(وفات ۱۳۸۹ء)

بشعر حافظ شیراز می گویند و می رقصند — سیہ چشمان کشمیری و ترکان سمرقندی

(۶) یوسف شاہ چک

(عہدِ حکومت: ۱۵۷۹-۱۵۸۶ء)

بر یادِ دو زلف بُت کشمیر نژادی — شد تارؔ سر و مارسر از گریہ دو چشم

(۷) محمد امین مستغنی

(عہدِ یوسف شاہ)

دوشینہ بچشم دل نہاں از مردم — دیدم نہ بہشت بلکہ کشمیر دوم
خاکی ز عبیر و مشک آگندہ خمیر — آبی ز صفا درو خودِ خود یافتہ گم

(۸) عرفی

(وفات ۱۵۹۱ء)

ہر سوختہ جانی کہ بہ کشمیر در آید — گر مرغ کباب است کہ با بال و پر آید

(۹) فیضی

(۱۵۴۷ - ۱۵۹۵ء)

ہزار قافلۂ شوق میکند شبگیر — کہ بارِ عیش کشاید بہ عرصۂ کشمیر

(۱۰) ظہوری

(وفات ۱۶۱۷ء)

بشکّر دہانانِ ہندی نسب — برعنا ملیحانِ برّ عرب
بترکانِ غارت گرِ صبر و ہوش — بکشمیریانِ صباحت فروش

(۱۱) طالب آملی

(وفات ۱۶۲۵ء)

فیض پیالہ بخشد آب و ہوائی کشمیر — از خشتِ خم نہادند گویا بنائی کشمیر
کشمیر می ستانم از حق بجائی جنت — اما نمی ستانم جنت بجائی کشمیر

(۱۲) حاجی محمد جان قدسی

(وفات ۱۶۴۵ء)

خوشا کشمیر و خاکِ پاکِ کشمیر — کہ سر بر زد بہشت از خاکِ کشمیر

لہ تارؔ سرادر مارسر کشمیر کی دو جھیلوں کے نام ہیں۔

چو کشمیر آبروئے ہفت کشور — نگاہ از دیدنِ اُو تازہ و تر

(۱۳) محمد قلی سلیم

(وفات ۱۶۴۷ء)

ہمانا کافر است این کوہِ خونخوار — کہ دارد بر کمر از راہ زُنّار
بسامان رفتنِ این راہ زشت است — مجرد شو کہ این راہ بہشت است

(۱۴) ابوطالب کلیم

(۱۶۱۹ - ۱۶۵۱ء)

شمیم خلد گدائی بہارِ کشمیر است — شگفتگی گل خارِ دیارِ کشمیر است
اگرچہ مایۂ دلبستگی است قامتِ سرو — عنانِ ہوش بدستِ چنارِ کشمیر است

(۱۵) نامعلوم

صبح در باغِ نشاط و شام در باغ نسیم — شالامار و لالہ زار و سیرِ کشمیر است و بس

(۱۶) طغرا مشہدی

کشمیر بود فصلِ خزاں عالمِ نور — پیداست فیض دیدنش ہست ضرور
گوئی کہ درین باغ چمن سازِ قضا — آوردہ نہال شعلہ از خرمنِ طور

(۱۷) ظفر خاں احسن

(وفات ۱۶۶۲ء)

ز سیرِ گل دل و جاں تازہ گردد — بساغر عہد و پیماں تازہ گردد
گلستاں زیرِ آبش بے شمار است — مگر آتش نقابِ نوبہار است

(۱۸) غنی کاشمیری

(وفات ۱۶۶۸ء)

کشمیر از صباحت روشن گر جمال است — حسنِ سیاہ آنجا گر ہست خال خال است

(۱۹) محسن فانی

(۱۶۱۵ — ۱۶۷۱ء)

دانۂ سبحہ شود سبز بدستِ زاہد — گر بہ کشمیر چنیں آب و ہوا خواہد بود
ہر کہ ہست از اہلِ دیں گیرد ز دنیا گوشۂ — من ہم از عالم گرفتم گوشۂ کشمیر را

(۲۰) نواب عاقل خاں

(وفات ۱۶۹۵ء)

بی رنج محال است بفردوس رسیدن — ہمواری رہ گلشنِ کشمیر ندارد

(۲۱) شاہ صادق قلندر

رُخِ تو کشورِ حُسن از خطِ بہار گرفت — فضائے گلشنِ کشمیر را بہار گرفت

(۲۲) جویا تبریزی کشمیری

تعالی اللہ زہی گلزار کشمیر — کہ در وی غنچہ ای ہم نیست دلگیر
دریں گلشن کہ باد آباد جا دید — لطافت را مجسم میتوان دید

(۲۳) حاجی محمد اسلم سالم

(وفات ۱۷۰۱ء)

دلم بہ سایۂ گل می کشد چو گل سالم — سرشتہ اند بہ آب و ہوای کشمیرم

(۲۴) پنڈت دیا رام کاچرو (خوشدل)

(وفات ۱۸۱۴ء)

الٰہی غنچۂ امید بکشای — بہار گلشن کشمیر بنمای
بخنداں چوں لب غنچہ دل تنگ — کہ گویم شکر احسانت بصد رنگ

(۲۵) محمد حسن شعری

(۱۸۰۸ - ۱۸۸۰ء)

بسکہ رنگیں بہار کشمیر است — سوزن لعل خار کشمیر است
از سواد بیاض دیدۂ حور — رنگ نیل و نہار کشمیر است

(۲۶) پنڈت ستہ کول تہار

(۱۸۰۰ - ۱۸۸۴ء)

خوشا کشمیر و آب خوشگوارش — خوشا گلزار و سیر سبزہ زارش
ز کوثر آب بردہ چشمہ سارش — کہ طوبیٰ سایہ پرور در چنارش

(۲۷) پنڈت دامودر رسل سعادت

(۱۸۴۷ - ۱۸۸۶ء)

خوشا سال نو دخل کردہ بکشور — ہوای زمستاں بروں شد ز کشمر
ترانہ بہر کو و ترکانہ ہر سو — کف دف زناں گشتہ مردم بہر در

(۲۸) پنڈت سہج رام خازن

(۱۸۲۵ - ۱۸۸۸ء)

بہشت است کشمیر فرحت فزای — ز آب و ہوای چنیں دلکشای
بہارش گل گلستاں آورد — خزاں خندۂ زعفراں آورد

(۲۹) کنھیا لال ہندی

(۱۸۲۹ - ۱۸۹۰ء)

چہ کشمیر گلزار خلد بریں — چہ کشمیر جنت بروئے زمیں
چنیں ملک سرسبز و عنبر سرشت — کہ ثانی ندارد بغیر از بہشت

(۳۰) پنڈت راجہ کول دیری

(۱۸۲۹ - ۱۹۰۰ء)

جہاں شگفتہ ز رنگ بہارِ کشمیر است — نگار خانۂ چیں لالہ زارِ کشمیر است
سحر بباغ نشاطم نسیم صبح آورد — کہ آبروئی جہاں شالمارِ کشمیر است

(۳۱) پنڈت شام نرائن بکیتا

(وفات ۱۹۰۴ء)

لطفِ آبِ خوشگوارِ چشمۂ شاہی نگر — چشمۂ کوثر اگر خواہی کہ آید در نظر
داشتی گر خضر زآبِ جانفزائش آگہی — سوئی ایں چشمہ سکندر را گشتی راہبر

(۳۲) خواجہ عزیز لکھنوی

خوشا باغِ نشاط افزائی کشمیر — کہ می گردد جواں از دیدنش پیر
بیا مطرب کہ وقتِ انبساط است — نشاط انگیز شو باغ نشاط است

(۳۳) اقبال

نسم گلی ز خیابانِ جنتِ کشمیر — دل از حریم حجاز و نوا ز شیراز است

رخت بہ کاشمر کشا کوہ و تل و دمن نگر — سبزہ جہاں جہاں ببیں لالہ چمن چمن نگر
دخترکی برہمنی لالہ رخی سمن بری — چشم بروی او کشا باز بخویشتن نگر

(۳۴) فخر طباطبائی

(شاعرِ معاصرِ ایران)

در پای دلم نہاد ایرانِ صغیر — زنجیرِ محبت لقای کشمیر
آنجا کہ بہشتِ جاوداں پنہان است — در زیرِ گل و سبزہ و بستان و غدیر

ایک روایت

جو ہر دور میں زندہ و تابندہ رہی ہے

آج یہ روایت

ادبِ لطیف

کے

عدیم النظیر سالنامہ ۶۱ء

کے روپ میں جلوہ گر ہے

آج کا مفکّر ذہن — کس طرح سوچتا ہے — کیا سوچتا ہے؟

سالنامہ ادب لطیف میں ملاحظہ فرمائیے

زرِ سالانہ دس روپے۔ مستقل خریداروں سے سالنامے کی الگ قیمت نہیں لی جاتی

مکتبہ ادبِ لطیف۔ لاہور

حفیظ ہوشیارپوری

کشمیر کے چند فارسی شعراء

شاہجہان کے زمانے میں بہت سے ایرانی شعرا کشمیر آئے۔ کشمیر کی آب و ہوا اور اس کے مناظر میں کچھ ایسی دلکشی تھی کہ ان میں سے بعض یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ یہاں کے باغوں، چشموں، جھیلوں، برفپوش چوٹیوں، آبشاروں اور دریاؤں نے انہیں نئے موضوعات عطا کئے۔ ان کے انداز بیان میں تازگی پیدا ہوئی۔ وہ اچھوتی تشبیہیں اور نئے نئے استعارے استعمال کرنے لگے۔ ان کی ہر صنف سخن کشمیر کی فضا سے متاثر ہوئی اور اپنے جذبات کا اظہار انہوں نے قصیدے، مثنوی، غزل، رباعی، مختصر یہ کہ ہر رنگ میں کیا۔

ایرانی شعرا نے مقامی شعرا سے میل جول بڑھایا۔ مشاعرے ہونے لگے۔ علم و فضل کی محفلیں جمنے لگیں۔ ان مشاعروں اور علمی محفلوں میں اراکین سلطنت اور امرا بھی شامل ہوتے۔ کشمیر کی مٹی بھی کچھ کم دامنگیر نہ تھی۔ حاجی محمد جان قدسی۔ محمد قلی سلیم۔ ابوطالب کلیم اور طغرا مشہدی یہیں سپرد خاک ہوئے۔ یہ سب شعرا کشمیر کے بعض مقامی شعرا کے ساتھ ایک ہی مقام پر مدفون ہیں جو سری نگر میں "مزارات الشعراء" کے نام سے مشہور ہے۔

حاجی محمد جان قدسی شاہجہان کی تخت نشینی کے پانچ برس بعد ۱۰۴۲ھ میں حج سے واپسی پر اس برعظیم میں پہنچا۔ بادشاہ نے ایک قصیدے کے صلے میں خلعت اور دو ہزار روپے عطا کئے۔ دو سال کے بعد اس نے نوروز کی تقریب پر قصیدہ پڑھا اور اپنے وزن کے مطابق پانچ ہزار پانچ سو روپے انعام پایا۔ ایک اور تقریب پر اس کا منہ سات مرتبہ جواہرات سے بھرا گیا۔ قدسی نے قصیدے اور غزل دونوں میں نام پیدا کیا لیکن اس کا اہم ترین کارنامہ ایک مثنوی ہے جس کے موضوعات یہ ہیں: سفر کشمیر۔ آمد شاہجہان در کشمیر۔ آب و ہوائے کشمیر۔ بہار کشمیر۔ باغ جہاں آرا۔ باغ فرح بخش۔ باغ فیض بخش۔ باغ شہزادہ۔ باغ نشاط۔ باغ صادق آباد۔ باغ نسیم۔ نور باغ۔ باغ بحر آرا۔ باغ بیگم آباد۔ باغ آصف آباد۔ ویری ناگ۔ اچھول۔ تالاب صفاپور۔

پیر پنجال کی بلندی کے متعلق کہتا ہے ؎

معاذ اللہ زکوہ پیر پنجال
کہ شکلش دیدہ کم چرخ کہن سال
جواں گر پوید ایں راہ پُر اندوہ
بہ پیری می رسد پیش از سرِ کوہ

ایک غزل کے دو شعر ہیں ؎

در مجلسے کہ یاراں شرب مدام کردند
نوبت بما چو آمد آتش بجام کردند
آیں جا غم محبت، آنجا جزائے عصیاں
آسائش دو گیتی بر ما حرام کردند

اُس کی یہ نعت شہرتِ دوام حاصل کر چکی ہے ؎

مرحبا سید مکی مدنی العربی
دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

قدسی نے کچھ عرصہ آگرہ کے مدرسۂ شاہی میں ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کے تحت تدریس کے فرائض بھی انجام دیے۔ اس کے علم و فضل کا اعتراف اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ لیکن علم و فضل کے ساتھ اُسے انکسار کی دولت بھی عطا ہوئی تھی۔ ایک مرتبہ کشمیر کے کسی مدرسہ میں غزل سنا رہے تھے۔ یہ شعر پڑھا ؎

ساقی بہ صبوحی قدحے پیشتر از صبح
برخیز کہ تا صبح شدن تاب ندارم

ایک طالب علم نے مؤدبانہ کھڑے ہو کر پہلے مصرع کو یوں دُہرایا:

ساقی بہ صبوحی "نفسے" پیشتر از صبح

قدسی نے نہ صرف "قدحے" کی بجائے "نفسے" کو قبول کیا بلکہ طالب علم کے ذوق کی داد بھی دی۔

قدسی نے کشمیر کے متعلق ایک شعر کہا تھا ؎

دریں گلشن کہ ہم گل ہست ہم خار
مرا ہم جائے دہ یک آشیاں وار

اس کی دعا قبول ہوئی۔ اور کشمیر کی گلپوش زمین نے اُسے اپنے آغوش میں لے لیا۔ یہ ۱۰۵۶ھ کا واقعہ ہے۔

خواجہ عزیز الدین عزیز لکھنوی نے مثنوی گلگشتِ کشمیر میں شعرائے کشمیر کے تحت قدسی کے اس شعر پر یوں تضمین کی ہے ؎

چو قدسی نغمہ سنج این چمن شد
چنیں بر درگہ حق نغمہ زن شد
دریں گلشن کہ ہم گل ہست ہم خار
مرا ہم جائے دہ یک آشیاں وار
رسیدہ بر ہدف تیر دعا کش
بزیر گلبنی دادند جا کش

اور طالب کلیم ہمدانی پہلی مرتبہ جہانگیر کے زمانے میں کاشان سے یہاں پہنچا۔ اس کی آمد کے کچھ عرصہ بعد ۱۰۲۵ھ میں جہانگیر نے طالب آملی کو ملک الشعراء کے خطاب سے نوازا۔ کلیم اس بات سے بددل ہو کر واپس چلا گیا۔ اور اپنی مراجعت کی یہ تاریخ کہی ؎

طالب ز ہوا پرستی ہند
برگشت و سوئے مطلب آمد
تاریخ توجہ عراقش
توفیق رفیق طالب آمد

لیکن ہندوستان کی یاد نے پھر اسے بیتاب کیا ؎

ز شوق ہند ز انساں چشم حسرت بر قفا دارم
کہ رو ہم گر براہ آرم نمی بینم مقابل را
چمن را غنچۂ نشگفتہ بسیار است می ترسم
کہ در گلزار ایراں ہم نہ بینم شادماں دل را

دو سال کے بعد پھر یہاں پہنچا۔ اس مرتبہ طالب آملی کی رقابت کے باعث اُس نے دربارِ جہانگیر کی بجائے دربار ابراہیم عادل شاہ ثانی بادشاہ بیجاپور (دکن) کا رُخ کیا۔ لیکن وہاں بھی بدبختی نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ مغلوں کی جاسوسی کے الزام میں گرفتار ہو کر قید ہوا۔ بالآخر میرزا شاہنواز خاں صفوی امیر دربارِ جہانگیر کی کوششوں سے رہائی پائی۔

۱۰۳۶ھ میں طالب آملی کا انتقال ہو گیا۔ اس کے ایک سال بعد جہانگیر بھی چل بسا۔ کلیم نے شاہجہان کے دربار میں رسوخ بڑھایا اور طالب اور قدسی کے بعد ملک الشعراء کا رتبہ حاصل کیا۔ ۱۰۴۹ھ میں کلیم شاہجہان کے ساتھ کشمیر گیا۔ اور وہیں مستقل قیام کی اجازت چاہی۔ یہاں اس نے فتوحات شاہجہانی کو منظوم کیا۔ ۱۰۶۱ھ میں وفات پائی۔ غنی کاشمیری نے تاریخ وفات کہی ؏

طور معنی بود روشن از کلیمؔ (۱۰۶۱ھ)

قطعہ تاریخ میں قدسی اور سلیم کا ذکر بھی کیا ہے ؎

عمرہا در یاد او زیر زمین،
خاک بر سر کرد قدسی و سلیم
عاقبت از اشتیاق یک دگر
گشتہ اند این ہر سہ در یکجا مقیم

کشمیر میں مقیم ہونے سے پہلے کلیم نے بہت سفر کیا تھا۔ اس کے دیوان میں گوالیار، برہان پور اور دکن کا ذکر ملتا ہے۔ کشمیر کی بہت سی عمارات پر کلیم کے قطعات تاریخ کندہ ہیں۔ کشمیر پر ایک مثنوی بھی لکھی۔ اس کی کئی غزلیات میں بھی کشمیر کا ذکر ہے۔ تاریخی اور ذاتی واقعات کی طرف اشارے بھی ہیں۔ ۱۰۴۷ھ میں شراب سے توبہ کی اور یہ قطعۂ تاریخ کہا ؎

از بادہ گذشتیم بپاکاں قسم است
شستیم ز جام دست اگر جام جم است
توفیق ثبات ہم خدا خواہد داد
آری تاریخ ہم ثبات قدم است
(۱۰۴۷ھ)

شراب ترک کر دی لیکن شراب کی یاد اُس کے دل سے نہ جا سکی ؎

گذشتن از لب ساقی گلعذار کلیم
خنک چہ توبہ می در بہار کشمیر است

ہمیشہ کارِ من بدکار خیر تا خیر است
گر تو بہ ماندہ دست و بہار کشمیر است
ہوای کشمیر از زہد خشک اثر نگذاشت
زیادہ دست کشیدیم ابر تر نگذاشت

لفظ کشمیر کو بہت سے شعرا نے استعارے کے طور پر استعمال کیا ہے۔ لیکن کلیم نے اس میں جو رنگینی پیدا کی ہے اُس کا جواب نہیں ؎

داریم تحفۂ تو دلِ پارہ پارہ ای
سودا ببیں کہ لالہ بکشمیر می بریم

کلیم کا بہترین شہکار یہ مرصّع غزل ہے جو اس نے اپنے محسن اور مربّی نواب ظفر خاں احسن کی یاد میں کہی ؎

شکوۂ دردِ ترا کی پیشِ درماں میکنیم
تشنہ می میریم و شکرِ آبِ حیواں میکنیم
بی تو تاریک است کشمیر ای چراغِ دیدہا
ما سیہ روزیم در شب سیرِ لبستاں میکنیم
در کمینِ عیش از بس دیدۂ بد دیدہ ایم
بادہ را از چشمِ ساغر نیز پنہاں میکنیم
گل اگر در سینۂ ورِ کشمیر می آید چہ شود
ما کہ گل از اشکِ خونیں در گریباں میکنیم
ماجرای دیدہ میگوئیم پیشِ سیلِ اشک
الہی بیں شکوۂ کشتی بطوفاں میکنیم
از ظفر خاں بود ایں جمعیتِ طرحِ غزل
با کہ دیگر زلفِ معنی را پریشاں میکنیم
تا تو رفتی دل بفکرِ خویشتن افتادہ است
سر چو می بازیم آنگہ فکرِ ساماں میکنیم
بادۂ کشمیر از بزمِ تو صاحب نشہ بود
بی تو ما خاطر نشانِ می پرستاں میکنیم
داغ می ماند کلیم ار لالہ زار از دست رفت
ہر چہ دشوار است با بر خویش آساں میکنیم

اگر ہمیں یہ معلوم نہ ہو کہ کلیم نے ظفر خاں احسن سے بارہ برس پہلے وفات پائی۔ تو اس غزل پر مرثیہ کا گمان ہونے لگے۔ خیالات کا تسلسل۔ انداز بیان کی روانی۔ جذبات کی شدّت اور فراوانی اور سوز و گداز، غرض مرثیہ کے تمام عناصر اس غزل میں موجود ہیں۔ ظفر خاں احسن اپنی مدت صوبہ داری ختم کرنے کے بعد کشمیر سے رخصت ہوا۔ اس کے بعد کلیم نے یہ غزل کہی۔ ظفر خاں دو بار کشمیر کا صوبہ دار رہا— ۱۰۴۲ھ سے ۱۰۵۰ھ تک اور پھر ۱۰۵۳ھ سے ۱۰۵۶ھ تک۔ کچھ عرصہ تھٹھہ کا صوبہ بھی اس کے تحت رہا۔ مغلیہ دور میں عبدالرحیم خانخاناں کے بعد وہ شعرا کا سب سے بڑا قدردان تھا۔ خود بھی ایک خوش گو شاعر تھا۔ فرصت کے اوقات شعرا اور علمائ و فضلائ کی صحبت میں بسر کرتا۔ کشمیر کے متعلق مثنویات اس کی یادگار ہیں۔

نہ صرف عہد شاہجہان کے شعرا میں بلکہ کشمیر کے تمام اہلِ سخن میں شیخ محمد محسن فانی کو ایک منفرد حیثیت حاصل ہے۔ وہ شاعر سے زیادہ ایک مفکر تھا۔ مشرق اور مغرب کے علمی حلقوں میں اس موضوع پر بہت بحث ہو چکی ہے کہ "دبستان مذاہب" کا مصنف فانی ہے یا نہیں۔ اس کی زندگی مذہبی اور سیاسی ہنگاموں میں گذری۔ تصوف کے رجحانات اس کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے تھے۔ انہیں رجحانات نے اسے دارا شکوہ سے وابستہ کر دیا تھا۔ شاہ جہان نے اللہ آباد کی صدارت فانی کے سپرد کر دی تھی۔ یہاں شیخ محب اللہ اللہ آبادی کی صحبت میں اُس کے تصوف کا رنگ اور گہرا ہو گیا۔ آخر ایک دلچسپ واقعہ صدارت سے فانی کے معزول ہونے کا باعث ہوا۔ جب شاہجہان نے ۱۰۵۶ھ میں بلخ کو فتح کیا تو وہاں کے حاکم نذر محمد خاں کے ذاتی کاغذات میں سے فانی کا دیوان برآمد ہوا جس میں نذر محمد خاں کی شان میں قصائد بھی درج تھے۔ شاہجہان نے برہم ہو کر فانی کو صدارت سے معزول کر دیا۔ لیکن یہ برطرفی فانی کو کبیدہ خاطر نہ کر سکی ؎

کی از عزلِ مناصب بجز گردد دل کرمیدہ اند
غرض طیِّ مقامات است از تحصیلِ منصب ہا

فانی کشمیر واپس چلا گیا اور معمولی پنشن پر گزارا کرتا رہا ؎

زبانِ سوختۂ داغِ فقر قانع باش
دعای دولتِ صاحبقرانِ ثانی کن

کشمیر کے امرا، علمائ و فضلائ اور شعرا نے اس کی صحبت کو غنیمت

منور کاشمیری

غنی کاشمیری

اکبر و جہانگیر کے زمانۂ حکومت سے شاہجہان کی وفات تک اسی ایک صدی کا عرصہ ملک میں امن و امان، عیش و آرام، جاہ و حشم، شان و شوکت اور ہر قسم کی ... کا زمانہ گذرا ہے۔ شاعروں کی حق شناسی قدردانی کا بھی یہی زمانہ تھا۔ اسی زمانہ کے عہد شاہجہانی میں کشمیر کے نامور اور ترقی پسند شاعر، پیر و فقیر جناب حضرت غنی کاشمیری پیدا ہوئے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ جس طرح ایران میں صفوی سلاطین

بقیہ —— کشمیر کے فارسی شعراء

تھا۔ تصوف اور فلسفے کے مسائل پر بحثیں ہوتی تھیں۔ مذہب کے متعلق فانی کا مسلک ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے ؎

کتاب صلح کل گردش گوید پیر میخانہ
تو ای از بادۂ توحید شست اوراق مذہب ہا

کسی ز اہل یقیں خوش نکرد جز فانی
از یں مذاہب حق اعتقاد باطل ما

سر مۂ وحدت کشید از صلح کل در چشم من
تا ز دیر و کعبہ دیدم جلوۂ اللہ را

خانہا در ملک وحدت میتواں برپا کرد
چوں سر منصور نتواں بر سر یک دار ماند

تخم نفاق اگرچہ نہ ہر گل سری کشید
این دانۂ سبز در چمن ما نمی شود

دارا شکوہ سے اپنی وابستگی کا اظہار یوں کیا ہے ؎

بی نیاز دولت کونین شد فانی چو دید
مطلع انوار شاہی جبہۂ شہزادہ را

فانی از دارا شکوہ و قدسی از شاہجہاں
فرق بسیار است از ہم آفتاب و ماہ را

فانی کہ سجدہ در دارا شکوہ کرد
دیگر سرش فرود بہر در نمی شود

اور اس شعر میں تو دارا شکوہ کی وابستگی دلبستگی کی حد سے بھی گذر گئی ہے ؎

داغ شو یوسف کہ ما را از نسیم دارا شکوہ
عشق بر عکس زلیخا در جوانی پیر کرد

دارا شکوہ سے تعلقات فانی کی داستان حیات کا ایک اہم باب ہیں۔ اور "دیوان فانی" کی روشنی میں "دبستان مذاہب" کا مطالعہ کرنے کے بعد اس بات کے ماننے میں شک کی بہت کم گنجائش رہ جاتی ہے کہ یہ کتاب فانی ہی کی تصنیف ہے۔ فانی کو علم و فضل پر ناز تھا۔ اپنے علم و فضل کا سہارا لیتے ہوئے اہل جہل پر کیا خوب طنز کی ہے ؎

واعظ نگیر کار من از روی جہل تنگ
کافی بود شکنجۂ فضل و ہنر مرا

لیکن وہ دوسروں کے علم و فضل کا بھی کچھ کم قدر دان نہ تھا ؎

پیش ما تعظیم دانشور بہ از دانشوری است
نکتہ دانی جہل باشد قدردانی مشکل است

نے بلند پایہ شعراء کو انعام و اکرام سے نوازا اسی طرح اس عہد میں ہندوستان کے درباری شاعروں نے بھی اشرفیوں کے انبار سمیٹ لیئے۔ یاد ہو گا کہ شاہجہان نے ایک مرتبہ کلیم کا صرف ایک مطلع سن کر اسے چاندی میں تلوایا تھا مگر اس قسم کے رسوم و آداب کے زمانے میں بھی غنی نے نہ کسی امیر و وزیر کی جبہہ سائی کی اور نہ کسی سلطان و بادشاہ کے دربار تک رسائی کی۔ غنی کا طرہ امتیاز یہ رہا کہ وہ سخن سے گوشۂ گمنامی سے باہر نکلا مگر جاہ و منصب اور مال و منال کو ہمیشہ نفرت کی نگاہ سے دیکھا اور فارسی شاعری میں وہ کمال حاصل کیا کہ کلیم اور صائب اصفہانی اور قدسی وغیرہ سے بھی گوئے سبقت لے گیا۔ چنانچہ اہل زبان کے نزدیک صائب کسی زمین میں بھی اس مرد فقیر و خود آگاہ کے کلام میں بڑھ نہ سکا۔ صائب ایرانی تھا اور دربار ایران کا ملک الشعراء۔ اس نے غنی کی سینکڑوں غزلوں پر غزلیں لکھیں۔ غنی کے خیالات و محاورات کا تتبع کیا مگر غنی نے صائب کی یا کسی اور شاعر کی ———— کسی بھی غزل پر غزل نہیں لکھی۔ پھر یہ امر محقق ہے کہ میرزا صائب نے غنی کاشمیری کے دو صد اشعار منتخب کر کے اپنی بیاض میں نوٹ کر رکھے تھے۔ غنی کے کلام کے ساتھ مسلمہ قسم کے اساتذہ کا یہ سلوک بتاتا ہے کہ کشمیر کا یہ عظیم فارسی گو صرف اس خطہ میں ہی نہیں بلکہ بقول مرزا محمد افضل سرخوش:

"ملا محمد طاہر غنی صاحب طبع عالی بود و پایۂ
سخنوری را بہ رتبۂ کمال رسانیدہ از خطہ کشمیر بلکہ از
اقلیم ہند ہمچو او خوش خیال نازک بند نخاستہ و اکثر
از معاصرین و متاخرین قائل بخوش کلامی او بودہ اند"

یہ امر مشہور ہے کہ مرزا صائب نے جب اصفہان میں غنی کا کلام سُنا تو بے اختیار غنی کی ملاقات کے لیئے رخت سفر باندھا۔ یہ صائب کا کشمیر میں دوسرا سفر تھا۔ بعض تذکروں میں لکھا ہے کہ صائب غنی کاشمیری کے مشہور شعر ؎

موئے میانِ تو شدہ کرا ہین
کرد جدا کاسۂ سرہا ز تن

میں لفظ کراہین کے معنیٰ دریافت کرنے کے لیئے دوسری بار کشمیر آئے تھے اس سفر کا ذکر ہے کہ صائب غنی کے مہمان تھے جب غنی کا یہ شعر پڑھا ؎

حسن سبزے بخط سبز مرا کرد اسیر
دام ہمرنگ زمیں بود گرفتار شدم

تو صائب بے اختیار بول اُٹھے "کہ کاش ایں ہمہ کہ در تمام عمر خود گفتہ ام بہ غنی مے بخشیدند و ایں یک بیت حوالہ بمن میکردند"

اسی پر بس نہیں بلکہ اس شعر ؎

کدام سوختہ جاں دست زد بدامانت
کہ از لباس تو بوئے کباب می آید

کو سن کر صائب پھڑک اُٹھے اور کہا "کاش کہ صائب دیوان یک مصرعہ مے نگاشتے و تضمینش ملا غنی می کردے"۔

مشاہیر کشمیر میں غنی کے متعلق دلچسپ داستان ہے کہ غنی نے فکر سخن فرمانے کے لیئے جو ایک حجرۂ خاص بنا رکھا تھا۔ ایک روز ایک دوست ان سے ملنے وہاں آئے مگر غنی کہیں نظر نہ آئے۔ دوسری دفعہ وہی دوست آئے تو حجرے کے دروازے بند پائے۔ دستک دی۔ غنی نے دروازہ کھولا دوست نے تعجب سے استفسار کیا آپ گھر پر موجود نہ ہوں تو حجرے کے کواڑ کھلے رہتے ہیں اور موجود ہوں تو بند۔ اس کا کیا سبب ہے؟ غنی نے جواب دیا کہ مکان کی متاع بے بہا تو میں ہوں۔ میں نہ ہوں گا تو مکان کے دروازے بند کرنا بے سود ہے۔ اس واقعہ کو علامہ اقبال نے بھی فارسی میں منظوم کیا ہے۔

کشمیر کے اس مشہور فارسی گو کے فقر و غنا اور اس کی عظمت کا اعتراف اُس واقعہ سے کرنا پڑتا ہے جب عالمگیر اورنگ زیب نے غنی کا کلام سُنا اور اس کے کمالات سے آگاہ ہو کر اُن سے ملاقات کی آرزو کی۔ چنانچہ اس وقت کے حاکم کشمیر سیف خاں کو لکھا گیا کہ ملا محمد طاہر غنی کو عزت کے ساتھ دہلی روانہ کیا جائے۔ مگر غنی نے سیف خاں سے کہا کہ بادشاہ کو لکھ دو کہ غنی دیوانہ ہو گیا ہے اور دہلی جانے سے انکار کرتا ہے سیف خاں نے کہا کہ ایک دانا و بینا اور عاقل و فرزانہ کو دیوانہ لکھنا میرے بس کا روگ نہیں! کہتے ہیں کہ غنی نے اسی وقت اپنا جامہ تار تار کر دیا اور سچ مچ دیوانوں کی طرح سیف خاں کے دربار سے نکل کھڑا ہوا۔ اور اس

واقعہ کے صرف تین روز بعد یہ گنجِ ہنر ہمیشہ کے لئے زیرِ زمین پنہاں ہوگیا! - ذرا غنی کا فقر ملاحظہ کیجئے ؎

غنی اگرچہ فقیر است ہمتے دارد
فشاندہ دست بکونین دستِ خالی را

"در فقر ہیچ کس نبود آشنائے ما"
نہ نشست غیر گرد کسے در سرائے ما

غنی کے حالات و واقعات اور اسی نوع کے ایک دوسرے سے بڑھ کر اشعار آبدار سے عیاں ہے کہ غنی اگرچہ غریب تھا مگر دل کا غنی تھا اور اپنے ضمیر کا خود مالک تھا - یہ آزادی و حریت کا دلدادہ انسان اپنے وقت کا صرف ایک بلند پایہ شاعر ہی نہ تھا بلکہ ایک عجیب و غریب دل و دماغ کا انسان اور قوی القلب درویش تھا جس کی ساری زندگی کے اخلاق و عادات اور اس کے کم و بیش ایک لاکھ فارسی اشعار ہمیں بتاتے ہیں کہ اس مردِ قلندر نے کسی کے جاہ و جلال سے مرعوب ہوکر اپنا سر کبھی نیچے نہیں کیا - اس کے وقت کے صوبہ داران کشمیر میں سے یہ فخر صرف اسلام خاں کو حاصل ہے جو خود ایک سچا مسلمان اور عابد و زاہد انسان تھا کہ غنی اس سے ملتے تھے چنانچہ اس باخدا مسلمان کی وفات پر غنی آبدیدہ ہوگئے اور ایک قصیدہ بطور قطعۂ تاریخ وفات لکھا جس کے آخر میں کہا ؎

جست این مصرع از زبان غنی
مُرد اسلام خان والا جاہ

یہ ۱۰۷۱ ہجری کا زمانہ ہے اس سے دس سال قبل کلیم نے کشمیر میں وفات پائی تو غنی نے اس وقت صرف ایک سال سے شاعری میں قدم رکھا تھا اس وقت سات اشعار پر مشتمل کلیم کی تاریخ وفات کہی گئی ان اشعار سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ صرف ایک سال کی مشقِ سخن کے بعد غنی کا کلام کس پایہ کا تھا ؟ آخری شعر اس قطعہ کا یوں ہے ؎

گفت تاریخ وفات اُو غنی
طورِ معنی بود روشن از کلیم

غنی طاہر بھی تخلص کرتے تھے چنانچہ ۱۰۶۴ ہجری میں ایران کے سادات میں سے ایک مشہور شاعر میر الٰہی نے کشمیر میں وفات پائی تو غنی نے اس قطعہ کے آخر پر کہا ؎

گفت تاریخ وفاتش طاہر
بُرد الٰہی زجہاں گوئے سخن

ہمارے غنی نہ صرف شاعر تھے بلکہ کشمیر کے مستند بزرگوں میں ان کا شمار ہوتا ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ شعر گوئی سے ان کی مراد علم تصوف کے مسائل بیان کرنا تھا چنانچہ حاجی محی الدین مسکین اپنی کتاب تحائف الابرار فی ذکر الاخیار میں غنی کے بھائی محمد زماں نامع کی نسبت لکھتے ہیں کہ "آداب طریقت باطنی از برادر خود ملا طاہر غنی حاصل نمودہ بود" اس سے ظاہر ہے کہ مرحوم اہلِ دل اور صاحبِ ارشاد بزرگ تھے اور سلوک و طریقت میں بھی ان کا مقام بہت بلند تھا - غنی شاعری اور علوم ظاہری میں شیخ محمد محسن فانی کے شاگرد تھے مگر لائق شاگرد نے فن سخن میں وہ یدِ طولیٰ حاصل کیا کہ اب تو اور خود استاد کا نام غنی ہی کے طفیل لوگوں کی زبان پر آتا ہے - اس جگہ غنی کی روحانیات بھی ملاحظہ کیجیے : ؎

فتح شد وسواس خاطر از نماز با حضور
ما بدست بستہ وا کردیم قفل بستہ را

چوں غنی ہر کس کہ دم از خاکساری میزند
می تواند کرد روشن از نفس آئینہ را

"نمی باشد مخالف قول و فعل راستاں باہم"
کہ گفتار قلم باشد نہ رفتار قلم پیدا

یہ غنی کے لائق شکریہ شاگرد مسلم کا ہم پر احسان ہے کہ غنی کی وفات کے بعد اسے جس قدر اشعار مل سکے دیوان کی صورت میں دنیائے سخن کو ایک نادر تحفہ بخشا - غنی سنہ ۱۰۴۰ ہجری میں پیدا ہوئے ۱۰۶۰ ہجری میں ۱۹ سال کی عمر میں مشق سخن شروع ہوئی - سالِ وفات بالاتفاق ۱۰۷۹ ہجری ہے گویا ابھی عالمِ شباب ہی تھا اور زندگی کی صرف ۳۹ بہاریں دیکھی تھیں کہ یہ یگانۂ روزگار سخن اس دنیا سے کوچ کر گیا!!! ✦

نصرت کا مطلب ہے
دشمن پر فتح

مظفر علی سید

کشمیر اور اردو ادیب

بچپن سے سنتے چلے آتے ہیں کہ کشمیری بزدل ہے۔ جو کوئی جھوٹ موٹ بیمار پڑ جائے یا ذرا سی تکلیف میں بہت سا شور و غل مچائے، اسے کشمیری کا لقب ملتا ہے۔ انگریزوں نے علاقائی نمائندگی دینے کی خاطر جب کشمیریوں کو ہندوستانی فوج میں بھرتی کر کے لام پر بھیجا تو بچارے کانگڑی بردار رائفلوں کو زمین پر ڈال کر ہاتھ کھڑے ہو گئے۔ اور کہنے لگے: "بتہ دیچے رکھ دیں ... نے آپے عرض کر دلیں"۔ یہ تصور ان لوگوں کا ہے جنھوں نے تیرہ روپے مہینے پر اپنی چار نسلیں غدر سے لے کر تقسیم تک سرکار برطانیہ کی خوشنودی پر صرف کر دیں۔ جو اٹلی، جرمنی، فرانس، برما اور انڈونیشیا میں توپ کے منہ میں دھکیلے گئے۔ مگر ان سے سرکار دولت مدار کی شان میں اتنی گستاخی نہ ہو سکی کہ ۱۸۵۷ء کے فسادات کو ہی روک سکتے۔ کشمیر کے بارے میں بڑے بڑے صحافیوں سے لے کر ادیبوں تک کی تحریروں میں معلومات کی انتہا یہ ہے کہ قبائلیوں کے داخلے سے پہلے تحریک آزادیٔ کشمیر کا کوئی تصور پیدا نہیں ہوتا۔ پونچھ کے سابق فوجیوں کی مسلح بغاوت کا جب ذکر آتا ہے۔ تو بڑے بڑے تاریخ دان یہ کہتے ہوئے پائے جاتے ہیں کہ جناب وہ تو محض خلافت کا ایک بہانہ تھی اور بس۔ ادھر ادھر یہ عالم ہے کہ لداخ پر چینیوں نے حملہ کیا تو ہمارے اخبار اس کا یوں ذکر کرتے رہے۔ جیسے یہ جارحانہ کارروائی محض ہندوستان کے خلاف ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ کشمیر کے ساتھ ساتھ ہم نے تاریخ اور جغرافیہ بھی پنڈت نہرو کی نذر کر دیا ہے۔

ایک محفل میں خروشچیف اور بلگانن کے دورۂ ہندوستان کا ذکر تھا اور ایک غیر جانبدار مبصر روسی رہبروں کی ڈپلومیسی کو خراج تحسین دے رہے تھے۔ کشمیر کا ذکر آیا تو فرمانے لگے۔ خیر وہ تو ہمارا اپنا مسئلہ ہے۔ اس ... ذرا ہٹ کے سوچیئے۔ گویا کشمیر سے ہٹ کے بھی سوچا جا سکتا ہے۔ بڑے بڑے صاحبانِ دماغ یہ کہتے ہوئے پائے جاتے ہیں کہ ہندوستان کشمیر میں دس لاکھ روپے روزانہ خرچ کر رہا ہے۔ ہم کشمیر لے کے کیا لیں گے۔ یہ تو گھاٹے کا سودا ہے۔ یہ وہی بات ہے جو الجزائر کے لوگوں سے کہی جاتی ہے اور ابھی پندرہ سال پہلے ہم سے کہی جاتی تھی۔ ہمارے دانشوروں کے پاس سب کچھ ہے۔ بس ایک اخلاقی جرأت کی کمی ہے۔ حالانکہ اس بات کے لکھنے پر کبھی کوئی پابندی نہ تھی۔ وہ لوگ بھی جو زبانِ خلق کو نقارۂ خدا کہتے ہیں۔ مسئلہ کشمیر کو عوامی تقاضا نہیں سمجھتے اور یہ فرض کر لیتے ہیں کہ یہ مسئلہ ہی نت نئی حکومتوں نے پیدا کیا ہے۔ حالانکہ ہر نئی حکومت کو محض عوامی اعتماد حاصل کرنے کے لیے یہ بات کرنے کی مجبوری تھی۔ ان کا بس چلتا تو سارے کشمیر کو سمگل کر کے پونڈ کھرے کر لیتے۔

جب کسی قوم میں بے عملی اور بے غیرتی کی انتہا ہو جاتی ہے تو سوچنے سمجھنے والے بے عملی اور بے غیرتی کا ایک فلسفہ ایجاد کر لیتے ہیں بعینہٖ یہی حالت ہمارے صاحبانِ دماغ کی ہے جو کشمیر کے بارے میں نجی گفتگو کرتے ہوئے کبھی غیر جانبداری کا لبادہ اوڑھ لیتے ہیں کبھی کسی ایک آدمی کو قربانی کا بکرا بنا کے اسی کے سر سارا الزام تھوپ دیتے ہیں اور کبھی سارے کشمیریوں کو بزدل کا خطاب دے کر اپنی دلاوری دکھاتے ہیں۔

تاریخ کو دیکھیے تو اکبر اعظم سے پہلے کشمیر میں کبھی کوئی غیر ملکی حکومت مستحکم نہیں ہونے پائی۔ اکبر نے بھی یہ ملک بیسیوں حیلوں سے حاصل کیا اور اندرونی خلفشار کو برسوں تک اپنے حق میں استعمال کر کے اپنی سب سے بڑی فوجی مہم کو اس علاقے کی تسخیر کے لیے بھیجا۔ پھر بھی یہ قلمرو ہندوستان کے بیشتر صوبوں سے ہٹ کے الگ ہوتی۔ اکبر اعظم سے لے کر آج تک یہ علاقہ مغلوں، افغانوں، سکھوں

اور انگریز کے زیرِ سایہ راجوں کی تحویل میں رہا جنھوں نے اسے کشمیر جنت نظیر اور ایران صغیر کے خطاب تو دیے مگر ان کے حسنِ انتظام اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر دوسرے یا تیسرے سال ایک عظیم الشان قحط پڑتا تھا۔ یہی صورتِ حال دس لاکھ روپے روزانہ صرف کرنے کے باوجود آج بھی بدستور قائم ہے۔ بلکہ قحط کی میعاد دگنی چوگنی ہوگئی ہے۔ اور درمیانی وقفہ ایک تہائی۔ اکبر اعظم سے پہلے کشمیر کا کیا حال تھا؛ بیشتر لوگوں سے پوچھیے تو کہیں گے ہندو راج کا زمانہ تھا۔ کشمیر کے بارے میں لوگوں کی معلومات عامہ کا یہ حال ہے کہ ان مسلمان سلاطین کشمیر کے دو تین سو سالہ دور کو نہیں جانتے جو تاریخ کشمیر کا زریں عہد کہا جا سکتا ہے۔ سلطان زین العابدینؒ علی ثانی، امیر کبیر سید علی ہمدانی اور نور الدین رشی جیسے آدمی ہندوستان کے کسی اور حصے میں ہوتے تو آج سارا برصغیر مسلمان ہوتا۔ دراصل کشمیر کی صحیح تاریخ ان مسلمان سلاطین سے شروع ہوتی ہے جو کشمیر میں پیدا ہوئے اور جنھوں نے اپنی مرضی سے اسلام کو پسند کیا۔ پھر کشمیر کی تحریک آزادی کو دیکھیے۔ جیسے آج ایک ہندو کشمیری ہندوستان میں بیٹھا لکھ رہا ہے۔ پریم ناتھ بزاز کے بارے میں ایک صاحب کا کہنا ہے کہ ہمارے حلقہ بگوشوں میں شامل ہے معلوم نہیں مردولا سارا بائی اور لکھن پال کے بارے میں ان کے کیا خیالات ہیں اور ایم این رائے کے ہفتہ وار اخبار "ریڈیکل ہیومنسٹ" کو وہ کس کی آواز قرار دیتے ہیں؛ اس قول کے پیچھے شاید یہ تصور کام کر رہا ہو کہ کوئی آدمی کسی ظلم کے خلاف آواز نہیں اٹھا سکتا جب تک کوئی غیر ملکی ادارہ اس کی پشت پناہی نہ کرے۔ بہرحال کشمیر کی تحریک آزادی لاٹھی چارج، فائرنگ، قید، لوٹ مار، قتل و غارت سے اتنی پُر ہے کہ شاید کانگرس اور مسلم لیگ دونوں مل کر اس کا جواب پیش نہ کر سکیں اور جب اس تحریک کی آخری کڑی یعنی پونچھ کے سابق فوجیوں کی بغاوت کا ذکر کیا جاتا ہے تو ہمارے پڑھے لکھوں کا ارشاد ہوتا ہے کہ وہ تو مداخلت کا بہانہ تھی۔

مشہور ہے کہ بنی امیہ کے آخری دور میں دو آدمی اس بات پر جھگڑنے لگے کہ علی کون تھا؛ آخر ایک پرانے بڈھے کے پاس پہنچے کہ اس کی بھویں بھی سفید ہو چکی تھیں۔ اس نے یوں فیصلہ کیا کہ علی ایک عورت فاطمہ کا بیٹا تھا جو بدر کی لڑائی میں مارا گیا۔ کچھ ایسی ہی معلومات کشمیر کے بارے میں ہمارے یہاں کے پڑھے لکھے اور تجربہ کار لوگوں میں پائی جاتی ہیں۔ عوام کالانعام تو محض یہ جانتے ہیں کہ کشمیر مسلمان اکثریت کا وطن تھا۔ جہاں کا ہندو راجا بغاوت کے دوران بھاگ نکلا اور دہلی جا کر ہندوستان سے مل گیا۔ مگر صاحب عوام تو فرقہ پرست ہیں۔ مذہبی دیوانے ہیں۔ دو قوموں کا نظریہ ان کے ذہنوں پر مسلط کر دیا گیا ہے۔ وہ کیا جانیں بین الاقوامیت کیا چیز ہوتی ہے؛ کانسٹی ٹیوشن کسے کہتے ہیں؟ اور دیسی ریاستوں کے الحاق کا قانون کیا تھا۔ انگریز کی حکمت عملی نے کیا کام کیا۔ ریڈکلف صاحب نے کیا کمال دکھایا۔ اب کشمیر کا حاصل کرنا کتنا مشکل ہے؛ اور حاصل کر کے انتظام کرنا کتنا دشوار۔ جو لوگ عوام کو بھیڑ بکریوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے (ماہرین سیاست نے انھیں یہی لقب دیا ہے) وہ تو خیر اپنی دور اندیشی کو شاباش دے کے پرے ہو جاتے ہیں۔ حیرت ان لوگوں پر ہے جو اس عوامی تقاضے کو ریکارڈ کرنے سے بھی انکار کرتے ہیں۔ جو حق خود ارادیت کو مانتے ہیں مگر فوجی معاہدوں کا تذکرہ چھیڑ دیتے ہیں۔ جو کشمیر اسمبلی کے انتخابات اور بخشی غلام محمد کی حکومت کے بارے میں کچھ بھی کہتے ہوئے کتراتے ہیں جو شیخ عبداللہ کی دونوں گرفتاریوں کا ذکر نہیں کرتے۔ جو لداخ کے حملے کو ہندوستان اور چین کا ہی مسئلہ سمجھتے ہیں اور اس پر کچھ کہنا سیاسی آداب کے برعکس جانتے ہیں۔ جو یہ نہیں سمجھنا چاہتے کہ ونوبا بھاوے اور ڈاکٹر کچلو شیخ عبداللہ سے جیل میں جا کر کیوں ملے۔ جو اس بات پر کوئی غور نہیں کرنا چاہتے کہ شہری آزادیوں کا وادی کشمیر میں کیا حشر ہے؛ اور ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی نے کشمیر کے بارے میں کیا کیا نقطہ ہائے نظر وقتاً فوقتاً پیش کیے ہیں۔

آج سے کوئی دس گیارہ سال پہلے جب ہندوستانی اشتراکیوں کا اخبار "نیا زمانہ" ہمارے یہاں کھلم کھلا بکا کرتا تھا اردو کے مشہور ترقی پسند ادیب سجاد ظہیر کا نام نامی اس کی پیشانی پر چھپتا تھا۔ اس میں ایک سلسلہ مضامین اس مفہوم کا نکلنا شروع ہوا کہ سردار ابراہیم اور چودھری غلام عباس وغیرہ جاگیردار طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔

قطع نظر اس سے کہ یہ ٹھیک ہے یا نہیں۔ یا چند ایک مشہور ترقی پسندوں کا بھی اس طبقے سے تعلق ہے یا نہیں۔ یہ بات کشمیر کے نزاعی مسئلے پر کوئی مثبت یا دیانتدارانہ زاویہ پیش نہیں کرتی تھی۔ آدھا سچ کبھی کبھی سفید جھوٹ سے بھی زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ افسوس اس بات کا نہیں کہ لکھنے والے نے یہ کیوں لکھا اور یہ کیوں نہ لکھا کہ مہاراجا ہری سنگھ کا تعلق کس طبقے سے ہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ پاکستان کے کسی ترقی پسند ادیب نے اپنی تحریر یا تقریر سے کوئی مختلف زاویہ پیش نہ کیا۔ اس بات سے کوئی تین چار سال بعد جب شیخ عبداللہ کو اس جرم میں قید کر دیا گیا کہ وہ آزاد کشمیر کے خواب دیکھ رہے تھے تو ان تمام لوگوں نے جو شیخ تمام ایسے کر ہندوستانی زاویۂ نظر کی تائید کیا کرتے تھے۔ یکایک ان کو فرقہ پرست اور مفسد کہنا شروع کر دیا۔ ان لوگوں میں سب سے سرگرم طبقہ ان اصحاب کا تھا جن کے سیاسی تدبر کو ہمارے ادب "مشعل راہ" بنا کر چلا کرتے تھے اور جن کو ہمارے تعلیم یافتہ گروہ نے فکر و نظر کے تمام مسائل سلجھانے کا اجارہ دے رکھا تھا۔

شاید بعض اصحاب ایک اخباری بیان کا ذکر کریں۔۔ جو مسئلہ کشمیر کے آغاز میں چند پاکستانی ادیبوں کی جانب سے جاری ہوا اور جس کے نیچے پطرس اور تاثیر مرحوم، حفیظ جالندھری، صوفی تبسم اور فیض احمد فیض کے دستخط تھے۔ اول تو یہ بیان کس کو یاد ہے۔ پھر ہندوستان کے ترقی پسند اخباروں اور رسالوں میں اس پر وہ شور مچا کہ ہمارے ادیبوں کو پھر بولنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ اور دوبارہ کشمیر کا نام بھی کسی کی زبان پر نہ آیا۔ پطرس اور تاثیر مرحوم نے اپنی سیاسی حیثیتوں میں کچھ کیا ہو تو کیا ہو۔ مگر اس سے کسے انکار ہو گا کہ ہمارے زمانے کا سب سے بڑا مسئلہ ہمارے ادب میں بار نہ پا سکا۔ اسے سیاسی شعور کا فقدان کہیے یا ادب اور زندگی (جن میں چولی دامن کا ساتھ بتایا جاتا ہے) کی بے ربطی کا انجام قرار دیجیے یا ادبی رہبروں کی باطنی سیاست کا کرشمہ سمجھیے۔ بہر حال کشمیر کی تقدیر ہمارے قومی ضمیر کو بیدار نہ کر سکی۔ شیخ عبداللہ جب کشمیر کے وزیراعظم ہوئے تو انھوں نے کئی ایک ادیبوں کو کشمیر آنے کی دعوت دی۔ ایک شاعر نے کھلی چٹھی لکھی کہ جب کشمیر آزاد ہو جائے گا تو آؤں گا۔ مگر جب شیخ عبداللہ آزاد کشمیر کا خواب دیکھنے کے جرم میں کال کوٹھڑی کی ظلمتوں سے بہرہ اندوز ہوئے تو شیریں کلام شاعر نے کشمیر سے کوئی دلچسپی نہ لی۔ ایک صاحب نے نظم لکھی جس میں ایک ہندوستانی اور ایک پاکستانی کو وادیٔ کشمیر میں لڑتے ہوئے دکھایا اور ان کے جذبۂ انسانیت کبھی کی ہموطنی اور ہمسائیگی کو اکساتے ہوئے امن کی اپیل کی۔ اور جب سیز فائر ہوا تو وہ سمجھے کہ امن ہو گیا۔ اس لیے آج تک اس مسئلے پر دوسری نظم نہ لکھی۔ چند ایک حساس اور چند ایک متعلق اصحاب نے کشمیر پر کبھی کبھی کچھ لکھا۔ مگر اس کی حیثیت دوسری ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس کو ادب کا ایک موضوع بنا کر سوچ بچار کے ساتھ کسی نے کچھ لکھا یا نہیں اور کیوں ؟

محمود ہاشمی کا رپورتاژ "کشمیر اداس ہے۔" جعفر طاہر کی ڈرامائی نظم "ملہ عارفہ" آغا بابر اور خواجہ معین الدین کے ڈرامے "سیز فائر" اور "آخری نشان" چند ایک شعراء کی اخباری نظمیں اور آزاد کشمیر ریڈیو کے پروگرام ۔۔ اردو زبان مسئلہ کشمیر کو اس سے زیادہ کچھ نہ دے سکی۔ تعداد اور قدر و قیمت کے لحاظ سے یہ تحریریں بہت اونچی نہ سہی پھر بھی ان لوگوں کی خموشی سے بہتر ہیں جو پچھلے گیارہ سال سے مقار زبیر پر بیٹھے رہے۔ اور اب جمود اور تنزل کا ذکر چھیڑ کر محفل ادب میں رنگ پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان میں سے اہم ترین تحریر محمود ہاشمی کے قلم سے نکلی ہے۔ بظاہر یہ ایک مسلمان کشمیری کی تحریر ہے جو تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ حساس اور غیور بھی ہے اور اپنے زمانے کے حالات کا شعور بھی رکھتا ہے۔ اگر کسی زندہ قوم کو یہ مسئلہ پیش آتا اور ایسی تحریر لکھی جاتی تو صدیوں تک اسے کلاسیک کا رتبہ دیا جاتا۔ اور وہاں کے نقادوں کی زبان اس کی تعریف سے نہ تھکتی۔ مگر ہمارے ملک اور ہماری زبان میں اس کی یہ قدر و قیمت ہوئی کہ سوائے ماہنامہ "شیریں کے "نیا دور" کے جس میں اس کا ایک حصہ چھپا۔ شاید ہی کسی ادیب یا کسی رسالے نے اس کا نوٹس لیا ہو اور اس کو آتنا بھی درجہ دیا ہو جو ایک صحافیانہ رپورٹ کو دیا جاتا ہے۔ حالانکہ شعور و احساس

دونوں کے اعتبار سے اس کا مرتبہ ہمارے زمانے کی کسی تحریر سے کچھ نہیں۔

جعفر طاہر کی نظم "للّٰہ عارف نہیں تو کشمیر کی ایک پرانی ہندو شاعرہ اور جوگن کے بارے میں ہے مگر اس میں کشمیر کی تہذیب میں اسلامی تصوف کا رول اس خوبی سے اجاگر کیا گیا ہے کہ کشمیر کے بارے میں ہمارے مسلک کی اس سے بہتر کوئی بنیاد کسی نے پیش نہیں کی۔ یہ تاریخی نظم کشمیر کے زوال خوردہ ہندو معاشرے اور آنے والے مسلمان دور کا صحیح نقشہ کچھ اس طرح پیش کرتی ہے کہ صحافت، نشری پراپیگنڈا بلکہ تاریخ بھی اس کے آگے گرد ہو جائے۔ خواجہ معین الدین جن کے ڈرامے زوال حیدرآباد اور لال قلعہ نالو کھیت بہت مشہور ہوئے اور جنھوں نے "آخری نشان" اس مسئلے پر لکھا۔ اگرچہ ان دونوں فن پاروں کے درجے کو نہیں پہنچتے۔ پھر بھی قومی غیرت اور ضمیر کو بیدار کرنے میں انھوں نے بھی کچھ حصہ لینے کی کوشش کی اخباری نظموں اور نشری فیچروں کا ذکر ادب کے سلسلے میں نہیں آتا مگر یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ چین، کوریا، مصر، مراکش، الجزائر، ایران، افریقہ اور عراق پر نظمیں لکھنے والے شاعروں نے کشمیر کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھا۔ یہ نہیں کہ ان ملکوں کے حالات سے بے خبر ہو جانا چاہیئے۔ ہمارے ادیب قومی شعور کی تربیت پر کوئی زور نہیں دیتے۔ اور نہ قومی مسائل کے بارے میں از خود کوئی سوچ بچار کرتے ہیں۔ الّا یہ کہ کوئی مجبوری ہو۔ ایسے عالم میں بین الاقوامی احساس بھی سطحی اور سرسری ہو کے رہ جاتا ہے۔ جن لوگوں نے سوئز کے حملے پر اردو نظمیں پڑھی یا سنی ہیں۔ وہ اس بات کی تصدیق کریں گے کہ شعر کہنے والوں کا جذبہ اور خیال دونوں خاصی نچلی سطح پر کام کرتے ہیں۔ ادب اور زندگی کے نظریاتی رشتوں کی بات کرنا کچھ اور ہے اور عملی طور پر اپنے ادب کو زندگی کے اہم مسائل سے مربوط کرنا کچھ اور۔ جیسے بعض نوجوانوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ عشق کے تصور سے عشق کرتے ہیں۔ کچھ ایسی ہی بات ہمارے ادیبوں پر صادق آئے گی۔

اچھا چلیے اپنے یہاں کے زندگی آموز اور زندگی آمیز ادب غفلت کر گئے۔ کیا ان کے ہندوستانی بھائیوں نے اس غفلت میں ان کا ساتھ دیا۔ نیا زمانہ اور چند ادبی رسالوں کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ سرینگر اور جموں ریڈیو سے جن جن مشہور ادیبوں نے تعاون کیا۔ ان کے اسمائے گرامی کچھ ایسے مخفی نہیں۔ مگر یہ کام ایک لحاظ سے ذمہ دار ادبی کام نہیں کہا جا سکتا۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ طلسمِ خیال اور نظارے کے مصنف کرشن چندر نے اپنے محبوب LOCALE کو دوبارہ کسی افسانے میں چھو کے نہیں دیکھا۔ انھوں نے بمبئی میں بیٹھ کر پشاور ایکسپریس کا حال تو لکھا۔ سپین سے بھاگی ہوئی ایک لڑکی کو ناچتے دکھایا اور تلنگانہ کے ایک قیدی کے لیے ریشمی قمیص بھی بڑے خلوص، چاؤ اور اہتمام سے سلوائی۔ مگر چھیتے چھیتڑے لگے کشمیری بھائیوں کو بھول گئے۔ جو کشمیر ان کی ابتدائی کہانیوں میں پیش کیا گیا تھا وہ مہاراجا ہری سنگھ کا کشمیر تھا۔ وہی کشمیر جس کے بارے میں کبھی حفیظ جالندھری نے نظمیں اور روحانی بدایونی نے رباعیاں کہی تھیں اور جس کشمیر کو فلم برسات میں رامانند ساگر نے پیش کیا۔ شاید کرشن چندر اس مسئلے پر کسی اندرونی تضاد یا تذبذب کا شکار ہو گئے جس نے آہستہ آہستہ ان کے قلم کا سارا زور چھین لیا۔ البتہ چند ایک دوسرے لکھنے والوں نے بحیثیت ہندوستانی سرکار کا زاویۂ نگاہ اپنے افسانوں میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ خواجہ احمد عباس نے ہندوستانی فوج کے ایک مسلمان افسر کو کشمیر میں مرتے ہوئے دکھایا۔ کشمیری لال ذاکر نے "جب کشمیر جل رہا تھا" لکھی اور یہ نہ سوچا کہ آخر کیوں جل رہا تھا۔ تاریخی پس منظر کو بھلا کر آدمی اچھا ادب تخلیق نہیں کر سکتا۔ وہ تو سیاق و سباق سے وجود میں آتا ہے۔ باقی یا تو کچی جذباتیت رہ جاتی ہے یا پراپیگنڈا۔ اور ہندوستان کے ترقی پسند ادیبوں نے اس معاملے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ پریم ناتھ پردیسی نے متعدد کہانیاں اس مطلب کی لکھیں۔ مگر مزیدار بات یہ ہے کہ ہندوستان میں کشمیر پر لکھی ہوئی کسی تحریر میں نہ وہ ادبی وقار ہے نہ مکمل صداقت جو محمود ہاشمی کے رپورتاژ میں پائی جاتی ہے۔

اس رائے کے بارے میں جو اوپر پیش کی گئی یہ کہا جا سکتا ہے کہ ادب ہنگامی موضوعات سے بلند رہتا ہے اور ادب کا یہ کام نہیں کہ ادھر کوئی حادثہ ہو، ادھر افسانہ، ناول، یا نظم تیار۔ اس سلسلے میں یہ بات یاد دلانے کی ضرورت نہیں کہ کشمیر کا

مسئلہ ہنگامہ یا حادثہ نہیں۔ تاریخی کڑیوں کا ایک سلسلہ ہے۔ اور پھر اس کی موجودہ صورت حال کو بھی بارہ سال ہونے کو آتے ہیں اور اگر آپ ہنگامی مسائل سے کنارہ کش ہیں تو محض کشمیر سے کیوں؟ باقی ساری دنیا میں تو ذرا سا بھی ہنگامہ ہو جائے تو اخبارات ورسائل میں دھڑا دھڑ اتنی چیزیں پہنچ جاتی ہیں کہ چھاپی بھی نہیں جا سکتیں اور وہ مسئلہ جو نشہ رگ کا حکم رکھتا ہے۔ اس کی کسی کو خبر بھی نہیں ہوتی۔ جب کسی بات پر خموشی کا یہ عالم ہو تو اس کو سوائے شعوری کوشش یا دانستہ غفلت کے کیا کہا جا سکتا ہے؟

سیاست میں ایک مرحلہ ایسا آتا ہے کہ کوئی سیاسی جماعت واضح نقطہ نظر رکھے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ اسی طرح ادب کی تاریخ میں بھی ایسے مقام آتے ہیں کہ آپ غیر جانبدار نہیں رہ سکتے۔ اگر قوم کے ساتھ ہیں تو اعلان کیجئے۔ اگر صورت حال برعکس ہے تو بھی اعلان کیجئے۔ نہیں تو اپنی ادبی زندگی پر فاتحہ پڑھ ڈالیے اور چپ چاپ ایک ایسے آدمی کی زندگی گزاریئے جس کو کچھ نہیں کہنا اور کچھ نہیں کرنا۔ مگر پیچیدگی یہ ہے کہ اس مسئلے پر کہا بہت جاتا ہے لکھا کچھ نہیں جاتا اور جو کچھ کہا جاتا ہے وہ اس انداز کا ہے۔ کہ لکھ دیا جائے تو حکومت بھی چاہے تو لکھنے والا اس ملک میں نہیں رہ سکتا۔ اس کا سیدھا سادھا مطلب یہ ہے کہ لکھنے والے کو قومی ضمیر اور قومی عزائم سے کچھ سروکار نہیں۔ وہ ریاکاری سے زندگی گزارتا ہے اور اپنے خیالات کی قیمت ادا کرنے پہ راضی نہیں۔ جب یہ صورت حال ہو تو جو کچھ بھی لکھا جائے گا اس میں ریاکاری اور دوغلا پن آجائے گا۔ وہ گرفت، وہ کاٹ نہ رہے گی جس کے بغیر ادب وجود میں نہیں آ سکتا۔ اگر ہمارے ادیبوں کا یہ خیال ہے کہ قوم اس معاملے میں غلطی پہ ہے یا اس کی رہنمائی غلط لوگوں نے کی ہے اور ان کے دل و دماغ میں بیہودہ عزائم بھر دیئے ہیں تو وہ جتنا اس بات کو دبائیں گے اتنا ہی اپنے پڑھنے والوں سے دور ہوتے جائیں گے۔ اپنے اس جرم خموشی کا احساس ان کو ادبی اظہار و ابلاغ کی اس منزل پر لے جائے گا۔ جہاں کہنے کی کوئی بات نہیں رہ جاتی اور کہنے کے سب وسیلے ہاتھ سے چھوٹ جاتے ہیں۔

اس زمانے میں چین کے حملہ لداخ نے اس مسئلے کو ایک اور رُخ دے دیا ہے جو اگرچہ وادیٔ کشمیر کی اندرونی سیاست میں پہلے سے نظر آ رہا تھا۔ مگر اب وہ تمام خدشے ایک امکان بن کر سامنے آ رہے ہیں۔ ہندوستانی کمیونسٹوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ شمال مشرقی سرحد کے بدلے لداخ کا سودا کرنے کی فضا پیدا کریں۔ ادھر کشمیری کمیونسٹ بخشی غلام محمد کی حکومت کے پیچھے در پردہ سرگرم ہیں اور شیخ عبداللہ اور ان کے ساتھیوں کی غیر موجودگی میں ان کی حزب مخالف طاقت پکڑتی جاتی ہے۔ پھر روسی رہنما جو مختلف حالات میں پنڈت نہرو کا مؤقف قبول کر چکے ہیں عجیب مخمصے میں ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ نئی صورت حال فوراً ہی کسی آخری نتیجے کو جنم نہیں دے سکتی۔ لامائی نظام کے زیر اثر کشمیر کی بدھ آبادی کی ہمدردیاں کس کے ساتھ ہوں گی اور کشمیر کی مسلمان آبادی کا اس نئے موڑ پر کیا ردعمل ہوگا؟ یہ سب باتیں حکومت اور صحافیوں کے ہی سوچنے کی نہیں۔ ادیب کو ان سے پہلے اور بہتر انداز میں سوچنا چاہیئے۔ ورنہ قیام پاکستان کی طرح ادیب اپنے معاشرے سے بہت پیچھے گھسٹ گھسٹ کر چلیں گے اور پھر ان کو کوئی اتنا بھی پوچھنے والا نہ ہوگا۔ ادیب کو معاشرہ کبھی از خود کوئی جگہ نہیں دیتا۔ جب تک وہ جگہ ادیب خود اپنے لئے نہ بنائے۔

اور اگر اس نئی صورت حال میں قومی عزائم کو کوئی صدمہ پہنچا تو یقینی طور پر پوری قوم میں مایوسی اور بیزاری کی ایک ایسی لہر دوڑ جانے کا خطرہ ہے جس کے سامنے موجودہ بے حسی اور بے عملی کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ قوم کا ضمیر ہونے کی حیثیت سے ادب کی یہ ذمہ داری ہے کہ بدلتے ہوئے حالات کی نبض پر ہاتھ رکھے۔ اور تدبر کے ساتھ کوئی ایسا زاویۂ فکر پیدا کرے کہ نہ صرف یہ کہ حالات تھوڑے سے بہت قابو میں آجائیں بلکہ جس قدر بدلیں اسی قدر گوارا بھی ہو سکیں۔

یہ ذمہ داری بہت بڑی ذمہ داری ہے اور وہ ادیب جو ایک ربع صدی سے رہبری کی ذمہ داری سے آنکھ چراتے آئے ہیں معلوم نہیں کس طرح اس منصب کو سنبھال سکیں گے اور خود اس منصب کے بارے میں کیا رویہ اختیار کرتے نظر آئیں گے۔

اردو ادیب، ہمارے مؤرخ اور نقاد حضرات اس بات

پھر خاصا فخر محسوس کرتے ہیں کہ اردو ادب نے برطانوی سامراج
کے خلاف لڑائی لڑی اور عوام کو "اپنے دیس میں اپنا راج" کا
زریں اصول بنایا۔ معلوم نہیں ان کے نزدیک یہ اصول اب
متروکات علام کا حصہ بن چکا یا اب بھی کوئی معنویت رکھتا
ہے۔ بدیہی طور پر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ سامراج کی نئی شکلوں کی
پہچان ملتوی ہو چکی۔ بے حسی، بے اعتنائی اور غیر ذمہ داری نے
ڈیرے جما لیے اور اب ادیب کا کام اس کے سوا کچھ نہیں رہا
کہ نئی حکومتوں کی چھتری پہ گزارا کرے۔ یا ملک و قوم کی تعمیرِ نو کے
نام پر لوح و قلم کی بجائے ذات کی پرورش کو مدِنظر رکھے۔ اردو
کے قریب قریب سب ادیب عام اس سے کہ ہندوستانی
ہوں یا پاکستانی۔ یا تو ذاتی آسودگی کی دھن میں مست نظر آتے ہیں
یا عالمگیر انسانیت کا پرچم بلند کرنے کا دعوےٰ کرتے سنائی
دیتے ہیں۔ انسانیت کا جو منظر ان کے آس پاس سٹیج ہوتا ہے
اس کی پرچھائیں سے نکلنے بچاتے کبھی یادِ ماضی سے دل بہلاتے
ہیں کبھی ایسی اصولی اور نظریاتی بحثیں چھیڑ دیتے ہیں جو حالاتِ
حاضرہ پر منطبق نہ ہو سکیں۔ آج سے پچاس سال پہلے کا اردو
ادیب اپنے دیس کے ندی نالوں، ٹیلوں اور چٹانوں، پہاڑوں
اور کھیتوں پر شاعری کرتا تھا۔ اور لوگ اسے محبِ وطن سمجھتے تھے
پھر اس نے بدیسی راج کے خلاف احتجاج کا نعرہ بلند کیا اور لوگوں
نے اسے سر پر اٹھا لیا۔ پھر اس نے سماج کے ڈھانچے پر وار
کرنے شروع کیے۔ اور سماج نے اس کو مصلح اور ریفارمر کا درجہ
دیا اور اب جب کہ اپنے دیس کے ندی نالے، ٹیلے اور چٹانیں
پہاڑ اور کھیت اس کے سامنے ہیں تو اس کا دل نہیں دھڑکتا۔
بدیسی راج کے بعد اپنا راج کچھ مختلف ثابت نہ ہوا تو اس کا
احتجاج اس کے گلے میں گھٹ کر رہ گیا۔ سماج کا ڈھانچہ ویسے کا
ویسا رہا اور اس کی فریاد ہونٹوں کے چکر کاٹ کاٹ کر تھک
گئی۔ اس کے باوجود اس کو پتہ نہ چلا کہ یہ سب کیسے ہو گیا۔

کشمیر ہمارے دور کا سمبل ہے۔ ایک طرف اس میں غیر ملکی
سیاست کی جھلک ہے۔ دوسری طرف نئے سامراج کا سراغ
بھی ملتا ہے۔ ایک طرف "اپنے دیس میں اپنا راج" کی مدھم آواز
ہے اور دوسری طرف اپنی حکومتوں کی بھاری بھرکم مجبوریاں۔ اور
ان سب کا تختۂ مشق ہیں کشمیری عوام۔ جو سیز فائر کی تسلی سے بہلائے
گئے۔ جن کو آزاد کشمیر ریڈیو کے علاوہ باہر کی کوئی آواز نہیں پہنچتی۔
اور جن کی اپنی آواز آہنی پردے سے بھی سخت پردے کے
پیچھے دبی ہوئی اپنے آپ کراہتی رہتی ہے۔

آپ یقیناً سوچتے ہوں گے کہ پاکستانی ادیبوں سے زیادہ
یہ ذمہ داری ہندوستانی ادیبوں کی تھی کہ کشمیر کی اصل آواز لوگوں
تک پہنچاتے۔ انھوں نے شیخ عبداللہ اور ان کے ساتھیوں کی
گرفتاری پر بھی آواز بلند نہ کی۔ انھوں نے پنڈت جی کو استصواب
کا وعدہ بھی یاد نہ دلایا۔ انھوں نے تو اتنی ہمت نہ کی۔ جتنی کہ
مردولا سارا بائی سے بن پڑی۔ اب اس سے زیادہ افسوس کی
بات کیا ہو گی کہ ہندوستانی قوم کا ضمیر ہندوستان کے ادیب نہ
بن سکے بلکہ گجرات کی ایک بے بس عورت نے یہ کام کیا۔ مگر
اس کے باوجود ہندوستانی ادیبوں کو الزام دینے کی بجائے اگر
ہم اپنے لکھنے والوں سے کہیں کہ آپ نے اس مسئلے پر اپنے دماغ
سے کیوں نہ سوچا اور اب تک کس بات کا انتظار کرتے رہے
تو بے جا نہ ہو گا۔ ہندوستان کا اردو ادیب یا تو مسلمان ہے
یا ترقی پسند۔ یا دونوں اور ہر صورت میں اس کی کوئی نہ کوئی مجبوری
ہے جو قابلِ معافی نہ سہی قابلِ درگزر ضرور ہوتی ہے۔

پاکستانی ادیب کہیں گے ہماری کون سنتا ہے۔ اس کا جواب
یہ ہے کہ جب یہ حال ہو گا تو جو سن سکتا ہے وہ بھی نہیں سنے گا۔
وہ کہیں گے اس مسئلے پر لکھنا ادب تو نہ ہو گا صحافت ہو گا۔
ارے بھائی! ایسے ادب سے تو صحافت اچھی ہے کہ جس سے
نہ ضمیر تڑپے نہ خون گرم ہو۔ وہ اسی طرح کے سینکڑوں بہانے
تراشیں گے۔ ان کا ارشاد ہو گا کہ اب ۱۹۶۰ء میں کشمیر کا مسئلہ
اٹھانے سے ہند و پاکستان کے تعلقات مزید خراب ہوں گے۔
اوّل تو اس میں شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں کہ ہند و پاکستان کے
تعلقات اس سے زیادہ خراب ہو نہیں سکتے۔ کیا ترکی اور یونان
صدیوں کی رقابت کو پسِ پشت ڈال کر غیر ملکی سیاست کے برعکس
سائپرس کے بارے میں کسی مثبت نتیجے پر نہیں پہنچے — ؟ کیا

ہند و پاکستان کی رقابت یونان و ترکی سے پرانی ہے : پھر کیا ہمارے اردو ادیب یہ سمجھتے ہیں کہ مسئلہ کشمیر کو بھول کر وہ ہند و پاکستان کی دوستی کی فضا ہموار کر رہے ہیں : کیا حقیقت سے آنکھ چرا لینے کے بعد آپ انسانیت کی منزل پر پہنچ سکتے ہیں؟

"قائداعظمؒ" کے سوانح نگار لکھتے ہیں کہ وہ آبادی کا تبادلہ ضرور چاہتے تھے مگر خون خرابے کے ساتھ نہیں۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ نے اپنی آپ بیتی میں لکھا ہے کہ پنڈت نہرو نے دہلی میں فسادات پر قابو پانے میں کتنا زور لگایا۔ فسادات پر لکھنے والے ان گنت افسانہ نگاروں نے یہ کہنا چاہا کہ بے شمار لوگوں نے اپنی جانیں ہتھیلی پر رکھ کر ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کی جانیں بچائیں اور وحشت و بربریت کے دور میں بھی انسانیت کا چراغ روشن رکھا۔ یہ سب ٹھیک ہے تو معلوم نہیں کشمیر کا مسئلہ کیوں پیدا ہوا! اور اب تک حل کیوں نہ ہو سکا؟ اور اگر ہماری انسانیت محض اکا دکا مثالوں تک محدود رہ جاتی ہے تو پھر وہ کون سی قوتیں ہیں جو میدان مارے بیٹھی ہیں اور ہماری انسانیت ان کے خلاف کیوں صف آرا نہیں ہوتی؟

بہر حال یہ احساس ادیب نہ پیدا کر سکیں گے تو بھی کشمیر مر نہیں جائے گا۔ آخر الجزائر بھی تو نیٹو کے ہتھیاروں کے باوجود زندہ ہے۔ شیخ عبداللہ اور اُن کے اَن گنت ساتھی جیلوں میں مر بھی جائیں تو بے شمار محبانِ وطن کشمیر کی تحریک آزادی کو زندہ رکھنے کی کوشش کریں گے۔ نیا سامراج آج نہیں تو کل اپنی فوج اور اپنے معاشی دباؤ کو ہلکا کرنے پر مجبور ہو گا۔ یا کسی بڑے سامراج کے سامنے دب کر رہ جائے گا۔ کشمیر کی تاریخ اور اس کی تہذیب آئندہ نسلوں تک اپنی حریت اور انفرادیت کا احساس پہنچاتی رہے گی۔ اس لیے کہ قومی خواہشات کبھی نہیں مرتیں۔ پاکستان کا وجود اس کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ اگر ساری دنیا کی مخالفت کے باوجود اور اپنی کمزوریوں کے باوصف ہم ایک علیحدہ وطن بنا لینے میں کامیاب ہو سکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ کشمیری عوام اپنے آپ کو آزاد نہ کرا سکیں۔ البتہ ایک کانٹا رہ جائے گا جو ہمارے ضمیر میں کھٹکا کرے گا۔

مظفر علی سید

حبّہ خاتون

گھر سے نکلی کھیلن کو، پر لوٹ کے آنا بھولا
جب مغرب میں دن ڈوبا
میں ارباب کی پیاری بیٹی!
حبّہ خوتن کہلائی
برقع پہنے جیڈر سے نکلی
پھر نہ کبھی واپس آئی
لوگ کہا تو بڑے بڑوں سے بول نہ دیکھا چھوٹا
جب مغرب میں دن ڈوبا

یہ گیت، کشمیر اور برِ صغیر ہند و پاکستان کی سب سے بڑی نہیں تو بہت بڑی شاعرہ کی آپ بیتی ہے۔ جو سولھویں صدی عیسوی میں ایک مسلمان گھرانے کی محدود چار دیواری میں پیدا ہوئی اور بڑھی پھولی مگر جس کی شہرت زمان و مکان کی حدوں سے ماورا ثابت ہوئی۔ یہاں تک کہ اردو زبان بھی جو دوسری زبانوں کے ادب سے پہلوتہی برتنے میں ضرب المثل کی حیثیت رکھتی ہے اس کے نام اور کام کے تذکرے سے غافل نہ رہ سکی۔ حبّہ کے چیدہ چیدہ گیتوں کے ترجمے کے علاوہ، ایک ریڈیائی ڈرامہ اور ایک تاریخی ناول بھی اس کی زندگی اور فن کو موضوع بنا کر لکھا گیا۔ پھر بھی اس کے اندازِ کمال کی نسبت اس کے بارے میں اردو خواں بہت کم جانتے ہیں

اس کی زندگی کے مفصل حالات اس کی ذات کی طرح پردۂ اخفا ہی میں رہ گئے لیکن چند اہم باتوں کا تذکرہ کشمیر کے مورخین کے یہاں ملتا ہے۔ مرحوم ڈاکٹر صوفی جنہوں نے وادیٔ کشمیر کی سیاسی اور تمدنی تاریخ دو ضخیم جلدوں میں "کشمیر" کے نام سے انگریزی میں لکھی ہے اور جنہوں نے اپنی کتاب میں بیشتر ماخذوں سے فائدہ اٹھایا ہے۔ حبّہ کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"حبّ خاتون عموماً حبّہ یا حبّہ خوتن کے نام سے معروف ہے خوتن کشمیری میں خاتون کو کہتے ہیں۔ حبّہ بڑی باکمال عورت تھی۔ اس کا اصلی نام زون تھا جس کے معنی چاند ہیں۔ اور وہ درحقیقت چاند ہی کی طرح حسین تھی، جوانی، صحت اور جاذبیت کا مکمل نمونہ۔ قصبہ چندہارہ جو سرینگر سے نو میل اور پامپور سے جو زعفران کے لئے مشہور ہے دو میل کے فاصلے پر ہے، حبّہ یہیں پیدا ہوئی۔

"ابتدائی تعلیم جو گلستان، بوستان اور قرآن حکیم پر مشتمل تھی اور کچھ بے کیف زندگی کے بعد اس کی شادی ہو گئی۔ اس کی ساس نے اسے بے حد تنگ کیا اور خاوند نے بے اعتنائی برتی چنانچہ اس نے طلاق لے لی۔

"ایک دن جب کہ وہ زعفران زار میں گا رہی تھی تو یوسف شاہ نے جو پاس سے گزر رہا تھا۔ اس کے نغمے سنے۔ شہزادہ دل دے بیٹھا۔ اس کے بعد حبّہ کی زندگی پلٹ گئی اس کے بعد وہ ملکہ بنی اور نور جہانِ کشمیر کا لقب پایا۔ . . .

"جب اکبر اعظم نے یوسف شاہ کو کشمیر چھوڑنے پر مجبور کیا تو حبّہ تارک الدنیا ہو گئی . . . اس نے موضع پانڈ چھوک میں (جو اسلام آباد کی سڑک پر سرینگر سے تین میل کے فاصلے پر واقع ہے) اپنی تعمیر کردہ مسجد کے پاس ایک جھونپڑی ڈال لی۔ اور باقی ماندہ زندگی گیان دھیان میں گذارنے کے بعد (جیسا کہ کہا جاتا ہے) یہیں وفات پائی۔ اگرچہ اس کی قبر کا نشان نہیں مل سکا۔

"حبّہ کی شاعری ہر کشمیری کی زبان پر ہے۔ اس کی زندگی تقدیر کے نشیب و فراز سے پر تھی۔ ۱۸۰، ۱۹ سال تک اس نے سادہ زندگی بسر کی پھر چودہ سال تک یوسف شاہ کی ملکہ بنی رہی اور گلمرگ، سونامرگ، اہربل، اچھہ بل اور ڈل کے خوبصورت موسم سے لطف اٹھایا۔ بیس سال جوگ میں کاٹے اور آخر کوئی پچپن برس کی عمر میں وفات پائی۔" (ترجمہ)

یہ مختصر سوانح عمری عالمانہ ہے مگر حبّہ کی آپ بیتی پر کوئی خاص اضافہ نہیں کرتی۔ وہ گیت جو اس مضمون کا سرنامہ ہے یقینی طور پر حبّہ کی آخری عمر سے تعلق رکھتا ہے اس میں اس نے اپنے خاندان کو "ارباب" کہا ہے۔ اس لئے فاضل مورخ کی یہ رائے کہ حبّہ متوسط درجے کے ایک گھر میں پیدا ہوئی محلِ نظر ہے۔ یہ کہنا بھی کہ اس کی ابتدائی زندگی سادہ اور بے کیف گذری کسی طرح صحیح نہیں حبّہ نے اپنے اس دورِ حیات کو کھیل سے تعبیر کیا ہے جس میں تاریخی واقعات بیشک نہ ہوں اسے بے کیف نہیں کہا جا سکتا۔ کھیل ہی کھیل میں اس کی ملاقات ولی عہد

شہرت ہوئی اس لئے اس کی زندگی میں کھیل کا مزہ بنیادی ہے۔ اس کی پہلی شادی اور ساس کی بدسلوکی کے بارے میں اس کا کوئی گیت میری نظر میں نہیں ہے۔ ممکن ہے ساس سے یوسف شاہ کی والدہ مراد ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کی پیش رو شاعرہ و عارفہ للہ سے حبہ خاتون کے حالات زندگی خلط ملط ہو گئے ہوں۔ حبہ کی شاعری کا موضوع یا تو فطرت ہے یا وصل و فراق اور اکثر اوقات تو دونوں باہم پیوست ہو جاتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ایسے ایک آدھ مصرعے سے

وہ موری دس آنکھ نہ ڈالے
پھر میرا کیا جینا

یہ اندازہ کیا گیا ہو کہ حبہ کا خاوند اس سے بے اعتنائی برتتا تھا اور چونکہ یوسف شاہ کا اس سے عشق عام طور سے مشہور ہے اس لئے اس کی پہلی شادی ایجاد کر لی گئی ہو۔ ایسی افواہوں پر حبہ کے حالات زندگی کا مبنی ہونا سمجھ میں آسکتا ہے کیونکہ بقول خود اس کی زندگی پردے میں گذری ہے اور اس کے سوانح نگار بے سوال لاجواب ہوئے ہیں۔

اس کی زندگی اگر اس کے اپنے کلام میں تلاش کی جائے اور تاریخ کشمیر کے معروف حادثوں سے اس کو ٹکرایا جائے تو غلط یا مشکوک نقشہ برآمد نہ ہوگا۔ وہ صاحب حیثیت گھرانے میں پیدا ہوئی جو یقینی طور پر زمینداری کرتا تھا۔ بچپن کا زمانہ زعفران کے سنہری کھیتوں میں گذرا ہے جہاں وہ ہرنی کی طرح کلانچیں بھرتی اور کوئل کی طرح گیت گاتی پھرتی تھی۔ پھولوں اور درختوں کے نام اس کے گیتوں میں اس قدر ہیں کہ ایک اچھی خاصی فرہنگ بن سکتی ہے۔ اس نے وادی کشمیر کے پھولوں اور درختوں میں جنم لیا اور خود بھی ایک پھول کی طرح بڑھی پھولی۔ انہیں پھولوں اور درختوں کے درمیان اس کی ملاقات بسنت کے راجہ سے ہوئی

برکھا آئی، کھیتی پکی، پھل بھی اُگے ہزاروں
بسنت آیو، بسنت کا راجا
سوسن، اگن، سنہر اکیسر جنگل جنگل مہکا
پتہ پتہ، بوٹا بوٹا ہولے ہولے لہکا
وہ نرگس کی آنکھوں والا ہمرے پاس براجا
بسنت آیو، بسنت کا راجا!

یہ راجہ کشمیر کے شاہی خاندان کا چشم و چراغ، یوسف تھا جو خود بھی حسین تھا، حسن کی قدر کرتا تھا اور موسیقی کا جنون رکھتا تھا۔ اس نے حبہ کو دیکھا تو گویا وادی کشمیر ایک انسانی شکل میں نظر آئی۔ خوش و خرم، تر و تازہ اور نغمہ ریز۔ ناممکن تھا کہ ایسا شہزادہ ہو اور ایسی لڑکی کو رانی نہ بنانا چاہیئے۔ ولی عہدی یقینی ہو اور ولی عہد لائق و فائق تو مخالفت مشکل ہے۔ شاید تھوڑی بہت ناراضامندی محل میں ظاہر ہوئی ہو مگر اتنی ہوگی کہ آج ہمیں اس کی خبر نہیں پھر حبہ معمولی لڑکی نہ تھی مگر یہ بھی لگتا ہے کہ شادی فوراً ہی نہیں ہوگئی بلکہ کچھ دیر ردو قدح میں گذری۔

تم نے یہ دیکھا اس کو سکھی
جو پریم کی چوٹ لگائے گیو

—

پونہ کے پالے میں ٹھٹھرایا
ہاڑ کی دھوپ جلایا
اور ندی دانک بہائے گیو
جو پریم کی چوٹ لگائے گیو

—

ایک صنوبر بن میں پایا
تبردار نے کاٹ گرایا
اور پل میں راکھ بنائے گیو
جو پریم کی چوٹ لگائے گیو

بہر حال اس تبردار نے اس صنوبر کو اس لئے نہیں کاٹا کہ راکھ بنائے اپنے گھر آنگن کی شوبھا بڑھانے کے لئے وہ اس فطرت زادی کو زعفران زار سے اٹھا کر محلات شاہی میں لے گیا۔ خیابانوں میں کلیلیں بھرتی ہوئی ہرنی کے لئے محلات شاہی کی فضا کچھ بے کیف سی ہوگی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس فطرت زادی کو محل میں پسند نہ کیا گیا ہو۔ پھر شہزادہ خود سیر و شکار اور عیش و تفریح کا دلدادہ تھا۔ اس نے گلمرگ کی مرغزار کو ٹھیک ٹھاک کیا۔ سونامرگ، اچھہ بل اور دھرہ بل کی سیرگاہیں درست کرائیں۔ ان میں جا بجا بیل پھول لگوائے تاکہ ان سے بہلنے والی کا دل لگا رہے اور وہ محلات شاہی کی فضا سے بیزار ہو کر اپنی تر و تازگی سے ہاتھ نہ دھو بیٹھے۔

"پھولوں کی شہزادی"

میں ہوں ایک حسین دوشیزہ
میں پھولوں کی شہزادی ہوں

میں باغوں کی رسیلی تتلی
پھول بنفشے کے چُنتی ہوں
میری پیشانی کا پسینہ
موتی بن بن کر بہتا ہے
ساقی گری کا شیوۂ رنگیں
دم سے میرے زندہ رہتا ہے
شالا مار کے تختہ گل پر
جام پہ جام لنڈھائے میں نے
اک اپنے محبوب کی خاطر
کیا کیا سوانگ رچائے میں نے
میں نے اپنے دوست کی خاطر
کیسے کیسے ہار بنائے
اچھ بل کی رعنائی میں
کیا کیا میں نے جھولے جھلائے
لانبی، کالی، ناگن زلفیں
کس کس طرح سجاتی ہوں میں
آج دہی ہیں آنے والے
جن کو روز بلاتی ہوں میں
ہار پہ ہار میں گوندھ رہی ہوں
اور ان کا رستہ تکتی ہوں
میں ہوں ایک حسین دوشیزہ
پھول بنفشے کے چنتی ہوں

(ترجمہ: تابش صدیقی)

شہزادہ بادشاہ بنا اور اس کے ساتھ ہی پوری سلطنت کی ذمہ داری اس کے شانوں پر آن پڑی۔ اب وہ پُرانا یوسف نہ رہا تھا۔ سیر و شکار، عیش و آرام کی فرصت اس کو بہت کم ملتی تھی پھر بھی حبہ خاتون کے نغمے اس کو سرکاری مصروفیتوں سے کھینچ لاتے تھے۔

دُور دُور تک پھیلے ہوئے ہیں
لدے ہوئے پھولوں کے سبزہ زار

تو نے سنی بھی میرے دل کی پُکار

ڈوب گئیں پھولوں میں یکسر
میرے دیس کی جھیلیں اور کُہسار
آؤ لوٹیں، جلوۂ حُسن بہار
جنگل جنگل چھایا ہوا ہے
بید مشک کی خوشبوؤں کا خمار

تو نے سُنی بھی، میرے دل کی پکار

(ترجمہ: تابش صدیقی)

یہ زمانہ عجیب تھا۔ ایک طرف کشمیر کا حُسن تھا اور دوسری طرف اکبر اعظم کی حکومت جو بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔ پھر کشمیر کے اندر دو متوازی گروہ ایک دوسرے سے گتھم گتھا تھے۔ امیروں کی بن آئی تھی کبھی اسے رشتہ دیتے تھے ——————— کبھی اس کو اور کبھی ان سب سے بیزار ہو کر حبہ خاتون کے شعر و نغمہ میں تلخیوں کو ڈبونے چلا جاتا تھا۔ ہوتے ہوتے امیروں کو یہ محسوس ہوا کہ بادشاہ تو معاملات سلطنت میں دلچسپی ہی نہیں لیتا۔ سیر و شکار، عشق و تفریح، شعر و موسیقی، جام و سبو میں مست رہتا ہے۔ یُوں نہ سلطنت کے الٹے تلے کئے جائیں گے! ایسے ہی نازک مرحلے پر وزیر سلطنت کی خیانت پکڑی گئی۔ باقی سب امراء اس کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوئے چند ایک مخلصوں نے درگذر سے کام لینے کا مشورہ دیا۔ ادھر سوچ وبچار اور غور و تامل کی برداشت نہ تھی۔ جلدی میں سختی کر بیٹھے تو امراء خفا ہو گئے اور سرکشی کا آغاز کر دیا۔ پہلے تو عشق پیشہ بادشاہ نے ہمت سے مقابلہ کیا جب کوئی پیش نہ گئی۔ تو آگرے کی طرف نکل گیا اور اکبر اعظم کو شاہی نام و نمود اور وادی کشمیر کا واسطہ دے کر مدد مانگی۔ ہمایوں کا بیٹا یہ بھول گیا کہ شاہ ایران کی مدد سے مغلوں کی سلطنت دوبارہ قائم ہوئی تھی، وہ خود کشمیر کو اپنی وسیع و عریض سلطنت میں شامل کر کے اس کی دولت و حسن سے بہرہ مند ہونا چاہتا تھا۔ یا شاید اس نے اپنے باپ کی مثال سے یہ سمجھا کہ بھگوڑے بادشاہ مدد لینے کے بعد پھر خود مختار ہو جاتے ہیں اور یہ تو پہاڑی علاقے کا آدمی ہے، اپنے آپ کو محفوظ سمجھ کے بیٹھ جائے گا۔ چنانچہ کچھ دیر اسی انتظار میں گذری کہ کب مدد ملے اور کب وطن چلیں۔ ہمایوں جتنا انتظار کرتا تو شاید مدد مل ہی جاتی۔ کیونکہ یوسف شاہ نے اپنے حُسنِ ذوق کا سکہ بہت سے امیروں کے دل پر بٹھا دیا تھا۔ ایک محفل خاص میں اس نے اکبر اعظم کے سب سے بڑے سنگیت کار میاں

تان سین کو ٹوک دیا۔ تان سین جو موسیقی کا خدا تھا اس موقعہ پر اسے بھی ماننا پڑا۔ ظاہر ا ہوگی مگر اس دوران میں تان سین کے نغمے اُسے خوش نہ کر سکتے تھے جیسا کہ وہ ساز میدانوں کو چیرتی ہوئی حبہ خاتون کی آواز اس کے کانوں میں آ رہی تھی۔

قدم قدم گلزار کھلائیں
آؤ مرے پھولوں کی رسیا

آؤ چلیں ہم چنبیلی چنبیلی!
موت کے بعد ہے التدبیلی
راہ تکوں میں بیٹھی اکیلی!
آؤ میرے پھولوں کے رسیا

آؤ چلیں باندھیں گلدستے — کیوں روٹھے ہو ساجن ہم سے
دور دیس میں کیا سکھ ہوگے — آؤ میرے پھولوں کے رسیا
آؤ چلیں ہم لا ہو توڑیں! — دنیا والے تہمت جوڑیں
دیکھیں کہ ہمارا کیسے موڑیں — آؤ میرے پھولوں کے رسیا
آؤ چلیں ہم ندی کنارے — مست پڑے ہیں نیند کے مارے
بیٹھی ہوں سندیس سہارے — آؤ مرے پھولوں کے رسیا

معلوم نہیں یہ حبہ کی آواز کا جادو تھا یا کوئی خوش آئند خبر تھی کہ یوسف شاہ دربار اکبری سے بھاگ کھڑا ہوا۔ راستے میں مان سنگھ لاہور کا حاکم تھا جس سے امداد کی توقع ہو سکتی تھی۔ وہاں بھی انتظار کا عالم دیکھا تو بھی جا کر خود ہی چلوں۔ ممکن ہے کہ لوگ سرکشوں کی سلطنت سے تنگ آ گئے ہوں یہ ہو سکتا ہے کشمیر کے سرحدی قبائل امداد کریں۔ بہرحال وطن چھوڑنے کے ایک سال بعد وہ دوبارہ بادشاہ بننے کو چل کھڑا ہوا اور حالات نے کچھ ایسا پلٹا لیا کہ لٹا ہوا راج پاٹ پھر سے ہاتھ آ گیا اور اس کے ساتھ حبہ خاتون کی شاعری اور نغمہ بھی۔

آؤ مورے رندجی
تمہرے سنگ میں کھیلن آئی
میں تیرے نام کی مالا پھیروں
سیٹھا جیون بھینٹ کروں
رات دن تری باٹ کو دیکھوں
نا سوؤں نا بیٹھ سکوں
اب آؤ دیدار کراؤ

توری برہا موہے کالن آئی
آؤ مورے رندجی
تمہرے سنگ میں کھیلن آئی

اس کے بعد یوسف شاہ محتاط ہو گیا اور پوری تندہی سے سلطنت کا کاروبار چلانے لگا۔ باغیوں اور سرکشوں کو سر اٹھانے کا موقع ملنا مشکل تھا لیکن اکبر اعظم کو اب یہ خیال پیدا ہوا کہ کشمیر ہماری فوج سے نہ سہی۔ ہمارے نام کی برکت سے فتح ہوا ہے۔ اس نے اپنے سفیر کے ذریعے پہلے تو ملک میں پھر سے بلوہ کرانے کی کوشش کی پھر شاہ کشمیر کو خود آ کر آستاں چومنے کا حکم دیا۔ یوسف شاہ کو خیال پیدا ہوا کہ شاید میرے جانے کے بعد مغل پیچھے کو رحم آ جائے مگر خیر خواہوں نے ٹوکا۔ آخر اپنے بیٹے کو تحفے تحائف دے کر بھیجا اکبر اس پر راضی نہ ہوا اور خود نہ آنے کو گستاخی سمجھا۔ چنانچہ بہت سے امیروں کو راجہ بھگوان داس کی سرکردگی میں بہت سی فوج دے کر بھیجا۔ پہلے تو لڑائی ہوتی رہی اور کچھ فیصلہ نہ ہو سکا۔ آخر یوسف شاہ خود اکبری چھاؤنی میں آیا اور باج و خراج کا وعدہ کیا ادھر سے حکم ہوا کہ پیداوار اور دستکاری پر محصول ہماری طرف سے لگے گا۔ یہ بھی منظور ہوا آخر عہد نامہ اکبر کی توثیق کے لئے بھیجا گیا۔ وہاں سے حکم آیا کہ عہد نامنظور ہے۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد آگے بڑھنے کا فرمان ملا۔ راجہ بھگوان داس نے سوچا کہ آگے بڑھتا ہوں تو راجپوتی خون پر حرف آتا ہے اور نہیں بڑھتا تو ولی نعمت کی عدول حکمی ہوتی ہے اسی سوچ میں کچھ غبار ایسا اٹھا کہ خودکشی کرنے کو جا کا مگر جان بچ گئی۔ اب اکبر نے مزید فوج بھیج کر کشمیر کو فتح کرنے اور یوسف شاہ کو گرفتار کر کے آگے روانہ کرنے کا حکم دیا۔ آخر وہ پکڑا گیا اور راجہ ٹوڈر مل سنگھ کے پاس پٹنہ میں قید رہا جس نے کبھی اس کی مدد کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ اب یہاں مؤرخین میں اختلاف ہے۔ ملا عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں کہ وہیں اسے زہر دے دیا گیا مگر اکبری دربار کے مؤرخ کہتے ہیں کہ اس کی قید محض آزمائش تھی۔ کچھ دیر کے بعد مان سنگھ نے رہا کر کے پانچ سو سپاہیوں کی کمان دیدی۔ اب اس چھوٹے سے نوبی عہدے پر اس بادشاہ کشمیر کو کیا تسلی ہوتی پھر حبہ کشمیر میں تھی جہاں وہ جا نہ سکتا تھا اور جہاں اس کا بیٹا اب بھی مقابلے کی لڑائی لڑ رہا تھا۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ شیر افگن خاں حاکم بنگال نے خلاف مہم کے دوران اس نے بڑی بہادری دکھائی اور نور جہاں کو حفاظت سے جہانگیر تک پہنچانے کا فریضہ ادا کیا مگر اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ اس کے بعد کچھ پتہ نہیں چلتا سوا اس کے حبہ خاتون یہ سمجھتی رہی کہ شاید اب بھی اس کا رندجی پہلے کی طرح واپس آ جائے گا مگر یہ تقدیر

کے سامنے کہاں پیش چلتی۔

میں تو ہاتھوں میں مہندی رچائے
کب سے بیٹھی ہوں آس لگائے
وہ کب آئیں گے کوئی بتائے

وہ جو آئیں گے سیج کے سجا کے

مری جاتی ہوں کاش وہ آئیں!
اب تو راہ نہ اتنی دکھائیں!
اب تو دل کی لگی کو بجھائیں!

چلی جیون کی سیج لٹائے

کوئی تیرے بنا میرے پیارے
کیسے جیون کی رین گذارے
میں تو جیتی ہوں تیرے سہارے

تیری یادوں کے ناز اٹھائے

(ترجمہ: تابش صدیقی)

مگر اس کی آواز پہاڑوں سے ٹکرا کے واپس آگئی اور اکبر خود کشمیر کی سیر اور انتظام کے لئے آیا تو رہی سہی امید بھی جاتی رہی۔ آخر دادلیوں مرغزاروں کی دنیا کو اکبر کے بیٹے اور بہو کے لئے چھوڑ کر ایک کٹیا میں جوگن بن کے بیٹھ گئی اور بقول اپنے ایسا جوگ لیا کہ بڑے بڑوں نے جوگ کا دھندا چھوڑ دیا

حبہ کی شاعری کے بارے میں صحیح رائے قائم کرنا ان لوگوں کا کام ہے جو کشمیری زبان اور اس کی تاریخ سے اچھی طرح واقف ہوں۔ راقم الحروف نے اصل سے سرسری آشنائی اور انگریزی ترجموں کی بنا پر جو اندازہ کیا ہے وہ اس سے زیادہ نہیں کہ حبہ کی زبان بے حد سادہ ہے اور سنسکرت یا فارسی کی ضرورت سے زیادہ ملاوٹ نہیں رکھتی۔ غالباً یہ اس دور کی بول چال کی زبان ہوگی اور چونکہ اب بھی اس کے گیت سب کی زبان پر ہیں اس لئے اب بھی سمجھی جاتی ہوگی۔ دیسی الفاظ کی اس میں افراط ہے۔ باہر کے الفاظ بہت کم ہیں اگرچہ حبہ ایک مسلمان کی بیٹی اور مسلمان کی بیوی تھی اور کہا جاتا ہے کہ گلستان بوستاں پڑھی ہوئی تھی مگر فارسی الفاظ اس کے یہاں درختوں پھولوں کے چند ناموں سے زیادہ نہیں یا چند ایک ایسے الفاظ ہیں جیسے یار، شیشہ، پیالہ، برقع، خواب، جواب، دیدار۔ چند ایک ایسے بھی ہیں کہ ایک دوسری قسم کہلائیں جیسے ارباب تبر دار اور رند۔ رند کا لفظ دیکھ کر ایک صاحب ایسے خوش

ہوئے ہیں کہ انہوں نے حبہ خاتون کو صوفی شاعرہ بنانے کی کوشش کر دی ہے جو آخر عمر کے جوگ کے باوجود کچھ مناسب بات معلوم نہیں ہوتی۔

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے حبہ خاتون کی شاعری کا موضوع فطرت اور وصل و فراق کے معاملات ہیں اور ان میں اس کی اور اس کے پریم راجہ کی شخصیت کچھ اس طرح داخل ہوتی ہے کہ فطرت سے حظ اٹھانے کا دوسرا نام زندگی معلوم ہوتا ہے۔ یوں بیشتر ہندوستانی شاعری عورت کی طرف سے جذبۂ عشق کا اظہار ہے اور بے شمار دیویوں نے اپنے پریتم کو شاعری کا موضوع بنا کے پوجا ہے مگر پتی ورتا کا یہ درجہ کسی اور شاعرہ کو نہیں دیا جاسکتا۔ انگریزی شاعر پٹمور (Patmore) نے اپنے مجموعہ کلام "فرشتہ بخانہ" میں جس قسم کی محبت کا تصور پیش کیا ہے وہ حبہ ہی کے یہاں مل سکتی ہے۔ پتی پتنی کی محبت، دونوں کی باہم سرشاری، پھر کشمیر کی جادو بھری وادی اس شاعری میں کچھ ایسا طلسم بھر دیتے ہیں کہ اس سے زیادہ خالص شاعری کا تصور محال ہے۔

حبہ خاتون کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت کا تفصیل ذکر بھی تجزیے کی اہلیت چاہتا ہے اور یہ خصوصیت ہے اس کی نغمگی اور موسیقیت کہتے ہیں کہ حبہ نے کشمیر کے لوک گیتوں کے انداز پر اپنے گیت بنائے ہیں اور اس میں وہ بات پیدا کی ہے جسے کشمیری "لول" کا نام دیتے ہیں اور جس کا صحیح ترجمہ نہیں ہوسکتا۔ اس اصطلاح میں جذبہ اور نغمگی دونوں شامل ہیں۔ شاید اس سے مراد ہے (PASTORAL QUALITY)۔ بہر حال حبہ کی دنیا ایک ایسی دنیا ہے جس پر مینی آتن تو کیا درجل بھی رشک کرتا۔ میدانی علاقوں میں رہنے والے ہزار زور ماریں وہ کشمیر نہیں دکھا سکتے جو حبہ کی مٹھی میں تھا۔ اکبری دور کے فارسی شاعروں کا کشمیر تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ مکتب میں کوئی درس دے رہے ہیں۔ مزیدار بات یہ ہے کہ حبہ نے براہِ راست کشمیر کی کہیں تصویر کشی نہیں کی۔ ورنہ فراق بیان کرتے کرتے یا اپنے عشق کی حالت بتاتے بتاتے ایک دو لکیریں ایک دو رنگ ایسے مار جاتی ہے کہ سارا کشمیر اس میں تھرتھری لیتا دکھائی دیتا ہے۔ چونکہ اس کے اکثر گیت برہا کے گیت ہیں اس لئے کشمیر کے لوگ ان کو "وداکھ" کا نام دیتے ہیں۔ عجیب یہ ہے کہ ان میں عورت کے شکوے نہیں، اگر درد کی چیخیں اور بیمار کی کراہیں بھی نہیں۔ کچھ ایسی نغمگی اور طرب انگیز خوبصورتی سے دکھ کی بات کہی ہے کہ اس کا سننا اپنی جگہ ایک سکھ ہے۔ اس لحاظ سے کوئی شاعر اس کے مقابلے کا ذہن میں آتا ہے تو حافظ ہے جس نے رنج و غم کو نشاط و طرب میں بدل کے رکھ دیا۔

پریم ناتھ بزاز

کشمیری زبان اور اُس کے شعراء

زمانہ قدیم میں کشمیر میں کون سی زبان بولی جاتی تھی۔ اس مسئلہ پر محققین کی مختلف رائیں ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ہندوستان کے دوسرے حصوں کی طرح خطۂ کشمیر میں بھی عوام سنسکرت زبان بولا کرتے تھے۔ زمانہ کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ یہ زبان بگڑ کر پراکرت بن گئی اور اس کے بعد اس نے موجودہ کشمیری زبان کی صورت اختیار کر لی۔ لیکن کچھ لوگ اس رائے کو تسلیم نہیں کرتے ان کا خیال ہے کہ یہ تعلق ان آدمیوں ہی کی زبان ہے جو وسطِ ایشیا سے چل کر ہندوستان، ایران اور یورپ میں آباد ہوئے لیکن یہ زبان درحقیقت آریوں کی اس گروہ کی زبان ہے جس نے علاقہ دردستان میں بود و باش اختیار کر لی تھی اس لئے کشمیری زبان کا رشتہ ان زبانوں کے ساتھ ہے جو کوہ ہندوکش کے دامن میں بسنے والی قوموں میں بولی جاتی تھیں نہ کہ سنسکرت کے ساتھ۔ گو دونوں زبانوں کا منبع ایک ہے لیکن کشمیری اور سنسکرت ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ کشمیری اور سنسکرت میں اسی قدر یکسانیت ہے جتنی کشمیری اور ایرانی زبان میں۔ بہرحال حقیقت جو کچھ بھی ہو تاریخی واقعات کی بنا پر اتنا تو کہا ہی جا سکتا ہے کہ جو زبان آج کل وادیٔ کشمیر میں بولی جاتی ہے وہ کم از کم سات سو سال سے مروج ہے کیونکہ اس لمبے عرصے میں جو کتابیں وقتاً فوقتاً لکھی گئی ہیں ان میں یکسانیت پائی جاتی ہے ہاں اتنا صحیح ہے کہ آج کل کی زبان سات سو سال قبل کی زبان سے بہت مختلف ہے۔ اس وقت کی زبان میں سنسکرت کے الفاظ زیادہ ملتے ہیں اور اب اس میں فارسی، عربی، پشتو، پنجابی، ڈوگری اور انگریزی کے الفاظ بھی کافی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔

کشمیری زبان کا ادبی ذخیرہ بہت وسیع ہے۔ لیکن تقریباً سارے کا سارا لٹریچر منظوم شکل میں ملتا ہے۔ نثر میں بہت کم۔ کشمیری ادب کو چار ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے

پہلا دور

شتی کنٹھ سے شیخ نورالدین تک

دوسرا دور

حبہ خاتون سے ارنی مال تک

تیسرا دور

محمود گامی سے شروع ہو کر وہاب پرے پر ختم ہو جاتا ہے

چوتھا دور

یعنی موجودہ دور جو مہجور سے شروع ہوتا ہے۔

کشمیری زبان کی پہلی کتاب جو اس وقت ملتی ہے اور جسے حکومت کشمیر کے محکمہ ریسرچ نے شائع کیا ہے تیرھویں صدی عیسوی میں راجانک شتی کنٹھ نے لکھی تھی۔ اس کا نام مہانے پرکاش ہے لیکن سر جارج گریرسن کا خیال ہے کہ للہ عارفہ کی شاعری سب سے پرانی ہے۔ یہ عابدہ سلطان علاؤالدین کے عہد حکومت میں (۱۳۴۵ء) انتہائی کمال کو پہنچ چکی تھیں۔ شیخ نورالدین (نندہ ریشی) للہ عارفہ کے ہمعصر تھے اور کشمیر میں بہت بزرگ تسلیم کئے جاتے ہیں۔ دونوں کے عقاید اور فلسفہ حیات کشمیری زبان میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کتابوں کے نام بالترتیب للہ واکھ اور نور نامہ ہیں۔

سلطان زین العابدین (بڈشاہ) کے عہد حکومت میں سوم بٹ نے بادشاہ کی زندگی کے واقعات کشمیری زبان میں لکھے۔ اس کتاب کا نام "زینہ چرت" ہے۔ اسی زمانہ میں ایک اور کشمیری یودھ بٹ نے زینہ ولاس نامی ایک ڈرامہ لکھا جس میں بڈشاہ کی زندگی کا ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے۔

سلطان زین العابدین کے بعد ڈوگروں کے زمانہ تک کشمیری ادب نے بہت کافی ترقی کی اور اس زبان میں کافی کتابیں لکھی گئیں۔ اس دور کے مشہور شعراء اور ان کی قابل ذکر تصانیف یہ ہیں۔

۱۔ صاحب کول

کرشن اوتار۔ جنم چرت

۲۔ محمود گامی ساکن موضع ارودری (ویری ناگ)

یوسف زلیخا۔ لیلیٰ مجنوں۔ شیریں خسرو۔ ہارون رشید۔ برنج گنج

۳۔ نندہ رام جو پرمانند کے نام سے مشہور ہیں ساکن مٹن

سداماں چرت۔ رادھا سوئمبر۔ شوگن۔

۴ ۔ مقبول شاہ کرالہ واری

گلریز ۔ گریست نامہ ۔ پیر نامہ ۔ طہ نامہ ، بہار نامہ

منصور نامہ ، ایوب نامہ

۵ ۔ رسول میر ساکن شاہ آباد

کلیات رسول

۶ ۔ وہاب پرے ۔ ساکن ہاجن

شاہنامہ فردوسی ۔ اکبر نامہ ۔ ہفت قصہ گلریز ۔ قصہ چہار درویش ۔ قصہ نونہال گلبدن ۔ قصہ بہرام گور ۔ خلافت نامہ

۷ ۔ لکشمن جو ۔ ساکن ناگام

نظمیں

۸ ۔ پرکاش رام

رام اوتار چرت ۔ لوکشن چرت

۹ ۔ اسد پرے

کلیات اسد

۱۰ ۔ رمضان بٹ

اکرنندن

۱۱ ۔ کرشن داس ۔ ساکن دنیوہ

راس لیلہ ۔ شولگن

اس دور میں بھی چند ایک عورتوں نے کشمیری ادب کی ترقی میں خاصہ حصہ لیا ۔ ان میں تین شاعرہ قابل ذکر ہیں ۔

۱ ۔ روپہ بھوانی ۔ جس نے سترھویں صدی کے آخر میں شہرت پائی اس عارفہ کے کلام کو آج کل بھی کشمیری پنڈت گھرانوں میں بڑے چاؤ اور عقیدت سے پڑھا جاتا ہے ۔

۲ ۔ دوسری نامور دہقان زادی حبہ خاتون ہے جو اپنی قابلیت اور ہنرمندی کی بدولت سلطان یوسف شاہ چک (۱۵۷۹ - ۸۶ء) کی ملکہ بن گئی تھی ۔

۳ ۔ ارنی مال آخر دور اس دور کی تیسری نامور شاعرہ ہیں جن کی عشقیہ غزلیں اور محبت بھری نظمیں آج بھی ہر گھر میں گائی جاتی ہیں ۔

ادبی لحاظ سے اس دور کے کشمیری شعرا کا کلام بعض اوقات بہت بلند رہا ہے ۔ لیکن ان کے تخیل کا دائرہ زیادہ وسیع نہیں تھا اور وہ ان حدود سے باہر نہیں جا سکتے تھے جو فارسی اور سنسکرت نے پہلے ہی متعین کر رکھی تھیں حمد و ثنا گل و بلبل ، عشق و پیام یا زیادہ سے زیادہ ہجو ان کے عموماً موضوع ہوا کرتے تھے ۔ ان کے علاوہ وہ بہت کم کسی دوسرے موضوع پر کچھ کہنا جانتے تھے یا کہہ سکتے تھے ۔

کشمیری ادب میں محبت عورت سے شروع ہوتی ہے ۔ مرد سے نہیں جس طرح دوسرے ادبوں میں ۔ عورت ہی محبت سے بے قرار ہو کر مرد کو یاد کرتی ہے اور اس پر اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار ہو جاتی ہے ۔ کچھ مدت کے بعد مرد اس کا جواب دیتا ہے لیکن یہ محض دھوکہ ہوتا ہے کچھ دنوں کے لئے مرد عورت کے ساتھ رہتا ہے لیکن پھر دوسری عورت سے دوستی کر لیتا ہے اور پہلی عورت کو چھوڑ دیتا ہے پھر بھی وہ عورت نئی سوکن کے طعنے سہتے ہوئے اس مرد کی وفادار رہتی ہے ۔ یہی کشمیری شاعری کا عام موضوع ہے

کشمیری شاعری کا کافی حصہ خدا پرستی اور تصوف پر مشتمل ہے ۔ ان شاعروں نے اس بات پر زیادہ زور دیا ہے کہ تمام مذہبوں کا خدا ایک ہے ۔ رام اور رحیم ایک ذات کے دو نام ہیں کعبہ کا اللہ مندر کے بھگوان سے مختلف نہیں آدم کے دو بیٹے تھے ایک نے قبر کو اپنایا اور دوسرے نے شمشان کو ۔

شاعروں نے انسانیت اور انسانی روح کو برترین قرار دیا ہے جس کے سامنے فرشتے بھی جھکنے پر مجبور ہیں ۔ خدا اور حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے بھی اس دنیا کو سچا تصور کیا گیا ہے جو اللہ کا بنایا ہوا ہے اور جہاں انسان بلند سے بلند منزل تک پہنچ سکتا ہے

عشقیہ غزلوں میں ہی مال اور ناگرائے یا یوسف اور زلیخا کبھی نہ مٹنے والے عاشق و معشوق کے نام ہیں ۔

اس دور کے کشمیری شعرا نے مجبوری ناانصافی کے خلاف بھی کچھ نہ کچھ ضرور لکھا ہے لیکن وہ سیاسی ظلم یا اجنبی حکومت اور اس کی چیرہ دستیوں کے خلاف کوئی حرف شکایت زبان پر نہیں لائے ۔

کشمیری ادب کا نیا دور تقریباً ۱۹۳۰ء سے شروع ہوتا ہے جب واقعات عالم کے زیر اثر عموماً اور ہندوستانی تحریک حریت کی وجہ سے خصوصاً کشمیریوں نے بھی کروٹ لینی شروع کر دی اور اس پسماندہ ملک میں بھی ترقی و بیداری کے آثار پیدا ہونے لگے ۔ ان تیس سال میں کشمیری شاعری نے حیرت انگیز ترقی کی ہے بلا خوف و تردید کہا جا سکتا ہے کہ کشمیری ادب میں اس وقت ایسے بھی شہ پارے موجود ہیں جن میں تخیل کی [illegible] تی مناظر کی رنگین بیانی ،

فلسفۂ حیات کی گہرائی دوسری زبان کے شاعروں کے مقابلہ میں کم نہیں پائی جاتی ہیں۔

موجودہ دور کے نامور شعراء میں غلام احمد مہجور، عبدالاحد ڈار آزاد، ماسٹر زندہ کول، نندہ لال کول خستا، دینا رام نادم، غلام حسین بیگ عارف، عبدالستار عاصی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

بہت کافی عرصہ تک سیاسی غلامی میں رہنے کی وجہ سے کشمیری آج تک بھی اپنی زبان کو سائنٹیفک طریقہ سے سنوار نہیں سکے۔ اجنبی حکومت کی بے توجہی، غفلت، بلکہ مخالفت کی وجہ سے اس زبان کی ابتدائی کتابیں تک موجود نہیں ہیں۔ اگرچہ اس زبان میں لٹریچر کافی ہے لیکن اس کی کوئی باضابطہ تعلیم نہیں دی جاتی تھی۔ سرکاری یا غیر سرکاری مدرسوں میں اس کو پڑھایا نہیں جاتا تھا یہی وجہ ہے کہ نثر میں کافی کتابیں موجود نہیں جو کچھ لکھا گیا ہے یا آج کل بھی لکھا جاتا ہے نظم کی صورت میں ہے ایسا نہیں کہ نثر میں لکھنے یا ابتدائی کتابیں بنانے کی کوشش ہی نہیں کی گئی۔ چند محب وطن اور بلند حوصلہ نوجوانوں نے وقتاً فوقتاً ایسی کوششیں ضرور کی ہیں پروفیسر شری کنٹھ توشہ خانی نے کشمیری زبان کی چند اضافتیں ایجاد کر کے دیوناگری رسم خط میں پانچ ابتدائی ریڈریں تیار کی تھیں جن کو ودیا دھرم پرچار ٹرسٹ نے شائع کر کے اپنے زنانہ سکول میں رائج بھی کر دیا تھا۔ ایک مسلم نوجوان مسٹر محمد امین نے فارسی رسم خط میں کشمیری زبان کا پہلا ہفتہ وار اخبار "گاش" بھی نکالا اس کے علاوہ سرینگر کے چند سرکردہ جریدے بھی کشمیری زبان کے لئے اپنا کچھ حصہ وقف کرتے رہے۔ لیکن جب تک پسماندہ ملکوں میں حکومت کی امداد شامل حال نہ ہو ایسی تحریکوں کا بار آور ہونا مشکل ہو جاتا ہے۔ غیر ملکی خودگرضوں نے کبھی اس کام میں دلچسپی نہیں دکھائی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ تحریکیں مدھم پڑتی گئیں اور اس میں وہ زور نہ آسکا جس کی یہ حقدار تھیں۔

بہرحال کشمیری شعراء کو یہ رکاوٹیں پیچھے نہ ہٹا سکیں اور وہ روز بروز ترقی کرتے گئے۔ قومی بیداری کے ان بیس سالوں میں وادیٔ کشمیر کے اندر تقریباً پچاس شاعر پیدا ہوئے۔ جنہوں نے اپنے کلام سے کشمیری ادب کو بہت مالدار بنا دیا۔ ان سب میں جن چند کو نمایاں جگہ مل سکتی ہے ان میں پیش پیش عبدالاحد ڈار آزاد کی ذات ہے جس نے پرانی بندشوں اور روایات سے بلند ہو کر اپنے کلام سے کشمیری زبان کو موجودہ دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کی صف میں لا کھڑا کیا۔

شاعرِ کشمیر — مہجور کاشمیری

تین ہا تو

میں کشمیری ہوں، —— ایک ہاتو۔ صرف اس لحاظ سے کہ میرے آبا و اجداد کشمیر سے ہجرت کرکے یہاں تشریف لائے (خدا معلوم کب؟) یہ عجیب بات ہے کہ میں نے آج تک کشمیر نہیں دیکھا۔ صرف بانہال تک گیا ہوں۔ لیکن میرے والد صاحب تو وہاں تک بھی نہ پہنچ سکے تھے۔ یہ اور بھی عجیب بات ہے کہ میرے والد صاحب کو کشمیریوں سے عشق تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ کبھی کبھی اس عشق کے زیرِ اثر کسی "ہاتو" یعنی کشمیری مزدور کو پکڑ کر اپنے ساتھ لے آیا کرتے تھے اور اُسے بیٹھک میں بٹھا کر بڑے فخر سے کہا کرتے تھے "میں بھی کاشر ہوں"۔

لڑکپن میں والد صاحب کی یہ بچگانہ جذباتی حرکت مجھے بڑی مضحکہ خیز معلوم ہوتی تھی۔ لیکن اب میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ مجھے بھی کشمیر اور کشمیریوں سے وہی والہانہ اور غیبی محبت اور الفت ہے جو والد صاحب مرحوم کو تھی:

اسی جذبے کے زیرِ اثر میں اس کتابچے کے متعلق کچھ کہ رہا ہوں، حالانکہ شاعری سے مجھے کوئی شغف نہیں۔

عرصہ ہوا۔ والد مرحوم نے مجھے بتایا تھا کہ ایک شاعر غنی ہوا ہے۔ بہت بڑا شاعر۔ فارسی کا شاعر۔ جس کی شاعری کی دھوم ایران میں بھی مچی تھی۔ انھوں نے بتایا تھا کہ ایران کا ایک شاعر (شاید بیدل چل کر) کشمیر گیا اور غنی کے گھر پہنچا۔ اُس نے دیکھا کہ دروازہ کھلا ہے۔ لیکن پھر بھی اُس نے دستک دی۔ اندر سے ایک خستہ حال آدمی نکلا۔ ایرانی شاعر نے اُس سے کہا کہ وہ ایران سے غنی کاشمیری سے ملنے آیا ہے۔ خستہ حال آدمی نے ایرانی شاعر سے کہا "آپ تشریف رکھیے۔ میں انھیں بلا کر لاتا ہوں"۔

وہ اپنے مہمان کی مہمان نوازی کے لیے کچھ بندوبست کرنے چلا گیا۔

یہ خستہ حال آدمی غنی کاشمیری تھا، جس کی فارسی شاعری کی دھوم ایران تک پہنچ چکی تھی۔ وہ چلا گیا اور وہ ایرانی شاعر وہاں کمرے میں بیٹھ گیا۔ دیر تک بیٹھا رہا۔ مگر غنی کاشمیری نہ آیا۔ تنگ آکر اُس نے اپنی بیاض فرش پر رکھ دی۔ جس میں اُس کا ایک شعر نامکمل تھا۔ اُس نے مصرعہ ثانی لکھا تھا۔ لیکن مصرعہ اولیٰ اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ مصرعہ ثانی یہ تھا ؎

کہ از لباس تو بوئے کباب می آید

بیاض چھوڑ کر ایرانی شاعر چلا گیا کہ وہ انتظار کرتے کرتے تھک گیا تھا۔ جب وہ چلا گیا، تو غنی کاشمیری آیا۔ اُس نے دیکھا کہ بیاض کھلی پڑی ہے اور اُس کے کھلے ہوئے صفحے پر ایک نامکمل شعر درج ہے جس کا مصرعہ ثانی یہ ہے:

؎ کہ از لباس تو بوئے کباب می آید

غنی کاشمیری نے فوراً قلم اُٹھایا اور مصرعہ اُولیٰ لکھ دیا:

؎ کدام سوختہ جاں دست زد بدامانت

یہ میں نے سب کچھ تمہیداً عرض کیا ہے، اصل میں مجھے اپنی اُس عقیدت، محبت اور کشش کا اظہار کرنا تھا جو مجھے کشمیر اور کشمیریوں سے ہے کشمیر میں نے نہیں دیکھا، لیکن کشمیری دیکھے ہیں۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ میں نے مہجور نہیں دیکھا، جسے میرا عزیز دوست نصیر نہ صرف دیکھ چکا ہے بلکہ اُس سے مل چکا ہے۔

مجھے یہ بھی افسوس ہے کہ میں کشمیری زبان سمجھ سکتا ہوں، نہ بول سکتا ہوں۔ لیکن نصیر یہ زبان سمجھتا بھی ہے اور بولتا بھی ہے اور چونکہ وہ ذوقِ سلیم رکھتا ہے اس لیے اُس نے مہجور کے ترقی پسند خیالات کا ترجمہ کیا اور بڑی خوبصورت نثر میں آپ کی خدمت میں پیش کر دیا۔

نصیر بھی کشمیری ہے، حالانکہ اُس کے خدوخال سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ تبت کا رہنے والا ہے۔ اُس کا رنگ گہرا سانولا ہے جو کشمیریوں کا نہیں ہوتا، لیکن وہ کشمیری ہے، اُس کا دل کشمیری ہے ــــ اُس کے گردے کشمیری ہیں ــــ وہ مہجور نہیں ہے، لیکن اُس کا عاشق ہے، اُس کا پرستار ہے وہ جب مہجور کی باتیں کرتا ہے، تو میں محسوس کرتا ہوں کہ وہ اُس فضا کی باتیں کر رہا ہے جو کشمیر ہے جس میں میرے آبا و اجداد کسی زمانے میں رہا کرتے تھے اور وہاں کے حکمران کے جور و ستم سے تنگ آ کر ہجرت کر آئے تھے۔

مجھے ندامت ہے کہ میرے آبا و اجداد نے ہجرت کی۔ جور و ستم سہنا بہت بڑی بات ہے لیکن ہجرت بہت بڑا فرار ہے۔ مہجور نے ظلم و ستم سہے۔ اُس نے سب سے بڑی اذیت جو ذہنی خصوصیت ہے، برداشت کی۔ مگر وہ ڈٹا رہا۔ ہجرت کا خیال تک بھی اُس کے دماغ میں نہ آیا۔ وہ وہیں رہا، جہاں کا وہ تھا۔

ہجر، ہماری رومانوی شاعری کا ایک اہم جزو ہے ــــ معلوم نہیں یہ کیا بلا ہے، کیونکہ اس سے مجھے آج تک واسطہ نہیں پڑا۔ لیکن مہجور کے کلام کا ترجمہ پڑھنے کے بعد میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اُس کا ہجر ہی اُس کا وصال تھا۔

ایک عجیب بات اور ہے کہ آج کل پاکستان اور ہندوستان میں کشمیر کا جھگڑا چل رہا ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو بھی کشمیری ہے۔ اُسے کشمیر سے محبت ہے جیسی مجھے ہے، جیسی نصیر کو ہے، جیسی کسی اور کشمیری کو ہو سکتی ہے ــــ کاش مہجور زندہ ہوتا ــــ اگر وہ زندہ ہوتا تو میں سمجھتا ہوں، ڈاکٹر گراہم کی ضرورت پیش نہ آتی۔

وہ اپنے قلندرانہ انداز میں جواہر لال نہرو اور خواجہ ناظم الدین کو (یہ بھی کشمیری ہیں) سمجھا دیتا کہ دیکھو انسان کا خون پانی سے ارزاں نہیں ہے کشمیری خواہ وہ مسلمان ہو، یا ہندو، ہر حالت میں کشمیری ہے۔ تم جواہر لال نہرو ہو ــــ یہ ناظم الدین ہے۔ دونوں کشمیری ہو ــــ حالانکہ تم کشمیر کے باشندے نہیں ہو۔ لیکن تمہاری روح کشمیری ہے ــــ تم گوگ جی اور بت (شلغم اور چاول) کو اپنے دسترخوان سے کبھی نکال نہیں سکتے۔ پھر تم کیوں لڑتے ہو شلغم اور بھات کی قسم کھاؤ، کیا تم ایک دوسرے کے گریبان میں ہاتھ ڈال سکتے ہو؟

سعادت حسن منٹو

۱۹ر نومبر ۱۹۵۲ء

مہجور کی پانچ نظمیں

زہر خند

کشمیر کی حسین وادی تیرے دامن میں
زعفران کی مہک ہے بہار کی رنگینی ہے
تو اترا رہی ہے کہ دُور سے آنے والے
تیری رعنائی پر مرتے ہیں تیرے شیدا ہیں

تو شیدائیوں کے ہجوم میں بھول گئی ہے۔
وہ انسان جس نے تمہیں زندگی عطا کی
خود زندگی سے محروم ہوا جاتا ہے۔
دیکھ میری آنکھوں سے دیکھ
تیری جھولی رنگین پھولوں سے بھری ہے۔
ان پھولوں کو سونگھ ان میں زندگی کا خون ہے۔

جو ہر مدتِ گل کو رنگین بنا چکا ہے۔
دیکھ اپنی خمار آلود آنکھوں سے
ان غریب ڈھانچوں کو دیکھ
جنھوں نے اپنے خون سے تمھیں رنگینی بخشی
دیکھو ان زرد چہروں کو دیکھ
جن پر ہر لحظہ یاس و حسرت کی بدلیاں چھائی رہتی ہیں
اے حسین وادی!
اپنی بہاروں کی چھاؤں میں اس خزاں رسیدہ ہجوم پر بھی ایک نظر ڈال
شاید تو مسکرانا چھوڑ دے
یہ مصنوعی ہنسی اب تمھیں زیب نہیں دیتی!

برف

"اے برف!
میں افلاس زدہ تجھے بلند چوٹیوں پر سے اٹھا لایا ہوں
تو نے وہاں سیاہ پہاڑیوں کی ہیبت کو اپنے سیمیں آنچل سے چھپا رکھا تھا۔
لیکن میں غربت کا مارا تمھیں اٹھا لایا
اور سبزہ زار کی ہری ہری گھاس میں
چھپا کر بازار میں چل پڑا
تاکہ تمہیں بیچوں
لیکن تو اتنی باحیا ہے
کہ جونہی سورج کی شوخ کرنیں سیاہ پہاڑوں کی اوٹ سے
تمھیں دیکھنے کی کوشش کرتی ہیں
تو تو مارے شرم کے پانی پانی ہو جاتی ہے"۔

کشتی

میں کشتی میں سوار ہو چکا تھا
مانجھی ایک سواری کے انتظار میں
ابھی کشتی کنارے لگائے بیٹھا تھا
یکایک ایک صاحب کا خود پسند چہرہ نمودار ہوا
اس کی اکڑی ہوئی گردن ایک طرف کو اٹھی
اس نے تحکمانہ انداز میں کہا
"چشمۂ شاہی چلو......"
وہ طمطراق سے کشتی میں سوار ہوا
اور اس کے بیٹھتے ہی کشتی کنارے سے دور ہونے لگی
ہم ایک ہی کشتی میں سوار تھے
صاحب، مانجھی اور میں
اکیلا مانجھی ہی زور زور سے چپو چلا رہا تھا
ماحول کی رنگینی
مناظر کی دلکشی
اس پر حرام تھیں
وہ چپو چلانے میں مصروف تھا
اس کی دونوں کہنیاں بار بار
اس کے پیٹ سے ٹکراتیں
جیسے اشاروں ہی اشاروں میں
سمجھا رہی ہوں
ذرا صبر کرو
بس تھوڑی ہی دیر میں
تمہارے سامنے چاولوں کا تھال ہوگا
شلجم کا شوربا ہوگا
دیکھو، دیکھو
کشتی میں صاحب بیٹھا ہے
لیکن پیٹ کی آنکھیں کہاں
وہ تلملاتا رہا
اور کہنیاں اس سے بار بار تیزی سے ٹکراتی رہیں
اچانک میری نگاہ صاحب پر اٹھی
وہ تکبر کا بت بنا ہوا تھا
اور آنکھوں ہی آنکھوں میں
اپنی بلندی کا جائزہ لے رہا تھا
اس کی اجنبی نگاہیں

ان پہاڑوں پر مرکوز تھیں
جو بستی کے سامنے کھڑے تھے
ہم ایک کشتی کے مسافر
ایک دوسرے کے قریب : تھے ہوئے بھی
ایک دوسرے سے کتنی دور ہیں ۔
مجھے اس خیال پر وحشت ہونے لگی ۔
میں نے مانجھی کے ہاتھوں سے دونوں چپو چھین لیے ۔
ایک چپو صاحب کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا
آؤ ہم دونوں کشتی چلائیں
اس مانجھی کو بلندی و پستی کا جائزہ لینے دو ۔
لیکن میری ہمدردی محض دیوانگی بھی گئی
آناً فاناً مانجھی میری طرف لپکا
اسے یہ کیا حرکت ہے
صاحب کی توہین کرتا ہے
صاحب نے اپنی ہوشمندی کا تقاضا
پورا کرتے ہوئے کہا
یہ پاگل معلوم ہوتا ہے
اور میں سچ مچ پاگل بن گیا
میں نے پانی میں چھلانگ لگا دی
کشتی کو دونوں ہاتھوں سے جھنجھوڑا
تاکہ الٹ جائے
اور ہم ایک ہو کر
حیات و موت کی کشمکش میں
برابر کا حصہ لیں
لیکن صاحب کا اشارہ پاتے ہی
مانجھی نے میرے ہاتھوں کو چپوؤں سے زخمی کیا ۔
کشتی چھوٹ گئی
میں غوطے کھانے لگا
اور جب سطح آب پر ابھرا
تو میں نے حسرت ناک نگاہوں سے دیکھا
کشتی دور نکل چکی تھی
صاحب قہقہے لگاتا ہوا زور سے کہہ رہا تھا
"وحشی قسم کا پاگل معلوم ہوتا تھا"
پیٹ کے بندے نے جواب دیا
"ہاں جی ۔۔!"
لیکن اس کے باوجود کہنیاں برابر
اس کے پیٹ سے ٹکرا رہی تھیں ۔

"شرابی"

میں گنگناتا ہوا چلا جا رہا تھا ۔
اچانک ہی لڑکھڑا کر نالی کے قریب گرا
راہگیروں نے یہی جانا
میں ہوش و حواس سے بیگانہ ہوں
انھوں نے اپنے ہوش حواس کا اظہار کرتے ہوئے کہا
"ارے یہ تو شرابی ہے
لڑکوں نے یہ سنا تو آواز بلند کی
"شرابی ہے ..... شرابی ہے
اور مجھ پر کنکر پھینکے
کاش یہ کنکر اسی طرح معصومانہ انداز میں
مجھ پر برستے رہیں
اور میں یونہی تماشا بن سکوں
ان لڑکوں کو کتنی خوشی حاصل ہوتی ہے
یہ خوشی بر خود غلط سہی
خوشی تو ہے
کتنی معصوم
جو سوائے مسرت کے اور کچھ بھی نہیں
ہوش و حواس کا ڈھنڈورا نہیں ۔
عقل و خرد کا اظہار نہیں
میرے زخم کیوں نہ مسکرائیں
اتنے میں سیاہ پتھر کا ایک مجسمہ

زندگی کا سہارا ہے
سفید لباس میں نمودار ہوا
ہجوم کو چیرتے ہوئے میرے قریب رُکا۔
سکتے ہی پیچھے ہٹا۔
اس کی پیشانی پر نیکی کا سیاہ دھبہ نمایاں تھا۔
اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے دستار سنبھالی
اور منقش جُبّے کو تھامے — یوں کہنے لگا
"شرابی! مردود!"
مجھے اپنی بے بسی پہ ہنسی آ رہی تھی۔
لیکن اس کی مغرور نیکی گھمنڈ میں آ گئی۔
"دیکھا اس قدر ذلیل اور بے غیرت ہے!"
تماشائیوں نے آپس میں سرگوشیاں کیں۔
عالم کی عالمانہ باتیں
ان کے دل و دماغ پر چھا گئیں۔
وہ دُور ہٹنے لگے۔
جھلکی ہوئی نیکی آپے سے باہر ہو گئی
"اس شرابی کتے کو پڑا رہنے دو
تاکہ لوگ عبرت حاصل کر سکیں"
خیالات کا طوفان میرے سینے میں مچل رہا تھا
میں بے اختیار چلا اُٹھا
"اے لوگو!
عبرت حاصل کرو
ہزار برس کی سجدہ ریزی
تکبر کی سربلندی سے ملوث ہوتی
اس عالم کو دیکھو تمہاری جہالت نے
اسے علم و حکمت سے سرفراز کیا
لیکن یہ منکر ہے۔
تمہاری لاعلمیوں نے اسے منبر پر جگہ دی
تم نے خود کو پست سمجھتے ہوئے
اسے بلند مرتبہ دیا۔

اس پر نظر ڈالو
یہ تمہارے درمیان رہتے ہوئے بھی
تمہارے ساتھ نہیں رہتا
سے تمہارا نہیں
اپنا خیال ہے
پر تم سب کچھ جانتے ہوئے بھی
کچھ نہیں سمجھتے
تمہاری خواہشات نے
تمہارے لیے کئی معبود پیدا کیے ہیں
اے نیک بھکاریو
یوں ہاتھ پھیلانے سے عبادت نہیں ہوتی
خود غرضی کے پتلو!
یوں انسانیت کو رسوا نہ کرو
کہاں ہے تمہاری خود اعتمادی
اُسے آواز دو
زندگی تمہاری ہو گی
میں نے تمہیں انسانیت کی راہ پر چلنے کا اشارہ کیا
لیکن تم خیالات کے تنگ حصاروں میں مقید رہے
تم پگڈنڈیوں پر قدم اُٹھاتے رہے۔
میں تمہیں زندگی کی شاہراہ پر پکارتا رہا۔
تم نے ایک نہ سُنی
تمہارے ماحول نے تمہیں جکڑ رکھا تھا
میں نے لاکھ چاہا، تم میرے قریب آؤ
پر تم نہ آئے
مجھے اپنی بے بسی پر ہنسی آ گئی
کون جانے یہ مسکراہٹ
رنج و الم کے طوفان کی لہر ہے
کون جانے کہ اس زہرخند کے احساس کو مٹانے کے لیے
میں نے تند شراب کی تلخیاں برداشت کیں
اسے تم خود فریبی کہو

یا خود فراموشی کی ناکام کوشش
تم جو کچھ چاہو کہہ سکتے ہو۔
یہی تاثر میں شرابی ہوں
لیکن تم کہو
اس انداز سے
کہ مجھے یقین ہو جائے
کہ یہ تمہاری اپنی آواز ہے
یہ کہتے ہوئے میں نے
اپنی بوجھل پلکوں کی چھاؤں میں
مخمور نگاہوں سے خاموش ہجوم کو دیکھا
فکر و آلام کی گرد سے اَٹے ہوئے چہرے
کھوئے کھوئے سے دکھائی دینے لگے
چھپی ہوئی ہمدردی اُن کی آنکھوں میں سمٹ آئی
ان کے دل چوری چوری میرے سینے میں دھڑکنے لگے
ان کے خشک ہونٹوں پر آواز تھرتھرانے لگی
وہ لب کشائی پر آمادہ ہی تھے
کہ یکایک عالمانہ خباثت جوش میں آئی
"اے خدا کے نیک بندو
خداوندِ قدس کے قہر سے ڈرو
شرابی کی بہکی ہوئی باتیں
تمہارا ایمان تباہ کر دیں گی
اے خدا کے نیک بندو
قیامت کے روز تمہیں جواب دینا ہوگا
جان لو کہ تمہارا کیا حال ہوگا
سوائے جہنم کے تمہیں کہیں پناہ نہ ملے گی"
عاقبت کے مارے ہوئے ہجوم پر سناٹا چھا گیا۔
خوف و ہراس سے اُن کی آواز گھٹ گئی
میری چیخیں سنسناتے ہوئے تیروں کی مانند
خاموش فضاؤں کو چیرنے لگیں
"میرے رفیقو!

مجھے یوں نہ چھوڑو
اگر ٹھکرانا ہے
تو اپنے پاؤں سے ٹھکراؤ
اور اپنی زندگی کی شاہراہ پر قدم بڑھائے چلو
میں تمہاری راہ میں اگر پتھر ہوں
تو مجھے اپنی ٹھوکر سے لڑھکا دو
لیکن قدم اٹھانے سے پہلے
میری آواز سن لو
میں شرابی ہوں
مجھے انگور کا نشہ ہے
یہ عالم بھی شرابی ہے
اسے علم کا نشہ ہے
تم بھی شرابی ہو
تمہیں خواہشات کا نشہ ہے
وہ بھی شرابی ہے
جو قیامت کے روز
تمہیں جہنم میں پناہ دے گا۔
وہ —
اس دنیا کا خالق
جسے تخلیق کا نشہ ہے
جو کسی جنت میں سرشار ہے
جو نہیں جانتا، کہ اُس کی حسین تخلیق
مسخ ہو چکی ہے
اس کی دنیا جہنم بن چکی ہے
زندگی جھلس رہی ہے۔
اس کے شاہکار خاکستر کیے جا رہے ہیں
ہوش و حواس کے دعویدارو
اپنے خالق سے پوچھو
وہ ہوش و حواس سے بیگانہ کیوں ہے؟
اسے پکارو

وہ اپنی آنکھوں سے اپنی دنیا کو دیکھے۔
اور ہمیں بتلائے
کیا اس جہنم کے ہوتے ہوئے بھی
کسی دوسرے جہنم کی ضرورت ہے؟
وہ کون سی جنت ہے۔
جس کا سہانا تصور
ان دوزخیوں کو عطا کیا گیا؟
لیکن نہیں ـــ۔
تم میں اتنی جرأت ہی کہاں
تمہاری آواز ہی نہیں
تم محض صدائے بازگشت ہو!
یہ کہہ کر میں نے خاموشی اختیار کر لی
ہجوم کے سینوں میں
اضطراب کروٹیں لے رہا تھا
کیوں ـــ؟
ابھی وہ سمجھنے بھی نہ پائے تھے
کہ سیاہ مجسمہ حرکت میں آ گیا۔
اس نے اپنی سیاہ چادر کو پرچم بنا دیا
اور بلند آواز سے کہنے لگا
"اے خدا کے نیک بندو!
اس شرابی کی باتوں میں
کہیں بہک نہ جانا
یہ شرابی ملحد ہے
جہنمی ہے
یہ تمہیں دوزخ کی راہ دکھا رہا ہے
لوگوں کا اضطراب
دل ہی دل میں گھٹ گیا
ان کی اپنی آواز دب چکی تھی
آن کی آن میں صدائے بازگشت کی گونج لہرانے لگی
طعن و تشنیع کا طوفان اٹھا

سب نے اپنی اپنی نیکی کا سامان پیدا کیا
سب نے جنت کی راہ اختیار کر لی
اور مجھے یک و تنہا چھوڑ کر
سب کے سب بڑبڑاتے ہوئے سدھار گئے
حیرت کون حاصل کرے!
اب تو یہاں کوئی بھی نہیں!!
فقط میں ہی ہوں
شرابی
ملحد
جہنمی
اب یہاں کون ہے جو زندگی کی آواز سمجھ سکے۔
اب تو ہر طرف سناٹا مسلط ہو گیا ہے
کتنی دیر تک میں یونہی محو خیال رہا
یہاں تک کہ شام کی تاریکی پھیلتی گئی
میرے پاؤں منجمد ہو چکے تھے
میرا جسم برف کا تودا بن چکا تھا۔
یخ بستہ موت میری طرف سرد ہاتھ
پھیلا رہی تھی
یکایک قدموں کی آہٹ سنائی دی
اس آہٹ میں زندگی کی آواز تھی
جو میرے قریب آتی گئی
میرے دل میں اترتی گئی۔
آپ ہی آپ مجمد تودے میں
چنگاری سی سلگ اٹھی
انجمادی کیفیت زائل ہونے لگی
کیوں ـــ؟
کیا مجھے جینا ہے؟
ہاں تمہیں زندہ رہنا ہے!!
میرے ہمدم نے پہلے ہی ایک بار
مجھے چونکا دیا تھا۔

لیکن جام وسبو کی رنگینی
چھلک کر میری آنکھوں میں سماگئی ۔
مسلسل اضطراب نے آوارگی پیدا کر دی
میں لڑکھڑاتا رہا
شرابی جو ٹھہرا
لیکن آج زندگی کی آواز نے
مجھے چونکا دیا
مجھے یوں محسوس ہوا
جیسے میری گمشدہ روح اسی آواز میں
سمٹ گئی ہے
میرا جسم احساس ندامت کے بوجھ سے
چور چور تھا ۔
باہمت بازوؤں نے مجھے اپنے پاؤں پر
کھڑا کیا
میں آہستہ آہستہ قدم اُٹھانے لگا
میں نے اپنے ساتھی کو بغور دیکھا
اس کی پیشانی عرق آلود تھی
اس کی آنکھوں میں لازوال ستاروں کی چمک تھی
اس کا چہرہ عزم کا چہرہ تھا
پاؤں میں استقلال تھا
وہ ٹھکرایا ہوا تھا
لیکن زمانہ اُس کی ٹھوکر میں تھا
اس کی غیر فانی آواز
زندگی کا احساس دلانے لگی ۔
یہ دنیا یونہی خندہ زن رہے گی
باطل کی مسکراہٹ شراب میں
تحلیل نہ کرو
یہ حق کب تک زہر آب پیے گا ۔
سوچو
خود فریبی سے گریز تمہیں نے سکھایا
خود فراموشی سے راہِ فرار تمہیں نے دکھائی
تم احساسِ درد کو
بھول جانے کی ناکام کوشش میں
سراپا زخم بن چکے تھے
زخمی دنیا کو صحت مند وجود کی ضرورت ہے
میری طرف دیکھو
سنہری زنجیروں نے مجھے جکڑ رکھا ہے
میرا ہر سانس خلش بن کر میرے سینے میں کھٹکتا ہے
لیکن اس خلش میں
مجھے جو جہد وجہد حاصل ہے
وہ نئی زندگی کی تعمیر کا باعث ہو گی
اور اُس وقت مجھے تمہاری ضرورت محسوس ہوئی
تم زندگی کے نغمے لامتناہی فضاؤں میں بکھیرنا
میں مسرت و شادمانی سے سرشار ہو کر
نئی دنیا آباد کروں گا
جہاں خدا انسان کے روپ میں
جلوہ گر ہو گا
جہاں بلندی کا سہارا پستی نہیں ہو گی
جہاں مساوات کا خواب
شرمندۂ تعبیر ہو گا
آنکھیں کھولو
وہ دیکھو!
سامنے بلند عمارت میں ایک بدترین
شرابی رہتا ہے
جو مظلوم انسانوں کا
لہو پیتا ہے ۔
وہ خونی نشے میں بدمست ہے
دیکھو ..... دیکھو ..... !!
میرے رفیق کی کانپتی ہوئی آواز خاموشی میں گم ہو گئی
وہ محنت کے نشے میں سرشار تھا

وہ سچا شرابی تھا
میں نے بے اختیار اُس کی پیشانی چوم لی
اور سرشار ہو کر
صرف اتنا کہہ سکا
ہاں مستقبل تمہارے ہاتھ میں ہے
آج کی رات تاریک سہی
لیکن کل کی صبح روشن و درخشاں ہوگی۔

اشرف المخلوقات

پہاڑوں کے اُس پار
مجھے زندگی نے آواز دی
مست ہواؤں نے میٹھے گیت سنائے
میں والہانہ انداز میں آگے بڑھتا گیا۔
یکایک ایک پہرہ دار نے
مجھے روک لیا
تم اس سرحد کو پار نہیں کر سکتے
پروانۂ راہداری دکھاؤ
میں جہاں چاہوں جا سکتا ہوں
میں اس زمین کا وارث ہوں
میں اس دھرتی کا فرزند ہوں
مجھے ہواؤں نے زندگی کا پیغام سنایا ہے
مجھے آگے بڑھنے دو"
پہرہ دار نے اپنے ایک ساتھی سے کہا
اس پاگل سے کہو
دور ہٹے
ورنہ کال کوٹھڑی میں ڈال دیا جائے گا
نہیں نہیں
میں آگے بڑھوں گا
مجھے مت روکو"
"چلے جاؤ یہاں سے"
اس نے غصہ میں کہا
میں سوچتا ہی رہ گیا
کیوں؟
اتنے میں
ایک خوبصورت پرندہ
اپنے چمکیلے پروں کو
پھڑپھڑاتا ہوا
زور زور سے تالیاں بجاتا
ہمارے سروں پر سے گزر گیا
اور دیکھتے ہی دیکھتے
سرحد کے اُس پار
نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

بہار کے ساتھ ساتھ

تازہ سویرا بھی آ رہا ہے

ادب — آرٹ — کلچر

۲۷

سویرا

ترتیب

حنیف رامے — سیّدہ شاہین

تازہ سویرا کا دامن بہار کی خوشبو سے لدا ہوا ہے

نیا ادارہ

۱۵ - سرکلر روڈ ، لاہور

عزیز احمد

آگ ـــــ سُلگتی ہوئی

جس زمانے سے خواجہ غضنفر جُو نے عبدالرب کے ساتھ کارواں کو تجارت کا مال وسط ایشیا اور تبت سے لاتے دیکھا تھا، اُسی وقت سے کے بیچھے دومنزلے کے وسیع دالان میں شطرنجیوں کا فرش تھا۔ بڑے بڑے قالین بچھے ہوئے تھے۔ گاؤ تکیوں کی طرح پیٹے ہوئے دیواروں سے لگے رکھے تھے جن کے سہارے خواجہ سکندر جو دوئی میں لپٹے ہوئے بیٹھے صبح کا سماں دیکھا کرتے تھے۔ مقابل، جہاں کسی زمانے میں رنجیا اسمنوقن کا قہوا سے دکان تھی۔ وہاں اب باقر جُو نے اپنی دکان ایران کے ٹیپسٹری اور ریپن، اسٹیچنگ کے کام کا ایک چھوٹا سا شوروم کھول رکھا تھا۔ علی الصباح سڑک پر چھوٹے چھوٹے دوکان داروں اور نوکروں کی بہو بیٹیاں اور کل سیال مخلوق کی عورتیں جس کا کسی پیشے سے کوئی خاص تعلق نہیں ہوتا، رفعِ حاجت کے لئے یا جہلم کے کنارے منہ دھونے یا سودا سلف خریدنے نکلتیں اور خواجہ سکندر جُو اپنا چھوٹا سا حقہ گڑگڑاتے ہوئے یہ منظر دیکھتے رہتے

پھر وہ انگڑائی لے کے اٹھتے اور انور جُو سے تازہ خبروں کا حال پوچھتے انور جو تازہ کشمیری اُردو اخبار پڑھتا ہُوا دوسرے قالین کا تکیہ لگائے اُوٹا اونی ڈریسنگ گون پہنے، اخبار پڑھتے پڑھتے کبھی ہنسنے لگتا اور پنڈت پریم ناتھ بزاز کا کوئی لطیفہ اپنے والد کو سناتا۔ شیخ محمد عبداللہ کا مذاق اڑانے کے لئے کچھ کہتا اور جب قائداعظم کا نام اخبار میں کہیں آجاتا تو اس کا چہرہ ادب اور اعتقاد سے سنجیدہ ہو جاتا اور قائداعظم کے متعلق باپ بیٹے میں اکثر بحث ہو جاتی لیکن اب خواجہ سکندر جُو بھی نیشنل کانفرنس اور شیرِ کشمیر کی کانگریس پرستی سے اکتاتے جا رہے تھے ــــ مسلمان تاجر اور اُمراء سب نیشنل کانفرنس سے دور ہٹ رہے تھے اور مسلم کانفرنس کے جدید دور کی بنیاد پڑ رہی تھی۔

پھر آٹھ بجے کے قریب باپ بیٹے دونوں کی یہ الساہٹ یک لخت ختم ہو جاتی انور جُو اپنے کمرے میں جا کے اپنی بیوی مریم سے لپٹ کے جلدی جلدی شیو کرنے لگتا۔ پھر حمام کرنے چلا جاتا اور خواجہ سکندر جُو وہیں بالاخانے کے دالان میں شیو کرنے کے لئے گرم پانی اور شیو کا پوریا سامان منگواتے، ناشتے پر ماں باپ، بیٹا، بہو اور اگر بیٹی میکے آئی ہوئی تو وہ بھی، سب اکٹھا ہوتے۔ سکندر جُو کی سوتیلی والدہ کلثوم جس کے چہرے پر کشمیری عورتوں کی وہ دلکش جھریاں پڑ چکی تھیں۔ اور جو بیوہ خواجہ غضنفر جو کے مرنے کے بعد بھی اپنی بیٹی کے مقابل سکندر جُو کی کوئی حقیقت نہ سمجھتی تھی، بڑبڑاتی، روتی، اپنی قسمت کو کوستی اور سکندر جُو اس کا اتنا ادب اور احترام کرتا جتنا شاید ہی اپنی سگی ماں کا کرتا

نو بجے دونوں باپ بیٹے خواجہ صاحب کی فورڈ میں تیسرے پل والے مکان سے نکل کے شوروم کا راستہ لیتے۔ یہ ایک معجزہ تھا کہ یہ بھاری بھرکم فورڈ وی ایٹ سرینگر کے ان تنگ خم دار کوچوں میں دس پانچ لاپرواہ کشمیریوں کو کچلے بغیر کیسے امیرا کدل کے قریب پہنچ جاتی جب پانی برستا اور سڑکیں کیچڑ کا دلدل بن جاتیں، تو موٹر جپ جپ اتنا کیچڑ اڑاتی کہ اس کے شیشوں تک پر کیچڑ کے نقش و نگار بن جاتے اور راستہ چلنے والوں کے کپڑوں کا تو پوچھنا ہی کیا۔

شوروم کو ممدا صبح کے سات ہی بجے جھاڑو وغیرہ دے کے دوسرے نوکروں کی مدد سے صاف کروا دیتا اور اس کے بعد چائے بنانے میں مصروف ہو جاتا۔ آٹھ بجے عبدالرب آجاتا اور دکان باقاعدہ کھل جاتی۔ لیکن نو بجے سے پہلے شاذ و نادر ہی کوئی گاہک آتا۔ سوا نو اور ساڑھے نو بجے کے درمیان خواجہ سکندر جُو اور انور اپنے اپنے میزوں پر بیٹھ جاتے اور کوئی دس بجے سے باقاعدہ گاہکوں، سیاحوں، دوستوں اور مہربانوں کا تانتا بندھ جاتا۔ معزز گاہکوں اور سیاحوں یعنی بڑے بڑے امریکن سیاحوں، راجاؤں، نوابوں، اسٹیٹ فوجی افسروں، گورنمنٹ آف انڈیا کے بڑے افسروں کو خواجہ سکندر جُو خود اوپر لے جاتے۔ "دوست" اور "مہربان" جوان کی دکان پر گپ شپ کے لئے جمع ہوتے، نیچے ان کے آفس کے میز کے گرد بیٹھے رہتے۔ لنچ خواجہ سکندر جو ہمیشہ باہر کھاتے یا تو وہ خود انگریز دوستوں یا معزز ہندوستانی دوستوں کو نیڈوز ہوٹل

بھیجنا یا کہیں اسے مدعو کرتے۔ یا پھر وہ کسی نہ کسی کے مکان، یا بوٹ ہاؤس یا ہوٹل میں مدعو ہوتے۔ اس لئے گھر سے صرف انور جو کا کھانا آتا جو اکثر عبدالرب کو اپنے ساتھ کھانے میں شریک کر لیتا۔

لنچ کے بعد گاہک کم آتے اور ملاقاتی زیادہ تر تین بجے کے قریب میمیں آتیں۔ ایک ایک دو دو اور خواجہ صاحب ان کو لے کر اوپر چلے جاتے رفتار کا دارومدار عورتوں پر ہوتا۔ نئی میموں کو وہ جواہرات کی چمک سے خیرہ کرتے اور اگر موقع ہوتا تو پہلی ہی مرتبہ ورنہ پھر دوسری یا تیسری مرتبہ میں ہاتھ بڑھاتے۔ ان کے سوا "بندھی ہوئی" عورتیں تھیں، ان میموں کو دیکھ کر انور جو اپنے منیجری فائلوں میں اور زیادہ منہمک ہو جاتا اور خواجہ سکندر جو شائستگی کے ساتھ "میڈم یہ۔ میڈم وہ" کہتے ہوئے انہیں اوپر لے جاتے۔ سیڑھیاں چڑھنے کے بعد "میڈم" کے بجائے "ڈارلنگ" سے وہ "بندھی ہوئی" میم کو مخاطب کرتے اور کامیابی کا دارومدار زیادہ تر میم کی احتیاج یا جواہرات کی چمک پر منحصر ہوتا۔ جس وقت کوئی میم صاحب خواجہ صاحب کے پاس اوپر ہوتی تو کوئی اور اوپر نہ جا سکتا تھا۔ صرف عبدالرب کو اوپر جانے کی اجازت تھی جو سیڑھیاں چڑھ کے آہستہ سے کھنکھارتا اور پھر کشمیری زبان میں کسی معزز گاہک کے آنے کی اطلاع دیتا اور خواجہ صاحب معزز گاہک کو لے کے پھر سیڑھیاں چڑھ جاتے اور قالین دکھاتے دکھاتے میم صاحب سے آنے والے گاہک کا تعارف بھی کراتے۔

"مہاراج کمار چتر بھوج سنگھ۔ مسز لائیڈ۔"

شام کے پانچ بجے کے بعد پھر گاہکوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو جاتا اور آٹھ بجے کے قریب جب دکان کے ملازمین جا چکے ہوتے تو میمیں اور فیشن ایبل ہندوستانی عورتیں آتیں۔ انور جو کی محتسب نگاہوں کی رعایت سے اس وقت خواجہ صاحب ان ملنے والیوں کو اوپر نہیں لے جاتے بلکہ دکان میں نیچے اپنے آفس ہی میں ان سے بات چیت کرتے اور انور جو کان کھڑے کر کے ایک ایک کلمہ سننے کی کوشش کرتا۔

پھر اگر شام کو خواجہ صاحب کی کہیں "دعوت" ہوتی جس سے زیادہ تر کسی میم کے ساتھ کہیں جانا یا کسی پارٹی میں جانا مراد ہوتا تو انور جو تانگے پر گھر چلا جاتا۔ ورنہ دونوں باپ بیٹے نو بجے کے قریب ساتھ ہی گھر واپس ہوتے۔

عبدالرب نے میجر صاحب سے کہا۔ "جناب آپ ذرا خواجہ صاحب کو سمجھائیے گا۔ بزنس بالکل ایک دم تباہ ہو رہا ہے۔ بڑا خواجہ صاحب مرحوم بھی عیاشی کرتا تھا۔ امیر آدمی کو عیاشی زیب دیتا ہے۔ مگر جناب ہمارا خواجہ سکندر جو تباہ ہو رہا ہے۔ جناب ہم پرانا نمک حلال ہے اس لئے ہم کو دکھ ہوتا ہے۔ ہم کیا کرے گا۔ جناب بنگلور، حیدرآباد کی برانچز بند ہو گئی ہیں اور ہمارا خواجہ صاحب اب بھی میموں میں اسی طرح مصروف ہے۔ یہاں کا پرانا مسلمان خاندان کا چشم و چراغ ہے۔ خدا نیک ہدایت فرمائے۔ جناب بیٹا جوان ہے۔ جوان صالح ہے۔ خدا اسے نیک ہدایت دے۔ مگر وہ بھی مجبور ہے۔ وہ کیا کرے گا۔ روز پانچ پانچ سو کا انگوٹھی میم صاحب لوگ کو جاتا ہے اور خواجہ صاحب سمجھتا ہے کہ یہ سفید عورت لوگ اس کی نیلی آنکھ پر مرتا ہے۔ جناب میجر صاحب اگر آپ خواجہ صاحب کا سچا دوست ہے تو اسے نصیحت فرمائیے گا۔۔۔۔"

ایک دن ٹیلیفون ذرا ذرا خراب تھا اور انور جو اکسٹینشن کا رسیور ہاتھ میں لئے اپنے باپ اور کسی ہندوستانی لڑکی کی باتیں سن رہا تھا۔ ادھر کئی ماہ سے اس نے جاسوسی شروع کی تھی۔ اپنے باپ کے کاروباری خطوط کھول لینے کی تو خیر اسے اجازت تھی ہی۔ وہ اس کے خانگی خطوط بھی کھول لیتا۔ وہ عموماً لفافے پر سواد خط سے پہچان لیتا کہ خط کسی عورت کا لکھا ہوا ہے یا نہیں اور اسی طرح رفتہ رفتہ وہ اپنے باپ کے ہر معاشقے سے آگاہ ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے والد کے اور بھی دوست تھے جو اس کے سامنے بھی بے تکلفی سے باتیں کرتے تھے۔ مثلاً ظہری صاحب جو اس کے دادا کے دوست تھے جنہوں نے اس کے والد کا بچپن دیکھا تھا، ایک سدا بہار درخت کی طرح اب انور جو سے بے تکلفی سے بات چیت کیا کرتے تھے۔ اور کبھی کبھی وہ سکندر جو کے کسی معاشقے کا مذاقاً ذکر کر دیتے۔ جب انور جو زیادہ کرید کر پوچھتا۔ تو وہ ٹال جایا کرتے۔ اور انور جو کہتا "واللہ ظہری صاحب اب آپ ہی غور فرمائیے۔ جوان بیٹے، جوان بیٹی کے ہوتے ہوئے اس قسم کی رنگ رلیاں خواجہ صاحب کو کیونکر زیب دیتی ہیں۔"

اس روز ٹیلیفون پر جس ہندوستانی لڑکی کو انور جو نے اپنے باپ سے بات چیت کرتے سنا اس کی آواز تو وہ پہچان نہ سکا لیکن اس دن سے اس کی کھوج میں رہنے لگا۔ پنڈت پریم چند چاگل کے ساتھ اس نے ایک نوجوان لڑکے اور لڑکی کو شیر سنگھ کلب میں اکثر دیکھا تھا۔ اور انور جو نے یہ بھی دیکھا

تھا کہ جب سے یہ جوڑا سری نگر آیا تھا۔ خواجہ سکندر جو پنڈت پریم چند چاگل سے بڑی پینگ بڑھا رہے تھے۔ ہارون کے قریب والے بنگلے میں جو نئیں ہوتیں ایک جگہ سونا مرگ کا بھی ہوا۔ گلمرگ تو ہفتے میں ایک آدھ مرتبہ سب کے سب ہو ہی آتے۔ اور اس کے بعد نوجوان لڑکا ہردے ناتھ چاگل جو پنڈت پریم چند کا دور کے رشتے سے بھتیجا ہوتا تھا۔ لاہور واپس چلا گیا۔ اس کے بعد کچھ دن یہ حال رہا کہ یہ لڑکی یعنی ہردے ناتھ چاگل کی بیوی مرندلا آر۔ آئی۔ این کے ایک لفٹنٹ کے ساتھ ہفتے میں تین دن باقاعدگی سے سری نگر کلب، نشاط باغ اور نیڈوز ہوٹل میں ناچنے جا رہی ہے۔ پھر معلوم ہوا کہ وہ لفٹننٹ دت کے ساتھ ایک ہفتے کے لئے گلمرگ گئی ہے اور پنڈت پریم چند چاگل اس کے ہرگز قائل نہیں تھے کہ کسی کے خانگی معاملات میں دخل دیا جائے۔ پھر لفٹننٹ دت کو بھی رائل انڈین نیوی نے مزید رخصت نہیں دی وہ کلکتے چلے گئے اور عین اسی زمانے میں انور جو نے ٹیلیفون پر اپنے باپ اور مرندلا چاگل کی گفتگو سنی

اگلے اتوار کو طے تھا کہ خواجہ سکندر جو اپنے بیوی بچوں کے ساتھ نشاط باغ تانگے پر جائیں گے مگر عین سنیچر کی شام کو خواجہ صاحب نے انور جو سے کہا کہ تم چلے جاؤ۔ کوئی انگریز کرنل مدراس سے آ رہا ہے مجھے اس سے ملنا اور اس کے ٹھہرانے کا بندوبست کرنا ہے۔ اس سے چند منٹ پہلے بھی جی نائک جنرل مرچنٹ کی دکان کے سامنے انور جو نے اپنے باپ خواجہ سکندر جو کو مرندلا سے باتیں کرتے دیکھا تھا۔

انور جو نے اپنی عمر میں پہلی مرتبہ ایک چال چلنی چاہی۔ وہ نشاط تک اپنی ماں، بیوی، اور بہن، بہنوئی کے ساتھ تو گیا مگر دوپہر کے کھانے کے بعد اس نے عورتوں کو اپنے بہنوئی کی نگرانی میں چھوڑا جو گراموفون پر ریکارڈ کے بعد ریکارڈ لگاتا چلا جا رہا تھا۔ نشاط کے سامنے کے خوانچے والوں اور سوڈا لیمونیڈ بیچنے والوں اور بیکاروں کے مجمع میں سے ہوتا ہوا انور جو وہاں جا پہنچا جہاں تانگے کھڑے تھے۔ ایک تانگے والے کو اس نے سری نگر واپس چلنے پر آمادہ کیا۔ ڈل جھیل کا پانی آفتاب کی روشنی میں چمک رہا تھا اور ڈل کے کنارے کنارے سڑک پر اس کا تانگہ چلا جا رہا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ اس بیکار کے تانگے کے سفر سے ممکن ہے کوئی نتیجہ بھی نہ نکلے۔ اس نے بہانہ بھی سوچ لیا تھا کہ اگر خواجہ صاحب دکان پر ملے تو وہ کہہ دے گا کہ وہ اپنا کیمرہ لینے آیا ہے بالآخر ہری سنگھ بولوارڈ، ڈل گیٹ، ریذیڈنسی روڈ سے ہوتا ہوا وہ شو روم کے پاس آ کر رکا۔ سکندر جو غفار جو کا بورڈ بھی دھوپ میں اسی آب و تاب سے چمک رہا تھا جیسے ڈل جھیل کا پانی۔ دکان پر صرف ممدا بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ انور جو نے جب اس سے پوچھا کہ بڑے خواجہ صاحب ہیں؟ تو اس نے انکار میں سر ہلایا۔ اس نے ممدا سے پوچھا کہ کہاں گئے ہیں تو وہ ہنس کے خاموش ہو گیا۔ انور جو نے مڑ کے اس سے کشمیری میں کہا ایک دن تجھے نوکری سے نکلوا کے رہوں گا۔ اگر تیرا بس چلے تو تو اپنی اماں بہن کو بھی بڑے خواجہ صاحب کے پاس لے آئے۔ انور جو کے دل میں اس وقت یہ عزم راسخ تھا کہ بڑے خواجہ صاحب کے مرتے ہی پہلا کام یہ کروں گا کہ اس ممدا کو جیل بھجواؤں گا۔ یہ ممدا اس امد تانگے والے سے کچھ کم نہیں ہے جس نے زون کی بیٹی غنی سے خواجہ صاحب کو ملانے کے لئے دیوار میں نقب لگائی تھی۔

انور جو پھر نشاط اسی تانگے پر واپس چلا گیا اور اس بیکار کے چکر پر اسے رہ رہ کے اور بھی غصہ آتا تھا۔ وہ نشاط واپس پہنچا۔ تو ٹانگے کی واپسی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ راستے بھر وہ منہ پھلائے بیٹھا رہا۔ اپنی بیوی کو بھی اس نے دو تین مرتبہ جھڑک دیا۔

دوسرے دن اتفاق سے ظہری صاحب نے ذکر چھیڑا۔ "خواجہ سکندر جو اپنی ساری دکان لٹا دیں گے۔ مرندلا چاگل ہزاروں خرچ کئے بغیر نہیں ملے گی اور پھر یہ ہندو ریاست ہے اور معلوم نہیں کیا کیا پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔ میاں صاحبزادے تمہارے باپ کا مغز خراب ہے۔"

"کل خواجہ صاحب کہاں گئے تھے؟" انور جو نے کرید کر پوچھنا چاہا۔

"جہنم کو" ظہری صاحب نے جھلا کے کہا۔

"آخر بتائیے تو سہی ظہری صاحب" انور جو نے پھر پوچھا۔

"جہنم کو۔ جاؤ تم اپنا کام کرو۔"

اور انور جو سے کسی نے نہیں کہا کہ اس اتوار کو خواجہ صاحب مرندلا کو لے کر کہاں گئے تھے۔

پھر دوسرا اتوار آیا۔ خواجہ صاحب نے کہا کہ وہ گوالیار کے کسی بڑے عہدے دار کے ساتھ مانس بل جا رہے ہیں اور خواجہ صاحب کی گاڑی نسیم باغ اور نگین باغ والا راستہ چھوڑ کے جس پر دوستوں اور جان پہچان والے لوگوں کے ملنے کا اندیشہ تھا، بیچ شہر کی اس سڑک

بڑھتی ہوئی گاندھربل کی طرف روانہ ہوئی جس کی غلاظت اور تنگی کی وجہ سے جانے والوں کی موٹروں کے ملنے کا احتمال کم تھا۔ گوالیار کا کوئی بڑا عہدے دار خواجہ سکندر جو کے ساتھ نہیں تھا۔ ایک بیس پچیس سال کی لڑکی البتہ تھی۔ جارجٹ کی ساڑھی پر بڑے بڑے زرد زرد پھول تھے۔ بال بھورے بھورے، اور اینگلو انڈین لڑکیوں جیسا صاف رنگ تھا مگر خدوخال ایسے ہی تھے جو صرف کشمیری پنڈتانیوں کے ہوتے ہیں۔ ہونٹوں پر گہرے قرمزی رنگ کی لپ اسٹک تھی اور ٹھوڑی کے قریب ایک مصنوعی مسا تھا اور بڑی بڑی آنکھیں ترچھی ہوئی تھیں۔

سامنے انچر جھیل کی دلدل تھی اور رفتہ رفتہ سڑک سری نگر کے غلیظ محلوں اور انچر کی دلدل کے منظر کو پیچھے چھوڑتی ہوئی گاندھربل کی طرف پہنچی۔ یہاں سے سندھ ندی کی وادی کا راستہ چھوڑ کے دونوں طرف پانی میں ڈوبے ہوئے کھیتوں کی سطح سے ذرا اونچی دوسری سڑک گاندھربل کے گاؤں لے آئی۔ یہاں سندھ ندی پر سے ایک پرانا پل قربان ہو چکا تھا۔ دوسرے تنگ لاتے پل پہ کھڑ کھڑ ایک لاری مقابل سمت سے چلی آرہی تھی۔ لاری سے تصادم کے امکان سے مردولا چیخ کے "اوہ" کہہ کے خواجہ صاحب کے اور قریب ہو گئی اور خواجہ صاحب نے چابکدستی سے اسٹیرنگ وہیل کو گھما کے ہنس کے کہا۔ "ڈارلنگ میری جان تم پر سے قربان ہے ہم تم کو ذرا بھی گزند نہیں آنے دے گا" اس انداز پر مردولا ذرا اسنرابی۔ گاندھربل اور سندھ ندی اب بہت پیچھے رہ گئے تھے دو دن پہلے کی بارش کی وجہ سے راستہ خراب تھا۔ اور تین انچ سے لے کر چھ انچ تک گہری کیچڑ کی تہہ تھی۔ پھر بھی اپنی فورڈ پر پورا پورا اعتماد کر کے خواجہ صاحب نے "مردولا ڈارلنگ" کہہ کے اس کی کمر میں بایاں ہاتھ ڈالنا چاہا اور وہ "جبھی خواجہ صاحب سیدھے بیٹھئے، کوئی دیکھے گا تو بھگوان کی قسم میں بدنام ہو جاؤں گی اور دوسرے کو منہ دکھانے کے قابل نہیں ہوں گی۔" خواجہ صاحب نے کہا "مردولا تم ہم کو پھر خواجہ صاحب کہہ کے ایڈریس کرتی ہے۔" اور مردولا نے کہا "اچھا سکندر سہی۔"

ایک آدھ میل اور آگے بڑھ کے سڑک کی حالت ذرا بہتر ہو گئی۔ اور سکندر جو نے کسی نہ کسی طرح اپنے بائیں ہاتھ سے مردولا کے شانوں کو لپیٹ ہی لیا اور پھر ایک ٹیلے سے سڑک نیچے جو اتری تو سامنے مانس بل کی خوبصورت جھیل تھی۔ دور پہ کچھ سفید سے پرانے بادشاہوں کے ایک اجڑے ہوئے باغ کا پتہ دے رہے تھے۔ ایک اور عجیب حاشیہ بائیں ہاتھ کی طرف جھیل کو ایک عجیب قدرتی حسن عطا کر رہا تھا۔ جھیل کا ایک طرف کا حصہ نظر سے پوشیدہ تھا۔ مگر جتنا حصہ نظر آتا تھا۔ اس میں ہوا کی رفتار کی تقسیم سے دو طرح کی سطحیں تھیں۔ ایک سطح تو بالکل شفاف تھی جیسے پانی کا فرش جس پہ ایک بھی سلوٹ نہ ہو۔ اس کے آگے جو سطح تھی اس پہ چھوٹی چھوٹی لہریں، چھوٹی چھوٹی شکنوں کی طرح مسلسل قائم تھیں۔

یہاں سکندر جو نے مردولا کو بیٹھا کے پیار کرنا چاہا مگر ان کے منہ کی بو سے شاید وہ گھبراتی تھی۔ اس نے رخساروں کو تو خواجہ صاحب کے ہونٹوں کے حوالے کیا اور اس دلکش منظر کو مسحور ہو کے دیکھنے لگی۔ بات اصل یہ تھی کہ ہر چند ماتھر جیا لال کی تنخواہ سوا تین سو روپیہ تھی اور مردولا چاہتی تھی کہ کوئی ساڑی مہینہ میں ایک مرتبہ سے زیادہ پہن کے کاسموپولیٹن کلب نہ جائے اور پھر سب عورتوں کی طرح اسے بھی جواہرات پسند تھے اور وہ ذرا "غیر محتاط" بھی تھی لیکن اپنی ہی عمر کے نوجوانوں کے ساتھ۔ خواجہ صاحب کو پہلے تو اس نے "چاچا" کہنا شروع کیا۔ پھر جب خواجہ صاحب نے نہ مانا تو خواجہ صاحب اور کبھی کبھی "سکندر" مگر وہ کسی طرح نہیں چاہتی تھی کہ خواجہ صاحب کو اس کے جسم پر وہی حقوق حاصل ہو جائیں جو اس کے چہیتے لفٹنٹ دت کو حاصل تھے۔ آخری نا امیدی اور غصے کی منزل سے پہلے خواجہ صاحب سے جو کچھ مل سکے وہ اینٹھ لینا چاہتی تھی۔

چنانچہ اس اتوار کی شام کو جب خواجہ سکندر جو دکان پر واپس آئے تو غصے اور ناکامی کے ملے جلے عالم میں وہ حقہ پیتے پیتے حسرت و یاس کی ایسی تصویر معلوم ہو رہے تھے کہ ظہری صاحب نے کہا "سلام علیکم خواجہ صاحب! آج تو آپ کی صورت دیکھ کے آپ پر فاتحہ پڑھنے کو طبیعت چاہ رہی ہے" اور لکڑی کی اوٹ کے اس پار یہ الفاظ سن کر، جو ظہری صاحب نے عمداً بہت بلند آواز میں کہے تھے، انور جو دل میں اتنا خوش ہوا جیسے کوئی اپنے رقیب کی ناکامی سے خوش ہوتا ہے۔

سکندر جو نے چپکے سے ظہری صاحب کو آہستہ آہستہ بات کرنے کا اشارہ کیا۔ اور پھر سرگوشی کے طور پر ظہری صاحب کے کان میں کہا "جناب ظہری صاحب ہم تو اب قتل ہو گیا۔ شہید ہو گیا۔ باخدا ہم کو عشق ہو گیا۔ مردولا مردولا۔ جناب ظہری صاحب ہم عشق میں مبتلا ہو گیا۔"

میجر صاحب اپنے دل میں سوچ رہے تھے۔ ان امیر اور متمول متوسط

ملنے کے کشمیری مسلمانوں کے گھروں میں بھی تو عورتیں ہوتی ہوں گی۔ وہ کیا کرتی ہیں؟ کیا سوچتی ہیں؟ ان کے دن، ان کی راتیں کیسے گذرتی ہیں جمالدار کی بیوی جانی کو تو وہ اس کے ساتھ دن دن بھر گھاس چھیلتے دیکھ چکا تھا۔ ایک دن اس نے جمالدار سے پوچھا کہ خواجہ سکندر جو اور ایسے دوسرے خواجوں کی بیویاں کیسی زندگی بسر کرتی ہیں۔

"وہ تو جناب پردے میں بیٹھتا ہے۔ وہ جناب کیا جانتا ہے۔ خواجہ صاحب باہر کیا کرتا ہے۔ وہ پردے میں بیٹھنے والا پردہ نشین مسلمان عورت ہے جناب اس کو کیا معلوم ہے" جمالدار نے جواب دیا تھا۔

لیکن جب یہی سوال میجر نے شعبانا مانجھی سے کیا تو الف لیلہ کا جام جس نے اپنی ہاؤس بوٹ میں دنیا دیکھی تھی ٹھنڈی سانسیں بھر نے لگا "جناب ادھر خواجہ بائیوں پر بہت ظلم ہے۔ جناب ادھر عورت لوگ کا بدقسمتی ہے۔ بہت ظلم ہے اور جناب ادھر کا غریب۔ امیر سب عورت لوگ بہت جاہل ہے" اور پھر رازدارانہ لہجے میں شعبانا نے کہا "یہ جمال دار تو جو جناب کے ساتھ ادھر آیا تھا نا؟"

"ہاں! جمالدار کا کیا ذکر؟" میجر صاحب نے کہا۔

گھٹنے پر ہاتھ مار کے شعبانا نے کہا "جناب یہ تو رب العالمین کا قدرت ہے۔ بات سے بات نکلتا ہے۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔ جناب پہلے ادھر خواجہ غضنفر جو کا بڑا ڈیری فارم ہوتا تھا۔ اور ادھر رام منشی باغ میں سب انگریز لوگ کو اور جناب ریزیڈنسی کو دودھ مکھن، ایسا مکھن، لسی دیتا تھا۔ پھر جناب خواجہ غضنفر جو نے جمال دار کو نوکری سے نکال دیا اور جناب ڈیری فارم بند کر دیا"

"یہ کیوں؟"

شعبانا نے اپنی آنکھوں میں بڑی پراسرار چمک اور ہونٹوں اور ٹوٹے ہوئے دانتوں سے بڑی پراسرار مسکراہٹ پیدا کر کے کہا "جناب یہ بڑا راز کا بات ہے"

میجر صاحب نے کہا "کہو تو سہی"

شعبانا بولا "جناب ہم دوسرا کا راز نہیں بولتا۔ جناب ہمارا بھی جو رشتہ ہے اس کا برا حال خراب ہے۔ ہمارا ایک بیٹی ہے۔ جناب ہم سب عورت لوگ کا عزت کرتا ہے"

میجر صاحب نے کہا "کیوں کیا کوئی بری بات ہے؟ جمال دار تو بدمعاش نہیں معلوم ہوتا"

"جمال دار؟" شعبانا نے جابجا سے منتشر بتیسی میں زبان دبا کے کہا "جناب جمال دار کو تو ہم بولا کہ بہت شریف گوجر ہے۔ بہت نمک حلال ہے۔ نمازی پرہیزگار۔ جناب ہم تو دنیا کا ذکر کرتا ہے۔ یہ عبرت کدہ ہے تماشا نہیں ہے"

صبح کے آٹھ بجے ہوں گے جب بند سے سکندر جو نے آواز دی "جناب میجر صاحب" اور میجر صاحب جلدی جلدی جوتے کی ڈوریاں باندھنے لگے۔ "حاضر۔ ابھی آیا"

وہ ہاؤس بوٹ کا لرزتا ہوا پل صراط پار کرنے بھی نہ پائے تھے کہ بند سے نیچے اتر کے سکندر جو نے کہا "اجی سلام علیکم حضرت دیکھیے آپ نے فرمایا تھا ہم دیر سے آئے گا۔ جناب کو تیار ہونے میں ذرا دیر ہو گئی۔ ظہری صاحب بھی ہمارے ساتھ چلے گا۔ جناب کو کوئی اعتراض تو نہیں ہے۔ یہ ظہری صاحب بڑا قابل آدمی ہے۔ پہلے وہ ادھر کشمیر کا لیڈر ہوتا تھا" اور اس درمیان میں بند کے دوسری طرف کی سیڑھیاں اتر کے خواجہ صاحب نے کہا "دیکھیے ظہری صاحب ابھی میجر صاحب کپڑے ہی لگا رہے تھے کہ بندہ ناچیز وہاں پہنچ گیا اور میجر صاحب کو ساتھ لے آیا۔ میجر صاحب آپ ظہری صاحب کے ساتھ آرام سے پیچھے تشریف رکھیے میں ادھر ڈرائیور کے پاس بیٹھ جاتا ہوں"

اور موٹر سونوار باغ کی پختہ سڑک پر اننت ناگ کے رخ چل دی۔ یہی سڑک آگے بانہال سے ہوتی ہوئی جموں جاتی ہے مگر اس وقت سکندر جو میجر صاحب کو پہلگام لے جا رہے تھے۔ پام پور کے ابھی دن نہیں پھرے تھے اور زعفران کی فصل دور تھی۔ لیکن زعفران کی کیاریوں کے بجائے دور دور تک کوکنار کے تختے پھیلے ہوئے تھے۔ چھوٹے چھوٹے سرخ لہکتے ہوئے پھول شاید یہ زعفران کے کھیتوں کی مٹی کی تاثیر تھی کہ ظہری صاحب نے بے اختیار ہنسنا شروع کیا "خواجہ صاحب آپ مرزا کو ساتھ نہیں لائے"

خواجہ صاحب نے پیچھے اپنے مہمانوں کی طرف مڑ کے دیکھا اور سینے پر ہاتھ رکھ کے کہا "ہم تو لٹ گیا، تباہ ہو گیا"

میجر صاحب نے کہا "کیوں خیریت تو ہے؟"

خواجہ صاحب نے کہا: "با خدا اس مرتبہ سچا عشق ہے اور ہمارا معشوق ہم کو الیسا رُلاتا ہے"

ظہری صاحب نے کہا: "جناب میجر صاحب اس مرتبہ ہمارے خواجہ سکندر جُو پھنسے ہیں اس کو۔ دیکھا تو ہے نا آپ نے۔ ابھی خاصی خوبصورت لڑکی ہے۔ معلوم نہیں خواجہ صاحب کا دل اس لڑکی پر آتا ہے یا گل نے کتنا لوٹا ہے مگر وہ خواجہ صاحب کی دکان کو ضرور لوٹ رہی ہے"

"نہیں با خدا میں نے اُسے ایک پیسے کی چیز نہیں دی ہے" سکندر جُو نے احتجاجاً کہا۔

"ہاں ٹھیک ہے خواجہ صاحب" ظہری صاحب نے کہا: "وہ تو آپ کی نیلی آنکھوں پہ مرتی ہے"

صبر اونتی پورہ اور بیج بہاڑہ کے کھنڈروں کے متعلق ظہری صاحب نے میجر صاحب کی معلومات میں اضافہ فرمایا: "میجر صاحب یہاں بیج بہاڑہ میں دارا شکوہ نے ایک باغ لگایا تھا۔ دیکھئے یہ سب چنار ہیں نا؟ اور وہ چنار دیکھا آپ نے؟ اس کے تنے کا قطر چون فیٹ ہے۔ جہلم کی دوسری طرف بھی باغ تھا۔ جو ویران ہو گیا ہے اور دونوں باغوں کے درمیان جہلم پر ایک پل تھا۔ جناب میجر صاحب اگر دارا شکوہ تخت نشین ہوتا تو آج ہندوستان کا کیا نقشہ ہوتا۔ بڑا صاحب ذوق، صاحب علم شہزادہ تھا۔ دیکھئے بری محل کے لئے کمبخت نے کیا جگہ انتخاب کی تھی آج وہ محل تو مہاراجہ کے محل کو بھی نصیب نہیں ہے"

مارتنڈ کے مندر کے ویرانے کو دیکھا جہاں ہر طرف بت شکنی کے آثار تھے۔ یہ کشمیر کا سومنات ہے۔ ان کھنڈروں کی بنیاد پر ایک متحد قوم کی تعمیر کتنی مشکل ہے۔ تاریخ نفرت کے سوا اور کچھ نہیں سکھاتی اور صرف یہ اب اس خلیج کو اور وسیع کر رہا تھا لیکن یہ کھنڈر ایسے دلکش منظر میں واقع تھے کہ شاید ہی کسی عبادت گاہ کے لئے اس سے زیادہ خوبصورت مقام چنا گیا ہو۔ پیر پنجال کے برف پوش پہاڑ مسلسل گرمی کے ستائے ہوئے، مگر اب بھی اپنی برنائی و شادابی لئے آہستہ اسی طرح کھڑے تھے۔ دوسری طرف ہمالیہ اعظم کے پہاڑوں کا سلسلہ تھا اور ان دونوں کے درمیان ایک وسیع فرش کی طرح کشمیر کی وادی دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہ آفتاب کی پرستش گاہ اس وادی کے تاج کی طرح ... بنائی گئی تھی۔ راہبوں کے لئے بڑے بڑے حجرے تھے جن میں سے ہر ایک جاتا ہوگا مندر کے لوں

کے آثار اور سکندر بت شکن کا تعصب اس نے اس پرستش گاہ کی عظمت پہ ضرب لگانے کی کوشش کی تھی۔ مگر دراصل وہ کہیں کہیں اونچی دیوار اور نقش نگار اب بھی اس کی پرانی شان و شوکت کی تصویر آنکھوں میں زندہ کر رہے تھے۔

دو بہت نیچے مارتنڈ کے گاؤں سے ان لوگوں کے ساتھ ہو گئے تھے ایک نے میجر صاحب سے پوچھا: "دیکھئے ان کے رہنے والے ہیں" اور ظہری صاحب نے نکال کے اس نے حیدر آباد اور مدراس کے ہندو جاگیرداروں کے نام سنانے شروع کئے جن کی طرف سے وہ گاؤں کے بڑے مندر میں پوجا کیا کرتا تھا۔

اور آگے چلے۔ سڑک کے ساتھ پہاڑ پر وہ نہر تھی وہ جسے شہر جو پہاڑ کو کاٹ کر لدر ندی سے مارتنڈ تک پانی پہنچاتی تھی جا بجا اس کا جوبی حاشیہ پانی سے، یا گرتی ہوئی مٹی کے تودوں سے گرتا اور ایک چھوٹا سا آبشار نیچے گرتا معلوم ہوتا۔

کھنہ بل مقام کی پہاڑی پر بکھری ہوئی آبادی کو دیکھ کے ظہری صاحب نے کہا: "یہ پٹھان یا دینا ہی کیا کاہل اور آرام طلب تھے کہ ٹھری کی پلوں میں اور آگے انہوں نے کوئی اور عیش مقام نہیں بنایا، ورنہ پہلگام سے بہتر اور کون سا مقام نہیں مل سکتا"

سکندر جُو نے کہا: "ظہری صاحب انسان کا دل اس کا اصلی عیش مقام ہے۔ ہم بمبئی جاتا، کلکتہ جاتا، سرینگر میں رہتا، گلمرگ جاتا۔ سب جگہ عیش مقام ہے"

ظہری صاحب نے کہا: "خواجہ صاحب اصلی عیش مقام آپ کی دکان کے جواہرات ہیں"

لدر کی وادی کو دیکھ کے میجر صاحب نے کہا: "یہ درہ بولان ایسا ہی ہے" نیچے لدر بہہ رہی تھی جیسے جیسے موٹر آگے بڑھتی گئی۔ وادی تنگ ہوتی گئی ندی کا شور بڑھتا گیا اور پہاڑوں پر دیودار زیادہ نظر آنے لگے۔ دور دور کسی چوٹی پر برف کی مانگ سی نظر آ جاتی۔ یہاں تک کہ ایک چھوٹے سے لکڑی کے پل سے آگے کچھ آبادی نظر آئی۔ وادی دفعتاً بڑی حسین معلوم ہونے لگی۔ ایک طرف دیوداروں کے ہجوم پر ابر کا ایک ٹکڑا اپنا سر ٹکرا رہا تھا۔ سامنے سے بے حد زور و شور سے بہتی ہوئی پتھروں سے سر دھنتی ہوئی ندی، دو ندیاں بن گئیں۔ دو ندیاں جو مل کے ایک ندی بن جاتی

ہس الدپیچ میں ایک خوبصورت سا جزیرہ نما تھا جس پر دو تین مکان تھے پہاڑوں پر گوجروں کی جھونپڑیوں سے خوشنما دھواں نکل رہا تھا اور پہلگام کی بڑی چوڑی سی سڑک چھوٹی چھوٹی گندی دکانوں کے درمیان کچھ عجیب سی معلوم ہو رہی تھی۔

پانی مرن ایک ہزار فیٹ سے زیادہ اونچا ہے۔ راستے میں ہلکی سی بارش ہوئی اور ہم تینوں کشمیر کی سیاسیات پر بحث کرتے ہوئے ایک درخت کے نیچے ٹھہر گئے جس کی نظیر ہندوستان میں نہ تھی۔ چھتری نے سب کو اس ہلکی سی بوندا باندی سے بچا دیا۔ پانی مرن کے مغرب کے دونوں اطراف چوٹیوں پر برف تھی جھیلوں کے سائے ٹھنڈے تھے اور سندر پھول کثرت سے تھے۔

سکندر جو نے اپنے دونوں مہمانوں کے ٹھہرنے کا انتظام درانی ہوٹل میں کیا تھا جس کے کمرے کے بالاخانے سے ندی کے بہاؤ کا منظر خوبصورت معلوم ہوتا تھا۔ ایک سکھ عورت اپنے بچے اور ملازم کے ساتھ ندی کے کنارے کھڑی معلوم نہیں کیا سوچ رہی تھی۔ لکڑی کے پتلے پتلے چھوٹے چھوٹے پل ندی کے بے شمار دھاروں پر قائم تھے اور ان پر سے گجراتی پنجابی طالب علموں اور کلرکوں کے غول کے غول ادھر سے ادھر پھر رہے تھے۔ پنجابی عورتوں کے دوپٹے ہوا میں اڑ رہے تھے اور ان کی قمیضوں اور شلواروں اور ان کے فربہ بھرے ہوئے گدرائے جسموں سے پسینے بہ رہے تھے۔

[illegible]

میجر صاحب نے اس سے پوچھا کہ دوسرا راستہ کدھر جاتا ہے۔ ہاتو نے جواب دیا: "آڑو کی طرف"۔ دوسری طرف لدر کی دوسری شاخ چندن واڑی سے ہو کے آتی تھی اور خواجہ سکندر جو، میجر صاحب کو کل چندن واڑی جانے پر آمادہ کر رہے تھے۔

ہاتو نے کہا: "اگر جناب ٹٹو مانگتا ہے تو ادھر ہمارا ٹٹو ہے۔"

لیفٹیننٹ میجر صاحب نے چندن واڑی کا ارادہ کر لیا اور کہا کل ہمارے ہوٹل ادھر وزیر ہوٹل کو ٹٹو لے آنا۔ ہمیں دو ٹٹو اور چاہئیں۔

دوسرے دن صبح سویرے ہوٹل کے صحن میں ٹٹوؤں اور ٹٹو والوں کا ہجوم تھا۔ ہوٹل کے بابو کو اس بات پر غصہ تھا کہ ان لوگوں نے ہماری وساطت سے ٹٹو کیوں نہیں لئے کہ ہم ٹٹو والوں سے تھوڑا سا کمیشن وصول کر لیتے۔

خیر کارواں چلا۔ پہلگام کی چوڑی سڑک آگے بڑھ کے ایک پگڈنڈی سی گلی بن گئی۔ پھر تھوڑی دور بڑھ کے ندی کے اس پار ایک چھوٹا سا گاؤں آیا۔ ایک جوان، بڑی خوبصورت، دیوانی سی لڑکی، کھڑکی سے آدھا دھڑ باہر نکالے جھانک رہی تھی۔ دونوں ہاتھ ہلا ہلا کے اس نے خواجہ سکندر جو کو اپنی طرف بلایا۔ اسی مکان سے ایک چھوٹی سی لڑکی دوڑتی ہوئی آئی اور میجر صاحب کے سامنے ہاتھ پھیلا کے کہنے لگی "صاحب پوشا۔ پوشا"۔ میجر صاحب نے ایک دونی اس کی طرف پھینکی اور پھر گاؤں کے لڑکوں کا تانتا سا بندھ گیا۔ گاؤں سے آگے بڑھ کے پگڈنڈی پہاڑ پر چڑھ گئی اور ندی ابلتے زور و شور سے بہتی، لدر ندی کے کنارے کنارے نیچی ہوتی گئی۔ سامنے پہاڑ بالکل دوسری دنیا کی طرح بڑا خوبصورت معلوم ہو رہا تھا۔ اس کی افتاد کچھ اس طرح کی تھی کہ اس کے جنگل کے بیچوں بیچ انسان کی بنائی ہوئی کوئی پگڈنڈی نہیں تھی۔ سڑک ایک تنگ سی وادی میں اتری اور پھر چڑھی۔

برف کے پل پگھل چکے تھے اور شرقی لدر برف کے تودوں کے بوجھ سے بے نیاز، دیوانہ رفتار سے بہہ رہی تھی۔ دیوداروں اور چیڑوں کے درمیان سے گذرتی ہوئی پگڈنڈی کبھی اس پگھلی ہوئی برف سے مس کر جاتی جو اب ندی کا پانی بن کے بہہ رہی تھی اور اس وقت انسان کا جسم خنکی کا ایک لطیف اور فرحت بخش لمس محسوس کرتا کہ معلوم ہوتا ایک لمحے میں ہندوستان کی سال بھر کی زندگی کے برابر قوت اور بالیدگی ہے۔ سامنے پہاڑ پر بہت بلندی سے ایک چھوٹا سا آبشار گر رہا تھا۔ پھر برف پوش چوٹیوں اور کھلے کھلے دالانوں میں گھرا ہوا ایک چھوٹا سا میدان جس میں کبوتروں کے کابکوں کی قسم کے کئی چوبی جھونپڑے تھے جو امرناتھ کے زائرین کے لئے بنائے گئے تھے۔

کیونکہ یہیں سے پنچترنی، ششناگ، رام ناگ اور وادیاں ہوتے ہوئے ہر سال سینکڑوں ہزاروں یوگی اور پجاری امرناتھ کے مندر کی زیارت کو جاتے ہیں۔ ابھی یاترا کو ایک مہینہ باقی تھا۔ یہاں شوجی کے یاتری ہزاروں سختیاں اٹھا کے ہندوستان کے ہر حصے سے آتے ہیں۔ یہاں برف کا قدرتی لنگم ہر مہینے چاند کے ساتھ بڑھتا اور گھٹتا ہے۔ سوامی دیکانند نے زیارت کے بعد کہا تھا۔ گرمیوں کے موسم میں کسی روز چرواہوں کا کوئی گروہ اپنے ریوڑ سے جدا ہو گیا ہوگا۔ چرواہے اس کی تلاش میں پھر رہے ہوں گے۔ ان کے احساسات کی کیا حالت ہوئی ہوگی۔ جب انہوں نے خلاف توقع اپنے آپ کو اس نہ پگھلنے والے برف کے لنگم کے حضور میں موجود پایا ہوگا۔ جو کائنات

کی طرح سفید ہے اور جس کی چھت اس پر ہو جاتا باقی ان بے شمار صدیوں سے ٹپک رہی تھی جن کو انسان کی فانی آنکھوں نے نہیں دیکھا۔"

لیکن سکندر جو اور اس کے ساتھی چندن واڑی سے آگے نہیں بڑھے برفیلی چوٹیوں کے سائے میں انہوں نے کھانا کھایا اور واپسی کا سفر بڑا تکلیف دہ تھا۔ خلافِ توقع پانی برسا اور سب بھیگ گئے اور جب پہلگام واپس پہنچے تو شام ہو رہی تھی اور ہر ایک کے جوڑ جوڑ میں درد تھا۔ ہاتوؤں نے وہ کھانا نہیں کھایا جو چندن واڑی میں میجر صاحب نے انہیں دینا چاہا۔ ظہری صاحب نے سمجھا کے کہا: "یہ ذات پات کی تفریق کا اثر ہے اور ان دور دراز وادیوں میں ابھی تک باقی ہے۔ ہمارا آپ کا کھانا ان کے لئے ناپاک ہے۔ سنہ [illegible] کی آزادی کے بعد بھی وہی اثر ان میں ابھی تک باقی ہے۔" ایک ہاتو جو بہت تھک گیا تھا اور بھوک کی شدت اور بارش کے اثر سے بالکل بے حال ہو رہا تھا۔ وہ تو پہلگام سے پہلے دیوانی خوبصورت لڑکی کے گاؤں میں ہی اپنے کسی ذات والے کے گھر میں کچھ کھانے کے لئے گھس گیا اور ہوٹل کے قریب ہانپتا ہوا پھر ان قافلے میں آملا۔

سردی اور بدن کا درد دفع کرنے کے لئے باوجود اس کے کہ یہ جولائی کا مہینہ تھا۔ میجر صاحب نے آگ جلوائی اور اپنے کمرے میں ان ہاتوؤں کو بھی بلایا۔ تاکہ جب تک ان کے ٹٹوؤں کے کرایے اور ان کی مزدوری کے دام انہیں دیئے جائیں وہ آگ تاپ کے اپنے کپڑے تو خشک کر لیں۔

اتنے میں ہوٹل کے منیجر صاحب ایک بانس کا ڈنڈا لئے ہوئے تشریف لائے اور انہوں نے ڈنڈے مار مار کے ہاتوؤں کو نکالنا شروع کیا۔ بالکل جیسے کوئی چرواہا یا چرواہے کا کتا بکریوں اور بھیڑوں کے ریوڑ کو ہنکاتا ہے ایک ہاتو کے سر پر تو بانس اتنے زور سے پڑی کہ وہ سکھ عورت جس کو میجر صاحب نے ایک دن پہلے لدر کے کنارے اپنے بچے کے ساتھ دیکھا تھا بے اختیار چیخ پڑی۔ میجر صاحب کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ انہوں نے کمرے سے نکل کے دیکھا تو منیجر صاحب ہاتوؤں پر برابر ڈنڈا برسا رہے تھے اور ہاتو [illegible] میاں چھلانگ مار کے بھاگ رہے تھے۔ مگر کسی میں اتنی ہمت، اتنی قوت نہ تھی کہ پلٹ کے منیجر صاحب کے ہاتھ سے ڈنڈا چھین لیتا۔

میجر صاحب نے ظہری صاحب کو آواز دی۔ ہاتو صحن میں کھڑے اپنے جسم سہلا رہے تھے اور اگرچہ کہ پانی رک چکا تھا۔ مگر ہوا میں بڑی ٹھنڈک تھی۔

ظہری صاحب بولے کہ میجر صاحب نیچے اترے اور سیدھے منیجر صاحب کے کمرے میں پہنچے۔ میجر صاحب نے پوچھا۔

"آپ ہمارے ہاتوؤں کو ڈنڈے کیوں مار رہے تھے؟"

"جناب ادھر ہوٹل میں کسی کو اوپر جانے کی اجازت نہیں ہے۔"

میجر صاحب نے کہا "تو آپ انہیں زبانی منع کر سکتے تھے۔"

منیجر صاحب نے کہا "یہ سور کا ہاتو لوگ ایسا نہیں مانتا۔ یہ تو ڈنڈا مارنے کے بغیر رکتا نہیں۔ جناب ہم ادھر کے لوگ کو خوب جانتا ہے۔"

میجر صاحب نے ہوٹل کے جتنے مقیم جمع ہو گئے تھے۔ سب کو مخاطب کر کے کہا "میں آپ سب لوگوں کو گواہ کرتا ہوں اس شخص نے ابھی خود اقبال کیا ہے۔ میں ان سب ہاتوؤں کی طرف سے مقدمہ دائر کرتا ہوں۔ آپ کو گواہی دینی ہوگی۔" اس درمیان میں سکھ عورت بھی نیچے اتر آئی تھی۔ "اور دیوی جی خصوصیت سے آپ کو بھی گواہی دینی ہوگی۔"

سکھ عورت نے کہا "یہ تو غریب لوگ پر بڑا ظلم ہے۔"

اب بھی ہاتو اسی طرح خاموش کھڑے تھے جیسے اصلی مجرم وہ تھے اور ایک اجنبی سیاح مجرموں کی حمایت کر رہا تھا۔

سکھ عورت کے سوا سب کو خاموش دیکھ کے منیجر نے کہا "اجی جانے جی میاں کا سب مجسٹریٹ ادھر کے نیچ لوگوں کی بدمعاشی جانتا ہے۔ تو ہم کو مقدمہ مقدمہ کہہ کے کیا ڈراتا ہے۔"

اور عین اس وقت سیٹھ صاحب مانک لعل چھاگل جو اس ہوٹل کے مالک تھے پہنچے اور منیجر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ منیجر کو ڈانٹ کے انہوں نے کہا "امی چند۔ تم گیسٹ اور ٹورسٹ لوگوں سے ایسی بات کرو گے۔ تو ایک دن بزنس نہیں چلے گا۔ ہاں فرمایئے صاحب آپ کو کیا شکایت ہے میں حاضر ہوں۔"

میجر صاحب نے شروع سے ہاتوؤں کے پیٹے جانے کا قصہ بیان کیا تو مانک لعل چھاگل نے کہا "جی صاحب یہ منیجر ذرا جانگلو ہے مگر ادھر تو یہ بات زیادہ اہم نہیں سمجھی جاتی، صاحب اب آپ بھی جانے دیجئے۔ میں خود سب مانشوں کی برابری کا قائل ہوں۔ اب جانے بھی دیجئے صاحب۔"

میجر صاحب نے کہا "صاحب میں تو یہی چاہتا ہوں کہ ان ہاتوؤں کی طرف سے آپ کے منیجر پر دعوے دائر کیا جائے۔"

سکندر جو نے جلدی سے میجر صاحب کے کان میں سرگوشی کی۔

"میجر صاحب آپ کیسا غضب فرماتے ہیں۔ یہ پنڈت مانک لعل جاگل پنڈت پریم چند جاگل کا عزیز قریب ہے۔ ہمارا بھی دوست ہے اب جانے دیجئے۔"

ظہری صاحب نے کہا "ہم ہانوؤں کو دو دو آنے مزدوری زیادہ دے گئے۔ اب مانک لعل جی کہہ رہے ہیں تو ختم ہی کیجئے۔"

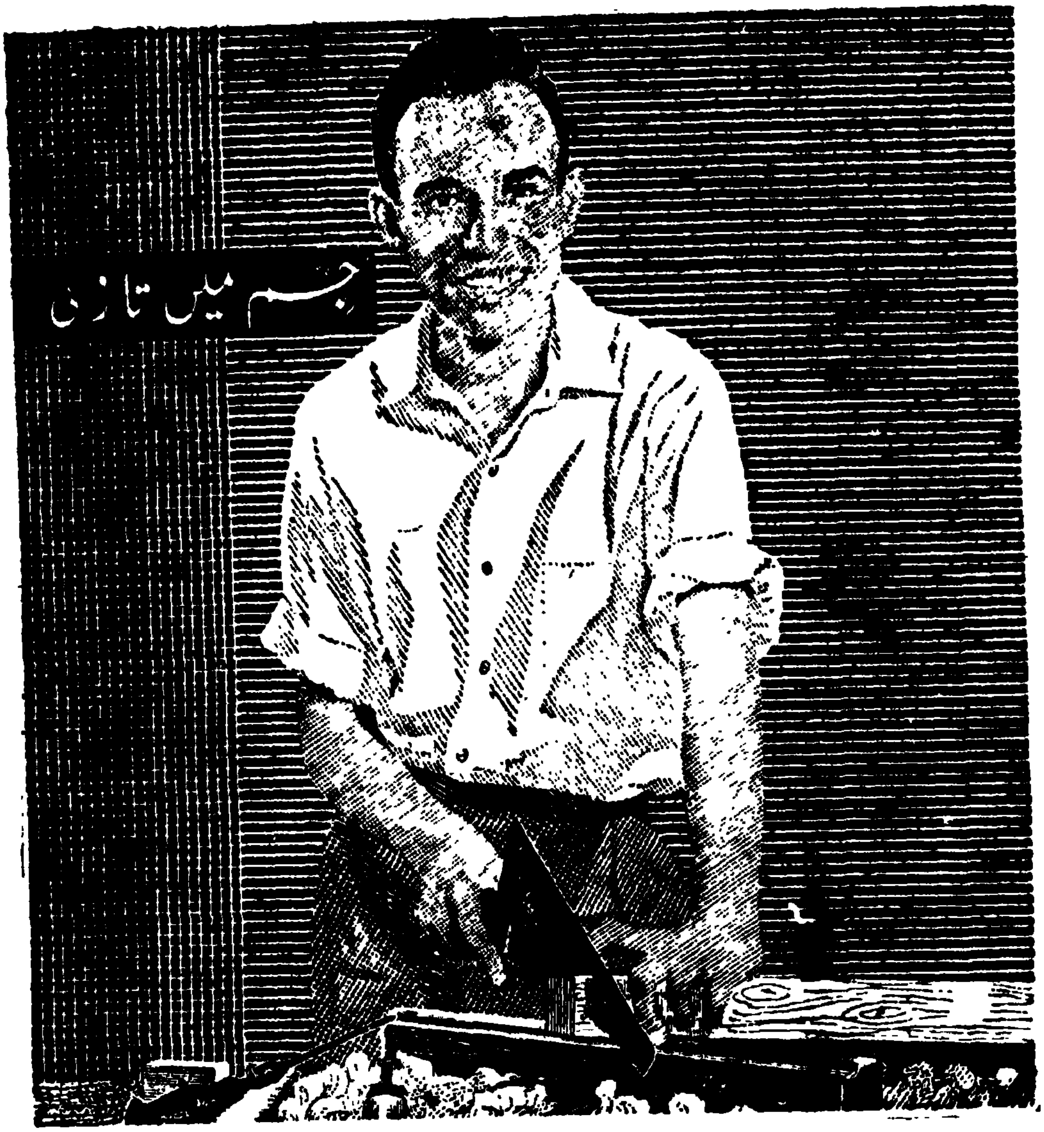
پنڈت مانک لعل جی نے کہا آپ کیوں دیجئے۔ امی چند یہ تمہاری نالائقی ہے۔ تم ہی ان ہانوؤں کو دو دو آنے زیادہ تقسیم کرو۔"

اور ہانو اب بھی اپنے آپ کو گنہگار سمجھ رہے تھے اور دل ہی دل میں میجر صاحب پر جھنجھلا رہے تھے۔ یہ اجنبی سیاح تو چلا جائے گا اور اس کے بعد معلوم نہیں کتنے مہینے وہ اس ہوٹل میں قدم نہ رکھنے پائیں گے اور ان کی کتنی مزدوری ماری جائے گی۔"

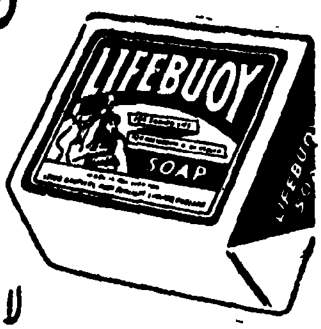
میجر صاحب سے رہا نہ گیا۔ انہوں نے کہا "خیر جو آپ لوگوں کی مرضی۔ مگر خواجہ سکندر جو صاحب اور آپ ظہری صاحب! میں آپ سے اتنا ضرور کہوں گا کہ آپ ہی لوگوں نے ہانوؤں کو پنڈت مانک لعل کے ہاتھ بیچ دیا ہے۔"

چند روز بعد میر جن سرور کے یہاں پھر چائے کی دعوت تھی۔ چنار کے نیچے نسترن کا قالین جگہ جگہ سے چاک ہو چکا تھا۔ اور چائے کے بعد اپنی موٹی بیاض سنبھالتے ہوئے انہوں نے کہا "صاحب کوئی غزل وزل تو موزوں ہوئی نہیں۔ خدا کی قسم جب سے لکھنؤ چھوٹا ہے۔ غزل کہنی چھوڑ دی کشمیر کے منظر میں کون غزل کی زمین سوچے۔۔۔ نا۔ نا بھئی ہم سے تو یہ ہوتے کا نہیں ایک نظم ابھی دو تین دن ہوئے لکھی ہے۔ بس کونسل کے اجلاس میں موزوں ہونی شروع ہوئی۔ دوسرے دن شعر پر شعر نازل ہوتا رہا۔ عنوان ہے "چنار اور نسترن" ملاحظہ فرمائیے۔ عرض کیا ہے۔۔۔۔

ناول: "آگ" میں سے



لائف بوائے صابن کی بدولت



لائف بوائے کے جراثیم سے محفوظ رکھنے والے فرحت بخش جھاگ جلد کے ہر مسام سے جراثیم آلودمیل اور گرد کو الگ کردیتے ہیں جس سے جسم صاف اور ستھرا ہو جاتا ہے اور آپ دن بھر ایک لطیف تازگی محسوس کرتے ہیں۔ یہ اطمینان کر لیجیے کہ آپ کے گھر میں سب کی صحت مفرح لائف بوائے صابن سے محفوظ رہے۔

لائف بوائے صحت مند زندگی کا ضامن ہے

L-20. 193-UR.

محمود ہاشمی

آگ ــــ بھڑکتی ہوئی

دو دن رہرسل پھر دوسہرہ، اور دوسہرے کی شام کو مہاراجہ کا شاہی دربار ـــ جوتے یہیں اتار دیجیے۔ اور راج محل کے سب سے پہلے دروازے پہ درباریوں نے اپنے جوتے اتار دیے اور پھر اُن کی سیاہ جرابیں سفید پاجاموں کے نیچے اور زیادہ نمایاں ہو گئیں۔ سیاہ جرابیں ان کے اوپر چوڑی دار پاجامے کی سلوٹیں۔ پھر چوڑی دار پاجامہ اس کے اوپر کسی نہایت شوخ رنگ کی ریشمی شیروانی کا تراس کے ساتھ لٹکتی ہوئی ایک تلوار اور سر پر ایک بڑا سا تربوزی رنگ کا صافہ۔

درباریوں نے جوتے اتارنے کے بعد پگڑیاں سنبھالنے کی بے بس سی کوشش کی اور پھر جھکتے ہوئے، شرماتے ہوئے آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ ان کی جرابوں کے نیچے قالین تھے اور ان کے دائیں بائیں قدِ آدم آئینے۔ جن میں نہایت مضحکہ خیز صورتیں حرکتیں کرتی ہوئی اور آگے کو بڑھتی ہوئی دکھائی دیں۔ "یہ شیروانیاں مانگے کی ہیں اور یہ صافہ بھی کسی اور سے بندھوا کے سر پہ رکھ لیا ہے" ہر صورت دوسری سے یہی کہتی دکھائی دے رہی تھی اور کوئی ہرج نہیں۔ کوئی ہرج نہیں۔ "اس حمام میں سب ننگے ہیں" کی تسلی کا لیبل بھی ہر چہرے پر نمایاں تھا۔

اور مہاراجہ کے محل کے اس حمام میں واقعی یہ سارے درباری ننگے دکھائی دے رہے تھے۔ انہیں اپنے لباس کے بے ڈھنگے پن کا، اپنے کارٹون بنے ہوئے کا، اپنی بے بسی کا۔ اور ساتھ ہی ساتھ اپنی اس خودداری کا، جسے ہر سال وہ اس موقع پر مہاراجہ کی بھینٹ چڑھایا کرتے تھے۔ احساس ضرور تھا مگر ہر سال کی طرح اس سال بھی وہ اسے راج محل کے سب سے پہلے دروازے پر چھوڑ آتے تھے۔ اپنے جوتوں کے ساتھ گھر سے آتے ہوئے اور بازاروں میں سے گزرتے ہوئے جب جب کہ تنہا ساری راہ وہ بے چینی محسوس کرتے گئے تھے لیکن اب مرگ انبوہ "ایک جشن" بن گیا تھا۔ اب یہ خیال کہ اپنی شیروانی کے نیچے اکثر نے صرف اس لیے دو سویٹر پہن رکھے ہیں کہ شیروانی مانگے کی ہے۔ اور اس لیے ان کے ڈھیلی ہے۔ اب انہیں پریشان نہیں کر رہا تھا۔ اور اُن کا یہ احساس بھی راج محل کے اس ماحول میں آ کے کہیں کھو گیا تھا کہ ابھی تھوڑی ہی دیر بعد انہیں ایک خودکشی کرنی ہے نہایت بے دلی سے انہیں اپنے ہی جیسے ایک انسان کے سامنے صرف اس لیے جھکنا کہ وہ مہاراجہ ہے اور یہ خود مہاراجہ نہیں صرف اس لیے کہ ایک مہاراجہ نے مدتوں پہلے انہی جیسے چند انسانوں سے جو مہاراجہ نہیں تھے کہا تھا کہ یوں ان کے سامنے جھکنے میں ہی ان کی سلامتی ہے اور ان کی عزت ہے۔ اور سننے والوں میں سے کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ ان کے کہے کو جھٹلا سکے۔ چنانچہ مہاراجہ گلاب سنگھ نے کہا تھا اور ان کے اجداد نے مانا تھا۔ مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے بھی یہ کہا تھا اور ان کے اجداد مان گئے تھے پھر اب جبکہ مہاراجہ ہری سنگھ بھی یہی کہتا ہے تو یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ بات اپنی اصلیت کھو چکی ہے۔ یہ مجبور ہیں کہ مہاراجہ کی بات کو اب بھی باتوں کی رانی سمجھیں اس لیے "مت آؤ، مت آؤ ہمارے قریب۔ اسے نئے زمانے کی سوچ کہ تم ہمیں ورغلا رہی ہو اور ہم میں اتنی ہمت نہیں کہ تم مہاراجہ ہری سنگھ کو جھٹلا سکیں" اور وہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے آگے بڑھ رہے تھے۔ زبردستی کی مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پہ پیدا کر کے ایک دوسرے سے خوشی کی باتیں بھی کر رہے تھے۔ مگر قدِ آدم آئینے بدستور ان کا منہ چڑا رہے تھے۔

اور پھر راج محل کے بڑے ہال کا دروازہ آگیا۔

دروازے کے سامنے ہال کے دوسرے سرے پر تخت تھا۔ شاہی کرسی تھی اور اس کے پیچھے دائیں بائیں ہر طرف سنہری جھالریں جھلملا رہی تھیں۔ حکم تھا کہ شاہی کرسی اور تخت کو دروازے میں سے داخل ہوتے وقت جھک کر ہر درباری کورنش بجا لائے جس طرح مہاراجہ کی بات باتوں کی رانی ہوتی ہے اسی طرح ہر وہ شے جو

مہاراجہ کا سب سے قابلِ احترام ہے اور اگر آپ اُسے اپنے سر آنکھوں پر جگہ اس لیے نہیں دے سکتے کہ وہ آپ سے بہت دُور ہے تو اس کی برتری اور اپنی خاکساری کے اعتراف کے طور پر کم از کم جھکیے تو۔ چنانچہ ہر درباری جھکا۔ ہر ایک نے اپنی خاکساری کا اعتراف کیا۔ دروازے پر رُکتے ہوئے دھڑکتے ہوئے دل اور سہمی ہوئی نظروں سے ہر ایک اپنا فرض بجا لایا اور اس کے بعد سہما سہما سا ہال میں چپ چاپ دم بخود سا ہو کر ہال کے فرش پر اس جگہ بیٹھ گیا جو اس کے لیے مخصوص تھی۔ یہ سب ریہرسل کی برکت تھی۔ ورنہ اپنی نشست کا پتہ چلانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اور پھیریوں جھکنے کے آداب بجا لانے کا سلیقہ بھی آسانی سے نہیں سمجھ آتا۔

ایک ایک کر کے سب درباری بیٹھ گئے۔

ہال میں سناٹا تھا اگر سوئی بھی گرتی تو آواز سنائی دیتی۔ کسی کو سرگوشی تک کرنے کی ہمت نہ تھی۔ میرے اردگرد کیا کچھ ہے یہ بھلا دیکھوں تو ہر دل میں اشتیاق تھا۔ مگر دربار۔ دربار کے آداب، راہ و رسم مختلف تھا۔ اور روایات کے بھوت خواہ مخواہ دلوں کی دھڑکنیں تیز کر رہے تھے۔ کسی گردن میں جنبش نہ تھی اور کوئی سر نہ تھا جو اُٹھا ہوا ہو۔ مگر آہستہ آہستہ ذہن ماحول سے مانوس ہونے لگے۔ اور جھکے ہوئے سر اور جھکی ہوئی گردنیں ذرا ذرا اوپر کو اٹھتی ہوئی دکھائی دینے لگیں۔ اور نیچی نگاہوں نے اپنا کام شروع کر دیا۔

شاہی کرسی اب تک خالی تھی البتہ اس کے گرداگرد دونوں طرف قوس کی سی شکل میں ننگی تلواروں والی گارد ضرور کھڑی تھی۔ گارد "اٹن شن" کی حالت میں تھی۔ اور اٹن شن کی حالت میں ہلنا ناممکن تھا۔ ہال کی چھت پر جہانگیر اور شاہجہان اور پرتاپ سنگھ اور ہری سنگھ کی تصویریں لگی ہوئی تھیں منقش چھت کے ساتھ پرانی وضع کے فانوس لٹک رہے تھے۔ جن میں جدید وضع کے بجلی کے قمقمے روشن تھے۔ ان سے ذرا پرے ہال کی چھت کے قریب چھوٹے چھوٹے بالکونی نما جھروکے سے تھے جن میں ہز ہائی نس مہاراجہ ہری سنگھ والیٔ ریاست جموں و کشمیر کے بہت سے مہمان اس کا طمطراق دیکھنے کے لیے بیٹھے تھے کہیں فوجی وردی میں کوئی انگریز لفٹیننٹ کرنل تھا کہیں کسی دیسی ریاست کا کوئی راجہ تھا۔ کہیں کوئی چرٹ پیتا ہوا نہ جانے کون سا۔ اور ایک طرف فرش سے لدی ہوئی بھاری بھرکم ایک بوڑھی خاتون بھی تھی جو ایک پانچ چھ سالہ لڑکی کو اپنے ساتھ لگائے بیٹھی تھی۔ غالباً کوئی امیر بیوہ تھی۔ جس کے ساتھ اس کی پوتی بھی آئی تھی۔ چہرہ کا انداز یوں تھا جیسے وہ اپنی پوتی کو کسی چڑیا گھر میں لائی ہو۔ اور پوتی فرش پر بیٹھے ہوئے درباریوں کو یوں دیکھ رہی تھی جیسے وہ کسی نئے جدید قسم کے سرکس میں آئی ہو۔ یہ لوگ اپنا تماشا کب شروع کریں گے۔ ہائے خدایا کھیل جلد شروع کیوں نہیں ہوتا؟ اور وہ بڑی بے تابی سے ہال کے اُس دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی جہاں تھوڑی ہی دیر پہلے کھیل کا ابتدائی حصہ دکھایا گیا تھا۔ ان لوگوں نے ہال میں داخل ہوتے وقت کچھ اس انداز کا ایکٹنگ کیا تھا کہ اُسے بے ساختہ ہنسی آ گئی تھی۔ اور اگر اس کی دادی اسے فوراً نہ روک دیتی تو وہ ضرور تالیاں بجاتی لیکن اُسے روک دیا گیا تھا۔ اور اب وہ حیران ہو رہی تھی۔ کہ یہ سب لوگ مسخروں کا سا لباس پہن کر آئے ہوئے ہیں۔ اب چپ چاپ اس طرح منہ بنا کے کیوں بیٹھ گئے ہیں جیسے وہ مسخرے بالکل ہی نہ ہوں۔ اور کیسی اداسی سے کھیل کے کام کرنے والے اداکار ہیں۔ نہ جانے یہ تماشا کیسا ہو گا؟ ہائے اللہ یہ اسے شروع کیوں نہیں کرتے؟

اور اگر یہ تماشا تھا تو جلد ہی اس کے شروع ہونے کے انداز پیدا ہو گئے۔ دربار شروع ہو گیا۔

ایک اونچی کڑکڑاتی ہوئی آواز نے کہا "راجوں کے راجہ....

.... مہاراجہ ہری سنگھ جی پدھار رہے ہیں"۔

اور ہال میں بیٹھے ہوئے سارے لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے۔

باہر زور زور سے بینڈ بجنے لگا۔ اور اس کے بعد دروازے میں سے کچھ آدمی اور ایک مہاراجہ جو ہری سنگھ تھا جلوس کی شکل میں اندر داخل ہوئے۔

کھڑے ہوئے لوگوں کی آنکھیں نیچی ہو گئیں۔ اور اس وقت تک نیچی رہیں جب تک کہ مہاراجہ اپنی کرسی پر نہ بیٹھ گیا اور اس کے پاؤں سامنے کے گدّیں پائیدان پر نہ ٹک گئے اور ریاست کے ایک معزز گھرانے کا وزیر ایک چند شاہی کرسی کے پیچھے اس جگہ نہ کھڑا ہو گیا جہاں کہ وہ شاہی مورچھل کو اس طور سے اپنے ہاتھ میں تھام

کر گزارہ سکتا تھا کہ مورچھل کا سایہ مہاراجہ کے سر پر پڑتا رہے۔ تاکہ مہاراجہ کا سایہ وزیر اعظم پنڈت پر ہمیشہ رہ سکے۔ وزیر اعظم چند کے اس طرح کھڑا رہنے میں ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ وہ اس کٹھن وقت میں دوسرے درباریوں کی بھی تھوڑی بہت اس طرح مدد کر سکتا تھا کہ وہ اپنے کئی سالوں کے تجربے کے بل بوتے پر مہاراجہ کے دیکھے بغیر ہی بہت سے حواس باختہ درباریوں کو اشاروں اشاروں میں سمجھا دے کہ بھئی اب تمہاری باری ہے۔ اٹھو، بڑھو، جھکو، پھر جھکو، پھر جھکو، اور اب جھک کر ریشمی رومال میں رکھ کر اپنی نذر مہاراجہ کے سامنے پیش کر دو۔

جب مہاراجہ تخت پر اور درباری فرش پر بیٹھ گئے تو کپڑوں کی ہلکی سی سرسراہٹ سنائی دی اور سامنے کی بالکونی پر مہارانی براجمان ہوتی نظر آئی۔ مہارانی اس کی سکھیاں اور اس کے گوٹے والی جن کے کنارے پر سے شال بار بار نیچے کھسک آتا تھا اور اسے اٹھانے کے لیے بار بار کسی کا ہاتھ بڑھتا۔ لیکن اٹھانے کی سعادت صرف مہارانی ہی کو نصیب ہوتی۔

اس کے بعد دربار شروع ہو گیا۔ اور درباری نذریں پیش کرنے لگے۔

سب کے سب ڈبل تعظیمی سرا جھکتے جھکتے گئے۔ اور نذر دینے کے بعد اپنی پیٹھ سنبھالتے سنبھالتے لوٹے مبادا پیٹھ مہاراج کی طرف ہو جائے اور آداب و احترام میں فرق پڑے۔ اور وہ اس دربار سے نکال دیے جائیں کیونکہ ہر سال معدودے چند درباری اس بات کی احتیاط نہ کرنے کے جرم کی پاداش میں ضرور نکال دیے جاتے تھے۔ ان سرداروں کے بعد دوسرے کم رتبہ کے سرداروں کی باری آئی۔ اور انہوں نے بھی تسلیم و رضا کا ثبوت پورے طور پر دیا تا این کہ بیچوں بیچ جو راستہ تھا اس پر تین بڑے بڑے پھول بنے تھے اور درباریوں کو ان میں سے ہر پھول پر کھڑے ہو کر جھکنا پڑتا تھا۔ اور اس کے بعد مہاراج کے قدموں میں جا کر ان پر جھک کر نذر پیش کرنا ہوتی تھی۔ اور اس احساس کو اپنے دل کے کسی نہاں خانے میں دفن کر دینا تھا کہ یوں اپنے جسم کے ساتھ وہ اس سنگھاسن پر اپنی روح کو بھی جھکا آئے ہیں۔ اور ریشمی رومال میں لپیٹ کر جب وہ ایک اشرفی کی نذر مہاراجہ کو پیش کرتے ہیں تو ساتھ ہی ان کی خودداری کا جوہر بھی مہاراجہ کے تخت کے پائیدان سے ٹکرا کے ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے اور اس وقت شاعر کا یہ سوال کہ ؎

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے اور دور آسمانوں پر وہ فرشتے جنہوں نے کبھی آدم کو سجدہ کیا تھا کچھ اس انداز سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں جیسے ایک دوسرے کو کہہ رہے ہوں کیا یہی وہ انسان ہے؟

ہاں یہی وہ انسان ہے صرف دور بدل چکا ہے تاریخ نے پتھر اور دھات اور اخلاق و تہذیب کے زمانوں کے بعد سونا کا اب مہاجنی دور عطا کیا ہے۔ اور مہاجنی دور کی یہی ریت ہے جس کے پاس چاندی ہے اور سونا ہے وہ تمہیں خریدے گا اور پھر تم اسے پوجو گے ایک صدی پہلے گلاب سنگھ نے ۷۵ لاکھ روپے میں لاکھوں انسان خریدے تھے اور پھر اس کے بیٹوں پوتوں نے ان میں سے چند ایک کے دام انفرادی طور پر بڑھا دیئے اور انہیں اور بھی زیادہ خرید لیا۔ کہا کہ تم سردار ہو، وزیر ہو، میرے گزیٹڈ افسر ہو اور اس لیے آؤ میرے سامنے جھکو اور مجھے پوجو۔"

چنانچہ وہ سب انھیں پوجتے رہے۔ اور اب مہاراجہ ہری سنگھ کو پوج رہے تھے۔

"آخر کب تک انسان کو یوں انسان پوجتا رہے گا۔ کب تک ہم یوں جھکا کریں گے کب تک۔" ممکن ہے اس سے پہلے بھی ان درباریوں میں سے ہر ایک کے دل میں یہ سوال بار ہا کھٹکا ہو مگر ۲۴ر اکتوبر ۱۹۴۷ء والے دوسہرے کی اس رات تو یقینی طور پر یہ سوال ان میں سے اکثر کے دل میں متواتر کھٹک رہا تھا۔ ہر درباری جب نذر دینے کے لیے اٹھتا تو یقین کے تین پھولوں پر اس کے پاؤں لڑکھڑا جاتے اور اس کا خیالات سے بوجھل ذہن اس کے سنبھالے نہ سنبھلتا۔ آخر کب تک اس سامنے بیٹھی ہوئی مورتی کو ہم پوجتے رہیں گے۔ کب تک ہم اپنی انسانی عظمت کو ایک حقیر سے سونے کے سکے اور روپے

دے کر اس مورتی کی بھینٹ چڑھاتے رہیں گے......"

ہر سال کی طرح اس سال بھی نذر دربار کے اس موقع پر بہت سے لوگ نو آموز اور گھبرائے ہوئے درباری نذر پیش کرنے کے آداب میں غلطیاں کر رہے تھے۔ جھکتے وقت زاویہ ٹھیک نہیں بناتے تھے، قالین پر ان کے قدم لڑکھڑا جاتے ہیں اور انہیں یاد نہیں رہتا کہ دوسرا پھول کہاں تھا اور تیسرا کہاں ہے۔ اور زبان کی وہ منزل جو مہاراجہ کے قدموں میں ہے ان سے کتنی دور رہتی مگر اس سال مہاراجہ کی آنکھیں ان کے یہ سارے گناہ معاف کر رہی ہیں۔ آج مہاراجہ کسی کو دربار سے نہیں نکال رہا۔ آج مہاراجہ خاموش ہے اور سوچ رہا ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے میرپور اور پونچھ کے بعد پرسوں شام کو مظفرآباد پر قبضہ کیا تھا اور جو آج اوڑی میں تھے۔ اس وقت کہاں ہوں گے؟ اسے کاش یہ دربار جلد ختم ہو جائے اور میں جان سکوں کہ وہ لوگ اس وقت کہاں ہیں۔ میرے اس راج محل سے کتنی دور ہیں؟

دو دن پہلے کشمیر کا نیشنلسٹ لیڈر شیخ عبداللہ دہلی میں تھا اور وہاں ایک دعوت طعام میں اس نے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔ "پونچھ میں جو کچھ ہو رہا ہے یہ اس دانشمندانہ پالیسی کا نتیجہ ہے جو حکومت نے اختیار کر رکھی ہے۔ پونچھ کے لوگ جو مدتوں سے مقامی حکمران کے جور کا تختۂ مشق بنے ہوئے تھے۔ اب ان پر دربار کشمیر کی طرف سے ظلم توڑے جا رہے ہیں۔ ان لوگوں نے اپنے مطالبات منوانے کے لیے تحریک شروع کر رکھی ہے۔ یہ تحریک فرقہ وارانہ نوعیت کی ہرگز نہیں۔ ریاست کشمیر نے پونچھ میں فوج بھیج دی ہے جس سے سراسیمگی پھیل گئی لوگ اپنے بال بچوں کو باہر لے گئے اور انہیں میں سے کچھ لوگ ہتھیار لے کر وہاں واپس آ گئے اور انھوں نے لڑنا شروع کر دیا......"

اس شام کو جب کہ شیخ عبداللہ دہلی میں یہ کہہ رہا تھا پونچھ کے بعد مظفرآباد میں حکومت کے اسی ظلم کا ردعمل ہو رہا تھا۔ ظالم راجہ کے خلاف جو نفرت برسوں کے دلوں میں تھی اس کا لاوا پھوٹ بہا تھا اور بہتا ہوا اب وادیٔ کشمیر کی طرف آ رہا تھا۔ راستے میں مظلوموں کے آنسو اس آگ میں تیل بن بن کر شامل ہو رہے تھے اور یہ طوفان اب اوڑی تک آ پہنچا تھا اور یہاں سری نگر کی دبی ہوئی راکھ سے بھی چنگاریاں سلگنے لگی تھیں اور انتظار ہو رہا تھا۔ آؤ آؤ ظالم کے خلاف لڑنے والے ہمارے مددگار بھائیو! تم نے مظفرآباد سے آتے آتے دیر کیوں لگا دی۔ آؤ کہ ہم تمہارے منتظر ہیں۔ ظالم کا ہاتھ ہماری شہ رگ پر ہے اور اس لیے ہماری آواز گھٹی ہوئی ہے۔ تم آؤ ظالم کا ہاتھ کاٹ دو اور پھر دیکھو کہ ہمارے بازو تمہارے ساتھ ہوں گے"

اور مہاراجہ یہ سب کچھ جانتا تھا۔ آج تک جو بیج اس نے بوئے تھے آہستہ آہستہ ان کا علم تھا مگر اس کی فصل کا اٹھانا اس کے بس کا روگ نہ تھا۔ عبداللہ کی آواز دہلی میں گونج رہی تھی۔ اور پونچھ کے جیالے اپنی مدد آپ کرنے کے بعد اب اپنے دوسرے بھائیوں کی مدد کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ پونچھ کے مضافات اور مظفرآباد کے بعد اب اوڑی کے قرب و جوار میں غلامی کی وہ زنجیریں جنہیں مہاراجہ ہری سنگھ اور اس کے اجداد نے مضبوط کیا تھا ٹوٹ رہی تھیں اور ان کی آواز کشمیر کی ساری وادی میں گونج اٹھی تھی۔ "مہاراجہ ہری سنگھ تم اور تمہارے اجداد نے جھوٹ بولا تھا کہ تم اپنی رعایا کی جان کے محافظ ہو، ان کی عزت کے ضامن ہو۔ اس زمین پر ہمارے خدا ہو۔ آج تک تم نے ہم سے کبھی ہمارا دکھ نہ پوچھا۔ تم ہمارے جھوٹے خدا تھے۔ تم نے کبھی اپنی خدائی کا ثبوت کبھی نہیں دیا۔ صرف یہی چاہا کہ ہم پستیوں میں رہیں تاکہ تم بلندیوں پر بیٹھ سکو"

اس رات بھی مہاراجہ بلندیوں پر بیٹھا تھا۔ مگر آج اس دھوم دھام، جاہ و جلال اور شاہانہ رنگ و روپ پر اسے کسی اداسی کا سایہ بھی نظر آ رہا تھا اور اس کے قریب ہی اس کے قدموں میں پستیوں میں بیٹھنے والے سوچ رہے تھے "کہیں آج کی رات قدرت کوئی مذاق تو نہیں کر رہی؟

اگر یہ مذاق تھا تو مذاق ختم ہو گیا۔

دربار ختم ہو گیا۔ سب سے پہلے مہاراجہ اٹھا اور اس انداز میں کہ وزیر امین چند کا مورچھل اب بھی اس پر سایہ کیے رکھے۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا چلا گیا۔ مہاراجہ کے بعد یا لکوئی میں سے مہارانی اس کی سکھیاں اور اس کے گرد بیٹھے اٹھنے اٹھتے ان کا شال آخری مرتبہ کندھے سے گرا۔ سکھیوں کے ہاتھ بڑھے لیکن پہلے کی طرح اب بھی یہ سعادت مہارانی کو نصیب ہوئی کہ وہ شال

اشا گرو جی کے کندھوں پر رکھ دے۔ اس کے بعد بالکونی میں بیٹھے ہوئے شاہی مہمانوں کی باری آئی جس میں وہ انگریز لڑکی بھی تھی جو اس دوران میں مسلسل سوچتی رہی تھی کہ یہ کیسا تماشا ہے جس میں ایک ہی کھیل کو ہر ایک دہراتا ہے "ماتھا ٹیکو اور پیچھے ہٹ کر بیٹھ جاؤ"۔ اس لیے اکتا کے وہ ہی کرسی کا آسرا لے کر وہ سو گئی تھی۔ اب جب اس کی بوڑھی دادی نے اُسے جگایا تو پھر بڑبڑا کے اٹھ بیٹھی "کیا شو ختم ہو گیا۔؟"

"ہاں۔۔۔"

اور اگر یہ شو تھا تو شو ختم ہو گیا تھا۔

دربار ختم ہو گیا اور درباری بھیڑیوں کے گلے کی طرح جیسے دروازے کی طرف رُخ کیے ایک دوسرے پر گرتے جاتے تھے۔ آٹھ بج کر پینتیس منٹ ہو رہے تھے۔

عین اُس وقت جب یہ درباری راج محل سے نکل چکے تو ایکا ایکی اندھیرا چھا گیا ہری سنگھ ہائی اسٹریٹ جہاں سے کہ لوگ گزر رہے تھے۔ دفعتاً بھوکوں کی بستی نظر آنے لگی جہاں سے صرف آوازیں ہی سنائی دے رہی ہوں اور نظر کچھ نہ آئے۔ یا امیرا کدل میں پلیڈیم ٹاکیز اور ریلیڈیم ٹاکیز کے بعد امریش اور ریگل ٹاکیز کے سارے تماشائی ایکا ایک اندھیرا ہو جانے کی وجہ سے اپنے اپنے سینما ہال سے باہر نکل آئے تھے اور حیران ہو رہے تھے۔ ذرا آگے نیڈوز ہوٹل بھی قصر ظلمات بن گیا تھا۔ اور ڈل گیٹ کے ہاؤس بوٹ بھی اور ... کے مکانات بھی......

یہ بجلی کہاں گئی۔

مگر یہ کوئی راز نہ تھا۔

اوڑی سے مہورہ دس میل دور ہے اور مہورہ وہ جگہ ہے جہاں وہ بجلی گھر ہے جس کی بجلی کشمیر کی وادی کو روشن کرتی ہے وہ لوگ جو صبح اوڑی میں تھے، اُس وقت مہورہ میں تھے، اور روشنی ان کے ہاتھ میں تھی۔

اگر یہ بجلی آدھ گھنٹہ قبل بجھتی۔ اگر مہورہ پاور ہاؤس اب سے صرف آدھ گھنٹہ پہلے ان کے ہاتھ میں آجاتا تو راج محل کے فانوس اور راج محل کے قمقمے عین اُس وقت بجھتے جب راجہ انسانیت کے ساتھ بلندی اور پستی کا یہ کھیل کھیل رہا تھا جب وہ ان بلندیوں پر تھا جو اس نے اپنی پرجا کے خون کی بنیادوں پر رکھی ہوئی تھیں اور اُس کے درباری ان پستیوں میں تھے جہاں وہ چاہتا تھا کہ اس کی پرجا بیٹھے، جہاں اس کی ساری پرجا بیٹھتی تھی۔

اگر یہ بجلی آدھ گھنٹہ قبل بجھتی تو پھر کیا ہوتا۔ ایک درباری نے سوچا اور پھر اس کی نگاہ اس تلوار پر اٹک گئی، جو اُس کی گود میں پڑی تھی۔ اور ساتھ ہی اسے اُن اَن گنت تلواروں کا بھی خیال آ گیا جو راج محل کے اس ہال میں نذر دربار کے وقت درباریوں کے پہلوؤں میں تھیں۔ تلواروں کو میان سے نکلنے دیر نہیں لگتی اور نفرت خواہ کتنی ہی دبی ہوئی کیوں نہ ہو کبھی نہ کبھی تو اُبھر سکتی ہے اور پھر وہ نفرت جس کا لاوا برسوں سے پھوٹا، برسوں سے پھوٹا اور مظفرآباد سے پھوٹا، موقع پا کر یہاں سے بھی پھوٹ سکتی تھی۔ اس کے علاوہ بھی اس رات سری نگر میں بہت کچھ ہوا۔ سری نگر میں اس رات خیالات، اور جذبات کی چنگاریاں مختلف روپ میں سلگتی رہیں۔ ساری رات لوگ جاگتے رہے اور اپنی خوابگاہوں کی کھڑکیوں سے ان جلوسوں کو دیکھتے رہے۔ جو تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد وہاں سے گزرتے تھے وہ ان نعروں کو بھی سنتے رہے جو ان جلوسوں سے بلند ہوتے تھے۔

ایک جلوس گزرا اور نعرے بلند ہوئے۔

"یہ ملک ہمارا ہے، اس کی حفاظت ہم کریں گے، اس کی حکومت ہم کریں گے" "حملہ آور ہوشیار نیشنل کانفرنس ہے تیار"۔

یہ نیشنل کانفرنسیوں کا جلوس ہے۔ اور یہ لوگ اپنی تیاریوں کا نعرہ لگا رہے ہیں۔ مگر نیشنل کانفرنس کس کے لیے تیار ہے۔؟

کیا حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے کے لیے؟

وہ لوگ جن کے ذہن میں شیخ عبداللہ دلی کی "عوت طعام" والی وہ ہی دن پہلے کی تقریر بھی تازہ تھی۔ یہ سن کر حیران رہ گئے۔ کیا نیشنل کانفرنس حملہ آوروں کا مقابلہ کرے گی۔ اور کیا یہ لوگ واقعی حملہ آور ہیں۔ یہی تو وہ لوگ ہیں جو کچھ دنوں پہلے پونچھ میں تھے اور جن کے بارے میں نیشنل کانفرنس کے صدر نے کہا تھا کہ ان پر دربار کشمیر کی طرف سے ظلم توڑے جا رہے ہیں اور ان لوگوں نے اپنے مطالبات منوانے کے لیے تحریک شروع کر رکھی ہے۔ اور یہ فرقہ وارانہ نوعیت

کی ہرگز نہیں۔ یہ وہ مظلوم تو ہیں جو کچھ روز پہلے پونچھ میں تھے جو پرسوں مظفرآباد میں تھے۔ جو آج صبح اوڑی میں تھے اور جواب بارہ مولہ میں ہیں کیا عبداللہ نے ان کے بارے میں جو کچھ دلی میں کہا تھا وہ سری نگر کی اس نیشنل کانفرنس نے نہیں سنا۔ کیا اُن کے صدر کی آواز ان کے کانوں میں اب تک نہیں پہنچی؟

نیشنل کانفرنس والے نعرے لگا رہے تھے "حملہ آور ہوشیار نیشنل کانفرنس ہے تیار" اور سری نگر کے لوگوں کو دلی یاد آ رہی تھی۔ یہی آنے والے تو ہیں جنھیں نیشنل کانفرنس کے صدر نے پرسوں دلی میں مظلوم کہا تھا اور جنھیں آج نیشنل کانفرنس سری نگر میں حملہ آور کہہ رہی ہے۔ یہ لوگ بھی اسی کشمیر کے ایک حصے کے رہنے والے ہیں۔ اور "آزاد کشمیر زندہ باد" ان کا نعرہ ہے اور اس نعرے کا مطلب بھی وہی ہے جو نیشنل کانفرنس کے ایک نعرے کا ہے۔ یہ ملک ہمارا ہے اس کی حفاظت بھی ہم کریں گے۔ اور اس کی حکومت بھی۔ تو پھر یہ نیشنل کانفرنس انھیں کیوں ہوشیار کر رہی ہے؟ یہ انھیں کیوں محض ایک حملہ آور سمجھ رہی ہے؟

مگر یہ بات کوئی نہیں بتاتا۔ وہ صرف نعرے لگا رہے ہیں اور سری نگر کے گلی کوچوں میں پھر رہے ہیں اور سری نگر کے مکانوں میں سری نگر کے رہنے والے انھیں دیکھتے ہوئے اور ان کے نعروں کو سنتے ہوئے سوچ رہے ہیں۔ کیا نیشنل کانفرنس واقعی سچ کہہ رہی ہے۔ اور کیا اس کے صدر نے دلی میں دو ہی دن پہلے جو کچھ کہا تھا وہ غلط تھا؟

دور ایک کھڑکی میں کھڑا جلوس کو دیکھتے ہوئے سری نگر کا ایک شہری سوچ رہا ہے کہ پچھلے سال انھیں فضاؤں میں "کشمیر چھوڑ دو" کا نعرہ گونجا تھا۔ دستی ہوئی گولیاں میں عوام سری سنگھ مردہ باد اور اس کا بیٹا کرن سنگھ مردہ باد چلاتے تھے اور ان کا رہنما شیخ عبداللہ گرفتار ہو گیا تھا اور لوگ سارا سال "باغی عبداللہ زندہ باد" کے نعرے لگاتے رہے تھے۔ مگر آج اسے بغیر کسی وجہ کے ہری سنگھ نے رہا کر دیا ہے اور ہری سنگھ کی اس نوازش نے نیشنل کانفرنس کو ان کے سارے پرانے نعرے بھلا دیے ہیں اور اگر اب انھیں کوئی اس طرح کا نعرہ بھی دلاتا ہے جس میں "کشمیر چھوڑ دو" کہا جا رہا

ہو اور جس میں غلامی کی زنجیریں توڑنے کا خواب لہرا رہا ہو تو نیشنل کانفرنس اُسے پسند نہیں کرتی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آج آزاد کشمیر زندہ باد کا نعرہ اُسے بُرا معلوم ہو رہا ہے کہ وہ لوگ جو آزاد کشمیر زندہ باد کہتے ہوئے سری نگر کی طرف بڑھے آ رہے ہیں اس کی نظر میں محض حملہ آور ہیں، محض حملہ آور۔

ایک اور جلوس گزرا "پاکستان زندہ باد" اور "کشمیر بنے گا پاکستان" کے نعرے لگاتا ہوا۔ یہ مسلم کانفرنسیوں کا جلوس ہے۔ یہ لوگ حکومت کرنے والے کے خواب کو حقیقت میں بدلنے کا انداز بھی بتا رہے ہیں کہ رہے ہیں کہ کشمیر اگر پاکستان میں شامل ہو جائے تو یہ عوام کی جیت ہوگی جو سیاسی پگڈنڈیوں کی بجائے سیدھی سڑک پر چلنا پسند کرتے ہیں۔ لیکن ان مسلم کانفرنسیوں کی آواز کوئی نہیں سننے دیتا۔ یہ اپنی سنانا چاہتے ہیں۔ مگر فضائیں ان کے لیے سازگار نہیں۔ ان فضاؤں کو اُن کے لیے ایک ایسا نقارخانہ بنا دیا گیا ہے جہاں ان کی آواز طوطی کی آواز بن جاتی ہے۔ ابھی یہ لوگ نعرے بلند کر رہے ہیں کہ نیشنل کانفرنس کا ایک اور جلوس آ جاتا ہے۔ "شیر کشمیر زندہ باد" "نیشنل کانفرنس زندہ باد" کے نعرے "کشمیر بنے گا پاکستان" والے نعروں کو دبا لیتے ہیں۔ اور مسلم کانفرنسیوں کی آواز مدھم پڑ جاتی ہے۔ اور یہ آواز مدھم کیوں نہ ہو جب ان کا سرپرست چوہدری غلام عباس جیل میں ہے۔ مسلم کانفرنس کے قائم مقام صدر چوہدری حمید اللہ کو ریاست سے نکال دیا گیا ہے اور جواں سال رہنما سردار ابراہیم کے لیے بھی یہاں کی فضائیں تنگ قرار دی جا چکی ہیں۔ پھر آخر ان کی آواز مدھم کیوں نہ ہو ——— اور نیشنل کانفرنس کی آواز انھیں کیوں نہ دبا لے جس کے رہنما کبھی باغی تھے۔ اور جیلوں میں تھے مگر جنھیں جیلوں سے نکال دیا گیا ہے اور جو اپنے آپ کو آج باغی کہلوانا پسند نہیں کرتے اور اپنی لیڈری کے بھرم کو قائم رکھنے کے لیے اتنا ہی ضروری سمجھتے ہیں کہ کبھی کبھار دبی زبان میں ذمہ دار نظام حکومت کا مطالبہ کر لیا جائے اور یوں عوام کو یہ تھپکی دے دی جائے کہ اگرچہ ہم پر مہاراجہ مہربان ہو چکا ہے اور ہم بڑی بڑی اور اونچی اونچی محفلوں میں باریاب ہو چکے ہیں تاہم غم نہ کرو ہم تمھیں اب تک نہ بھولے

اب نیشنل کانفرنس پر مہاراجہ کا سایہ ہے اور باغی باغی نہیں رہے اس لیے اب اگر نیشنل کانفرنس کے سامنے مسلم کانفرنس اپنی کوئی بات سنانا چاہے تو نیشنل کانفرنس نہ صرف نہیں سننے دے گی، نہیں سننے دے گی۔

مسلم کانفرنسیوں کا جلوس چلا گیا اور نیشنل کانفرنسیوں کے جلوس سے اب ایک اور نعرہ گونجا "عوامی راج زندہ باد" اور اس وقت یوں محسوس ہوا جیسے سرینگر کے عوام کے منہ پر کسی نے زور سے ایک طمانچہ دے مارا۔

جب مسلمانوں کے بڑے بڑے رہنما جیلوں میں ہوں۔ یا ریاست بدر کر دیے گئے ہوں "کشمیری پنڈتوں کے پریم ناتھ بزاز اور پریم ناتھ کھنہ جیسے بڑے رہنماؤں کو صرف اس لیے جیل میں ٹھونس دیا گیا ہو کہ جب کشمیر کے عوام "کشمیر بنے گا پاکستان" کا نعرہ بلند کرتے ہیں تو وہ ناک بھوں نہیں چڑھاتے بلکہ مسکراتے ہیں۔ کشمیر ٹائمز کے ایڈیٹر اور اس کے ہندو سیکرٹری کو صرف اس لیے ریاست سے باہر نکال دیا گیا ہو کہ وہ اپنے اخبار میں عوام کے ان جذبات کی ترجمانی کرتے تھے جن سے مہاراجے کی نیندیں اچاٹ اور اس کے بہت سے خواب چکنا چور ہو چکے ہو جاتے تھے۔ جب یہ سب کچھ کھلم کھلا ہوں کے سامنے ہو رہا ہو تو اس وقت نیشنل کانفرنس کا اس انداز میں "عوامی راج زندہ باد" کا نعرہ بلند کرنا عوام کی حرماں نصیبی کا مضحکہ اڑانا نہیں تو اور کیا ہے؟ اور ایسے وقت میں اگر کشمیر کا کوئی حساس شہری یہ سوچے کہ کیا پریم ناتھ بزاز کی کسان مزدور کانفرنس، مسلمانوں کی مسلم کانفرنس اور پریم ناتھ کھنہ کے پیرو کشمیری پنڈت عوام میں شامل نہیں۔ اور کیا صرف وہ گنتی کے چند لوگ ہی عوام کے نمائندے ہیں جن کا کسی نہ کسی طور نیشنل کانفرنس سے تعلق ہے تو اس میں بے چارے شہری کا کیا قصور؟

اس رات جب کہ جلوس آ رہے تھے اور جلوس جا رہے تھے، نعرے بلند کیے جا رہے تھے اور نعرے دبائے بھی جا رہے تھے سری نگر کا ایک شہری نہیں بلکہ اڑھائی لاکھ شہریوں میں سے بیشتر ایسی ہی باتیں سوچ رہے تھے۔

اور ان اڑھائی لاکھ شہریوں سے دور جھیل ڈل کے کنارے اپنے عظیم الشان محل میں مہاراجہ ہری سنگھ اداس بیٹھا تھا اگرچہ اس شام کو اس نے نذر دربار رچایا تھا اور اس دوران میں اپنے آپ کو پورے طور پر یہ یقین دلانے کی کوشش کرتا رہا تھا کہ وہ اب بھی اپنی پرجا کا معبود ہے۔ اب بھی اس کی پرجا اس کی غلام ہے۔ وہ اسے اپنے سامنے جھکا سکتا ہے، اس سے اپنی پوجا کروا سکتا ہے اور اگرچہ باغی عبداللہ بھی اب اس کا بن چکا تھا اور عبداللہ کی نیشنل کانفرنس بھی اب "عہد نامہ امرتسر توڑ دو، کشمیر چھوڑ دو" کے نعرے بلند نہیں کر رہی تھی اور "آزاد کشمیر زندہ باد" کہتے ہوئے کشمیر کے اس محلے کی طرف آنے والوں کو حملہ آور کہنے لگی تھی لیکن پھر بھی اسے اطمینان میسر نہ آ سکا تھا۔ وہ اداس رہا تھا، اب بھی اداس تھا۔ اور یہ اداسی بڑھتی جا رہی تھی۔ حملہ کرنے والے مظفرآباد تک پہنچ چکے تھے۔ کل وہ بارہ مولا پہنچ جائیں گے اور پرسوں یہاں۔ افواہیں گرم تھیں کہ وہ لوگ عید کی نماز سری نگر میں پڑھیں گے۔ اور اب یہ افواہیں سچ معلوم ہونے لگی تھیں۔ مظفرآباد سے بارہ مولا کچھ دور نہیں اور بارہ مولا سے سری نگر صرف ۳۰ میل ہے "اور پرسوں عید ہے اور کون کہہ سکتا ہے سری نگر کے یہی لوگ جو آج شام کو اس کے سامنے جھک رہے تھے ان کے پہنچتے ہی ان کی صفوں میں جا کھڑے ہوں اور عید کی نماز ایک ساتھ ہی ادا کریں۔ ان کا معبود بھی تو ایک ہی ہے جو ان کا ہے۔ اور یوں اس رات کی ابتدا میں راجہ اور پرجا کا جو کھیل کھیلا گیا تھا وہ محض ایک مذاق بن کر رہ جائے۔ اور وہ مہاراجہ جس نے پرجا کے دلوں میں جھانکنے کی آج تک کبھی ضرورت ہی نہیں سمجھی تھی۔ قدرت کے اس مذاق میں پس کر رہ جائے۔

مہاراجے نے سوچا، وہ بھاگ جائے گا۔ سری نگر کی یہ نگری چھوڑ کر، ڈل کے وسیع پانیوں کا یہ منظر چھوڑ کر اور یہ باغ و راغ چھوڑ کر وہ بھاگ جائے گا۔ آج تک وہ لوگوں سے یہ کہتا رہا تھا کہ وہ ان کی جان و مال کا محافظ ہے۔ مگر آج اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اصل میں یہ لوگ ہی اس کی جان و مال کے محافظ تھے۔ چونکہ دل نے کبھی دل کو اپنایا نہ تھا۔ راجہ اور پرجا آج تک ایک دوسرے سے دور رہے تھے۔ اور سدا سکھ کے ہنڈولے میں جھولنے والے

راجہ نے کسی کے دکھ کی آہیں سننا کبھی پسند نہ کیا تھا اس لیے آج بھی یہ دور رس نشان گے پرسوں جب وہ لوگ جن کا خون مدتوں تک ظلم سہتے رہنے کے بعد اب کھول رہا ہے۔ عیدگاہ میں کسی بلند و برتر محبوب کے سامنے جھکیں گے تو مہاراجہ ان کی نگاہوں میں ایک حقیر ذرہ ہوگا اور اس حقیر ذرے کو ان کے پاؤں کی ٹھوکر اڑا دے گی۔

اور اس لیے مہاراجہ نے سوچا۔ وہ بھاگ جائے گا۔ یہ بزدلی ہی سہی لیکن آخر وہ یہاں کس بل بوتے پر رہے۔ اپنا ماضی اس کے سامنے تھا۔ اور اپنے بھیانک مستقبل کو دیکھنے کی اس میں تاب نہ تھی۔ اور اس لیے صبح ہوتے ہوتے وہ بھاگ گیا۔ اپنی مہارانی کو لے کر اور اپنے کچھ حواریوں کو لے کر۔ وہ بھاگ گیا اور لاریاں اور کاریں انہیں بھگا کر لے گئیں۔

"مہاراجہ کہاں جائے گا"

شاید جموں۔

مگر سری نگر کے لوگ اس رات یہ نہیں جانتے تھے کہ کون جا رہا ہے اور کب جا رہا ہے۔ البتہ اس رات کے آسمان کے تارے جو سری نگر کی اس یادگار رات میں انسان کی ساری کمزوریاں اور انسانیت کی ساری عظمت کو اپنی تمام تر عریانی کے ساتھ دیکھ رہے تھے یہ دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہے تھے کہ آج کی رات صدیوں کی بنی ہوئی روایات کا بھانڈا پھوٹ چکا ہے ماضی کا سراب پاش پاش ہو گیا ہے اور مہاراجے کو اپنی منزل نظر نہیں آ رہی اور اس وقت جب کہ مہاراجہ اپنی کار میں بیٹھا اپنے ہاتھ میں ایک پستول اور دوسرے میں بندوق سنبھالے اپنے شاہی مندر کی مورتیاں وہاں سے اکھڑوا کے اپنے ساتھ لیے بھاگا جا رہا تھا تو ایک ستارے نے اپنے پڑوسی ستارے سے پوچھا کہ مہاراجہ یہ مورتیاں اپنے ساتھ تو اس لیے تو نہیں لے جا رہا کہ یہ سونے کی ہیں تو پڑوسی ستارہ کھلکھلا کے ہنس پڑا — آہ رے مہاراجہ تم مہاراجہ بن کے ہمیشہ مجبور کے رہے کہ تم انسان بھی ہو۔ ورنہ آج تمہیں انسانوں سے یوں نہ بھاگنا پڑتا۔

مہاراجہ بھاگ گیا اور سری نگر کی وہ رات ختم ہو گئی۔

(۲)

پھر صبح ہوئی دن چڑھا اور اس وقت راجدھانی تھی مگر نگر باقی نہ راجہ تھا نہ راج۔

سری نگر کے راج محل پر لہرانے والا جھنڈا غائب تھا اور اس کے سامنے کی جھیل ڈل خاموش تھی۔ اور جھیل ڈل میں بنا ہوا کبوتر خانہ بھی جو راجے کے لیے مدتوں ایک طرح کا عیش مقام رہا تھا۔ اس کبوتر خانے نے مغل بادشاہوں کا جلال دیکھا تھا۔ پھر یہاں سکھ آئے تھے، مہاراجے آئے تھے، ہری سنگھ آیا تھا اور اب یہاں کوئی اور آ رہا تھا اور سری نگر کی دنیا بدلنے لگی تھی۔

مہاراجہ بھاگا۔ اور پھر پرجا نے سوچا کہ شاید انھیں بھی بھاگ جانا چاہیے اور اڑھائی لاکھ انسان یہ سوچنے لگے کہ اب انھیں کیا کرنا چاہیے۔

کچھ لوگوں نے بھاگنا شروع کر دیا۔ لاری والوں نے کرایے بڑھا دیے اور وہ ٹریفک کے سارے قوانین بھی بھول گئے لاریوں کی چھتیں بوجھ سے اٹ گئیں۔ کاریں بوجھ ڈھونے والے چھکڑے دکھائی دینے لگیں اور ان میں بستروں اور ٹرنکوں کے بے پناہ انبار کے درمیان انسانی سر نہایت حقیر سے معلوم ہونے لگے۔ اس دن پٹرول ایک ایک سو روپے فی گیلن بکا اور بہت سی کاریں محض اس لیے خریدی گئیں کہ ان کے ساتھ اپنا پٹرول بھی خریدا جا سکتا تھا جس سے کار جموں تک جا سکے۔ آناً فاناً پٹرول اور کاروں کے بہت سے سودے چکائے گئے۔ اور پھر بانہال روڈ پر اس شدت کا ٹریفک جاری ہو گیا کہ اگر اطمینان کا زمانہ ہوتا تو اسے سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔ مگر اسی وقت ایسی کوئی دشواری نظر نہ آ رہی تھی کیونکہ وہاں کوئی نہ تھا جو ایسی باتوں پر پریشان ہوتا۔ مہاراجے کے ساتھ ساتھ حکومت کے سب بڑے بڑے کارندے بھی رات کے اندھیرے ہی اسی سڑک سے سری نگر چھوڑ چکے تھے۔

ہاؤس بوٹوں کے ان ہانجیوں کی قسمت بھی یکایک جاگ اٹھی جن کا کاروبار پچھلے سال کے دو بڑے ہنگاموں کی وجہ سے ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ عبداللہ کی کشمیر چھوڑ دو والی گڑبڑ اور اس کے بعد ۱۵ اگست کے بعد کی افراتفری نے سیاحوں کو کشمیر سے دور رکھا تھا۔

اور اس لیے ہانجی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے تھے۔ مگر اب اکتوبر کی اس چھبیس تاریخ کو جیسے اچانک ان کے لیے بہار کا زمانہ لوٹ آیا۔ وہ لوگ جو جموں نہیں جا سکتے تھے مضطرب سے ہو کر نقل مکانی کرنے لگے اور یوں معلوم ہونے لگا جیسے ہر شخص اپنے گھر کے سوا باقی ہر جگہ کو محفوظ سمجھتا ہے۔ اگر امر سنگھی باغ کے لوگ امیرا کدل کی طرف بھاگ رہے تھے تو امیرا کدل کے لوگ ہری سنگھ باغ کی طرف۔ ہری سنگھ باغ کے ہٹ مالوں کی طرف اور ڈل گیٹ کی طرف۔ ڈل گیٹ کی طرف تو ہر طرف سے بھاگ دوڑ تھی۔ ہانجی ان کو گھیرنے چلے جا رہے تھے۔ "صاحب یہ مس امریکہ ہے چار کمرہ والا بوٹ۔ پچھلے سال اس میں جو صاحب رہتا تھا وہ بہت بڑا صاحب تھا۔ اور صاحب یہ سامان موسی ہے۔ انگلی کا ایک میم صاحب کو یہ بوٹ بہت پسند تھا یہ دیکھیے اس کا خط۔ اس نے ہم کو خود لکھ کر دیا تھا۔ اور صاحب ہمارا بوٹ میں ریڈیو بھی ہے اور ہم ہر قسم کا کھانا بنا سکتا ہے۔ انگریزی کھانا، انگلی کا کھانا، ترکی کا کھانا، جرمنی کا کھانا اور چینی اور جاپان کا کھانا بھی ہم صاحب کو اتنا لذیذ کھلائے گا کہ صاحب ہمیشہ ڈل کو نہیں بھول پائے گا۔ کشمیر کو بھی بھول جائے گا۔" اور چہرے پر وہی خوشامدانہ ہنسی۔

مگر آج اس ہنسی کی کوئی قدر نہ تھی کیسا صاحب، کون سی مس امریکہ اور کہاں کا سامان سوئی۔ آج یہ سب باتیں بے معنی ہو چکی تھیں۔ ہانجی لوگ اپنی عادت سے مجبور اپنی اپنی الاپے جا رہے تھے۔ سننے والے بھی بظاہر سن رہے تھے۔ لیکن ہاؤس بوٹوں کے یہ خریدار ان خریداروں سے بہت مختلف تھے جنہیں یہ باتیں بھی آتی ہیں پہلے معلوم ہوا کرتی تھیں کہ ہاؤس بوٹ کی زندگی۔ آج کے یہ خریدار یہاں زندگی کا لطف اٹھانے کے لیے نہیں آ رہے تھے بلکہ زندگی کو بچانے کے لیے آ رہے تھے اور اس لیے ان کے واسطے یہی خیال بہت تھا کہ ہاؤس بوٹ، پانی میں رہتا ہے اور پانی اور آگ کا بیر ہے۔ اس لیے یہ لڑائی جو اب بارہ مولا کے آس پاس کہیں ہو رہی ہوگی جب سری نگر کے بازاروں میں ہوگی تو لڑائی کی آگ سے وہ محفوظ ہوں گے۔ اور گیہوں کے ساتھ گھن نہیں پس سکے گا۔ اور اس لیے وہ دھڑا دھڑ ہاؤس بوٹوں میں جمع ہو رہے تھے اور ہانجیوں کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ اکتوبر نہیں مارچ ہے۔ ان کی آمدنی کا اولین مہینہ ہے۔ جس ابھی ان کا سیزن شروع ہوتا ہے۔ اور اب بادام کا شگوفہ پھوٹے گا، سیاح آئیں گے اور ان کی جیبیں سال بھر کے لیے بھر جائیں گی کم از کم اس ایک دن میں ان کی جیبیں خوب بھریں۔ ڈل گیٹ سے ڈرائیٹ کریکڈل پر جہاں ٹانگے لوگوں کو اپنے گھر سے کسی اور گھر کی طرف لے جا رہے تھے اور جہاں لاریاں اور لاریاں جموں کا رخ کیے ہوئے تھیں ایک اور ہی عالم تھا، وہاں تلاشیاں لی جا رہی تھیں۔ نیشنل کانفرنس کے والنٹیئر سرخ بلے لگائے اور ہاتھوں میں لاٹھیاں لیے ہر ایک کی تلاشی لے رہے تھے۔ اور یہ تلاشی ہر چند قدم کے بعد دوبارہ ہوتی تھی۔

"ٹھہرو" اور ٹانگہ رک جاتا تھا۔

"سامان باہر نکالو اور تلاشی دو" اور تلاشی شروع ہو جاتی تھی۔

اگر اس وقت کوئی جرأت کرتا اور کہتا کہ ہماری تلاشی اس تھوڑے سے فاصلے میں امیرا کدل سے نکلنے کے بعد سے اب تک ایک دفعہ نہیں بلکہ کئی دفعہ ہو چکی ہے تو تیوریاں چڑھ جاتی تھیں اور تلاشی کا انداز زیادہ سخت ہو جاتا تھا۔ "اس میں کیا ہے" "کیمرہ۔" "یہ کیمرہ کیوں لیے جا رہے ہو" اور کیمرہ ضبط ہو جاتا تھا۔ گھڑیاں ضبط ہو جاتی تھیں سوئیٹر ضبط ہو جاتے تھے۔ ہر خوبصورت چیز ضبط ہو جاتی تھی۔ کیونکہ کہا یہ جاتا تھا کہ ہم تلاشی اس لیے لے رہے ہیں کہ تم کہیں کوئی اسلحہ تو نہیں لے جا رہے۔ اس لیے تلواروں اور بندوقوں کے علاوہ چاقو اور بلیڈ تک بھی ضبط ہو جاتے تھے۔

"یہ بلیڈ تو شیو کے لیے ہیں"

"مگر یہ وقت پڑنے پر خون بھی بہا سکتے ہیں"

اور اس لیے بلیڈ بھی اسلحہ سمجھا جاتا تھا بلکہ بعض اوقات اگر کوئی شخص یہ کہتا کہ بلیڈ کے بغیر اس کا شیونگ سٹ بیکار ہے تو اس گستاخی کے لیے اس کا شیونگ سٹ بھی ضبط ہو جاتا تھا۔ "کم بخت وقت کی نزاکت کو نہیں سمجھتے۔"

اور وقت کی نزاکت کو سمجھنے والے نیشنل کانفرنس کے یہ والنٹیئر یہ سب کچھ ضبط کر لیتے تھے اور پھر گھڑیاں ان کی کلائیوں پر جا سجتی تھیں۔ سوئیٹر ان کے سینے کی زینت بن جاتے تھے۔ بلیڈ ان کی جیبوں میں جا پڑتے تھے اور کیمرے اور اس طرح کی دوسری چیزیں

ان کا کوئی ساتھی گھر کی طرف لے جاتا تھا جبکہ مشہور شدہ تلواریں اور بندوقیں بھی ان کے بڑے کام آرہی تھیں کیونکہ دستے سب کے سب نیشنل کانفرنس کے والنٹیئر مسلح ہوتے ہیں۔ یہ تھے کل تک وہ نہتے تھے، آج صبح اُن کے پاس لاٹھیاں تھیں۔ اور وہ جس کی لاٹھی اُس کی بھینس والی کہاوت بیان کرتا ہوا پامال ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ اور اس لیے انہوں نے اپنی لاٹھیوں کا پورا پورا فائدہ اٹھایا تھا اور یہی وجہ تھی کہ اب لاٹھیوں کی جا تلواریں اور بندوقیں نے بھی نہیں اور تلاشیاں جاری تھیں۔ اور ان کے ساتھ ہی ساتھ جلوس بھی جمع ہوتے رہے تھے اور نعرے بھی تھے "نیشنل کانفرنس زندہ باد"۔

اور نیشنل کانفرنس واقعی زندہ باد تھی۔ اگر نیشنل کانفرنس زندہ باد نہ ہوتی تو لوگوں کے گھیرے ان تک کیوں پہنچتے۔ ان کے ہوٹیڑان کے پاس کیوں ہوتے۔ ان کا شیونگ سیٹ آج کہاں کسی اور کی جیب میں پڑا تھا۔ اور جیسے جوتے ڈرے ہوئے لڑکوں کو یہ کیسے پتا چلتا کہ قانون کے ختم ہونے کے بعد لاقانونی کا بھی ایک مزا ہوتا ہے اور وہ دور شروع ہو گیا ہے اور اس لیے نیشنل کانفرنس واقعی زندہ باد تھی۔ [illegible] شہریوں کو شہرت اور تنہائی میں بیٹھ کر پڑھا رہی تھی۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ عوامی راج بھی زندہ باد تھا۔ آخر یہ سب تلاشیاں لینے والے نیشنل کانفرنس عوام کے نمائندے ہی تو ہیں اور پھر تلاشی ہمیشہ وہ لیتا ہے جس کے ہاتھ میں راج ہو اور جس کے ہاتھ میں راج ہو اس کو کچھ لینے سے کوئی کیسے روک سکتا ہے اور اس لیے نیشنل کانفرنس کو بھی من مانی کرنے سے کون روک سکتا ہے۔ چنانچہ اُس کے والنٹیئرز کے ہاتھ میں لاٹھیاں تھیں اور وہ سری نگر کے ان نہتے اور ڈرے ہوئے شہریوں پر راج کر رہے تھے اور اس لیے ایک اور نعرہ بھی تھا، "عوامی راج زندہ باد"۔

جلوس گزر رہے تھے۔

مسلم کانفرنس کے جلوس بھی تھے مگر آج ان کی آواز بھی مدھم تھی۔ ہائے کاش اصول پر چلنے والی مسلم کانفرنس بے اصولی کی راہوں پر بھی چلنا جان سکتی تو پھر آج اس کا بھی بول بالا ہوتا۔ کہ وہ دوسروں کو مرعوب کرنے کا گر اسے بھی آتا ہوتا تو وہ بھی آج زندہ باد ہوتی۔

مگر آج صرف نیشنل کانفرنس ہی زندہ باد تھی اور نیشنل کانفرنس والے تلاشیاں لے رہے تھے۔ مجبور و معذور شہری تلاشیاں دے رہے تھے۔ اور وہ جو ان کی مدد کرنے آ رہے تھے ابھی دور تھے آج پہنچ نہ سکے تھے۔

دوسرے دن عید آئی مگر وہ جن کا انہیں انتظار تھا، وہ نہ آئے، نہ آ سکے۔ بارہ مولا کے لوگوں کی محبت ان کے ارادوں پر غالب آئی اور بارہ مولا والوں نے انہیں وہیں روک لیا۔

عید آئی مگر یہ عید بڑی روکھی پھیکی سی تھی۔

اور یہ عید سری نگر والوں کے لیے صرف بظاہر روکھی پھیکی نہ تھی بلکہ اس عید کے دن جب کہ ساری اسلامی دنیا میں ایک پرانی قربانی کی یادگار کے طور پر قربانیاں دی جا رہی تھیں، دلی میں ایک خود غرض مسلمان اپنے فائدے کے لیے ایک ایسا خونیں معاہدہ بھی کر رہا تھا جس کی رو سے کشمیر کے سارے مسلمان بیچے جا رہے تھے۔ ایک خود غرض مسلمان اپنے فائدے کے لیے تیس لاکھ مسلمانوں کی قربانی دینے کو آمادہ تھا۔ وہ جس نے پچھلے سال کہا تھا قوم سے غداری کرنے والا خود غرض ہے آج اس قوم کو اس نے بڑی سستے داموں بیچ رہا تھا۔ اور اس وقت وہ قوم فروش ہونے کے باوجود اپنے آپ کو خود غرض نہیں کہہ رہا تھا۔

اب [illegible] لوگوں کا سب پتا۔ ہجوم تھا اور یہاں کھڑے ہو کر تماشا دیکھنے والوں کو ڈنڈے کھانے پڑتے تھے اور سارے محاورے بڑی شدت سے یاد آتے تھے۔ چوک کے گرد اگرد نیشنل کانفرنس کے والنٹیئروں نے گھیرا ڈال رکھا تھا۔ اور وہ اس گھیرے میں کسی کو داخل نہ ہونے دیتے تھے۔ اس کے علاوہ ٹولیاں بھی تھیں جو اس ہجوم کو ہجوم رواں بنانے پر تلے ہوئے تھے۔ جہاں کہیں انہیں ایک سے زیادہ آدمی رکتے یا رک کے باتیں کرتے نظر آتے تو ڈنڈے والا کوئی والنٹیئر انہیں وہاں سے پھر متحرک کر دیتا۔

آپ لوگ یہاں کھڑے نہ ہوں۔

"بھئی ہم پریس رپورٹر ہیں۔ اخبار کے لیے مضمون لکھنا ہے اس لیے دیکھنے بھالنے کے لیے یہاں ٹھہرنا ضروری ہے۔"

"اوہ یہ بات ہے"

اور وہ ایڈیٹر چلا گیا لیکن کسی کو اتنی جلدی مراعات حاصل نہیں ہو سکتیں اس لیے جلد ہی ایک اور وہ ایڈیٹر آگیا آپ کس اخبار کے رپورٹر ہیں"

"ملاپ" "لاہور والا ملاپ"۔۔۔؟

"جی"

"تو پھر آپ یہاں کھڑے ہو کر رپورٹ نہیں لکھ سکتے" اور ایڈیٹر صاحب انداز بدل گئے۔

"مگر اب تو یہ دہلی سے نکلتا ہے" اور کہنے والے کی عقلمندی نے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا لیا۔

"تو پھر ٹھیک ہے"

اور دہلی کا اسم اعظم کام آگیا۔ بھلا دہلی کا اسم اعظم کیوں نہ لکھتا دہلی ہی تو وہ شہر تھا۔ عالم میں انتخاب، جہاں نیشنل کانفرنس کا صدر جیل سے چھوٹتے ہی پہنچا تھا۔ جہاں نیشنل کانفرنس کے صدر کا سب سے بڑا دوست نہرو رہتا ہے اور جہاں ۹ بجے بجے سے کر اس وقت تک نہ جانے وہ کتنے چکر لگا چکا ہے۔ پھر آخر نیشنل کانفرنس کے ان والنٹیروں کے لیے دلی اسم اعظم کا حکم کیوں نہ رکھتی۔

سری نگر بدل رہا ہے لحظہ بہ لحظہ، لمحہ بہ لمحہ، دن بدن جو پرسوں تھا وہ کل نہ تھا، اور جو آج ہے وہ بھی کل نہ تھا۔ پرسوں جہاں دو مختلف سیاسی عقیدوں کی گرم بازاری تھی۔ ایک مسلم کانفرنس زندہ باد کہہ رہا تھا اور دوسرا کہہ رہا تھا نیشنل کانفرنس زندہ باد۔ پھر ایک سیاسی ہوا چلی۔ چنانچہ کل صرف ایک ہی نعرہ گونج رہا۔ نیشنل کانفرنس زندہ باد پر آج پھر دو مختلف گروہ ہیں۔ جن کے دو مختلف نعرے ہیں۔ سری نگر کے بازاروں میں ہندوستانی فوجیں چکر کاٹ رہی ہیں۔ اور یہاں ایک نیا نعرہ بھی گونجنے لگا ہے۔ "جو بولے سو نہال ست سری اکال" ایڈورڈ روم سے سکھ سپاہیوں کی بھری ہوئی لاریاں آ رہی ہیں۔ سپاہی لاریوں کی چھتوں تک پر بیٹھے ہیں۔ بندوقیں تانے چھت پر بیٹھے چھت پر بیٹھی مورچے بنائے۔ اور نعرہ گونج رہا ہے۔۔۔ "جو بولے سو نہال۔ ست سری اکال"۔

امیرا کدل میں نیشنل کانفرنس کے ہوم گارڈز کا ایک جلوس اپنے آج کل کے مخصوص نعرے بلند کرتا ہوا گزر رہا ہے "نیشنل کانفرنس زندہ باد۔۔۔۔ شیر کشمیر کا کیا ارشاد، ہندو مسلم سکھ اتحاد ——— ست سری اکال والا نیا نعرہ ان کے کانوں میں بھی پڑتا ہے اور ان میں سے ایک شاید یہ خیال کر کے کہ شیر کشمیر کا ارشاد غالباً اب بدل گیا ہے تیج کر اپنا اصلی نعرہ ارشاد کرتا ہے ——— نعرۂ تکبیر اللہ اکبر ۔۔۔ اور لاریوں کی چھت ہی کو مورچہ بنائے ہوئے سکھ سورماؤں کی بندوقوں میں کھٹا کھٹ ہوتی ہے اور ان کا منہ اس گستاخ ہوم گارڈ کی طرف ہو جاتا ہے ——— پر عین وقت پر ہوم گارڈ کے کمانڈر کی ذمہ داری کا احساس خطرے کو سنبھال لیتا ہے چٹاخ سے ایک چانٹے کی آواز آتی ہے۔ کمانڈر غصے سے آگ بگولا ہو رہا ہے "کم بختو! پر مذہبی دیوانگی آتی جلدی طاری ہو جاتی ہے کمبخت اتنی جلدی فرقہ پرست بن جاتے ہیں۔ کم بخت"۔۔۔۔ اور ہندوستانی سورماؤں کو اطمینان ہو جاتا ہے اور ان کی بندوقوں کا منہ اگرچہ اب بھی اسی ہوم گارڈ کی طرف رہتا ہے تاہم اب وہ اپنے ست سری اکال والے نعروں کو بلند کرنے میں زیادہ مشغول نظر آتے ہیں۔ شکر ہے آئی بلا ٹل گئی۔ پر وہ ہوم گارڈ اب بھی نادانی پر تلا ہوا ہے اب وہ نہایت بھولپن سے اپنے گال ہی ثابت کرنا چاہتا ہے۔ پر "تاب یہ سکھ بھی تو مذہبی نعرے بلند کر رہے ہیں اور اس کا بھولپن اس کو اور بھی قصور وار بنا دیتا ہے" بیچارہ زیادہ اتنا بھی نہیں سمجھتا کہ یہ نعرہ ان سپاہیوں کا جنگی نعرہ ہے اور یہ محاذ جنگ پر جا رہے ہیں"۔

"الو کا۔۔۔۔" چٹاخ سے ایک اور چانٹے کی آواز آتی ہے اور اس ہوم گارڈ کو کمانڈر ایک گھاس کی بٹی ہوئی رسی سے باندھ کر دوسرے ہوم گارڈوں کی حراست میں دے دیتا ہے جو اسے دھکیلتے ہوئے امیرا کدل کی اس چھوٹی سی عدالت سے دور کسی نامعلوم جگہ لے جاتے ہیں جہاں کی کال کوٹھڑی میں اس جیسے کتنے اور لوگ اسی عدالت کے طفیل پڑے ہیں

پڑھے جا رہے ہیں اب اس کارروائی کے بعد امیراکدل میں نعرے پھر نمایاں ہو جاتے ہیں۔۔۔ شیر کشمیر کا کیا ارشاد — ہندو مسلم سکھ اتحاد ...... اور ..... جو بولے سو نہال۔ ست سری اکال ..... ایک شیر کشمیر کا ارشاد ہے اور دوسرا ہندوستانی فوجیوں کا جنگی نعرہ ہے اور وہ جز و مشترک جو ان دونوں بظاہر متضاد نعروں کو ایک بناتا ہے۔ اور ست سری اکال والے اس نعرے کو بھی شیر کشمیر کا ارشاد ثابت کرتا ہے کوئی نہیں جانتا۔ کوئی یہ پوچھ بھی نہیں سکتا کیونکہ اس والنٹیر کا انجام جس نے اس طرز کا ایک اقدام کرنا چاہا تھا سب دیکھ چکے ہیں۔ پھر اب کوئی پوچھے؛ کس سے پوچھے؟

آج یہاں یہ بات کوئی نہیں پوچھ سکتا۔

دوسرے دن جب یہ جنگی نعرے بلند کر کے جاتے ہوئے ان ہندوستانی سپاہیوں کو محاذ جنگ پر پہنچانے والی لاریاں واپس آئیں تو وہ لاشوں سے بھری ہوئی تھیں اور یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ان کو انسانی خون میں رنگ کے واپس کیا گیا ہے بریگیڈ کے جن باشندوں نے انھیں بٹ مالو سری سنگھ ہائی سٹریٹ اور امیراکدل سے واپس بادامی باغ کی طرف جاتے ہوئے دیکھا ان کے دل میں ہزاروں سوال اٹھے اور ان میں سے ہر ایک نے بہت کچھ پوچھنا چاہا پر نہ پوچھ سکا۔ البتہ ایک سکھ ڈرائیور نے ان کے تجسس کو کچھ حد تک ضرور دور کر دیا۔ یہ سکھ ڈرائیور بادامی باغ جاتے ہوئے ذرا کی ذرا راستے میں رک گیا تھا اور بازار میں گھوڑوں کے پانی پینے والی ٹینکی کے قریب کھڑا اپنا لہو بھرا ٹرک دھو رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ بڑبڑا بھی رہا تھا — "اوتہ ..... شیخ عبداللہ ..... کہتا ہے پٹھانوں کا مقابلہ سکھ ہی کر سکتے ہیں ..... بہانہ ہے ..... مسلوں کا بدلہ لینے کے لیے سکھوں کو اس بہانے یہاں کشمیر میں بلوا کے مروا رہا ہے ..... اوتہ حرامی مسلا ..... کل شام کو سب زندہ تھے۔ مولا سیاں بھی، سجان سیاں بھی اور پرکاشا بھی اور آج ..... آج کوئی بھی نہیں، سب مر گئے ..... اوتہ ..... شیخ عبداللہ ..... مائسمہ کے رہنے والوں میں سے صرف ایک دو نے یہ سنا لیکن جلد ہی اس نے ان دو ایک کو بھی اپنے قریب سے بھٹکا دیا۔ بھاگ جاؤ یہاں کوئی بائیسکوپ ہو رہا ہے جو کھڑے ہو آخر لاری ہی تو دھو رہا ہوں۔ اور اس کے بعد اس نے پانی سے بھرا ہوا ہیا جس سے وہ لاری صاف کر رہا تھا ان کی طرف انڈیل دیا اور وہ بھاگ گئے اور پھر انھوں نے یہ واقعہ سارے مائسمہ میں ایک ایک کو سنایا حتیٰ کہ مائسمہ کے بعد یہ باتیں زینا کدل پہنچیں فتح کدل پہنچیں۔ اور آہستہ آہستہ سارے بلوں والے اس سارے شہر میں پھیل گئیں۔ سینہ بہ سینہ کیونکہ اور کوئی صورت نہ تھی۔ اور اس کے ساتھ ہی سری نگر بھی بدلتا رہا۔ لحظہ بہ لحظہ، لمحہ بہ لمحہ، دن بہ دن۔

ہوم گارڈز اب بازاروں میں نہیں گھومتے؛ ایک میان میں جس طرح دو تلواریں نہیں سما سکتیں اسی طرح ایک میدانِ جنگ میں دو مختلف نعروں کی بھی ہمیشہ ٹکر ہی ہو گی۔ اور چونکہ شیر کشمیر کا ارشاد۔ ہندو مسلم سکھ اتحاد والا ہوم گارڈز کا نعرہ اور ہندوستانی فوجیوں کا ست سری اکال والا نعرہ سوائے شیر کشمیر کے ہر ایک کو دو مختلف عقیدوں اور دو مختلف نقطہ ہائے نظر کی ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں اس لیے شیر کشمیر اس خیال کے پیش نظر کہ شاید عوام کی نظر اتنی گہری نہیں جتنی ان کی رہتی ہے اور شاید عوام ان باریکیوں تک کبھی نہ پہنچ سکیں جن تک ان کا ذہن پہنچ چکا ہے مصلحت اسی میں سمجھتے ہیں کہ اب سری نگر کے بازار ان فوجیوں کی گھوما پھیری کے لیے وقف کر دیے جائیں اور ہوم گارڈز کو ان کی نظر سے ذرا اور دور ہی رکھا جائے چنانچہ اب یہ گارڈز لیفٹ رائٹ کرنا تو پرتاپ پارک میں سیکھتے ہیں۔ اور اس کے بعد نعرے لگانے کے لیے اندرون شہر کے گلی کوچوں کا رخ کرتے ہیں۔ البتہ ان ہوم گارڈز کا صدر دفتر اب بھی امیراکدل میں ہے۔ امیراکدل کے کارونیشن ہوٹل میں۔ اس ہوٹل کو اس مقصد کے لیے استعمال کرنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس کے مالک نے پندرہ اگست کو اس پر پاکستانی جھنڈا لہرایا تھا۔ چنانچہ اب اس کو اس کی ناعاقبت اندیشانہ حرکت کی سزا دینے کی خاطر موجودہ ہندوستان کے پرستار ارباب اختیار پر لازم آتا تھا کہ وہ ہوٹل چھین لیں اور اسے اپنے کام میں لائیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب اس کے مختلف کمروں میں نیشنل کانفرنس یہ

ایڈمنسٹریشن نے دفاتر میں ہوٹل کا فرنیچر بھی ہوٹل کو دفتر کا روپ دینے میں خاصا ممد ثابت ہوتا ہے۔ ہوٹل کے مالک نے یوم آزادی کے دن اگرچہ پاکستانی جھنڈا لہرا کر شاید نااندیشی کا ثبوت دیا تھا۔ یہ فرنیچر کے معاملے میں اس کی نظر بڑی دوربین اور بڑی گہری تھی۔ اس فرنیچر کو دیکھ کر کوئی شخص بھی تو تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا خوش ذوق آدمی، دیکھیے نا ایسی ایسی نفیس کرسیاں خرید رکھی تھیں کہ اب دفتروں کا حسن دوبالا ہو گیا ہے۔

پریم ناتھ پردیسی کہتا ہے اس نے کتابوں میں پڑھا ہے کہ ہر انقلاب میں یونہی ہوتا ہے اور جب روس میں انقلاب آیا تھا تو وہاں بھی یہی ہوا تھا اور وہاں بھی حکومت کو شروع شروع میں اپنے دفاتر ایک ہوٹل میں ہی رکھنے پڑے تھے۔

اور پردیسی خوش ہو کر کہتا ہے۔ کتنے خوش نصیب ہیں ہم جو انقلاب کو اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ رہے ہیں ورنہ اگر ہم انقلاب کی باتیں کتابوں میں ہی پڑھتے رہتے اور یونہی چپکے سے ایک دن مر جاتے تو یہ بھی کوئی زندگی ہوتی۔"

چنانچہ اپنی زندگی کا اور اپنی خوش نصیبی کا پورا پورا فائدہ اٹھانے کے لیے ہم کارونیشن ہوٹل کی بالکونی میں کھڑے ہو کر انقلاب کو اپنی آنکھوں سے اور زیادہ دیکھنے میں منہمک ہو جاتے ہیں۔ اس وقت انقلاب کا جو منظر ہمارے سامنے ہے اس میں سب سے نمایاں ہیں۔ ہندوستانی سپاہی اور کشمیری سیب۔ ان سیبوں میں کشمیر کا وہ حسن ہے جو یہاں کی زمین سے پھوٹ کر سیب کا روپ دھار کر راولپنڈی کی راہ پنجاب تک پہنچا کرتا تھا اور وہاں کے حسینوں کے عارض پر جھلکتا تھا لیکن اب چونکہ راولپنڈی کی راہ بند ہو چکی ہے اور پٹھان کوٹ کے راستے کے طویل فاصلوں میں اتنی سکت نہیں جو اسے اسی پہلے کی سی شان اور آن بان کے ساتھ پنجاب پہنچا سکیں۔ اس لیے یہ یہیں پڑا ہے۔ کوڑیوں کے مول بک رہا ہے اور اتنا سستا ہے کہ سری نگر کی ساری تاریخ میں آج تک اتنا سستا کبھی نہ بکا تھا۔ صاحب یہ گول والا فرنچ ایپل ہے جب انگریز لوگ اس کی ترشی پر مرتا تھا اور اسی کو کھاتا تھا..... اچھا صاحب یہ امری سیب ہے خاص سولہ روالا..... صرف پانچ آنہ سیر..... اچھا صاحب چار آنہ..... اچھا اچھا صاحب لیو۔ تین آنہ ہی دیو۔ لیکن صاحب ہیں کہ تین آنہ سیر پر بھی رضامند نہیں ہو رہے۔ کون جانے کل کیا ہونے والا ہے۔ اس لیے نقدی کا اپنے پاس رکھنا زیادہ ضروری ہے۔ وقت پڑنے پر تین آنے بھی بڑی چیز بن جاتے ہیں اور اس لیے یہ فرنچ ایپل اور امری سیب سری نگر کی سڑکوں پر فٹ پاتھ پر ضائع جا رہے ہیں اور کوئی ان کی طرف توجہ نہیں دیتا سوائے محاذ جنگ پر جانے والے ان سپاہیوں کے جن کی لاریاں اس وقت امیرا کدل سے گزر رہی ہیں۔ ان لاریوں میں سے ہر دو تین لاریوں کے گزرنے کے بعد دفعتاً ایک لاری فٹ پاتھ کے کنارے آکھڑی ہوتی ہے۔ اس کے اگلے پہیے کسی ٹوکرے کو بالکل چھوتے ہوئے رکتے ہیں اور سیب بیچنے والا "لیو صاحب" کہنے کے سیبوں کے لیے ابھی سوچ ہی رہا ہوتا ہے کہ وہ اُن نئے گاہکوں کو پہلے سانس میں ہی تین آنے سیر والا بھاؤ بتا دے یا پانچ آنے سے زینہ بہ زینہ اترے کہ سیبوں کا سالم ٹوکرہ فوجی ڈرائیور کے ہاتھوں کے ایک ہی جھٹکے سے لاری کی چھت پر جا پڑتا ہے اور پھر ست سری اکال، جو بولے سو نہال" کی ایک گونج کے ساتھ لاری آگے روانہ ہو جاتی ہے اور سیب فروش بے چارہ ابھی اپنے ہوش و حواس پورے طور پر مجتمع کر ہی رہا ہوتا ہے اور دور سے اُسی لاری کی چھت پر سے ایک سیب اس کی ٹوپی کو اڑا کر اس کی گنجی کھوپڑی پر آ لگتا ہے۔ فوجیوں کا نشانہ بھلا کیسے چوک سکتا تھا۔ وہ اُف کر کے سر کو پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے اور اس کے پاس بیٹھے ہوئے شیر کشمیر کی ہاف پوسٹ کارڈ سائز کی تصویر بیچنے والے لونڈے زور زور سے ہنسنے لگتے ہیں اور پھر فوجیوں کے ہاتھوں اپنے سودے کے محفوظ ہونے کے پورے یقین کے ساتھ پہلے سے بھی اونچی آواز کے ساتھ چلانے لگتے ہیں۔ لے جاؤ شیر کشمیر کا نشانہ۔ قیمت دو ہی آنہ۔ شیر کشمیر کا نشانہ لے جاؤ۔ وہ جانتے ہیں کہ شیر کشمیر کی اس نشانی سے ان فوجیوں کو کوئی دلچسپی نہیں۔ پھر وہ کسی اور راہرو کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا یہ موقع کیوں گنوائیں؟ اور اس کے علاوہ یوں بھی کم از کم اس حادثہ کے بعد شیر کشمیر کی تصویر بیچنے والے بیوپاری

کی سیبوں کے بیوپار پر ترقیبت ان پر پورے طور پر واضح ہو گئی ہے اس لیے — قیمت دو ہی آنہ سیر لے جاؤ شبیر کشمیر کا نشانہ ہے — اب ان کی آوازیں مدھم اور ملتجی ہوتی جا رہی ہیں اور ان کے قریب سیبوں کے ٹوکروں کے دوسرے مالک یہ ترکیب سمجھتے ہوئے کہ انھیں کیا کرنا چاہیے، مسکرانے لگتے ہیں لیکن یہ مسکراہٹ اتنی جعلی ہوتی ہے کہ اس سے صاف ٹپکتا ہے وہ کہہ رہے ہیں کہ ہم بھی اپنا انجام جانتے ہیں پر آ ... ہمیں معلوم تو ہوا ہے کہ اب نہ ہوا تو ذرا دیر بعد پانچ منٹ بعد یا ایک گھنٹے بعد وہ لاری بھی آنے والی ہے جس کا فوجی ڈرائیور ہمارے ہی سیبوں سے ہماری کھوپری کا بھی نشانہ بنا لے گا۔ پر ہم غریب نہتے سیب فروش آخر ان بندوق والوں سے کچھ کیسے کہہ سکتے ہیں اور پھر شبیر کشمیر کا نشانہ بھی تو ابھی اتنا مقبول نہیں ہوا کہ ہم اس کی تجارت کے بل بوتے پر ہی اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ بھرنے کی کوئی سبیل کر سکیں اس لیے — لے لیو امری سیب تین آنہ سیر ہی لے لیو صاب"۔ صورت حال نے نرخ اور بھی گھٹا دیا ہے۔

ناتھو جی انقلاب کی بیٹھک میں سیبوں کے پسنے کے اس انداز کے لیے وجہ جواز پیدا کرتے ہوئے اظہار خیال کرتا ہے کہ اب ہم گھر کی چیزوں کو گھر میں ہی رکھا کریں گے جونہی لڑائی ختم ہو گی اور امن کا دور دورہ ہو گا ہم اپنے ہاں چھوٹی چھوٹی فیکٹریاں کھول لیں گے جن میں ان سیبوں کے مربے بنا کریں گے جام اور چٹنیاں اور مارملیڈ پھر ہمیں سیب باہر کی منڈیوں میں بھیجنے کی ضرورت ہی نہ رہے گی"۔

اور پھر وہ کشمیری سیب جن کی اس وقت ساری دنیا میں دھوم ہے جب محض جام اور مارملیڈ کے روپ میں ہی نظر آیا کریں گے اور اپنی اصلیت کھو دیں گے تو بجز یہ ایک کہانی بن کر رہ جائیں گے اور آنے والے بے انتہا ترقی اور تہذیب کے زمانے میں یہ کہانی لوگ ایک دوسرے کو سنایا کریں گے کہ کبھی پرانے وقتوں میں کشمیر کی جنت نظیر وادی میں جہاں کیسر کے پھول کھلتے ہیں اور جہاں جھیل ڈل ہے ایک پھل اگا کرتا تھا جس کا نام تھا سیب اور میرا دل چاہتا ہے کہ میں کہوں لیکن یہ سوچ کر کہ ہر

بات کے لیے ایک وقت ہوتا ہے اور اس بات کے لیے یہ وقت نہیں۔ خاموش رہتا ہوں۔

پھر میرا تخیل مجھے سرزمین سوپور میں لے جاتا ہے جہاں وہ پھل جس کا نام سیب ہے اور جہاں سے دو تین میل پرے وہ مقام ہے جس کا نام دو آب گاہ ہے۔ اور جہاں وہ دریا ہیں جن کا کشمیر کے دوسرے دریاؤں کی طرح اس ملک کی طرف رخ ہے جس کو اب لوگ پاکستان کہنے لگے ہیں اور جو بے حد بڑا ہے کیونکہ پنڈت نہرو اس کے وزیراعظم نہیں۔ کچھ دنوں پہلے تک کشمیر کے سارے جنگلوں کی لکڑی دو آب گاہ کے انھیں دریاؤں کی راہ لکڑی کی منڈیوں میں پہنچائی جاتی تھی لیکن چونکہ ان دریاؤں نے کشمیر کا ہندوستان کے ساتھ سمبندھ ہو جانے کے باوجود ابھی تک اپنا رخ نہیں بدلا اور یہ نئے سیاسی اصولوں کو پرے ڈھکیلتے ہوئے کے ساتھ نظرانداز کیے بدستور اپنی پرانی ڈگر پر چلتے ہوئے پاکستان ہی کی طرف بہے جا رہے ہیں اس لیے لکڑی کے ٹھیکیداروں کو محسوس ہو رہا ہے کہ اب ان کے برے، بہت ہی برے دن آ گئے ہیں۔ اور چونکہ نیشنل کانفرنس اور ہندوستان کی حکومت دونوں کا فرض ہے کہ وہ لوگوں کے اسی طرح کے ہر احساس پر قابو پانے کی پوری پوری کوشش کریں کیونکہ اس صورت حال میں لوگوں کے ففتھ کالمسٹ بن جانے کا خدشہ ہے اس لیے اب دو آب گاہ میں لکڑی چیرنے کی ایک مشین لگا دی گئی ہے جس میں بڑے بڑے شہتیروں کے ٹکڑے کیے جاتے ہیں اور اس کے اور بالکل اسی طرح جیسے اس سے قبل یہ دریا ان شہتیروں کو اپنے سینے پر لاد کر ٹھیکیداروں سے کوئی معاوضہ لیے بغیر لکڑی کی منڈیوں تک پہنچا دیتے تھے اب وہ فوجی ٹرک انھیں ہندوستان کے کسی شہر میں جا پھینکتے ہیں جو اوڑی کے محاذ پر فوجیوں کو چھوڑنے کے بعد واپس خالی جا رہے ہوتے ہیں۔ لہٰذا اور دریاؤں کی اسی ... ٹھیکیدار لوگ اب بھی سوچتے ہیں کہ آخر کب تک یہ معاملہ یوں چل سکے گا۔ جنگ آخر ہمیشہ رہے گی نہیں جو یہ خالی ٹرک ہمیشہ دستیاب ہوتے رہیں گے اور اگر مشین اور ٹرکوں کی امداد کا سلسلہ ہمیشہ شامل حال ہی رہنا ہے تو اس ہنگامی دور کے بعد وقت بھی آخر

آئے گا جب اس کاروبار کو اس طور چلانے پہ اتنی لاگت آیا کرے گی جس سے شٹیکیداروں کی کمرٹوٹ جائے اور حکومت کو اپنے بجٹ سے جنگلات کی اس آمدنی وانی مد کو خیر باد کہہ دینا پڑے گا اور میں بھی سوچتا ہوں کہ پاکستان کو میں اگر دستور برابر سمجھتے رہنا پڑا تو لڑائی کے بعد گوسیلیوں کا بدل تو یہ جام اور مار مٹے کی شکل میں مل جانے گا پر جنگلوں کی یہ اقتصادی اہمیت ضروری زمانہ ماضی کی ایک بات بن کر رہ جائے گی محض ایک قصہ پارینہ کو بہت بہت پرانے زمانے میں ایک وقت ایسا بھی تھا جب کشمیر جنت نظیر کے جنگل سونا اگلا کرتے تھے۔ پر جب یہاں کے باشندوں نے اپنے اور بیگانوں میں تمیز کرنا چھوڑ دی اور اپنا سود و زیاں نہ پہچان سکے تو قدرت ان کے خلاف ہو گئی۔ دریاؤں نے ان سے ناطہ توڑ لیا۔ اور جنگلوں نے بھی سونا اگلنے سے انکار کر دیا اور یہ وادی آہستہ آہستہ ویران ہونے لگی اور ...... ایک دفعہ پھر یہ ارادہ ہوتا ہے کہ میں ناظر جی اندرا سے یہ کہوں۔ لیکن پھر پہلے کی طرح یہ سوچ کر کہ ہر بات کا ایک وقت ہوتا ہے اور اس بات کا یہ وقت نہیں۔ خاموش رہتا ہوں۔ اور اپنے خیالوں میں ہی مگن رہتا ہوں۔

کارونیشن ہوٹل کی بالکونی میں کھڑے کھڑے میں اب ناجی اور پران سے دور چلا جاتا ہوں اور اپنے ایک دوست انند باہری کے ساتھ نیڈوز ہوٹل کی گیلری میں جا بیٹھتا ہوں۔ یہاں رات کا وقت ہے۔ ایک خاص ترتیب سے رکھے ہوئے میزوں پر بڑی نفاست سے پلیٹوں میں رکھی ہوئی موم بتیاں کانپ رہی ہیں۔ اور ان کے درمیاں بیٹھے ہم دونوں چائے پی رہے ہیں۔ بالکل اکیلے کیونکہ نیڈوز میں آج کل لوگ کم آتے ہیں۔ اس وقت یوں معلوم ہو رہا ہے جیسے ہم دونوں کسی قبر پر بیٹھے ہیں اور جگنوؤں کی ایک قوم بڑے پراسرار انداز میں ہمارے گرد بیٹھی جھپک جھپک کر ہمیں دیکھ رہی ہے اور ان کی مدھم روشنی میں جب ہم اپنی چائے کی پیالیوں میں سرخ سرخ شکر گھولتے ہیں تو ہمیں اس صاف شفاف چینی کی یاد ستانے لگتی ہے جو کسی دور دیس کا ایک ایسا تحفہ تھی جسے ہم اب کھو چکے ہیں۔ اور جس کی اب یاد ہی باقی رہ گئی ہے۔ اگر کوئی اور وقت ہوتا تو یہ کانپتی ہوئی موم بتیاں یہ آنکھیں جھپکتے ہوئے جگنو۔ اور ان کے بیچوں بیچ بیٹھ کر چینی کی یاد میں آہیں بھرنا ہمیں بڑا رومانٹک نظر آتا۔ پر اس وقت اس مجبوری کو خود فریبی کا کوئی انداز نہیں چھپا سکتا۔ اور ہمارے پاس کسی پھول کی کوئی ایسی پتی نہیں جو اس کانٹے کو ڈھانک سکے۔ اسے کاش! اسے کاش!!

آنند باہری مجھ سے کہہ رہا ہے۔ ایک پائلٹ سے میری دوستی ہو گئی ہے۔ اور اس کے ساتھ میں کل ہوائی جہاز میں دہلی جا رہا ہوں۔ دو ایک دن تک واپس آ جاؤں گا اور دلی سے تمہاری ضرورت کی چیزیں بھی لیتا آؤں گا۔

اور میں خوش ہو کر کہتا ہوں "تمہارا باہری ضرور لانا۔ بلکہ میں تمہیں فہرست لکھوائے دیتا ہوں۔"

لیکن وہ لکھنے کے لیے فہرست بنانے کے لیے تیار نہیں "واہ کیا میں اتنا بھی نہیں جانتا" باہری مگر ہمیں رہ کر ان دنوں کس کس چیز کے لیے پریشانی ہوتی ہے۔ سنو! میں تمہارے لیے سفید چینی بھی لاؤں گا۔ سگرٹ لاؤں گا۔ رومال لاؤں گا اور تھوڑا سا نمک بھی لاؤں گا اور ہاں ایک دیا سلائی بھی لاؤں گا۔ کیونکہ اب یہاں دیا سلائی کا بھی توکال ہے نا؟ پھر وہ ذرا رک کر مسکراتے ہوئے کہتا ہے۔ البتہ بجلی کی روشنی نہ لا سکوں گا۔ اس کے لیے تمہیں موم بتیوں سے ہی گزارہ کرنا پڑے گا۔ اور چونکہ موم بتیاں بھی یہاں نایاب ہو رہی ہیں اس لیے کچھ موم بتیاں بھی تمہارے لیے لیتا آؤں گا۔

(کتاب "کشمیر اداس ہے" میں سے)



حرفِ آخر

دُلوہا باغوانو! نو بہارک شان پیدا کر
پھلن گل گتھ کرن بُلبل تِتھی سامان پیدا کر
اَے باغبان! آ اور اک نئی بہار کی شان پیدا کر دے
ایسے سامان پیدا کر کہ پھول کھل جائیں اور بلبلیں رقص کرنے لگیں

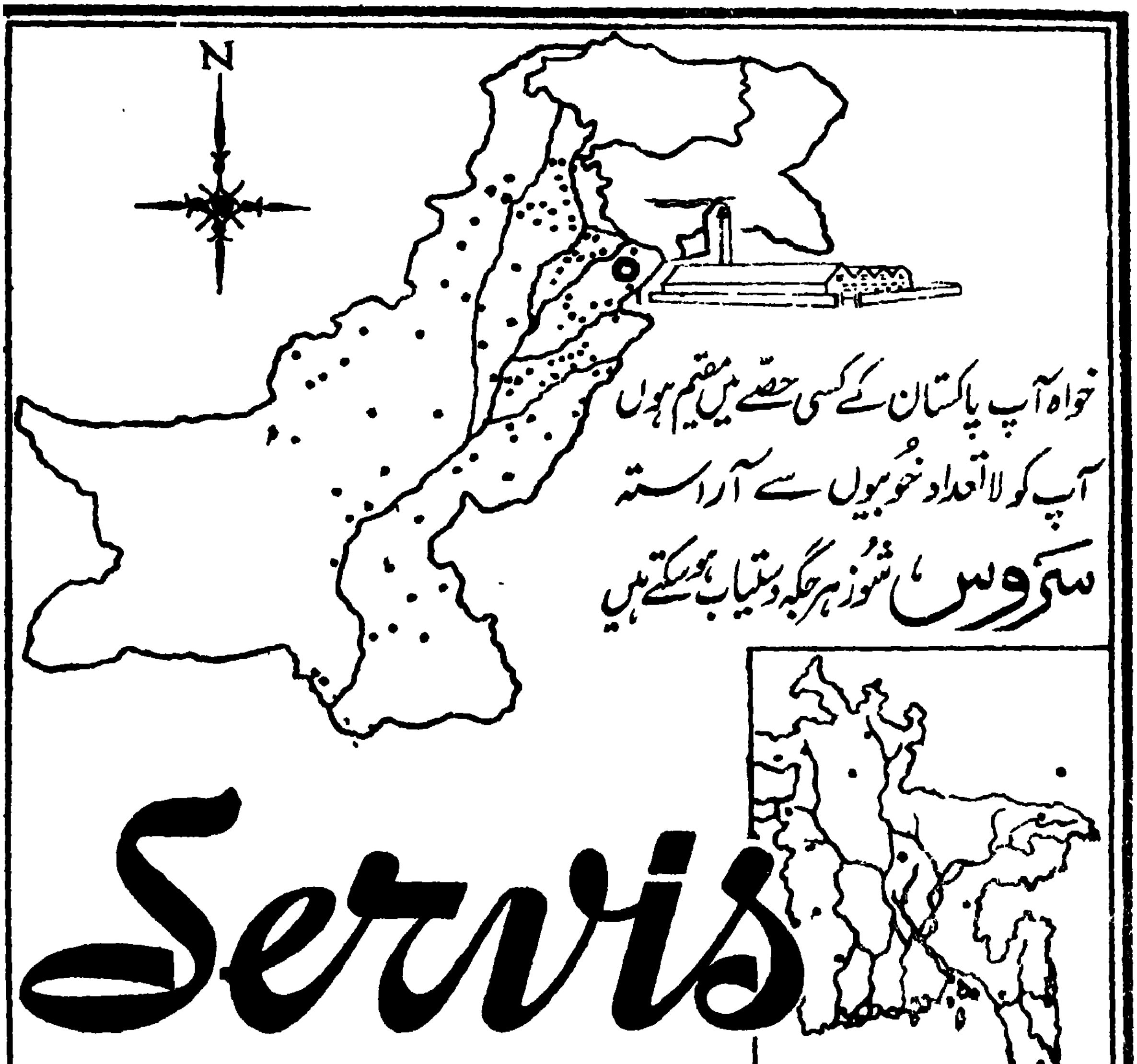
چمن ویراں رواں شبنم ژٕٹتھ جامہ پریشاں گل
گلَن تے بلبلن اندر دوبارہ جان پیدا کر
چمن ویران ہے شبنم رو رہی ہے، پھول کپڑے پھاڑ کر پریشان ہو رہے
ہیں۔ سو پھولوں اور بلبلوں میں تو دوبارہ جان پیدا کر دے

کری کُس بلبلا آزاد پنجرس منز ژٕ نالاں چھکھ
ژٕ پننے دستہ پنن مشکلن آسان پیدا کر
تجھے اَے بلبل کون آزاد کرے گا تُو جو پنجرے میں نالاں ہے
تو اپنے ہی ہاتھ سے اپنی مشکلیں آسان کر لے

چھ باغس جانور بولاں مگر چھک بیوں بیوں
یہندِس آلہ وس یارب اثر یکسان پیدا کر
باغوں میں پرندے بولتے ہیں مگر ان کی آوازیں الگ الگ ہیں
اَے خدا ان کی آوازوں میں یکسانیت پیدا کر دے!

اگر وزہ نادہ ہن بستی گلن ہنز ترا وزیر و بم
بُنیُل کر دا دکر گگرایہ کر طوفان پیدا کر
اگر تجھے پھولوں کی بستی کو جگانا ہے تو زیروبم اور ساز ستار چھوڑ دے
اور زلزلہ اور زور کی ہوا اور بجلی کی کڑک اور طوفان پیدا کر دے

مہجور کاشمیری



SS—50

M A MALIK